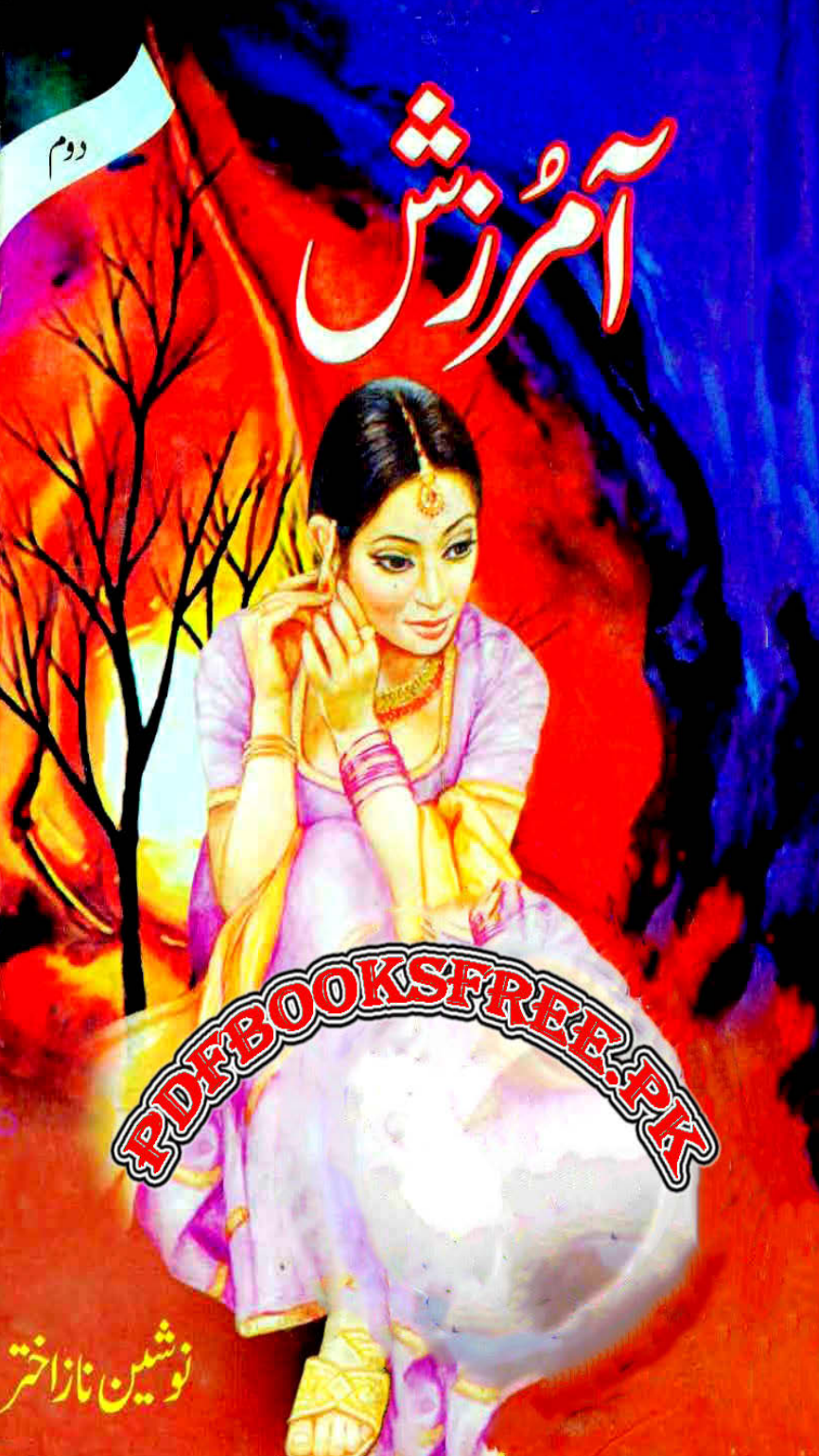

PDFBOOKSFREE.PK

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آمُزش

(دوئم)

نوشین ناز اختر

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون 042-37668958 , 042-37652546
www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معیاری اور خوبصورت کتابیں

با اہتمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل 2010ء

مطبع .... نیئر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ .... کلاسکس گرافکس

قیمت .... [redacted] روپے

سائرہ پریس میں اپنی ڈائی بنوا رہی تھی، جب اُسے گھر سے فون آیا۔

''صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں، وہ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔'' ملازم نے اطلاع دی۔

''یا اللہ خیر! میرے ابو کو صحت تندرستی دینا!'' سائرہ نے دعا کی، اُس کے چہرے کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔

''اچھا تم فوراً ڈاکٹر گیلانی کو فون کرو اور پھر لالہ کو بھی بتاؤ، میں بس ابھی نکل رہی ہوں۔'' سائرہ سارا کام ادھورا چھوڑ کر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب بڑھی، کالج کا پرنٹنگ پریس تہ خانے میں تھا، سائرہ تیزی سے اوپر کو دوڑی۔

''لالہ، فون اٹھاؤ!'' سائرہ مسلسل طارق کا سیل نمبر ڈائل کر رہی تھی لیکن فون سوئچ آف مل رہا تھا سائرہ نے جلدی جلدی طارق کو پیغام سینڈ کیا۔

''ولی بھائی! پلیز لالہ کا پتا کریں ابو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں!'' سائرہ نے ولی کا نمبر ملا کر کہا۔

''ٹھیک ہے میں پتا کرتا ہوں، تم فکر نہ کرو، تم کہاں ہو اِس وقت؟'' ولی نے سوال کیا۔

''میں ابھی تو کالج سے نکل رہی ہوں، گھر پہنچنے میں آدھا گھنٹا تو ضرور لگ جائے گا۔'' سائرہ روہانسی ہو رہی تھی، باپ کا بیمار اور نقاہت بھرا چہرہ مسلسل اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

''میں ابھی گھر سے نکلا ہوا ہوں، ٹھیک ہے میں سیدھا تمہارے گھر جا رہا ہوں۔'' ولی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

گھر پہنچ کر سائرہ تقریباً دوڑتی ہوئی اندر بھاگی۔ یوں لگ رہا تھا کوئی بہت قیمتی چیز ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلے جا رہی ہو۔

سائرہ کو ڈاکٹر گیلانی ابو کے کمرے کے باہر ہی مل گئے۔ وہ بہت تیزی سے کمرے سے باہر نکلے تھے۔

''ڈاکٹر... ڈاکٹر صاحب کیا ہوا ابو کو؟'' سائرہ کی آواز شدتِ غم سے بیٹھ گئی تھی۔ اُسے بولنا دشوار ہو گیا تھا۔

''انہیں فوراً ہسپتال لے جانا پڑے گا میں نے ہسپتال فون کر دیا ہے ایمبولینس پہنچنے ہی والی ہو گی۔'' ڈاکٹر گیلانی کے منہ میں ابھی الفاظ ہی تھے کہ باہر ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔

''جلدی کریں، آپ میں سے جس کو بھی ساتھ جانا ہے وہ فوراً آ جائے۔'' ڈاکٹر گیلانی کہہ کر شہباز صاحب کے کمرے کی جانب دوبارہ بڑھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ابو!'' سائرہ نے اُن کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگالیا۔

''تم کیوں فکر کرتی ہو!'' شہباز صاحب نے اٹک اٹک کر کہا۔

''ابھی تو میں بہت جیوں گا! ابھی تو... ابھی تو میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تا کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکوں۔'' شہباز صاحب کے چہرے پر تکلیف با آسانی دیکھی جاسکتی تھی۔

''میں... میں زندہ... زندہ رہنا چاہتا ہوں تو موت کیوں آئے گی!'' شہباز صاحب کا تنفس بے حد تیزی سے چل رہا تھا۔

''آپ پلیز کم بولیں۔'' ڈاکٹر نے آکسیجن ماسک اُن کے منہ پر دوبارہ رکھتے ہوئے سختی سے ہدایت کی اور ساتھ ہی اُن کو انجکشن لگادیا، جس سے وہ غنودگی میں چلے گئے۔

''ہسپتال پہنچنے تک ان کا پُرسکون رہنا ضروری ہے۔ ویسے تو اب یہ انجکشن شاید ہی اِن پر اثر کرسکیں۔'' دوسری سیٹ پر بیٹھے ڈاکٹر کی بڑبڑاہٹ اتنی واضح تو ضرور تھی کہ سائرہ با آسانی سُن سکتی۔ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رودی، ایمبولینس میں ساتھ بیٹھے ولی نے سائرہ کا سر تھپتھپایا، وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اُسے کس طرح تسلی دے، باپ تو وہ رشتہ ہوتا ہے جس کا کوئی نعم البدل ہی نہیں۔ پھر انہوں نے یہ واحد رشتہ بھی تو کیسے تڑپ تڑپ کر حاصل کیا تھا۔

''بھائی! ابو ٹھیک تو ہوجائیں گے نا؟'' سائرہ نے اپنی روئی روئی سرخ آنکھیں اُٹھا کر سوال کیا۔

''انشاءاللہ!'' ولی نے اُسے پھر تسلی دی۔

اِنسان کتنا بے بس ہے وہ نہ تو اپنی مرضی سے اِس دنیا میں آتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے اِس دنیا میں ایک پل زیادہ رہ سکتا ہے۔

ولی نے فکرمندی سے شہباز انکل کا چہرہ دیکھا، جو چند منٹوں میں ہی ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔

❖❖○❖❖

''اتنی دیر سے یہ لڑکی گھر آتی ہے! کسی دن اِس لڑکی کی یہ عادتیں میری جان لے کر ہی دم لیں گی۔'' حُسن آرا بیگم نے دروازے سے پلٹ کر کہا۔

وہ مسلسل دروازے کے چکر لگارہی تھیں، مغرب کا وقت کب کا نکل چکا تھا، منزہ گھر نہیں آئی تھی وہ بار بار گلی میں جاکر دیکھتی تھیں۔ اِسی پریشانی میں انہوں نے صرف تین رکعت سنت پڑھ کر جاء نماز لپیٹ دی۔

''یا باری تعالیٰ معاف کرنا، میرا دِل و دماغ تو کہیں اور ہی اٹکا ہوا ہے، یہ لڑکی آخر کہاں رہ گئی... ہر سُو اندھیرا پھیل گیا ہے۔'' اُن کی فکر جوں جوں بڑھ رہی تھی اتنا ہی اُن کا سانس لینا دوبھر ہورہا تھا۔

''علیزے... علیزے۔'' انہوں نے گھبرا کر علیزے کو پکارا۔

''جی امی!'' علیزے گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی وہ بھی ابھی نماز پڑھ کر ہٹی تھی۔

''علیزے! مجھے پانی پلاؤ، میرا دِل ڈوب رہا ہے۔''

''امی جی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' علیزے نے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، اُن کا ماتھا بے حد ٹھنڈا تھا انہیں باقاعدہ ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

''وہ... منزہ ابھی تک گھر نہیں لوٹی، اُس کے پارلر فون لگاؤ۔'' حُسن آرا پر جانے کس بات کی گھبراہٹ طاری تھی۔

''اچھا امی! میں ملاتی ہوں فون! لیکن پلیز خود کو سنبھالیے، بے وجہ فکرمند ہورہی ہیں، منزہ آپی کوئی چھوٹی سی بچی تھوڑا ہی ہیں، جو راستہ بھول جائیں گی۔'' علیزے نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''بچی ہی تو ہے۔ اور تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ وہ راستہ ہی تو بھٹک گئی ہے۔'' حُسن آرا بیگم نے بہت گہری بات کہی تھی۔

''تم نہیں دیکھتیں کہ وہ جس قسم کا لباس پہن کر گھر سے باہر نکلتی ہے وہ تو خود فتنہ ہے، اللہ میری نادان بچی کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا، جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے، جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہو۔'' حسن آرا بیگم نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

''اپنے ابو کا پتا کرو کہاں رہ گئے؟ ایک تو یہ شخص کبھی چھتنار نہ بن سکا، مجال ہے جو اِسے پیسے کے علاوہ کسی چیز سے سروکار ہو۔'' حُسن آرا بیگم تو پہلے سے بھری بیٹھی تھیں، اب باقاعدہ چھلک پڑی تھیں۔

''اِس گھر کے سارے ہی مرد بےحس ہیں۔'' حُسن آرا بیگم باآواز بلند بولیں۔

''کاشف بھی اللہ جانے یونی ورسٹی کا بتا کر سارا سارا دن کہاں غائب رہتا ہے۔''

''امی کیا میں بھی بےحس ہوں؟'' گڈو نے پریشانی میں پوچھا۔

اتنی پریشانی میں بھی حسن آرا اُس کی بات پر مسکرادیں۔

وہ چھوٹا سا بچہ ذمّے داری کو محسوس کرکے خود کو مردوں میں شامل کرچکا تھا اور جن کا فرض تھا وہ جانے کہاں غائب تھے۔

''کیا ہوا؟ کیا کہا پارلر والوں نے؟'' حُسن آرا نے کمرے سے باہر آتی علیزے سے بے تابی سے سوال کیا۔

''وہ تو کہہ رہے ہیں کہ تین بجے اپنی چھٹی کے وقت یہاں سے جاچکی ہے، اب تو دوسری شفٹ والی لڑکیاں پارلر میں موجود ہیں۔'' علیزے خود بھی پریشان تھی۔

''علیزے! اُس کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں کو فون کرو۔''

''امی! صرف سدرہ سے اُس کی دوستی ہے اور وہ خود گزشتہ ایک ماہ سے پارلر نہیں جارہی، اُس کا ایکسیڈنٹ جو ہوگیا تھا۔'' علیزے نے طویل سانس بھری۔

منزہ اُس کی سب سے ضدی بہن تھی، اللہ جانے وہ کہاں تھی اُس کی علیزے سے کبھی بھی نہیں بنی تھی، حقیقت میں وہ غصّے کی اِس قدر تیز تھی کہ اکثر اپنا نقصان کر بیٹھتی تھی۔ علیزے کی منگنی کے بعد علیزے سے اُس کی بول چال ختم ہوچکی تھی بلکہ گھر والوں کے ساتھ بھی اُس کا رابطہ بہت کم رہ گیا تھا۔ اکثر وہ اپنی من کی مرضی کرتی تھی۔ علیزے نے ایک نظر اپنی گھبرائی ہوئی ماں پر ڈالی اور دوسری نظر باہر پھیلتے اندھیرے پر! دونوں ہی گزرتے وقت کے ساتھ پل پل مزید تاریکی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اور علیزے یہ تو جانتی ہی نہ تھی کہ یہ اندھیرا، یہ تاریکی کہیں اور بھی کسی کی تقدیر پر جم رہی تھی۔

❖❖○❖❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے میں لمبی میز کے گرد آٹھ افراد بیٹھے تھے، سامنے پروجیکٹر پر طارق نے اِن افراد کو کچھ مواد دکھایا جو نہایت شرمناک تھا۔ کچھ پَل کی خاموشی کے بعد طارق نے اپنی پریزنٹیشن دوبارہ شروع کی۔ ڈائریکٹر صاحب آج خصوصی طور پر یہ میٹنگ اٹینڈ کرنے آئے تھے۔

’’آج کل نئے منصوبوں کے لیے نئی لڑکیاں، نئے چہرے مختلف پارلر سے حاصل کیے جارہے ہیں۔‘‘ طارق نے بے حد دُکھ سے کہا۔

’’پارلر میں عام گھروں سے لے کر اچھے گھروں تک کی لڑکیاں کپڑوں سے بے نیاز ہوجاتی ہیں! آصف آپ اپنی رپورٹ پیش کریں۔‘‘ طارق نے کہا۔

’’مارکیٹ میں یہ ویڈیو بالکل ایک نئی دلہن کی ہے ابھی چند روز پہلے وہ ایک مشہور پارلر میں دلہن پیکیج کے لیے گئی تھی، جس میں خواتین کو فل باڈی ویکس سے لے کر میک اپ وغیرہ دیا جاتا تھا اور نہایت کم ریٹ میں! جس کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں اپنے سب سے خاص دن کے لیے بے حد خاص نظر آنے کی لالچ میں وہاں دوڑی جاتی تھیں۔‘‘

’’یاسمین نجمی! اس کی عمر بیس سال ہے، ایم اے معاشیات کی طالبہ تھی، گیارہ روز پہلے اس کی شادی ہوئی، جس پارلر سے وہ تیار ہوئی انہوں نے جی بھر کر اِس کے جسم کی تصاویر اُتاریں اور یہ سب کچھ سروس روم میں، دورانِ سروس ہوا۔ جس روز اِس کا نکاح تھا اِس کی فلم اور مختلف کلپس انٹرنیٹ اور موبائل نیٹ پر دے دیے گئے۔ دولہا کو اُس کے ہی کسی دوست نے وہ تصاویر دکھائیں تو دولہا نے نکاح کے آدھے گھنٹے بعد ہی سب کے سامنے دُلہن کو طلاق دے دی۔ لڑکی کی ماں کو برین ہیمرج ہوا اور اب وہ کومے میں ہے۔ اُس کی زندگی، موت سے لڑرہی ہے، لڑکی نے اگلے دو گھنٹوں میں ہی شادی ہال کی چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ یہ ساری فیملی ایک ہی دن میں برباد ہوگئی اور سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اِن میں سے کوئی بھی اِس کیس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔‘‘ آصف نے پروجیکٹر آف کرکے لائٹس آن کردیں۔

’’اللہ جانے ان لڑکیوں کی ماؤں کی عقلوں کو کیا ہوگیا ہے وہ اپنی بچیوں کے لیے محتاط کیوں نہیں ہیں۔‘‘ امتیاز احمد نے کہا۔

وہ اُن کی ٹیم کا متحرک رکن اور بے حد اچھا صحافی بھی تھا۔ لڑکیاں ذرا سا بھی **Resist** نہیں کرتیں کہ ویکس، فیشل وغیرہ کے لیے پارلرز والوں کے گاؤن چینج روم میں جاکر پہننے کی کیا ضرورت ہے، گھر سے ہی لوز کپڑے پہن لیے جائیں تو بھی یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔‘‘ مس شازیہ نے کہا۔ یہ بھی اُن کی ٹیم کی نہایت ذہین رکن تھی اور ایک بڑی ایجنسی میں پی، آر، او کی پوسٹ پر کام کررہی تھی۔

’’ٹھیک ہے مس شازیہ! احتیاط بھی اِس مسئلے کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے لیکن کیا صرف احتیاط کافی ہے؟ اس سسٹم کو ہر صورت ختم کرنا ہوگا ورنہ کچھ محفوظ نہ رہ سکے گا۔‘‘ رانا راشد علی نے کہا۔ وہ محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اُن سب کو فرنٹ اینڈ پر مختلف جابز کرنی پڑتی تھیں، اُن کی نوکری کا پہلا اصول تھا کہ اُن کی پہچان کو نہایت خفیہ رکھا جائے گا۔

’’یہ تجربہ پہلے اسلام آباد میں ویڈیو سینٹر اور نیٹ کیفیز پر کیا گیا، خفیہ کیمرے سے تصاویر بنا کرتی ہی

لڑکیوں کی زندگیوں سے کھیلا گیا، کم از کم چار لڑکیوں نے خودکشی کی تھی۔ تین کے گھر ٹوٹے، دو کے والدین نے خودکشی کی، جن میں اعلیٰ فوجی اور سول حکام شامل تھے۔ حکومتی مداخلت پر ویڈیو سینٹرز کے کمروں کی دیواریں چھوٹی تو ہوئیں، کچھ ڈر کے مارے باز آگئے۔ مگر یہ تو کسی نے سوچا ہی نہ تھا کہ شکاری، شکار کا دوسرا راستہ بھی نکال سکتے ہیں۔‘‘ طارق نے اپنے ہاتھ میں پکڑا قلم زور سے ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا۔

’’بیوٹی پارلرز شکار کا آسان ذریعہ ثابت ہوئے۔ پہلے اپنی لڑکیاں بھجوادیں، وہ کمال بے نیازی سے یہ گاؤنز وغیرہ پہن لیتی تھیں، ان چینجنگ روم میں وہ اپنا لباس کیا بدلتی ہیں اُن کی تقدیر ہی بدل جاتی ہے! دو اینگلز سے کیمرے لگائے جاتے ہیں اور ان معصوم فرشتہ صفت حیادار لڑکیوں کے جسموں کی تصاویر بن جاتی ہیں، جن کو کبھی انسانی آنکھ نے بے لباس نہ دیکھا، اُن کی عزت پامال ہوجاتی ہے۔ یہی مناظر، شکاریوں کے لیے سب سے قیمتی ہوتے ہیں، وہ اُنھی کو دیکھ کر لڑکی کو گھیرنے کا فیصلہ کرتے پھر اِس کے گرد گھیرا یوں تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ محسوس بھی نہیں کرپاتی۔ کبھی دوستوں جیسی لڑکیوں کے ذریعے، کبھی بوائز کے ذریعے اور آخر میں اُنھی فلمز کے ذریعے! جب ایسا کیس ہوتا، لوگ شرم کے مارے چپ ہو جاتے، کس کو بتاتے اور کیا بتاتے؟

لوگ تو قانون کا دروازہ بھی کھٹکھٹانے کو تیار نہیں ہیں۔

’’سب لوگوں کا کہنا ہے کہ نہ کوئی قانون نہ ضابطہ، نہ قانون کے محافظ کوئی بھی معصوموں اور بے چاریوں کے ساتھ نہیں ٹھہرتا۔ سبھی طاقتوروں، ظالموں اور شکاریوں کے ساتھ ذاتی اور لمحاتی فائدوں کی خاطر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کچھ بک جاتے، کچھ جھک جاتے، کچھ مختلف ترغیباتی قیمت لے کر برباد ہونے والیوں کو کیس دبانے کا مشورہ دیتے ہیں۔‘‘ طارق نے اپنی بات کو ایسے جملے پر ختم کیا کہ سب کے ہی دلوں میں کوئی نہ کوئی سوال اور اُس کا حل آیا تھا۔

طارق نے اپنے سامنے پڑی منرل واٹر کی چھوٹی سی بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلا اور چند گھونٹ لیے، اِس دوران وہ اپنے خون کے چڑھاؤ کو نارمل کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

’’آپ نے اِس مسئلے کے حل کے لیے ابھی تک کیا ہوم ورک کیا ہے؟‘‘ ڈائریکٹر صاحب نے طویل سانس بھر کر سنجیدگی سے پوچھا۔

’’سر! ہم نے کچھ لوگوں کے متعلق مضبوط، ٹھوس ثبوت حاصل کرلیے ہیں، ہمیں وارنٹ اور آپ کی اجازت درکار ہے۔‘‘

ترنم نے ابھی حال ہی میں نہایت اہم ثبوت طارق کو پہنچائے تھے۔

’’تمہارے خیال میں تم درست آدمی تک پہنچ گئے ہو؟‘‘

’’کون ہے بڑی مچھلی؟‘‘ ڈائریکٹر صاحب نے سوال کیا۔

’’سر! بڑی مچھلی تک تو ہاتھ نہیں پہنچا لیکن اُن لوگوں کے نہایت اہم کارکن اور اڈوں کی انفارمیشن مل چکی ہے۔ ہمارے پاس اِن کے خلاف بے حد اہم ثبوت موجود ہیں۔‘‘ طارق آج ہر صورت ڈائریکٹر صاحب سے گرفتاری کے وارنٹ کی اجازت لے لینا چاہتا تھا۔ اس نے آج کی یہ ساری میٹنگ اور

پریزنٹیشن کا اہتمام کیا ہی اس لیے تھا کہ اُسے گرفتاری کے وارنٹ حاصل ہو جائیں۔
''تمہارا خیال ہے کہ تم اِن چند لوگوں کو پکڑ کر اُن بڑے مگرمچھوں تک رسائی حاصل کر لو گے؟''
ڈائریکٹر صاحب جس قدر خاموش طبع انسان تھے، اُسی قدر ذہین بھی تھے۔
طارق اُن کی باریک بینی اور دور اندیشی کا بے حد قائل تھا۔
''سر! ہم اگر ایک ایک کر کے بھی صفائی کا عمل شروع کر دیں تو ایک نہ ایک دن اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔'' طارق نے بے حد جذبے سے کہا۔
''کیا تمہاری یہ چھوٹی موٹی صفائی بڑے گاربج کو الرٹ نہیں کرے گی؟'' انہوں نے بے حد اہم نکتے کی جانب طارق کی توجہ دلائی۔
''سر! بے شک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ہمارے اِس آپریشن کے شروع ہونے سے وہ بوکھلا کر کئی غلطیاں اور کئی قدم اٹھائیں گے اور... اور ان کی بوکھلاہٹ ہی ہمارے لیے بہت سارے راستے کھولے گی۔'' طارق نے اُن کو کنوینس کرنے کی کوشش کی۔
''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں، بے شک تم ایک بے حد ذہین اور قابل انسان ہو لیکن اکثر تمہارا جذبہ، تمہاری ذہانت پر حاوی ہو جاتا ہے اور ینگ مین! ہمارے شعبے میں غلطی کی گنجائش نہیں نکلتی۔''
ڈائریکٹر صاحب اُسے اجازت دینے میں تامل کر رہے تھے۔
''سر! مجھے اپنی نیت پر پورا یقین ہے اور میری نیت نیک ہے، مجھے امید ہے کہ اِس آپریشن سے ہمیں کئی راستے ملیں گے۔'' طارق نے اصرار کیا۔
''سر! ہماری بہو، بیٹیاں اور بہنیں پامال ہو رہی ہیں اور اُن کی پامالی کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کو بے کار بنایا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے ملک کی آئندہ نسل کے مستقبل کا سوال ہے۔''
''ٹھیک ہے ینگ مین! میں تمہیں فی الحال چند لوگوں کی گرفتاری کے وارنٹ ایشو کروا دیتا ہوں، باقی کچھ ایسے نام ہیں، جن کے لیے تمہیں اِس سے بھی ٹھوس ثبوت درکار ہوں گے۔ اگر تم موجودہ ثبوتوں کے ساتھ اِن کو پکڑ بھی لیتے ہو تو یہ شام تک باہر ہوں گے، تمہیں مزید جدوجہد کی ضرورت ہو گی۔''
''یس سر!' طارق نے الرٹ ہو کر کہا۔
''ابھی یہ چند نام چھوڑ کر میں باقی لوگوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کروا دیتا ہوں۔'' انہوں نے اپنا چشمہ اُتار کر کہا۔
''تھینک یو سر! انشاء اللہ آپ کو مایوسی نہیں ہو گی۔'' طارق نے بے حد سچائی سے کہا۔
''گڈ لک۔'' انہوں نے کہہ کر اپنی سیٹ سے اُٹھ کر طارق کا کندھا تھپتھپایا۔
''بے شک ہمارے ہاتھ کافی حد تک بندھے ہوئے ہیں لیکن ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔ میرا تعاون ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔'' انہوں نے بھرپور یقین دلایا۔
اگر لیڈر کا دل صاف ہو تو ٹیم ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے اور خوش قسمتی سے طارق کو اپنے باس بہت اچھے ملے تھے۔
''تھینک یو سر!'' طارق کے چہرے پر بہت پُرنور مسکراہٹ دَر آئی تھی، ہدف کے لیے سفر شروع ہو ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایا تھا اور جب سفر شروع ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ راستہ کتنا بھی ہے اور منزل ملتی بھی ہے۔

❖❖ ☾ ❖❖

''کہاں تھیں تم اتنی دیر سے؟'' علیزے نے منزہ سے دروازے سے ہی پوچھا، جب کہ منزہ بے حد گم سم تھی، اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔
علیزے نے اُس کی خاموشی کو روز کی ناراضی جانا۔
''ٹھیک ہے تم مجھے نہ بتاؤ لیکن کم از کم امی کا خیال کر کے ایک فون ہی کر دیتیں۔'' علیزے نے اُس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ پہلی بار منزہ کی چال نہایت شکستہ تھی۔
''امی جی کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ انہیں ڈاکٹر کو دکھانا پڑا۔ ابھی ابھی ڈاکٹر امی کو سکون کا انجکشن دے کر گیا ہے، وہ نیند میں بھی بے حد پریشان تھیں، میں خود بے حد پریشان تھی۔'' علیزے نے اُسے کچھ احساس دلانے کی کوشش کی۔
منزہ نے مڑ کر کچھ نہ کہا وہ بے حد خاموش تھی۔
علیزے نے حیرت سے اُسے دیکھا، ورنہ تو وہ ایک جملے کے جواب میں دس جملے سنایا کرتی تھی۔
''تم ٹھیک ہو؟'' علیزے نے اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں!'' منزہ نے پہلی بار کچھ کہا تھا۔
''تمہیں فون کرنا چاہیے تھا تم کہاں تھی؟'' علیزے نے اُس سے دوبارہ پوچھا۔
''میں، میرا سر بہت دُکھ رہا ہے، کیا میں کچھ دیر آرام کر سکتی ہوں؟'' منزہ نے بے حد دھیمے لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے! کیا تمہیں کچھ کھانے کو چاہیے؟'' علیزے کا ہمدرد دل بہن کی بھوک کے لیے فکرمند ہوا۔
''ابھی نہیں!'' منزہ کہہ کر کمرے میں گھس گئی، جو اُن بہنوں کا مشترکہ کمرا تھا۔
''دیکھوں اگر امی اُٹھ گئی ہیں تو ان کو بتا دوں کہ اُن کی لاڈلی آ چکی ہے۔'' علیزے بڑبڑاتی ہوئی حسن آرا کے کمرے میں چلی گئی۔ حسن آرا بیگم انجکشن کے زیرِ اثر ابھی تک سو رہی تھیں اُن کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔
''منزہ تو گھر آ گئی ہے اور مزے سے آرام بھی کر رہی ہے، جانے امی کیوں آج اتنا گھبرا گھبرا کر منزہ کے لیے فکرمند تھیں۔'' علیزے امی کے پاس پڑی کرسی پر ڈھے نے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ گزشتہ کچھ گھنٹوں کی فکر اور پریشانی سے اُس کے اعصاب بھی تھک گئے تھے۔
''میرے ابو کا، منزہ اور کاشف کا مزاج کتنا الگ ہے، امی ہمیشہ پریشان رہتی ہیں۔ کاش اِن لوگوں کے دلوں پر پڑے بے حسی کے تالے کھل جائیں!'' علیزے نے شدّت سے دُعا کی۔

❖❖ ☾ ❖❖

سارے دن کی مشقت کے بعد طارق تھک کر چُور ہو چکا تھا لیکن اُس کے لیے یہ ذہنی اور جسمانی مشقت کبھی بھی مسئلہ نہ رہی تھی۔ وہ ہر پل، ہر وقت کام کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس نے کرسی سے سر ٹکایا ہی تھا کہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا اور جیب سے موبائل نکال کر آن کیا۔ دوران میٹنگ اُس نے فون بند کر دیا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر مسلسل کام کے دوران وہ فون آن کرنا بالکل ہی بھول گیا تھا، اب اُسے اچانک یاد آیا کہ فون مسلسل صبح سے بند پڑا ہے۔

فون آن کرتے ہی سامنے چوبیس میسج آئے ہوئے تھے، ابھی وہ اِن باکس کھول کر پیغامات پڑھنے ہی والا تھا کہ اسکرین پر ولی کا نمبر جگمگایا۔

''السلام علیکم! خیریت آج مہا کنجوس نے خود کیسے فون کرلیا؟'' طارق نے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

''تم صبح سے فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔'' جواباً ولی کی آواز بے حد سنجیدہ تھی۔

''یار بہت کانفیڈینشل میٹنگ تھی۔'' طارق نے طویل تھکن بھری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اوہ... اچھا تم فوراً سروسز ہسپتال کے کارڈیالوجی کے شعبے میں پہنچو، میری ملاقات تم سے وہیں ہوگی۔''

''خیریت ہے نا، کس کو دل دے بیٹھے جناب؟'' طارق ابھی تک شوخی سے مخاطب تھا۔

''طارق! انکل شہباز ٹھیک نہیں ہیں، تم جلدی سے پہنچو۔'' ولی نے مزید گفتگو سے پہلے رابطہ ختم کردیا۔ طارق نے جلدی سے اپنا ریوالور اور موبائل پینٹ کی جیبوں میں رکھے، ریوالور کے لیے اُسے خاص طرح کا کیس اپنے شعبے سے ملتا تھا، جس میں وہ اِسے رکھ کر کمر سے لٹکا لیتا تھا۔

''سر! آپ جا رہے ہیں؟'' اس کے ماتحت نے اُسے پیچھے سے آواز دی۔

''ہاں... جلدی بولو کوئی کام تھا۔'' طارق نے بے حد عجلت سے پوچھا۔

''نو سر! آپ کے لیے کسی مِس سحرش کی والدہ کا فون مسلسل آرہا تھا اِس کے علاوہ آپ کے گھر سے بھی بہت بار کال آئی تھیں۔ مِس سحرش کی والدہ کا فون ہسپتال سے آیا تھا اُن کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے اور وہ آپ سے بات کرنا چاہتی تھیں، وہاں کے ڈاکٹرز مسلسل آپ کو بلا رہے تھے۔'' ماتحت نے جلدی جلدی پیغام دیا۔

''کون سے ہسپتال میں؟'' طارق نے پوچھا۔

''سروسز ہسپتال کی ایمرجنسی میں۔'' ماتحت نے جواب دیا۔

''او کے!'' طارق بہت تیزی سے باہر نکلا۔

''یا اللہ میرے ابو کو خیریت سے رکھنا۔'' ایک بیٹے کے تڑپتے ہوئے دِل نے شدت سے دُعا کی۔

❖❖○❖❖

''آپ؟'' سائرہ نے پہلے حیرت سے آنی کو دیکھا پھر منہ موڑ لیا۔

''میری جان مجھے معاف کردو۔'' آنی گڑگڑائیں۔

جواباً سائرہ کو کچھ اور تو نہ سوجھا وہ ہسپتال کے کوریڈور میں بیٹھی تھی، وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ نیلوفر نے طویل سانس خارج کی۔

''شہباز! میں تم کو جیتنے نہیں دوں گی، تم نے پَل بھر میں مجھ سے میرے بچے چھین لیے۔'' نیلوفر نے آئی سی یو کے باہر کھڑے ہوکر با آواز بلند کہا۔

شیشے کے اُس پار شہباز مختلف مشینوں سے جکڑا لیٹا تھا نیلوفر مسلسل اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُسی پل نیلوفر کو لگا کہ شہباز علی نے شاید آنکھیں کھولی تھیں، وہ فوراً اندر داخل ہوئیں۔

کمرے میں دوائیوں کی بُو اور مشینوں کا مدھم شور تھا۔

نیلوفر نے اِدھر اُدھر دیکھا، کمرے میں فی الحال کوئی نرس موجود نہ تھی۔

''شہباز۔'' نیلوفر نے شہباز علی کے قریب آ کر انہیں پکارا۔

شہباز علی نے غنودگی میں آنکھیں کھولیں لیکن وہ سامنے کھڑے چہرے کو پہچان نہ پا رہے تھے۔ غنودگی سے ہر منظر دھندلا نظر آرہا تھا۔

''لیکن یہ آواز! انہوں نے کچھ سوچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے وہ ایک بار پھر غنودگی میں چلے گئے۔''

''تم... تم نے مجھ سے سائرہ اور طارق کو جدا کیا۔ تم نے پہلے میری انسلٹ کی اور میرے پیار کو ٹھکرایا اور پھر سارہ سے شادی رچا کر میری مزید بے عزتی کی... تم نے میری جوانی، میری زندگی روگی کر کے تباہ کر ڈالی۔''

''تم... تم تو میرے بہت قصور وار ہو، میں نے تم دونوں کو ایک ساتھ رہنے نہ دیا۔ تم نے اگر مجھ سے سب کچھ چھینا تھا تو میں نے بھی تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا...''

''تمہارا سکون، خوشی، گھر بار، بیوی اور بچے..... یہاں تک تو حساب برابر تھا۔ لیکن اب تم پر زیادہ حساب نکلتا ہے! تم جانتے تھے کہ یہ بچے میری کمزوری، میری زندگی بن چکے تھے، تم نے میری زندگی چھین لی۔ تم نے سائرہ اور طارق کو چھین لیا۔'' وہ جنونی ہورہی تھیں۔

''اب میں تم سے تمہاری زندگی چھین لوں گی اور تم کچھ کر بھی نہ سکو گے۔'' وہ ہذیانی لہجے میں ہنسیں، پھر نیلوفر بیگم نے ہاتھ بڑھا کر سامنے دیوار پر موجود آکسیجن سسٹم کا بٹن آف کردیا۔

اگلے ہی لمحے شہباز علی کا جسم جھٹکوں کی زد میں تھا۔ لمحہ لمحہ اُن کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔

❖❖○❖❖

''ہیلو!''

''جی... جی میں طارق بول رہا ہوں۔'' طارق ہسپتال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

''آنٹی پلیز ابھی میں نہیں آسکتا، میرے فادر آئی سی یو میں ہیں اور میں اُن سے ہی ملنے جارہا ہوں۔'' طارق نے زچ ہوکر کہا، یہ اُسے مسلسل آٹھواں فون تھا۔

''بیٹا وہ ڈیتھ بیڈ پر ہے اور اُس کے لبوں پر صرف تمہارا نام ہے وہ جب جب ہوش میں آتی ہے صرف تمہارا نام لیتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اُس کی سانسیں تمہارے ہی لیے اٹکی ہیں۔''

''پلیز طارق! میں تانیا کی پڑوسن ہی نہیں اُس کی بہت پرانی دوست ہوں، وہ میرے لیے میری بیٹیوں کی طرح ہے، پلیز ایک مرتے ہوئے انسان کی بات سُن لو، جانے وہ تمہارے لیے کیوں اتنی بے چین ہے۔'' اجنبی عورت جس نے مرینا کے نام سے تعارف کروایا تھا، مسلسل منتیں کر رہی تھی۔

''بائی گاڈ'' طارق نے تنگ آ کر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آنٹی! لسن! مائی فادرز لائف از ان ڈینجر اینڈ ہی نیڈز می! میں فوراً نہیں آ سکتا۔'' طارق نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ تیزی سے آئی سی یو کی جانب بڑھ رہا تھا۔ موبائل پھر بجا، یہ مرینا آنٹی ہی کا فون تھا۔

''اوہ نو!'' طارق نے گہری سانس لے کر فون اُٹھایا۔

''طارق۔''

''پلیز دوڑ کر آ ؤ!'' وہ رو رہی تھیں ان کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا، جس کی وجہ سے طارق کو اپنے قدم ایمرجنسی کی جانب موڑنے پڑے۔

طارق۔ پھولے سانسوں کے اندر داخل ہوا، مسز تانیا کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

''طا...طارق...طارق!''

''طارق کو بلاؤ...'' وہ پھٹی پھٹی آواز میں بول رہی تھیں، ایسے جیسے اُن کے گلے پر چھری پھر رہی ہو۔

''وہ دیکھو... یہ ہی طارق ہے نا۔'' مرینا آنٹی نے مسز تانیا کو بتایا۔

''طا...طارق'' مسز تانیا کے تکلیف زدہ چہرے پر ایک دم بے حد سکون اُتر آیا تھا۔

''طارق!'' اُن کی اکھڑتی ہوئی سانسیں کچھ دیر کو یوں پُرسکون ہو گئیں، جیسے طارق کے وجود سے اُن کو آکسیجن مل رہی ہو۔

''جی... جی آنٹی!'' طارق کو اِس ساری صورتِ حال میں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مسز تانیا اُس کے لیے اِس قدر بے چین کیوں تھیں۔

''تم میری سحرش سے شادی کر لو گے؟'' مرتی ہوئی عورت نے عجیب وغریب فرمائش کی۔

''واٹ؟''

''لیکن آنٹی! میں! طارق اُن کی فرمائش پر بوکھلا گیا تھا۔

''طارق! میں... میں مر رہی ہوں، میرا سارا خاندان ختم ہو گیا، میری سحرش اِس بھیڑیوں کی دنیا میں اکیلی رہ جائے گی!'' مسز تانیا کا تنفس ایک بار پھر بے ترتیب ہو گیا تھا۔

''تانیا کا بیٹا، بھائی اور بھابی اِس حادثے میں آن دی اسپاٹ فوت ہو گئے ہیں بیٹا!'' مرینا آنٹی نے دِل دہلا دینے والی خبر دی۔

''یہ سب ایئرپورٹ سے واپس آ رہے تھے، تانیا کا بڑا بیٹا ماں سے ملنے آیا تھا۔ چھوٹا بیٹا! وہ بھی ابھی دس منٹ پہلے دم توڑ گیا ہے۔'' مرینا آنٹی نے روتے ہوئے بتایا۔

''اوہ! میرے اللہ!'' طارق کا دل دُکھ سے بھر گیا۔ گزشتہ سال سے وہ ریگولر سحرش سے ملنے جا رہا تھا اِس لیے وہ سب ہی سے واقف تھا۔ اِس گھر کو تو نظر ہی لگ گئی تھی پہلے باپ، پھر دادی اب سب سب ختم ہو گئے تھے۔ اور وہ مظلوم لڑکی جو نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں! وہ دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔

''طارق تم سحرش کو اپنا لو گے نا!''

''میں... میں تمہارے سوا کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔'' مسز تانیا کی سانس ایک بار پھر اُکھڑنے لگی۔

''اُسے اِس دنیا میں، بھیڑیوں میں، تنہا نہ چھوڑنا!''

''طا... طارق... وعدہ کرو!'' اُن کی آنکھیں تکلیف سے پھیل رہی تھیں۔

طارق نے زندگی میں بہت سے فیصلے فوراً کیے تھے۔ اکثر دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ حکمت عملی آن دا اسپاٹ تیار کرتا تھا۔ لیکن آج تک اُسے اِس قدر دُشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

مسز تانیا کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں، مگر شاید طارق کا جواب سنے بغیر سکون حاصل نہیں کر سکتی تھیں، اِسی لیے وہ موت سے لڑ رہی تھیں، لیکن... لیکن یہ کس قدر تکلیف دہ تھا نا!

''طا...رق!''

''سحرش!''

''وعدہ کرو!''

''شا...دی!'' طارق کے سامنے نگینہ کا چہرہ لہرایا لیکن اِس چہرے کو دو منت بھری نگاہوں نے دھندلا دیا۔

''آنٹی میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں سحرش سے شادی کروں گا۔'' طارق کو اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

''ہا...'' مسز تانیہ کا سانس اور چہرہ ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ وہ شاید تھوڑا سا مسکرائی بھی تھیں اُن کی آنکھیں مسلسل طارق کو دیکھ رہی تھیں۔

''آنٹی!'' طارق کو کچھ مختلف سا احساس ہوا تو اُس نے مسز تانیہ کو پکارا، لیکن وہ اپنے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ جس وعدے کے لیے وہ کتنی دیر سے موت سے لڑ رہی تھیں وہ پورا ہوتے ہی وہ ایک دم سے سدا کے لیے پُرسکون ہو گئی تھیں۔

''بیٹا طارق! وہ جا چکی ہے!'' آنٹی مرینا نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میرے خدایا!'' طارق کا دِل دُکھ اور کسی اَن جانے سے بوجھ تلے دب گیا۔

''تانیہ دوپہر سے تمہیں یاد کر رہی تھی اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ مزید جی نہ سکے گی... یہ ہیں کچھ کاغذات جو اُس نے مجھے تمہیں دینے کے لیے دیے تھے۔'' نرس مسز تانیا کی ڈیڈ باڈی پر چادر ڈال کر دو آیاؤں کے ساتھ مل کر لے جا چکی تو مرینا آنٹی نے کاغذ اُس کے حوالے کر دیے۔ ساتھ میں مسز تانیا کا پرس بھی تھا۔

''یہ... یہ سب کیا ہے؟'' طارق کا ذہن باقاعدہ ماؤف ہونے لگا تھا۔

''کاغذ تو دوپہر تانیا کا وکیل اُس کے کہلوانے پر دے کر گیا تھا، جب کہ یہ پرس اُس نے خود مجھے تمہیں دینے کو کہا تھا اِس میں گھر، لاکرز وغیرہ کی چابیاں ہیں۔'' مرینا آنٹی نے ایک دم سے ساری ذمے داری اُس پر لاد دی۔

''لیکن یہ سب آپ مجھے کیوں دے رہی ہیں؟'' طارق نے پریشانی سے کہا۔

''تم شاید ابھی مرحومہ سے کیا وعدہ بھول رہے ہو!'' مرینا آنٹی نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔

''تم پر ہی اُس کا اعتبار تھا ورنہ کچھ دُور کے رشتے دار تو نکل ہی آتے سحرش کی ذمّے داری اُٹھانے کے لیے...''

''اب سحرش اور جائیداد دونوں تمہارے ہیں تم مرحومہ سے کیا وعدہ پورا کرو... اور ہاں اب اُن سب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی تدفین کی ذمے داری بھی اُٹھانی ہوگی، پیچھے اُس معصوم بچی کے علاوہ کوئی نہیں بچا۔'' مرینا آنٹی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

طارق کو ایک دم اپنا وجود بھاری زنجیروں میں بندھا ہوا محسوس ہوا۔

''میرے اللہ! یہ میں کہاں پھنس گیا؟ کسی کا اندھا اعتبار اُس پر کیسی تاعمر کی ذمّے داری ڈال گیا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے آئندہ اِس ذمے داری کو اٹھانا ہی تھا۔''

❖❖○❖❖

''امی! منزہ، علیزے...'' کاشف غصّے سے تھر تھر کانپتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا ہے آخر تمہیں...کیوں چلا رہے ہو، آہستہ بات کرو امی کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔'' علیزے نے باہر نکل کر ناگواری سے پوچھا۔

''منزہ!'' کاشف نے چیخ کر اُسے آواز دی، اس نے علیزے کی کسی بات پر دھیان نہ دیا۔

''کیا مصیبت آ گئی؟ تمہیں کہا نا کہ دھیرے بولو، امی اُٹھ جائیں گی۔'' علیزے نے بھی کچھ بلند آواز میں کہا، کاشف نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے اُسے گھورا تو وہ ایک دم سہم گئی۔

''منزہ!'' کاشف کی آواز غصّے سے پھٹ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' منزہ نے کمرے سے باہر نکل کر دھیرے سے پوچھا۔ علیزے نے حیرت سے منزہ کو دیکھا۔ یہ آج، شعلہ کیسے بجھ گیا؟

لیکن اِس سے پہلے کہ منزہ کو کاشف اُس کی کسی بات کا جواب دیتا یا پھر علیزے کی کچھ حیرت ختم ہوتی۔ کاشف نے اپنی جیکٹ سے کوئی چیز باہر نکالی۔

اگلے ہی پل سارا گھر چیخوں سے گونج اُٹھا۔ کاشف نے پستول منزہ کی جانب تان کر مسلسل گولیاں چلائیں۔

سامنے منزہ کا وجود خون سے لت پت پڑا تھا، علیزے کی چیخیں سُن کر حُسن آرا بیگم اور گڈو باہر آئے لیکن حُسن آرا بیگم باہر کا منظر دیکھ کر لہرا کر گر گئیں۔

منزہ!

منزہ! علیزے اُس کا سر گود میں رکھے پکار رہی تھی، جب کہ منزہ کا سانس دھیرے دھیرے اُکھڑ رہا تھا۔

''کوئی... کوئی ہے؟

''کوئی ہے جو میری بہن کو بچالے۔'' علیزے نے سر اُٹھا کر آواز دی۔

کاشف فائرنگ کر کے فوراً بھاگ گیا تھا، جب کہ چھوٹا سا بچہ گڈو صدمے سے سُن ماں اور بہنوں کی حالت دیکھ رہا تھا۔

ایسے میں علیزے خود ہی فون کی جانب بھاگی ریسکیو ون کا نمبر ملا کر اُس نے اپنے گھر کا ایڈریس لکھوایا۔ وہ دوڑ کر پھر منزہ کے پاس آئی، منزہ کے گرد اِس قدر خون بکھرا ہوا تھا، جیسے بکرا ذبح کیا گیا ہو علیزے کو تو اپنی بے ہوش ماں بھی نظر نہ آئی تھی، محلے کی کچھ خواتین دوڑتی ہوئی گھر کے کھلے دروازے

سے اندر بھاگی آئیں۔

''کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' ہمسایوں نے پوچھا۔

وہاں کوئی جواب دینے والا بھی نہ تھا۔

''میری بہن، ہائے میری بہن!''

علیزے منزہ کا سر گود میں رکھے سِسک رہی تھی، جب کہ گڈو ساکت کھڑا منزہ اور اِس کے گرد پھیلے خون کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھی زندگی لانگ جمپ مار کر بہت سا فاصلہ ایک دم طے کر لیتی ہے، ایسے میں اگر یہ لانگ جمپ انسان کی اپنی خواہش پر مارا گیا ہو تو اُسے یوں لگتا ہے، جیسے اُس کی ایک دم لاٹری نکل آئی اور اگر یہ لانگ جمپ اُس کی خواہشوں کے برعکس ہو تو وہ بلاوجہ تھکن کا شکار ہو کر ہانپنے لگتا ہے!

طارق کو بھی اپنا وجود ایک دَم بہت بڑے بوجھ تلے محسوس ہو رہا تھا۔

چار لاشوں کو کندھا دینا اور اُن کا وارث بننا کتنا مشکل تھا، کوئی اُس سے پوچھتا۔ ایک زندہ لاش ابھی گھر میں منتظر تھی، جس کے ساتھ اُسے اپنی زندگی منسلک کرنی تھی۔

''کیا وہ ساری عمر ایک زندہ لاش کا جنازہ اُٹھا سکے گا؟'' یہ سوال اُس کا سانس لینا دوبھر کر رہا تھا۔

''یا میرے اللہ، میں کیا کروں؟'' طارق نے بے اختیار اُس بڑی ذات کو پکارا۔

جب تک انسان اپنی پریشانیوں کا بوجھ خود اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور خود اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایک ایسی گنجلک حالت میں پھنس جاتا ہے، جہاں سے نکلنا اور راستہ پانا اکثر ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِس لیے ہر سمجھ دار مسلمان بڑے بوجھ خود نہیں اُٹھاتا۔ جب یہ بوجھ وہ بڑی ذات کو دے دیتا ہے تو اللہ اُس کا کبھی مان ٹوٹنے نہیں دیتا اور اُس کو ہر مشکل سے یوں نکالتا ہے، جیسے دودھ میں سے بال! طارق کا دِل جب اِس بے پناہ بوجھ کو نہ سہار سکا تو اُس نے بے اختیار اپنے ربّ کو پکارا۔

''اے میرے اللہ میری مدد فرما!'' طارق نے بے حد سچے دل سے دُعا کی تھی۔

''آنٹی! آپ ایک فیور کریں۔ یہ پانچوں ڈیڈ باڈیز میرے ماتحت لے کر آتے ہیں، آپ پلیز سحرش کے پاس جائیے وہ بے شک بے خبر ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ انسان میں اُمید باقی ہوتی ہے کہ وہ کب ہوش میں واپس آ جائے... آپ اُسے جا کر سب کچھ بتائیے! ہوسکتا ہے جیسے ایک بہت بڑے دُکھ بھرے حادثے نے اُس کی ہر طرح کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔ شاید ایک اور بڑا دُکھ اُس کے سوئے ہوئے احساسات کو جگا دے۔'' طارق نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''طارق!'' مرینہ آنٹی نے جاتے جاتے رُک کر اُسے پکارا۔

''جی آنٹی!''

''تم سے مل کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ کیوں تانیہ کو اِس بھری دنیا میں صرف تم پہ اعتبار تھا۔ تم واقعی بہت اچھے ہو!'' مرینہ آنٹی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اور تم یقین مانو کہ اچھے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے، تمہاری یہ نیکی کبھی رائیگا نہیں جائے گی۔'' مرینہ آنٹی نے نم آنکھوں کے ساتھ اُسے دُعا دی۔

''آنٹی! میں اپنے ابو کی خیریت پتا کر کے آتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد گھر پہنچ جاؤں گا۔ اتنی دیر میں میرا ماتحت سب بندوبست کروا دے گا۔'' طارق انہیں تسلی دے کر تیزی سے آئی سی یو کی طرف بھاگا۔ پہلے ہی اُسے بہت دیر ہو چکی تھی۔

❖❖○❖❖

''سچے دل سے دی ہوئی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے اور ... اور سچے دِل سے کی ہوئی نیکی کا اجر ضرور ملتا ہے۔''

''اللہ دعاؤں اور نیکیوں کا اجر کبھی اپنے پاس نہیں رکھتا، کیوں کہ وہ کبھی لیتا نہیں، صرف دیتا ہے!''

عبدالولی چائے کے دو کپ لیے جب آئی سی یو کے باہر بنے ویٹنگ روم میں آیا تو سائرہ وہاں نہ تھی۔

''کہاں چلی گئی؟'' عبدالولی نے سوچا۔

''شاید انکل کو دیکھنے چلی گئی ہے، وہ سوچتا ہوا آئی سی یو کی جانب اندر چل دیا۔ عبدالولی جانتا تھا کہ اندر کھانے پینے کی اشیا لانا سختی سے منع ہے لیکن پھر بھی وہ اندر چلا گیا۔ اُسے کوئی طاقت اندر کی جانب کھینچ رہی تھی۔

وہ بے حد تیزی سے شیشے کے بنے دروازے کی جانب بڑھا اور انکل شہباز کو دیکھنے کے لیے جیسے ہی اُس نے کھڑکی، کی طرح بنے ٹرانسپیرنٹ شیشے سے جھانکا، اُس کے ہاتھوں سے چائے کے ڈسپوزیبل کپ گر گئے۔

گرم چائے کے چھینٹوں نے اُس کے ہاتھ اور پاؤں جلا دیے تھے لیکن وہ اِن کی پروا کیے بغیر تیزی سے دروازہ دھکیلتا اندر داخل ہوا۔

''یہ کیا کیا آپ نے؟'' ولی نے غصّے سے پھنکارتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا وہ آکسیجن کا بٹن تلاش کر رہا تھا، جو چند سیکنڈ میں اُسے نظر آ گیا۔

اُس نے انکل شہباز کے جھٹکے کھاتے جسم کو بے حد فکر مندی سے دیکھا۔ بٹن آن کر کے اُس نے جلدی سے اُن کا آکسیجن ماسک اُن کے منہ پر دوبارہ لگایا۔ اِس ساری کارروائی کے دوران وہ ڈاکٹرز روم کا ایمرجنسی کال کا بٹن دبانا نہ بھولا تھا۔

انکل شہباز کا تنفس ابھی بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

''اگر انکل کو کچھ ہو گیا تو آنی آپ کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔'' ولی نے تیزی سے باہر کی طرف جاتی نیلوفر کا بازو پکڑ کر کہا۔

''اور آپ کہیں نہیں جا رہیں! ہاں دُعا کریں کہ انکل کو کچھ نہ ہو ورنہ آپ کا اتنا بڑا نقصان ہوگا کہ اگر آپ ایک اور زندگی مانگ کر بھی لائیں گی تو کبھی پورا نہ ہوگا۔'' ولی کی آنکھیں غصّے کی شدت سے سُرخ ہو رہی تھیں۔

اُسی پَل ڈاکٹر اور نرسیں بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور انہیں باہر بھیج دیا۔ ولی نیلوفر کا بازو پکڑے

پکڑے باہر آیا۔

''چھوڑو مجھے!'' وہ غرائیں۔

''ان کو کیوں پکڑے کھڑے ہو؟'' طارق پھولی سانسوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ آنی کو دیکھ کر اُس کے ماتھے پر ناگوار بَل پڑ گئے تھے۔

''انہوں نے آج اپنے مرتبے سے اُتر کر اِس قدر گھناؤنی حرکت کی ہے کہ میرے لیے اپنی ہی آنکھوں سے دیکھے سچ پر یقین کرنا دُشوار ہو گیا ہے۔'' ولی نے ایک جھٹکے سے نیلوفر کا بازو چھوڑتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا؟'' طارق نے پریشانی سے پوچھا۔

''اِن محترمہ نے اندر جا کر انکل کا آکسیجن ماسک اُتار کر پیچھے سے سسٹم بھی بند کر دیا اور وہاں کھڑی انکل کی اکھڑتی سانسوں پر قہقہے لگا رہی تھیں۔''

''ڈِس گسٹنگ!''

''میں... میں یقین نہیں کر پا رہا کہ واقعی کوئی اِس حد تک خطرناک ہو سکتا ہے! اِس حد تک گر سکتا ہے!'' ولی کی آواز میں غصّہ اور حیرت دونوں موجود تھیں۔

طارق کی آنکھوں میں آنی کے لیے پہلے اجنبیت رہتی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پہلی بار سلگی تھیں۔

''آپ... آپ کوئی تو گہرائی رہنے دیتیں، جس میں آپ نہ گرتیں... اتنا... اتنا گر سکتی ہیں آپ؟'' طارق نے نفرت سے کہا۔

''اور کتنا گریں گی؟'' طارق کا لہجہ جھلسا ہوا تھا۔

''طارق جانو وہ... وہ کم بخت مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر لے گیا۔'' آنی حواسوں میں نہ تھیں۔

''آنی!''

''بس کریں!'' طارق نے غصّے سے کہا۔

''آئی ایم سوری ولی صاحب! آپ کے مریض کی حالت بے حد نازک ہے، ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مریض کا لائف سپورٹنگ سسٹم اچانک کیسے بند ہو گیا۔'' ڈاکٹر نے پریشانی سے کہا۔

''بہر حال زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، آپ دعا کریں کہ اللہ کوئی معجزہ کر دے۔'' ڈاکٹر نے بے حد سچائی سے نہایت سفاک حقیقت سے آگاہ کیا۔

طارق کی آنکھیں دُکھ سے لبریز ہو گئیں۔ اُس نے بے اختیار اپنا موبائل نکالا۔

''جی بٹ صاحب! جی بالکل ٹھیک ہوں!''

''آپ پلیز اپنے کسی ایس ایچ او کو بھیجیں ایک گرفتاری کروانی ہے۔ ملزمہ نیلوفر بیگم، ڈاکٹر شہباز علی پر قاتلانہ حملہ کرتے ہوئے عین موقع پر پکڑی گئی ہیں اور ڈاکٹر شہباز علی کی حالت بے حد نازک ہے۔''

''جی فوراً۔''

''جی...''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی ہاں! میری اُن سے رشتے داری ہے!''

''ڈاکٹر شہباز علی میرے والد ہیں۔'' طارق کا لہجہ بے حد دُکھی ہو گیا تھا۔

عبدالولی نے حیرت سے طارق کا چہرہ دیکھا۔

''طارق یہ... یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' آنی نے بے حد پریشانی سے پوچھا۔

''گناہ گار کو سزا ہی ملتی ہے انعام تو نہیں ملتا نا؟'' طارق نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر آنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''طارق! میں تمہاری خالہ ہوں! تم ... تم کیسے مجھے پولیس کے حوالے کر سکتے ہو؟'' نیلوفر بیگم نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہونہہ!'' طارق نے چہرہ موڑ لیا۔

''طارق...'' وہ چلائیں۔

''مِس نیلوفر بیگم! میرے باپ پر قاتلانہ حملے کرتے وقت آپ کو اپنے کسی رشتے کا خیال آیا تھا؟''

''آپ تو عادی مجرم ہیں اور خطرناک مجرموں کو کھلے رکھنا نہایت حماقت ہے!'' طارق نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔

''میں دیکھتی ہوں کس کی جرأت ہے کہ مجھے گرفتار کرے۔'' نیلوفر نے وہاں سے جانے کی کوشش کی۔

''اوں۔ ہوں!'' طارق نے نرمی سے اُن کا بازو پکڑ کر انہیں روکا۔

''آپ یہاں سے اب کہیں نہیں جا سکتیں۔'' طارق کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

''طارق! میں نے اِن ہاتھوں سے تمہیں نوالے کھلا کھلا کر بڑا کیا ہے، تم اِن ہاتھوں میں کیسے ہتھ کڑیاں ڈلوا سکتے ہو؟'' آنی نے احسان جتایا۔

''آنی! اگر آپ کے نوالے یاد نہ رہتے، بے شک وہ آپ نے ہمارے ساتھ ایک گیم کھیلا تھا لیکن پھر بھی آپ کے نوالے یاد ہیں تو میں اپنے باپ کے مجرم سے اِس قدر فاصلے پر کھڑا ہوں۔ آپ کی محبت چاہے جھوٹی ہی تھی، وہ میرے دِل کو بے بس کیے ہوئے ہے۔'' طارق نے دِل ہی دِل میں کہا۔

''لالہ... ابو!'' سائرہ باہر سے ابھی آئی تھی، آتے ہی بھائی کے گلے لگ گئی۔

''انشاء اللہ ہمارے ابو ٹھیک ہو جائیں گے۔'' طارق نے اُس سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' سائرہ نے آنی کو وومین پولیس کی حراست میں باہر جاتے دیکھ کر سہم کر پوچھا۔

''سزا کا عمل شروع ہو چکا ہے! اگر اللہ پاک چاہتے ہیں کہ اِن کو سزا ملے تو انہیں سزا مل جائے گی اور اگر انہیں معافی ملنی ہوئی تو معافی مل جائے گی... ہماری زیادتیوں کا فیصلہ اللہ پاک کریں گے۔'' طارق سائرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے آئی سی یو کے دروازے کے پاس لے آیا۔

اندر اُن کا باپ زندگی موت سے لڑ رہا تھا۔

''اگر موت جیت گئی تو؟''

طارق کا دل ایک دم کسی چھوٹے بچے کی طرح سہم گیا تھا۔ لاکھ وہ روز موت کا کھیل دیکھتا تھا لیکن پرائے کی موت اور اپنے کی موت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے جب کوئی اپنا مرتا ہے تو اپنے دِل کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی ایک حصہ مر جاتا ہے کیوں کہ اپنے گھروں میں نہیں دلوں میں رہتے ہیں اُن کے جانے سے دل کا وہ حصہ قبرستان بن جاتا ہے۔

''یا اللہ! اگر میں نے زندگی میں کوئی نیکی کی ہے تو پلیز میرے ابو کو صحت تندرستی کے ساتھ زندگی عطا فرما۔'' طارق نے آنکھیں بند کر کے بے حد دھیان سے دُعا کی اور دعا کی قبولیت کی شرط تو ہے ہی، پوری لگن اور دِل و دماغ کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ ہی دعا کو مقبول کرواتی ہے۔

''حیرت ہے ان کی پلس اور بی پی ایک دم کیسے نارمل ہو گیا؟'' دو جونیئر ڈاکٹر شیشے کے دروازے کو دھکیل کر باہر آئے تو اُن میں سے ایک بولا۔

''ڈاکٹر!'' سائرہ نے پیچھے سے بلایا۔

''کیسے ہیں میرے فادر؟'' سائرہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''یہ اگر معجزہ کہا جائے تو ٹھیک رہے گا۔''

''ہم تو مریض کے پاس کھڑے تھے کہ چند منٹ بعد یہ مر جائے گا۔ بڑے ڈاکٹر صاحب نے ہمیں فوراً یہ ٹیکہ لگانے کو کہا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی، وہ پندرہ منٹ سے بالکل نارمل ہیں۔'' ڈاکٹر بتاتے ہوئے خود بھی حیران تھے۔

''سچ!'' طارق نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''جی بالکل!'' ڈاکٹر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

طارق کے کانوں میں کہیں دُور سے ایک گونج سنائی دی تھی۔

''تمہاری یہ نیکی کبھی رائیگا نہیں جائے گی۔''

طارق کا دِل ایک اَن جانے بوجھ تلے تھا۔ بے حد اُداس اور پریشان یوں کہ ان جانے جی سے وہ کوئی نیکی کیسے لے سکتا تھا۔ لیکن اپنے باپ کی زندگی کے ساتھ معجزہ دیکھ کر اُس کا دِل بے حد پُرسکون ہو گیا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہو۔ شہباز صاحب کو دیکھ کر جب وہ باہر نکلا تو سیدھا عبدالولی کے پاس آیا۔

''ولی! میرے ابو اب بالکل ٹھیک ہیں۔'' خوشی سے اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''تمہیں اُن کی نئی زندگی بہت بہت مبارک ہو!'' ولی نے اُس کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

''ولی! اللہ نے مجھے جس نیکی کے کام کا ایڈوانس میں یہ اجر دے دیا ہے۔ میں وہ ادھورا کام پورا کرنے جا رہا ہوں تم شام تک ابو کے پاس رُک سکتے ہو؟ تا کہ ادھورا کام ادھوری نیکی نہ رہے۔ مکمل ہو جائے۔''

''کیوں نہیں! لیکن یہ تم کس نیکی کی بات کر رہے ہو؟'' ولی اُس کی مبہم گفتگو سے کچھ اندازہ نہ کر پا رہا تھا۔

طارق کچھ بتاتے بتاتے رُک سا گیا۔ نگی سے اُس کا دِل زندگی بھر دست بردار نہ ہو سکتا تھا۔

ولی کو سحرش کے راز میں شامل کرتے کرتے وہ ایک دم سے رُک گیا۔ ولی، نگی کا بھائی تھا اور بے شک وہ طارق کا بہترین دوست بھی تھا لیکن اُسے اِس راز میں بالکل شامل نہ کیا جا سکتا تھا۔

''میرے پیارے دوست! نیکیوں کے ساتھ ایک شرط لازم ہوتی ہے کہ اُن کی تشہیر سے اُن کے اجر میں کمی کا خطرہ ہوتا ہے۔ سوری! میں تم سے فی الحال کچھ شیئر نہیں کر سکتا۔'' طارق نے معذرت کی۔

''اٹس او کے یار! تم تو پریشان ہو گئے ہو۔'' ولی نے اُسے باقاعدہ تسلی دی کیوں کہ طارق کا چہرہ کچھ پریشان ہو چکا تھا۔

''تھینکس! اچھے دوست واقعی نعمت ہوتے ہیں۔'' طارق ولی سے مل کر تیزی سے باہر نکلا، اُس کا رُخ اُس گھر کی جانب تھا، جہاں ایک طرح کی قیامت برپا ہو چکی تھی جہاں ایک تنہا اور خود سے بے گانہ لڑکی رہتی تھی۔

جو اُس کے سہارے اور نام کی منتظر تھی۔

❖❖○❖❖

''یہ... یہ سب کیا ہو گیا؟''

علیزے نے سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ بہت دیر سے اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کام نہیں کر رہی تھی لیکن جوں جوں کچھ وقت گزرا تو پہلا احساس بہت بڑے نقصان کا تھا اور پہلا سوال بے یقینی کا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا؟

وہ پرائیویٹ روم کی سیٹی پر پاؤں اونچے کیے بیٹھی تھی۔

''اِس روم میں حُسن آرا کو شفٹ کیا گیا تھا انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا بروقت طبی امداد ملنے سے اب وہ خطرے سے باہر تھیں لیکن دواؤں کے زیر اثر تھیں۔ گڈو کو بھی سکون آور انجکشن دیے گئے تھے، وہ بھی بچوں کے وارڈ میں عارضی طور پر داخل تھا۔ اور... اور منزہ؟

منزہ پر آ کر اُس کا دِل بُری طرح ڈوبا تھا۔

''کیا وہ چاند چہرہ لڑکی، جو زندگی سے بہت کچھ پانا چاہتی تھی کیا... کیا وہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی؟'' یہ ایسا سوال تھا، جو وہ ابھی پانچ منٹ پہلے ہی آئی سی یو سے لے کر آئی تھی۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور تیزی سے دوبارہ آئی سی یو کی جانب بڑھی۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے وہ کبھی گڈو، کبھی امی اور کبھی منزہ کے پاس مسلسل چکر کاٹ رہی تھی۔

آئی سی یو کے باہر شیشے سے سر ٹکائے وہ مسلسل رو رہی تھی، گزرا سارا بچپن اُس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ منزہ بہت زیادہ حسین بچی تھی اور بے حد ضدی بھی، ہر اچھی چیز کے لیے وہ مچل جاتی تھی اور تب تک چین سے نہ بیٹھتی اور نہ بیٹھنے دیتی تھی، جب تک وہ اپنی مطلوبہ چیز حاصل نہ کر لیتی یونہی لڑتے جھگڑتے دن تیزی سے گزر گئے تھے، کچھ عرصے قبل جب علیزے کی منگنی ولی سے ہوئی تھی وہ جو پہلے ہی وقت خفا رہتی تھی اب گھر والوں سے اور اُن کی زندگی سے مزید کٹ کر رہ گئی تھی۔

اور اب کیا وہ ہمیشہ کے لیے اُن سے کٹنے جا رہی تھی؟

تم کتنا لڑتی تھیں کتنا زیادہ تنگ کرتی تھیں لیکن میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ تم یوں ریت کی طرح ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاؤ گی۔

''منزہ۔ پلیز کم بیک!''

''میری پیاری بہنا پلیز ٹھیک ہو جاؤ اور واپس آ جاؤ۔''علیز ے نے با آواز بلند کہا۔

لیکن منزہ کی سانسیں مزید مدھم دیکھ کر وہ بے بسی سے سسک پڑی۔

''منزہ میری بچی!''علیز ے کو اپنی پشت پر ابو کی فکر بھری آواز سنائی دی۔

''ابو جی...''علیز ے کسی اپنے کو دیکھ کر سارے ضبط ایک بار پھر کھو چکی تھی وہ ابو کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''یہ سب کیسے ہوا؟ میں گھر آیا تو محلے داروں نے بتایا، تم نے مجھے کیوں نہیں انفارم کیا؟''انور میاں نے آتے ہی علیز ے پر ناراضی کا اظہار کیا۔علیز ے جواب دیے بغیر مسلسل سسکتی رہی۔

''تم نے اپنی خالہ اور خالو کو بھی انفارم نہیں کیا؟''انور میاں نے غصّے سے پوچھا۔

''مجھے کسی شخص کا خیال نہیں آیا سوائے اس کے کہ میری بہن، ماں اور بھائی کی زندگی بچ جائے۔''علیز ے نے سچائی بتائی۔

''تو اِس ہسپتال کا خرچا کون اُٹھائے گا؟''انور میاں کو بیٹی کی زندگی کی اتنی پروا نہ تھی، جتنی خرچوں کی فکر تھی۔

''میں لماری سے پچیس ہزار روپے لے آئی تھی، جس میں سے آٹھ ہزار بچ گئے ہیں۔''

''اگر منزہ کی بلیڈنگ رک جاتی ہے! انٹرنل بلڈنگ۔تو پھر وہ فوراً میجر آپریشن کریں گے، جس کے لیے بیس ہزار فوراً جمع کروانے ہوں گے۔دوائیاں خود لانی ہوں گی۔''علیز ے کی باتیں سُن کر انور میاں کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

''ت...تم میرے پیسے بھی لے آئیں؟''انور میاں کا دِل چاہ رہا تھا کہ علیز ے کے منہ پر کس کر تھپڑ لگائیں۔

''بجائے اس کے کہ تم اپنے خالو کو فون کرتیں کہ آ کر وہ سب کچھ سنبھالیں، تم...تم نے گھر کی جمع پونجی بھی خرچ کر ڈالی۔''علیز ے کو اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی کہ وہ ایسے بے ضمیر باپ کی بیٹی ہے۔

''یہ پیسے بھی تو خالو کے دیے ہوئے پیسوں میں ہی سے تھے۔''علیز ے نے چبا چبا کر کہا۔

پیسہ پیسہ۔اور صرف پیسہ!

بس کریں ابو۔بس کریں!

میری بہن مر رہی ہے!

''میری ماں کی زندگی خطرے میں ہے اور میرا بھائی...وہ قاتل بن گیا ہے! کیا آپ جانتے ہیں کہ منزہ پر گولی کاشف بھائی نے چلائی تھی۔''علیز ے نے دھماکا کیا۔

''کا۔کیا؟''انور میاں پہلی بار سارے دورانیے میں شاکڈ ہوئے تھے۔پیسہ اور بیٹا واحد دو چیزیں اُن کو زندگی میں پیاری تھیں۔

''کاشف نے؟ لیکن کیوں؟''اُن کی آواز پست تھی۔

''معلوم نہیں...اُس پر تو جانے کیسا شیطان سوار تھا۔''علیز ے نے روتے ہوئے کہا۔سارا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر منزہ کو کچھ ہو گیا تو پولیس کاشف کو پکڑ لے گی؟''انور میاں کے لہجے میں صرف کاشف کے لیے فکر تھی۔علیز ے نے بے حد حیرانی سے اپنے باپ کو دیکھا زندگی میں اپنی بیٹیوں کا کوئی مقام نہ تھا۔ حالاں کہ منزہ انور میاں کے بے حد قریب رہتی تھی۔

علیز ے نے بے اختیار منہ موڑ لیا۔

''یا میرے اللہ!''وہ بے حد کرب میں تھی۔

''یا اللہ رحم کرنا!''

علیز ے کے ذہن میں تو لفظ بھی نہ بن پا رہے تھے کہ وہ کوئی کامل دُعا مانگ سکتی۔

اُسی پَل پولیس کے دو اہل کار کمرے میں تقریباً بھاگتے ہوئے گئے اُن کے ساتھ ساتھ نرس اور ڈاکٹرز تھے۔

علیز ے نے چونک کر شیشے کے پار دیکھا۔منزہ کو ہوش آ گیا تھا۔

''لگتا ہے منزہ کو ہوش آ گیا ہے!''وہ کہہ کر بجلی کی سرعت سے اندر بھاگی، اُس کے پیچھے انور میاں بھی تھے۔

''بیٹا! بولو تم پر کس نے گولی چلائی؟''ادھیڑ عمر ایس ایچ او منزہ کا بیان ریکارڈ کرنا چاہتا تھا۔

''بولو بیٹا! تم پر کس نے گولی چلائی اور کیوں چلائی؟''

علیز ے نے دیکھا کہ منزہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن درد کی شدت سے اُس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''منزہ!''علیز ے تڑپ کر اُس کی جانب بڑھی اور اُس کا خون آلود ہاتھ تھام کر بے اختیار چومنے لگی۔

''میری جان تمہیں کچھ نہ ہوگا!''

''علیز ے!''منزہ کی آواز میں کس قدر بے بسی تھی۔

''میں...میں تو جینا چاہتی تھی۔''منزہ نے ٹوٹتی سانسوں سے کہا۔

''زندگی!''

''آہ!''

''میرا جہاں...میری دنیا!''منزہ کو پچھتاوے کے ناگ نے ڈسا۔

''زندگی بس اتنی سی تھی کیا؟''منزہ کا سوال علیز ے کا دِل دہلا گیا۔

''آپ پلیز ہٹیے، ہمیں اِن سے کچھ پوچھنا ہے!''ایس ایچ او نے آگے بڑھ کر علیز ے کو ہٹایا۔

''آہ!''

''زندگی کتنی پیاری تھی!''

''آہ!''

''واپسی کتنی تکلیف دہ ہے!''منزہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے پھر وہ تکلیف سے بُری طرح تڑپنے لگی۔

''امی۔''منزہ کی چیخ بھرپور تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''امی پلیز مجھے بچالو...'' منزہ کے چہرے پر ڈر بے حد نمایاں تھا۔

''بیٹا پلیز! ہمارے ساتھ تعاون کرو، ہمیں بتاؤ تم پر کس نے گولی چلائی تھی؟'' ایس ایچ او نے اونچی آواز میں منزہ کو متوجہ کیا۔

''گولی!''

''آہ! بہت درد...'' منزہ پھر تڑپی۔

''ہاں بیٹا کس نے گولی چلائی؟''

انور میاں اور علیزے کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ اُن کا گھر اُجڑنے اور اُن کا دِل بکھرنے جا رہا تھا۔

منزہ کے سامنے کاشف کا ہنستا ہوا چہرہ لہرایا۔

وہ اُس سے کس قدر پیار کرتا تھا۔ سوائے اُس کے، کسی کے ساتھ اُس کی دوستی نہ تھی ہر اچھی چیز وہ منزہ کے لیے ضرور رکھتا تھا۔ پھر اِس قدر بُری موت وہ اُس کے لیے کیوں ڈھونڈ کر لایا؟ وہ تو ایک پیارا، لاڈلا بھائی تھا؟

منزہ کے بدن میں اِس قدر درد تھا کہ سب سوال، باتیں، منظر، چہرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔

پھر ایک دم ایک بہت بھیانک چہرہ سب چہروں میں نمایاں ہوگیا۔

یہ پاشا کا چہرہ تھا!

یہ وہ بلیک میلر تھا، جس نے اُس کی پورنوگرافی کر کے نیٹ پر دے دی تھی، اسے عریاں کر کے تصاویر عام کردی تھیں۔ اُس نے اُس کی عزت کو داغ دار کر دیا تھا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکی تھی۔

کاشف نے منزہ کی یہی عریاں تصاویر کسی کے موبائل پر دیکھی تھیں اور طیش میں آ کر بہن پر گولی چلادی تھی۔

''پاشا۔ میں کس قدر بے بس تھی!''

''لیکن اب نہیں ہوں!'' درد کی لہریں تیز ہونے سے منزہ کی سوچیں منتشر ہو رہی تھیں۔

''پاشا!'' منزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا، علیزے اور انور میاں نے چونک کر منزہ کو دیکھا۔

''کون پاشا؟'' ایس ایچ او نے پوچھا۔

''جس پارلر... پارلر میں! میں... میں... میں کام کرتی تھی۔ اُس کی مالکن کا بھائی!'' منزہ کی آنکھیں درد سے کُھل رہی تھیں۔

ایس ایچ او بہت تیزی سے منزہ کا بیان نوٹ کر رہے تھے۔

''اُس نے میری عزت لوٹی!'' منزہ کا انکشاف علیزے اور انور میاں کے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔

''اُس نے میری ویڈیو بنائی'' منزہ کا سانس اُکھڑنے لگا۔

''اُس نے مجھ پر گولی چلائی!''

منزہ بھائی کو صاف بچا گئی اور جاتے جاتے اصل مجرم کو سزا دلانے کے لیے جال کس گئی تھی۔

''یہاں پر سائن کرو بیٹا!'' ایس ایچ او نے پھرتی سے منزہ کے ہاتھ میں قلم تھمایا۔

وہ باوجود کوشش کے سائن نہ کر پا رہی تھی۔

''میرے انگوٹھے کی مہر لے لو! پاشا کو سزا دلانا۔'' منزہ باوجود تکلیف کے بول رہی تھی۔

ایس ایچ او نے پھرتی سے اُس کے انگوٹھے کا نشان کاغذ پر لیا۔

''علیزے۔ معاف... معاف کر دینا!''

''معافی۔'' منزہ نے باپ کو دیکھا۔

''معافی.. اللہ!''

''اللہ معافی!'' علیزے نے بڑھ کر بہن کو گلے سے لگالیا۔

''اللہ معافی.. معافی.. اللہ!'' منزہ کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ علیزے بے اختیار رو دی۔

''اللہ.. اللہ.. معا...'' علیزے کو لگا کہ، کہ منزہ کا وجود ریت کی طرح اُس کے ہاتھوں سے پھسل گیا ہو۔

''منزہ!'' علیزے نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے منزہ کو دیکھا، جس کی آنکھیں ہلکی سی کھلی تھیں اور وہ پانی سے لبریز تھیں۔

''اوہ مائی گاڈ۔''

''شی از نو مور!'' ایس ایچ او نے ڈاکٹر سے کہا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر تصدیق کر ڈالی۔

''نہیں۔'' علیزے کی سسکی نکلی۔

اُس نے بے یقینی سے اپنے بازوؤں میں جھولتے منزہ کے بے جان وجود کو دیکھا۔ دُکھ سے دِل پھٹنا کیا ہوتا ہے؟ علیزے اِس وقت جان گئی تھی۔

آیا اور نرس نے تیزی سے بڑھ کر منزہ کو علیزے سے الگ کر کے اُس کی آنکھیں بند کیں اور ٹانگیں سیدھی کر دیں۔ چہرہ سفید کپڑے سے ڈھانپ دیا۔

علیزے نے بے یقینی سے اُس چاند کو غروب ہوتے دیکھا۔

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود اُمیدوں پہ ندامت ہے مجھے
میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی میری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری اُمیدوں کا حاصل، میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں
کتنی بے کار اُمیدوں کا سہارا لے کر
میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمناؤں کے مبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
اپنے ماضی کے تصور میں ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے!

وہ چلی گئی تھی بہت سی باتیں راز لیے اور کچھ راز کھول کر!
زندگی میں کبھی اپنے گھر اور بہن بھائیوں کی خبر بھی اخبار میں لگے گی، علیزے نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اُس کی برداشت کی حد ختم ہوگئی تھی۔ علیزے کا دِل بے اختیار ڈوبا، وہ لہرا کر گری اور فرش بوس ہوگئی۔

❖❖○❖❖

میری اتنی سی خواہش ہے کہ
میں اِک آسماں ہوتا
اور تو میری زمین ہوتی
میں جھک کر تیرے سارے غم
اپنے کاندھوں پر ڈھولیتا
تیری تکلیفیں اور کٹھنائیاں
خود میں سمولیتا
میرے بادلوں سے بارشیں
چھم چھم برستیں تو تجھے سیراب کردیتیں
وہ تیری پیاس کو پی کر تجھے شاداب کردیتیں
میرے سورج کی کرنیں تجھ پر پڑتیں تو
بڑی ان مول ہوجاتیں
ہَوا سے مل کر نئی اِک شکل میں ڈھلتیں
غزل کے بول ہوجاتیں
میں تجھ سے روٹھتا تو تاریک رات ہوجاتا
مگر پھر بھی میرا چندا تیرے ہی ساتھ ہوجاتا
کہیں تارے چمک پڑتے گو میرا حسن بڑھانے کو
مگر بے تاب رہتے وہ تیرا آنچل سجانے کو
لیکن جاناں! میں نے مانا
کہ ایسا ہو نہیں سکتا
نہ جانے کس کی سازش ہے
مگر پھر بھی میری اتنی سی خواہش ہے

ڈاکٹر فیصل کی سرگوشیاں خوشبو کی طرح اُس کے اردگرد پھیلی ہوئی تھیں، سدرہ کتنی ہی دیر سے آئینے

ں لھڑی اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ اس کے عکس میں اس کے نقوش میں اضافہ ہوگیا تھا اور یہ نیا نقش اِس ،، نمایاں تھا کہ ہر کوئی ٹھہر ٹھہر کر پوچھتا تھا کہ واقعی یہ پرانی والی سدرہ ہے؟
وہ اس خوشی کے نقش کو کہیں چھپا نہ پارہی تھی۔ یہ خوشی کی کرنیں تو اُس کے اندر سے پھوٹ کر اُس ، چہرے کو جگمگاتی تھیں۔ ڈاکٹر فیصل کوئی خواب کی طرح لگتا تھا لیکن اب وہ اس کی حقیقت کو چھوسکتی ی۔

گزرے دن اس حویلی کے لیے بہت سارے دُکھ لائے تھے۔ سید نوازش علی، سید سرفراز علی کی کروائی ا نک سے ہلاک ہوگئے تھے۔ اِس حملے میں سید عبداللہ بھی بُری طرح زخمی ہوا تھا لیکن وہ کیا کہتے ہیں نا ا اچھے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے۔
سید عبداللہ کو اللہ نے دوبارہ ایک نئی زندگی عطا کردی تھی لیکن اِس پیچھے سے کیے گئے وار سے دشمنیاں ا منے سے کھل کر شروع ہوچکی تھیں۔ زلیخا بی بی کے بھائیوں نے جوابی حملہ کیا تو سید سرفراز کے چار اور ان کے پانچ بندے مرگئے۔ اب یہ لڑائی صرف اُن کی چچا زاد بہن زلیخا کی لڑائی نہ رہی تھی بلکہ اس لڑائی نے ذاتی لڑائی کی شکل اختیار کرلی تھی۔
زلیخا بی بی نے فوراً بٹوارے کا کہا تو سید سرفراز علی مزید بپھر گیا اور اُس نے سید عبداللہ پر دوبارہ جان ا ملہ کروایا تاکہ وہ زمینوں کی ڈیمانڈ دوبارہ نہ کریں۔ اِس کشمکش میں کچھ زمینیں ہی سید عبداللہ واپس لے سکے، باقی کا کیس انہوں نے عدالت میں دائر کردیا۔
''دِلوں کے بٹوارے پہلے ہوتے ہیں پھر جاکر زمینوں کے بٹوارے ہوتے ہیں۔'' یہ محاورہ سچ ثابت ہ ا تھا۔

سید سرفراز اور ریحانہ بی بی چھوٹی حویلی میں شفٹ ہوگئے۔ ظالم بھائی کے جانے سے حویلی کی سالوں ے بند کھڑکیاں خود بہ خود کھل گئیں اور وہاں سے تازہ ہَوا کے جھونکے آنے لگے، ان ہی تازہ جھونکوں ں سے ایک تازہ ہوا کا جھونکا ڈاکٹر فیصل بھی تھا۔
اس مرتبہ سدرہ ڈاکٹر فیصل کے دستک دیتے ہوئے ہاتھوں کو نہ روک سکی۔ اور پھر محبت کا ننھا منا پودا یکھتے دیکھتے تناور درخت کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ اور اِس محبت کے سارے خوب صورت رنگ سدرہ بی کے چہرے پر اِس قدر نمایاں تھے کہ اکثر انہیں لگتا کہ اُن کا راز بس کھلنے ہی والا ہے۔
وہ جانتی تھی کہ جب یہ راز کھلے گا تو ہمیشہ کی جدائی اُس کا مقدر تو ٹھہرے گی، اِس لیے وہ آنے والے ں بھی بُرے وقت سے پہلے اِس محبت کا بھرپور لطف لے لینا چاہتی تھی۔
''بی بی سائیں... بی سائیں...'' ملازمہ دوڑتی ہوئی اُس کے کمرے میں داخل ہوئی۔
''کیا ہوا؟........ خیریت تو ہے نا؟''
''وہ جی عائشہ بی بی تو درد سے بہت تڑپ رہی ہیں۔ دائی مائی بھی پریشان ہے کہ انہیں اگر ہسپتال نہ ، جایا گیا تو وہ ... بچہ اور وہ...'' ملازمہ کی جرأت نہ تھی کہ مالکن کے متعلق کوئی غلط اندیشہ بھی زبان پر لے۔

''اماں کدھر ہیں؟'' سدرہ نے تیزی سے عائشہ کے کمرے کی جانب بڑھتے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لو بی بی کل رات بڑی بی بی اور عبداللہ سائیں شہر والی کوٹھی گئے تھے، آج دوپہر بڑے شاہ جی کے قاتلوں والے کیس کی سنوائی جو ہے۔'' بشیراں نے سدرہ کو یاد دلایا کہ وہ اتنی اہم بات کیسے بھول گئی؟

''اوہ! میں کیسے بھول گئی؟'' سدرہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ہاں ماسی بختاں، کیا ہوا ہے بھابی کو؟'' سدرہ نے بستر پر تڑپتی عائشہ کو دیکھ کر دایا سے پوچھا۔

''وہ جی... اب میرے بس کی بات نہیں ہے، بچہ ترچھا بھی ہے اور سانس بھی مدھم ہے اگر جلدی آپریشن نہ کیا گیا تو زہر پھیل جائے گا، کیوں کہ بچے کا پانی بھی ختم ہوگیا ہے۔''

''میرے خدا!'' سدرہ نے دل پر ہاتھ رکھا۔

''تم دو گھنٹے سے بھابی کو کمرے میں لیے بیٹھی ہو اور ایک بار بھی اتنی خطرناک صورتِ حال کا نہ بتایا۔ اگر میری بھابی کو کچھ ہوگیا تو تیری اور تیرے خاندان کی خیر نہیں۔'' سدرہ کا غم اور غصے سے بے حد بُرا حال تھا۔

''بشیراں... بشیراں!'' سدرہ نے تڑپتی ہوئی عائشہ کا سر گود میں رکھ کر ملازمہ کو آواز دی۔

''جی بی بی!'' بشیراں کسی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

''ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے شہر جانا ہے!'' تڑپتی ہوئی عائشہ کی چیخیں آسمان تک چھو رہی تھیں۔

سدرہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

''بی بی صاحبہ! شہر لے جانے کا بھی وقت نہیں رہا۔'' دایا نے کانپتی آواز میں کہا۔ وہ کم عقل عورت سیدوں سے بچے کی پیدائش کے انعام واکرام کے چکر میں خود ہی مسئلے سے نپٹنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ جب سید عبداللہ پیدا ہوئے تھے تو اُس کی ماں کو ایک قطعہ زمین سید نوازش علی نے انعام کے طور پر دی تھی۔

یہ دایا بھی اِسی لالچ میں تھی۔ وہ ہر صورت یہ کیس کرنا چاہتی تھی اور اب اِس لالچ میں اُسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ عائشہ بی بی کا کیس بے حد خراب کر چکی تھی۔

''سدرہ!''

''ہائے۔ میں مر جاؤں گی!'' عائشہ نے روتے ہوئے کہا۔

''اگر شہر نہیں لے جائیں گے تو پھر کیا کریں؟'' سدرہ نے چیخ کر پوچھا۔

''بی بی صاحبہ! میں تو پیٹ کاٹنے اور ٹانکے لگانے میں اناڑی ہوں البتہ وزیراں علی چھوٹے موٹے ٹانکے لگاتی آئی ہے شاید وہ کچھ کر سکے۔'' دایا نے پھر اپنی ہی سوچی کہ وہی کوئی عورت لاکر دے تاکہ انعام میں اُس کو حصہ ہر صورت مل جائے۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا... ہر طرح کی اوٹ پٹانگ تجربے کے لیے تمہیں میری ہی بھابی ملی تھیں۔''

''یا اللہ کیا کروں... کیا کروں؟'' سدرہ نے درد سے دُہری ہوتی عائشہ کا سر سہلایا اور پھر آخر اللہ نے راہ سوجھا دی ورنہ سدرہ تو اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھی تھی۔

❖❖○❖❖

''بی بی! سوچ لو آج تک آپ کے خاندان کی عورتوں کو کسی نے دیکھا تک نہیں، کہاں یہ زچگی مرد کروائے گا۔'' بشیراں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''تم اپنی زبان مکمل بند رکھو کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ عائشہ بھابی کی مدد کے لیے ایک مرد ڈاکٹر کو بلایا ہے۔'' سدرہ نے نہایت سختی سے اُسے جھڑکا۔

''بی بی جی! میری زبان تو کبھی نہیں کھلے گی لیکن سید عبداللہ کو اگر پتا چل گیا اور انہوں نے اِسے اپنی عزت کا مسئلہ بنالیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔'' بشیراں نے بند دروازے کو خوف سے دیکھتے ہوئے کہا جس کے پیچھے ڈاکٹر فیصل، عائشہ بی بی کے لیے اندر داخل ہوا تھا۔

''اللہ کرم کرے گا... اُس وقت بھابی کی اور بچے کی زندگی اہم ہے، پھر میرا بھائی باہر کا پڑھا لکھا ہے اللہ کرے وہ بھی غلط نہ سوچے...'' سدرہ کہہ کر تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔

ایک زندگی کو جنم دینا کس قدر مشکل مرحلہ ہے۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ اللہ کو عورت میں، ماں کا روپ سب سے زیادہ پسند ہے اور اُسے افضل درجہ دیا ہے۔

عورت ایک جنم دینے کے لیے، ایک زندگی کو اس دنیا میں لانے کے لیے خود موت سے ہاتھ ملا کر آتی ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا دل والا مرد بھی موت کو خوش دلی سے دیکھنا نہیں چاہتا جب کہ ایک کمزور سا تو اِس عورت کو اللہ نے ساری تکلیف برداشت کرنے کی ہمت دے رکھی ہے۔

''میں اپنی پوری کوشش کر رہا ہوں کہ دونوں بچ جائیں لیکن حالت تمہارے سامنے ہے۔''

''پھر... یہ دیکھو میرے پاس تو مکمل آپریشن کے اوزار تک نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل کی آواز بے حد فکر مند تھی۔ ڈاکٹر فیصل کی مدد مریم کر رہی تھی۔

سدرہ تو چاہتے ہوئے بھی قریب کھڑی نہ ہو پا رہی تھی اس نے قریب ہی حاجت کے نوافل کی نیت باندھ لی۔

''اے اللہ تو تو مُردوں میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ جنگلوں میں جہاں کوئی مددگار تک نہیں ہوتا وہاں زندگیاں جنم لیتی ہیں صرف اور صرف تیری مدد سے...

اے اللہ! تو میری بہن، میری بھابی عائشہ کو صحت و زندگی عطا فرما اُسے نیک صالح اولاد عطا فرما۔'' سدرہ نے سجدے میں جا کر گڑگڑا کر دعا کی۔ وہ اِس وقت کمرے کے سارے ماحول سے کٹ گئی تھی۔

وہ تھی... اُس کا اللہ اور اُس کی منت بھری دعا تھی۔

''مالک!'' وہ سسکی۔

اُسی پل بچے کے رونے کی آواز آئی۔

''یا میرے اللہ! ہمیں اپنی بھابی اور اِسے ماں کی جدائی کی آزمائش سے بچانا۔'' سدرہ کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ سر اُٹھا کر صورتِ حال تک دیکھے۔

''سدرہ!'' اُسے اپنے کندھے پر بوجھ محسوس ہوا۔

اُس نے بے اختیار سر اُٹھایا۔ سامنے سید عبداللہ لبریز آنکھوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ اُن کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بازوؤں میں ایک ننھا فرشتہ تھا۔

''لالہ! معاف کر دینا... میرے پاس ان دونوں کی زندگی بچانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔'' سدرہ گڑگڑائی۔ وہ اپنے خاندان کے مَردوں کی سختی سے آگاہ تھی۔

''چپ! اللہ نے دیکھو کتنا کرم کیا ہے، ہماری عائشہ ہمارے ساتھ ہے۔'' سید عبداللہ گزشتہ آدھے گھنٹے سے کمرے میں موجود تھے۔ سدرہ اپنے نوافل میں اِس قدر مگن تھی کہ ماں اور بھابی کی واپسی کا پتہ ہی نہ چل سکا۔

عائشہ بے ہوش تھی لیکن خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹر فیصل بہت قابل سرجن تھا، اُس نے بے حد مہارت سے اِس آپریشن کو بغیر سہولتوں کے ہینڈل کیا تھا۔

''ٹانکے کچے ہیں مریضہ کو ہلنے جلنے سے منع کرنا ہے، میں کچھ دوائیاں لکھ کر دیتا ہوں فوراً شہر سے منگوالیں۔ ساتھ ہی کسی نرس وغیرہ کا بندوبست کریں جو دو تین دن ان کو ڈرپ میں میڈیسن وغیرہ لگا سکے۔'' ڈاکٹر فیصل نہایت پروفیشنل انداز میں بول رہا تھا۔

''لالہ! مبارک ہو۔'' مریم کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

''یہ دیکھو بیٹا ہے!'' مریم نے بچہ سدرہ کی گود میں ڈال دیا۔

''میرے اللہ!'' سدرہ کے جلتے سلگتے وجود میں ایک دم سے ٹھنڈک اُتر آئی۔ اُس نے بے اختیار بچے کو چوما۔

معصوم فرشتہ کسمسایا۔

''یہ تو میرا بیٹا ہے!'' سدرہ کا ادھورا پن سوالی بنا۔

''اسے میں لے لوں؟'' وہ بھائی سے فرمائش کر رہی تھی، جیسے وہ کوئی چوڑی ہار بُندا مانگ رہی ہو۔

''ہوں!'' سید عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا تو سدرہ کے مُردہ دل میں جان پڑ گئی۔

''اُس کا نام میں ولی رکھوں گی... یہ ننھا فرشتہ اللہ کا دوست بن کر آیا ہے۔ ہم سب کے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔ یہ میرا عبدالولی ہے!'' سدرہ نے جھک کر بچے کی بند آنکھوں پر پیار کیا۔

''تمہیں یہ دنیا بدلنی ہوگی، تم پر میرے ان لمحوں کا قرض ہے۔'' سدرہ نے بچے کے چہرے کے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ''عبدالولی!''

''یہ ہمارا بیٹا ہے مریم۔''

''ہمارا!'' سدرہ نے لبریز آنکھوں سے کہا۔

مریم بھی روتی آنکھوں سے بے اختیار رو دی تھی، وہ سدرہ کے اندر کے خالی پن سے اچھی طرح آگاہ تھی، جو بچوں کے لیے ترستا تھا۔

''کتنا پیارا ہے نا!'' سدرہ نے بھائی کو مخاطب کیا۔

''آں... ہاں!'' سید عبداللہ نے چونک کر کہا۔ اُس کی ساری توجہ بے ہوش عائشہ پر تھی، جو ہلدی کی طرح پیلی پڑ چکی تھی۔

''اب فکر کی کوئی بات تو نہیں؟'' سید عبداللہ نے ڈاکٹر فیصل کے ساتھ باہر آتے ہوئے پوچھا۔

''احتیاط کی بے حد ضرورت ہے! اناڑی دایا نے کافی نقصان کر دیا ہے۔ بھابی کچھ عرصہ مکمل بیڈ پر گزاریں شاید تین چار ماہ لگ جائیں... مجھے تو دایا کی، کی ہوئی گڑبڑ کے بھی ٹانکے لگانے پڑے۔ وہ تو شکر ہے کہ ابھی گزشتہ ہفتے ہی میں سرجری کا بہت سارا سامان لے کر گاؤں آیا تھا۔ ورنہ تو یہ آپریشن ناممکن تھا۔'' ڈاکٹر فیصل نے گول کمرے میں آ کر کہا، جہاں سید عبداللہ نے اُن کے لیے چائے کے ساتھ بہت سارے لوازمات منگوا رکھے تھے۔

''عبداللہ!'' پیچھے سے زلیخا بی بی کی آواز آئی۔

''جی امّاں جان!'' سید عبداللہ تابع داری سے مُڑا۔

لیکن ڈاکٹر فیصل سے پردہ کیے ہوئے بھی سید عبداللہ ماں کی واضح ناراضی دیکھ چکا تھا۔

''بچے سے کہو کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ وہ ہماری حویلی کی عورت کے علاج کے لیے آیا تھا۔'' یہ بات اِس حویلی سے باہر نہیں نکلنی چاہیے۔''

''جی اچھا!'' سید عبداللہ، ڈاکٹر فیصل کو وہاں بٹھانے کے بجائے باہر لے آئے۔

''سوری یار!''

''ہمارا ماحول اِس قدر دقیانوسی ہے کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتا۔ یہاں عورتوں کو مرنے دیا جاتا ہے لیکن کسی میل ڈاکٹر سے علاج کروانے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ آج میری بہن نے جو بولڈ اسٹیپ لے کر میری بیوی اور بچے کی زندگی بچائی ہے، میرے اوپر سدا اس کا احسان رہے گا۔ امّاں جان، سدرہ آپی اور مجھ سے بے شک بے حد ناراض ہیں لیکن دو زندگیوں کے سامنے یہ ناراضی تو جھیلی جا سکتی ہے۔''

''تھینکس یار! تمہارے مجھ پر دُہرے احسانات ہیں پہلے تم نے میری جان بچائی یہ احسان کم تھا، جو آج تم نے میری بیوی اور بچے کو نئی زندگی دی... میں واقعتاً تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ کسی بھی شخص کی اچھائی کا اجر کوئی انسان نہیں لوٹا سکتا۔ تمہاری اچھائی، بھلائی کا اجر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات دے گی لیکن پھر بھی تم بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' سید عبداللہ نے بہت پیار سے پوچھا۔

ڈاکٹر فیصل نے بہ غور اس بے حد وجیہہ انسان کو دیکھا، جس کا چہرہ ہی نہیں دِل بھی بے حد خوب صورت تھا۔

''کیا یہ اپنی بہنوں کے لیے بھی اِس قدر اچھا دِل رکھتا ہوگا؟'' ڈاکٹر فیصل کے اندر مختلف سوالات مختلف زاویوں سے پلس مائنس ہونے لگے۔

''کیا میں اِس موقعے کا فائدہ اُٹھالوں...؟'' اُس کے اندر لالچ نے سر اُٹھایا۔

''موقعے سے فائدہ اُٹھانا اچھی بات نہیں ہوتی۔'' ڈاکٹر فیصل بے اختیار بولا۔

''تو ٹھیک ہے تم کبھی بغیر موقعے کچھ کہہ کر دیکھنا میں تمہیں کبھی مایوس نہ کروں گا۔'' سید عبداللہ نے ڈاکٹر فیصل کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اللہ کرے تمہارا ظرف تمہارے قول کا ساتھ دے۔'' ڈاکٹر فیصل کی بات پر سید عبداللہ بے اختیار چونکا۔

''ایسا کیا تم کہنے والے ہو جو میرے ظرف سے بڑا ہوگا؟'' سید عبداللہ خود کو سوال سے روک نہ سکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’میں وعدہ کرتا ہوں کہ کہوں گا میں صرف تم سے...لیکن کچھ عرصے بعد۔‘‘ ڈاکٹر فیصل کا سسپنس سید عبداللہ کو بے چین کرگیا تھا۔

’’اگر تم اپنے ہسپتال کے لیے مزید زمین چاہو گے تو میں ضرور دوں گا...‘‘ سید عبداللہ نے دِل ہی دِل میں اندازہ لگا کر خود سے کہا۔

❖❖○❖❖

’’کون ہو مائی تم؟‘‘ سید سرفراز سیڑھیاں اُتر کر ہال کمرے میں آیا۔ ملازم نے بتایا تھا کہ کوئی عورت اُس سے ملنے پر بہت اصرار کررہی تھی۔

’’میں زبیدہ کی چچی ہوں!‘‘ ریحانہ چچی نے نقاب کھول دیا۔

’’تو؟‘‘ سید سرفراز نے ماتھے پر بَل ڈال کر کہا۔

’’میں تمہیں کچھ بتانے آئی ہوں۔‘‘ ریحانہ چچی کو سید سرفراز سے مل کر بے حد مایوسی ہوئی تھی لیکن وہ پھر بھی سید سرفراز سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ آخر یہ زبیدہ کی زندگی کا سوال تھا۔

’’میں کچھ بھی سننے میں دِل چسپی نہیں رکھتا۔‘‘ سید سرفراز نے روکھے لہجے میں کہا۔

’’لیکن یہ تم کو سننا ہوگا خواہ تمہارا دِل چاہے یا نہ چاہے۔‘‘ ریحانہ چچی نے کہا۔

’’تم نے جو کچھ زبیدہ کے ساتھ کیا تھا اُس کا پھل اُس کی کوکھ میں پل رہا ہے۔ وہ اکیلی اِس سارے کی ذمے دار نہیں ہے تم برابر کے اس گناہ میں شریک ہو اب تمہارے اور اُس کے لیے بہتر ہوگا کہ تم اُس سے نکاح کرلو تا کہ بچے کو باپ کا باعزت طریقے سے نام مل سکے۔ ویسے دیر اس قدر ہوگئی ہے کہ تم لوگ بچے کو فوراً دنیا والوں کو دکھا نہ پاؤ گے، زبیدہ کو میں اپنے ننھیالی گاؤں لے کر گئی ہوں تا کہ اُس کے باپ کو اس قیامت کی خبر نہ ہو۔ چند دنوں تک بچہ دنیا میں آجائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ اُسے تم نام دو تا کہ وہ ناجائز نہ کہلائے۔‘‘ ریحانہ چچی نے کہا۔

’’اس ساری گفتگو کرنے کا مقصد؟‘‘ سید سرفراز علی نے بے نیازی سے پوچھا۔

’’تم اُس بچے کی باپ ہو!‘‘ وہ غصے سے بولیں۔

’’جس کو میں نہ مانوں گا تو وہ کیسے میرا بچہ کہلائے گا؟‘‘ سید سرفراز کی ہنسی، ریحانہ چچی کو بے حد مکروہ لگی۔

’’اللہ سے ڈرو سید سرفراز علی۔‘‘ ریحانہ چچی نے اُسے اُس بڑی ذات کا ڈراوا دیا۔

سید سرفراز یوں قِل قِل کر کے ہنسا جیسے اُس نے کوئی لطیفہ سن لیا ہو۔

’’مت ہنسو! ایسے کسی دن سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے...‘‘ ریحانہ چچی نے نہایت بے بسی سے کہا۔

’’ایسا کوئی دِن نہیں نکلنے والا۔‘‘ سید سرفراز علی اپنی جوانی، صحت، دولت اور طاقت کے نشے میں چُور ہوکر بولا۔

’’کیوں خود کو خدا بنا کر دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کررہے ہو۔ تم زبیدہ کو اپنا لو تو اللہ کی ناراضی سے بچ جاؤ گے۔‘‘ ریحانہ چچی نے مجبوراً اپنا لہجہ نرم کیا۔

’’ہرگز نہیں... میرے وارث کو کوئی بہت امیر کبیر اور خاندانی لڑکی جنم دے گی۔‘‘ سید سرفراز نے فوراً انکار کردیا۔

’’اور یہ بچہ؟‘‘ ریحانہ چچی نے دکھ سے پوچھا۔

’’اُسے تم جو مرضی کرو، لیکن آئندہ میرے سر تھوپنے ہرگز نہ آنا۔‘‘ سید سرفراز علی کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

’’تم کس قدر ظالم ہو، اپنی ہی اولاد کے لیے اِس طرح کی باتیں کررہے ہو۔ تم نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرڈالی، تم کو اِس کا احساس تک نہیں ہے۔‘‘

’’میں اُس لڑکی کے پاس نہیں گیا تھا۔ وہ ہی میرے پیچھے آیا کرتی تھی اور اگر وہ میرے پیچھے آتی تھی تو جانے اور کتنوں کے پیچھے جاتی ہوگی اور جانے یہ بچہ کس کا ہے۔‘‘ سید سرفراز نے بدتمیزی سے کہا۔

’’بس کرو سید سرفراز علی! میں نے آج تک کسی کو بد دعا نہیں دی لیکن میں آج تمہیں بد دعا دیتی ہوں۔ اللہ تمہیں اس بچے کی ناقدری کے بدلے میں کبھی اولاد کا سُکھ، اُن کی خوشیاں نہ دے، اللہ میری بچی کی ناقدری کے بدلے تمہیں کبھی بیوی کا سُکھ نہ دے۔ تم بھی ویسے ہی خالی اور کانٹوں بھرے راستے میں سفر کرو، جو میری بچی جھیل رہی ہے۔‘‘

’’مقبول احمد!‘‘ سید سرفراز کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔

’’اس مائی کو اُٹھا کر باہر پھینکو۔‘‘ سید سرفراز کہہ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا لیکن ریحانہ چچی کی بے بس بد دعائیں اُس کا اُوپر تک پیچھا کرتی آئی تھیں۔ سید سرفراز علی نے کمرے میں آکر یوں سر جھٹکا، جیسے وہ کوئی وزن سر سے اُتار رہا ہو۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کے سر جھٹکنے اور اُس عورت کی باتوں کو جھٹلانے سے یہ بات ختم نہ ہوگی۔

ریحانہ چچی نے زبیدہ کو ماں بن کر پالا تھا اور وہ ایک دکھی ماں کی تڑپ تھی اور ماں کی تڑپ کبھی اللہ رائیگاں نہیں جانے دیتا۔

آج وہ ماں جس آگ میں جل رہی تھی۔ سید سرفراز علی کا مستقبل اُس کی تپش سے جھلسنے والا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ لوگ کانٹے بوئیں اور انہیں کاٹے نا۔ سید سرفراز علی نے اندر آتی اپنی ماں کو دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

’’خیریت؟‘‘ ماں کے چہرے پر کچھ عجیب سا تھا۔

❖❖○❖❖

’’سید عبداللہ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ اُن کا وارث آچکا ہے! اِن زمینوں کا وارث آچکا ہے اب تو کیا کرے گا؟‘‘ ماں نے اُسے دہلایا۔

سید سرفراز کو واقعتاً اندر سے بے چینی ہوئی تھی۔

’’امّاں! میرا بیاہ کردو۔‘‘ سید سرفراز کے اتنے ٹال مٹول کے بعد یہ حامی واقعی اُس کی ماں کے لیے حیرانی لیے ہوئے تھے۔

’’لیکن...‘‘ وہ کچھ کہنے جارہی تھیں۔

’’لیکن... کچھ نہیں... مجھے فوراً شادی کرنی ہے۔‘‘ سید سرفراز کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اُسے فوراً اپنی زمینوں کے وارث کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ عبداللہ سے اُسی صورت جیت سکتا تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کے ہاں بھی بیٹے ہوں کیوں کہ سید نوازش علی نے اپنی ساری زمین اپنے پوتوں کے نام لکھی تھی۔

''عبداللہ کے بچے کو تو میں جینے نہیں دوں گا اور باقی زمین صرف میرے بچوں کے لیے ہوگی... لیکن اس سے پہلے مجھے شادی ضرور کرنا ہوگی... تا کہ میرے بچے بھی آ سکیں۔''

اِس ساری پلاننگ میں اُسے رتی بھر بھی اُس بچے کا خیال نہ آیا، جو اُس کی ہوس کی نشانی بن کر ایک معصوم لڑکی کی کوکھ میں پَل رہا تھا۔ دو زندگیاں معاشرے میں سوال بننے والی تھیں لیکن اُسے صرف اپنی پروا تھی۔

وہ تو صرف اور صرف خود کے لیے سوچتا تھا۔ اس کی وجہ سے ایسے میں کوئی مرے یا جیے اُسے کسی کی پروا کب تھی۔ ظلم کرنے اور زیادتی کے مزے لینے والے کب جانتے ہیں کہ ظالم کی رسی دراز ضرور ہو سکتی ہے لیکن وہ قدرت کے انتقام سے بچ نہیں سکتے، حساب سے بھاگ نہیں سکتے۔ آنے والا کل سرفراز علی کے ظلم کا دہلا دینے والا جواب لیے کھڑا تھا۔

خواہشوں سے دست بردار ہونے کا مطلب ہے کہ انسان اپنے خوابوں سے دست بردار ہو رہا ہے۔ اور... اور جب خواب نہ رہیں تو نیند نہیں رہتی اور ایسے میں انسان بس جاگتا ہی رہتا ہے۔ خواہش اور خواب کا ادھورا پن اور جاگتے زخم انسان کو دھیرے دھیرے توڑ دیتے ہیں۔

''میں تم سے کیسے دست بردار ہو جاؤں نگینہ!'' طارق نے بے چینی سے چکر کاٹتے ہوئے سوچا۔

وہ اِس وقت سحرش کے گھر میں تھا اُس کے کمرے میں موجود! اب سحرش نا چاہتے ہوئے بھی اُس کی زندگی کا اہم ترین حصہ تھی۔ لیکن وہ ایسا حصہ تھی، جس کو وہ کبھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

طارق نے تھک کر اپنا وجود راکنگ چیئر پر گرا دیا۔

وہ جب جب سحرش سے ملنے آتا تو نگینہ کا تصور مجسم ہو، ہو کر اُس کے سامنے چلا آتا اور بے طرح اُسے بے بس و مجبور کر دیتا۔

سحرش! جس کو بے حسی کے خول سے طارق ہی نے نکالا تھا، اب ہر وقت طارق کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی تھی۔ اِدھر مرینہ آنٹی دھیرے دھیرے سحرش کے کانوں میں اُس کے اور طارق کے رشتے کے متعلق کچھ نہ کچھ ڈالتی رہتی تھیں۔ وہ پہلے سے زیادہ طارق سے اٹیچ ہو چکی تھی، جب کہ جیسے ہی سحرش طارق کے سامنے آتی، اس کو اپنا وجود ایک دم خالی خالی لگنے لگتا۔

تم مری کون ہو، تم سے ہے تعلق کیسا؟
تم کسی دُھند میں لپٹی ہوئی تنہائی ہو
میری شہرت ہو دعا ہو، میری رُسوائی ہو
بات کرتی ہو کبھی چُپ میں بکھر جاتی ہو
کیوں میری روح کے گوشوں پر ستم ڈھاتی ہو
تم مری کون ہو، تم سے ہے تعلق کیسا؟
تم مرے پاس ہو، نا دور ہو میرے دل سے

''ہیلو... ہیلو! کون بول رہا ہے؟'' نگینہ کی آواز مسلسل موبائل سے آ رہی تھی، جب کہ طارق لب بھینچے اُس کی آواز سُن رہا تھا۔ جن سے دِلوں کا تعلق ہوتا ہے، اُن کی تو آواز بھی دِل کی رگوں میں توانائی بن کر اُترتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طارق بھی اپنے مرتے بے جان دِل کی زندگی چاہتا تھا۔ نگینہ نے ہیلو، ہیلو کر کے فون آخر بند کر دیا ،طارق نے آنکھیں موندھ کر طویل گہری سانس بھری... وہ دھیرے دھیرے چلتا دیوار پر لگے اُس فریم کے پاس پہنچا، جس میں سحرش کی اپنی فیملی کے ساتھ تصویر تھی۔

تانیہ آنٹی، اُن کے شوہر، ساس، بیٹے اور سحرش کا مسکراتا زندگی سے بھرپور چہرہ... یہ سب لوگ مر چکے تھے لیکن مرنے سے پہلے اپنا رشتہ طارق سے بنا چکے تھے۔

''نہیں یہ سب کے سب نہیں مرے! اِن میں سحرش تو زندہ ہے... کیا وہ سحرش کو خوش رکھ پائے گا؟'' یہ ایسی کسوٹی بھرا سوال تھا کہ طارق کا سارا وجود بے چینی سے بھر گیا۔

اُسی پَل کوئی اُس کی پشت سے آ کر لپٹ گیا۔

''طارق آپ کتنے دِنوں بعد آئے ہیں!'' معصوم اور بے قرار شکوہ اُس کے سامنے تھا۔

''میں کام سے گیا ہوا تھا۔'' طارق نے نرمی سے اپنا آپ اُس سے چھڑا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ بے اختیار اُس سے نظریں چُرا رہا تھا۔ وہ اُس کی زندگی کی ایسی حقیقت بن چکی تھی کہ جس سے وہ چاہ کر بھی نگاہیں نہ چُرا سکتا تھا۔

''میں نے آپ کو بہت مِس کیا... کیا آپ نے بھی مجھے مِس کیا؟'' وہ بے حد جوش سے بول رہی تھی۔

''ہوں...!'' طارق کو یہ ہوں کہنا بھی بے حد دُشوار لگ رہا تھا۔

''یا اللہ! میں اِس سے رشتہ کیسے نبھا پاؤں گا۔''

''طارق! ایک بات پوچھوں؟'' سحرش نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ہوں...!'' طارق نے جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر جلایا۔

وہ سحرش سے شادی سے پہلے کبھی اسموکنگ نہ کرتا تھا۔ لیکن اپنے اندر کی بے چینی سے گھبرا کر اُس نے اسموکنگ شروع کر دی تھی۔

''مرینہ آنٹی کہتی ہیں کہ آپ میرے شوہر ہیں اور شوہر...! وہ ایک دم چُپ ہوگئی۔

''اور کیا؟'' طارق اپنے ہی خیالوں میں مگن تھا ورنہ اُس کے چہرے کے رنگوں کو دیکھ کر مزید سوال نہ کرتا۔

''طارق! میں نے زندگی سے بس دُکھ اور عدم تحفظ ہونے کا احساس ہی پایا ہے۔ لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے بعد اگر اللہ نے مجھے آپ سے نواز دیا ہے تو میں آپ کو کبھی کھونا نہیں چاہوں گی... میں نے زندگی کے دو سال پتھر کی مورت بن کر گزارے، وہ زندگی کا خوف ناک دور تھا لیکن اُس حبس بھرے اندھیرے میں تازہ ہَوا اور روشنی آپ نے ہی بھری تھی۔ آپ کی توجہ سے میں زندگی کی جانب بڑھی ہوں... آپ... آپ مجھے کبھی نہ چھوڑ کر جانا...'' وہ ایک دم اُس سے لپٹ گئی۔ طارق کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

''اب آپ میرے شوہر ہیں، میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی...'' اُس کے لفظوں میں جو مطالبے تھے، وہ فی الحال طارق پورے نہیں کر سکتا تھا، اُس کا دل و دماغ اُس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔

''تم بے فکر رہو میں کبھی تم سے لاپروا نہ رہوں گا۔'' طارق نے ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''طارق! آپ نہیں جانتے تو جان لیں، آپ میری زندگی کی سانسیں ہیں اور... آپ یہ تو جانتے ہی ہیں نا کہ سانسوں بنا زندگی ختم ہو جاتی ہے۔'' طارق نے چونک کر سحرش کو دیکھا، اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا سحرش کی آنکھوں میں جنون اور ضد تھی۔

''اللہ حافظ!'' طارق نظر چُرا کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

سحرش کی نگاہوں کا رنگ طارق کی آنکھوں کے سامنے مسلسل گھوم رہا تھا۔

''کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب انسان گتھیاں سلجھانے بیٹھتا ہے تو دھاگے مزید اُلجھنے لگتے ہیں۔'' طارق نے بے حد تھکے ذہن کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچا پھر اُس نے گاڑی فوراً اکرم زبیر کے گھر کی طرف موڑ دی۔

❖❖○❖❖

''کیسے ہو، خوب صورت آدمی!'' پروفیسر اکرم زبیر نے وہیل چیئر کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہا۔

''شکر الحمدللہ سر!'' طارق نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔

''کچھ اُلجھے ہوئے لگ رہے ہو۔'' انہوں نے اپنی الیکٹرک چیئر صوفوں کے بیچ خالی جگہ پر لا کر پوچھا۔

صوفوں کے درمیان یہ جگہ اُن کے لیے خاص طور پر خالی رکھی گئی تھی۔ اِسی طرح کھانے کی میز کی بھی ایک کرسی ہٹا کر اُن کی وہیل چیئر کی جگہ بنائی گئی تھی۔ طارق نے پہلی بار جب اِس شخص کو دیکھا تھا تو بے حد افسوس ہوا تھا لیکن جیسے جیسے وہ پروفیسر اکرم زبیر سے گفتگو کرتا گیا اُس کا یہ افسوس بھاپ بن کر اُڑ گیا حالانکہ بے شک وہ پولیو زدہ ٹانگوں کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتے تھے لیکن وہ بے حد خود مختار تھے۔ اُن کو اپنی کسی سے کوئی شکوہ نہ تھا اُن کی ٹانگیں بے شک کمزور تھیں لیکن وہ بے حد مضبوط انسان تھے، خود گاڑی چلا کر آتے جاتے تھے۔ انہوں نے زندگی میں ہار اور مایوسی کو کبھی اپنے سامنے نہ آنے دیا تھا۔ وہ بے حد قابل ماہر نفسیات تھے اُن کا اپنا پرسنل سیٹ اَپ بھی تھا اِس کے علاوہ گورنمنٹ جاب بھی تھی۔ پبلک سروس کمیشن کے تھرو وہ بیسیوں افراد میں سے منتخب ہوئے تھے آج کل سینٹرل جیل ہسپتال میں کام کر رہے تھے جو مجرم مریض اُن کے پاس لائے جاتے تھے وہ بے حد خطرناک ہوتے تھے کبھی اپنے جرائم کا اقرار نہ کرتے تھے۔

لیکن پروفیسر اکرم زبیر کا ریکارڈ تھا کہ اُن کے پاس مشکل سے مشکل کیس حل ہو جاتا تھا۔ بڑے بڑے مجرم اپنا قصور مان لیتے تھے۔ اِسی طرح نوجوان لڑکے جو ذہنی طور پر بے حد ڈسٹرب ہوتے تھے وہ اُن کی تحلیل نفسی کے بعد زندگی اور مثبت سوچ کی طرف آ جاتے تھے۔ اس لیے وہ کمزور ٹانگوں اور مضبوط اعصاب والے ذہین آدمی بے حد مصروف رہتے تھے لوگوں میں آسانیاں بانٹنا انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا ڈالا تھا۔

جیل میں کوئی عام آدمی بھی جا کر مجرم بن جاتا ہے۔ انہوں نے یہ کلیہ ختم کر ڈالا تھا۔ وہ بہت محنت سے مجرموں کو انسان بنا رہے تھے۔ طارق کے ساتھ اُن کی دوستی بھی جیل کے ایک وزٹ کے دوران

ہوئی تھی پھر یہ دوستی کب ایک محبت بھرے رشتے میں تبدیل ہوگئی طارق خود بھی نہ جانتا تھا۔

''طارق! آر یو آل رائٹ؟'' پروفیسر اکرم زبیر نے پوچھا۔ طارق نے بے اختیار تھکن بھری سانس بھری۔

اور پھر جانے کیسے وہ اُن کے سامنے کھلتا ہی چلا گیا۔ سحرش سے چھپ کر شادی کرنا ایک اتنا بڑا بوجھ تھا جو وہ اکیلے سہار نہ پا رہا تھا۔

''ہوں... اگر تم نے شادی کر ہی لی ہے تو پھر گھبرا کیوں رہے ہو؟'' پروفیسر اکرم زبیر کے سوالات کا مطلب ہوتا تھا کہ اُن کا Analises شروع ہے۔

''میں... میرا تو خیال تھا کہ وہ تو اِس قدر مظلوم اور زندگی سے بیزار لڑکی ہے کہ مجھ سے کسی قسم کے حقوق کی ڈیمانڈ نہ کرے گی لیکن وہ تو... عام لڑکیوں سے زیادہ Expressive ہوچکی ہے۔'' طارق نے آخر اپنی پریشانی کہہ ہی ڈالی۔

''تو تم اُس سے صرف کاغذی رشتہ رکھنا چاہتے تھے؟''

''جی ہاں! کیوں کہ میرا ماننا ہے کہ جسمانی تعلق بھی صرف دِلی تعلق سے بنتا ہے۔'' طارق نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔

''لیکن ہر مرد اتنی خالص سوچ نہیں رکھتا، وہ تو عموماً اَن چاہی بیویوں کے ساتھ بھی ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔'' پروفیسر اکرم زبیر نے مسکراتے ہوئے اُسے ملازم کی لائی ہوئی چائے دی۔

''لیکن... میرا معاملہ مختلف ہے سر! میری زندگی میں سچائی بے حد اہم ہے، میں سحرش کے نام کا ملاوٹ ہرگز نہ کرتا اگر اُس مرتی ہوئی عورت کا اِس قدر زیادہ اصرار نہ ہوتا... اب جب کہ میرا خیال تھا کہ سحرش چوں کہ خود اتنے بڑے سانحے سے گزری ہے تو وہ...'' طارق کہتے کہتے حجاب سے رُک گیا۔

''ہوں...!'' پروفیسر اکرم زبیر نے بڑا سا ہنکارا اُبھرا۔

''ایسے اسپیشل کیسز میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص کو ہم بے ضرر جانتے ہیں وہ بے حد Selfish ہو جاتا ہے۔ عموماً اندھے، لنگڑے، گونگے لوگ اپنے حقوق کی حفاظت کے چکر میں نارمل انسانوں سے زیادہ لڑاکا اور غصیلے ثابت ہوتے ہیں۔

وہ بھی بہت کچھ کھونے کے بعد اِس عجیب سے دور میں داخل ہوچکی ہے اور تم واحد انسان اور واحد رشتہ ہو اُس کے پاس، پھر بے حسی کے دور میں تم واحد انسان تھے، جو اُس کے سامنے تھے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکے اور پھر مخاطب ہوئے۔

''ایکچولی تم اُس کی چھوٹی سی دنیا کا مرکز ہو... اِس لیے تم پر اُس کی ملکیت بڑھ گئی ہے، اِس لیے اُس کا ڈیمانڈنگ ہونا اور تم پر حق جتانا ایسے کیس میں نارمل ہے۔ آئندہ دِنوں میں تم تیار رہو کہ وہ تمہارے ایک ایک پل کے لیے Agressive ہو جائے گی۔ یہ تم کو بہت بُرا لگے گا لیکن وہ اِس کو درست جانے گی۔'' پروفیسر اکرم زبیر نے پزے کے ٹکڑے کو کانٹے میں پرو کر نفاست سے کھاتے ہوئے کہا۔

''اُف...'' طارق نے بے اختیار سانس خارج کیا۔

''ڈونٹ وری بیٹا! اگر تم نے کوئی قدم اچھے مقصد کے لیے اُٹھایا ہے تو اللہ تمہیں آسانیاں دیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ا ان کی عقل، تدبیریں، فیصلے اللہ کے آگے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ تم سحرش کو ویک میں اِک بار میرے پاس لایا کرو میں اُسے زندگی میں اُس کا اپنا وجود جو کہیں کھوگیا ہے اُسے کھوجنے میں مدد ... گا... اِس طرح اُس کا صرف اور صرف تم پر فوکس ختم ہوجائے گا... لیکن اِس کے ساتھ ساتھ تم کو بھی اپنے دل کو منانا ہوگا اور سحرش کو اُس کا حق بھی دینا ہوگا... اب تم اپنی زندگی کا یہ حصہ اگنور نہیں کرسکتے۔'' پروفیسر اکرم زبیر نے اُسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

''لیکن سر! میں جب سحرش کو دیکھتا ہوں sense of loss میرے اندر بڑھ جاتا ہے اور نگینہ کا تصوّر میرے ہر احساس کو درہم برہم کردیتا ہے۔'' طارق نے بے بسی سے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر گرادیا۔

''اس کا آسان سا حل ہے کہ تم نگینہ سے شادی کرلو... اِس طرح نگینہ کو کھو دینے کا دُکھ اور پچھتاوا تم کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔'' اکرم زبیر کے مشورے پر طارق نے حیرت سے اُن کو دیکھا۔

''لیکن سر! نگینہ سے پہلے میری زندگی میں لڑکی آچکی ہے، وہ کیسے میری زندگی کا حصہ بنے گی...؟''

''ہاں کچھ سوشل پرابلمز تو ہیں لیکن تمہارے مسئلے کا حل صرف اور صرف یہی ہے۔ تم فرض اور محبت کے درمیان جھولتے رہے تو کسی ایک کا بھی حق نہ ادا کرسکو گے اِس لیے تم اُن چیزوں کو حاصل کرو، جو تمہارا بچپن کا خواب ہے پھر تم شاید نہیں یقیناً یہ فرض بھی اچھے طریقے سے نبھالو گے...'' پروفیسر اکرم کا مشورہ طارق کے بے چین اور بے قرار دِل کو ایک دَم قرار دے گیا۔

واقعی یہ سچ تھا کہ نگینہ کو کھو دینے کا احساس اُسے اندر سے توڑنے لگا تھا۔

''تھینک یو سر!'' وہ ڈاکٹر اکرم کا شکریہ ادا کرکے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹا!'' ڈاکٹر اکرم نے اُسے پیچھے سے پکارا۔

''جی سر!''

''اپنے رب پر ہمیشہ یقین رکھنا وہ تم کو کبھی بھی مشکل میں ہمیشہ کے لیے نہیں رہنے دے گا...'' انہوں نے مسکرا کر اُسے دعائیہ انداز میں نصیحت کی۔

''یس سر! انشاء اللہ۔'' وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا۔

واقعی یہ درست ہے کہ صرف ایک مسکراہٹ انسان کے لیے تازہ جھونکے کی طرح ثابت ہوتی ہے۔ طارق اتنے دِنوں سے کھل کر تو کیا دھیمے سے بھی نہ مسکرایا تھا آج جب وہ دھیرے سے مسکرایا تو اُسے اپنے اعصاب بے حد ریلیکس لگ رہے تھے۔ وہ بے حد مگن انداز میں گاڑی چلاتے ہوئے ایک دم رُکا۔ طارق نے بے اختیار چونک کر سامنے عالی شان بنگلے کو دیکھا۔

''... کا شایانہ روشن'' اپنی پوری آب و تاب سے کھڑا تھا۔ مشہور ڈیزائنر کا بنایا ہوا یہ بنگلہ بے حد Elegent اور خوب صورت تھا۔

دل بوجھل بوجھل رہتا ہے
اک بات یہ مجھ سے کہتا ہے
میں اِس کو بہت سمجھاتا ہوں
ہر بار اسے بتلاتا ہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو خواب ہیں تیری آنکھوں میں
یہ تجھ کو پاگل کر دیں گے
اَشکوں سے دامن بھر دیں گے
پھر پاگل دل تُو کیا جانے
جب ٹوٹ کے خواب بکھرتے ہیں
تب یاد کے دیپ بھی جلتے ہیں
اور آنکھ سے آنسو بہتے ہیں
لیکن اے پاگل دِل اب کون یہ تجھ کو سمجھائے

''تم کو بھلانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے نگینہ!'' طارق نے بے اختیار مسکرا کر باآواز بلند کہا۔

''صاحب!'' چوکیدار نے اُسے آ کر چونکایا۔

''ہوں!''

''صاحب دروازہ کھول دوں؟'' چوکیدار نے اُسے پہچان کر کہا۔

''ہوں۔نہیں!'' طارق نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ہیں...؟'' چوکیدار واقعی حیران تھا کہ اگر صاحب نے گھر کے اندر نہیں آنا تھا تو وہ یہاں تک لینے کیا آیا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ دِل کی لگی تو انسان کو صحراؤں تک کی سیر کروا دیتی ہے۔ یہ تو بس گھر تک کا ہی فاصلہ تھا۔

''یہ بڑے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں! جانے کب کیا سوچ لیتے ہیں موڈ بدل لیتے ہیں۔'' چوکیدار نے بڑبڑا کر کہا اور اپنے کیبن میں جا کر بیٹھ گیا۔

❖❖○❖❖

وہ لوریوں کی صدا کہاں ہے
گرہ میں تھی جو دُعا کہاں ہے
چراغ بجھنے پہ آ گیا ہے
ہَوا کو دیکھو ہَوا کہاں ہے
یہ رات اتنی مہیب کیوں ہے
ہمارے آنسو کہاں گرے ہیں
ہمارے غم کا صلہ کہاں ہے
جو کھو گئیں منزلیں کدھر ہیں
جو چھن گیا راستا کہاں ہے!

ترنم کا سارا وجود آنسوؤں کے طوفان سے لرز رہا تھا۔

''میں نے کیسے ہیرے موتی جیسے لوگ کھو دیے...'' وہ دروازے کا تالا پکڑ کر رو دی، یہ اُس کا گھر تھا!

اس کی جنم بھومی! اِس کے آنگن کی مٹی سے اُسے اماں ابا کی خوشبو آتی تھی۔

''میری بیٹی تو شہزادی ہے! یہ تو میری نور العین ہے! میری آنکھوں کا نور ہے۔''

ابا کہتے تھے۔

''ابا! آہ! میں نے اپنے باپ کو بس ایک بازگشت ہی بنا ڈالا!'' وہ سسکی۔

''آپ کی والدہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا اور وہ ایک دِن اچانک گھر سے کہیں چلی گئیں پھر آج تک ان کا پتا نہ چلا۔'' طارق کی آواز ترنم کے کانوں میں گونجی۔

یہ وہ ہی گلی تھی، وہ ہی شہر تھا اور یہ... یہ وہ ہی دہلیز تھی، جس کو چند سال پہلے وہ رات کو پار کر گئی تھی۔

وہ کہاں جانتی تھی کہ دہلیز کے پار تو حفاظت کا ہر دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ کراچی شہر تھا انسانوں سے بھرا پڑا تھا۔

''میں... میں کہاں سے اپنی ماں کو تلاش کروں؟'' وہ خاص طور پر آج کی فلائیٹ سے کراچی آئی تھی، آئی تو وہ ایم پی اے کے لیے تھی لیکن سب سے پہلے وہ اپنے محلے میں گئی تھی۔ رات کے اِس پہر سب محلے دار سو رہے تھے، وہ اِس گھپ اندھیرے میں ڈوبی گلی میں اندھیرے کا حصہ بنی سسک رہی تھی۔

''کاش اُس دِن وہ واپس گاڑی سے اپنے گھر جا سکتی تو ایمان فاطمہ کبھی نہ مرتی!'' روتے روتے اُس ہ کا نمکین ہو گیا تھا۔

''اس گندے سسٹم میں نا جانے کتنی بے قصور ایمان فاطمہ مری ہوں گی اور کتنی ہی ترنموں نے جنم لیا ہو گا۔''

''لیکن اب بس! اب مزید کوئی اور ترنم جنم نہ لے گی، میں اُن کے سارے سسٹم کو ختم کر ڈالوں گی'' ترنم نے وہیں دروازے پر بیٹھے بیٹھے اپنے پرس سے موبائل نکالا اور لاہور ایک نمبر پر بات کی۔

کچھ دیر بعد وہ پُرسکون ہو کر دروازے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے جو خبر لیک آؤٹ کی تھی۔ کل کے اخبار کی وہ ہیڈ لائن بننے والی تھی۔

''اے پاک دہلیز! میں تیری قصور وار ہوں... لیکن آج میں نے وہ کیا ہے کہ تیرا کچھ نہ کچھ قرض ضرور اُترے گا...'' ترنم کے چہرے پر بہت ہی مختلف قسم کی مسکراہٹ تھی، جیسے اندھیرا چھٹنے والا ہو...

❖❖○❖❖

یہ ڈھلتے بڑھتے سائے، اور گھٹتی بڑھتی چھاؤں
یہ آتے جاتے موسم، یہ رنگ بدلتا آسمان
سب بے اعتبار ہیں، چڑھتے سورج کے پجاری
کبھی تیرے ہیں تو کبھی میرے
جانے والوں کے ساتھ کوئی نہیں روتا
آنے والوں کا ساتھ... سب دیتے ہیں
ساون گیلا کیے بنا سات سمندر پار ہو جاتے ہیں
آنسو بن کہاں... زندگی کٹتی ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کون جانے قسمتوں کے آسمان پہ
مقدر کے دوڑتے بادل
کس کے در پہ برستے ہیں؟
موسموں کے اعتبار پہ مت رہو، سب دھوکا دیتے ہیں
یہ ڈھلتے بڑھتے سائے، یہ گھٹتی بڑھتی چھاؤں

باہر ڈھولک کی تھاپ پر گاؤں کی نائن بلند آواز میں شادی کے ماہیے گا رہی تھی۔ جیسے جیسے نائن کی آواز میں جوش بڑھتا جارہا تھا۔ مسکان کا دِل بُری طرح ڈوبتا جارہا تھا۔

''میرا وجود بہت مضبوط ہے بلکہ میں بہت ڈھیٹ ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ میں مسلسل دو تین بار موت کے منہ میں گئی ہوں۔ لیکن کیا میں اتنی بُری ہوں کہ موت تک مجھے قبول نہیں کرتی...'' مسکان نقاست سے چلتی ہوئی شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آئینہ ایک الگ ہی مسکان کو دکھارہا تھا، وہاں سامنے تو ہڈیوں کے ڈھانچے کا عکس تھا۔ سرخ سنہری رنگت کملا کر سنولا گئی تھی، آنکھوں کے گرد بے حد گہرے حلقے پڑے ہوئے تھے۔

''تم کون ہو...؟'' بے اختیار مسکان کے اندر سے اِس عکس نے پوچھا۔

''Iam a Loser!'' مسکان نے سسکی بھر کر کہا۔

''اوہ! تو کیا ناکام لوگ تمہاری طرح زندہ لاش بن جاتے ہیں؟''

''شاید...'' مسکان نے غائب دماغی سے کہا۔

واقعی یہ عکس کسی لوزر ہی کا ہوسکتا ہے، آئینہ ایک دم قہقہے لگانے لگا۔

''یو لوز ایوری تھنگ...''

''تم نے اپنی محبت کھودی...''

''تم نے اپنا باپ کھودیا...''

''تم نے اپنا اعتبار کھودیا...''

''تم نے اپنا بہتر مستقبل کھودیا...''

''لیس یو آر لوزر! لوزر... لوزر... لوزر!'' آئینہ قہقہے لگا رہا تھا۔ مسکان نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم کی بوتل اُٹھا کر آئینے پر دے ماری، آئینہ زمین پر گر کر کرچی کرچی ہوگیا۔ مسکان نے جھک کر کرچیوں کو دیکھا۔

ٹوٹے پھوٹے شیشوں میں اُس کا اپنا عکس بھی ٹوٹا پھوٹا سا ہو کر رہ گیا تھا۔

''مسکان! تم بھی اندر سے ٹوٹ چکی ہو...'' وہ تھک کر بیڈ کی پائینتی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''بیگم صاحبہ! بی بی جی! مہندی آگئی ہے۔'' ملازمہ جوش سے اندر بھاگی چلی آئی۔

مسکان نے خالی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ہائے ربا! اے کی ہویا...؟'' ملازمہ نے سارے کمرے میں بکھرے شیشے دیکھ کر پوچھا اور جلدی جلدی شیشے اکٹھے کرنے لگی۔

ابھی سب عورتوں نے اِسی کمرے میں دلہن کو لینے آنا تھا، مہندی لگانے کے لیے مسکان کی سسرال سے بہت ساری خواتین آئی تھیں۔

''تمہاری آپا اماں کہاں ہیں؟'' سید سرفراز علی نے اندر آکر سوال کیا۔ مسکان نے منہ موڑ لیا۔

سید سرفراز بے حد جلدی میں تھے انہوں نے کسی بھی اُلجھن سے بچنے کے لیے باہر کا رُخ کیا۔

''آپا اماں کہاں...؟'' مسکان کے دماغ نے بھی پوچھا۔

گزشتہ دو دن سے وہ نظر نہ آئی تھیں۔ اگر مسکان ذہنی تکلیف کے اِس دور سے نہ گزر رہی ہوتی تو وہ اماں کی غیر حاضری پر یوں لاپروائی ہرگز نہ دکھاتی۔

''بی بی جی کدھر جارہی ہو...؟'' ملازمہ نے اُسے باہر نکلتے پوچھا۔

''آپ کی سسرالی عورتیں بس اندر ہی آنے والی ہیں۔'' ملازمہ نے فکر مندی سے پوچھا۔ کچھ سید سرفراز کی خاص ہدایات تھیں کہ مسکان کو اکیلے نہ چھوڑا جائے۔

''میں ٹھیک ہوں... تم فکر نہ کرو، اماں کو دیکھنے جارہی ہوں۔'' مسکان نے رک کر کہا۔

''وہ تو بی بی اپنے کمرے سے دو دن سے نکلیں ہی نہیں...'' ملازمہ اطلاع دے کر دوبارہ شیشے چننے

مسکان دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آپا اماں کے کمرے کی طرف چل دی لیکن دروازے پر جا کر اُس کے قدم اندر جانے سے رُک گئے۔

اندر سے سید سرفراز علی اور آپا اماں کی اونچی اونچی بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''میں یہ ظلم نہ ہونے دوں گی...'' آپا اماں کی آواز میں جو طاقت تھی وہ باہر کھڑی مسکان محسوس کرسکتی

''کس ناتے...؟'' سید سرفراز علی غرائے۔

''بیوی ہوں تمہاری!'' آپا اماں کے انکشاف نے مسکان کے سر پر دھماکا کیا۔

''ہونہہ! تم کب مانتی ہو اِس رشتے کو...'' سید سرفراز علی نے کہا۔

''بیس سال اور آٹھ ماہ سے میں تمہاری رکھیل کی طرح جی رہی ہوں... لیکن اگر وہ نیک فرشتہ انسان عبداللہ میرا نکاح نہ کرواتے تو شاید میں ساری عمر حرام جینے پر مجبور ہوتی... اور جو تمہارا رویہ تھا اُس میں کیسے تمہیں اعلانیہ شوہر کہہ سکتی تھی؟ مجھے ڈر لگتا تھا کہ تمہارے کردار کی بدنامی کہیں مجھ تک آکر بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے...'' آپا اماں نے بے حد سچائی سے جواب دیا۔

''لیکن صائمہ سے مسکان پیدا ہوئی تھی، تم اُس کی اصلی ماں نہیں ہو... اِس لیے مت بھولو کہ تم نے اُس سے پنگا لیا ہے۔'' سید سرفراز علی نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''میں جب تک زندہ ہوں آخری سانس تک یہ لڑائی لڑوں گی... میں اپنی بیٹی کی زندگی کبھی برباد نہ ہونے دوں گی...'' آپا اماں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''تو پھر تم کو مرنا ہوگا...'' سید سرفراز علی کی سرد آواز پر باہر کھڑی مسکان کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ تیزی سے اندر بھاگی۔ سید سرفراز علی کے مضبوط ہاتھوں نے آپا امّاں کی گردن کو دبوچ رکھا تھا۔
''بابا...!'' مسکان نے آگے بڑھ کر پوری طاقت سے سید سرفراز علی کو پرے ہٹایا۔
سید سرفراز علی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔
''پلیز! اِن کو چھوڑ دیں...'' مسکان گڑگڑائی۔
آپا امّاں مسلسل کھانس رہی تھیں۔
''تو پھر اِس سے کہو کہ ابھی فوراً اُس وومن ایسوسی ایشن یا جو بھی کوئی این جی او والوں کو روکے، فو
کرے، ورنہ مجھے اِسے ختم کرنے سے کوئی نہ روک سکے گا...''
''آپا امّاں پلیز! آپ نے کیوں یہ سب کچھ کیا...؟'' مسکان نے روتے ہوئے کہا۔
''اپنی اولاد کے لیے تو بلّی بھی شیر سے لڑ جاتی ہے میں تو پھر انسان ہوں...'' آپا امّاں نے کھان
ہوئے کہا۔
''پلیز آپ منع کر دیں آپ کو میری قسم! اگر آپ نے این جی او والوں کو نہ روکا تو آپ میرا مرا
منہ دیکھیں گی۔''
''نہیں بچے!'' آپا امّاں تڑپ اُٹھیں۔
''تو آپ فوراً منع کر دیں۔'' مسکان نے تھکے تھکے لہجے میں اصرار کیا تو آپا امّاں کو مجبوراً فون کر
اُن لوگوں کو منع کرنا پڑا، ورنہ تو این جی او کی چیئر پرسن پریس والوں کے ساتھ حویلی پر ہلّہ بولنے والی تھی
''تم نے ایک بار پھر مجھے بیچ راستے رُسوا کیا ہے۔'' آپا امّاں پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔
''آپ اِسے میری بُری قسمت سمجھ کر قبول کر لیں۔'' مسکان روتے روتے اُن کے قدموں میں ب
گئی۔ آپا امّاں نے کاٹتی نظروں سے اُسے دیکھا۔
سید سرفراز علی نے ایک گہری نگاہ دونوں پر ڈالی اور باہر نکل آئے۔ مسکان کا روتا سسکتا وجود اُن
بے قرار کر چکا تھا۔ وہ کتنے ہی دِنوں سے اُس سے بھاگ رہے تھے لیکن آج آخر اُن کا سامنا مسکا
سے ہو ہی گیا تھا۔ وہ وہاں سے تیزی سے بھاگے تھے کہ کہیں مسکان کے آنسو اُن کو پگھلا نہ دیں۔

❖❖○❖❖

کمرے کی خاموشی کو گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آواز توڑنے میں مصروف تھی، اس لیے یہ آواز یوں لگ
رہی تھی جیسے وہ خاموشی کا گیت ہو یا اَن کہے لفظوں کا ردھم!
کمرے میں موجود دونوں نفوس کتنی ہی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ بعض اوقا
وہ لفظ ہی ختم ہو جاتے ہیں، جن سے گفتگو چلتی ہے۔
''آپ کے لیے چائے لاؤں...؟'' علیزے نے آخر خاموشی توڑ ڈالی
''نہیں! تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔'' ولی نے گہرا طویل سانس بھرا۔ سُکھ انسان کو اتنا قریب نہیں ل
جس قدر دُکھ انسانوں کے درمیان فاصلے کم کر دیتا ہے، ولی بھی علیزے کو آپ سے تم کہنے لگا تھا۔
علیزے چپ چاپ دوبارہ بیٹھ گئی۔
''حسن خالہ کہاں ہیں...؟'' ولی نے کچھ دیر پہلے کا کیا سوال دوبارہ دہرایا۔

''وہ سو رہی ہیں، میں نے اُن کو نیند کی گولی دی تھی تا کہ وہ سو جائیں...'' علیزے کی آواز ابھی تک
ہوئی تھی۔
رو کر اُس کا حال بے حال ہو چکا تھا۔ اِس وقت بھی وہ نڈھال بیٹھی تھی، جیسے کچھ دیر میں ہی گر
گی۔
''منزہ... منزہ کا دُکھ! ایک روگ کی طرح ہمارے ساتھ رہے گا... وہ جس طرح ہمارے بیچ سے نکل کر
ہے وہ دُکھ سدا تازہ رہے گا۔''
''میں تمہیں اُسے بھولنے کو بھی نہ کہوں گا وہ تمہاری بہن تھی۔ اُس کی موت کا دُکھ اور اس کی تلافی تب
کن ہے کہ تم اُس کے لیے کچھ زادِ راہ بھیجو...'' ولی نے گہرا سانس بھر کر کہا۔
''تمہارے آنسو اُسے کوئی فائدہ نہ دے پائیں گے ہاں البتہ تم جو اُس کے لیے بخشش کی دُعا کرو گی،
اُس کے لیے اُس کی مغفرت کے لیے صدقہ جاریہ قرآن پاک پڑھ کر، نیک عمل کر کے یا خیرات کر کے
گی، وہ اُس کی منزلیں آسان کرنے کے لیے مدد دے گا...'' ولی نے قریب بیٹھی علیزے کے سرد ہاتھوں
اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
علیزے کو اپنے نڈھال مردہ وجود میں ایک دم طاقت کا احساس ہوا۔
''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' علیزے کو واقعی ولی نے راہ دکھائی تھی، ورنہ وہ بہت دِنوں سے خالی سوگ
بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔
لی! ہمارا سارا گھر بکھر گیا ہے۔'' وہ سسکی۔
''کاشف...'' علیزے نے کچھ کہتے کہتے اپنی زبان دانتوں تلے لے لی، وہ کیسے راز سے پردہ اُٹھانے
رہی تھی۔
''کیا ہوا کاشف کو؟ وہ سارے دورانیے میں کہیں نظر نہیں آیا۔'' ولی نے سوال کیا۔
''پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے اُس کی گمشدگی بھی بہت پریشان کُن ہے۔'' علیزے نے خالی آنکھوں
سامنے بنی کھڑکی جو آنگن میں کھلتی تھی اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ابو بے حد خاموشی سے تخت پر لیٹے
ئے تھے وہ اپنے آپ میں بے حد مگن سے تھے جو اُن کو گھر آئے گئے تک کی خبر نہ تھی۔
''حیرت ہے کسی نے پہلے ذکر تک نہیں کیا ورنہ بہت پہلے اُس کی خبر گیری کر لی جاتی...'' ولی کو واقعی
ت ہوئی تھی کہ کہاں تو خالہ، خالو بیٹے کے بغیر نہ رہتے تھے کہاں وہ اتنے دِن سے اُس کی گمشدگی پر
وش بیٹھے تھے۔
علیزے نے ایک دم نگاہیں چرائی تھیں، اب وہ کس منہ سے واپس آتا۔
''کیا بہن کو قتل کرنے کے بعد وہ کبھی ہم سب سے نگاہ ملا پائے گا اور کیا ہم... ہم اُسے معاف کر سکیں
، کیا منزہ کا خون اتنی آسانی سے معاف کیا جا سکتا؟'' یہ سارے سوال مل کر اُس کے اندر شور مچا رہے
ے۔
''علیزے!'' ولی کی آواز نے اُسے چونکایا۔
''جی...!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کہاں کھوگئی ہو؟ میں پتا کرواتا ہوں کاشف کا، تم لوگ پریشان نہ ہونا، وہ کوئی بچہ تھوڑا ہی ہے جو گھ کا راستا بھول گیا ہو..." ولی نے علیزے کو تسلّی دی۔

"ہاں وہ بچہ نہیں ہے، لیکن بھٹکا ہوا ضرور ہے۔" علیزے نے دِل ہی دِل میں کہا۔

"میں حُسن خالہ سے مل لوں، اب وہ اُٹھ چکی ہوں گی..." ولی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"شاید... کیوں کہ وہ نیند کی گولی لے کر سوئی ہیں۔" علیزے نے بے حد نارمل انداز میں کہا۔

ولی نے چونک کر اُسے دیکھا۔ کاشف کے ذکر پر اُس کا لہجہ، رویّہ کچھ عجیب سا تھا کچھ بہت مختلف جس کو ولی محسوس تو کرسکتا تھا لیکن بیان نہ کرسکتا تھا۔

"آئیں میں آپ کو امی کے پاس لے چلوں۔" علیزے کہہ کر باہر نکل گئی۔

ولی چپ چاپ کتنے ہی لمحے کھڑا رہا۔

کچھ عجیب سا ہے! کچھ راز سا ہے!

لیکن کیا؟ ولی بے حد ذہین انسان تھا، وہ آس پاس کیا پک رہا ہے، بہت پہلے محسوس کرلیتا تھا۔

ایسا ہی اِس معاملے میں تھا۔

"کچھ راز تو ہے!" ولی نے طویل سانس بھر کر اپنے آپ کو پُرسکون کیا۔

"دیکھتے ہیں کہ میرا شک درست نکلتا ہے کہ نہیں!" ولی نے با آواز بلند پرسوچ لہجے میں کہا۔

❖❖❖○❖❖❖

"سر میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے اُوپر تک بات کرلینی چاہیے۔" طارق کے ماتحت آصف نے یہ مشو کوئی تیسری بار دیا تھا۔

"یونو آصف! ہم پولیس والوں کے ہاتھ سے اسّی فیصد مجرم نکل کیوں جاتے ہیں؟" طارق نے ا ریوالور میں گولیاں چیک کرکے کمر کے پیچھے ہوسٹر میں لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہم لوگ جہاں بھی جاتے ہیں ہماری گاڑیوں میں موجود سائرن الارم کی طرح مجرموں کو الر کردیتا ہے، بھاگنے میں مدد کردیتا ہے، چوہے کو پکڑنا ہو تو بلّی تک جس کے قدموں کی چاپ نہیں ہوتی بھی دبے پاؤں چوہے کو پکڑنے کے لیے بڑھتی ہے۔ ایک ہم ہیں! ہم ایک معمولی سا ریڈ بھی مار جائیں گے تو آس پاس سارے محلّے کو باخبر کرکے نکلیں گے۔ میں مانتا ہوں کہ ریڈ کرنے کے لیے اَ پراسیس ہوتا ہے، ہمیں ہر صورت اپنے بڑوں سے اجازت لینی ہوتی ہے لیکن ہمارے عہدوں کے حق بھی ہے اور اختیار بھی... اور بائی داوے! نوکری ہم کس بات کی کررہے ہیں۔ چلو جلدی نکلو ہماری بے حد احتیاط کے باوجود کوئی نہ کوئی خبر اس ریڈ کو لیک آؤٹ کردے گا..." طارق نے تیزی باہر نکلتے ہوئے کہا۔

آصف کو لامحالہ باہر کی جانب رُخ کرنا ہی پڑا۔

"طارق سر بھی نا! ہر وقت پنگے، پھڈے لیتے رہتے ہیں۔" آصف بڑبڑاتا ہوا پیچھے پیچھے آیا۔

❖❖❖○❖❖❖

"بھائی یہ آپ کے نام ارجنٹ میل سے کوئی خط آیا رکھا ہے۔" ولی کے گھر آتے ہی نگینہ نے اط

"کدھر ہے!"

"ادھر آپ کی ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔" نگینہ نے کمرے کے پردے برابر کرکے ہیٹر آن کردیا۔

"تھینک یو!" ولی نے مشکور نظروں سے بہن کو دیکھا، جو اُس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بے حد ال رکھتی تھی۔

"اماں جان اور بابا سائیں کا کوئی فون آیا؟" ولی نے مگن سے انداز میں لفافہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

نے والے نے پشت پر اپنا ایڈریس نہ لکھا تھا۔

"ہاں بھائی! شام میں آیا تھا۔ انشاء اللہ کل تک واپسی ہوجائے گی..." احمد شاہ اور روشن آرا بیگم ؤں پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں مزارعوں کی آپس کی لڑائی میں بندہ مارا گیا تھا۔ احمد شاہ کو ایمرجنسی میں نا پڑا تھا انہوں نے روشن آرا بیگم کو بھی ساتھ لے لیا تھا کیوں کہ گھر میں رہتے ہوئے وہ ہر وقت منزہ ی جواں مرگی کے غم میں رہتی تھیں، روشن آرا بیگم کا دِل اور ذہن بٹ جائے اِس لیے احمد شاہ اُن کو مجبور کے لے گئے تھے۔

"بھائی! میں نے مقبول کو کھانا گرم کرنے کا کہہ دیا ہے۔ آپ ہاتھ منہ دھوکر آجائیں، تب تک میں انا لگواتی ہوں۔" نگینہ کہہ کر باہر نکل گئی جب کہ ولی گم صم سا ہاتھ میں پکڑی تحریر کو دیکھ رہا تھا۔

کفِ شام پہ سجی حنا کا سرخ اور سیاہ ہونا
دورِ جنوں کا... بڑھتے جانا
ہمارے سانسوں کی ڈور کو جھٹکے لگا رہا ہے
آنکھوں کے سامنے، تاریکی اُسی طرح بڑھ رہی ہے
جس طرح کھڑکی کے پار...
آسمان پر چھائے گھرے بادلوں کی چادر
لحظہ بہ لحظہ دبیز ہوتی جارہی ہے
ریتیلی دِل کی زمین پر... اَن گنت دُکھ
سسکتے دم توڑ رہے ہیں
کیا یہ یوں ہی بے گوروکفن پڑے رہ جائیں گے؟
ہاں! تمہیں تو اِس حادثے کی خبر بھی نہ ہوگی
اور ہم! چپکے سے یہ دنیا چھوڑ جائیں گے
مگر... اِس سے پہلے
وہ سامنے... رائٹنگ ٹیبل پر
اِک آخری نامہ تمہارے نام رکھا ہے
اُسے پڑھ کر... تمہیں یقین آجائے
کہ زیست کے اِن آخری لمحوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہاری ہی یادیں... تمہاری ہی باتیں
ہمارے ذہن کی غلام گردش میں بھٹکتی پھر رہی تھیں
اور... ہماری بے جان آنکھوں میں
تمہاری ہی صورت منقش تھی
مگر بہت ممکن ہے
جتنی دیر میں تمہیں اِس بات کا احساس ہوگا
سینہ گیتی پہ مٹی کا اِک اور ڈھیر... بڑھ چکا ہوگا

ولی نے لفافے میں دُوسرے کاغذ کو دیکھا یہ مسکان کی شادی کا کارڈ تھا۔

اس نے بے اختیار دُکھ بھرا سانس لیا۔ وہ اُسے اپنی زندگی کا مرکز جب مانے ہوئے تھی، تب بھی ولی بے خبر تھا اور آج وہ اُسے اپنی بربادی کا ذمے دار ٹھہرا رہی تھی تب بھی ولی بے قصور تھا، لیکن وہ اُسے ہی سارے معاملے کا قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔

''اُس کی شادی ہو رہی ہے! چلو شکر ہے کم از کم وہ اپنی نئی زندگی میں مگن ہو کر مجھے تو بھول جائے گی...'' ولی نے خود کو تسلی دی۔

''جب تک لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی تب تک انہیں تصوراتی (آئیڈیل) مرد بے حد عزیز ہوتا ہے اُن کو لگتا ہے کہ وہ اُس کے بغیر مر ہی تو جائیں گی، لیکن پھر یہ لڑکیاں اپنے شوہر کی محبت میں اِس قدر آگے نکل جاتی ہیں کہ اُن کو اپنا ماضی کسی حماقت سے کم نہیں لگتا۔'' ولی مسلسل ایسی ہی سوچوں میں گرفتار خود کو تسلیاں دے رہا تھا لیکن جانے کیوں اتنی زیادہ تسلیاں دینے کے باوجود اُس کا دِل مطمئن نہ ہو رہا تھا۔

❖❖○❖❖

لاہور کو داتا نگری بھی کہا جاتا ہے، اُن کے کتبے پر یہ تحریر دیکھ لو کس قدر خوب صورت ہے۔

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں رہبرِ کامل کاملاں را رہنما

طارق نے بلند آواز میں تحریر کو پڑھا۔ پھر داتا صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھی، اب وہ دُعا کے بعد آصف سے محوِ گفتگو تھا۔

''اگر داتا صاحب کو اندازہ ہوتا کہ لوگ اُن کے مزار کے گرد ایسے ایسے گھناؤنے عمل میں مصروف ہوں گے تو داتا صاحب کبھی یہاں آرام کرنا پسند نہ کرتے...'' آصف نے جذباتی ہو کر کہا تو طارق بے اختیار مسکرا دیا۔

''کم آن یار! اگر ہمارے پاس یہ ولی نہ ہوتے تو ہم آگہی اور رہنمائی سے محروم رہتے... پھر یہ جو کچھ ہو رہا ہے اِس میں گناہ گار بھی ہدایت اور اچھائی سے محروم ہیں۔ ہم اُن گناہ گاروں سے اِس داتا کی نگری کو پاک کر دیں گے... بس اللہ کی مدد چاہیے۔'' طارق نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

آج رات طارق نے مزار کے پاس کچھ مخصوص گلیوں کا گھیراؤ کروایا تھا۔ وہ آج اِن گناہ آلود

اندھیری گلیوں میں ریڈ کرنے والے تھے، جہاں خیرات کی دیگیں بھی پکائی اور چھپائی جاتی تھیں۔

❖❖○❖❖

مسکان کا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا، اُس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو ایک دَم چونک کر بیٹھ گئی، یہ اُس کا کمرا نہ تھا۔ اِس کمرے تک وہ شاید نیم بے ہوشی میں لائی گئی تھی۔ دلہن کے لباس میں زیور سے لدا یہ اُس کا اپنا ہی وجود تھا۔

مسکان کو اپنے گلے میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ پانی کی شدید طلب نے اُسے اُٹھنے پر مجبور کیا۔ ابھی اُس نے ٹانگیں مسہری سے لٹکا کر پاؤں زمین پر ہی رکھے تھے کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص نشے میں دھت اندر داخل ہوا، اُس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔

''معاف کرنا بھرجائی! بھائی صاحب آج آپ کے آنے کی خوشی میں زیادہ پی گئے ہیں۔'' ساتھ ہی اُس موٹی سی سانولی خاتون نے ہنسنا شروع کر دیا۔

مسکان نے حیرت بھری نظروں سے خاتون کو دیکھا۔

''ارے بھابی بھی کہتی ہوگی کہ میں نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔'' عورت نے نشے میں دھت مرد کو کرسی پر بٹھا دیا، جو اگلے ہی پل میں ہوش سے بے گانہ ہو گیا تھا۔

''میں نا آپ کی سب سے چھوٹی نند ہوں۔'' وہ ایک بار پھر بے ترتیبی سے ہنسی۔ مسکان کو اُسے دیکھ دیکھ کوفت اور کرسی پر ڈھے ہوئے شخص کو دیکھ کر بے حد وحشت ہو رہی تھی۔

''بھابی کو کچھ کھلایا پلایا نہیں؟'' اُس کی دوسری نند نے سوال کیا۔

''ہیں! بھرجائی تم نے تو کچھ بھی نہیں کھایا! یہ کھانے کی ٹرے، پھل دودھ تو جوں کا توں پڑا ہے۔'' اُس کی سب سے چھوٹی نند نے جاہلانہ انداز میں اُونچا بولتے ہوئے کہا۔

''میں... مجھے... پانی چاہیے۔'' مسکان نے مری مری آواز میں کہا۔

''ہاں یہ لو...'' دوسری نند نے جلدی سے چھوٹا سا روم فریج کھول کر پانی نکال کر اُسے تھمایا۔

''بھرجائی کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بول دینا۔'' اُس نے سخاوت دکھاتے ہوئے کہا جب کہ مسکان گھونٹ گھونٹ پانی حلق میں اُتارتے ہوئے اپنے اِرد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اِس بڑے سے کمرے کی اجنبی فضا سے اُس کا دِل بُری طرح گھبرا رہا تھا۔ آنے والے لمحوں کا سوچ کر اُس کا دل بُری طرح گھبرایا۔ وہ مسز اظہر علی بنا کر اِس کمرے اِس حویلی میں پہنچا ہی دی گئی تھی۔

❖❖○❖❖

''دور دراز کے علاقوں سے لوگ منتیں مانگنے، دعائیں کرنے داتا صاحب آتے ہیں، اِن زائرین میں جوان لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں، جو اپنے والدین کے ساتھ آتی ہیں۔ گزشتہ پانچ سال کا ہی ریکارڈ دیکھ لو، ہر مہینے تقریباً ایک یا دو لڑکیاں، بچیاں اور عورتیں غائب ہوئی ہیں، بہت تلاش کے باوجود یہ لڑکیاں کہیں سے بازیاب نہیں ہو پاتیں، گھر والے اور انتظامیہ اِس لیے پریشان ہوتے ہیں کہ آخر چند منٹوں میں لڑکی کہاں غائب ہو جاتی ہے؟ بہت سے کھاتے پیتے، اعلیٰ گھرانوں کی لڑکیاں غائب ہوئیں تو انہوں نے بہت زیادہ شور مچایا، پولیس عدالت! لیکن کسی کو کبھی بھی اپنی بیٹی نہ مل سکی۔ یہ کیس آج تک ان سولوڈ

پڑے تھے۔ کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ لڑکیاں کہاں گئیں یا انہیں کون لے گیا؟'' طارق نے رُک کر سب کی جانب دیکھا، ابھی کل ہی اُس نے ایک کامیاب ریڈ کر کے بہت ساری لڑکیاں بازیاب کروائی تھیں، اب وہ اپنی رپورٹ ہائی کمان کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

''لڑکیاں اغوا کر کے وہیں پاس ہی گلیوں میں چھپادی جاتی تھیں، اِسی لیے لڑکیاں کسی ناکے تک نہ پہنچتی تھیں نہ پکڑی جاتی تھیں۔ اِن لڑکیوں کو مہینوں اِن ہی گلیوں میں بنے چھوٹے چھوٹے گیراجوں، کوٹھی خانوں اور اندھیری دکانوں میں رکھ کر جسم فروشی کروائی جاتی۔ جب لڑکی ان کے سامنے بالکل اِس کام کے لیے سرنڈر کر جاتی تو اُسے ریڈ لائیٹ ایریا میں شفٹ کر دیا جاتا، جہاں ایک نہ ختم ہونے والا جہنم ہوتا تھا، جس میں انہیں عمر بھر کے لیے جلنا ہوتا تھا اچھی شکل اور تعاون کرنے والی لڑکیاں باقاعدہ تربیت پاتیں اور عام صورت لڑکیاں وہیں عام لوگوں کے لیے رکھی جاتیں۔''

''اِن لڑکیوں کا اغوا بہت چالاکی سے کیا جاتا ہے۔ جب کوئی خاندان منت ماننے کے لیے آتا اور کچھ گھنٹے یا رات کا قیام کرتا تو نائکہ اپنی چھ سات لڑکیوں کے ساتھ اِس خاندان کے ساتھ گھل مل جاتی ہے۔ پھر کسی بھی لمحے لڑکی کو اہل خانہ سے جدا کر دیتی ہے اور اُس کے کارندے صرف چند منٹوں میں لڑکی کو اُس اندھیری گلی میں بنے گیراج میں پہنچا دیتے، جہاں کسی کا دھیان اور شک بھی نہ جاتا۔ ماں باپ بے چارے تلاش کرتے رہ جاتے تھے لیکن آج تک کسی کی لڑکی دستیاب نہ ہو سکی تھی۔ گزشتہ رات ہمیں اطلاع ملی تھی اور اُسی مخبری کی وجہ سے ہم نے کامیاب ریڈ کیا اور سترہ لڑکیاں بازیاب کروائیں اس گروہ کے تقریباً سارے افراد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اِن لڑکیوں میں دو معصوم بچیاں بھی ہیں ایک کی عمر تیرہ سال ہے اور دوسری کی عمر صرف آٹھ سال ہے، یہ بچیاں تقریباً پانچ مہینے پہلے اغوا ہوئی تھیں۔ باقی کی لڑکیوں میں دو عورتیں ایسی ہیں، جو خاوندوں سے جھگڑ کر دربار آئیں اور اکیلی ہونے کی وجہ سے اِن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئیں، کچھ لڑکیاں باہر کے دور دراز کے علاقوں سے ہیں، بے چاری مہینوں سے مسلسل سخت جسمانی اذیت میں تھیں۔ دِن میں چار پانچ بار دلال اُن کو گاہکوں کے حوالے کر رہا تھا۔ اُن میں سے ایک بے حد بیمار ہے، جسے فوراً ہسپتال داخل کروا دیا گیا ہے۔ جب ہم اِن لڑکیوں کو لے کر گاڑیوں میں بٹھا رہے تھے تو ہمارے سر شرم سے جھک گئے تھے، اُن سب کی نظروں میں دِن کی روشنی اور ہوا دیکھنے کی جو حسرت تھی وہ دِل دہلا دینے والی تھی، ایک انسان کیسے شیطان بن جاتا ہے کہ وہ معصوم اور پاکیزہ لڑکیوں کو عزت، خوشی، آزادی تک سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسے بدبختوں کا نام چاہے مسلمانوں جیسا ہو، مگر ایمان اور اِسلام نے اِن کو چھوا بھی نہیں ہوتا، گناہ کے اِس کاروبار میں انہیں نہ مذہب روک پاتا ہے نہ قانون!''

''ایک خوف خدا رکھنے والی جگہ، خدا کی نافرمانی کی بنیاد پہ غلیظ کاروبار پروان چڑھ رہا تھا۔ ایک مزار جو لوگوں کے عقیدتوں کا مرکز ہے، وہاں زندگیاں برباد ہو رہی تھیں۔''

''ریڈ اِز سکسیس فُل! ہم نے کچھ بہت اہم کارندے پکڑے ہیں، انشاء اللہ آئندہ کا آپریشن بہت دھماکا خیز ہوگا۔'' طارق نے دھیمے سے مسکرا کر کہا اور اپنی بات مکمل کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''گڈ مسٹر طارق!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لیکن! آپ اِن لڑکیوں کے لیے آئندہ کیا لائحہ عمل تیار کریں گے؟'' طارق سے اُس کے ایک ڈائریکٹر نے پوچھا۔

''جن کے گھر والے اُن کو لے جانا چاہیں گے... وہ لڑکیاں اُن کے حوالے کر دی جائیں گی اور باقی کو دارِ رحمت میں بھیج دیا جائے گا۔''

''گڈ!''

''مسٹر طارق آپ نے جو رپورٹ پیش کی ہے، اُس میں کچھ بہت بڑے بڑے نام بھی شامل ہیں، کیا آپ اِن ناموں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تیار ہیں؟''

''ابھی تو نہیں سر! کیوں کہ اِن اہم شخصیات کو پکڑنے کے لیے ہمارے پاس مکمل ہوم ورک ہونا ضروری ہے، جس کے لیے ہم لگے ہوئے ہیں۔'' طارق نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ہوں! ٹھیک ہے! اچھا آپ بتائیے کہ آپ کا سورس آف انفارمیشن کیا ہے؟ آپ کا یہ ریڈ، آئی مین یہ دوسرا کامیاب آپریشن ہے، آپ تو بڑے ٹھیک نشانے سے ریڈ کر رہے ہیں۔'' اُن چار ڈائریکٹروں میں سے ایک نے بہت تجسس سے پوچھا تو طارق کی چھٹی حس نے الارم کیا کہ اُسے یہ سوال ہر صورت ٹالنا ہوگا۔

''بس سر اِس سارے آپریشن میں ہماری نیک نیتی کاؤنٹ کرتی ہے۔ ہم نے بہت محنت اور پلان سے سب کچھ کیا تھا اور باقی رہا سورس آف انفارمیشن تو وہ ہم خود ہی ہیں۔ بس کبھی کبھی بلّی کی طرح دبے پاؤں پیچھے لگ کر کچھ اہم راز حاصل کر لیے جاتے ہیں ورنہ کوئی خاص سورس آف انفارمیشن یا سورس آف پرسن نہیں ہے۔'' طارق صاف ترنم کا نام بچا گیا تھا۔

''اوکے طارق!''

ویل ڈن طارق!'' باقی سب نے اُٹھ کر اُسے شاباش دی، سوائے اُن میں سے ایک کے، وہ مسلسل طارق کو جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

طارق جب باہر نکلا تو اُسے اپنی پشت پر اُن ڈائریکٹر صاحب کی نظروں کی تپش کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

''یہ بندہ گڑبڑ ہے! یقیناً یہ کوئی نہ کوئی پرابلم پیدا کرنے والا ہے، مجھے ترنم سے رابطے کے لیے مزید احتیاط کرنی ہوگی، ورنہ وہ بے چاری تو خوامخواہ ماری جائے گی۔'' طارق نے دِل ہی دِل میں کہا۔

''ویسے وہ لڑکی کتنی عجیب ہے نا! اپنی جان خطرے میں ڈال کر مسلسل ہماری مدد کر رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر کبھی کال گرل کا احساس نہیں ہوتا، سچ ہے کنول کا پھول کیچڑ میں رہ کر بھی خوب صورت لگتا ہے۔'' طارق نے اپنے دِل میں ترنم کے لیے بے حد عزت محسوس کی۔

❖❖○❖❖

''تم سے میں نے کہا تھا کہ اِس لڑکے کا کوئی بندوبست کرو، کم بخت جان کو ہی آ گیا ہے۔'' چاندنی میڈم اِس وقت بے حد غصّے سے فون پر میڈم رانی سے بات کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے میں انتظار کر لیتی ہوں... لیکن دیکھنا تمہارا یہ انتظار کسی دن ہمیں لے ڈوبے گا۔'' میڈم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاندنی نے غصّے سے فون رکھا۔

آج کل اُس کی طبیعت خراب تھی اور کل کے واقعے کے بعد اُس کی صحیح معنوں میں کمر ٹوٹی تھی ستر لڑکیاں اُس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھیں، اِس سے زیادہ دکھ اُسے اپنے بہت اہم کارندوں کے جانے کا ہوا تھا۔ اُس کے خفیہ اڈے لیک آؤٹ ہوگئے تھے۔ کل اس کے دھندے پر باقاعدہ بُرا وقت آیا تھا۔ لیکن راگنی اِس سارے معاملے میں بے حد پُرسکون تھی۔ مشکل یہ تھی کہ بگ باس کے درمیان جو رابطے کا پُل تھا، وہ راگنی ہی تھی اسی لیے راگنی کو اپنے اسٹیٹس پر بہت زیادہ غرور تھا۔ ایسے میں وہ باقی لوگوں کو اگنور کر دیتی تھی۔

''آپا! طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' ماہی نے بہ غور اُس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میڈم چاندنی کا چہرہ اِس قدر پیلا پڑ رہا تھا کہ کوئی بھی اندازہ کرسکتا تھا کہ اُس کی طبیعت خراب ہے۔

''ہاں کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں ہوں۔'' میڈم چاندنی نے نقاہت سے کہا۔

''تو پھر ڈاکٹر کو دکھادیں۔'' ماہی نے مشورے کے ساتھ فوراً ساتھ چلنے کی آفر کی۔

''ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو، میرا حال واقعی ناقابلِ برداشت ہے۔''

''چلیں پھر...'' ماہی نے گاڑی کی چابیاں اُٹھا کر پوچھا۔

''ہاں چلو... میڈم راگنی کے رویّے تو مجھے مزید روگی بنادیں گے۔'' میڈم چاندنی تمام راستے بڑبڑاتی آئیں۔ کلینک پہنچ کر بھی اُس کی بڑبڑاہٹ ختم نہ ہوئی تھی۔

اگر ڈاکٹر اُن کو اتنی عجیب نظروں سے نہ دیکھتا تو وہ یوں ایک دم چپ نہ ہوتیں۔

''آپ کے شوہر کیا کام کرتے ہیں؟''

''میں غیر شادی شدہ ہوں۔'' میڈم چاندنی نے جواب دیا۔

''اوہ!'' ڈاکٹر نے ہنکارا بھرا۔

''پھر۔ آئی مین۔ اچھا!

''اچھا یہ بتائیں، کبھی آپ نے بغیر ٹیسٹ کروائے خون لگوایا؟''

''جی مجھے کبھی خون وغیرہ نہیں لگا۔''

''کیا کبھی کسی دانتوں کے ڈاکٹر سے ٹریٹ منٹ لی؟''

''جی نہیں!'' میڈم چاندنی نے حیرت سے ڈاکٹر کے سوال کو سُنا۔

''کیا کبھی کوئی **Stearilize** سرنج کے علاوہ انجکشن استعمال کیا؟''

''جی نہیں...'' میڈم چاندنی نے بے حد سکون سے جواب دیا۔

''آپ کا پروفیشن کیا ہے؟'' اِس بار ڈاکٹر نے بہ غور اُن کو دیکھتے ہوئے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

میڈم چاندنی اور ماہی کو ایک دم سانپ سونگھ گیا تھا۔

ڈاکٹر نے اُن کے چہرے پر نظریں ہٹا کر کاغذ پر کچھ ٹیسٹ لکھے۔ وہ اپنے مطلوبہ جواب تک پہنچ چکا تھا۔

''بی بی! یہ ایچ آئی وی کا ٹیسٹ کروالیں آج اور ابھی۔ اور ساتھ یہ دوا فوراً شروع کردیں، اگر میرا

...درست ہے تو آپ فوراً اِس کلینک میں جائیں یہ خاص طور پر آپ لوگوں کے مرض کے علاج کے ...ہے۔'' ڈاکٹر نے فوراً کاغذ اُن کو پکڑا کر اگلے مریض کے لیے بیل بجادی۔ وہ اُن کو فوراً اپنے کمرے ...واپس بھیج دینا چاہتا تھا۔

...ڈم چاندنی کو یوں لگا کہ اِردگرد کی ساری عمارتیں اس کے اُوپر آن گری ہوں۔ اِس بوجھ تلے اُس ...سانس رُکنے لگا تھا۔

''آپا چلیں...!'' ماہی نے ڈاکٹر کو دوبارہ گھنٹی بجاتے دیکھ کر اُسے اُٹھایا۔ میڈم چاندنی کسی نیند سے ...جاگی تھی۔

...اسے لگا یہ گھنٹی اُس کے اِس کلینک سے نکلنے کے لیے نہیں بلکہ اُس کے اِس دنیا سے نکلنے کے لیے ...والی جارہی ہے، خوف سے اُسے اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

وہ خالی خالی نظروں سے اِردگرد دیکھتی ماہی کے ساتھ باہر نکل آئی۔

❖❖○❖❖

''ابّو کی طبیعت اتنی زیادہ خراب رہی تم کدھر تھے؟'' سائرہ نے سمعان سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''تھا تو اِسی دنیا میں، لیکن احساسات کی حِس کچھ عرصے سے سوگئی تھی۔'' سمعان علوی نے کھوکھلی ہنسی ...ہنستے ہوئے کہا۔

''سمعان! کیا تم ٹھیک ہو؟'' سائرہ نے فکرمندی سے اُس سے پوچھا۔ جن سے محبت کی جاتی ہے اُن ...کے مزاج میں بال برابر بھی فرق پڑے تو فوراً پتا چل جاتا ہے، چاہنے والے تو خون میں دوڑتے ہیں۔

''تم ہمیشہ بہت پہلے سے جان جاتی ہو کہ میں پریشان ہوں یا نہیں، کیسے جان جاتی ہو؟ سمعان نے ...حیرت سے سائرہ سے پوچھا۔

''محبوب کا مزاج تو انگلیوں کی پوروں پر ہوتا ہے نا!'' سائرہ نے دل ہی دِل میں کہا۔

''کیوں! کیا ہم اچھے دوست نہیں؟'' سائرہ نے اُسے جذب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے! اور واقعی یہ بات درست ہے کہ یو آر اونلی مائی فرینڈ!'' سمعان نے طویل سانس ...لی۔

''سمعان! ہوا کیا ہے؟'' سائرہ نے ملازم کو چائے لانے کا کہہ کر اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

...سمعان گہری سوچ میں تھا کہ آیا وہ اپنے دِل کی بات شیئر کرے یا نہ کرے۔ اُس کا دِل اِس قدر ...بوجھل ہو چکا تھا کہ وہ فی الواقعی کسی دوست کا کندھا چاہتا تھا۔

اچھے دوست بھی تو سکھ کے سنبل جیسے نرم اور پیارے تکیے ہوتے ہیں، جن پر جب دِل چاہا سر رکھ کر ...اطمینان سے سو بھی لیا جاتا ہے اور دُکھ سے رو بھی لیا جاتا ہے۔

''کہانی تو بے حد طویل تھی لیکن خیر! میری کہانی تو ابھی ٹھیک سے شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کا ...اختتام ہوگیا!'' سمعان نے کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''مجھے محبت ہوگئی تھی!'' سمعان نے یوں کہا، جیسے کوئی بیماری ہوگئی ہو۔

...محبت کا سفر آسان نہیں ہوتا، کٹھن ہیں راستے اِس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر تم کبھی غلطی سے اِس راہ پر نکلو تو ذہن میں رکھنا
کہ اِس میں واپسی کا کوئی بھی راستا نہیں ہوتا
جو راستا مل بھی جائے، تو انسان جا نہیں پاتا
وہ زخمی روح زخمی دِل و جگر لے کر کہاں جائے
محبت کا سفر آسان نہیں ہوتا۔

سمعان سامنے بنی کھڑکی میں دیکھتے ہوئے بولا۔

سائرہ کے تو مانو جیسے سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہو۔

''جس کو آپ اپنا سب کچھ مان لیتے ہیں ..اگر وہ کسی اور کو چاہے تو اپنا آپ کسی تنکے کی طرح بے وقعت لگنے لگتا ہے، کیا ہم دونوں سہیلیوں کی قسمت میں لکھا ہے کہ ہم دونوں وَن سائیڈڈ محبت کا دُکھ سہیں۔'' سائرہ کے دماغ میں پہلی سوچ یہ ہی آئی۔

''کون ہے وہ؟'' سائرہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہے نہیں! تھی وہ، اب نہیں ہے! لیکن نہیں وہ شاید میرے دِل میں ہمیشہ رہے گی، وہ میرا پہلا پیا... تھی!'' سمعان نے اُداس لہجے میں کہا۔

''کون..؟ سائرہ کا سانس اٹکا ہوا تھا۔

''مسکان!'' سمعان نے یوں سر جھکا کر کہا جیسے وہ خود بے حد قصوروار ہو۔

سائرہ کے اٹکا ہوا سانس بے اختیار اُس کے سینے سے خارج ہوا۔ یعنی سمعان کی محبت ون سائیڈڈ تھ... پھر اب تو مسکان پرائی امانت تھی۔

''وہ مجھے ملنے سے پہلے ہی گم ہوگئی! وہ مجھے بہت اپنی اپنی لگا کرتی تھی، کچھ خاص طرح کی کشش ... اُس کی جانب کھنچا کرتی تھی۔ لیکن اب تو...!'' سمعان اُس سے اپنا پہلا پیار، اپنا پہلا احساس شیئر کر... تھا۔ ایسے میں سائرہ کو سمجھ نہ آرہی تھی کہ وہ سمعان سے کیا کہے۔

''سمعان! میں تم کو اُسے بھولنے کو ہرگز نہیں کہوں گی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پرائی چیز کا خیال خیانت ... طرح ہوتا ہے۔ تمہارے سامنے بہت ساری زندگی پڑی ہے اور گاڑی کبھی ایک پہیے سے نہیں چلتی، آ... جا کر تمہیں بھی ہر صورت ایک ساتھی کی ضرورت ہوگی اور میں دُعا کروں گی کہ تمہاری زندگی میں کوئی ا... لڑکی آئے، جو تمہاری زندگی کے ہر کانٹے، ہر دُکھ کو چُن لے...'' سائرہ نے سچے دِل سے اُسے دُعا دی۔

''تھینک یو سائرہ! یو آر ریئلی مائی فرینڈ! تمہارے وجود سے مجھے ہمیشہ سکون ملتا ہے۔'' سمعان مشکور ہوتے ہوئے کہا۔

''دوستوں کو تھینک یو کہہ کر پرایا نہیں بناتے۔'' سائرہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

جانے کیوں اُسے لگ رہا تھا کہ اگر اس نے سمعان کو پایا نہیں تو کھویا بھی نہ تھا۔

❖❖○❖❖

''ماہی اِس وقت فون کر رہی ہو، کیا تم ٹھیک ہو؟'' ترنم نے سوئی سوئی آواز میں پوچھا۔ صبح ساڑھے تین بج رہے تھے۔

''ت...ترنم!'' ماہی کی مارے گھبراہٹ کے آواز نہ نکل رہی تھی۔ اُس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا، جس سے اتنی دُور بیٹھی ترنم بھی چونک گئی تھی۔

''کیا ہوا ماہی؟'' ترنم نے الرٹ ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ اِس وقت کراچی میں تھی۔ آئی تو وہ ایک کام کے ہی سلسلے میں تھی لیکن کام ہوتے ہی وہ کچھ دن کے لیے ایک اور ہوٹل میں جا ٹھہری تھی۔ اس روشنیوں کے شہر سے اُس کی جڑوں کا رشتہ تھا ایسے کیسے اتنی آسانی سے وہ اُسے جانے دیتا۔

''ترنم! آپا... آپا میرا خیال ہے کہ مرگئی ہیں!'' ماہی کی کپکپاتی آواز ترنم محسوس کرسکتی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ترنم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں ابھی ابھی ایک نائٹ پارٹی سے آئی تھی۔ مجھے ڈائمنڈ کا ایک ہار گفٹ ہوا تھا، آپا کو پہلے سے اِس کی خبر تھی، تم تو جانتی ہو آپا ایسے معاملوں میں کیسی حساب کی پکی ہے۔ میں نے سوچا صبح یہ اسلام آباد جارہی ہیں، میں سونے سے پہلے ہار اِن کو دے دوں... جب میں ابھی اِن کے کمرے میں آئی ہوں تو...!'' ماہی کی آواز میں مسلسل کپکپاہٹ تھی۔

''ہاں کیا ہوا؟'' ترنم نے پوچھا۔

''یہ... یہ مرچکی ہے!''

''ترنم یہ مرچکی ہے میں نے ٹھیک سے دیکھا ہے۔'' ماہی نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

''کیا.. کیا میڈم چاندنی مرگئی ہے!'' یہ انکشاف واقعی ترنم کے لیے بے حد چونکا دینے والا تھا۔ وہ اُس کی بد دُعاؤں سے نہ مری تو اب اچانک کیسے مرگئی؟

''لیکن کیسے...؟'' ترنم نے پریشانی سے پوچھا۔

ماہی جواب میں خاموش تھی۔

ڈاکٹر کی کاٹتی نگاہیں، اِن میں چھپا پیغام، سوال مرض اور نفرت سب بول رہے تھے۔

وہ اندر تک سے کانپ گئی تھی۔ کیسے بتاتی کہ وہ خود اپنے Test بھی دے کر آئی تھی۔ اور رزلٹ لینا بھول گئی ہے۔

''ایڈز!'' اس کے منہ سے نکلا۔

قدرت کا اپنا نظام ہے، کسی کے چاہنے نہ چاہنے سے نہیں بدلتا۔ جو اِس کے اصولوں اور پابندیوں سے کھیلتا ہے اُنہیں توڑتا ہے۔

ایک دِن اچانک ایسے ہی سوتے میں مرجاتا ہے۔

''ترنم! آپا کو ایڈز تھا!'' ماہی کی آواز خوف سے پھٹ رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میڈم چاندنی کی اچانک موت کل کے اخبار کی سرخی تھی۔ وہ ایک بہت بڑا سوشل سرکل رکھتی تھی۔ اُس کے جنازے پر ٹاپ کی ہیروئنز بھی شامل تھیں، کئی ادھیڑ عمر اداکارائیں جو اب فلمیں ڈائریکٹ یا پروڈیوس کرتی تھیں، وہ بھی اُس کے جنازے پر دھاڑے مار مار کر رو رہی تھیں، ہیرا منڈی کی ہر طوائف، انڈسٹری کی اداکارائیں، اسٹیج ایکٹریس کالے لباس میں یوں ماتم کرتی نظر آ رہی تھی جیسے اُن کی ماں مرگئی ہو۔

میڈیا نے بھی بڑھا چڑھا کر سارے ایونٹ کی کوریج کی تھی لیکن آج کے اخبار میں ایک ہیڈ لائن نے سارا منظر بدل دیا تھا۔

''ایڈز'' میڈم چاندنی کی موت ایڈز کی وجہ سے ہوئی تھی!

یہ انکشاف ایسا تھا کہ ہر آرٹسٹ ہر ''ہوکر'' ہر ''سا کڈ'' کے اندر بے چینی بھر گئی تھی۔ سب ہی نے چوری چھپے ہسپتالوں اور کلینک کا رخ کیا تھا اپنے ایچ آئی وی ٹیسٹ کے لیے، کچھ امیر اور سمجھ دار اداکاروں نے اس کے لیے باہر کے ممالک کا رُخ کیا تھا۔

بہرحال ایک خوف و ہراس کی فضا تھی، جو اِن سب میں پھیلی ہوئی تھی۔ انڈسٹری میں ایک دَم ویرانی سی پھیل گئی تھی پروڈیوسروں کی فلمیں، ڈرامے بیچ میں چھوڑ کر اداکاراؤں کا یوں غائب ہونا مزید شکوک پھیلا گیا تھا۔

''لگتا ہے ہمارا قفس کھل گیا ہے!'' شبنم نے سب لڑکیوں سے کہا۔ میڈم چاندنی کی اچانک موت پر جہاں وہ سب حیران ہو رہی تھیں وہیں سب کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا کہ آئندہ وہ آزاد ہوں گی۔ وہ اتنے سالوں سے اتنی کڑی نگرانی میں تھیں کہ اُن کو ابھی تک ٹھیک سے اپنی آزادی کا تعین نہیں ہو رہا تھا۔ میڈم چاندنی کی موت پر سب سے زیادہ دُکھی ترنم تھی۔

''تم اُس وقت کیوں نہ مریں جب میرا سارا وجود پاکیزہ تھا۔ جب ایمان فاطمہ نے خود کو زندہ رکھنے کے لیے صرف اور صرف تمہاری موت کی خواہش کی تھی۔'' ترنم سسکی۔

''کاش تم تب مرتیں! اب جب کہ میرا سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا ہے تو مجھے تمہاری موت کا کیا فائدہ، ایسی آزادی کا کیا فائدہ! ایک بار فصل کو آگ لگ جائے تو بعد میں راکھ کی حفاظت تو نہیں کی جاتی نا!''

''اب تم یہیں رہو گی یا کہیں اور جاؤ گی؟'' رات کو ماہی نے ترنم سے سوال کیا تھا۔ وہ لوگ فی الحال آنٹی چاندنی کی کوٹھی میں ہی تھیں۔

''صبح میں دوبارہ کراچی چلی جاؤں گی، مجھے اپنی ماں کو ڈھونڈنا ہے۔'' ترنم نے دھیمے لہجے میں کہا، ایک عجیب سے خالی پن کا احساس تھا۔

ہی کے پَر اتنے سالوں سے کاٹ کر اُسے پنجرے میں رکھا گیا تھا، اب پنجرے کا دروازہ کھلا بھی تھا ان وہ خود کو قید میں ہی محسوس کر رہا تھی۔ یہ ہی حال سب لڑکیوں کا تھا۔ ابھی تک کوئی لڑکی کہیں بھی نہ گئی تھی میڈم چاندنی کا زیور جو کوٹھی میں ہی پڑا تھا سب لڑکیوں نے آپس میں بانٹ لیا تھا۔ ابھی تک ان اُس کے اکاؤنٹس تک رسائی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

''میں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟'' ماہی نے حسرت سے پوچھا۔

''ارے! تمہاری تو اپنی ذاتی کوٹھی ہے، جہاں تک مجھے یاد ہے تم نے کرائے پر چڑھا رکھی تھی۔ تمہارا اپنا گھر ہے اور جمی، وہ جمی بھی مجھے لگتا ہے کہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تم اُس سے شادی کر لینا۔'' جمی ان ایکسرسائز کروانے آتا تھا۔ ترنم یہ نہ جانتی تھی کہ وہ ماہی کو نہیں ترنم کو دِل سے چاہتا تھا۔

''نہیں! میں۔ میں اِس شہر میں نہیں رہنا چاہتی۔'' ماہی کے چہرے پر گھبراہٹ بے حد نمایاں تھی۔

''میں بس تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' ماہی نے ضد کی۔

''ماہی! آئندہ دِن میرے اور خواری کے ہیں! میں پچھتاوے سے کفارے کے دور میں داخل ہونا چاہتی ہوں اور جو گناہ میری روح کو آلودہ کر چکے ہیں اُن کو دھونے کے لیے ایک بہت مشقت بھرا راستہ منتظر ہے۔'' ترنم نے اُسے اپنے ساتھ جانے سے منع کیا۔

''میں اپنے اُسی محلّے، اسی گھر جو کہ صرف دو ڈھائی مرلے کا ہے، میں رہنے جا رہی ہوں تم کہاں میرے ساتھ خوار ہو گی؟'' ترنم نے حیرت سے ماہی کے مسلسل اصرار اور ضد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ترنم! میں بہت خوف زدہ ہوں۔'' ماہی کی آواز ایک دم کپکپانے لگی۔

''اب کس بات کا خوف ہے؟'' ترنم نے حیرت سے پوچھا، وہ دیکھ رہی تھی کہ ماہی کے چہرے کی رنگت ایک دم سے ماند پڑ گئی ہے۔ اُسے واقعی حیرت تھی کہ ہر پَل اپنے لیے کانشس رہنے والی لڑکی کیسے اتنی بے لاپروا رہ سکتی ہے۔

''ترنم! کیا موت کے بعد واقعی انسان کو اپنے اچھے بُرے کا جواب دینا ہو گا؟'' ترنم ایک دم چونکی، سوال بے شک حیران کن نہ تھا البتہ سوال کرنے والی حیرانی کا باعث تھی۔

''ہاں! ایک مسلمان کا آخرت پر ایمان ہوتا ہے!'' ترنم نے دھیرے سے کہا، وہ غور سے ماہی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''بُرے لوگوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟'' ماہی کے چہرے پر اِس وقت بچوں جیسی معصومیت تھی۔

''وہ۔ وہ جہنم میں جاتے ہیں!''

''جہنم کیسی ہوتی ہے؟'' ماہی نے پوچھا۔

''میری امّاں بتاتی تھیں کہ اگر جہنم کی آگ کا ایک شعلہ زمین پر پڑ جائے تو اِس پر کبھی سبزا، اناج نہیں آئے گا اور یہ جو آگ ہم استعمال کرتے ہیں جس میں کوئی گر جائے تو جل کر راکھ ہو جاتا ہے، یہ ایک ستر پانیوں سے دُھل کر زمین پر اُتاری گئی ہے۔'' ترنم کی آواز میں بے انتہا لرزش تھی۔

''ترنم! تم کہتی ہو کہ ہم بُری لڑکیاں ہیں کیا ہم بھی جہنم میں جائیں گی؟'' ماہی نے روہانسی ہو کر کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں! تمہیں نہیں معلوم کہ ہم اچھی ہیں یا بُری؟" ترنم نے اُلٹا اُس سے سوال کیا۔

"ہاں بُری ہیں!" ماہی نے جیسے اقرار کیا۔

"ماہی! میں یہ تو جانتی ہوں کہ ہم بُری ہیں ہمارے اعمال بُرے ہیں لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ ہم ا جہنم میں جائیں گے۔ کیوں کہ جزا اور سزا کا اختیار اللہ جی کو ہے اور وہ بڑا مہربان ہے اُس کی ر ہمارے گناہوں سے ہمیشہ بڑی رہتی ہے۔" ترنم بات کرتے کرتے ایک دم چُپ ہوگئی وہ خود حیران کہ وہ یہ سب کچھ بول رہی تھی۔

یہ سب تو امّاں اور ابّا بولا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں کہیں دِل کے نہاں خانوں میں ہمیشہ سے تھیں آج ماہی کی باتوں سے دوبارہ سامنے آگئیں۔

ترنم کو ایک دم احساس ہوا کہ اِن باتوں کی زیادہ ضرورت تو خود اُسے تھی، وہ جو بھول بھلیوں بھٹک رہی تھی۔ اللہ نے اُسی سے اُس کے لیے راستہ دکھا دیا تھا۔

"تو اِس کا مطلب ہمیں بھی معافی مل سکتی ہے؟"

"ہم بھی بخشے جاسکتے ہیں؟" ماہی نے اُمید سے کہا۔

"نا اُمیدی کفر ہے!" ترنم کی آواز کسی گہرائی سے آئی تھی۔

"میرے خدا! کیا میں!" وہ عین امّاں کے الفاظ دہرا رہی تھی۔

"بس ترنم! تم مجھ کو بھی اپنے ساتھ لے چلو، نہیں رہنا مجھے اِس دنیا میں، اِس حرام کاری میں۔" نے اُس کے ہاتھ تھام کر کہا تو ترنم نے آنسو بھری آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے میں اپنی بھی پیکنگ کرتی ہوں۔" ماہی کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی، جب کہ ترنم ساکت بیٹھ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ کہیں دُور کچھ لوگوں کی آوازیں سُن رہ کچھ سائے سے اُس کے سامنے لرزتے گھوم پھر رہے تھے۔ پھر ایک دم سے یہ سائے واضح منظر بن اور مدھم آوازیں ٹھیک سے سنائی دینے لگیں۔

"ایمان۔ ایمان پُتر! عصر کا ویلا (وقت) ہو رہا ہے تو اپنے بال باندھ لے۔" خدیجہ بی بی نے کُٹ کُٹ کرتی مرغیوں کو دانا ڈالتے ہوئے کہا۔

"توبہ ہے امّاں! اب اپنی مرضی سے بال بھی کھلے نہیں رکھے جاسکتے؟ یہ آپ کے اصول کسی پھن کی طرح میرا دم گھونٹ دیتے ہیں!" ایمان بڑبڑائی۔

"نہ پُتر ایسے تو خار نہ کھا! تیرے بھلے کو دھیان کرتی ہوں۔" امّاں نے پیار سے کہا، اُن کا تحمل ختم ہوتا تھا۔

"اِس میں میرا کیا بھلا ہے؟" ایمان بھڑکی۔

"تو تو میرا سب سے قیمتی مال ہے، تیرا دھیان نہ کروں گی تو کس کا کروں گی؟" خدیجہ بی بی سوکھی روٹیوں کا چورا بنا کر اُن کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس کوئی ہار موتی ہوتا ہے تو اُسے ہم جندھروں (تالوں) میں چھپا کر رکھتے ہیں دھیاں (بیٹیاں) تو بہت قیمتی ہوتی ہیں کسی لال موتی کی طرح اور پاکیزہ بالکل روشنی کی طرح!

...دھیان سے رکھنا ہوتا ہے۔ کسی چندرے کی میلی نظر نہ پڑ جائے۔" خدیجہ بی بی نے پیار سے اُس ... ہاتھ پھیر کر اُس کے غصّے کو دباتے ہوئے کہا۔

"امّاں! اِس چار دیواری میں کم از کم اتنا روکا ٹوکا نہ کریں۔ تنگ آ جاتی ہوں میں!" ایمان نے ماں کا ... دیکھ کر دِل کی بات کہی۔

"اوں ہوں! کنواری لڑکی ہو یا پکے آم کی خوشبو! دونوں باہر سے گزرتے بندے کو اپنے ہونے کا پتا ... ہیں۔" خدیجہ بی بی اب بھی اپنے کہے پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

"...نی امّاں میں اپنے ہی گھر میں قید ہو جاؤں!" ایمان نے بُرا سا منہ بنایا۔

"...ا اسے قید نہیں کہتے قرینہ کہتے ہیں۔"

"...یاں گھر میں ہوں یا باہر! ڈھکی چھپی، ویسی ہی اچھی لگتی ہیں۔" خدیجہ بی بی نے ڈربے سے ...وں کے تازہ دیے گرم گرم انڈے اکٹھے کر کے پیالے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"...ونہہ! یہ قرینہ نہیں ہے، یہ تو قید ہے!" ایمان کا باغی دِل تو بہرہ ہوا پڑا تھا۔ اُسے کہاں کچھ سنائی دیتا ...اں کی باتیں اُس تک نہیں اُترتی تھیں۔ ترنم نے بے اختیار سسکی بھری۔

"کاش! کاش زندگی کی اِس فلم کو ریوائنڈ کر کے پھر سے شروع کیا جاسکتا!" ترنم کے کانوں میں دُور ... آواز رس گھول رہی تھی۔

...یں تیری منزلوں کے نشاں سے
...ہت دُور آ گے نکل گیا
...نبھل سکا بہت دیر تلک
...ہی بے سبب بھٹکتا رہا
...رے نور کی وہ روشنی
...رے آس پاس بکھرتی رہی
...ں نا اہل میں بے خبر!
...یوں دیر تک سویا رہا
...ھے آگہی کا شعور دے
...ھے تازگی کا سرور دے
...ری راہ میں کھڑا ہوں
...رے راستے کی دھول ہٹا دے
...ہی مجھے اپنے قرب سے نواز دے

...ابّا تھے! یہ ابّا کی آواز تھی۔

...نم نے بے اختیار اُن کو چھونے کی کوشش کی، منظر بلبلے کی مانند پھوٹ گیا۔

...نم بے اختیار سسکی۔

...دغرضی، بے حسی ہی بے وفائی کے پودے کو جنم دیتی ہے اور یہ پودا ایسا جھاڑ کانٹے جیسا ہوتا ہے کہ

ساری اچھائی کا پانی چوس لیتا ہے اور پھر آس پاس کی ساری زمین کو بنجر کر دیتا ہے۔ اِسی لیے تو بے و آدمی ہو، عورت ہو یا اولاد! وہ ہمیشہ اکیلے اور بنجر رہ جاتے ہیں، بے وفا رستوں کو ہریالی کبھی نہیں نصیب ہوتی۔

''لے پُتر! یہ تیرے نئے جوڑے اور یہ ہیں تیرے جوتے! تیرے ابا جی نے پُتر ے ہار بندوں سے یہ تیس روپے الگ سے دیے تھے۔'' خدیجہ بی بی نے پاؤں کی چپل اُتار کر برقعے کی ڈوری کھولی۔

ایمان نے کھولتے خون کے ساتھ ان دو تین شاپرز پر نظر ڈالی۔

''امّاں! اتوار بازار سے چھانٹ چھانٹ کر (ٹوٹوں) پیسوں سے اُس کے لیے کپڑے اور سو رو کی چپل خرید کر لائی تھیں، جس پر سفید نگ لگے ہوئے تھے۔ لمّاں نے اپنی سی کوشش کر کے کپڑوں کے کھلتے رنگ تلاش کیے تھے۔ چپل بھی نازک سی تھی۔

لیکن ایمان کے ماتھے پر بل تھے۔

ترنم نے بے اختیار ایمان کو روکنے کی کوشش کی لیکن اُس کا ہاتھ منظر کو چھو نہ پا رہا تھا۔

''کیا ہوا ایمان پتر؟'' امّاں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا، امّاں کا چونکنا لازمی تھا کیوں کہ اِ سے پہلے یہ ہی ایمان تھی، جو لپک کر اِن چیزوں کو پکڑتی تھی، اِس کے لیے یہ چیزیں بہت اہم ہ تھیں۔

ترنم نے بے اختیار سسکی بھری، کاش وہ اِس منظر کو چلنے سے روک سکتی۔

اب وہ ہی ایمان منہ بنائے اُن پر نظر ڈالے، چھوئے بغیر اتنے فاصلے پر بیٹھی تھی، اُس کی یہ حر لمّاں کو حیران کرنے کے لیے کافی تھی۔

''ہوں! مجھے نہیں چاہیے یہ ''سی'' کلاس چیزیں!'' ایمان نے غصّے سے کہا۔

''سی کلاس! یہ کیا ہوتا ہے؟'' لمّاں نے حیرانی سے پوچھا۔

ترنم نے ایک بار پھر بڑھ کر ایمان کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ منظر ایک بار پھر اُس کے ہاتھوں پھسل گیا تھا۔

ایمان کو وہ اسکول باقاعدگی سے بھیجتی تھیں لیکن وہ خود سوائے قرآن پاک کے، کچھ نہ پڑھ لکھ تھیں۔

''لمّاں! یہ ٹکے ٹکے کی گھٹیا سستی چیزیں!'' ایمان نے شاپرز کو دور دھکیلتے ہوئے کہا۔

ترنم نے دوڑ کر اُن شاپرز کو پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ اِن چیزوں کو کسی قیمتی متاع کی طرح سینے لگانا چاہتی تھی۔

ایمان کی بات سمجھتے ہی لمّاں کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔

''استغفار کر ایمان! اُس ربّ جی کا شکر ادا کر، ایسی ناشکری نہیں کرتے۔'' امّاں نے دھیمی لیکن آواز میں کہا۔

''وہ بھی تو لوگ ہوتے ہیں، جن کو تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں جُوتا، کھانے کو دانہ، رہنے کو چھت نہیں ہم ربّ جی کا لاکھ بار بھی شکر کریں تو کم ہے اُس سوہنے رب نے ہم کو ہر چیز سے نواز رکھا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے جذب سے کہا۔

''صدقے جاؤں اُس رحمان جی کے، ہم کبھی بھوکے نہیں سوئے، تین وقت کا رج رج کھاتے ہیں، ی سردی کا لتا کپڑا، رہنے کو اپنا ٹھار (ٹھکانا) ہے۔ میں تو کہتی ہوں اللہ سوہنے نے بڑا ہی چنگا (اچھا) لما ہے۔ بہت بہت کرم کر رکھا ہے۔ شکر الحمدللہ!''

''لاکھوں سے بہتر، ہمیشہ سے بہتر ہیں! شکر الحمدللہ۔'' آخر میں امّاں نے بڑے جذب سے شکر الحمدللہ کہا تھا اور صرف دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی تھی کہ اُن کا روم روم پوری سچائی سے شکر گزار تھا۔

''ہونہہ! اللہ ہی جانے آپ کو کس بات کا اتنا اطمینان اور خوشی چڑھی رہتی ہے کہ ہر وقت شکر کرتی تی ہیں۔''

''آخر ہم کس بات پر اتنا شکر ادا کریں؟'' ایمان کے کہنے پر ترنم بے اختیار چلّائی تھی۔

''رُک جاؤ ایمان، چپ ہو جاؤ ایمان۔''

''شکر کریں اِس غریبی پر جو تن نہ ڈھانپے، جو پیٹ نہ بھرے! اِس پر شکر ادا کریں، کیا دیا ہے آخر اپ کے رب جی نے ہمیں؟ یہ دو مرلے کا گھر! دم گھٹتا ہے میرا!''

''یہ، یہ کپڑے!'' ایمان نے پاگلوں کی طرح کپڑے شاپرز سے نکال کر تخت پر اُچھالے۔

''رک جاؤ ایمان، نہ کرو ایمان!'' ترنم سسکتے ہوئے بولی۔

''یہ۔ یہ داغ لگے، ڈورا آئے سستے سے سوٹ! ہونہہ! جب ساری دنیا تھان سے اچھا کپڑا خرید کر لے جاتی ہے تو میری لمّاں شکر ادا کرنے کے لیے بچ جانے والا وہ کپڑا جو نقص زدہ ہوتا ہے خریدنے چل لی ہے۔ سارا اچھا تھان سب کے لیے اور یہ بچ جانے والے میرے لیے! کیا میں اِس قابل ہوں اماں؟''

دیکھو امّاں! باہر نکل کر لوگ اپنی اولاد کی آسائشوں کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، ایک آپ لوگ ہیں ن وقت سبزی دال پکا کر، کھلا کر ''شکر شکر'' کی گردان کے سوا کرتے کیا ہیں آپ؟''

ترنم نے بے اختیار اپنا سینہ پیٹ لیا۔

''ہائے ایمان! تیری لمبی زبان اور بڑی بڑی باتیں کس قدر دُکھ دینے والی تھیں۔''

''ایمان!'' امّاں کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''یہ کیا بک بک کر رہی ہے؟''

''یہ تجھے آخر کیا ہو گیا ہے؟'' امّاں کی آواز رنج و غم میں ڈوبی ہوئی تھی، حیرانی اُن کی آنکھوں میں تھی ن سے پہلے ان کی یہ ہی بیٹی ہر حال میں مست و مگن رہتی تھی۔

''اُس کو ''ناشکری کے کیڑے'' نے کب کھانا شروع کیا؟'' اپنی بے خبری پر اُن کو دُکھ بھی ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے تجھے پتر؟''

''یہ سب کچھ تو ہمیشہ سے ہے پھر اب تجھے ہر چیز بُری، کم، سستی اور گھٹیا کیسے لگنے لگی؟'' امّاں کی انکھیں اُس کے وجود میں چبھ رہی تھیں، وہ اِن ساری باتوں کی جان لینا چاہتی تھیں۔

ایمان چُپ چاپ تخت پر بیٹھی اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے کچی زمین پر جانے کیا بنا رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بھکے پیروں سے بنائی آڑی ترچھی لکیریں ہوں یا خواب! کبھی اچھی تعبیر اور تصویر نہیں بن پاتی۔''

''یہ گھر ہمارا اپنا ہے دو کمرے اوپر ہیں پھر ویہڑا (صحن) ہے، غسل خانہ ہے نیچے ویہڑا، باورچی خانہ اور تیرے ابّا کا کمرہ! دیکھ کتنا کھلا اور زیادہ گھر ہے ہم دو جیوں (افراد) کے لیے۔''

''پھر؟''

''پھر تیرا دم کیوں گھٹنے لگا؟''

''آہ! جب انسان کا زوال آتا ہے اُس کو اچھی خاصی چیز اور ماحول بُرا لگتا ہے۔ وہ ناشکرا ہو کر اپنے بُرے وقت کو خود دعوت دے دیتا ہے امّاں۔'' وہ بے اختیار بولی۔

''کچھ نہیں امّاں! چھوڑیں بس میرا دِل ہی مجھے تنگ کرتا ہے۔'' اِس بار ایمان کے لہجے میں سچائی اور بے بسی دونوں نمایاں تھیں۔

''کیا ہوا تیرے دل کو؟''

''بس امّاں! شاید میرے خواب بڑے اور دِل چھوٹا پڑ گیا ہے۔'' ایمان بغیر کسی مصلحت کے بولی۔

''نہ پُترا! اپنے دِل کو خواہشوں سے چھوٹا نہ کر! یہ دِل چھوٹا بڑا نہیں ہوتا خواہشیں اگر اوقات سے بڑ کرنے لگیں تو تب یہ دل کم پڑ جاتا ہے۔ تو کبھی ان خواہشوں کو سر پر سوار نا کرنا، یہ سر پر سوار ہو کر ہمیشہ سر جھکا دیتی ہیں۔''

''من مارنا سیکھ! نا ماننے والے تو ہمیشہ ریوڑ سے نکلی سرکش بھیڑوں کی طرح ہوتے ہیں، لاکھ گھیر ریوڑ میں واپس لائیں وہ موقع ملتے ہی پھر باہر کو بھاگتی ہیں اور ''باہر'' پُتر جی ان کے لیے عافیت نہیں ہوتی!''

ترنم نے امّاں کو دیکھا اُن کا وجود روشنی اور نور سے بھرا نظر آ رہا تھا۔ ترنم سے یہ روشنی برداشت نہ ہو تو ایک دم اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا، اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی شدت مزید تیز ہو گئی تھی۔

ترنم نے دوبارہ ہاتھ ہٹایا تو سارے منظر، آوازیں غائب ہو چکی تھیں کھو دینے کا احساس ترنم کا سانس روکنے لگا تھا۔ امّاں کی نرم آغوش میں جانے کو دل مچل مچل جا رہا تھا۔

''میں آ رہی ہوں امّاں! میں تم کو ڈھونڈ نکالوں گی! تیرے پیروں میں سر رکھ کر معافی مانگوں گی، تیری جوتیاں سر پر کھاؤں گی تو شاید میری روح کے آزار کو کچھ سکون میسّر آ جائے۔''

میں آ رہی ہوں امّاں! ترنم نے مصمّم ارادے سے کہا۔

❖❖○❖❖

''السّلام علیکم بابا سائیں!'' ولی نے اندر داخل ہو کر کہا۔

''آپ نے یاد کیا تھا بابا سائیں؟'' ولی اُن کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آج کل کیا ہو رہا ہے؟ تم آفس بھی باقاعدگی سے نہیں جا رہے، قاسمی صاحب نے بتایا تھا۔''

''بابا سائیں! کالج میں کچھ مصروفیت زیادہ تھی کل سے انشاء اللہ باقاعدگی سے جاؤں گا۔ آپ کو آئندہ کبھی شکایت نہ ہو گی۔'' عبدالولی نے ہمیشہ کی طرح تابع داری سے کہا۔ اُس کو کتنا بھی اہم کیوں نہ ہوتا وہ پہلے ہمیشہ احمد شاہ کا کہنا سُنتا تھا۔ اب کل بھی اُس کے پاس آفس جانے کا وقت نہیں

ان اُس نے احمد شاہ کے کہنے کو کبھی نہیں ٹالا تھا۔

''بیٹا! جوانی میں کی ہوئی محنت، عبادت ہی لونگ لاسٹنگ ہوتی ہے!'' احمد شاہ نے بہت گہری بات کہی تھی۔

''جی بابا سائیں۔'' عبدالولی نے بے حد تابع داری سے جواب دیا۔

''اور بیٹا! آج شام میں، بابا جی سے ملاقات کے لیے نکل رہا ہوں، ان کا پیغام آیا ہے وہ یاد کر رہے تھے۔ تم اپنی ماں کا خاص خیال رکھنا۔'' احمد شاہ نے فکر مندی سے کہا۔

''بابا سائیں! امّاں جان پر تو میری زندگی قربان آپ بے فکر رہیں، میں اُن کو چیک اپ کے لیے بھی لے کر جاؤں گا۔'' عبدالولی نے بے حد ذمّے داری سے کہا۔

''بابا جی ٹھیک ہیں نا؟ میرا بھی اُن سے ملنے کو بے حد دِل کرتا ہے میرا انہیں سلام دیجیے گا۔'' عبدالولی نے کہا۔

''رحیم بخش کہہ رہا تھا کہ بابا جی بے حد کمزور ہو گئے ہیں، اِس عمر میں ضعیفی تو بے شک ضرور ہوتی ہے لیکن وہ ہمارے لیے روشنی کا مینار ہیں، ان کے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور زندگی عطا فرمائے۔'' احمد شاہ نے اپنے وسوسوں کو دُعا کی شکل دی۔

''آمین!'' عبدالولی نے بے اختیار کہا۔

''اچھا بیٹا! تم چل کر آرام کرو رات گہری ہو رہی ہے۔'' احمد شاہ نے اُسے جانے کی اجازت دی۔

عبدالولی جس طرح باپ کے کہنے پر فوراً دوڑا آیا تھا، اُسی طرح اُن کے کہنے پر فوراً واپس چلا گیا جب کہ احمد شاہ گہری سوچ میں مبتلا ہو گئے تھے۔

''آخر ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے بابا جی نے اتنا ارجنٹ بلایا ہے، وہ کون سی بات ہو سکتی ہے؟'' وہ خود سے سوال کر رہے تھے۔

❖❖○❖❖

''میں نا اب اپنے بیٹے کی شادی کر دینا چاہتی ہوں۔'' روشن آرا بیگم نے گاڑی کی سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر آہستگی سے کہا۔ وہ اِس وقت ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آ رہے تھے۔

''جی امّاں جان!'' پیچھے بیٹی نگینہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔

عبدالولی کے چہرے پر مسکراہٹ بے اختیار تھی۔

''لیکن میں سوچتی ہوں کہ حسن آرا کو ابھی ابھی بہت بڑے صدمے سے گزرنا پڑا ہے۔ ایسے میں شادی کی بات کچھ عجیب لگتی ہے۔'' روشن آرا بیگم نے باآواز بلند خیال آرائی کی۔

''امّاں جان! بابا سائیں آ جائیں تو مجھے آپ دونوں سے ایک اجازت لینی ہے۔''

''آسٹریلیا سے اسکالر شپ پر کورس کروائے جا رہے ہیں، میرا نام بھی اسکالر شپ میں نکلا ہے اگر آپ لوگ اجازت دیں گے تو میں پہلے کورس کرنا چاہتا ہوں۔'' عبدالولی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کتنے عرصے کا کورس ہے؟'' روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

''ہے تو ڈیڑھ سال کا، لیکن چھ ماہ کے سمسٹر کے بعد اگلا سمسٹر دو مہینے بعد شروع ہو گا۔ میں دو ماہ کے

لیے واپس پاکستان آؤں گا۔ یہ سب کچھ تب ہی ہوگا، جب آپ لوگ مجھے اجازت دیں گے۔"

"پھر... پھر شادی بھی کر دیجیے گا بلکہ آپ اِس بلّی کے لیے بھی اچھا سا رشتہ دیکھیں۔" عبدالولی نے ساتھ ہی اپنا رُخ نگینہ کی جانب کر دیا۔

"کوئی نہیں! میں پہلے اپنی بھابی کے ساتھ رہنے کا خواب تو پورا کرلوں۔" نگینہ نے معصومیت سے کہا۔

"ماشاءاللہ! میڈم نے خواب دیکھے تو پرائے دیکھے۔" عبدالولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئی نہیں میری بھابی پرائی تھوڑی ہوگی، وہ تو میری بہن ہوگی اور علیزے آپی تو ہیں بھی بہت نائس۔" نگینہ نے کہا۔

"ولی! اس کے بیاہ کا سوچ کر تو میرا دِل ہولنے لگتا ہے۔"

"اِس گڑیا کی جدائی کیسے برداشت کروں گی پھر سوچتی ہوں کہ بیٹیاں تو پیغمبروں نے نہیں رکھیں تو ہم کون ہوتے ہیں ایسا سوچنے والے۔" روشن آرا بیگم نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امّاں جان! پلیز بابا سائیں سے میری سفارش کر دیجیے گا۔ میری بہت زیادہ خواہش تھی اِس کورس کرنے کی۔" ولی روشن آرا سے فرمائش کرلیتا تھا۔

"اگر میں ہی تم کو جانے کی اجازت نہ دوں تو؟" روشن آرا بیگم نے غور سے ولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کو منظور نہیں تو میں کبھی ضد نہیں کروں گا۔" عبدالولی نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"میں بابا سائیں سے کہوں گی کہ اگر تمہارے لیے یہ کورس بے حد اہم ہے تو تم کو ضرور اجازت دیں۔" روشن آرا بیگم نے بے حد پیار سے کہا۔ اگر اولاد اتنی فرماں بردار ہو تو ماں باپ بھی اولاد کی خوشیوں میں حائل نہیں ہوتے۔

"بھائی! پھر شادی تو لیٹ ہوگئی؟" نگینہ کو صرف اپنی مطلب کی بات سے غرض تھی۔

"یار ابھی کون سا شادی اناؤنس ہوگئی تھی، جو لیٹ ہوگئی ہے۔ بہت کم مدت کا میرا یہ کورس ہے جب تک تم نے اپنے سوٹ کے ساتھ میچنگ چیزیں خریدنی ہیں، تب تک میں واپس بھی آ جاؤں گا۔"

"بھائی! تو کیا مجھے سال لگنا ہے میچنگ کرتے ہوئے؟" نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ اللہ جی نے تمہارے سر میں دماغ نہیں ڈالا یا پھر تمہیں بچپن میں کہیں بہت بلندی سے سر میں چوٹ لگی ہوگی!" ولی ہنستے ہنستے ایک دم چپ ہوگیا ساتھ ہی اُس نے بریک لگا کر گاڑی روک دی۔

پلک جھپکتے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر لہرایا تھا۔

ایک سات آٹھ سال کے بچے نے گود میں کوئی بچہ اُٹھایا ہوا تھا، پس منظر میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور اچانک وہ بچہ چھلانگ لگا دیتا ہے۔

ولی نے یہ منظر اکثر خواب میں دیکھا تھا، جب وہ چھوٹا سا تھا تو اکثر راتوں میں یہ خواب دیکھ کر ڈر کر اُٹھ جایا کرتا تھا۔ ایسے میں روشن آرا بیگم اُس پر ساری ساری رات آیت الکرسی اور سورۃ الناس پڑھ کر پھونکا کرتیں، اُسے گود میں لے کر سلایا کرتیں۔ پھر یہ ہوا کہ روشن آرا بیگم کی محبت اور آغوش کی گرمی اِ

خواب اور اُس کے ڈر پر حاوی ہونے لگی تو وہ دھیرے دھیرے اِس خواب کو بھولنے لگا تھا لیکن آج پھر اچانک یہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا؟" روشن آرا نے پریشانی سے اُس کے سر کو سہلایا، جو ہاتھوں پر سر گرائے بیٹھا تھا۔

"آں۔ ہاں۔ ہاں جی! میں ٹھیک ہوں۔" خود ولی کو بھی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اُس کے دِل و دماغ کی کیفیت ایسی کیوں ہے۔

پیچھے گاڑیوں کے ہارن بج رہے تھے۔

"بیٹا چلو! لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔" روشن آرا بیگم نے عبدالولی کو پیار سے کہا تو عبدالولی نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اُس کے چہرے کے **Reflexes** بہت سلو تھے۔

"ہاں جی میں ٹھیک ہوں!"

"امّاں جان جب یہ خواب میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے کہ کوئی بچہ بلندی سے گر رہا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں گر رہا ہوں۔" عبدالولی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

روشن آرا بیگم نے چونک کر ولی کو دیکھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھیں کہ ولی کے بچپن کی یہ گنجلک کیفیات کیوں تھیں اتنا تو وہ جانتی تھیں کہ یہ دونوں بچے اُن تک شدید حادثے کے بعد پہنچے تھے۔ اِس لیے وہ بچپن میں بھی اُسے ہمیشہ پیار سے دلاسہ دے کر ایسی باتوں کو اُس کا وہم کہتی تھیں تا کہ بچہ اِن باتوں کو سر پر سوار نہ کرلے۔

"تمہارا وہم ہے! میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ جب جب تم کو کوئی بے قراری ہو تو "یا حی یا قیوم" پڑھا کرو، دل کو بے حد سہارا نصیب ہوتا ہے۔" روشن آرا بیگم نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جی امّاں جان!" عبدالولی نے دِل ہی دِل میں مسلسل "یا حی یا قیوم" کا ورد شروع کر دیا اور آخر اُس کے دِل کو قرار آ ہی گیا۔

وہ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اُس کے دِل کو بے شک بے حد سکون میسر آیا تھا لیکن اُس کا دماغ ابھی تک اُلجھا ہوا تھا کہ مجھے بچپن سے صرف ایک ہی خواب کیوں آتا ہے؟

❖❖○❖❖

"یار ایک ضروری کام تھا!" ولی نے سلام دُعا کے بعد فون پر کہا۔

"پولیس والے عموماً ضرورت کے وقت ہی یاد آتے ہیں، یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ لوگ ہمیں نارمل حالات میں یاد نہیں کرتے۔" طارق نے ولی کی غیر حاضری صاف لفظوں میں جتا ڈالی۔

"بکو نہیں! کیا میں پہلے تمہیں ہمیشہ کام سے فون کرتا رہتا تھا۔" عبدالولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا کہو خاکسار کے لائق کیا کام نکل آیا؟" طارق اِس وقت ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"یار میری کزن کا کیس سول پولیس کے پاس ہے اور وہ روز ہی اُن بے چاروں کو تفتیش کے معاملے میں ستانے پہنچ جاتے ہیں۔ گھر میں موجود خواتین اور اُن کا چھوٹا بھائی خوف زدہ رہنے لگے ہیں۔ تم پلیز اس معاملے میں کچھ کرو کہ وہ بار بار ان لوگوں کو تنگ نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ جس دن منزہ پر فائرنگ ہوئی تھی اُسی روز سے اُن کا بڑا بیٹا بھی لاپتہ ہے۔ گھر میں اِس قدر پریشانی رہی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی

گمشدگی کو ٹھیک سے محسوس ہی نہ کر سکے لیکن جوں جوں دِن زیادہ ہو گئے ہیں کاشف کی پریشانی بڑھتی جارہی ہے۔ میں اس کی تصویر تمہارے دفتر پہنچادوں گا، پلیز اپنے ''کھوجیوں'' سے اس کا پتا تو کرواؤ۔'' عبدالولی نے فکرمندی سے کہا۔

لفظ ''کھوجی'' عبدالولی مذاق سے اُن کے محکمے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے تم بھجوادو میں پتا کرواتا ہوں اور تمہاری کزن کے کیس کی تفصیلات بھی منگواتا ہوں۔'' طارق نے اچھے اور ہمدرد دوستوں کی طرح فوراً حامی بھرلی۔

''تھینک یو یار!'' ولی نے مشکور ہوتے ہوئے کہا۔

''تم ہوتے کہاں ہو آج کل؟''

''نہ گھر نہ دفتر۔ خیریت تو ہے نا؟'' ولی نے شرارت سے پوچھا تو طارق کا چہرہ اُس کی آواز میں جو سوال تھا اُسے سُن کر ہی بدل گیا۔

اُس نے گاڑی گیٹ کے باہر ہی کھڑی کردی وہ اُس وقت حسب معمول سحرش کی خبر گیری کے لیے چھوٹا سا چکر لگانے آیا تھا۔

کیسی عجیب بات تھی کہ وہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی سچائی اُسی دوست سے چھپالینا چاہتا، تھا جس سے وہ ہمیشہ ہر بات کو شیئر کرتا آیا تھا۔

''بس یار کچھ کام تھا۔ میں اِدھر ہی تھا۔'' طارق نے کمزور سے لہجے میں جواب دیا۔

''اوکے فائن!''

''سی یو لیٹر!''

''اللہ حافظ'' ولی نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

جب کہ طارق لمبے لمبے سانس لے کر خود کو کافی دیر کمپوز کرتا رہا تھا۔

''یا اللہ زندگی کس قدر مشکل دور میں آ گئی ہے! تو ہی مدد فرما!'' طارق نے بے اختیار اللہ سے مدد مانگی تھی۔

❖❖○❖❖

احمد شاہ بہت دیر سے خاموش بیٹھے بابا جی کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

بابا جی عشا کی نماز کے بعد لمبی دعا میں مصروف تھے۔

''اِدھر ہی آجاؤ بیٹا!'' بابا جی نے دُعا مانگ کر انہیں اپنے قریب ہی بلالیا۔ وہ بہت ضعیف ہو گئے تھے۔

احمد شاہ نے بڑھ کر اُن سے سلام لیا اور ہاتھ کا بوسہ لیا۔

''آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔'' احمد شاہ نے تابع داری سے پوچھا۔

''ہاں! تم سے ملنے اور تم کو دیکھنے کو شدّت سے دِل چاہ رہا تھا۔'' بابا جی نے پیار بھری نگاہوں سے احمد شاہ کو دیکھا۔

''باباجی! میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں پلیز آپ میرے ساتھ چلیں، ہمیں خدمت کا موقع

ہیں۔'' احمد شاہ نے ہمیشہ کی طرح اُن سے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔

''نہیں بیٹا! مجھے یہاں سے جانے کا حکم نہیں ہے۔'' بابا جی نے اتنی مدھم آواز میں کہا کہ احمد شاہ مشکل سے سُن سکے۔

''پاکستان ہندوستان بننے کے دوران میرا سارا خاندان شہید ہو گیا، میں اپنی بیٹی، جو تین سال کی تھی اور آٹھ ماہ کے بیٹے کو بچا کر اِس سرزمین تک پہنچا تھا۔ بہت مشکل وقت تھا!'' انہوں نے طویل گہری سانس بھری۔

''اس جگہ جتنے گاؤں تھے سکھوں اور ہندوؤں کے پاس تھے، بہت کم مسلمان تھے یہاں پر، ایک رات سکھوں نے حملہ کیا اور رہے سہے مسلمان بھی مار ڈالے، لڑکیوں کو سرِ عام بے آبرو کیا۔ مردوں کو ننگا کر کے دوڑا کر مارا اور بچوں کے سینے میں نیزے پرو ڈالے۔ میری بیٹی توتلی زبان میں بات کیا کرتی تھی۔'' بابا جی باتیں کرتے کرتے کہیں دُور کھو گئے۔

''نورالعین!''

''وہ واقعی میری آنکھوں کا نور تھی! اُس معصوم جان کے سینے میں ظالموں نے خنجر گھونپ دیا تھا۔ خنجر زنگ آلود تھا، میری بچی نے چار گھنٹے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔''

''میں نے وہ چار گھنٹے جس بے بسی کے گزارے تھے اُس نے مجھے ایک دم سے احساس دلایا کہ انسان کی ذات ایک ذرّے سے بھی کم ہے۔ اگر اللہ مدد نہ فرمائے تو وہ لاکھ کوشش بھی کرنا چاہے، تب بھی کچھ نہیں کرسکتا، چار گھنٹے میں نے اُس کی مسلسل باتیں سنی تھیں۔ وہ کبھی اتنا نہ بولی تھی لیکن اُس روز تکلیف کے باوجود وہ مسلسل بولتی رہی تھی۔ اُسے پورا یقین تھا کہ اُس کے بابا اُسے بچالیں گے۔'' بابا جی کہتے کہتے رُک گئے!

بے شک وہ بہ ظاہر خاموش تھے لیکن اُن کا دِل رو رہا تھا۔

''انا اللہ وانا اللہ راجعون!''

''اور آپ کا بیٹا!'' احمد شاہ نے دِل چسپی سے سنتے سنتے پوچھا۔

''وہ معصوم روح تو اُن ظالموں کا ایک وار بھی نہ سہہ سکا تھا۔'' بابا جی نے دھیرے دھیرے کہا۔

''میرے ماں باپ، بہن بھائی، دادی، عزیز رشتے دار اور میری شریکِ حیات سب شہید ہو گئے تھے لیکن میں اپنے بکھرے وجود کے ساتھ زندہ تھا تو اپنے بچوں کے لیے، اُن کی شہادت کے بعد میں نیم پاگل سا ہو گیا تھا میں دنوں بولایا بولایا سنسان گلیوں میں گھومتا رہا، ہر گلی میں مجھے اپنی نورالعین کھیلتی دوڑتی نظر آتی تھی۔''

پھر دھیرے دھیرے یہاں دوبارہ آبادی ہونے لگی، ٹوٹے بکھرے مسلمانوں نے دوبارہ سے زندگی شروع کی، ہر کسی کے سینے میں کوئی نا کوئی گھاؤ رِستا رہتا تھا۔ لیکن میں تو بے خود رہنے لگا تھا! ایسے میں ایک دن مجھے ایک بہت خوب صورت نوعمر لڑکا اسی گاؤں میں مِلا۔

''تم ہر وقت سوگ میں رہتے ہو، کیا یہ ناشکری نہیں؟'' اُس نے ایک دم مجھے پکڑ کر کہا۔

''میرا … لُٹ گیا میں نے کس بات پر شکر کرنا ہے!'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ہی طرح ایک عورت تھی۔ ایک بار اُس کا اکلوتا بچہ مرگیا اُس نے بہت شور مچایا۔ اللہ سے ناراض ہوگئی، دنیا سے ناراض ہوگئی، ایک دِن حضرت موسیٰ کو اُس نے پکڑ کر کہا کہ اپنے اللہ کو کہو کہ میرا بچہ واپس کردے اُس نے مجھے اتنا بڑا دُکھ دیا ہے کہ میری برداشت سے باہر ہے حضرت موسیٰ نے کہا ٹھیک ہے میں تمہارے بچے کو زندہ کرنے میں تمہاری مدد کروں گا لیکن مجھے اس کے لیے ایسے پانی کی ضرورت ہے، جو اُس گھر سے لیا جائے جہاں آج تک کسی کی موت نہ ہوئی ہو۔''

وہ ممتا کی ماری دیوانی گاؤں کے گھر گھر گئی کہ ایسے گھر سے پانی حاصل کرسکے جہاں پر موت نے قدم نہ رکھا ہو۔

لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکی کیوں کہ ہر گھر میں کبھی نا کبھی کوئی نا کوئی ضرور مرا تھا۔ وہ مایوس لوٹ آئی، لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ وہ اکیلی نہیں تھی جس کے ساتھ ایسا ہوا تھا بالآخر اُسے صبر آ گیا۔

''اور تم جانتے ہو صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہوتا ہے! اگر تم سمجھتے ہو کہ موت نے صرف تمہاری آغوش سے تمہارا سکون، نور چُرایا ہے تو ضرور یہ سوانگ بھر کر پھرو، اور اگر تمہاری عقل میں یہ بات آ جائے تو اپنی ذمّے داری سنبھالو!''

''کیسی ذمّے داری؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''اپنے حصّے کی جھاڑو پھیرنے کی ذمّے داری۔'' اُس نے بے حد سکون سے کہا۔

''جھاڑو پھیرنے کی ذمّے داری؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! جہاں جہاں سے معاشرے کی گندگی تم صاف کرسکو، تمہیں کرنا ہوگی۔ اور یہ چاروں گاؤں جو اِس گھاٹی کے لگتے ہیں اِن میں لوگوں کے دِلوں میں جھاڑو لگانے کی تمہاری ذمّے داری ہے!''

''اور تم اب یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے، جب تک تم کام مکمل نہ کرلو۔ ہاں آئندہ دِنوں میں یہاں دس گاؤں آباد ہوجائیں گے اور تمہیں اِن ٹوٹے بکھرے انسانوں کو اللہ کی ہدایت کی طرف بلانا ہے، اب بس کرو بہت وقت ضائع کرلیا۔'' وہ نوجوان لڑکا یوں بولا، جیسے مجھ سے بڑا ہو۔

''واقعی اُس کے لہجے میں جو رعب تھا وہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ لڑکا اپنی بات کہہ کر چلا گیا اور مجھے جینے کا مقصد مل گیا۔ میں نے قرآن کی تعلیم کا بیڑہ اُٹھایا۔''

''الحمدللہ! میں کامیاب رہا اِن دس گاؤں میں جگہ جگہ میرے طلبا اور طالبات اللہ کے پیغام اور علم کو سب تک پہنچا رہے ہیں۔'' بابا جی اتنی طویل بات کرکے تھک سے گئے تھے اِس لیے وہ بولتے بولتے چپ ہوگئے، انہوں نے اشارے سے پانی مانگا۔

احمد شاہ نے لپک کر مٹکے سے پانی نکال کر اُن کو دیا جو انہوں نے بسم اللہ پڑھ کے گھونٹ گھونٹ یوں پیا جیسے کوئی بہت بڑی نعمت کا لطف لے رہے ہوں۔ اُس وقت زندگی میں جو جینے کا مقصد لگا اب وہ جینے کا بہانہ لگتا ہے!

میرا دِل اُس مالک کے قبلہ رُخ رہتا ہے؟ اُس مالک نے مجھ پر بڑا کرم کیا۔ ورنہ ہر انسان ساری عمر اس دِل کے ہاتھوں خوار ہوتا رہتا ہے۔

میں نے ساری عمر لوگوں کو ایک ہی بات بتائی ہے کہ یہ جو ہمارا دِل ہے نا! ہم اگر اس کو رب کے قبلہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...کرلیں تو ہماری زندگی کا مقصد پورا ہوجاتا ہے!

...ں نے گاؤں کے لوگوں کو ہمیشہ بتایا کہ سب سے بڑی ذات اللہ کی ہے لیکن وہ لوگ ایسے نفس کے ...ہیں کہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے انہوں نے کچھ لوگوں کو اپنی زندگی کا ''بڑا'' ...ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ ہمیشہ سے خوار ہورہے ہیں اِن جاگیرداروں کے ہاتھوں۔

...ں دن ہم ہر انسان کو بڑے رتبے سے نکال کر صرف اللہ کو ہی بڑا کہیں گے اس دن ہم ہر طرح کی ...ے نکل آئیں گے، اللہ تعالیٰ کی ذات اِن لوگوں پر رحم کرے۔'' انہوں نے حسبِ عادت فوراً دعا ... وہ دُعا دینے اور مانگنے میں کبھی کنجوسی نہ کرتے تھے کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ اگر اللہ نے دُعا کو ...ت کہا ہے تو ہمیں یہ عبادت ہر صورت ہر وقت کرنی چاہیے۔

...مد شاہ! اِن جاگیرداروں کی چھایا اِن لوگوں پر حاوی ہوتی جارہی ہے، جس سے اِن انسانوں نے ...تا گرالیا ہے کہ وہ خود کو کیڑے مکوڑے سمجھنے لگے ہیں، ہمیں اس کے لیے باقاعدہ کچھ کرنا چاہیے۔ ...میں اگر ہائی اسکول، ہسپتال اور مدرسے بنیں تو ان کے بچوں کے اندر آگہی ہوگی۔'' بابا جی نے ...ی حل پیش کردیا۔

...بابا جی! میرے پاس جس قدر وسائل ہیں میں اُن کو خرچ کرنے پر تیار ہوں لیکن یہاں کے ہیڈ ...اپنی زمین ہمیں دے دیں گے؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

...ہیں! وہ کبھی نہیں دے گا، زمین اُس کی کمزوری ہے!'' بابا جی نے صاف لفظوں میں بتایا۔

...و پھر؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

...اِس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ اس کا اصل مالک اپنی زمین اِن اچھے کاموں کے لیے دے ...'' بابا جی نے دھیرے سے کہا۔

...ون ہے اصل مالک؟ ہم اُس سے بات کرکے دیکھ لیتے ہیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔

...بدالولی!''

...ید عبدالولی شاہ! یہاں کی تقریباً ساری زمین کا مالک ہے!'' بابا جی کی بات پر احمد شاہ کو باقاعدہ ...کا تھا۔

...بابا جی! آپ۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' احمد شاہ نے بے حد حیرانی سے کہا۔

...یں کچھ غلط کہہ رہا ہوں احمد بیٹے؟'' بابا جی نے اُلٹا اُن سے سوال کرڈالا۔

...ں ولی کو اِس خون خرابے میں جان بوجھ کر دوبارہ نہیں دھکیل سکتا، جہاں سے میں نکال کر انہیں ...یا تھا۔'' احمد شاہ نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

...مد شاہ! جب تم دونوں بچوں کو لے کر جارہے تھے تو میں نے تمہیں صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ...امانت لوٹانی پڑتی ہے۔'' بابا جی کی بات پر احمد شاہ نے سر جھکالیا اُن کے اندر جو طوفان برپا تھا اس ...وجود اُکھڑ رہا تھا۔

...پ۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں!'' بالآخر احمد شاہ نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

...اباش! بیٹے مجھے خوشی ہے کہ آج سے برسوں پہلے جو میں نے فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا تم اُن

بچوں کے سرپرست کے طور پر بہترین انسان تھے، تم نے آج کی بات سے ثابت کردیا ہے۔'' بابا جی نے تعریفی انداز میں کہا۔

جواباً احمد شاہ خالی خالی دِل کے ساتھ چپ سے رہے۔

''احمد شاہ!''

''بچوں کو اُن کی پہچان بتانے کا وقت آ گیا ہے۔'' بابا جی کی بات پر احمد شاہ کو لگا، جیسے اُن کی زندگی کے کڑے امتحان کا وقت آن پہنچا ہو۔

''تم اُن کو سب حقیقت سے آگاہ کرو، یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی پہچان واپس کریں۔'' بابا جی نے دھیمے سے کہا۔

''لیکن اِس سب کا کوئی فائدہ؟'' احمد شاہ کہنے بنا نہ رہ سکے۔

''نگینہ تو ابھی تک بے حد معصوم ہے!''

''بچے ایسی بات سُن کر ذہنی طور پر ڈسٹرب ہوجائیں گے۔''

(بچے کیا! اُن کا سارا گھر اُن کی ساری زندگی ڈسٹرب ہونے والی تھی)

''تم ٹھیک کہتے ہو!''

''لیکن تم نے اب نہ بتایا تو آئندہ دِنوں میں کسی اور ذریعے سے اُن کو معلوم ہوا تو تم پر سے اُن کا بھروسہ ٹوٹ جائے گا۔''

''لیکن بابا جی کون بتائے گا میں نے انہیں معاشرے میں اپنا نام دیا ہے، اُن کا ماضی کیسے اُن تک آ سکتا ہے؟'' احمد شاہ نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''ماضی، حال اور مستقبل سے ہمیشہ جُڑا رہتا ہے کبھی الگ نہیں ہوتا اور کسی موڑ پر سامنے آ ہی جاتا ہے اور اب تو بچے بڑے ہوچکے ہیں۔ یہ ہی درست وقت ہے تم انہیں حقیقت سے آگاہ کرڈالو۔'' بابا جی نے نصیحت کی۔

''بابا جی! اگر زمین کا معاملہ ہے تو ولی کے پاس کون سے کوئی کاغذات ہیں جو وہ ثابت کرسکے کہ وہ ہی سید عبداللہ کا بیٹا اور ان زمینوں کا اصل مالک ہے!'' احمد شاہ کے اس سوال پر بابا جی بے اختیار مسکرائے۔

''جس اللہ نے اُن کی زندگی بچائی وہ چاہتا تھا کہ بچے واپس اپنے مقام پر آئیں، اس لیے اُسی نے سارے ثبوت بھی محفوظ رکھے۔''

''مطلب؟'' احمد شاہ نے نا سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''عبدالولی جب مجھے ملا تھا تو بچے نے اعلیٰ قسم کے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ کچھ دن بعد بخش کی بیوی میرے پاس وہ جیکٹ لائی کہ بچے کو نہلانے کے لیے جب کپڑے بدلوائے گئے تو اُس جیکٹ میں چرمی بیگ اندر کی بڑی جیب میں سے ملا تھا۔ وہ اُس کے باپ کی جاگیر کے کاغذات اُس میں بچوں کے پیدائشی سٹرٹیفکیٹ سے لے کر اُن کے والدین کا نکاح نامہ تک موجود تھا۔ مرنے سے پہلے بھی بہت وفادار اور سمجھ دار شخص نے ہر طرح کا اہم کاغذ جو یقیناً اکٹھے کرے ہوں گے

پڑوں میں ڈال دیا تھا۔'' بابا جی نے ایک بم دھماکہ ہی تو کیا تھا۔

اتنے سالوں سے وہ اتنی بڑی اور اہم بات سب سے چھپائے بیٹھے تھے۔

''آپ۔ آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا!'' احمد شاہ کی آواز کھوئی کھوئی تھی۔ اُن کی آخری اُمید بھی کھوگئی تھی کہ عبدالولی اور نگینہ کو بچالیا جائے۔

''کچھ مصلحتیں آڑے تھیں ورنہ تم پر مجھے پورا بھروسہ تھا اگر میں بچے تمہارے حوالے کرسکتا تھا تو یہ کاغذات بہر حال بچوں سے کسی طور اہم نہ تھے۔'' بابا جی نے احمد شاہ کو تسلی دی کہ وہ اُن کے بھروسے پر پورے اُترتے تھے۔

''یہ دیکھو، یہ ہے ولی کی امانت۔'' بابا جی نے کاغذوں کا لفافہ اُن کے حوالے کیا۔

''ہر کاغذ کو تہہ لگا کر چھوٹا کرکے اِس چھوٹے سے چرمی بیگ میں رکھا گیا تھا۔ بابا جی نے بھی ترتیب میں کوئی ردوبدل نہیں کی تھی۔'' واقعی وہ کاغذات نہایت اہم اور پکے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ہر طرح کے کاغذات اُس میں موجود تھے، نا صرف حویلی کے اہم کاغذات بلکہ ہر طرح کے کاغذات بچوں کی آیا اماں ہی سنبھال کر رکھتی تھیں۔ وہ پڑھی لکھی بیوہ عورت تھی جیسے سید عبداللہ نے اپنے بچوں کی نگہداشت کے لیے رکھا تھا۔ سید عبداللہ اُن کو ماں کا درجہ دیتے تھے بہت عزت اور محبت سے انہوں نے آیا اماں کو رکھا تھا۔ جب وہ ولی اور نگینہ کو لے کر سیڑھیوں کی طرف دوڑی تھیں تو انہوں نے ہر طرح کا کاغذ، جو الماری میں رکھا تھا وہ موڑ کر ایک چرمی پرس میں ڈالے اور ولی کی جیکٹ کے اندر موجود بڑی سی جیب میں رکھ دیے تھے۔

وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ بچوں کو بچاپائیں گی یا نہیں لیکن انہوں نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ بچے نہ صرف بچ جائیں بلکہ اُن کے پاس اُن کی پہچان بھی ہو۔

انہوں نے ہر چیز اللہ کے سپرد کردی تھی۔

اللہ بہتر معاملات طے کرنے والا ہے! اور اللہ تو بالکل ویسا ہی ہے جیسا ہم اُس کے بارے میں گمان کرتے ہیں۔

ایک مرتی ہوئی جلتی ہوئی عورت کا گمان اُس کا یقین تھا کہ اللہ اِن معصوم بچوں کی ضرور حفاظت کرے گا اور اللہ نے اُس کے یقین کو شرمندہ نہیں ہونے دیا تھا۔

بچوں کو جس طرح معجزانہ طریقے سے اللہ نے زندگی بخشی تھی وہ انسانی عقل سے دور تھی کیوں کہ جہاں انسانی عقل کی حد ختم ہوتی، بے وہاں سے ہی انسان کو جان لینا چاہیے کہ اللہ ہی سب کچھ کرسکتا ہے۔

بے شک جان ڈالنے اور لینے والی صرف اللہ کی ہی ذات ہے!

''یہ۔ یہ تو واقعی بے حد اہم کاغذات اور ثبوت ہیں!'' احمد شاہ کی آواز حیرانی سے سرسراتی ہوئی تھی۔

''تو بیٹا! تم ایسے حالات پیدا کرلو، جس میں بچوں کو ذہنی طور پر تیار کرکے اصلیت بتادی جائے۔'' بابا جی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا، وہ بہت زیادہ لمبی گفتگو سے تھک گئے تھے لیکن اُن کو یہ امانت حق دار تک پہنچانی ہی تھی۔

''بابا جی! اِس طرح [illegible] کے ساتھ بچے ایک دم اُس شخص [illegible] کے سامنے آ [illegible] بچوں کی زندگی

دو

خطرے میں نہ آئے گی؟'' احمد شاہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''پیارے بیٹے! جس اللہ نے اُن کی اب تک حفاظت کی ہے۔ وہ ہی اُن کی اب بھی حفاظت کرے گا۔'' باباجی نے انہیں تسلّی دلائی۔

احمد شاہ نے اثبات میں سر ہلا تو دیا لیکن اُن کے دِل و دماغ میں شدید جنگ جاری تھی۔

آنے والے دن اُن کو بے حد مشکل لگ رہے تھے۔ درحقیقت انہیں اپنی زندگی کے بے حد مشکل دِ(ن) لگ رہے تھے۔

❖❖ ○ ❖❖

ابر گریزاں ہو میں صحرا کی طرح ہوں
دو بوند جو برسو گے بے کار میں برسو گے
ہے خشک بہت مٹی ہر سمت بگولے ہیں
صحرا کے بگولوں سے اُٹھتے ہی تو شعلے ہیں
تم کھل کر اگر برسو صحرا میں گلستاں ہو
پر تم سے کہیں کیسے تم ابر گریزاں ہو
جل تھل جو اگر کر دو تن من میں نمی بھر دو
ہے خشک بہت مٹی پوری جو کمی کر دو
پھر تم کو بتائیں گے کہ روح میں پنہاں ہو
پر تم سے کہیں کیسے تم ابر گریزاں ہو
مل جاؤ اگر ہم کو تو جشن منائیں گے
دھرتی نے نہ دیکھے ہوں وہ پھول کھلائیں گے
آنکھوں میں اُجالے ہوں اور دِل میں چراغاں ہو
پر تم کو کہیں کیسے تم ابر گریزاں ہو
مانا نہیں اس قابل تم چاہو محبت دو
ہم تم کو سدا چاہیں بس اتنی اجازت دو
تم عشق تم ہی پوجا اے جان میری جاں ہو
پر تم سے کہیں کیسے تم ابر گریزاں ہو

مسکان کی مٹھی میں موجود کاغذ اور اُس کی تحریر جو وہ کئی سو بار پڑھ چکی تھی، اُس کے ہاتھوں کے پسینے سے گیلی ہو رہی تھی لیکن اُس نے کاغذ اپنے ہاتھوں میں اِس قدر مضبوطی سے دبا رکھا تھا، جیسے کوئی قیمتی ترین چیز مضبوطی سے پکڑی جاتی ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی تحریر تھی جو شہر بانو میکے آئی تو آتے ہوئے مسکان کی ڈاک بھی لے آئی۔ وہ نہایت سادہ اور کم عمر سی لڑکی تھی، جس کو سید سرفراز علی نے اپنے ابنارمل بیٹے کی بیوی بنا کر رخصت بھی کروالیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کان اور شہر بانو کا نکاح ایک ہی دِن ہوا تھا۔ دونوں ہی قسمت کے معاملے میں بدقسمت نکلی تھیں۔
کا شوہر بوڑھا شرابی تھا تو دوسری کا شوہر پاگل جنونی تھا۔
نارمل ہنستی مسکراتی لڑکیاں قربانی کا بکرا بنا کے بھینٹ چڑھادی گئی تھیں۔

آپی! یہ آپ کے کچھ خط آئے ہوئے تھے، جو آیا امّاں کے پاس پڑے تھے، انہوں نے آتے مجھے دیے ہیں کہ آپ کو دے دوں۔'' شہر بانو نے دھیمے لہجے میں کہا وہ اپنی پھوپیوں سے بالکل تھی۔ عام سے نقوش کی گندمی رنگت رکھنے والی لڑکی کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا لیکن اُس کی ازدواجی اُس کی توقعات سے بھی زیادہ بُری نکلی تھی۔

کان نے بے دِلی سے خطوط پکڑ لیے، کمرے میں آ کر اُس نے خط میز پر پھینک دیے، یہ خط یقیناً نے لکھے ہوں گے وہ شہر میں اکیلی اُس کی تکلیف پر تڑپ رہتی تھی۔

ہیں، اُس سے کیا رابطہ کروں، میرے حالات سُن کر الٹا وہ اور پریشان ہوگی اور اب مجھے کوئی حق پہنچتا کہ میں کسی کو اپنی ذات کے لیے مزید پریشان کروں۔'' مسکان نے جل کر سوچا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ خطوط پر پڑی۔

لفافہ بالکل مختلف ہینڈ رائٹنگ میں تھا۔

کان کا دِل بے اختیار دھڑکا، اُس نے حیرت سے اپنی دِلی کیفیت کو دیکھا۔ اُس کا تو خیال تھا کہ اندر اب ہر طرح کے محسوسات کی حِس ختم ہو چکی ہے لیکن یہ اُس کی خام خیالی تھی۔

ل تو اپنے محبوب کے نام پر ہر صورت دھڑکے گا مچلے گا، تڑپے گا۔ کیوں کہ دِلوں کے نکاح نہیں دلوں پر بندش نہیں لگتی۔'' مسکان نے لرزے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا اور خط کھولا۔

م اللہ الرحمٰن الرحیم''

اُس لڑکی کے لیے ہے جس کا خیال ہے کہ وہ ایک ڈوبتی شام ہے۔ جو خالی جھولی ہے، جو بے اور جس کا دِل اتنا چکنا چُور ہے کہ اُس کے سینے میں اُس کی جگہ خالی ہو چکی ہے! اور۔ اور وہ مر چکی

ہماری قسمت میں ہوتا کہ ہم ملتے اور پھر مل کر ہمیشہ کے لیے جڑ جاتے جیسا کہ لوگوں کے ساتھ تو مجھے کہنے میں عار نہیں کہ تم بہترین لڑکی تھیں۔

ان اے پیاری لڑکی۔

ی کے کٹورے میں دُودھ جیسی شفاف آنکھیں اور دِل رکھنے والی، قصّہ صرف اتنا تھا کہ ہماری میں یہ تھا کہ ہم ملیں اور پھر جُدا ہو جائیں۔ اس سارے سفر میں نہ تمہارا قصور ہے اور میرا تو بالکل پھر یہ تو قسمتوں اور دِلوں کے فیصلے تھے۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

م۔ اگر میں نے ان جانے میں تمہارا دِل دُکھایا تو اب معاف کر دو۔ کسی کا مجھ سے ناخوش ہونا ے لیے زندگی برباد کر دینا یہ احساس میرے لیے ایسا ہی ہے، جیسے میری پھولوں بھری زندگی جا کانٹے بار بار چبھنے لگ جائیں۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ کبھی کسی دِل کا، زندگی کا روگ بن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیاری لڑکی!

مجھ تک تمہاری سسکتی روتی تحریریں آئی ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ میرا دِل بہت دُکھا۔ لیکن میں پھر کہو کہ میں نے کبھی نہ تم کو کوئی امید دلائی نہ وعدہ کیا، نہ توہین کی اور نہ ہرٹ کیا۔ تم میرے لیے دوست کی طرح قابلِ احترام تھیں اور رہو گی! مجھے اُمید ہے کہ تم۔ اپنا دل بڑا کرو گی اور میرے لیے نہیں بہاؤ گی۔ اللہ نے تمہیں نئی زندگی میں داخل کر دیا ہے! میری دُعا ہے کہ تمہیں اللہ اتنی محبت او دے کہ تم مجھے کیا میرا نام تک بھول جاؤ (آمین) والسلام۔

عبدالولی احمد شاہ

مسکان کو یہ تحریر پڑھ کر یوں لگا کہ گھٹن بھرے کمرے میں اچانک ہوا آنے لگی ہو۔ کئی روزن کھڑکیاں کھل گئی ہوں۔ اُسے اچانک زندگی میں تازگی محسوس ہوئی تھی وہ زندگی جو مردہ وجود کی بے حِس ہو گئی تھی، زندگی لگنے لگی تھی۔ وہ بجائے خط پڑھ کر ولی کو اپنی زندگی سے الگ کر دیتی بلکہ وہ بار پھر خوش گمانیوں میں گھر چکی تھی حالانکہ وہ جس قید میں تھی وہاں سے موت کے سوا اُس کی جان کو چھڑا سکتا تھا۔

''بھرجائی! کیا تم دن چڑھے بھی اندھیرے کر کے لیٹی رہتی ہو، خیر سے نئی دلہن ہو پہنو اوڑھو بنو یہی تو دلہن کے دن ہوتے ہیں۔'' بڑی نند تقریباً روز ہی اس حویلی کا چکر لگاتی تھی کیوں کہ اُس کی بھی کہیں قریب ہوئی تھی۔

مسکان نے تیزی سے خط تکیے کے نیچے کر دیا۔ اُس پر اُس طرح کی گھبراہٹ طاری تھی، جیسے اُ کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

''ایک تو بھائی صاحب کے یہ زمینوں کے بکھیڑے جانے کب ختم ہوں گے اپنی نئی نویلی دلہن چھ ڈیرے جانے کا تُک کیا بنتا ہے؟'' وہ تیز تیز بولتی الماری کھول کپڑے نکالنے لگیں۔

''آج رج کر تیار ہو جاؤ، میں مالشن کو بھیجتی ہوں، وہ تم کو چنبیلی کے تیل سے مالش کرے گی تیر بدن خوشبو میں دس دن نہ بسا رہا تو مجھے کہنا، مرد کو بنی سنوری عورت زیادہ اچھی لگتی ہے۔''

''تُو ہمیں بس وارث دے دے تاکہ شریکوں کا منہ بند ہو جائے۔ میرے ویر کے دشمن بہت ہیں، کیا کریں جتنی زیادہ زمین اُس سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں، تیری کوکھ سے لڑکا مل گیا تو بھائی ا تم کو رانی بنا کر رکھے گا تا عمر تیرا ہی رہے گا۔ ورنہ عورت کے معاملے میں وہ بڑا بے نیاز ہے کیوں کہ عورت پر وہ نگاہ کرے راتوں رات اُس کے ڈیرے میں آ جاتی ہے اِس لیے وہ کوئی ترسا ہوا م ہے اُس کو قابو کرنا ہے تو تیری چھوٹی عمر کام نہیں آئے گی بلکہ تیری شوخ ادائیں کام آئیں گی۔'' نے حیرت سے اُس عورت کو دیکھا، وہ کس قدرے بے حیائی اور ڈھٹائی سے اپنے بھائی کے کرتو رہی تھی، جیسے اُس کا بھائی کوئی کارنامہ انجام دیتا رہا ہو۔

''آج رات وہ ڈیرے سے واپس آ رہا ہے، کہہ رہا تھا نئی دلہن کو تیار کرو آج وہ سہاگ رات گا۔ ہا، ہا۔ ہی۔'' ساتھ ہی اُس نے بے ہودگی سے ہنسنا شروع کر دیا، جیسے اُسے کوئی لطیفہ سننے کو ہو۔

ہائے!''

جائی اُٹھ جا، اُٹھ کر تیاری شیاری شروع کر کیا مُردوں کی طرح پڑی ہے۔ عورتیں تو شوہر کے ن کر ہر بار دلہن کی طرح بجتی اور انتظار کرتی ہیں۔'' مسکان کو اِس عورت کی باتوں سے سخت ہو رہی تھی۔

کے زبردستی کرنے پر وہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی تو اُسے اندازہ ہوا کہ اُس کی ٹانگیں تو بے جان ہوئی

ن رات ہی اللہ تیرے پر خیر کر دے تو اِس حویلی کا وارث آ جائے گا۔''

سے پہلے وہ بتول تو کچھ نہ دے سکی، ہر سال مُردہ بچہ پیدا کر کے نحوست پھیلاتی رہی اور شہر بانو ایک کُڑی پیدا کر کے ہی بنجر ہو گئی اور وہ تیسری والی بھی خالی پڑی ہے۔ بھلا ہم نے اِن سب کا ہے جو وارث ہی پیدا نہ کر کے دیں۔'' مسکان پر یہ انکشافات حیران کن تھے۔

لی کی تین بیویاں موجود تھیں تو مجھے کیوں بابا سائیں نے اِس شخص کے ساتھ بیاہا؟ مسکان کے ید سرفراز علی کے لیے نفرت بڑھ گئی تھی۔

ان کی بیویاں موجود ہیں تو پھر مجھ سے شادی کیوں کی؟'' مسکان نے اپنی نند سے بھی سوال کر

تمہیں بھرجائی، لڑکے کے واسطے۔''

لی شادی کو انتیس تیس سال ہو گئے ہیں، پر اولاد پیدا ہوتی مرجاتی، دوسری سے شیر بانو کے بعد تیسری کے ساتھ بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ بھائی اظہر علی بوڑھا ہو گیا تو شریکوں کو تو موقع مل مین ہتھیانے کا، خود میرا میاں اکثر اِس زمین کے متعلق بات کرتا ہے لیکن میں نے بھی سوچ لیا ے کا ویاہ (شادی) اور کر دوں گی تاکہ بچہ ہو جائے لیکن یوں لوگوں کی تھوتھنیاں نہیں کھلنے دوں ان نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

میں مالشن کو بھیجتی ہوں۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئی جب کہ مسکان کھڑے وجود کے ساتھ زمین پر

فرش پر سجدہ ریز ہو گئی تھی۔

پلیز! اب سے پہلے میں نے کبھی بھی تم سے جامع دُعا نہیں مانگی لیکن پلیز میری دُعا قبول ے وجود کو صرف اور صرف ولی چھوئے، میرے بدن سے صرف ولی کی اولاد پیدا ہو۔ مجھے اس جانور نما شوہر سے۔''

نہیں جانتی یہ کیسے ہوگا لیکن تیرے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے جب تو چشموں کا رُخ بدل ری دُعا قبول کرنا تیرے لیے کون سا بڑا کام ہے۔''

اللہ! تجھے تیری بڑائی کا واسطہ! میری دعا قبول فرما!'' مسکان سسک رہی تھی، بلک رہی تھی، آج مرنے کی کوشش کرتی رہی تھی کبھی جامع دُعا نہیں کی تھی۔ اللہ پر یقین بھروسہ نہ کیا تھا لیکن ے یقین سے، بھروسے سے دعا مانگ رہی تھی اور یقین اور بھروسے سے کی جانے والی دُعا تو

ہمیشہ قبول ہوتی ہے، معراج پاتی ہے مکان اِردگرد سے بے گانہ مسلسل دُعا میں مشغول تھی۔

''اللہ۔ پلیز اللہ بچالو!''

کیسے میں نہیں جانتی!

''اللہ مجھے میری محبت دے دے، اُسے میرا شریکِ زندگی بنادے۔'' وہ اَنہونی مانگ رہی تھی۔

اُسے لگا آج وہ دوبارہ ہوش میں آ گئی ہے!

اِس سے پہلے شیطان نے اُسے اتنا بھٹکایا کہ اُس نے اپنے لیے خیر کا سوچا بھی نہیں اور دُعا تک نہ تھی لیکن ولی کی ایک تحریر نے وہ شیشے کا حصار توڑ ڈالا تھا۔ اب وہ پھر سے سانس لینے لگی تھی۔

❖❖○❖❖

ترنم اور ماہی ایئر پورٹ پہنچ کر بورڈنگ کارڈ لے کر ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھی تھیں، جب دو وومن پولیس کی اہلکار اُن کی طرف تیزی سے بھاگتی آئیں۔

''آپ دونوں فلائیٹ نہیں لے سکتیں!'' انہوں نے کہا۔

''لیکن کیوں؟'' ماہی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

''وہ اِس لیے کہ آپ کے نام بلیک لسٹ میں ہیں!'' وہ انکشاف کر رہی تھیں۔

''واٹ؟'' ماہی چیخی۔

''لیکن ہم نے کیا کیا ہے؟'' ترنم نے پوچھا۔

''آپ ہمارے ساتھ چلیں آپ کو پتا چل جائے گا۔'' دونوں نے اُن دونوں کا ایک ایک بازو پکڑا انہیں باہر لے آئیں۔

''لیں جی! یہ ہی ہیں نا آپ کی لڑکیاں؟'' اُن میں سے ایک پولیس آفیسر بولی۔

ترنم اور ماہی کا سانس اوپر کا اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

سامنے میڈم راگنی کھڑی تھی بیک لیس بلاؤز میں، کالے رنگ کی ساڑھی میں اُس کا جسم چمک رہا تھا

''ارے تم لوگ کہاں جارہی ہو؟''

''چندا کیا ہوا اگر چاندنی نہیں رہی تو، میں تو ہوں نا، میں کیوں اُس کی لڑکیوں کو لاوارثوں کی طرح رستوں میں رُلنے دوں گی۔''

''چلو میرے ساتھ!'' اُس نے پیار سے کہتے کہتے حکم دیا۔

''نہیں میڈم! اب ہم خود مختار رہیں گی۔'' ماہی میں جانے کہاں سے ہمت آ گئی، جو اُس نے کہہ ڈالا۔

''مت بھولو لڑکی کہ یہ جو ہماری دُنیا ہے یہ ون وے ہے، جہاں لڑکی آ تو سکتی ہے لیکن جا نہیں سکتی صرف ایک راستے سے واپس جا سکتی ہے اور وہ ہے موت، اب آرام سے چلو۔''

''مائیک! لے چلو ان کو۔'' اُس نے اپنے ہیوی ویٹ باکسر نما نوکر کو حکم دیا، جس نے اگلے ہی دونوں کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''سی۔'' ماہی اور ترنم بے اختیار ہوئیں۔

جب وہ دونوں میڈم راگنی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں تو ترنم کو ایک بار پھر لگا کہ ایمان فاطمہ ایک بار پھر لٹنے بازار جارہی ہے!

ترنم کو سانس لینا دُشوار ہورہا تھا۔ وہ بے بسی سے کسمسا کر رہ گئی۔

جس دُنیا کی اُسے ملکیت بنادیا گیا تھا، وہ دنیا ایک ایسی دلدل تھی، جہاں مزید دھنسا تو جاسکتا ہے یا تو جاسکتا ہے! لیکن نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آرہا تھا۔

❁

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سر! اطلاع بالکل پکی ہے!'' طارق کے اسسٹنٹ نے ایک فائل اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا
''اگر لڑکے نے کچھ گڑ بڑ نہیں کی تھی تو وہ علاقہ غیر کیوں گیا؟ ملزم عموماً کچھ غلط کر کے ہی علاقہ
دوڑتے ہیں۔'' طارق نے باآواز بلند خیال آرائی کی۔

''سر! وہاں تک ہمارے قانون اور پولیس کی پہنچ تو ہوتی نہیں، پھر کس طرح لڑکے کو واپس لانا ہے
طارق کا ماتحت خبر لایا تھا کہ کاشف علاقہ غیر دوڑ گیا ہے۔
ایک مخبر پٹھان کے ذریعے خبر کنفرم بھی کر لی گئی تھی۔

''ایک تو بہت سادہ اور عام طریقہ ہے کہ اخبار میں اُس کے والدین اور گھر والوں کی جانب سے آ
محبت بھرا پیغام چھپواؤ کہ وہ واپس آ جائے، ساتھ اُس کی تصویر ضرور دینی ہے۔ علاقہ غیر میں اُردو اخبا
اپنے مخبر قائم خان کے ذریعے کاشف تک پہنچاؤ۔ یہ سب کچھ یوں ہو کہ لڑکے کو یہ سب اچانک نظر آ
تا کہ اگر اُس کی کوئی ناراضی ہے تو وہ دور ہو جائے یا پھر کوئی اور مسئلہ ہے تو وہ بھی دُور ہوتا کہ وہ خود
واپس آئے۔'' طارق نے اپنے ماتحت کو ہدایات دیں۔

''وہ جی سر کہتا باہر نکل گیا۔''

طارق نے ہاتھ بڑھا کر فون اُٹھایا اور ولی کا نمبر گھمایا اُدھر سے جو آواز سنائی دی، طارق کی روح
میں آسودگی اُتر گئی۔

''کیسی ہیں؟'' طارق کا رُواں رُواں کان بنا ہوا تھا۔

''کاش تم کہو کہ صرف آپ کی ہوں!'' طارق نے خود سے خیال آرائی کی۔

''ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں، اب تو آپ سائرہ آپی کو بھی نہیں لاتے۔'' نِگی نے اُس کی غیر حاضری
کا شکوہ کیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم میری غیر حاضری کو محسوس کرتی ہو؟'' طارق بے اختیار سوال کر بیٹھا

''بالکل!''

''آپ اتنے دِنوں سے نظر نہیں آئے، نہ ہی سائرہ آپی کو لائے، کہیں گئے ہوئے تھے کیا...؟'' نِگی
باتوں میں سادگی تھی۔ کاش اِن میں کوئی تڑپ ہوتی تو یہی جملہ طارق کے لیے کتنا انمول ہو جاتا۔

''میں یہیں ہوں! اگر تم اپنے آس پاس محسوس کرو تو!'' طارق کا اظہار بے اختیار تھا، درست وقت
انتظار کرتے کرتے وہ بہت کچھ گنوا بیٹھا تھا۔ نِگی کے لیے اُس کی شدت مزید بڑھ چکی تھی۔

طارق بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں، آپ کا لہجہ کتنا بدلا بدلا ہے۔'' نِگی نے حیرت سے طارق کی خیریت
... اُس سے کبھی اتنی سنجیدگی سے مخاطب نہ ہوتا تھا۔

... کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں، میرا دِل! کچھ بھی تو اپنے مقام پر نہیں ہے، میں بہت اپ سیٹ
... تمہاری مدد کی ضرورت ہے تم مجھے اور میرے دِل کو مقام پر لانے میں مدد کرو۔'' طارق دھیرے
... بولتا گیا۔ اُس کی آواز بے حد گمبھیر ہو چکی تھی۔

... نے حیرت سے فون کو دیکھا۔

طارق بھائی کو کیا ہوا؟ اور یہ اتنے اپ سیٹ کیوں ہیں؟'' وہ بے اختیار سوچ گئی۔

ہیلو!''

... تم فون پر موجود ہو؟'' طارق آج بہت بے صبرا ہو رہا تھا۔

... ''

طارق بھائی پلیز! آپ اپ سیٹ نہ ہوں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، میں بھائی کو بھی آپ کی
... وں گی، آپ بتائیں کہ کیا مسئلہ ہو گیا؟ انکل شہباز کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' نِگی کا صاف دِل و
... نی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ طارق کی باتوں سے اور ہی نتیجہ اخذ کر بیٹھی تھی۔

... چپ! چپ!'' طارق ایک دم سے چڑ کر بولا۔

... تم بڑی ہو چکی ہو، اور بڑوں کی طرح سوچنا اور دیکھنا شروع کرو۔''

... اتنی بے خبری! یہ بے خبری بہت قیمتی پل اور انسان کھو دیتی ہے، کبھی اپنے بچپنے سے نکل کر
...'' طارق بات کرتے کرتے ایک دم بے حد غصے میں آ گیا ساتھ ہی اُس نے کھٹاک سے فون رکھ

... نے حیرت سے فون کو دیکھا۔

طارق کی ساری باتیں تو اُسے سمجھ نہ آئی تھیں، لیکن طارق کا بدلا بدلا لہجہ اور غصہ اُس کو سہما گیا تھا۔

... ں نے کیا کہا؟ مجھ پر کیوں اتنے خفا تھے!''

... کبھی کسی نے اونچی آواز میں مخاطب نہ کیا تھا۔ طارق کی گفتگو پر وہ روہانسی سی ہو گئی، دِل کچھ
... اس سے دھڑکنے لگا تھا، کیوں؟ فی الحال وہ خود بھی نہ جان پا رہی تھی۔

❖❖○❖❖

... اتنی سی تھی تب سے من مانی کرنے لگی تھی، من کی بہت سنتی تھی میں اُس سے ہمیشہ یہ ہی کہتی تھی
... یوں کو من مارنا سیکھنا چاہیے! لیکن اُس نے... اُس نے سُنا ہی نہیں!'' حسن آرا کی آواز بے حد
... تھی۔

... کھو دینے کا احساس ایسا تھا جیسے بہت قیمتی چیز ہاتھوں سے پھسل جاتی ہے۔

... نے دیکھا بیٹا! من نہیں مارا اُس نے، تو من نے اُسے مار ڈالا!'' وہ سسکتے سسکتے ایک دم پھوٹ
... رو دیں۔

... میری پہلی بیٹی تھی، میں نے اپنی ممتا کے احساس کو اُس کے وجود سے تسکین دی تھی۔'' حسن آرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ر کا لفظ لفظ ماتم کر رہا تھا۔

''پلیز! آپ حوصلہ کریں... میں تو معمول کی کارروائی کے لیے حاضر ہوا تھا، میرا مقصد آپ کا دل دُکھانا ہرگز نہ تھا۔'' طارق کو اُس روتی بلکتی خاتون کے رونے سے بے حد تکلیف ہورہی تھی۔

''وہ خود تو مرگئی... اپنے ساتھ ہمیں بھی مارگئی۔'' حسن آرا بیگم ایک بار پھر زار و قطار رونے لگیں۔

''سسٹر پلیز! ان کو پانی پلائیں!'' طارق نے پاس کھڑی علیزے کو مخاطب کیا، جو چپ چاپ آنسو بہارہی تھی رونے سے اُس کی آنکھیں اور ناک بے حد سرخ ہورہی تھی، اُس نے آگے بڑھ کر ماں کو پانی پلایا۔

''وہ نامراد! اُس کا کچھ پتا چلا...؟'' حسن آرا بیگم نے پانی پی کر پوچھا۔

''کون...؟'' طارق نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ، یہ کاشف بھائی کا پوچھ رہی ہیں۔ ولی بتارہے تھے کہ انہوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اُن کا پتا کروائیں۔'' علیزے نے فوراً آگے بڑھ کر بات کو سنبھالا، اُسے ڈر تھا کہ ماں اپنے غم میں کہیں سچائی نہ اُگل دیں۔

دل تو علیزے کا بھی کاشف سے بے حد اُکھڑا ہوا تھا لیکن جب مرنے والی اُسے صاف بچا کر معاف کرگئی تھی تو اُس کو کاشف سے بدلہ لینے کا حق نہ پہنچتا تھا۔ پھر وہ کس سے بدلہ لیتے؟

اپنے ہی بھائی بیٹے کو سزا دینا اُن میں حوصلہ نہ تھا۔

''اوہ اچھا!''

''جی ہاں! کاشف کا پتا تو چل گیا ہے لیکن جس جگہ وہ موجود ہے اُس سے پہلا سوال یہ ہی اُٹھتا ہے کہ اُس نے ایسا کیا کیا، جو وہ علاقہ غیر میں جا چھپا...'' طارق کے سوال پر حسن آرا بیگم نے بے ناراضی سے منہ موڑ لیا، وہ منزہ کا قتل کاشف کو معاف نہ کرسکی تھیں، لیکن اپنے منہ سے اپنے ہی بیٹے کے خلاف گواہی بھی نہ دے سکتی تھیں۔

''وہ ابو کے کچھ پیسے، تقریباً لاکھ روپے چُرا کر بھاگے ہیں، بھائی کوئی کاروبار کرنا چاہتے تھے ابا اُن رقم نہیں دے رہے تھے، اس لیے وہ رقم لے کر بھاگ گئے۔''

کبھی کبھی بڑے جُرم کو چھپانے کے لیے چھوٹے جرم کا اظہار ہی بڑے جُرم سے بچا سکتا ہے، علیزے نے بھی کچھ ایسا کیا تھا۔

''اوہ! تو یہ بات تھی۔'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا، جیسے وہ ساری بات سمجھ گیا ہو۔

علیزے نے بھی ایک طویل سانس بھری۔ شکر تھا طارق ان کی باتوں پر یقین کررہا تھا، ورنہ طار جیسے ذہین شخص کا یوں آسانی سے بات مان جانا آسان نہ تھا۔

''میں انشاء اللہ جلد از جلد کوشش کروں گا کہ وہ گھر واپس آجائے، اپنی ایک غلطی کو چھپانے کے وہ بے حد غلط جگہ جا چکا ہے۔ وہ تو مجرموں کی پناہ گاہ ہے وہاں رہنے والا ہر شخص جرم کی اُس دنیا جراثیموں سے خود کو کم ہی بچا پاتا ہے، آپ بھی اُس سے رقم کا ذکر کر کے اُسے پریشان نہ کیجیے گا۔ اُس واپس آجانا ہی اُس کی زندگی کے لیے بہتر ہوگا۔'' طارق نے علیزے کے بنائے ہوئے بہانے کے

لر ان سب کو سمجھایا۔

''جی... انشاء اللہ ہم اُس کو کبھی گزری باتوں سے ڈسٹرب نہیں کریں گے۔ اُس کا واپس آجانا بے حد ضروری ہے، جب سے وہ گیا ہے میرے ابّو بالکل گم صم سے ہوکر رہ گئے ہیں وہ اُن کا بے حد لاڈلا اور پیارا تھا، اُس کے یوں غائب ہوجانے پر وہ بے حد ڈسٹرب ہوچکے ہیں۔'' علیزے نے سچائی بیان کی۔

''ٹھیک ہے، میں اب چلتا ہوں، اجازت دیجیے...'' طارق نے وہاں سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''جی بہت زیادہ شکریہ! آپ نے سول پولیس کی روز کی تفتیش سے ہماری جان چھڑائی۔'' علیزے نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

''ارے! میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اپنے صاحب بہادر کا شکریہ ادا کیجیے گا، وہ محترم اپنی محترمہ کے لیے بے حد فکرمند تھے۔ واقعی بھابی صاحبہ! آپ نے سرپھرے شیر کو کیسے قابو کرلیا؟ وہ تو ایسا انسان تھا جس کے متعلق لڑکیاں آئرن مین کا لفظ استعمال کرتی تھیں، جانے وہ آئرن مین آپ کے آگے کیسے پگھل گیا، آخر آپ نے اُس پر کیا جادو کیا؟'' طارق نے دلچسپی سے علیزے کا حیا سے سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواباً علیزے، شرم سے بے حد سرخ پڑگئی۔

''واقعی یار ولی! تمہاری پسند ہے تو بالکل یونیک! آج کل کہاں ایسی شرم میں ڈوبی لڑکیاں ملتی ہیں۔'' طارق دل ہی دل میں سوچتا باہر نکل آیا۔

❖❖ ◯ ❖❖

سید سرفراز بہت دیر سے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ بے چینی اُن کے چہرے اور چال دونوں ہی سے واضح تھی غصّے میں اُن کا تنفس ہمیشہ بے ترتیب ہوجاتا تھا اس وقت بھی غصّے سے اُنکا تنفس بے ترتیب تھا لیکن ان کا دماغ ہر بات کو بہت ترتیب سے سوچ رہا تھا۔

سید اظہر علی کی باتیں اُن کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں، وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اُن کی پلاننگ اِس بُری طرح بھی فیل ہوسکتی ہے۔

بلال اور شہر بانو کی شادی اور مسکان اور اظہر علی کی شادی اسی پلان کا مکمل حصہ تھا۔ لیکن آج اُن کو اپنا پلان فیل ہوتا محسوس ہوا۔

مسکان کی شادی اظہر علی سے کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اُن کی زمین کو بٹوارے کا سامنا نہ کرنا پڑے... اس لیے انہوں نے شادی سے پہلے ہی کہلوادیا تھا کہ اُن کو شہر بانو کے جہیز میں زمین نہیں چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ وٹے سٹے کے اِس رشتے میں اگر سید سرفراز نے زمین کا مطالبہ نہیں کیا ہے تو سید اظہر علی بھی زمین کا مطالبہ نہیں کرے گا... لیکن یہ اُن کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔

سید اظہر علی مسلسل اُن سے زمین کا مطالبہ کررہا تھا شادی سے لے کر اب تک سید اظہر علی کا یہ کوئی پانچواں چکر تھا زمین کے چکر میں۔

سید سرفراز علی کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ اظہر علی اِس قدر لالچی اور حریص نکلے گا۔ اُن کا تو خیال تھا کہ جوان اور خوب صورت خاندانی لڑکی سے شادی ہی اُس کو دبا لے گی لیکن اظہر علی بے حد شاطر انسان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ عورتیں، لڑکیاں اُس کے لیے کوئی خاص معنی نہ رکھتی تھیں، وہ جس عورت کو چاہتا تھا قیمت دے کر فوا حاصل کرتا آیا تھا۔ مسکان سے شادی صرف اور صرف اُس نے زمین کے لالچ میں کی تھی۔ سید سرفراز کی زمین بہت زرخیز مقام پر تھی اور یہ زمینیں صحیح معائنوں میں سونا اگلتی تھیں۔

''مجھے اپنی بیوی کا حصّہ چاہیے...!'' آج وہ پھر مطالبہ لے کر پہنچ گیا تھا۔

''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر مجھے زمین ہی بانٹنی ہوتی تو میں وٹے سٹے کا رشتہ ہی نہ کرتا۔'' سید سرفراز نے واضح لفظوں میں جتایا۔

''لیکن اِس سارے معاملے میں، میں نے یہ بالکل نہ کہا تھا کہ میں اِس رشتے میں زمین سے دستبردار ہو چکا ہوں۔'' سید اظہر علی نے فوراً کہا۔

''تم...تم بھول رہے ہو کہ تمہاری اکلوتی بیٹی اب میری بہو بن کر اِس حویلی میں آچکی ہے۔'' سید سرفراز نے اُسے ڈرانے کی کوشش کی۔

''کیا تم نہیں بھول رہے کہ تمہاری بیٹی اب میری بیوی بن کر میری حویلی میں آچکی ہے۔'' سید اظہر علی تو بہت ہی شاطر انسان تھا، وہ کیسے چوکتا۔ سید سرفراز کو اب باقاعدہ احساس ہوا کہ اُس کا واسطہ ایک حریص انسان سے پڑا ہے۔ اُن کے دماغ نے فوراً کہا کہ اِس غلط کو فوراً اُس درست ہونا چاہیے۔ ورنہ اُن کے لیے بے حد خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

''اور تم یہ بھی نہ بھولنا کہ اگر میں چاہوں تو تمہاری بیٹی کو فوراً طلاق دے کر واپس بھیج سکتا ہوں، میں نے تو اِسی لیے اب تک اُسے بیوی کا حق بھی نہیں دیا کہ معاملات طے ہو جائیں...'' اظہر علی کی بات پر سید سرفراز کا غیرت سے چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''میرا کیا جاتا ہے! اگر میں مسکان کو طلاق دوں گا تو ساری برادری میں تھو تھو ہوگی کہ شوہر نے ہاتھ لگائے بغیر ہی طلاق کیوں دے دی، یقیناً لڑکی آوارہ بدچلن ہوگی۔'' سید اظہر علی اپنی بات کہہ کر خود ہی ہنسا۔

''اور اگر ہم تمہاری بیٹی کو طلاق دے دیں تو...؟'' سید سرفراز نے غصّے سے کہا۔

''تم بھول رہے ہو کہ تمہارے نیم پاگل بیٹے کی ذہنی حالت کی وجہ سے تم طلاق کا حق لڑکی کو تفویض کر چکے ہو، اب تمہارا بیٹا میری بیٹی کو خود سے طلاق نہیں دے سکتا۔''

سید سرفراز کو فوراً احساس ہو گیا تھا کہ اظہر علی نے اِس شادی میں سید سرفراز سے زیادہ گیم کھیلا تھا اُس نے اپنے مہرے بے حد پکے کیے تھے۔

''اور تم نکاح نامے میں واضح کر چکے ہو کہ اِس نکاح کے ساتھ تمہیں زمین وغیرہ سے غرض بھی نہیں ہے۔'' اظہر علی کھل کر مسکرایا، سید سرفراز کو اُس کی یہ مسکراہٹ بے حد بُری لگی۔

''اگر تم کو لڑکی عزت سے بسانی ہے تو آج اُس کے زمین کے کاغذات بنوا دو، ورنہ اپنی لڑکی گھر بٹھاؤ۔'' اظہر علی نے خاصی بدتمیزی سے کہا۔

''اگر تم نے میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی تو ہم تمہاری لڑکی کو تمہارے گھر بھیج دیں گے۔'' سید سرفراز نے اُس کے پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! لیکن اِس کے بعد کے نتائج کے تم خود ذمے دار ہو گے۔'' اظہر علی کے لہجے میں بے حد اطمینان تھا۔

اظہر علی کے چہرے پر کچھ ایسا ضرور تھا، جس نے سید سرفراز کو چونکا دیا تھا۔

''تم آخر کیا کرنے والے ہو...؟'' سید سرفراز پوچھے بِنا نہ رہ سکے۔

''یار دیکھو! میں ہوں سیدھا سادا انسان، میں پیچھے سے کچھ نہیں کرتا۔ جو کرتا ہوں سامنے سے کرتا ہوں۔ مسکان تمہاری بیٹی، بیوی میری! آخر میرا ہی سنے گی۔ میں اُس کے دستخط لوں گا اور قانونی طور پر اپنی بیوی کا حصہ لوں گا اور وہ کچھ بھی جو اُس کی والدہ اُس کے نام کر گئی تھیں۔ میری بیوی کا حصّہ اور حق اُس کے پاس رہنا چاہیے، یہ حق تلفی میں ہرگز نہ ہونے دوں گا... میں اپنی بیوی کے سارے حقوق اُسے دلاؤں گا۔'' سید اظہر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا...

''تم زمین کی خاطر اتنی گری ہوئی حرکتیں کرو گے؟'' سید سرفراز کا خون ہی کھول گیا۔

''تم سے کم! تم کون سا بلندی پر بیٹھے ہو، تم نے زمین اور حکم رانی کی خاطر جو کچھ آج تک کیا ہے وہ لوگ آج تک بھولے نہیں ہیں، میں تم سے پنگا بالکل نہیں لوں گا تم سیدھے طریقے سے ہمارا حق دے دو...'' اظہر علی نے صلح جو انداز میں کہا۔

''ہمارا حق!'' سید سرفراز علی نے ایک قہر بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔

''کون سا تمہارا حق؟''

''میری بیوی کا حق، میرا حق ہی تو ہوا۔'' اظہر علی کی باچھیں کھل رہی تھیں وہ کچھ زیادہ ہی خوش اخلاق ہو رہا تھا بات بات پر مسکراہٹ اُس کے چہرے کا حصّہ بن کر سید سرفراز کا خون کھولا رہی تھی۔

''اچھا سُسر جی! چلتا ہوں!'' اظہر علی بے حد خود اعتمادی سے قدم اُٹھاتا باہر نکلا تو سید سرفراز علی بے چینی سے اُٹھ کھڑے ہوئے، تب سے اب تک وہ پاؤں جلی بلّی کی طرح چکر کاٹ رہے تھے۔ اظہر علی! جسے وہ بیٹی دے کر اور اُس کی بیٹی لے کر احسان کرنے نکلے تھے، کیسا زہریلا سانپ نکلا جس نے شادی کے فوراً بعد ہی اپنا سر اُٹھا لیا تھا۔

''اِس سانپ کا سر کچلنا بے حد ضروری ہے ورنہ یہ سانپ ہمیں ہی ڈس لے گا...'' وہ ایک دم چلتے چلتے رُکے اور با آواز بلند بولے۔ یوں جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہوں۔

''اکبر!'' انہوں نے اپنے ملازم خاص کو آواز دی۔

''جی سائیں!'' وہ دوڑتا ہوا اندر آیا، اپنی گھر والی سے کہو کہ میرے کالے کپڑے نکال کر تیار کرے، مجھے ماتم والے گھر جانا ہے۔'' اکبر کی بیوی حویلی کے اندر خاص ملازمہ تھی اور بہت سارے کام سنبھالتی تھی۔

''جی سائیں!'' اکبر نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''کس کے گھر ماتم ہے؟'' اکبر نے پوچھا۔

''میرا داماد کچھ دیر بعد اِس دنیا میں نہیں رہے گا! وہاں اُس کی حویلی میں ماتم تو ہوگا نا۔'' سید سرفراز علی نے سفاکی سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی سائیں!'' اکبر علی نے حیرت سے سید سرفراز علی کو دیکھا۔
''پر سائیں وہ تو چھوٹی بی بی کے سائیں ہیں۔'' اکبر کہے بِنا نہ رہ سکا۔
''ہیں نہیں، تھے۔'' سید سرفراز علی نے غصّے سے کہا۔
''جاؤ دیگوں کا انتظام کرو... ہمارے ہاں داماد کی فوتگی پر سسرال سے کھانا جاتا ہے۔''
''جی... جی سائیں!'' اکبر نے فوراً تابع داری سے حامی بھری۔
''سندھو گولی سے کہو کہ ایک لال جیپ ہماری حویلی سے پندرہ منٹ پہلے نکلی ہے وہ جیپ اپنے گا ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ سکتی ہے لیکن اب نہیں پہنچنی چاہیے، اُس کی ہر سواری سیدھی شہر کے سول ہسپتال کے مردے خانے میں پہنچنی چاہیے۔
جاؤ فوراً! اور ہاں کام ہوجائے تو فوراً اطلاع دینا تاکہ ہم تیار ہوکر ماتم کے گھر پہنچ سکیں۔'' سید سرفرا کے چہرے پر ایسی سفاکی تھی کہ اکبر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔
''جی سائیں!'' وہ تابع داری سے سر ہلاتا باہر نکل آیا۔ سید سرفراز کے تنے ہوئے اعصاب اُن کے ذہنی خلفشار کی نشان دہی کر رہے تھے۔
''ہونہہ! مجھ سے پنگا لے گا! ارے میں نے تو اپنے سگے باپ اور پھر اپنے بھائی کو اپنی راہ میں آنے دیا یہ پھر کیا چیز ہے۔'' سید سرفراز نے تنفر سے سوچا اور باہر نکل گئے، ابھی اُن کو ڈھیروں کام کرنے تھے۔
سو طرح کی رسمیں، بیٹی کے گھر پوری کرنی ہوتی ہیں وہ اُن کے انتظامات کرنے کا کہنے نکلے تھے۔

❖❖()❖❖

''تمہیں کیا ہوا ہے بھر جھائی؟ یہ بوتھا تو ٹھیک رکھو... آخر کو تیرا میاں آنے والا ہے یہ سارا ہار سنگا اُس کے ہی لیے تو ہے، خوش ہو کہ آج تیری سہاگ رات ہے۔'' وہ تھوڑا غصّے سے بولی، اُسے مسکان بنا ہوا منہ اچھا نہ لگ رہا تھا۔
مسکان نے کچھ گھور کر اپنی اِس نند کو دیکھا، جو کسی مصیبت کی طرح نازل ہوتی تھی اور چیونگم کی طر چپک جاتی تھی۔
''ایک بات اپنے پلّے سے باندھ لے کہ وارث چاہیے ہمیں حویلی کا... اگر تو نے بھی وارث نہ دیا تجھے بھی دوسری بانجھ بیویوں کے ساتھ چھوٹی حویلی میں رہنا ہوگا۔'' مسکان کی چھوٹی نند اُسے مختلف گھر روایتوں سے آگاہ کر رہی تھی۔
مسکان نے ایک بیزاری نگاہ اُس پہ ڈالی، اُسے اِن روایتوں اور حکمت عملیوں سے کوئی نہ غرض تھی وہ تو اِس قید خانے سے نکل جانا چاہتی تھی۔
''تی... تجھے کہا تھا بی بی کو یہ لال اور ہرا سیٹ چوڑیوں کا پہنانا ہے۔'' مسکان کی نند کی نگاہ ایک مسکان کی سونی کلائیوں پر پڑی۔
''کم بخت! پہلے بی بی کو چوڑیاں پہنا... سونی کلائیاں تو بہت بڑی بدشگونی ہوتی ہے۔''
''یا اللہ! اگر میری قسمت میں یہ ہی جاہلانہ ماحول تھا تو تو نے باہر کی دنیا دیکھنے ہی کیوں دی۔

لی اگر دودھ پر پالنی ہو تو کبھی بھی اُسے گوشت نہیں چکھاتے، تاکہ وہ اُس کی کمی محسوس ہی نہ کرے۔
اس کے باپ نے کیوں اُس کے ساتھ، ایک جیتی جاگتی لڑکی کے ساتھ، اُس کے جذبات کے ساتھ دل کھول کر کھیلا تھا۔
اُس کے باپ نے اُسے تعلیم دلوائی، ہائر اسٹڈی کے لیے باہر نکالا پھر اُسے صرف لڑکیوں کے ہی نہیں لڑکوں کے ساتھ پڑھایا، بے انتہا اعتماد دے کر اپنی ذات کے خاص ہونے کی پہچان دے کر اُسے یہاں چار دیواری میں لاکر بند کر دیا۔ آسمان دکھا کر اُس کے پر کاٹ لیے!
''سی!'' مسکان نے ایک دم سسکی بھری، جیسے وہ اُس تکلیف کو ابھی تک محسوس کرتی ہو۔
مسکان چپ چاپ ملازمہ کو چوڑیاں پہناتے دیکھ رہی تھی، ایسے جیسے وہ یہ چوڑیاں اُس کو نہیں کسی اور کو پہنا رہی ہو۔ مسکان کی مگن خیالی تب بھی نہ ٹوٹی جب بہت ساری سرخ چوڑیاں ایک دم ٹوٹ کر اُس کے ہاتھوں پر زخم بنا کر ہلکی سی خون کی لکیر بنا گئیں۔
''ہائے، ہائے مرجانی!'' مسکان کی نند کی نگاہ اچانک مسکان کے ہاتھ پر پڑی تو اُس نے ملازمہ کو ڈانٹا۔
''مرجانی! بی بی کا سارا ہاتھ لہولہان کر ڈالا، تیری آنکھیں ہیں کہ بٹن، جو دیکھتی نہیں صرف سجاوٹ کے لیے لگا رکھی ہیں۔'' اُس کا غصّہ اب بھی نہ اُترا تھا۔
''چل اب بس کر۔ آدھی درجن چوڑی توڑ ڈالی ہے کم بخت یہ بھی بدشگونی ہوتی ہے، دھیان سے نہیں ڈالتی تھی۔'' مسکان کی نند نے ملازمہ پر برستے ہوئے کہا جو ایک دم سہم گئی تھی۔
''معاف کردو بی بی!'' ملازمہ نے معافی مانگی۔
''دفع مر! پتا بھی ہے چوڑی ٹوٹنا بدشگونی ہوتی ہے۔'' وہ بڑبڑاتی باہر نکل گئی۔
''توبہ کس قسم کے جاہل لوگ ہیں۔'' مسکان نے اُس کے واویلے پر سوچا۔
''آخر ایک چوڑی ٹوٹنے سے کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا...'' مسکان ابھی اتنا ہی سوچ رہی تھی کہ باہر سے ایک دم رونے دھونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔
''ربا خیر کرنا!'' ملازمہ کہتی ہوئی باہر بھاگی۔
لیکن چند پل بعد ہی ملازمہ اُس کی نند کے ساتھ اونچی آواز میں روتی اندر داخل ہوئی اُس کے ساتھ حویلی کی چند خواتین بھی تھیں۔ وہ روتے ہوئے عجیب وغریب آواز نکال رہی تھیں، ایک پل کو مسکان بالکل نہ سمجھ پائی کہ آخر ہوا کیا تھا۔ وہ بہ غور سب کے روتے دھوتے چہرے دیکھ کر صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
''کیا ہوا؟'' آخر مسکان نے پوچھا۔
''ہائے تو برباد ہوگئی! تو لُٹ گئی!'' ساتھ ہی اُس کی نند نے آگے بڑھ کر اُس کے دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر توڑ ڈالیں۔
مسکان درد سے ''سی'' کر کے رہ گئی۔
''تیرے سر کا سائیں نہیں رہا! بھائی اظہر علی کو کسی ظالم نے گولی مار ڈالی! ہائے۔ ہائے ربّا!'' کر رے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ماتم کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔

''نہیں!'' مسکان نے سہم کر ایک دم کہا۔

وہ اِن عورتوں کو بہ غور دیکھ رہی تھی جو اُس کا ایک ایک سنگار نوچ نوچ کر اُتار رہی تھیں۔ اس کو یوں کہ یہ جاہل عورتیں کہیں اُسے اپنے بھائی کے ساتھ ہی نہ مار ڈالیں۔ اُس کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا اُس کا دِل خوف سے ایک دم سکڑا۔

ایک دم اُس کی نندوں نے روتے روتے اُسے دیکھا۔

''یہ ہی منحوس تھی، یہ ہی سبز قدم تھی میرے بھائی کو کھا گئی۔'' اگلے ہی پَل اُن میں سے ایک خطرناک تیور لے کر مسکان کی جانب بڑھی۔

مسکان سہم کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔

''یا اللہ مدد! یا اللہ رحم!'' بے اختیار اُس کا دِل پکارا۔

❖❖○❖❖

یاد اِس کی ہمیں آتی ہے
وہ جو خوشبو تھی میرے آنگن کی
میرے دِل کی دھڑکن
میرے ہر دِن کی سحر
ہمہ وقت جو ہنستی تھی وہ
ہنستے ہوئے جُدا ہوئی
پَل میں ہم سے خفا ہوئی
گلشن میرا ویران کرگئی
جا کے سب کو حیران کرگئی وہ
نارسائی کا دُکھ دے کر خالی ہاتھ مگر
پھر بھی... پھر بھی سب لے گئی
ایسی کیا خطا ہوئی کڑی اتنی جس کی سزا ہوئی

کمرے میں سسکیوں کی آواز سے اُداسی بال بکھیرے، منہ نہوڑے بیٹھی تھی۔

حسن آرا بیگم کی تو ہچکی ہی بندھ گئی تھی علیزے اور غزالہ مسلسل اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کر رہی تھیں، جب کہ انوار صاحب زمین کی جانب نگاہیں جھکائے جانے کہاں سفر کررہے تھے۔

طارق نے ولی کو اشارہ کیا کہ وہ کچھ اِن لوگوں کو تسلّی دے تا کہ بات مکمل ہو سکے۔

''خالہ پلیز! خود کو سنبھالیں۔'' ولی نے اُن کو اپنے کندھے سے لگا کر کہا۔

''میں، میں اپنی بیٹی کو نہیں سنبھال سکی اِسی لیے وہ نازک سی کلی اُن درندوں کے ہاتھ چڑھ گئی۔'' خالہ کی آواز میں بے حد پچھتاوا تھا۔

انوار صاحب اب بھی خاموش بیٹھے تھے۔

ھ دیر پہلے طارق ایک بریف کیس اور ولی کے ساتھ اُن کے گھر میں داخل ہوا تھا، بریف کیس میں ری ویڈیوز، سی ڈیز اور پرنٹ تھے، جو منزہ کی زندگی کو گرہن لگا کر اُسے موت سے ہم کنار کرگئے اس بریف کیس میں کچھ اور لڑکیوں کے بھی کیسٹ ہیں، جن کو اُس کم بخت پارلر کی مالکن کے نام بھائی نے بلیک میل کرنا شروع کیا ہوا تھا۔

''منزہ بہت بڑا کام کرگئی، مرنے سے پہلے اُس آدمی کے خلاف بیان لکھوا کر اُس کے لیے بچاؤ کا ہر بند کرگئی۔ منزہ کا خون رائیگا نہیں گیا۔'' طارق نے اپنی سی تسلّی دینے کی کوشش کی۔

انوار صاحب ایک دم دھاڑیں مار مار کر رو دیے، منزہ جب مری تھی تب سے لے کر اب تک وہ نہیں تھے بلکہ زیادہ تر کاشف کا سوچتے رہتے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ایک حیران کن بات نے آئی۔ اُن کو چھوٹی سی منزہ اِدھر اُدھر کھیلتے بھاگتے باتیں کرتے دکھائی دینے لگی۔ ہر ہر پَل اُن کے نے زندہ ہو کر چلنے لگی کیسے وہ خود بھی ''تھوڑے'' سے ناراض رہتے اور ناشکری کرتے تھے اور کیسے نے ان جانے میں انہوں نے منزہ اور کاشف کو خود کی سوچ کے پیچھے لگا لیا تھا۔ جوں جوں وہ بڑی لی۔ زیادہ کی تمنّا نے اُسے زیادہ خوار کیا اور اِس تمنّا کو انہوں نے کبھی روکنے ٹوکنے یا سمجھانے کی کوشش لی تھی بلکہ ہمیشہ بڑھاوا دیا تھا۔

دنیا میں دو طرح کے باپ ہوتے ہیں ایک جو مثبت سوچ دیتے ہیں، لونگ ٹرم راستے کے ذریعے، ت اور صاف دِل کے ذریعے منزل کو پانے کی رہنمائی دیتے ہیں۔ اور دوسرے خود جو جلد باز ہوتے ہیں، شارٹ کٹ سکھاتے ہیں، اپنے اندر کی بے صبری، ناشکری اپنی اولاد کے اندر منتقل کرتے ہیں اور ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں دھکیل دیتے ہیں اور یہ اندھیرے جلد یا بدیر بُری موت پر ختم تے ہیں۔

وہ کیسے باپ تھے، جنہوں نے اپنے بچوں کے شفاف دِل اپنے خیالات سے گندے کر ڈالے، پچھتاوے کا ناگ اُن کو ہر پَل ڈسنے لگا تھا اور وہ چپ اور گم صم رہنے لگے تھے اور آج...... آج یہ چپ ان کے آنسوؤں سے ٹوٹی تھی۔

طارق اور ولی دونوں گھبرا کر اُن کی جانب لپکے۔

''خالو پلیز خود کو سنبھالیں!'' ولی کے لیے انور خالو کا یہ رویہ حیران کن تھا۔ وہ اب تک تو بالکل خاموش تھے جیسے انہوں نے اِس بات کو، اِس تلخ حقیقت کو قبول کرلیا ہو لیکن نہیں، پچھتاوا دُکھ کا لاوا بنا تا رہا تھا اور آج یہ لاوا باہر آ گیا تھا۔

''میں نے... میں نے اپنی اولاد کو تباہ و برباد کردیا!'' وہ ایک دم بولے۔

''باپ تو گھر کا سربراہ ہوتا ہے، وہ اپنے بچوں کے لیے کسی آئیڈیل کی طرح ہوتا ہے اُس کے بنائے ہوئے نشان پر بچے پاؤں رکھ کر زندگی کی شاہراہ پر چلنا سیکھتے ہیں۔ میں کیسا بدقسمت باپ ہوں! میرے بنائے ہوئے نشان میرے بچوں کو تباہ کر گئے۔ اندھیروں میں دھکیل گئے۔'' وہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار مار کر رو دیے۔ طارق نے بے حد دُکھ سے اُس بلکتے باپ کو دیکھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ، یہ زمانہ ہمارے بچوں کو خراب کر رہا ہے لیکن بچوں کی پہلی درس گاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلی سوچ، اچھائی برائی کی تمیز تو اپنے گھر سے ملتی ہے اور پھر یہ معاشرہ یہ زمانہ کیا ہے، معاشرہ تو ہم ہی ہیں اور زمانہ تو بہت بڑی چیز ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ زمانے کو برا نہ کہو۔ کیوں کہ وہ خود زمانہ ہیں۔

''طارق بیٹا! آج میرا دل کرتا ہے کہ گلی گلی جا کر گھر گھر جا کر ہر شخص کو پکڑ کر بتاؤں کہ اولاد کی تر اور اُن کی سوچ کو اپنی بے صبری اور ناشکری سے میلا نہ کرو۔ یہ بچے شفاف ذہن ہم اگر خراب کرد ہیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے بچوں تک کو کھو دیتے ہیں پھر یہ ہیرے موتی جیسی اولاد واپس نہیں ملتی ''وہ ایک دم ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

طارق نے بڑھ کر اُن کا ہاتھ تھام کر اُن کو دلاسا دیا۔

''انکل جو کھو گیا وہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ ہمارے ہاتھ میں ہے، آپ ک پاس اپنے دوسرے بچے موجود ہیں آپ بجائے دُکھ اور پچھتاوے کے جنگل میں کھو کر خود کو گنوا دیں ا کے بجائے آپ ان سب کے لیے ایک مثالی باپ بنیں۔ اولاد کو تو آخری عمر میں بھی جا کر اپنے والد کی راہنمائی درکار ہوتی ہے۔'' طارق کی باتوں سے انوار صاحب کے تڑپتے سسکتے دل کو کچھ ڈھار بندھی۔

''ہاں! ایک بات کچھ اُلجھی ہوئی ہے کہ اُس پارلر کی مالکہ کے بھائی نے ہر جرم قبول کیا ہے سوا منزہ پر گولی چلانے کے، اس کے لیے وہ کچھ ثبوت بھی بتاتا ہے کہ اُس روز وہ اپنی بھانجی کی سالگرہ م موجود تھا۔ ویڈیو مووی اور سالگرہ میں موجود تصاویر اور گھر والوں کی گواہی بتاتی ہے کہ منزہ کے قتل ک روز وہ تقریب میں موجود تھا۔ اگر ایسا ہے تو منزہ پر گولی کس نے چلائی؟ اور اگر وہ شخص نہیں تھا تو منز نے خاص طور پر اُس کا ہی نام کیوں لیا؟ یہاں پر آ کر کیس کی گتھی کچھ اُلجھ جاتی ہے۔'' طارق نے اپ بات کے اختتام پر ہر شخص کے چہرے کو حیرت سے دیکھا، جو ایک دم ایسے ہو گئے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

''آنٹی! آپ لوگ پلیز کوئی بات نہ چھپائیں، آئندہ اگر تفتیش کے دوران کچھ مختلف پتا چلتا ہے میں اُس وقت کچھ سیف نہ کر پاؤں گا۔'' طارق کو سب کے چہرے دیکھ کر یہ بُو تو آ گئی تھی کہ واقعی کچھ تھا جس کو اُس سے چھپایا گیا تھا۔ ولی کو بھی اپنے اندر اتنے دنوں کا شک درست محسوس ہو رہا تھا۔

''طارق بھائی!'' علیزے نے گلا کنکھار کر اُسے مخاطب کیا۔

''مرنے والا کبھی جھوٹ نہیں بولے گا، اُس وقت اُس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا کہ وہ اپنا بیان بد اس لیے آپ منزہ کے دیے ہوئے بیان کے مطابق مجرم کو سزا دلائیں۔'' علیزے نے بے حد مضبوط ل میں جواب دیا تو طارق کو پہلی بار اپنا شک کچھ غلط محسوس ہوا۔

''جب مرنے والی نے اپنے خون کا الزام کسی ایسے شخص کو دیا، جو واقعی اُس کی موت کا سبب تھا تو ہ سو کالڈ سچ بول کر کیوں اُس کی روح کو تکلیف پہنچائیں۔'' علیزے نے بے حد سکون سے سوچتے ہو دل ہی دل میں کہا۔

علیزے کی بات پر حسن آرا اور انوار صاحب نے چونک کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ وہ جو ہاں یا نہ میں لگے ہوئے تھے، علیزے کی بات پر کسی حد تک پرسکون ہو گئے، کچھ بھی تھا اب اُن کے اندر کاشف کو کھونے ک

ات نہ تھی۔

ٹھیک ہے بہن! اگر یہی درست صورت حال ہے تو اُس شخص کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ اُس کے خلاف یہ اور منزہ کا بیان بے حد مضبوط گواہی ہے، اُسے پھانسی کے شکنجے تک ضرور پہنچائے گا۔'' طارق نے یقین دہانی کروائی اور ولی سے چلنے کا کہا۔

وہ دونوں باہر نکلے تو علیزے نے ایک دم سکون کا سانس بھر کر آنکھیں موندھ لیں، پھر ایک دم نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں، اُس کی آنکھوں کے سامنے منزہ کا مسکراتا چہرہ لہرایا۔

''آہ! منزہ!'' علیزے کو بے اختیار اپنی بہن یاد آئی۔

اس کا مسکراتا چہرہ تو علیزے کے تصورات میں سے کہیں کھو گیا تھا، اُسے جب جب اپنی بہن کا تصور اُس کی نظروں کے سامنے وہ ہی تڑپتا بلکتا چہرہ گھومتا جو آخری وقت میں اُس نے ہسپتال میں دیکھا آج پہلی بار اُس کا مسکراتا ہوا چہرہ اُس کے تصور میں زندہ ہوا تھا اِس کا مطلب ہے کہ آج میں نے بالکل ٹھیک کہا!

علیزے کو اپنی بات کے درست ہونے پر بے حد سکون اور اطمینان کا احساس محسوس ہوا۔

''اللہ میری بہن کو آسانیاں دینا اور اُس کی کوتاہیوں کو معاف کر کے اُس کے درجات بلند کرنا۔'' ایک آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپکا۔

❖❖ ○ ❖❖

گول گول گھومتے اِس دائرے جیسی زندگی میں باہر جانے کا راستا کدھر ہے؟ اِس بھول بھلیوں جیسی لی طرح زندگی کو باہر نکلنے کا راستا نہیں ملتا، آخر کب یہ سب ختم ہوگا، یہ کیسی دلدل ہے، جو اپنے تی جاتی ہے۔ میرا سارا وجود اِس دلدل میں پھنس کر غائب ہو چکا ہے بس اِک چہرہ باقی ہے اور ہرے پر اُمید بھری آنکھیں باقی ہیں، جو ابھی تک باہر نکلنے کا راستا تلاش کر رہی ہیں۔ ہاں ایک ی باقی ہے جو سدا کھڑا ہے بار بار التجا کر رہا ہے کہ ہے کوئی جو اِس دلدل میں پھنسے وجود کے ہاتھ کو لے۔

ہے کوئی جو اِس ہاتھ کو تھام کر اُسے باہر کھینچ لے؟

''اماں، ابا!''

''بابا! ہے کوئی جو مجھے بچا لے! اللہ مجھے بچا لو!'' وہ زور زور سے چیخنے لگی تھی۔ چیختے چیختے اُس کا حلق نے لگا تھا۔ اتنا چیخنے سے آہستہ آہستہ آواز میں سے لفظ غائب ہو گئے اور گریہ زاری اور بس غوں نائی دینے لگی۔

''ترنم!..... کیا تم ٹھیک ہو......؟'' ماہی نے اُس کے پسینہ پسینہ وجود کو دیکھتے ہوئے ہلایا، جو نیند میں چلاتے عجیب سی آوازیں نکالنے لگی تھی۔

''ہاں!'' ترنم نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ماہی کو دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک اُس خواب کے زیرِ اثر تھی۔ وہ ابھی تک کچھ س نہ کر رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ترنم پانی پی!'' ماہی نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور اُس کے لبوں سے پانی کا گلاس لگا دیا، ترنم پانی ایک ہی سانس میں پی لیا، جیسے وہ صدیوں کی پیاسی ہو۔

''کیا ہوا...؟'' ماہی نے کتنی ہی دیر بعد اُس سے پوچھا ترنم گہرے گہرے سانس لیتی بیڈ کی ٹیک ساتھ سہارا لے کر بیٹھی، خود کو کافی حد تک نارمل کر چکی تھی۔

''میں نے ایک خواب دیکھا!'' ترنم کی آواز سرسراتی ہوئی تھی۔

''یہ کوئی انوکھی بات ہے، تم تو ایسی لڑکی ہو، جسے سوتے جاگتے حال اور ماضی کی یادوں کے متـ خواب آتے ہی رہتے ہیں۔'' ماہی نے کچھ لاپروائی سے کہا کیوں کہ ترنم کو اتنے عرصے میں وہ خوب چکی تھی۔

''نہیں ماہی! میں نے ایک بالکل مختلف خواب دیکھا ہے!'' ترنم کسی مسمریزم میں تھی۔ اس چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ ماہی چونک کر اُس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

''کیا دیکھا...؟'' ماہی اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''میں نے خواب میں ولی کو دیکھا، وہ کسی بزرگ کے ساتھ کھڑا تھا، اُس بزرگ نے ولی کو کچھ پکڑا جو ولی نے میری جھولی میں ڈال دیا۔ ماہی وہ گلاب کا اتنا بڑا پھول تھا جتنے سائز کا کچھ ماہ کا انسانی میں حیرت و خوشی سے رونے لگتی ہوں، روتے روتے میری ہچکی بندھ جاتی ہے اُس گلاب کی خوشبو قدر تیز ہوتی ہے کہ مجھے اپنا سارا وجود گلاب کی خوشبو سے مہکتا محسوس ہوتا ہے۔ تب میں اُن بزرگ کہتی ہوں کہ میں اِس پھول کے کہاں قابل ہوں، میں نجس اور گندی ہوں یہ تو کسی عبادت گزار پاکیزہ لڑکی کا انعام ہے، مجھ جیسی لڑکی اس کے قابل نہیں ہے۔ بزرگ میری بات سُن کر مسکرانے ہیں اتنے میں ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو جاتی ہے، ہم تینوں اُن بزرگ کی جھونپڑی نما گھر میں آتے ہیں۔ راستا کچا ہوتا ہے اور میرے پاؤں مٹی سے بھر جاتے ہیں لیکن مجھے اپنے پیر اِس ر چلتے بالکل آلودہ محسوس نہیں ہوتے۔

جب ہم تینوں اُس جھونپڑی نما گھر میں بیٹھ جاتے ہیں تو میں دوبارہ اصرار کرتی ہوں کہ میں اِس قابل بالکل نہ تھی۔ میری بات پر وہ بزرگ دوبارہ مسکراتے ہیں اور پھر مجھے ایک قصہ سناتے ہیں۔ یقین مانو خواب اتنا واضح تھا کہ مجھے اُن بزرگ کی شکل، اُن کے گھر تک جاتا راستا اُن کی ہر بات طور پر یاد ہے۔'' ترنم نے جوش سے بتایا۔

''انہوں نے مجھے ایک ایسے شخص کی کہانی سنائی، جو ہزاروں سال تک اللہ کی عبادت میں مصروف وہ ایک ایسی چوٹی کے غار میں عبادت میں مصروف رہا جہاں کوئی جنگلی نقصان دہ حشرات یا جانور نہ بلکہ انار کا پیڑ اور ایک چشمہ تھا۔ جب اُسے بھوک لگتی، وہ انار کے پھل کھا کر پیٹ بھر لیتا اور پانی پیـ وضو کرنے کے لیے وہ اُس میٹھے چشمے کا استعمال کرتا۔ اللہ نے اُسے طویل عمر عطا کی اور یہ سلسلہ ہزا سال تک چلا، پھر جب اُس کو موت آئی اور فرشتے اُسے رب کریم و عظیم کے پاس لے کر گئے تو سے کہا گیا کہ وہ بخش دیا گیا ہے، وہ شخص بے حد مسرور ہوا۔ رستے میں ایک فرشتے نے پوچھا معاملہ رہا؟ اُس نے کہا کہ میرے ساتھ تو اللہ نے بہت اچھا معاملہ کیا میں بخشا گیا اور مجھے جنت نوا

شتے نے پوچھا تجھے یہ سب کیوں ملا؟ اِس لیے کہ میں نے اپنی عمر کا پل پل اللہ کی یاد میں گزارا ان لی عبادت کی۔ اُس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اُس کے جواب کو سن رہی مان ہوا جاؤ اِس شخص کو ذرا جہنم کے باہر باہر سے گھما کر لاؤ فرشتوں نے ایسا ہی کیا۔ جہنم کے باہر ر تپش و گرمی اور تکالیف تھی کہ وہ شخص بلبلا اُٹھا۔

انی۔ پانی۔ پانی۔''

شتے اُس نڈھال کو واپس لیے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص ایک پیالے میں صرف تین بوند لے کر کھڑا تھا۔ وہ شخص تڑپتا ہوا اُس پانی کے پیالے کو تھامے شخص کی جانب بڑھا۔

ھے۔ مجھے یہ پانی دے دو۔'' وہ گڑگڑایا۔

ان پانی کی قیمت ہے۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔

ے شخص نے کہا کیا؟

ان کی قیمت تم نہیں ادا کر سکتے کیوں کہ یہ دنیا کمانے کی نہیں سزا و جزا پانے کی ہے۔ عمل اور حاصل یا تو چھوڑ آیا ہے۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔

تو پھر میں کیا دے سکتا ہوں؟'' پیاسے شخص نے بلکتے ہوئے پوچھا۔

م اپنے سات ہزار سال کی عبادت کا اجر دے دو، میں یہ پانی تم کو دے دیتا ہوں۔'' اُس شخص نے دیا۔

ھیک ہے پانی دو اور سارا اجر لے لو۔'' پیاسے شخص نے تڑپتے ہوئے کہا۔

ن بوند پی کر بھی پیاس نہ بجھی تھی لیکن ذرا تلخی کم ہو گئی تھی۔

می کی عقل کچھ ٹھکانے لگی، فرشتے اُسے دوبارہ دربار عظیم باری تعالیٰ کے سامنے لے گئے کہ اِس کا اب کیا کرنا ہے، یہ اپنی ساری عمر کی کمائی تو تین بوند پانی کے عوض لٹا آیا ہے۔

ان کریم نے پوچھا۔

ول اب کیا کہتا ہے؟'' شخص گڑگڑایا۔

ے پروردگار! میں تو اب خالی ہوں، صرف تیری رحمت ہی ہے جو مجھے بخش سکتی ہے، میں نے ہزار سال اپنی عبادت کو اپنی بخشش کا سبب جانا تھا لیکن وہ تو بس اتنی ہی اہمیت رکھتی تھی تین بوند پانی ابر۔ ہر شخص جو بخشا جاتا ہے وہ اپنی ہزاروں سال کی عبادت کی وجہ سے نہیں، تیری رحمت کی وجہ شا جاتا ہے۔ اُس شخص نے دنیا و آخرت کا راز سمجھ لیا تھا۔ اللہ رحیم کریم نے اُسے اپنی رحمت کے میں بخش دیا اور اُسے جنت عطا کی۔

با! اس ساری گفتگو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ نیک عمل، اچھا عمل کتنا بھی کر لیں ان کا تکبر دل جائے تو وہ کُل تین بوند پانی کی وقعت رکھتے ہیں، اگر ساتھ میں صرف یقین ہونا لازم ہے کہ اللہ کی ن سارے معاملے سیدھے کرنے والی ہے! وہی کوتاہیاں معاف کرنے والی ہے، اُن بزرگ کی ن کر میں خوشی سے روتی جاتی ہوں، مجھے یقین نہیں آتا کہ واقعی یہ سب کچھ میری زندگی کا حصہ ان ایک دم مجھے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی ہیں، منظر بدل جاتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک وجود دلدل میں بُری طرح ڈوبا ہوتا ہے۔
اُس کا چہرہ اور صرف ایک ہاتھ باہر نکلا ہوتا ہے۔ وہ چہرہ مدد مدد پکارتا پکارتا عجیب و غریب آواز نکالنے لگتا ہے۔ خوف، دکھ، تکلیف، نا امیدی جو کچھ وہ وجود محسوس کر رہا تھا، وہ میں بھی محسوس کرتی ہ اور روتی جاتی ہوں۔ تب ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے اور سامنے تم کھڑی تھیں، کیسا عجیب سا خواب نا!'' ترنم نے معصومیت سے ماہی سے پوچھا۔
''ہاں۔ شاید!'' ماہی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔
''اچھا تم اب سو جاؤ، صبح تمہاری فلائٹ ہے پھر سیدھا تم کو ایک پارٹی میں پہنچنا ہے، تمہارا فریش اور دکھائی دینا بے حد ضروری ہے۔'' ماہی نے ترنم کو کمبل اوڑھایا، ترنم چھوٹے اور معصوم بچوں کی ط فوراً کہا مان کر آنکھیں بند کر کے بے سُدھ ہوگئی۔ اِس بار اُس کے چہرے پر بے حد سکون تھا، ماہی اُ کتنی دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی پھر طویل سانس بھرتی ہوئی اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوئی اچانک ہی وہ اپنی جگہ پر بیٹھتے بیٹھتے رک گئی، بے حد چونکتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے ترنم کے بیڈ پاس آئی کمرے میں پہلے بھی سنگل لائٹ آن تھی لیکن اُس نے دو لائٹیں اور آن کر دیں اور بیڈ کے زمین پر بیٹھ گئی۔ اب وہ کمبل سے باہر نکلے ترنم کے پیر دیکھ رہی تھی، ماہی کے سارے وجود میں سنسنی پیدا ہوئی۔ اُس نے شہادت کی انگلی سے ترنم کے تلووں کو چھوا، اُس کا شک و گمان درست نکلا۔ ترنم پاؤں مٹی سے آلودہ تھے اور یہ مٹی گیلی تھی۔
''بیڈ پر لیٹے لیٹے یہ ترنم کے پیروں میں گیلی مٹی کہاں سے آ گئی؟'' یہ سوال اُس نے با آواز بلند سے کیا۔
ایک برقی رو اُس کے پورے وجود میں سے گزری۔ کانوں میں ابھی کچھ دیر پہلے ترنم کا سنایا خ گونجا۔
ماہی نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے پہلے اپنی شہادت کی انگلی کو دیکھا، جس پر واضح مٹی لگی تھی اور پھر ت دیکھا جس کا چہرہ سوتے میں اتنا معصوم، پاکیزہ اور پُرسکون لگ رہا تھا جیسے کسی حور کا ہو۔
ماہی کو لگا کہ اُس کا دِل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آ جائے گا۔

❖❖ ◯ ❖❖

''بابا سائیں! آپ نے بلایا تھا۔'' ولی نے دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر پوچھا۔
''آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ!'' احمد شاہ کسی گہری سوچ میں گم تھے، ولی کی آواز سُن کر ایک دم چونک بولے۔
''بابا جی کیسے تھے؟'' ولی نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''بہت کمزور اور ضعیف ہو چکے ہیں لیکن بے حد ہمت والے ہیں اپنی کمزوری کو کسی پر عیاں نہیں دیتے۔'' احمد شاہ نے جواب دیا۔
''آپ اُن کو یہاں لے آئیں... ہم اُن کی خدمت بھی کریں گے اور ہمارے گھر میں بھی خیر و ...'' ولی نے اُن کے پاس رکھی چائے کی ٹی کوزی اُٹھا کر کپوں میں چائے اُنڈیلی، وہ ولی

...طار میں بیٹھے ہوئے تھے۔
''میں نے اُن سے کہا تھا لیکن وہ وہاں سے کہیں جانے پر تیار نہیں ہیں۔'' احمد شاہ نے طویل سانس ...تے ہوئے کہا۔ اُن کے اندر مسلسل جوڑ توڑ چل رہی تھی کہ بابا جی کی دی ہوئی ذمے داری کے لیے وہ ...تہید باندھیں۔
''پھر ان کے پاس ایک دو خدمت گار ہوں، جو اُن کی دیکھ بھال کریں۔'' ولی نے دوسرا خیال پیش
''ہاں یہ بات بے حد اچھی ہوگی اگر وہ مان جائیں۔'' احمد شاہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
''واقعی وہ بابا جی کو کچھ آرام دینا چاہتے تھے لیکن وہ یہ آرام کیسے اُن کو دیں، وہ ابھی تک سمجھ نہ پا رہے
''بابا سائیں! کچھ خاص کام تھا؟ امّاں جان کہہ رہی تھیں کہ جب سے آپ گاؤں سے آئے ہیں کچھ ...شان لگ رہے ہیں۔'' ولی نے انہیں چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔
''آں۔ ہاں!''
''اچھا تم بتاؤ تمہاری آئندہ کی کیا پلاننگ ہے؟'' احمد شاہ چاہتے تھے کہ وہ ولی کو سب حقیقت تب ...ئیں جب وہ ذہنی طور پر بالکل فری ہو، تا کہ اُس کے کیریئر پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔
''امّاں جان نے شاید آپ کو بتایا ہو کہ میں ڈیڑھ دو سال کے لیے آسٹریلیا جا کر ایک کورس کرنا چاہتا ...، جو یہاں کی کسی پی ایچ ڈی ڈگری سے کم نہیں ہے۔ یہاں میرے کیریئر میں یہ کورس بہت کام ...ے گا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو پھر یہ ڈیڑھ دو سال میں باہر اپنی تعلیم پر استعمال کرنا چاہتا ہوں۔'' ولی ...ہچکتے ہوئے کہا۔
''اور تمہاری شادی؟'' احمد شاہ نے سوال کیا۔
''...ھ ماہ بعد ایک سمسٹر ختم ہوگا اور دو ماہ کی چھٹیاں ہوں گی، تب میں پاکستان آؤں گا تب دیکھ لیں ...'' ولی ہر حال میں یہ کورس کرنا چاہتا تھا۔
''ہوں!'' احمد شاہ نے ہنکارا بھرا۔
''ولی! میں تم سے کچھ بے حد ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' احمد شاہ کے لیے بولنا بے حد دوبھر تھا۔
''جی کہیے!'' ولی نے تابع داری سے پوچھا۔
احمد شاہ شش و پنج میں تھے کہ آیا وہ اُسے بتائیں یا نہ بتائیں۔
''میرا خیال ہے تم کورس کے لیے چلے جاؤ، اپنے سمسٹر کے بعد تم جب پاکستان آؤ گے تو میں تم کو ...ری زندگی کا وہ اہم پہلو بتاؤں گا، جس کا جاننا تمہارے اور نگینہ کے لیے بے حد ضروری ہے لیکن میں ...لوگوں کو یہ تب بتاؤں گا، جب اِس کا ٹھیک وقت ہوگا تا کہ تم لوگوں کی اپنی زندگی ڈسٹرب نہ ہو، ابھی تم ...س کے لیے جانا چاہتے ہو اگر میں پہلے بتاتا ہوں تو ہوسکتا ہے کہ تمہاری ذہنی حالت ایسی نہ رہے کہ تم ... جا کر یکسوئی سے اپنا کورس کر سکو میرا خیال ہے ہم کچھ عرصے کے لیے رُک جاتے ہیں۔'' احمد شاہ ...از بلند خیال آرائی کر رہے تھے جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ولی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ ایسی کون سی باتیں ہیں، جن کے لیے اُن کا باپ اِس قدر متفکر ایسے کون سے پہلو ہیں زندگی کے، جن کو وہ نہیں جانتا۔ لیکن وہ سدا کا تابع دار بیٹا۔ جس نے اپنے سے کبھی کوئی سوال نہ کیا تھا، بے حد تجسس کے باوجود اُس نے کچھ نہ پوچھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم جب واپس آتے ہو تو میں تم کو تمہاری جنم بھومی لے جاؤں گا... وہاں تمہا لیے بہت کچھ منتظر ہے، میرا وعدہ ہے کہ میں تم کو کبھی بھی اکیلے نہیں کروں گا۔ تم میرے بیٹے ہو حقیقت ہے اور رہے گی۔'' وہ کہتے گئے، ولی کے لیے ڈھیروں سوال چھوڑتے جا رہے تھے۔

''ٹھیک ہے تم اپنے کورس کے لیے کاغذی تیاریاں کرو۔'' احمد شاہ نے سب کچھ خود ہی طے کر اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

اور ولی نے تابع داری کی حد کردی، اپنے منہ زور قسم کے سوالات کے باوجود خود پر ضبط باندھ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''جی اچھا! جیسا آپ کہیں۔'' وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا۔

❖❖ ◯ ❖❖

''جانے زندگی میں اور کتنے رنگ اور رویے دیکھنے باقی رہ گئے ہیں۔'' مسکان نے سر پر اپنے د ہاتھ رکھے ہوئے تھے، دونوں جانب سے اُس کے سر پر جوتے برس رہے تھے۔ جب جب جوتا اُس سر پہ لگتا، توہین کا احساس سِوا ہوکر اندر ہی اندر آگ سلگانے لگتا۔ مسکان خود کو بچانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کا استعمال کر رہی تھی۔

اظہر علی کی بہنیں، بیویاں غم و غصے سے پاگل ہو رہی تھیں کبھی کبھی کسی جلوس کو کسی خاص طرف کردیا جائے تو سارے کے ساروں کا رُخ اُسی جانب ہو جاتا ہے، مسکان کی سب سے چھوٹی نند ایک دم مسکان کو ٹارگٹ بنا کر، سب کو اشتعال دلا کر اُسے مرکز بنا دیا تھا۔

منحوس!

سبز قدم!

کم بخت! جاہل عورتیں زبان اور ہاتھ دونوں سے اُسے زخمی کر رہی تھیں، سید سرفراز علی کی بیٹی کو جا سے مار پڑ رہی تھی۔

''سید سرفراز علی کی اولاد اِسی قابل ہے کہ اُس کی بیٹی کو جوتے پڑیں، ارے اِس سید سرفراز کی قبر پہلے زندگی میں کیڑے پڑیں۔'' وہاں بہت ساری تماشا دیکھتی عورتوں میں سے کھڑی ایک عورت کہا۔

کچھ عورتوں نے مڑ کر اُسے دیکھا یہ بوڑھی عورت کچھ نیم پاگل سی تھی، ہر وقت اِدھر اُدھر گلیوں گھومتی تھی۔ حویلی میں بھی وہ گھومتی پھرتی بلا اجازت آجاتی تھی۔ اظہر علی کی تیسری بیوی، جو بالکل اولاد تھی وہ اُس پر ترس کھا کر اُسے روٹی اور کپڑے دیتی اور نہلاتی، شاید اللہ اُس کی اِس نیکی سے ہوکر اُس کی گود ہری کردے، اِس لیے اُس کا حویلی میں آنا جانا بلا روک ٹوک تھا۔

''نی گوما تجھے کیا بیر ہے سید سرفراز علی کی اولاد سے؟'' ایک جوان ملازمہ جو مسکان کی درگت

... ہو رہی تھی لیکن وہ مالکنوں کو روکنے سے بے بس تھی، اُس نے چڑ کر مائی گوما سے پوچھا۔

''ارے کیڑے پڑیں اِس سید سرفراز علی کے، اُس کی اولاد اور اُس کی آگے سے اولاد در در کی خاک ... نامراد رہے یہ سارا خاندان!'' مائی گوما کف اُڑاتی ہذیانی انداز میں گویا ہوئی۔

اس عورت نے حیرت سے مائی گوما کو دیکھا۔

''اے کیا ہوا ہے؟'' وہ بے اختیار خود سے بولی۔

... کان کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، ایک بے حد قابل لڑکی چند ماہ پہلے جو این سی اے کی طالبہ تھی، ایک ... اسٹوڈنٹ، جس کا نام و پہچان تھی۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ ٹاپ کرتی تھی، جس کو اپنے وجود اور ذات ... غرور حاصل تھا جو بے حد حسین لڑکی تھی، کئی دلوں کی دھڑکن میں شامل تھی۔ وہ چند جاہل عورتوں ... ہاتھوں بُری طرح پیٹ رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ باپ کے ہاتھوں سرزد ہوئی بد اعمالیوں کی سزا ... اس دنیا میں اولاد کو سہنا پڑتی ہے۔

... ہی تو ہر اچھی ماں اپنے بیٹے کو باپ کا درجہ حاصل کرنے پر تحفے میں ایک نصیحت بھری دعا دیتی

''اب تو بیٹی کا باپ بن گیا ہے، تجھے اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے، اِس کی ذمے داری اچھے سے ... اب تم صاحب اولاد ہو گئے ہو ہمیشہ اپنی سوچوں، اعمال اور کردار کو لگام دینا، ورنہ بد اعمالیوں کے ... بھاگتے گھوڑے تمہاری اپنی اولاد کو یوں روندیں گے کہ تم ان کی چیخیں تو سنو گے اور بے گناہی کا ... بہتے دیکھو گے... مگر اِن کی اُڑتی گرد دیکھنے کے سوا کچھ نہ کرسکو گے۔

ماں باپ کے اچھے اعمال بُری اولاد کو اچھا بنا دیتے ہیں اُن کے آگے اچھا آتا ہے۔ لیکن ماں باپ ... بُرے اعمال اکثر اچھی اولاد کے لیے زندگی بھر کا عذاب پیدا کردیتے ہیں۔

''اور مارو... اور مارو...!'' مائی گوما نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ وہ اِس طرح خوش ہو رہی تھی، جیسے ... پسند کھیل دیکھ کر خوش ہو رہی ہو۔

''رب سے ڈر مائی گوما! وہ بھی کسی کی اولاد ہے۔'' ملازمہ نے مسکان کے سر پر بہتے خون کو دیکھ کر ... ہو کر مائی گوما کو روکا۔

''ارے اُس کی اولاد کو تو صرف جوتے پڑ رہے ہیں میرا تو لال ہیرے جیسا پُتر اُس کم بخت نے کتوں کے آگے ڈلوا دیا تھا، کتوں نے نوچ نوچ کر میرے معصوم بچے کو یوں کھا لیا جیسے بھیڑیے کھا جاتے ہیں۔ ... میرا بیٹا!'' وہ اُس عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

... وجود کو ذرا سی چوٹ لگے تو دیکھ ایسے چیخیں نکلتی ہیں، یہ کُوی تو جوان ہے میرا پُتر تو چھوٹا سا بال ... معصوم کو اِس کے باپ نے کتوں کے آگے ڈال دیا تھا۔'' مائی گوما ایک دم اونچی آواز میں رونے ... مسکان کو مارتے ہاتھ ایک دم رک کر مائی گوما کو دیکھنے لگے، اُس کے گلے سے کتوں کے غرانے ... آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ سُرخ سُرخ آنکھوں سے مسکان کو گھورنے لگی۔

... کانپتی مسکان نے منہ سے خون صاف کر کے اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی روح فنا ہونے لگی ... نیم پاگل عورت اُس پر جھپٹ پڑی پھر اُس نے مسکان کو دانتوں سے اِس طرح کاٹنا شروع کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ مسکان کی چیخوں سے در و دیوار لرزنے لگے۔ گھر کی خواتین میں سے کسی نے مائی گوما کو نہ روکا۔

مسکان ان کے لیے وہ منحوس وجود تھا جس نے اِس حویلی کے واحد مرد، اُن کے سائباں کو کھالیا تھا۔ اُس کے جاتے ہی یہ حویلی زمین اور وہ خود بٹے ہوئے مالِ غنیمت کی طرح شریکوں کے ہاتھ لگ گئی تھیں۔

اس کم بخت نے اُن کی زندگی کے تحفظات ہی ختم کر ڈالے تھے۔ اب اُس کو جتنی سزا ملتی کم تھی۔

امّاں بچاؤ! بابا سائیں بچاؤ!

اللہ بچاؤ!

اللہ۔ اللہ۔ اللہ!

مسکان کی دل دوز چیخیں حویلی کے باہر تک گئی تھیں اور اندر داخل ہوتے قدم حویلی کے آنگن جانب تیزی سے دوڑے تھے، جہاں یہ خونی کھیل بہت ساری تماشائی عورتوں کے ساتھ کھیلا جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

ہونٹوں پہ کبھی اُن کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی برسرِ الزام ہی آئے
حیران ہیں لب بستہ ہیں دل گیر ہیں غنچے
خوشبو کی زبانی ترا پیغام ہی آئے
لمحاتِ مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے
تاروں سے سجالیں گے رہ شہرِ تمنا
مقدور نہیں صبح چلو شام ہی آئے

وہ شوخ انداز میں گنگناتی اُس کے اِرد گرد منڈلا رہی تھی۔ تیز پرفیوم کی خوشبو، چست چوڑی پاجامہ اور فٹ شرٹ پہنے رسی نما دوپٹا گلے میں ڈالے وہ طارق کے سامنے بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔

طارق نے ایک نگاہ ڈال کر لب بھینچ لیے۔ جانے کیوں جتنا وہ اُس کے قریب آتی اُس کا دِل اُس سے اور دور ہونے لگتا تھا۔

”سحرش!“ آخر وہ اُسے ٹوکے بنا نہ رہ سکا۔

”زہے نصیب! آپ نے اتنی دیر سے مخاطب کرنا تو پسند فرمایا۔“ وہ شوخی سے بولی۔

طارق کو اُس کی یہ شوخی قطعی نہ بھائی، کہاں تو وہ پتھر جیسی ساکن سحرش! کہاں اُس کی یہ شوخیا[ں] شوخیاں یہ زندگی بے شک طارق کی مسلسل محنت کا نتیجہ تھا بلکہ اُس کی یہ محنت و ہمدردی اُسے تا عمر لیے پھنسا گئی تھی۔ اب اُسے سحرش کا یوں چنچل ہونا اچھا نہ لگتا تھا۔

”تم کو میں نے ڈاکٹر اکرم زبیر کے پاس جانے کے لیے کہا تھا، تم تیار ہونے کے بجائے اِدھر گھوم رہی ہو۔“ طارق نے سنجیدگی سے کہا، وہ اُسے ڈاکٹر اکرم زبیر کے پاس مسلسل سیشن کے لیے جاتا تھا لیکن آج سحرش جانے کس موڈ میں تھی۔

”آج رہنے دیں طارق! آج نہیں!“ وہ بہت خوش و مگن تھی۔

”کیوں آج کیا ہے؟“

”آج کیا خاص بات ہے۔“ طارق نے بیزاری سے پوچھا۔

”آپ کو واقعی بالکل یاد نہیں ہے؟“ سحرش نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں!“ طارق نے سنجیدگی سے جواب دیا تو سحرش کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

”جب میرے اندر کوئی جذبہ زندہ نہ تھا تب آپ میرے متعلق ہر بات یاد رکھ کر میری زندگی کا ہر لمحہ ...یٹ کرتے تھے اور جب میرے اندر آپ کی دی ہوئی زندگی ہر طرح سے متحرک ہے تو آپ مجھے ...ر کرنے لگے ہیں۔“ سحرش نے منہ در منہ شکوہ کیا تو طارق ایک دم بوکھلا گیا۔

”طارق! آپ کا کون سا سچا روپ ہے؟ وہ جو ایک ہمدرد دوست تھا جو میرے ننگے سچ پر پردہ ڈالتا تھا یا یہ جو میرا محرم ہو کر میرے ساتھ نامحرموں جیسا رہتا ہے۔“ سحرش ایک دم پھٹ پڑی۔

طارق کے تو صحیح معنوں میں ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔

”کیا... کیا ہوا؟“ طارق نے ایک دم نرمی سے پوچھا۔

”طارق! آج میرے سالگرہ ہے۔“ سحرش نے احتجاج کیا۔

”اوہ!“ طارق نے ایک دم طویل سانس بھرا۔

”آئی ایم ریئلی سوری یار! دراصل میں دفتری کام میں اُلجھا ہوا تھا، اِسی لیے میرے دماغ سے نکل [گیا]“ طارق نے شائستگی سے معذرت کی۔

”اوکے ٹھیک ہے۔“ سحرش جس کا منہ بے حد پھولا تھا ایک دم مسکرا کر بولی۔ اُس کے چہرے پر بچوں [کی] معصومیت اور خوشی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی فوراً سے من جانے والی اور فوراً سے روٹھ جانے والی۔

”تھینک یو، تم نے مجھے معاف کردیا۔“ طارق نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

”اوں ہوں! اب ہر بات پہ معافی نہیں ملے گی۔“ سحرش گویا ہوئی۔

”مطلب؟“ طارق نے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ میرے تحفے کی معافی نہیں ملے گی۔“ سحرش نے لاڈ سے کہا۔

”اوکے! کیا چاہیے تمہیں؟ جو کہو گی ساتھ جا کر دلا دوں گا۔“ طارق نے فراخ دلی سے کہا۔

”جو میں کہوں گی وہ دیں گے۔“ وہ طارق کو بغور دیکھ کر بولی۔

”آف کورس! برتھ ڈے بے بی جو چاہے گی وہ ملے گا۔“ طارق نے اُسے یقین دلایا۔

”طارق!“ وہ اُس کے بے حد قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”آپ مجھے اپنا آپ دے دیں۔“ سحرش نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

طارق نے بے اختیار اُسے چونک کر دیکھا۔ وہ اُس کے بے حد قریب بیٹھی اُس سے اپنا وہ حق مانگ [رہ]ی تھی، جو طارق اب تک بچاتا آیا تھا۔

”کیوں؟ کیوں چپ ہیں؟“ وہ بولی۔

”کیا میں نے اپنی اوقات سے زیادہ مانگ لیا ہے۔“ درد اُس کے اندر سے بولا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طارق کو یوں لگا کہ وہ ایسے موڑ پر آن کھڑا ہوا ہے، جہاں واقعی بچ نکلنے کا کوئی بھی راستا سامنے نہ
''طارق مجھے اپنا تحفہ چاہیے!'' سحرش کے لہجے میں ضد اور اصرار تھا۔ سحرش کے تیور دیکھتے ہ
طارق کے اندر مسلسل جوڑتوڑ چلنے لگی تھی۔

لب اِس خوں میں غرق زمیں کی پیاس بُجھے گی!
لب غم کے اِن ویرانوں!
غارگہوں میں، قتل گہوں میں
زہریلے سانپوں سے بھری سہمی راہوں میں
آس اُمید کا پھول کھلے گا!
لب ظلم کے پرکاروں کا بھید کھلے گا
لب حاکم کی عیاری کا تاج گرے گا
مظلوموں کے پیمانوں میں
خوشی کا کوئی رنگ کھلے گا!
ناداروں کی زخم رسیدہ، نم آنکھوں میں
لب اِس خوں میں غرق زمیں کی پیاس بجھے گی!
لب پیاس بجھے گی! کب پیاس بجھے گی!

''رُک جاؤ! میں کہتا ہوں رُک جاؤ!'' سید سرفراز علی نے چیخ کر کہا اور تیزی سے آگے بڑھے۔
مائی گوما نے ایک پل کو رُک کر سید سرفراز علی کو دیکھا، پھر جیسے اُس کے جنون میں شدت آ گئی ایسے
. مندر میں طوفان آ جاتا ہے۔ وہ مسکان پر اب شدت سے حملہ آور ہوئی تھی۔
کان کی چیخوں اور اُس کی حالت دیکھ کر سید سرفراز کا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ وہ دیوانہ وار آگے
ے اور مائی گوما سے مسکان کو چھڑانے لگے، لیکن اس نے بہت سختی سے مسکان کے بازو پر دانت گاڑ
ے تھے۔

اُف! درد کا ایک سمندر تھا۔ مسکان کو لگا کہ اِس درد کے سمندر میں بہتے بہتے اُس کا سارا وجود درد بن
اُبھر رہا ہے۔
''امّاں! ماں!'' مسکان کی چیخیں ناقابلِ برداشت تھیں۔
ید سرفراز علی اور شیر بانو جتنا مائی گوما سے مسکان کو چھڑانے کی کوشش کرتے، مائی گوما اس سے زیادہ
ت سے اس کو کاٹتی۔ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی اس میں کہ وہ قریب آنے والے ہر بندے
ھکا دے رہی تھی۔ آخر سید سرفراز نے آنگن میں پڑے مٹکے کو اُٹھایا اور اُس کے نیچے پڑی اینٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُٹھا کر مائی گوما کو دے ماری....... چوٹ بہت شدید تھی مائی گوما لہرا کر گری لیکن گرتے گرتے اُس دانت مسکان کی بوٹی نوچ کر لے گئے تھے۔

''اللہ!'' مسکان کی چڑ مڑ چیخیں، سسکیاں دِل دہلا دینے والی تھیں۔

سید سرفراز علی کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ وہ خوں خوار نگاہوں سے مائی گوما کو دیکھ رہے جس کے خون آلود چہرے پر زہریلی اور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اُس کے سر سے خون کسی فوارے کی پھوٹ کر اُس کے گلے سے ہوتا ہوا اُس کے کپڑوں کو تر کر رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر درد کے اح کے بجائے عجیب سی خوشی تھی اور یہی مسکراہٹ سید سرفراز علی کے تن من میں آگ لگا گئی تھی۔

انہوں نے جنونیوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ کر اینٹ ڈھونڈی اور اینٹ اُٹھا کر دوبارہ مائی گوما کا لیا۔ مائی گوما بے خوفی سے کھڑی رہی اُس نے خود کو بچانے کے لیے ہٹنا مناسب نہ سمجھا۔

سید سرفراز کو اُس کی آنکھوں کی بے خوفی حیرت اور غصّہ دِلا رہی تھی۔

''تیری تو!'' انہوں نے ایک گالی اُسے دی۔

اِرد گرد کھڑی گھر کی خواتین اور ملازموں میں سید سرفراز کی موجودگی کی وجہ سے بہت زیادہ خو ہراس پیدا ہو گیا تھا۔

''بس!'' مائی گوما خون خون ہوتے وجود کے ساتھ بے خوفی سے آگے بڑھی۔

''مقبول... آصف!'' سید سرفراز علی نے دروازے کی جانب منہ کر کے اپنے ملازموں کو آواز دی بھول گئے تھے کہ اپنے گھر کی خواتین کو وہ مرد ملازموں سے دور رکھتے ہیں، اِس وقت مسکان نیم ہوش چیتھڑے وجود اور لباس کے ساتھ ڈھیر بنی پڑی تھی۔ لیکن سید سرفراز علی کے سر پر تو مائی گوما کی خوف آنکھیں سوار تھیں۔ وہ اِن آنکھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال کر باہر پھینک دینا چاہتے تھے۔

''بابا سائیں!'' شیر بانو کی کپکپاتی آواز نے اُن کو چونکایا۔

''آپی کو ہسپتال لے چلو!'' صرف شیر بانو تھی، جو مسکان کی حالت پر رو رہی تھی۔

باہر سے ملازم دوڑتے آ رہے تھے۔ سید سرفراز نے اُن کو آتے دیکھ کر جلدی سے اپنی چادر مسکا ڈال دی۔

''دیکھا سرفراز علی!'' مائی گوما کی سرسراتی آواز سید سرفراز علی کو کچھ جانی پہچانی لگی۔

''دیکھا اولاد کا دُکھ! ماں باپ کے اندر کیسی آگ لگاتا ہے، تو نے ایک دن میرے معصوم بچے کو باپ کے ساتھ مل کر بھوکے کتوں کے آگے ڈالا تھا۔ دیکھ اپنی بیٹی کے پنڈے پہ زخم! میں نے تو تھوڑے زخم لگائے ہیں، تیرے کتوں نے تو میرا بیٹا زخم زخم کر کے مار دیا تھا۔ اپنی بیٹی کا زخم تجھے سار اپنے ظلم کی یاد دلاتا رہے گا۔ میرا مرد جورا، میرے سر کا سائیں تیری وجہ سے خود کو کتا سمجھتا ہے۔ وہ دن آسمان کی طرف منہ کر کے کتوں کی طرح روتا ہے! دیکھنا ایک دن ربّ ہمارا انصاف ضرور کر۔ ایک سورج ایسا ضرور طلوع ہونے والا ہے، جب سید سرفراز علی تُو اپنے ظلم سمیت غروب ہوگا۔'' وہ انداز میں ہنستی چلی گئی۔

سید سرفراز نے غصّے میں آ کر مقبول کے ہاتھ سے بندوق لے کر مائی گوما کا نشانہ لینے کی کوشش

ان مائی گوما ہنستے ہنستے ایک دم لہرا کر زمین پر گری۔ چوٹ اُسے بہت شدید لگی تھی سر سے نکلا خون اُس سارے وجود کو نہلا گیا تھا۔

''تم بھی ضرور اولاد کا دُکھ دیکھو گے، تیری اولاد بھی رُلے گی، تو پناہ مانگے گا لیکن تجھے پناہ نہ ملے لی۔'' وہ دھیمے دھیمے بولتی ایک دم آنکھیں بند کر گئی۔

روح نے جسم کو بے حد آسانی اور بِنا تکلیف کے آزاد کر دیا تھا۔ مائی گوما کے چہرے پر بہت چمک ار مسکراہٹ آ کر جم گئی تھی۔

''یہ... یہ تو مر گئی ہے۔'' ایک عورت نے مائی گوما کو چھو کر انکشاف کیا۔

''ہونہہ!'' سید سرفراز علی نے اُس پر تھوکا لیکن تھوک اُس کے چہرے تک نہ پہنچا، وہاں ایک فاتحانہ مسکراہٹ سید سرفراز علی کو منہ چڑھا رہی تھی۔

''سائیں! چھوٹی بی بی کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔'' ملازم بولا تو سید سرفراز علی چونکے۔

''ہاں!'' وہ مسکان کی جانب بڑھے اور اُسے پھولوں کی طرح اُٹھالیا اور جاتے جاتے ایک دم مجمعے ں کھڑی عورتوں کی جانب مڑے۔

''تم لوگوں نے جو کچھ میری بیٹی کے ساتھ کیا ہے، میں کبھی معاف نہ کروں گا، تم نے سید سرفراز علی لختِ جگر پر ہاتھ ڈالا، میں قسم کھاتا ہوں کہ یہاں کھڑے ہر فرد چاہے وہ مالکن ہے یا نوکر! اسے ے بدلے کی آگ میں سے گزرنا ہوگا۔ تم لوگوں نے سید سرفراز علی کی بیٹی کے ساتھ بُرا کر کے بہت ا کیا ہے، میری آنکھ میں زخمی ناگ کی طرح ہر اُس شخص کی تصویر قید ہو گئی ہے، جس نے اس پر ظلم میں شرکت کی ہے اور یہ شرکت چاہے صرف دیکھنے تک ہی کیوں نہ ہو، میں نہیں معاف کروں گا۔'' وہ چلائے اور اِس گونج نے حویلی کے در دیوار ہلا دیے۔

وہاں کھڑی ساری عورتیں حواس باختہ تھیں لیکن ملازموں کا سب سے بُرا حال تھا۔ اُن کو نظر آ رہا تھا کہ وہ گیہوں کی طرح ضرور پیسی جائیں گی۔

سید سرفراز علی دھپ دھپ پاؤں مارتے باہر نکل گئے عورتوں نے خوف زدہ ہو کر مائی گوما کی لاش اور سید سرفراز علی کو باہر جاتے دیکھا۔

''ہونہہ! کیا کر لے گا یہ!'' مسکان کی چھوٹی نند نے تنفر سے کہا۔

''میرا ہیرے جیسا بھائی یہ منحوس کھا گئی، مر ہی جاتی یہ کلموہی تو اچھا تھا۔'' بڑی نند کا کینہ بولا۔

سید اظہر علی کی ساری بہنیں نڈر ہو کر مسلسل بول رہی تھیں اُن کے لہجے کی بدتمیزی بے خوفی پہچان کروا رہی تھی کہ وہ کس شخص کی بہن تھیں۔

''وہ بہت بُرا کرے گا، اب بہت بُرا ہوگا۔'' شیر بانو نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔

وہ سید سرفراز علی کو چند ہی دِن میں بہت اچھی طرح جان گئی تھی اور کیوں نہ جانتی اُس نے بہت قریب سے اُس کے دل دہلا دینے والے مظالم دیکھے تھے۔

''خدایا! اب کیا ہوگا، اب شاید بہت بُرا ہوگا!'' شیر بانو نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

❖❖○❖❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"طارق...!" وہ سراپا سوال بنی اُس کے سامنے کھڑی تھی کیا کچھ نہ تھا اُس کی آنکھوں میں محبت اصرار، اقرار محبت کی چاہت اور "سب" پالینے کی تمنّا!

طارق ہی اُس کی زندگی میں سب کچھ تھا۔

"سحرش...!" طارق کو واقعی لگا کہ اِس مرتبہ اُسے ٹالنے کا مطلب تھا کہ اُسے غصّے کے اُس ردِعمل کی جانب دھکیل دیا جائے جس کے لیے ڈاکٹرز نے سختی سے منع کیا تھا وہ واقعی مشکل میں گھِر گیا تھا۔

طارق نے نرمی سے سحرش کے بالوں کو چھوا اور اُسے اپنے حلقے میں لے لیا۔ سحرش کی بلکتی تڑپتی روح میں ایک دم جیسے سکون اُترا تھا۔ اب وہ اِن پناہوں میں اُتر کر اپنا آپ بھول جانا چاہتی تھی خود طارق کو اپنے پہ بند باندھنا مشکل لگ رہا تھا۔

تیل جب جب لکڑی پر پڑتا ہے آگ تو لگتی ہے نا۔

"اَن جانے جی سے محبت کرنا یوں ہی لگتا ہے، جیسے بھرے پیٹ میں بنا بھوک کے کھا کر طبیعت پر بوجھ ڈال دینا۔" طارق کو دو طرح کی کیفیتوں کا احساس فوراً ہوا تھا۔

وہ سحرش کو لے کر صوفے تک آیا، سحرش نے طارق کی آنکھوں میں جھانکا، وہ روز کی طرح جلدی میں جانے کے چکر میں نہ تھا۔ سکون کی ایک اور لہر نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ طارق کہیں نہیں جا رہا۔ طارق چپ چاپ اُس کا سر سہلا رہا تھا سحرش کو بے حد سکون سے اپنی آنکھیں بند ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"طارق! آپ مجھ سے محبت تو کرتے ہیں نا!" سحرش نے بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی کھولتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا سوال ہوا؟" طارق نے پوچھا۔

"بولیں نا!" سحرش نے ضد کی۔

"سحرش! تم اگر مجھے عزیز نہ ہوتیں تو میری زندگی میں اتنا اہم مقام کبھی حاصل نہ کر پاتیں۔" طارق نے اپنی سی تسلی اُسے دینے کی کوشش کی بہر حال اُسے کوئی تو جواب دینا تھا، جس سے سحرش کا سوال اُگاتا دماغ کچھ پُرسکون ہو سکے۔

"طارق! میں نہیں جانتی، لیکن شاید ہر عورت اظہار محبت کی بھوکی ہوتی ہوگی۔ کیوں کہ میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے اِس لیے میں زیادہ بھوکی ہوں۔" سحرش نے بلا جھجک اظہار کیا، وہ طارق کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑے بیٹھی تھی یوں کہ اُسے جیسے ڈر ہو کہ طارق اب بس بھاگنے ہی والا ہو۔

"بولیے نا! آپ کو مجھ سے محبت ہے؟" وہ ایسا سوال کر رہی تھی، جس کا جواب سحرش بالکل برداشت نہ کر سکتی تھی۔

"تم محبت کسے کہتی ہو؟" طارق نے الٹا اُس سے سوال کر ڈالا۔

"محبت وہ جذبہ ہے جو ہمارے سلگتے، بنجر ذہن کو سیراب کر کے سرسبز و شاداب کر دیتا ہے۔" سحرش نے اِک جذب سے کہا۔

طارق کے صحیح معنوں میں چودہ طبق روشن ہو گئے تھے، وہ اپنی بے خبری پہ حیران تھا کہ سحرش کب اور

وقت اس قدر زیادہ باخبر ہو گئی تھی۔ ان جانے میں پتھر کو چھو کر زندگی دے بیٹھا تھا۔

طارق کو بچپن میں امی کی سنائی کہانی یاد آ گئی کہ کیسے ایک روز شہزادہ کسی کھوئی ہوئی شہزادی کو تلاش کرتے کرتے پتھروں کے شہر میں چلا جاتا ہے۔ پھر اچانک وہ ایک پتھر کی مورتی کو چھو بیٹھتا ہے، جو اس کے چھونے سے ہی زندہ ہو جاتی ہے۔ وہ ایک اور ملک کی شہزادی تھی، جسے کسی جن نے پتھر بنا کر کھڑا کیا تھا لیکن شہزادے کا چھونا شہزادی کو زندگی دے گیا تھا۔ پھر شہزادہ اس شہزادی سے ہمدردی کر بیٹھتا اور شہزادی کو چھوڑنے اس کے ملک جاتا ہے جہاں سب اُسے شہزادی کا شوہر سمجھ کر عزت مان اور دیتے ہیں۔ شہزادہ کچھ ایسی مروّت اور ہمدردی میں گھر کر اپنے اصل رشتوں کو بھول کر اپنی محبت کو بھول کر وہیں رہ جاتا ہے۔

ایک دن اچانک اسے اپنے ملک کا ایک آدمی ملتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے والدین اس کی راہ تکتے مر گئے اور ایک دن اس کی شہزادی بھی اسے تلاش کرتی محل میں پہنچ گئی اور جب اسے پتا چلا کہ شہزادہ ہے تو ایک بار پھر شہزادے کو ڈھونڈنے کے چکر میں دنیا کے ہجوم میں کھو گئی یوں کہ آج تک کسی کو اس کا پتا نہ چلا۔ شہزادے کو یہ سب کچھ سن کر بے حد دکھ ہوا تھا کہ وہ اپنے مقصد سے ہٹ گیا تھا، سب بھول گیا تھا۔ اپنوں کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا یوں وہ تا عمر اس بات پر پچھتاتا رہا کہ اس نے رستے کو جانا اور اپنی منزل کھوٹی کر ڈالی۔

طارق کو بچپن ہی سے اس شہزادے پر غصہ آتا تھا کہ کیوں وہ اپنے مقصد سے ہٹا، کیوں اس نے کو منزل جانا؟ لیکن آج اس کی زندگی بھی کچھ اسی طرح کے موڑ پر آن رکی تھی۔

زندگی جب رکتی ہے تو انسان کے ہونے کا مقصد فوت ہونے لگتا ہے۔ چلتی زندگی بہتا پانی ہی خوشبو اور شفاف رہتا ہے اس میں آگے بڑھنے کی ہمت اور لگن ہوتی ہے۔ اسی پل طارق کا فون مسلسل

طارق نے دیکھا آصف کا فون تھا۔

"ہاں کہو آصف!" طارق نے بہ غور آصف کو سنتے ہوئے کہا۔

"سر بٹر فلائی کلب پہ جو ریڈ ہم نے کی ہے وہاں سے درجنوں لڑکے، لڑکیاں اپنی پرائیویٹ فلمیں کرواتے پکڑے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بہت اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ تو مشہور لوگوں کی اولاد ہیں ان سب کا کرنا کیا ہے؟" آصف نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

"ابھی تو فوری طور پر سب کو اسپیشل سیل لے جاؤ، بعد میں دیکھتے ہیں کہ سب کا کیا کرنا ہے۔ ہاں وہ جو تھے کلب کے وہ مل گئے۔" طارق نے پوچھا۔

کچھ روز پہلے ایک والدین طارق کے پاس آئے تھے کہ ان کی بیٹی اپنی ایک غلطی کی وجہ سے مسلسل بلیک میل ہو رہی ہے اسے ان لوگوں سے نجات دلا دیں۔ طارق نے لڑکی سے ساری تفصیل پوچھی تو لڑکی نے بتایا کہ اس کی کالج کی دوستوں نے مل کر پہلے اس لڑکی کے ساتھ دوستی کی اور پھر مل کر اس کو تباہ کیا۔ وہ اس غلط کام کے لیے اسے مجبور کرنے لگیں، نہ ماننے پر اس کے کچھ عریاں اور فحش کلپ دکھا کر بلیک میل کرنے لگیں۔ لڑکی سے جب یہ سب کچھ سہا نہ گیا تو اس نے اپنے ماں باپ کو ساری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سچائی بتادی اور اس کے ماں باپ کسی نہ کسی طریقے سے طارق تک پہنچ گئے اور مدد کی درخواست کی۔
لڑکی کے بتائے ہوئے نیٹ کیفے اور کلب میں آج چھاپہ مارا گیا تھا اور ریڈ بے حد کامیاب ہوئی تھی۔

''گڈ! اچھا او کے! میں بھی کچھ دیر بعد پہنچ جاؤں گا۔'' طارق نے کہہ کر فون بند کردیا۔

سحرش مسلسل اس کا ایک ہاتھ تھامے طارق کی ساری گفتگو بغور سن رہی تھی۔

''آج آپ کو جانا پڑ رہا ہے۔'' وہ خود ہی دھیمی پڑ گئی تھی۔

''ہاں! لیکن اگر تم نہیں چاہو گی تو نہیں جاؤں گا۔ آج تمہارا بڑا دن ہے میں تم کو اکیلے نہ کروں'' طارق نے اس کا دل رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! آپ جائیں!'' سحرش ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

طارق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کہاں تو وہ آتش جوالا بنی منہ زور لہر بنی اُس کو بے بس کر رہی تھی کہاں سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

''سحرش! میں تمہارا وقت کسی کو نہیں دے رہا، تم اپنا موڈ ٹھیک کرو۔'' طارق نے اس کا دل رکھا۔

''نہیں طارق! آپ کی بے شک مجھے بے حد ضرورت ہے لیکن مجھ سے بھی زیادہ آپ کی ضرورت کہیں اور ہے۔ جایئے ایک اور سحرش کو پیدا ہونے سے روک لیں۔'' سحرش کے لہجے میں بربادی کا بول رہا تھا۔

طارق نے اس کی بھیگی آنکھوں کو دیکھا اور جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

ایک جانور بھی ساتھ رہے تو اس کے ساتھ اُنسیت ہو جاتی ہے۔ پھر یہ تو ایک جیتی جاگتی لڑکی تھی ہر وقت دل و جان سے اس پر واری صدقے جاتی تھی۔ اسے مرکز زندگی مان کر اسی کے گرد گھوم رہی ساری نہ سہی، بہت نہ سہی لیکن سحرش کے ساتھ اور تعلق نے اس کے دل میں کچھ مقام و جگہ حاصل کر لی تھی۔

''میرا وعدہ ہے تم سے کہ میں بہت جلد اپنے دل کو سمجھا لوں گا۔ تاکہ تمہاری جانب سے مجھے جواب دہی نہ دینی پڑ جائے۔'' طارق نے دل ہی دل میں کہا۔

''طارق!'' سحرش نے جاتے جاتے اسے پکارا۔

طارق نے رک کر اسے دیکھا پھر ایک دم طارق کو خود کو اور اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا، وہ اس کے سے لگی رو رہی تھی۔

''طارق! اب نہ سہی لیکن آئندہ ضرور میرے سوال کا جواب لانا۔'' اس نے بھیگے بھیگے لہجے میں کہا

''کیا؟'' طارق نے پوچھا۔

''یہی کہ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟'' وہ اس سے سوال کر رہی تھی اور طارق نظر چرائے باہر کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس ڈھونڈھتی ڈھونڈھتی کسی اور کو نہ پالے۔

سحرش نے لمبے چوڑے طارق کو باہر نکلتے دیکھ کر گہرا سانس بھرا۔

تمہیں ضد ہے کہ میں کہہ دوں
مجھے ضد ہے کہ تم کہہ دو

مجھے تم سے محبت ہے
کہو مجھ سے محبت ہے
نہیں یہ جانتے دونوں
محبت کب محتاج ہے لفظوں کی
محبت تو ہماری دھڑکنوں کے ساز میں شامل
سُریلے گیت کی مانند
جو تنہا رات کو اکثر آتی ہے آنکھوں میں
محبت مسکراہٹ ہے
حسین نازک سے ہونٹوں میں
محبت صندلی ہاتھوں کی نازک لرزشوں میں ہے
محبت سوچ کی گہرائیوں سے پھوٹتی خوشبو!
ہمیشہ ساتھ رہتی ہے
محبت آنکھ میں پلتا وہ پُر اسرار جذبہ
جسے اب تک نہ کوئی سمجھ پایا
نہ اس کی کوئی صورت ہے نہ اس کا کوئی پیمانہ
ڈھکے الفاظ میں اس کا بہت اظہار ہوتا ہے
کچھ ایسے ہی کہ جیسے اب
تہہ دل سے تو ہم دونوں اقرار کرتے ہیں
مگر پھر بھی نجانے کیوں
تمہیں ضد ہے کہ میں کہہ دوں
مجھے ضد ہے کہ تم کہہ دو مجھے تم سے محبت ہے

سحرش نے صوفے کی لکڑی کی بیک پر ہاتھ پھیرتے مگن سے انداز میں باآواز بلند یہ نظم پڑھی۔ اس کا حافظہ بلا کا تیز تھا۔ طارق اسے اُردو فکشن، اسلامی ادبی کتابیں لا کر دیتا رہتا تھا، جو وہ ایک بار پڑھ لیتی تو ازبر ہو جاتی تھیں۔

''طارق! تم صرف میرے ہو، میرے! خدا نے تم کو میرا نصیب بنا کر یہ بات ہمیشہ کے لیے ثابت کر دی کہ تم صرف اور صرف میرے ہو اور تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔'' سحرش نے اپنے آپ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سحرش! یہ طارق کہاں گیا؟'' مرینہ آنٹی نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ان کو کوئی کام تھا۔'' سحرش نے بے حد مطمئن انداز میں جواب دیا۔ طارق کے لبوں کا لمس ابھی بھی اس کی پیشانی پر تازہ تھا۔ اسے اپنے ماتھے پر خوشبو کا فوارہ پھوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ طارق کا اپنایت بھرا یہ احساس اس کے اندر کی بے چینی کی آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ثابت ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم نے اسے جانے کیوں دیا؟ میں نے تم کو سمجھایا تھا کہ اسے اپنے قابو میں کرو، اس سے اپنا وصول کرو۔'' مرینہ آنٹی نے حسبِ معمول نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

''اب وہ کہیں نہیں جائے گا آنٹی! آپ کے خدشات غلط ہیں، اس کی یہی تو خاصیت مما کو پسند کہ وہ زبان اور آن کا سچا ہے۔ اور اس نے اپنی زبان سے اقرار کر کے یہ بندھن باندھا ہے اور مجھے ا آن بنایا ہے، وہ مجھ سے کیسے مُکر سکتا ہے۔ وہ صرف میرا ہے۔'' سحرش نے مسکرا کر کہا۔

مرینہ آنٹی بس ایک طویل سانس بھر کر رہ گئیں۔

اب وہ اتنا اندھا اعتماد کر رہی تھی تو اس کی کوئی نہ کوئی تو بنیاد ہوگی۔ وہ حیران تھیں کہ آدھی عمر کی یہ لڑکی صرف اپنے اعتماد کی وجہ سے قابلِ رشک سکون میں تھی۔

❖❖○❖❖

اے مرے کبریا
میرے ادراک کی سرحدوں سے پرے
میرے وجدان کی سلطنت سے اُدھر
تیری پہچان کا اوّلین مرحلہ
میری مٹی کے سب ذائقوں سے جدا
تیری چاہت کی خوشبو کا پہلا سفر
میری منزل؟ تیری رہ گزر کی خبر
میرا حاصل؟ تیری آگہی کی عطا
میرے لفظوں کی سانسیں
ترا معجزہ؟
تیرے لطف کا بے کراں سلسلہ
میرے اشکوں کی چاندی
تیرا آئینہ
تری جستجو کی مسافت میں گم راستوں کا پتا
میں مسافر تیرا خود سے نا آشنا
ظلمت ذات کے جنگلوں میں گھرا
میں مسافر تیرا!

ولی نے احمد شاہ کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ حاجت کے نفل ادا کر کے دعا میں مشغول تھے۔ احمد شاہ نے دعا کر کے ہاتھ چہرے پر آمین کہہ کر پھیرے۔ سامنے ولی کھڑا تھا۔

لمبا چوڑا یہ خوبرو لڑکا جو ان کے اندر خون کی طرح شامل تھا۔ انہوں نے اپنے سارے خواب اس کی ذات سے پورے کیے تھے۔ وہ بے حد فرماں بردار بھی تھا۔ آج ایک کڑی آزمائش بن کر ان کے سامنے کھڑا تھا۔

احمد شاہ نے بہت سارے دن بے حد ڈسٹرب ہو کر گزارے تھے پھر انہوں نے اپنا آپ اور اپنے دل کا سارا بوجھ اللہ تبارک کے حوالے کر دیا تھا۔ تب سے لے کر اب تک وہ بے حد پُرسکون ہو گئے تھے۔

''بابا سائیں چلیں!'' ولی نے احمد شاہ سے پوچھا۔

وہ سب لوگ علیزے کی جانب جا رہے تھے، ولی کی دو روز میں آسٹریلیا کے لیے روانگی تھی۔ حسن آرا چاہتی تھیں کہ آج وہ سب ان کی طرف کھانا کھائیں۔

''ہاں چلو!'' احمد شاہ نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے چشمہ اُٹھا کر ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

روشن آرا اور نگینہ پہلے ہی لان کی کرسیوں پر بیٹھی انتظار کر رہی تھیں۔ یہ قافلہ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا علیزے کے گھر پہنچا تو حسن آرا خالہ کے ساتھ انور خالو بھی ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

...لی موت جہاں انور صاحب کو بہت سا سبق دے گئی تھی وہاں ان کو بہت سا بدل بھی گئی تھی۔ ان کی ...ی گردن اور تنفر بھری نگاہوں میں واضح فرق آ چکا تھا۔ اب وہ حسن آرا خالہ کا خیال کرنے لگے تھے کہ انسان کو قربت میں باندھے یا نہ باندھے لیکن دکھ کی سانجھ انسانوں کو ہمیشہ جوڑ دیتی ہے رونے کے لیے ایک دوسرے کا کندھا دستیاب ہوتا ہے تو انسانوں کے بیچ ہر فاصلہ ختم ہو ہی جاتا ہے۔ انور صاحب ...ی حسن آرا بیگم اور اپنے بچوں کے بے حد قریب ہو گئے تھے۔ منزہ کی موت پر حسن آرا خالہ نچڑ کر رہ گئی تھیں لیکن شریکِ سفر کے ساتھ اور محبت نے ان کے اندر تک توانائی بھر دی تھی۔ دوبارہ سے زندگی ...ی لگنے لگی تھی۔

...ب نے اس تبدیلی کو بہت واضح طرح محسوس کیا تھا اور یہ تبدیلی سب کو اچھی لگی تھی۔ انسان بعض اوقات اپنی زندگی کی بہت اہم یادوں کو کھو کر سبق سیکھتا ہے انور صاحب بھی مچھلی کی طرح پتھر چاٹ کر واپس آئے تھے۔

علیزے نے سرخ اور رائل بلیو کنٹراسٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر سرخ آنچل اور بنا ہار سنگھار کے ...ی وہ کسی گڑیا کی طرح من موہنی لگ رہی تھی۔

عبدالولی نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔

...ب سے اس کے حقوق ولی کے نام ہونے کا اعلان ہوا تھا۔ ولی بلا جھجک علیزے کو دیکھا کرتا تھا اس ...ا اپنے ہونے کا احساس ولی کے اندر تک خوشی کو بھر دیتا تھا۔

''آپ نے کھانے پہ اس قدر تکلف کیوں کیا؟'' احمد شاہ نے دسترخوان کو پُرتکلف دیکھ کر کہا۔

''آپا! میرا دل بہت دنوں بعد ہوا کہ میں کچھ کروں میں نے یہ بریانی اور چپلی کباب خاص طور پر ...پ لوگوں کے لیے بنائے ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں اپنی بیماری بھول کر کچن میں کھڑی ہو سکی تھی۔'' ...ن آرا نے سچائی سے جواب دیا۔

''عبدالولی بیٹا کتنے عرصے کے لیے رہنے کا پروگرام ہے؟'' انور صاحب نے پوچھا۔

''انکل میں چھ ماہ بعد چکر لگاؤں گا۔ ویسے کورس تو دو سال بعد ختم ہوگا۔'' عبدالولی نے علیزے پر ایک ...ہ ڈالی اس کے جانے کا سن کر اس کے چہرے پر اداسی کے بادل چھا گئے تھے۔

''چھ ماہ بعد!'' حسن آرا بیگم کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

’’دو سال مزید! بیٹا یہ تو بہت زیادہ ہیں۔‘‘ حسن آرا بیگم نے بے ساختہ کہا۔
’’میرا دل تھا کہ اب علیزے کی صورت میں کوئی خوشی دیکھ لوں۔‘‘ وہ اپنی طبیعت کے اوپر نیچے ہو
سے بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ علیزے کچھ غیر محسوس انداز سے وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔
’’اگر بیٹا! تمہیں اعتراض نہ ہو تو تمہارے چھ ماہ بعد نکاح کی ایک تقریب کر لیتے ہیں۔‘‘ احمد شاہ
قریب بیٹھے عبدالولی سے سرگوشی میں مشاورت کی۔
’’جیسے آپ کی مرضی!‘‘ عبدالولی نے ہمیشہ کی طرح تابع داری دکھائی، حالاں کہ وہ بیچ کورس میں
باتوں سے بچنا چاہتا تھا۔
’’بہن! اگر ایسی بات ہے تو ہم ولی کے آنے کے بعد نکاح کی تقریب کر لیتے ہیں اور رخصتی ولی
مکمل واپسی کے بعد ہو جائے گی۔‘‘ احمد شاہ کی بات نے دونوں ماں باپ کے چہرے کھلا دیے تھے۔
منزہ کے قتل اور کاشف کی مشکوک روپوشی کی وجہ سے خاندان کے لوگ اور ملنے جلنے والے ان سے
دور رہنے لگے تھے، جیسے ان کے خاندان میں چھوت کی بیماری ہوگئی ہو۔ تب سے حسن آرا اور
صاحب کو یہ لگنے لگا تھا کہ علیزے کے رشتے پر بھی یہ اثر نہ پڑ جائے۔
’’تو ٹھیک ہے، پھر ٹھیک چھ ماہ بعد عبدالولی کے آنے پر دونوں بچوں کا نکاح کر دیا جائے گا۔‘‘ احمد
نے مسکراتے ہوئے کہا۔
’’آپا آپ کو بہت مبارک ہو!‘‘ روشن آرا بیگم نے کہا۔
’’خیر مبارک!‘‘ حسن آرا بیگم نے بہن کو مبارک دی۔
’’ارے ایسے سوکھے منہ بھی مبارک باد ہوتی ہے۔ میں ابھی مٹھائی لے کر آتا ہوں۔‘‘ انور صا
کے اندر توانائی بھر گئی تھی وہ تیزی سے باہر نکلے۔
چائے ٹرے میں لاتی علیزے نے اندر کا خوش گوار ماحول دیکھا تو سب کے چہرے پڑھنے کی کو
کی۔
سب کے چہروں سے ہوتی ہوئی نگاہ جب عبدالولی پر پڑی تو اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سی
تھی کہ اس کے کانوں کی لویں تپنے لگیں اور دل بہت تیز دھڑکنے لگا۔
’’اِدھر آؤ بیٹا!‘‘ روشن آرا بیگم نے علیزے کے لیے اپنے قریب جگہ بناتے ہوئے کہا۔
علیزے کچھ جھجک کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ روشن آرا بیگم نے اس کا ماتھا چوما اور اپنے ہاتھ میں
خوب صورت کنگن اُتار کر علیزے کو پہنا دیا۔
’’حسن آرا! ٹھیک چھ ماہ بعد یہ گڑیا ہماری ہو جائے گی انشاء اللہ!‘‘ روشن آرا بیگم کی بات پر علیزے
سمجھ آئی کہ سب کے چہرے اور خاص طور پر عبدالولی کی نگاہیں کیا بول رہی تھیں۔ اس نے ایک دم
کر اپنا سر جھکا لیا، اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہو رہا تھا کہ بہت پیار کرنے والے اور قدر روالے خاندا
ساتھی کے ساتھ وہ زندگی گزارنے جا رہی ہے۔ لیکن جانے کیوں اتنی ڈھیر ساری خوشی میں بھی اس
دل کا ایک کونہ کچھ چپ چپ اور گم سم سا تھا۔ بے اختیار اس کے لبوں پر دعا آئی۔
’’پروردِگار! میری خوشیوں کو سلامت رکھنا۔‘‘ اس نے چور نگاہ ولی پر ڈال کر کہا۔

❖❖ ◯ ❖❖

خار پھولوں کے عوض دے گئی دنیا ہم کو
خواب کیا دیکھا تھا، تعبیر ملی کیا ہم کو
ہم نے تو وادیٔ شبنم کی تمنا کی تھی
زندگی دے گئی تپتا ہوا صحرا ہم کو

کان کا سارا وجود پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کا منہ سوجھ کر بہت بڑا ہو گیا تھا سارے جسم پر بے حد
ل اور زخم تھے۔ دانتوں کے زخم سے بازو میں زہر پھیلنے کا خطرہ تھا اس لیے ڈاکٹرز نے ان زخموں کی
ی لی تھی اور اس انفکشن سے مسکان کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ اس کا پور پور دکھ رہا تھا۔
الٹر تو کہہ کر چلا گیا لیکن سید سرفراز علی تو جیسے پتھر کے ہو گئے۔ چند گھنٹوں میں ہی وہ بہت بوڑھے
لے تھے۔ مسکان کی تکلیف وہ خود پر محسوس کر رہے تھے۔ وہ گم سم دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آئی
ے شیشے کے باہر آ کھڑے ہوئے۔
’’کان...!‘‘ ان کے لب پھڑ پھڑائے۔
بستر پر پٹیوں میں لپٹی زخم زخم ادھڑی ہوئی لڑکی تھی ان کی تو بیٹی نہ تھی۔ ان کی بیٹی تو بہت خوب
تھی۔ سنہری بالوں، کتھئی آنکھوں والی یہ گڑیا تو ان کی جان تھی، وہ اس کے چہرے سے عشق کرتے
اس کے چہرے میں وہ اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھتے تھے۔ عائشہ کا چہرہ دیکھتے تھے۔
ایک تو اللہ نے ان کے دل میں مسکان کے لیے خاص طرح کی محبت رکھ دی تھی، دوسرے عائشہ کے
لی مماثلت بھی مسکان میں بے حد کشش کا باعث تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس محبت میں اضافہ
ا گیا۔
ن بات جب روایات کی آئی تو وہ ان سب محبتوں کو بھول گئے تھے ان پر تو زمین اور روایات کو
کا جنون تھا اور آج اس جنون کی بھینٹ ان کی اپنی خود کی بیٹی چڑھ گئی تھی۔
’’مسکان....!‘‘ وہ دھیرے سے بولے۔
ان تک شیشے سے پار ان کی آواز نہ جا سکتی تھی۔ اگر وہ اس کے پاس بھی کھڑے ہوتے تو بھی وہ ان
آواز نہ سن سکتی تھی کیوں کہ جب جب وہ ہوش میں آتی تو درد اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ وہ بے حد چیخنے
تی۔ اس لیے ڈاکٹر نے اسے پین کلرز اور بے ہوشی کی دوائیاں دے کر سلا رکھا تھا کیوں کہ نیند اسے
ے بیگانہ رکھتی تھی اور ہوش میں تو صرف اور صرف درد تھا۔
’’میری بچی...!‘‘ وہ پہلی بار سسکے تھے۔ ان کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔
’’مت کہو اسے اپنی بچی!‘‘ ان کو اپنے پیچھے ایک روتی آواز سنائی دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہ آیا
تھیں۔
’’انیسہ!‘‘ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ان کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے یوں لگتا تھا کہ ایک دم اُن کے
ے اِدھر اُدھر سے دھند چھٹ گئی ہو اور اب صرف اور صرف مسکان اور اس کا درد ان کے سامنے تھا
ان کا دل چیر رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پہلے خود ہی اسے دوزخ میں مرنے کے لیے دھکیل دیا اور اب ٹسوے بہا رہے ہو، میری پھول
جیسی بچی کی تم نے کیا حالت بنوادی!'' آیا امّاں کا رو رو کر گلا بیٹھا ہوا تھا۔
''اسے کچھ ہو گیا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کرسکوں گی۔ آہ! میں اس کی جنت مکانی ماں سے کیا وا
تک نہ نبھا سکی میں۔ اس کی حفاظت نہ کرسکی۔'' آیا امّاں رو رہی تھیں۔
سید سرفراز یوں تھک کر بینچ پر ڈھے گئے جیسے وہ ایک دم کوئی بہت بڑی بازی ہار گئے ہوں۔
''میں نے اپنی بچی کی خوشیاں تباہ کردیں!'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔
''تم نے مسکان کی خوشیاں، اس کی زندگی سب کچھ تباہ کردیا۔ تم قاتل ہو! تم قاتل ہو! کیسی تمہا
محبت ہے، جو کبھی کسی کو سکھ نہیں دے سکتی۔ تمہارا وجود کیسا گرہن جیسا ہے جس کے ساتھ جڑتا ہے و
اندھیرا کردیتا ہے۔'' نفیسہ بیگم کا بس نہ چل رہا تھا کہ سید سرفراز علی کا سر پھاڑ دیں۔
حیرت تھی کہ سید سرفراز علی بے حد صبر و تحمل سے سب کچھ برداشت کررہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ و
سب کچھ سننا چاہتا ہو۔
''کیا کیا تھا میری بچی نے؟ بس کسی کو چاہتی تھی! اور یہ محبت تو تھی بھی یک طرفہ... اگر تم کو اس کی
سے شادی نہیں کرنی تھی تو کم از کم اظہر علی کے ساتھ اس کی زندگی تو نہ تباہ کرتے۔'' نفیسہ بیگم نے
سے پھنکارتے ہوئے کہا۔
سید سرفراز علی کو واقعی بے حد پچھتاوے نے گھیرا، وہ گڑیا اپنی پیاری گڑیا کو کیسے اپنے ہی ظلم کی بھ
چڑھا گئے تھے۔
''کون تھا یہ لڑکا، جسے مسکان چاہتی تھی؟'' انہوں نے ایک دم نفیسہ بیگم سے سوال کیا۔
''اب کیا فائدہ ان باتوں کا؟'' نفیسہ بیگم نے چادر کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکا
سوجا ہوا وجود دیکھا۔
''میں جو پوچھ رہا ہوں اتنا بتاؤ!'' سید سرفراز علی نے حسبِ عادت دبنگ لہجے میں کہا۔
نفیسہ بیگم کچھ دیر کو ناراضی سے چپ رہیں۔
''تم کو اب کیا سوجھ رہی ہے؟'' آیا امّاں نے سسکتے ہوئے کہا۔
''نفیسہ! میں وقت کا پہیہ اُلٹا چلا لوں گا، میں اپنی بیٹی کو سب کچھ دوں گا جو کچھ وہ چاہتی تھی۔''
سرفراز کی باتوں پر آیا امّاں نے ایک ناراض نگاہ ان پر ڈالی۔
''اب کیسے کرو گے یہ سب کچھ، اب تمہاری ناک نہ کٹے گی... غیروں میں بیٹی بیاہتے؟''
''نفیسہ! تم سے میں نے پوچھا ہے وہ کون لڑکا تھا؟ اگر تم نہ بتاؤ گی تو میں خود پتا کروالوں گا۔
سرفراز علی تو کبھی بھی بے بس نہیں رہا۔ وہ جو جاننا چاہتا، کرنا چاہتا ہمیشہ کرکے رہا ہے۔''
''کیا کرو گے سرفراز؟''
''میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرواؤں گا۔'' سید سرفراز علی نے خوش ہو کر کہا۔ ان کو ایک دم اپنا
ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ اتنی دیر سے جس بوجھ میں وہ دبے ہوئے تھے، وہ ایک دم اُتر گیا تھا ایسے جیسے ا
فیصلے پر پہنچ گئے ہوں۔

''وہ زندہ بچے گی تو تب نا!'' نفیسہ بیگم نے طنز سے کہا۔ اسے اس حال پر پہنچا کر بھی اس شخص کو مزید
املے لینے کی پڑی ہے۔
''میں... میں اس کے لیے زندگی مانگ کر لے آؤں گا... میں اسے ہر خوشی دوں گا۔''
''وہ تمہاری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی۔'' نفیسہ بیگم نے اسے احساس دلایا۔
''میں اپنی بیٹی کو منالوں گا... بس وہ ایک بار ٹھیک ہوجائے میں اپنی بیٹی کو ہر خوشی دوں گا... تم بتاؤ
کیا نام ہے اس لڑکے کا؟'' نفیسہ بیگم نے یک ٹک ان کا چہرہ دیکھا اور پھر دھیرے سے بولیں۔
''عبدالولی!'' ان کا لہجہ سرسرا رہا تھا، جس پر سید سرفراز کی توجہ نہ جاسکی۔
''عبدالولی! ٹھیک ہے! میں اپنی بیٹی کو عبدالولی کے نام کی خوشی ضرور دوں گا۔'' انہوں نے کہا۔
''اگر... اگر لڑکا نہ مانا تو؟'' نفیسہ بیگم نے پوچھا۔
''ہونہہ! سید سرفراز علی نے آج تک کسی کو نہیں پوچھا وہ صرف حکم دیتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے وہ کرتا
تم دیکھنا اگر خوشی راضی سے یہ رشتہ ہوا تو میں ہر صورت میں یہ رشتہ کروں گا۔ یہ سید سرفراز علی کی
ہے کہ مسکان سرفراز علی کی شادی اسی لڑکے سے ہوگی، عبدالولی کی اگر شادی ہوگی تو صرف مسکان
ورنہ وہ ہمیشہ کنوارا رہے گا...'' سید سرفراز علی کے جنونی لہجے پر آیا امّاں کا دل مزید ہراساں ہوا۔
انہوں نے شیشے کے پار درد میں ڈوبے مسکان کے وجود کو دیکھا۔ اگر وہ بچ گئی تو کیسا لائف ہیو کرے
یہ وہ خود بھی نہ جانتی تھیں، کیا اب بھی اس کی زندگی میں وہ ہی باتیں، چیزیں اہم ہوں گی جو پہلے
تھیں
بہت سارے سوال اُٹھ کر ان کے اِردگرد اکٹھے ہو کر شور مچانے لگے تھے۔

❖❖○❖❖

راستے، دل، نظر اداس اداس
کر رہا ہوں سفر اداس اداس
غم کی برسات کر گئی سارے
پھول، پتے، شجر اداس اداس
تم نہیں ہو تو زندگی اپنی
ہو رہی ہے بسر اداس اداس
جانے کیوں آسمان چپ چپ ہے
کیوں ہیں شمس و قمر اداس اداس
کوئی پوچھے مجھے تو بتلانا
جی رہا ہوں مگر اداس اداس
رونقیں تو تمہارے دم سے تھیں
تیرے بن ہے نگر اداس اداس
فاصلے کیفیت بدل نہ سکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اِدھر وہ اُدھر اداس اداس

علیزے نے کبوتروں کو دانہ ڈال کر پلیٹ دیوار پر رکھ دی اور خود چپ چاپ اپنے ہاتھ دیوار پر اپنی ٹھوڑی اُس پر رکھ کر ڈوبتے سورج کو دیکھا۔

ولی کی آج فلائیٹ تھی۔ شاید اب تک وہ چلے بھی گئے ہوں۔ اس کا دل بے حد اداس تھا۔

بے شک ولی سے ٹیلی فون یا ملاقات کا کوئی رابطہ نہ تھا لیکن دل کو تسلی رہتی تھی کہ وہ ان ہی فضا میں رہتا ہے۔ یہ ہوائیں اس کو چھو کر جب اس کے پاس آتیں تھیں تو اسے ولی کی موجودگی کا احـ اِردگرد ہوتا تھا۔ علیزے کو خود بھی پتا نہ چلا کہ کب وہ ولی کے نام کے سنگ اتنی دور تک آ نکلی تھی۔

''شاید محبت اُسے ہی کہتے ہیں کہ کوئی دور جا رہا ہو تو دل بے کل ہو کر رہ جاتا ہے۔'' علیزے دھیرے سے کہا۔

''بالکل! درست فرمایا آپ نے!'' نگی نے ایک دم اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ اب ذرا سے نیچے تشریف لائیں مجھے ضروری کام سے آپ کو ساتھ لے جانا ہے، خالہ سے میں نے اجازت لی ہے۔'' نگی بے حد جلدی میں تھی، اس لیے وہ اس کا بازو کھینچ کر نیچے لے آئی۔

''ارے آخر کیا ہو گیا، کس بات کی جلدی ہے؟'' علیزے نے جوتے بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کام ہے! کچھ شاپنگ کرنی ہے چلیں جلدی۔'' نگی جلدی جلدی بولتی اسے لے کر گاڑی آ بیٹھی۔

''یہ؟'' گاڑی رکی تو علیزے نے بے اختیار سوال کیا تھا۔

''یہ تو!''

''جی بالکل! آپ درست سمجھیں، اب جلدی کریں بیچارے بہت دیر سے آپ کی راہ تک ر کہیں ان کی فلائیٹ ہی مس نہ ہو جائے۔'' نگی علیزے کو ایئرپورٹ لے کر آئی تھی۔ اب وہ اس کا پکڑے تقریباً بھاگ رہی تھی۔

سلیپری فرش پر علیزے کا پاؤں کئی بار پھسلا تھا لیکن نگی ہیل والا جوتا پہنے بھی تیزی سے یوں رہی تھی، جیسے پانی کی سطح پر چل رہی ہو۔

''امیر لوگوں کے لیے ایسے فرشوں پر ہر جوتے کے ساتھ چلنا کب مسئلہ ہو گا۔'' علیزے کو ایک کے لیے احساس کمتری نے گھیرا۔

یہ بڑی بڑی شیشے جیسی عمارتیں ہمیشہ اس کے اندر اپنی برتری کا احساس دلا کر اُس کے دل کو سہ تھیں۔ اسے ایک دم اپنا آپ بونا لگتا۔ ایک بار اس نے یہی بات حسن آرا بیگم کو بتائی تو کچھ پل خاموش رہیں اور پھر ایک دم مسکرا دیں، جیسے وہ کسی حل کو پا گئی ہوں۔

''تمہارے دل میں اگر اللہ جی رہتے ہیں تو پھر تم جان لو کہ یہ بڑی بڑی عمارتیں اور بڑے بڑے سب عام سے اور چھوٹے ہیں کیوں کہ تمہارا تو سب سے بڑی ذات پر قبضہ ہے، اس کا ساتھ ہے سے بھی بڑے ہیبت ناک پہاڑوں کا خالق ہے، یہ عمارتیں پہاڑ اور ان میں رہنے والے سب کے اسی کے کہنے سے وجود میں آئے ہیں، ان کے پاس اصل میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ سب چھوٹا۔

''اللہ اکبر ہے!'' حسن آرا بیگم کی بات جیسے ہی علیزے کے اندر بازگشت کی طرح گونجی تو اس کے اندر ایک دم خود اعتمادی آ گئی اسے اِردگرد کے بنے سنورے لوگوں سے خوف ختم ہو گیا۔

''بے شک! اللہ آپ ہی سب سے بڑے ہیں!'' علیزے نے شکر بھرا اقرار کیا۔

''وہ دیکھیں آپی! بھائی ادھر کھڑے ہیں!'' نگی نے اسے متوجہ کیا۔

''جلدی چلیں بہت دیر ہو چکی ہے!'' نگی تیزی سے ولی کی جانب بڑھی اور دوڑ کر ولی کے بازو سے جا لگی۔

''بھائی آئی وِل مس یو!'' نگی نے تڑپ کر کہا۔

''تم کو کس نے روکا ہے، تم ملنے آ جانا بابا سائیں اور اماں جان دو ماہ بعد میرے ہاں چکر لگائیں گے۔'' ولی نے اسے تسلی دی۔

''پھر بھی بھائی! دو ماہ تو ہیں!'' نگی واقعی اداس ہو رہی تھی۔

''پاگل بچی جب تمہاری شادی ہو گی پھر بھی تو تم نے رخصت ہو کر ہم سے دور جانا ہے پھر کیسے رہو گی۔ اپنے دل کو بڑا کرو۔'' ولی نے فوراً اسے نصیحت کی اور دھیرے دھیرے اس کے ساتھ چلتا علیزے تک پہنچا۔ نگی نے دونوں کا ایک دوسرے کو بے اختیار تکنا فوراً نوٹ کیا تھا۔

''بھائی! بابا اور اماں جان کدھر ہیں؟'' نگی نے پوچھا۔

''وہ اماں جان کو واش روم کی جانب وضو کرانے لے کر گئے ہیں۔'' ولی نے جواب دیا۔

''میں بھی ہو کر آتی ہوں۔'' نگی کہہ کر واش روم کی طرف بڑھی، کچھ پل کو وہ ولی اور علیزے کو مکمل تنہائی دے گئی تھی۔

''میں جا رہا ہوں، اب بھی چپ رہو گی لڑکی!'' ولی نے گم سم علیزے کو دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔

''خیر سے جائیں، خیر سے واپس آئیں!'' علیزے نے نگاہ اُٹھا کر دعا دی۔

''اور واپسی پر تمہارے لیے کیا لاؤں، کوئی گوری میم چلے گی؟'' ولی نے شرارت سے کہا۔

''آپ ایسے تھوڑا ہی ہیں!'' علیزے نے مسکرا کر کہا۔

''تو پھر کیسا ہوں، کیا تم مجھے جاننے لگی ہو؟'' ولی نے گھمبیر آواز میں پوچھا۔

''آپ... آپ بہت!'' وہ اچھا کہتے کہتے رک گئی۔

''آپ بہت کیا؟'' ولی متوجہ تھا۔

''بہت شیطان ہیں! لفظ پکڑتے ہیں۔'' علیزے نے کہا۔

''اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ مجھے مس کرو گی؟'' ولی نے اشتیاق سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اوں ہوں!'' علیزے نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایسا ہے کیا؟'' ولی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''بالکل! مس تو اسے کیا جاتا ہے، جو آپ سے دور ہو آپ تو ہمیشہ میرے آس پاس ایک مضبوط حصار کی طرح رہتے ہیں۔'' علیزے کا لفظ لفظ اظہار کر رہا تھا، ولی کا دل کھل گیا۔

''کبھی کبھی اظہار بالکل زندگی کی طرح ضروری ہوتا ہے۔ You Have made my

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

day!۔'' ولی نے اس کے اظہار پر خوش ہو کر کہا۔

''تمہارا یہ اظہار میں سنبھال کر لے جا رہا ہوں۔ تنہائی میں تمہاری یاد میں کام آئے گا۔'' ولی نے ایک دم اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر چھوڑا تو علیزے کے ایک برقی رو سر سے پیروں تک گزر گئی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رابطے میں رہو۔'' ولی نے اسے ایک موبائل سیٹ پکڑایا۔

''یہ...؟

''لیکن ولی! امّاں ابا کو کیا بتاؤں گی؟'' علیزے نے پریشانی سے کہا۔

''تم خالہ کو فوراً بتا دینا۔ اگر وہ اجازت دیں تو اسے آن کر کے سب سے پہلے ان کی ہی مجھ سے بات کرانا اگر وہ نہ مانیں تو بھی ہمارے دل کے رابطے تو برقرار ہیں۔ وعدہ کرو کہ دل کے تاروں اور اس کے سٹیلائیٹ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی تم اپنا ہر مسئلہ مجھ سے شیئر کرو گی۔'' وہ جاتے جاتے اسے کتنا معتبر کر رہا تھا۔ اس کی ساری پریشانیوں کو اپنے سر لینے کا کہہ رہا تھا۔

''بولو...!'' ولی نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے!'' علیزے دھیمے سے مسکرا دی۔

''دیٹس لائیک مائی گرل!'' ولی کو اس کی اتنی اپنائیت بہت اچھی لگ رہی تھی، زندگی میں ایک وقت اور کوئی ایک رشتہ ضرور آتا ہے جس پر ہم کوئی حد نہیں باندھتے ہیں۔

''بھائی ہم آ رہے ہیں۔'' نکی نے کچھ فاصلے سے آواز دی۔

''او کے علیزے!'' ولی نے ایک بار پھر علیزے کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر گرم جوشی سے دبایا۔

''اللہ کے سپرد!'' علیزے نے کہا۔

ولی فوراً سب کی جانب مڑا اور پھر سب سے ملتا ہوا اندر چلا گیا، علیزے کے اندر جو اداسی کا بسیرا تھا اب نہ تھا۔ اب اس کے اندر خود اعتمادی تھی۔

کسی کے ساتھ اور پیار کا احساس آپ کو اکیلے اور اداس نہیں ہونے دیتا۔ ولی کو رخصت کر کے جب وہ گاڑی میں آ کر بیٹھنے لگی تو اس نے آسمان پر اڑتے ایک جہاز کو دیکھا، اُسے لگا کہ اسی میں ولی موجود ہے۔ علیزے نے بے اختیار کہا۔

''جلدی آیئے گا ولی!''

محبت کا احساس دلا کر وہ شخص اسے مکمل طور پر اپنے حصار میں باندھ کر چلا گیا تھا۔

❖❖○❖❖

اے ماں!
آتا ہے یاد مجھ کو
شانوں پہ تیرے وہ جھولنا مرا
ماتھے کو میرے ہر دم وہ چومنا ترا
انگلی کو تھام کے مجھے چلنا بھی سکھایا

بولنا، لفظ کو پڑھنا بھی سکھایا
لڑھکا جو کبھی تھام لیا تو نے
رویا جو کبھی بھینچ لیا تو نے
زندگی میں جب کٹھن موڑ کوئی آیا
فقط تیری دعاؤں سے ملا مجھ کو سہارا
ٹھوکر جو لگی تو نے سنبھالا مجھ کو
گر جو گیا تو نے اُٹھایا مجھ کو
مرے دکھ نے تجھے تڑپایا ہے
خوشیوں نے مری تجھ کو ہنسایا ہے
دنیا میں فقط تو ہی مری خیر اندیش
بے غرض و جاں نثار پُر خلوص
مشکل نے جو گھیرا کبھی راہوں کو میری
کام آئی ہیں سدا صرف دعائیں تیری
وہ گود سر رکھ کر جس پہ میں سوتا تھا
آرام و سکون جس سے مجھے ملتا تھا
میں نشاں ہوں تری محبتوں، عطاؤں کا
تری بے غرض وفا، سحر کی دعاؤں کا
ترے قدموں تلے جنت ہے جان گیا ہوں
تو جو نہیں تو یہ سب کچھ مان گیا ہوں

''ترنم! یہ فون بند کرو اور میری بات غور سے سنو۔'' ماہی ایک دم کمرے میں داخل ہوئی۔ ترنم نے فون بند کر کے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم کہاں فون کر رہی تھیں؟'' ماہی نے پوچھا۔

''جانتی ہو تو بار بار کیوں پوچھتی ہو؟'' ترنم نے بیڈ پر لیٹے ہوئے پوچھا۔

''تم اپنی مدر کے لیے پوچھ رہی ہو نا؟'' ماہی نے پوچھا۔

''ہاں! میں نے ایک این جی او سے رابطہ کیا تھا انہوں نے مجھے مختلف دارالامان اور پاگل خانوں کے نمبرز دیے تھے جہاں میں پتا کروا رہی ہوں کہ شاید کہیں سے ان کا معلوم ہو سکے۔'' ترنم نے تھکے تھکے لہجے میں اب تک کی مسلسل کوشش گوش گزار کی۔

''کیا تم شیور ہو کہ وہ ضرور اس طرح کے ادارے میں ہی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کسی گھر نے ان کو پناہ دے رکھی ہو۔'' ماہی کی بات پر جہاں ترنم نے چونک کر دیکھا، وہیں اس کا دل بُری طرح ڈوبا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ کہاں اتنی بڑی دنیا میں اپنی ماں کو تلاش کرے گی۔

''یا میرے اللہ!'' ترنم نے بے اختیار اپنا سر اپنے ہاتھوں پر گرا لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب سے اُس نے اپنی ماں کے متعلق سنا تھا اس کا دل کرتا تھا کہ وہ اُڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس جائے لیکن جتنا وہ اسے تلاش کرنے کی کوشش تیز کرتی، اتنا ہی وہ مایوسی کا سامنا کررہی تھی۔

''امّاں! میری پیاری ماں!
تجھے ڈھونڈوں کہاں؟'' ترنم بے اختیار سسکی۔

''ترنم حوصلے سے ...اب تم نے کچھ کرنے کا عہد کیا ہے تو حوصلے اور صبر سے کرو۔ اللہ تمہاری کرے گا۔'' ترنم نے چونک کر ماہی کو دیکھا۔ یہ ماہی تھی، جو اُسے تسلیاں دے رہی تھی۔ گئے دنوں ماہی کے اندر خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔

ترنم اکثر اسے دیکھ کر چونکتی تھی، ماہی کے بدلنے کی وجہ وہ ابھی تک جان نہ پائی تھی اگر جان پاتی شاید اتنی حیران نہ ہوتی کیوں کہ موت کے دہانے پر کھڑا شخص یا تو بے حد خوف زدہ ہوتا ہے یا پھر بے بہادر! اور ماہی بے حد بہادر ہوگئی تھی۔

''ہاں تم کیا کہنے ~ئی تھیں؟'' ترنم نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔

''پلیز اسے تو بند کرو، میرا دل گھبراتا ہے۔'' ماہی کے کہنے پر ترنم نے ایک بار پھر چونک کر اسے د کیوں کہ کچھ عرصے پہلے ماہی خود بھی سگریٹ نوشی کرتی تھی۔

''یہ ماہی نے سگریٹ کیسے چھوڑی؟''

''وہ راگنی چڑیل نے تمہاری ڈیوٹی وڈرائچ کے ساتھ لگائی ہے۔''

''وڈرائچ کے ساتھ آج میں جاؤں گی، کم بخت بہت کرپٹ ہے، بہت ساری لڑکیوں کی زندگی تباہ ہے اب اسے مزید نہیں جینا چاہیے اس لیے اس کے ساتھ میں جاؤں گی۔'' ماہی نے آخری لفظ بڑ کر کہے۔

''یہ تمہیں آج کل کیا مصیبت آئی ہوئی ہے ہر کیڑے مکوڑے کے ساتھ جا رہی ہو، انسان ہو کہ مشی تھکتی نہیں؟'' ترنم نے ماتھے پر بَل ڈال کر کہا۔

''بہت سارے حساب باقی ہیں، میرے پاس وقت کم اور کام زیادہ ہے جب میں نہ ہوں گی لیک دیکھنا یہ لوگ مجھے ضرور یاد کریں گے۔'' ماہی خود ہی ہنستی چلی گئی لیکن اس کی ہنسی ٹوٹے ہوئے کانچ طرح تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

''ماہی!'' ترنم ایک دم لیٹے سے اُٹھ بیٹھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم اس طرح کی باتیں کیوں کررہی ہو؟'' ترنم واقعی پریشان تھی۔

''ارے ڈونٹ وری بے بی! آخر کمپنی کا اثر تو ہونا ہی تھا نا! تمہارے زیرِ سایہ رہنے سے اس طرح ابنارمل باتیں کرنا انتہائی نارمل ہے۔'' ماہی نے فوراً ہنستے ہوئے بات کو ٹالا۔

''لیکن...لیکن میں کچھ اور محسوس کررہی ہوں۔'' ترنم فوراً سمجھ نہ پا رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے لیکن وہ ا ضرور جان گئی تھی کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

''ارے جناب! میں نے چھ سال تمہاری ابنارمیلٹی کو بھگتا ہے۔ آخر مجھ پر کچھ اثر تو ہونا تھا نا۔ ا آج شام کے لیے تم فری ہو، تم ماں جی کے لیے جاؤ انہیں ڈھونڈنے کے لیے کسی نجی ادارے کی مدد

...ان کل کئی نجی سراغ رساں کمپنیاں بھی تو نظر آتی ہیں۔'' ماہی کہہ کر باہر نکل گئی۔

''...ماہی کیا کرتی پھر رہی ہے، کیسی کھچڑی ہے، جو مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔'' ترنم نے باآواز بلند خیال ...ال لی۔

❖❖○❖❖

''...اللہ! کدھر تھے آپ؟'' سائرہ نے طارق کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کی بندی ذرا سانس تو لینے دو۔'' طارق نے مسکرا کر اس کے سر کے بالوں کو بکھیرتے ہوئے کہا۔

''...اللہ! آپ تو اتنا زیادہ گھر سے غائب رہتے ہیں کہ مجھے آپ پر شک ہونے لگتا ہے۔'' سائرہ کی ... طارق کے چہرے پر اِک سایہ لہرایا۔

''...شک! کیسا شک؟'' اس کے اندر کا چور ہر وقت الرٹ رہتا تھا۔

''...یہی کہ آپ نے یقیناً پرموشن لے لی ہے اور اب آپ نے اپنا کام مزید بڑھا لیا ہے۔'' سائرہ نے ...بت سے کہا تو طارق کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔

''دراصل میں آپ کو مسلسل فون کررہی تھی، میں مسکان کی طرف جانا چاہ رہی تھی۔''

''...مسکان! وہ یہاں شہر میں واپس آ گئی؟'' طارق نے پوچھا۔

''...آئی نہیں بلکہ لائی گئی ہے۔''

''...مطلب؟'' طارق نے پوچھا۔

''...وہ بے حد بیمار ہے، مجھے آپا امّاں نے فون پر بس اتنا ہی بتایا تھا۔ کیا آپ میرے ساتھ چل سکتے ...'' سائرہ نے رک کر پوچھا۔

''...آں۔ سوری یار! مجھے تو اگلے گھنٹے میں فوراً نکلنا ہے میں تو گھر ایک بہت اہم فائل لینے آیا ...'' طارق نے معذرت کی تو سائرہ کا چہرہ اُتر گیا۔

''...کم آن یار! تم سمعان کو لے جاؤ... میں اُسے فون کردیتا ہوں۔ تم لوگوں میں دوستی بھی تو ہے۔'' ...طارق نے مصروف انداز میں کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''...اوں! ٹھیک ہے میں سمعان کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔'' سائرہ میں ایک اچھی بات تھی وہ بات فوراً ...مان جایا کرتی تھی۔

''...گڈ گرل!'' طارق نے اس کا سر تھپتھپایا۔

''...والد کیسے ہیں کیا میں ان سے مل لوں؟'' طارق نے پلٹ کر پوچھا۔

''...وہ دوا لے کر سو رہے ہیں۔ اُٹھایئے گا نہیں۔'' سائرہ نے کہا تو طارق اثبات میں سر ہلاتا اندر چلا ...

''...سمعان! ہاں سمعان سے کہتی ہوں کہ میرے ساتھ چلے...'' سائرہ کہتی ہوئی فون کی جانب بڑھی۔

❖❖○❖❖

...کتنی ہی دیر گزر گئی لیکن کمرے میں موجود نفوس بے حد چپ تھے، ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مختلف سوچوں ...گم تھا لیکن ان سب کی سوچ کا مرکز صرف اور صرف مسکان تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقفے وقفے سے سائرہ کی سسکی کمرے کی خاموشی کا ارتکاز توڑتی رہی۔

"اتنا کچھ میری بہنوں جیسی سہیلی پر بیت گیا او مجھے آپ نے اب بتایا۔" سائرہ کے لہجے میں دکھ نمایاں تھا جیسے اگر وہ جان جاتی تو شاید اپنی سہیلی کو بچالیتی۔

"ہم سب اس کے لیے بے حد بے بس تھے، تم کیا کرلیتیں۔" آپا لماں ہارے ہوئے جواری کی... بولیں۔

"مسکان کو اپنے شوہر کی موت کا بے حد دکھ ہوگا مزید اس کے سسرال والوں کا اتنا جان لیوا... میری بہن پر کیا گزری ہوگی۔" سائرہ نے پیار سے بے سدھ لیٹی مسکان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

آپا لماں نے جواباً کچھ نہ کہا۔

وہ بھی سب چپ چاپ یک ٹک بے سدھ لیٹی مسکان کو دیکھتی رہیں۔

"آج اسے دسواں روز ہے، ایسے ہی سوئی رہتی ہے۔

دواؤں کا اثر جب جب ختم ہوتا ہے تو چیخیں مارتی ہے روتی ہے ڈاکٹر پھر نشہ آور ادویات س... سلا دیتے ہیں۔ جب تک یہ بے ہوش ہے یوں لگتا ہے کہ اسے سکون آ گیا ہے لیکن جب جب ا... آتا ہے تو... کیا اسے ہم ساری عمر بے ہوش رکھیں گے؟" آپا لماں کی آواز درد سے ڈوبی ہوئی تھی۔

سمعان ان دونوں کی گفتگو سے بالکل لاپروا بس چپ چاپ مسکان کے سوجے منہ اور وجود کو... تھا۔

جانے کیوں اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو کررہا تھا۔ مسکان کی تکلیف اسے اپنے پہ... رہی تھی، اس لڑکی سے کبھی وہ اظہار نہ کرپایا تھا اسے ہمیشہ دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ اس کا اس لڑکی س... رشتہ ہے تب ہی تو وہ اسے اپنے بے حد قریب لگا کرتی تھی۔ اُسی پل ڈاکٹرز روم کا دروازہ کھول... آئے۔ ڈیوٹی ڈاکٹر اور نرسیں بڑے ڈاکٹر کے راؤنڈ کے وقت بے حد الرٹ تھیں۔

"ڈاکٹر عابد! میں نے آپ سے کہا تھا کہ مریضہ کی ذہنی حالت کی ہسٹری لیں۔" سرجن عثما... اپنے ماتحت ڈاکٹر سے پوچھا۔

"دیکھیں خاتون! آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گی تو مریضہ کی حالت میں بہتری آ... مریضہ کے باہر کے زخم تو دواؤں کے ذریعے ٹریٹ ہورہے ہیں لیکن یہ سب بالکل بے سود ہے اگ... ذہنی حالت کی ٹریٹ منٹ نہ کی گئی تو..." ڈاکٹر عثمان نے لماں کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

"بچی ہوش میں آتے ہی بری طرح چیخنے لگتی ہے جس سے اس کے زخم اکھڑنے لگتے ہیں اس... مجبوراً اسے سلا دیتے ہیں۔ لیکن آپ ہی بتائیں کہ ہم اسے کب تک سلائیں گے؟ اسے ہوش میں... دنیا اور اس کے خود کا سامنا کرنے کے لیے تیار تو کرنا ہوگا نا...؟" ڈاکٹر نے آپا لماں اور سائرہ... ہوئے کہا۔

"اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" سائرہ نے پوچھا۔

"اس کے لیے مریضہ کو ہمارے علاوہ کسی اسپیشل ڈاکٹر کی ضرورت ہے، جو اس کی ذہنی حا... بہتری لاسکے۔" ڈاکٹر عثمان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مطلب؟" آپا لماں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ان کو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا ہوگا۔" ڈاکٹر عثمان نے وضاحت کی۔

"اوہ!" سائرہ جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گئی ہو۔

"ان کو اس وقت ڈاکٹر اکرم زبیر کی ضرورت ہے۔ وہ بے حد کامیاب نفسیات دان ہیں اور بے حد قابل انسان بھی! وہ انشاء اللہ آپ لوگوں کے لیے بہت بہتری کا باعث بنیں گے۔" ڈاکٹر عثمان نے ان کو تسلی دی۔

"کیا نام بتایا ہے ان کا، ہم جلدی ان سے رابطہ کرلیتے ہیں۔" سائرہ نے پوچھا۔

"ان کا نام ہے ڈاکٹر اکرم زبیر!" ڈاکٹر عثمان نے بتایا۔

"ڈاکٹر اکرم زبیر!" سائرہ کو یہ نام کچھ جانا پہچانا سا لگا پھر ایک دم اس کے دماغ میں جھماکہ سا ہوا۔ اس نے کچھ روز پہلے طارق لالہ کی جیب سے ایک کارڈ گرتے دیکھ کر اُٹھایا تھا۔ وہ ڈاکٹر اکرم زبیر کا تھا جو کہ مشہور نفسیات داں تھے۔

"ہوسکتا ہے لالہ ان کو جانتے ہوں، میں لالہ سے بات کروں گی کہ وہ مسکان کے لیے ان سے رابطہ کریں۔"، سائرہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

"لیکن لالہ کی جیب میں ایک سائیکاٹرسٹ کا کارڈ کیوں تھا۔" ایک بے ضرر سا خیال سائرہ کے دماغ کو چھو کر گزر گیا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ بے ضرر سوال نہ تھا بلکہ اس کے بھائی کی زندگی کا بے حد اہم حصہ تھا۔

❖❖○❖❖

جیسے ہی سید سرفراز علی نے سید اظہر علی کی حویلی میں قدم رکھا تو وہاں موجود سب نفوس کو سانپ سونگھ گیا کہ ان کی سب سے بڑی نند کا میاں شہر بانو کا ماموں تھا اس وقت وہ ہی سب کو اٹینڈ کررہا تھا۔

"آپ...؟" سید سخاوت علی نے گھبرا کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ میرے داماد کا دسواں ہے، کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔" سید سرفراز علی کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ جیسے دس روز پہلے ان کی بیٹی کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

"جی... جی ضرور!"

"پھر یہ میرے بیٹے کی سسرال بھی تو ہے نا!" انہوں نے اپنے ساتھ آئے بلال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ جس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے سید سخاوت علی نے فوراً محسوس کرلی جب کہ بلال بالکل چپ تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی تھا خود میں مگن رہتا تھا۔

"بالکل... بالکل! آپ مہربانی کرکے تشریف رکھیں۔" سید سخاوت علی نے بے حد مؤدب ہوکر کہا۔ یہی کیا کم تھا کہ سید سرفراز علی اپنا غصہ تھوک کر دوبارہ بنا کہے ان سے ملنے آئے تھے۔ اس لیے وہ جتنے مشکور ہوتے کم تھا۔

کچھ دیر سید سرفراز علی نے بیٹھ کر واپسی کی اجازت لی۔

"اچھا سائیں! اب ہم چلتے ہیں۔" وہ بے حد نارمل انداز میں مخاطب تھے۔ سب ہی نے شکر ادا کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ بات اتنی نہ بگڑی تھی ورنہ ان کے خاندان کی جاہل عورتوں نے ایک طوفان کو اپنی جاہلیت سے دعو، تو دے ہی دی تھی۔

''اچھا بھئی! وہ ہماری لڑکی کو تو تیار کرو، بہت دن رہ لی اب اپنے گھر چلے۔'' سید سرفراز علی نے۔ حد نارمل انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے شہر بانو کے متعلق کہا۔

''ابھی...؟'' سخاوت علی کچھ سوچ میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن سید سرفراز علی کا چہرہ اس قدر نارمل تھا کہ ا کے دماغ میں کوئی بھی وسوسہ نہ آ سکا۔

''ہاں ابھی کروا دو، ابھی تو بچہ بھی ساتھ لینے آیا ہے۔'' انہوں نے بلال کی جانب اشارہ کر کے کہا، جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے سائیں! ہم اندر کہلوا دیتے ہیں، بس دس منٹ اور انتظار کر لیں۔'' سید سخاوت علی نے فو اندر زنان خانے پیغام پہنچایا۔

کچھ دیر بعد جب گھبرائی، ڈری سہمی شہر بانو ملازمہ کے ساتھ جیپ تک آئی تو سید سرفراز علی نے اس یوں بھرپور جائزہ لیا، جیسے شکاری اپنے شکار کو دیکھتا ہے۔

طارق بے حد تیزی سے جیپ سے نکل کر پورچ کا راستا پار کر کے اندر آیا، تیز بارش نے چند سیکنڈ میں بھگو ڈالا تھا۔ اُسے بے حد کوفت کا احساس ہوا اُس نے شیڈ کے نیچے آ کر اپنے کوٹ کو پانی کی ں سے صاف کیا لیکن کچھ پانی کپڑوں میں جذب ہو کر جسم میں کپکپی کا احساس پیدا کر گیا تھا۔

''یا وحشت! مجھے تو ابھی آفس بھی جانا تھا۔'' طارق بڑبڑایا لیکن پھر اُس کی بڑبڑاہٹ ایک دم رُک گئی منظر ہی ایسا تھا کہ ساری کوفت، غصّہ بھاپ بن کر اُڑ گئے تھے، سامنے ہی نگی شیڈ کے نیچے کھڑی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

وہ تھوڑا سا آگے بڑھ کر پانی کی بوندوں کو خود پر آنے دیتی اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ جاتی۔ بازو پھیلا اپنے ہاتھوں پر بارش کی بوندوں کو لیتی اور پھر بے حد خوش ہوتی، ایک ہاتھ میں اُس نے اپنی لاڈلی بلی رانی'' پکڑ رکھی تھی۔ طارق کے قدم بے اختیار نگینہ کی جانب بڑھنے لگے۔ اسے لگا، جیسے وہ خود میں بے ہے۔

گیراج کے شیڈ سے سامنے بنے برآمدے کے بیچ لان سے گزرتے اُسے ایک پل کو بھی بھیگنے کا احساس نہ ہوا تھا۔ وہ ایسے چلے جا رہا تھا، جیسے مقناطیس کھینچا چلا جاتا ہو۔

''ارے! آپ؟'' نگینہ خوش گوار موڈ میں طارق کو دیکھ کر مزید خوش ہوئی۔

''آپ تو بالکل بھیگے بلّے بن گئے!'' وہ طارق کے بھیگے حلیے کو دیکھ کر قل قل کرتی ہنسنے لگی۔

''مطلب؟'' طارق نے بہت نرم اور پیار بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ اگر رانی بھیگتی ہے تو وہ بھیگی بلی ہوئی اور آپ بھیگے تو بلّے ہوئے۔'' نگینہ کو بہت مزہ آیا۔

''تم رانی کو اور مجھے ایک ہی صف میں کھڑا کر رہی ہو!'' طارق نے مصنوعی سنجیدگی سے پوچھا۔

''اوہ سوری! اگر آپ کو بُرا لگا ہے تو!'' نگینہ نے کچھ سہم کر اُسے دیکھا۔ وہ نہ کسی کو دُکھ دے سکتی تھی اور نہ کسی کو ناراض کر سکتی تھی۔

طارق کو تو وہ پوری کی پوری اچھی لگا کرتی تھی، لیکن اُس کی سادگی اور دھیما پن تو دل کو چھو جایا کرتا تھا۔

''نہیں! مجھے تمہاری کسی کوئی بات بھی بُری نہیں لگتی۔'' طارق نے اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اُن کے قطروں کو ہٹایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اندر چلیے نا، سب لوگ بھی اندر ہیں۔" نگینہ نے اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ لیکن ایک دم اُسے دیکھنے لگی، ساتھ چلتے طارق نے بھی رُک کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"لیکن؟ لیکن آپ تو اُس دن مجھ سے بہت خفا ہو کر نکلے تھے، میں کتنی دیر ڈسٹرب رہی، طارق آپ کو میری کوئی بات بُری لگی تھی؟" آنکھوں میں معصومیت چھپائے وہ دشمنِ جاں اُس سے کس قدر سوال کر رہی تھی۔

"نگینہ! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟" طارق نے بے حد جذب سے پوچھا۔ اس کا سوال نگینہ کے سوال کے جواب میں بالکل برخلاف تھا۔

"ہاں جی کی ہے!" نگینہ نے کہا تو طارق جیسے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کا دِل بھی کچھ اپنی معمول کی رفتار سے ہٹ گیا تھا۔

"کس سے؟" طارق کا سارا وجود کان بنا ہوا تھا۔

"مجھے اپنی امّاں اور بابا جانی سے محبت ہے!" نگینہ کے جواب سے طارق کے جوش کے غبارے میں ایک دم سوراخ ہوا تھا۔

"اچھا! اس کے علاوہ؟" طارق نے بھی ہمت نہ ہاری۔

"ولی بھائی سے!" نگینہ نے پھر معصومیت سے درست جواب دیا۔

"لاحول ولا!" طارق منہ میں بڑبڑایا۔

"ماں باپ اور بہن بھائیوں سے تو سب کو پیار ہوتا ہے میں اِس کے علاوہ پوچھ رہا ہوں۔" ... کے جسم سے سرد ہَوا کا جھونکا ٹکرایا تو اُسے سارے جسم میں سردی سے سوئیاں سی چبھنے لگیں لیکن آج وہ بے صبرا ہوا بیٹھا تھا۔

"ہاں جی! مجھے "رانی" سے بھی بہت پیار ہے۔" نگینہ نے جواب دیا۔ طارق کا موڈ ایک دم ... ہو گیا۔

"طارق! کیسے بے خبر، نا سمجھ صنم سے دِل لگا بیٹھے ہو!" اس نے کڑھ کر خود سے کہا۔

"بس؟" طارق نے پوچھا۔

جیسے اُس کی خود کی بس ہو چکی ہو۔

"اور کون ہے؟" نگی نے سہمی سہمی نظروں سے طارق کے بگڑے موڈ کو دیکھا۔

"زندگی میں بہت ساری محبتیں ہوتی ہیں لیکن زندگی میں صرف کوئی ایک محرمِ راز، محرمِ دِل ہوتا ہی ہمارے وجود کی اصل محبت کا حق دار ہوتا ہے! میں تم سے تمہارے محرمِ دل کی محبت کے متعلق ... ہوں!" طارق نے اُس کی جانب تھوڑا سا جھک کر گمبھیر لہجے میں کہا۔

طارق کی آنکھوں کی تپش اُس کے لہجے کی گرمی کو نگینہ نے اِس سردی میں بے حد شدت سے ... کیا۔

نگینہ اُسے یک ٹک دیکھے گئی۔

دِل نہ جانے کب سے باخبری کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا اور جب دِل نے طارق کی بات کے مفہوم کو

... قدم رکھا تو نگینہ کی سفید رنگت ایک دم سرخ پڑ گئی۔ اس کے چہرے کا ہر رنگ طارق بہ غور پڑھ رہا ... ہی نگینہ کے چہرے کے رنگ چمکے اُس کا دِل بے حد خوشی سے بھر گیا تھا۔ وہ اُس کے احساس کو ... جا رہی تھی۔

"نگینہ! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟"

طارق پھر پوچھ رہا تھا لیکن اِس بار وہ خوش تھا کہ اس بار وہ اپنی بات کو اندھے کنویں میں نہیں پھینک ...

"ہاں!" نگینہ نے اِدھر اُدھر سر گھما کر کہا۔

... وہ طارق کی نظروں کی تپش سے بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

"کیا تم جانتی ہو کہ میں نے اپنے دل کے سب سے اہم حصے میں جو چہرہ چھپا رکھا ہے وہ کون ..." طارق کا لہجہ شدتِ جذبات سے بھاری ہوتے جا رہا تھا۔

... سے کوئی جواب نہ بن پا رہا تھا۔ وہ اُس سے آخر کیا پوچھتی۔

"وہ چہرہ، جسے میں بچپن سے پیار کرتا آیا ہوں، اُس کی صورت میرے من مندر میں سالوں سے سجی ... لیکن میں اُسے بتانے کے لیے ہمیشہ درست وقت کا انتظار کرتا رہا۔ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ آج ... وقت ہے!" طارق نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"... میں تم سے جو کہنے جا رہا ہوں وہ دنیا میں کروڑوں شخص روز شاید ایک دوسرے کو کہتے ہوں گے۔ ... کے لیے وہ بات اُس کی زندگی کی اہم ترین بات ہے! اور... اور میرے لیے بھی یہ زندگی کی ... بات ہے! نگی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اب سے بہت بہت پہلے سے جب میں نے ... لفظ کو زندگی میں پہلی بار جانا، تب سے اور تب سے بھی جب یہ کسی آبِ حیات کی طرح قطرہ ... دل پر برسی اور میرے دِل کو تمہارے نام سے زندہ کرنے لگی تب سے!" طارق نے اُس کے ... ہو کر کہا۔

... وجود یوں ہوا کہ جیسے اُس کے اندر سے برقی رو گزری ہو، جو سر سے پیروں کے تلووں تک گئی ... کے ہاتھ سے رانی چھوٹ گئی، رانی بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

... کی نگاہیں تو زمین میں گڑ گئیں دل تھا کہ سرپٹ گھوڑے کی طرح بھاگے جا رہا تھا۔

"نگی! کیا تمہیں میں اور میری محبت قبول ہے؟" طارق نے بے حد جذب سے پوچھا۔

... سارا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ ساری عمر اُس نے ایک کپڑا تک اپنی مرضی سے نہ ... اتنی بڑی بات کا وہ کیسے جواب دے لیتی۔ وہ ایک دم کنفیوژ سی ہو گئی، بہت سارے خیالات ... ہو کر اُس سے فیصلہ نہ کروا پا رہے تھے۔

"نگی!" وہ منتظر تھا۔

... نے پریشان ہو کر نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا، پھر ایک دم سارے منظر واضح ہو گئے۔ اُس کا دل ... صورت احساس میں گھرا تھا اُسے یہ سب بُرا نہیں لگا تھا بلکہ بے حد اچھا لگا تھا اُسے طارق کے ... کی خوشبو بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ اُسے طارق آج ایک بالکل نئے رُخ سے مزید اچھا لگنے

لگا تھا۔ اُس کی نظریں بے اختیار جھکیں، لب مسکرائے اور چہرہ مزید لال گلاب ہوگیا۔

طارق کے اندر تو زندگی دوڑ گئی تھی وہ نگینہ کی ہر ہر ادا کا قاری تھا وہ نگینہ کا چہرہ پڑھ گیا تھا۔

''نگینہ تمہارا جواب ہاں ہے؟'' طارق پھر بھی پوچھے بِنا نہ رہ سکا۔

نگینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک دم اندر کو بھاگی لیکن اُس کا دوسرا ہاتھ تو طارق کی مضبوطً میں تھا۔ اُس کا سارا وجود طارق کی نظروں کی گرفت میں تھا، اُسے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا دُشوارا تھا۔

''طارق بھائی! پلیز ہاتھ چھوڑیں!'' اُس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ طارق تو جانے نشے کی کیفیہ تھا!

اپنی محبت کو پالینے کی، فتح کے نشے کی کیفیت! اُس کے چہرے پر بے حد جان دار مسکراہٹ تھی۔

طارق نے اُسے بہت نرمی سے اپنے قریب کیا اور اِس سارے دورانیے میں ایک بار بھی اُس نگینہ کے چہرے سے نہ ہٹی تھی۔ نگینہ تو یوں تھی، جیسے بدن میں جان نہ ہو اُس سے حرکت کرنا مشکل ہورہا تھا۔

طارق نے اپنے گلے سے موٹی سی چین اُتار کر نگینہ کو پہنادی۔

''یہ...؟'' نگینہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''دل تو میرا کرتا ہے کہ تمہیں ڈیک لگا کر پی جاؤں لیکن ابھی مجھے تمہارے حقوق اپنے نام کے لیے تھرو پراپر چینل جانا ہوگا۔'' طارق نے بے حد استحقاق بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہو ہی دِل میں سوچا۔

''یہ میری امی کی ہے انہوں نے مجھے میری سالگرہ پر اپنے گلے سے اُتار کر پہنائی تھی۔ تب تو کا بے اختیار ہوکر اِسے پہنانا سمجھ میں نہیں آیا تھا، لیکن آج تمہیں پہناتے ہوئے جان گیا ہوں پر بہت پیار آرہا ہے اور میں تم کو کچھ اپنا دینا چاہتا ہوں۔'' طارق بولا۔

''ہمارے دین کی حد مجھے تمہیں چھونے سے منع کرتی ہے ورنہ تو میرا اس وقت تمہارے وجود میں جذب ہونے کو دِل چاہ رہا ہے۔'' طارق کو خود پر بند باندھنا مشکل ہورہا تھا۔

نگی کے لرزتے لبوں پر پیاری سی مسکان آ کر ٹھہری، اُس نے بے حد نرم نگاہوں سے طارق پھر وہ تیزی سے بھاگتی اندر چلی گئی۔

طارق نے مسکراتے ہوئے اُس کے پیروں کی رفتار سے اُڑتے ہوئے چھینٹے دیکھے۔ اگر آ پر برکھا تھی تو خوشی و اطمینان کی بارش اُس کے من پر بھی اپنی پھوار برسا رہی تھی۔ وہ بے حد خوش کے ساتھ اندر بڑھا جہاں ابّو اور احمد شاہ انکل اُس کا انتظار کررہے تھے۔ اُس کا دِل بے حد جھ آج کتنے دنوں بعد اُسے سب اُجلا اُجلا لگ رہا تھا۔

واقعی جب من پریشان ہو، اُداس ہو تو اُداسی اندھیرا بن کر سارے منظروں پر چھا جاتی ہے من خوش ہو تو ہر سو بہار ہی بہار نظر آتی ہے کون کہتا ہے کہ موسم چار ہوتے ہیں۔ موسم تو پانچ ہو پانچواں موسم تو من کا موسم ہوتا ہے جو ہر موسم پر حاوی ہوتا ہے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طارق کے من کا موسم بھی بے حد خوش گوار تھا۔ تب ہی تو اُسے دنیا نئی نئی لگ رہی تھی۔

❖❖ ○ ❖❖

ہاری ذرا سی توجہ نے
جانتے ہو کیا کیا ہے
مجھے میرے من میں
جدا کردیا ہے

ندگی اتنی خوب صورت بھی ہوتی ہے علیزے کو اِس سے پہلے احساس نہ ہوا تھا۔

امی نے اُسے موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ولی کے فون اُس کی آواز کا انتظار ا اُس کے لیے ایک بے حد قیمتی احساس تھا۔ اُسے یوں لگتا تھا، جیسے وہ ایک دم بے حد مال دار ہوگئی ی کی ڈھیروں ڈھیر محبتوں سے وہ مالا مال ہوچکی تھی۔ اِس وقت بھی اُس کا سارا دھیان موبائل کی لی جانب تھا۔ ویسے تو دو چاہنے والوں کے دِل کے تار ایسے ملتے ہیں کہ بِنا کچھ کہے سُنے ہی وہ دوسرے پر بیتنے والے پَل اور خیال جان لیتے ہیں لیکن اگر محبوب کی آواز بھی سننے کو مل جائے تو ن کا احساس دوبالا ہوجاتا ہے۔ یہ ہی کچھ علیزے بھی محسوس کررہی تھی۔

ظاہر تو وہ اسکول سے لائی بچوں کی کاپیاں چیک کررہی تھی لیکن اُس کی نگاہ بار بار اپنے سامنے رکھے بائل پر پڑتی۔ حالاں کہ یہ ولی کے فون آنے کا وقت نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی اُس کا دِل چاہ رہا تھا کہ ن آئے اور وہ ولی کی آواز سُن سکے۔

کوئی آپ کو اس قدر ارتکاز سے سوچے تو ہم اُس ارتکاز کے اثر میں ضرور آتے ہیں۔ سائنس نے ٹیلی پیتھی کا نام دیا ہے، جب کہ یہ تو دِلوں کے رشتے ہوتے ہیں، جو ایک کا وجود اپنے اندر جذب لیتے ہیں۔

اُسی پَل موبائل فون کی بیل بجی۔ اسکرین پر چمکتے نام نے علیزے کے چہرے پر بہت چمک دار راہٹ سجادی تھی۔ علیزے نے آگے بڑھ کر فون ہاتھ میں لے کر اوکے کا بٹن دبا دیا۔

''السلام علیکم!'' ولی کی آواز گونجی اور ہر روز کی طرح علیزے کے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔ نگاہ یوں ما ئی، جیسے ولی سامنے بیٹھا ہو۔

''السلام علیکم!'' ولی نے دوبارہ کہا۔

''السلام علیکم!'' جواباً علیزے نے دھیرے سے کہا۔

''پہلے میرے سلام کا تو جواب دے دو!'' ولی نے شرارت سے کہا۔

''جی وعلیکم السلام!'' علیزے کو ہمیشہ کی طرح گھبراہٹ نے گھیرا۔

''جانے اِس ساحر میں کیسا جادو ہے، جو میری زبان ہمیشہ اُس کے سامنے لڑکھڑا جاتی ہے!'' علیزے ل ہی دِل میں کہا۔

''سن خالہ اور خالو کیسے ہیں؟ بچے کیسے ہیں۔'' ولی نے پوچھا۔

''امی ابّو کی طبیعت بس مناسب ہی رہتی ہے۔ منزہ کی موت اور کاشف کی دوری کا غم اگر وہ نہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہیں تو بھی اُن کی آنکھوں سے ہر پَل جھلکتا ہے!"علیزے کا لہجہ ایک دم اُداس ہو گیا تھا اور یہ اُدا
ہزاروں میل دور بیٹھا ولی بے حد آسانی سے محسوس کر سکتا تھا۔

"علیزے! میں نے دراصل ایک بہت اہم بات کے لیے بے وقت فون کیا ہے۔ اُمید ہے تم حو
سے سنوگی اور سمجھ داری سے سارے معاملے کو سنبھالوگی۔" ولی نے کہا۔

ولی کی تمہید پر علیزے کا دِل مزید سہم گیا وہ منزہ کی موت کے بعد اپنے اعصاب کو بے حد کمزور
تھی۔ کسی بھی بُری خبر کو سننے کی اُس کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امی ابو تو دونوں ہر وقت کے بیمار آدمی تھے۔

"کیا کوئی بُری خبر ہے؟"علیزے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اوں...نہیں!

لیکن... اِن فیکٹ....اچھی خبر کچھ بُری ریسینگ میں ہے۔" ولی بھی اُس کی سہمی آواز سُن کر محتاط ہ
تھا اِسی لیے بے حد ہلکے پھلکے انداز میں مخاطب ہوا۔

"مطلب...؟"علیزے نے کان لگا کر سوال کیا۔ بہر حال ولی کے پاس کوئی اہم بات تھی۔

"مطلب یہ کہ کاشف مل گیا ہے!" ولی نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

"کہاں ہے؟"علیزے نے بے اختیار سانس خارج کیا۔ اس کا لہجہ بے حد مدھم تھا، ولی کچھ نہ
پایا۔

"طارق کا فون آیا تھا کہ کاشف مل گیا ہے لیکن وہ بُری طرح بیمار ہے اس لیے ہسپتال میں ہے۔"
نے کہا۔

"کہاں؟ کس ہسپتال میں ہے؟"علیزے نے بے حد سرد لہجے میں دریافت کیا۔ کاشف کے چہ
کے سامنے ہمیشہ منزہ کا خون سے لت پت وجود آ جاتا تھا۔ اس کی یہ بھول وہ لوگ کیسے معاف ک
گے۔

"فی الحال تو وہ اسلام آباد کے پی ایچ ٹی ہسپتال میں داخل ہے اور نیم بے ہوشی میں ڈاکٹرز نے
رکھا ہوا ہے۔ طارق اُس کے علاج معالجے کی پوری نگرانی کر رہا ہے اس معاملے میں تم لوگوں کو فکر ک
کی ضرورت نہیں۔

ہاں طارق بتا رہا تھا کہ وہ بے حد بیمار ہے، اس لیے اُس کے لیے دعا بھی کرو اور خالہ خالو کو دھ
دھیرے اُس کی واپسی کے لیے تیار کرو۔ یہ نہ ہو کہ ایک دم خوشی حسن خالہ کے لیے نقصان دہ ثابت
ولی نے بُردباری سے کہا۔

"جی اچھا!"علیزے نے سرد آہ بھر کر جواباً کہا۔

اگر وہ اپنی بہن کا خون کاشف کو معاف نہیں کر سکتی تھی تو اپنے بھائی کو بھی بھول نہیں سکتی تھی۔ اگر
اُس سے خفا تھا تو اُس کی گمشدگی پر، پریشان بھی تو رہتا تھا۔ بہر حال اُس کے ملنے کی اطلاع نے
کچھ سکون بخشا تھا۔

"علیزے! کیا تم سن رہی ہو؟" اس کی طویل خاموشی پر ولی بولا۔

"ہاں جی!"علیزے اِس وقت خاصی ڈسٹرب تھی۔

"علیزے مجھے بہت عرصے سے ایک سوال تنگ کر رہا ہے اُمید ہے تم مجھے اِس کا تسلّی بخش جواب
دو۔" ولی نے کہا۔

"جی پوچھیے!"علیزے نے غائب دماغی سے جواب دیا۔

"یہی کہ منزہ کی موت کے دن سے اب تک کاشف ہم سب سے کیوں چھپتا پھر رہا ہے، اُس نے
کیا کیا، جو اتنے عرصے سے روپوش ہے؟" ولی کے سوالوں کے جواب دینے کا مطلب تھا کہ اس راز
سے پردہ اُٹھ جاتا کہ منزہ کا قتل کاشف ہی نے کیا تھا۔ بے شک ولی اُس کا محرم دِل تھا وہ اُسے سب کچھ
بتا بھی دینا چاہتی تھی لیکن ولی طارق کا دوست بھی تھا اور پولیس سے وہ ساری سچائی چھپا گئے
علیزے سے واقعی فوراً کوئی جواب نہ بن پا رہا تھا۔

"علیزے! چپ کیوں ہو، کیا میری کوئی بات بُری لگی، دراصل یہ سوال مجھ سے طارق نے کئی بار
پوچھا ہے۔ وہ پولیس کا بندہ ہے نا، اس لیے ہر معاملے کی تہہ کو کھوجتا ہے ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے
کہ تم مزید پریشان ہو۔"علیزے کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے ہو گئے وہ کتنا اچھا تھا کبھی
بھی راستے میں نہ کھڑا کرتا تھا، کبھی مشکل نہ دیتا تھا ہمیشہ آسانیاں ہی بانٹتا تھا۔

"تھینکس ولی! آپ اتنی دور بیٹھ کے بھی ہمارے سارے مسئلے حل کرتے ہیں!"علیزے نے دِل سے
ممنون ہو کر کہا۔

"اوں، ہوں! آئندہ یہ تھینک یو کا ڈنڈا میرے سر نہ مارنا! یار میں نے بہت پہلے بھی کہا تھا کہ تمہارے
سارے دُکھ میرے اور میرے سارے سُکھ تمہارے... پھر کیوں ایسے بولتی ہو۔" وہ اُسے ہر پَل معتبر کرتا
تھا۔

خوشی و تشکر سے علیزے کی آنکھیں جھلملا گئیں...

"او کے! میں اب فون بند کرتا ہوں، تم ذرا کاشف کی خبر حسن خالہ کو دوپہر میں طارق سے کہہ کر تم
لوگوں کی کاشف سے ملاقات بھی کروا دیتا ہوں۔ او کے اللہ حافظ؟"

"جی! اللہ کے سپرد۔ اللہ کی امان میں!"علیزے نے دعا دی۔

"اچھا فون بند کرو۔" ولی نے کہا۔

"نہیں آپ پہلے رکھیں!"علیزے نے کبھی ولی کی کال خود ڈسکنیکٹ نہ کی تھی، وہ خود سے کبھی رابطہ
بھی نہ کرتی تھی۔ ولی کو اُس کی یہ ادا بے حد خاص اور اچھی لگتی تھی۔

"او کے اللہ حافظ!" ولی نے مسکرا کر فون بند کیا۔

جب کہ علیزے نے اپنی گود میں رکھی اسکول کی کاپیاں سائیڈ پر رکھیں اور جسم ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں
موند کر بیٹھ گئی۔

"تو کاشف تم آخر آ ہی گئے! لیکن تم ہمارا اور ہم تمہارا سامنا کیسے کریں گے، کیا منزہ کا خون سے لت
پت وجود ہمارے بیچ سے نکل سکتا ہے؟

اے پیارے بھائی تم نے یہ کیا کیا؟ کیسا ظلم کمایا!

کبھی بھی رشتوں کو کھینچ کر اُس "حد" کے پار نہیں لائے، جہاں محبت اور نفرت کی سرحدیں مل کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خالص جذبات میں ملاوٹ کر ڈالیں۔ بس ایک... صرف ایک کانٹے کی طرح چبھتا احساس رہ پل پل دُکھ دیتا رہے!" دو آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل کر اُس کے دامن میں جذب ہو گئے، وہ پہلے دِل کو اور خود کو کاشف کی واپسی کے لیے تیار کر رہی تھی تب ہی امی ابو کو تیار کر سکتی تھی نا۔"

❖❖○❖❖

کیفے میں مدھم لیکن رنگین روشنیوں کی حرکت مختلف چہروں پر مسلسل تھی۔ جب جب لال، پیلی روشنی چہروں پر پڑتی تو کچھ چہرے بے حد بھیانک نظر آتے۔ ترنم نے اپنے سامنے بیٹھے مرکزی اطلاعات کو دیکھا، جو مسلسل ڈرنک پر ڈرنک کر رہا تھا۔

"کم بخت جب تک چڑھتی محسوس نہیں ہوتی، مزہ نہیں دیتی!" اُس نے ہنستے ہوئے اپنے سگریٹ سے پیلے پڑے دانت نکوسے۔

"بالکل رشید صاحب! واقعی مزہ چکھنے میں ہے، جلد ہی آپ کو بھی مزہ آ جائے گا۔" ترنم نے اسے دیکھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ وہ سلیولیس بلیک میکسی میں ملبوس تھی اور قیامت لگ رہی تھی۔

"ڈانس! کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرو گی؟" وزیر نے کچھ آگے بڑھ کر ہاتھ آگے کیا۔

"اس کو چڑھ گئی ہے اب یہ بندر ضرور ناچے گا..."

ترنم نے بیزاری سے کہا۔

"کیا بولتی تم؟" وزیر نے اُس کے ہلتے ہوئے لب محسوس کیے تھے۔

"بکواس کر رہی ہوں، کیا آپ سنیں گے؟" ترنم نے ایک دم بھڑک کر کہا۔

"اوئی۔ تیری یہی ادائیں ہیں، جو مجھے تیرے پاس لاتی ہیں، قسم خدا کی تم مجھے ورلڈ ٹور پر لے آئی۔ تمہاری یہ بکواس سننے کو میں راگنی کو ڈبل پیسہ بھرا۔ کم بخت بہت منہ پھاڑ کر مانگتی ہے۔" وزیر نے ترنم کو یوں لاڈ سے دیکھا، جیسے اُس نے وزیر کو بہت اچھی بات سنائی ہو۔

ترنم نے ایک بے بیزار اور تیکھی نگاہ اُس پر ڈالی۔

"مگرمچھ کا مگرمچھ۔ بُرے کرتوت اُس کے چہرے پر ثبت ہو گئے تھے، مکروہ چہرہ!" ترنم کو ابکائی آئی۔ اُس نے اپنی توجہ بٹانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

"اچھا اگر ڈانس کا موڈ نہیں تو کچھ سنا ہی دو!" ایک نئی فرمائش آئی۔ اکثر کسٹمر اُسے کال گرل کے ساتھ ساتھ طوائف کا درجہ بھی اعزازی دیتے تھے، ساتھ ناچنے کے علاوہ گانا سننے کی فرمائش عام تھی۔ پڑھا لکھا طبقہ غزل کی فرمائش کرتا تھا لیکن اندر سے سارے کسی تہلکہ خیز مجرے کی امید کرتے۔ ترنم کو ان کی ایسی فرمائشیں زہر لگا کرتی تھیں اُس کا فشارِ خون مزید بڑھ جاتا تھا۔

"یہاں پر! رشید صاحب یہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی، اتنے میوزک اور شور میں آپ کو میری آواز کیسے سنائی دے گی؟" ترنم نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"ویسے اتنے میوزک کو سننے کے بعد بھی کچھ سننے کی حسرت ہے؟"

"تو تیرا کیا خیال ہے کہ میں اتنی حسین رات یہاں بیٹھ کر خراب و برباد کرے گی۔" رشید صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"م تیرے کو اندر سویٹ میں لے کر چلتے ہیں نا! وہاں تجھے گھونٹ گھونٹ پئیں گے اور تجھے سنیں گے

"چل۔" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا لیکن ایک دم لڑکھڑایا اُسے نشہ چڑھ ہی گیا تھا۔

ترنم کو لیے بڑے سے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ ہنی مون سویٹ کہلاتا تھا اور بے حد لگژری تھا لیکن ی جہنم سے کم نہ لگ رہا تھا۔

یا میرے اللہ! پھر وہی کچھ! جانے مجھے اتنا سہنے سے پہلے موت کیوں نہیں آتی۔ اگر مجھے نہیں آتی تو ں کو بھی تو نہیں آتی!" ترنم نے سامنے بنے شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوئی! تم ابھی تک وہاں ہی کھڑی ہے! ارے بابا میرے پاس آؤ یہاں میرے ساتھ!" رشید ب نے اپنے پاس اُسے بلایا۔

م سڑتی کڑھتی اُس کے پاس جا بیٹھی۔

"اوئی! یہ تم کو ہم کوئی مہمان بنا کر لایا ہے۔ اری ادھر میرے نزدیک بیٹھو نا!" رشید صاحب نے ت سے ہنستے ہوئے کہا جیسے انہوں نے بڑا جوک مارا ہو۔ ترنم کا دل چاہا اُس کا سر پھاڑ دے۔

"زمین کا عذاب، کم بخت، اللہ کرے تو مر ہی جائے۔" وہ بڑبڑائی۔

"ہاں اب کچھ سناؤ!" رشید صاحب نے اُس کی کمر کے گرد اپنا مضبوط بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

م کو لگا، جیسے کوئی سانپ اُس کے گرد لپٹ گیا ہو۔

"اوئی بول بھی نا! تیری آواز میں جادو بھی تیری طرح ہے!" اُس نے ترنم کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے کہا، اُس کا بھاری بھرکم ہاتھ ترنم کے ہاتھ کو دبوچے ہوئے تھا۔

جو بھی ارماں حیات میں ہے
آج تو دامِ ممکنات میں ہے!

م دھیرے سے کہتی خود کو چھڑاتی سامنے بنے شیشے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ سامنے اُس کا ہی عکس والہ بنا نظر آ رہا تھا۔

م نے ایک دُکھ بھری نگاہ اپنے عکس پر ڈالی۔ ایک وقت تھا کہ اِس عکس کو اُس کی ماں کتنا چھپا چھپا رکھتی تھی۔ اور اب!

جو بھی ارماں دِل حیات میں ہے
آج تو دامِ ممکنات میں ہے!
کل نہ معلوم کیا سے کیا ہو جائے
کل کا مفہوم کیا سے کیا ہو جائے
اُلجھے اُلجھے اجل کے دھارے سے
جا کے ٹکرائیں کس کنارے سے
کس نشیمن میں، کس ٹھکانے، کہاں...؟
اپنی منزل ہو پھر نہ جانے، کہاں...؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترنم کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی اُسے لگا کہ وہ مزید نہ بول پائے گی۔ اُس کے حلق میں کا
چبھنے لگے تھے اُسے پانی کی شدید طلب ہوئی تھی۔ اُس نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو رشید صاحب
آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ننگے سینے کو مسلسل مسل رہے تھے۔

ترنم کو کسی غیر معمولی پن کا احساس شدت سے ہوا۔

اب رشید صاحب کرسی سے گر کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

''خان صاحب! خان صاحب کیا ہوا؟'' ترنم نے رشید صاحب کو سیدھا کر کے پوچھا۔

''اوئی! امارے سینے میں بہت درد ہے!'' وہ کراہ کر بولے۔

''اوہ! میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔'' ترنم نے اپنا موبائل اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''اوئی نہیں یارا! تم میرے پی اے کو فون کرو وہ کسی اعتبار کے ڈاکٹر کو بلائے گی!'' رشید صاحب
اتنی تکلیف میں بھی احتیاط لازم رکھی۔ اس کمرے سے باہر کی دنیا میں وہ ایک بہت باکمال اور اصول
وزیر کہلاتے تھے۔ رات کے اس پہر کوئی بھی ڈاکٹر ان کو اس ہوٹل میں چیک کرنے آتا تو یقیناً
ساری باتیں بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس لیے اتنی تکلیف میں بھی احتیاط ملحوظ خاطر تھی۔

ترنم نے فوراً رشید صاحب کے پی اے کو فون ملا کر صورتِ حال بتائی، پھر زمین پر گرے رشید صا
کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ بے حد فکر مندی سے اُن کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ اُسے فوری طبّی امداد نہیں دینی آتی تھی ورنہ وہ
جاتی کہ رشید صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اُس نے خود ہی اس شخص کی موت کی تمنا کی تھی اور اب اُس کو بچانے کے
مسلسل کوششیں کر رہی تھی۔

''خان صاحب! اِدھر اوپر بیڈ پر لیٹو!'' وہ بہ مشکل خان صاحب کے بھاری بھرکم وجود کو گھسیٹ کر
آئی۔ وہ تو شکر تھا کہ بیڈ ایک ڈیڑھ قدم کی دوری پر تھا ورنہ وہ شاید یہ نہ کر پاتی۔

''یہ پانی پی لیں!'' اُس نے سہارا دے کر خان صاحب کو پانی پلانے کی کوشش کی لیکن رشید صا
تکلیف سے بے حال ہو رہے تھے۔ پانی کا وہ گھونٹ نہ بھر سکے، گلاس چھلک کر دور جا گرا۔

رشید صاحب کی آواز ایک دم غراہٹ میں بدل گئی۔ وہ زور زور سے چیخنے لگے تھے۔

''خان صاحب کیا ہوا؟'' ترنم نے گھبرا کر پوچھا۔ بہر حال اُس میں ابھی تک انسانیت باقی تھی۔

''اوئی! یہ... یہ بلائیں میرے سینے پر چڑھ گئی ہیں!''

وہ کہہ رہے تھے۔

''خان صاحب ہوش میں آئیں۔ کون سی بلائیں؟'' ترنم نے گھبرا کر کہا۔

''اوئی! یہ امارے کو مارتی ہیں!'' ساتھ ہی وہ اپنے بیڈ سے دو دو فٹ اُچھل کر جھٹکے کھانے لگے،
اُن کو بجلی کے کرنٹ لگ رہے ہوں۔ اُن کے گلے سے عجیب غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

ترنم گھبرا کر پیچھے جا کھڑی ہوئی، لیکن بعد میں اُسے خیال آیا کہ خان صاحب کی مدد کرنی چاہیے۔

''خان.. خان صاحب آپ کو کیا ہوا ہے؟'' وہ بے اختیار پوچھ رہی تھی۔

''یہ بڑی بڑی بلائیں میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھی ہیں، اُچھل رہی ہیں آہ! میرا سینہ پھٹ جائے گا ان
...ہ سے...'' وہ تڑپے۔

''یہ... یہ میرا کلیجہ کھا جائیں گی!'' وہ غراہٹ بھری آواز میں بولے۔

...م نے سہم کر خان صاحب کی جانب دیکھا۔

...ترنم کی گھگھی بندھ گئی۔ خان صاحب کا مشکل وقت اُس پر بیتنے لگا تھا۔

''استغفر اللہ!'' ترنم نے بے اختیار استغفار کی تھی۔

...ید صاحب کی چیخ پکار اس قدر ڈراؤنی تھی کہ ترنم کو لگا اُس کا خود کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

''یہ بلائیں، یہ اتنی ساری بلائیں میرا کلیجہ کھا...'' خان صاحب غراہٹ نما آواز میں بولے پھر اُن کی
...یں اوپر کو ساکت ہوئیں اور گلے سے ایسی آواز نکلنے لگی، جیسے اُن کے گلے پر کسی نے پیر رکھ دیا ہو۔

...ں نے چار فٹ جتنا جھٹکا کھایا اور جسم ساکت ہو گیا۔

...م سہمی نظروں سے دیوار کے ساتھ لگی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے ڈرتے ڈرتے
...گے بڑھ کر خان صاحب کو دیکھا۔

''یا میرے خدایا! یہ تو مر گیا ہے!'' ترنم نے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہوتے ہوئے کہا۔

...بھی باہر کمرے کی ڈور بیل ہوئی، ترنم نے لپک کر دروازہ کھولا۔ رشید صاحب کا پی اے ڈاکٹر کے
...ساتھ تیزی سے اندر بڑھا۔

''اوہ میرے خدایا!'' پی اے کا ترنم کی طرح بُرا حال تھا۔ اُن میں فرق صرف اتنا تھا کہ ایک خوف
...اور دوسرا اپنے روزگار کی محرومی کی وجہ سے گھبرایا ہوا تھا۔

''...بی بی! صاحب کے سانس تو نہیں ہیں!'' پی اے نے زبان ہونٹوں پر پھیر کر کہا۔

''ہاں! شاید!'' ترنم کی آواز بہ مشکل نکلی۔

''اب؟ اب کیا کریں؟ صاحب تو مر گیا!'' پی اے نے پوچھا۔

''اب ان کو سیدھا ہسپتال لے جاؤ۔ اس طرح اخبار والے یہ ہی چھاپیں گے کہ ہسپتال میں آ کر
...ہوئی ہے۔'' ترنم نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور اپنی Black شال اُٹھا کر اپنے اِرد گرد لپیٹی۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔ تم ان کے گھر والوں کو اطلاع دے دو۔'' وہ ان سب کو چھوڑ کر
...کل آئی۔ ترنم کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ بہ مشکل لفٹ تک آئی۔

اس نے لفٹ میں داخل ہو کر لفٹ کی دیوار سے ٹیک لگا دی۔ چاروں طرف قد آدم شیشوں میں اُس کو
...س نظر آیا۔ ترنم کو اپنا عکس نہایت ناپسند تھا، اُس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

''یس میم!'' لفٹ کیئر نے شائستگی سے پوچھا۔

''گراؤنڈ فلور!'' ترنم نے کہہ کر لمبے لمبے سانس لے کر خود کو متوازن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن! لیکن
...خان صاحب کی پھٹی پھٹی آنکھیں ذہن کے پردے پر لہرانے لگیں تو اُس نے جھٹ سے آنکھیں کھول
...

...اؤنٹر پر منیجر نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ اتنی جلدی واپس کیوں جا رہی تھی؟ وہ لپک کر آگے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑھا۔

''میڈم! واپس جائیں گی آپ...؟''

''کیوں آپ کو کیا لگتا ہے میں یہاں ٹہلنے کے لیے نکلی ہوں!'' ترنم نے اپنی ٹینشن اُس پر نکالی۔

''سوری میڈم! اگر آپ کو بُرا لگا ہے۔'' منیجر نے فوراً معذرت کی، اُس کا دماغ خراب نہیں تھا کہ اِن خاص لڑکیوں کی ناراضی مول لیتا جو صرف اور صرف اپر کلاس کو سرو کرتی تھیں اور شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح پروٹوکول وصول کیا کرتی تھیں۔

''میں.. میں آپ کی گاڑی لگواتا ہوں!'' وہ کہہ کر تیزی سے واپس مُڑا۔ ترنم چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر لے کر آئی۔ اُس کی گاڑی فوراً اُس کے پاس آ کر رُکی، جب وہ بیٹھنے لگی ریسکیو والوں کی خوب صورت ایمبولینس بھی ساتھ آ کر رُکی۔ بھاگتے دوڑتے بوٹوں کی آواز وہ با آسانی سُن سکتی تھی۔

ترنم کا سر درد سے پھٹنے کو تھا۔

''کہاں چلنا ہے بے بی؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''ابھی تو تم فوراً یہاں سے چلو۔'' ترنم نے بیزاری سے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی!'' ڈرائیور بھی سمجھ دار تھا، اُس کی ناراضی دیکھ کر فوراً بولا۔

ترنم نے تھک کر سر سیٹ کے ساتھ ٹکا دیا۔ دو آنسو آنکھوں سے نکل کر اُس کی صراحی دار گردن پر آ گئے تھے۔

دور کہیں بہت دور سے اُسے آوازیں سنائی دی تھیں پھر یہ آوازیں دھیرے دھیرے واضح ہونے لگیں...

''مومن بندے کی جان ربّ سوہنا اُس کے جسم سے یوں نکالتا ہے، جیسے بھری مشک کا منہ کھول دیا جائے تو پانی بہ آسانی باہر نکل آتا ہے! لیکن بُرے آدمی کی جان ایسے نکلتی ہے، جیسے خار دار جھاڑی اُلجھ کر دُکھ و تکلیف دے کر نکلے اور اندر لیروں لیر کر ڈالے۔ بُرے آدمی کی روح سات زمین نیچے دوزخ میں لے جائی جاتی ہے اور اُس کی روح ڈراؤنی شکل والے دوزخ کے فرشتے لینے آتے ہیں۔ اُس کا نامہ اعمال ''سجین'' میں رکھا جاتا ہے۔'' لتاں کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

کتنی کم تعلیم یافتہ یا پھر بالکل بھی پڑھی لکھی نہ تھی اُس کی ماں لیکن کتنا سچ اور کتنا کچھ جانتی تھی وہ...

آج ترنم نے خان صاحب کا نزع کا عالم دیکھا تھا۔

جتنی اُن کو تکلیف تھی وہ واقعی بہت خوف ناک تھی۔ تکلیف سے وہ دو دو فٹ اونچے جھٹکے کھاتے تھے۔ گناہ گار کے نزع کا وقت وہ دیکھ آئی تھی۔

''موت! موت کی تکلیف اِس قدر ہے تو موت کے بعد کیا ہوگا؟'' ترنم کا سارا وجود پسینے سے بھیگ گیا۔

خان صاحب پیتے پلاتے، ناچتے گاتے مزید گناہ کے لیے پُر جوش بیٹھے تھے۔ دور دور تک کوئی امکان نہ تھا کہ وہ مر جائیں گے! خود اُن کو بھی مرنے سے پہلے یقین نہ ہوگا۔ وہ تو شاید یہ ہی سمجھتے رہے تھے

PAKISTANIPOINT

...پھ ہمیشہ کی طرح یوں ہی سدا چلتا رہے گا... لیکن آخر موت سر پر آن پہنچی اور گیم اِز اوور کا سگنل ...ا اب صرف اس گیم میں حاصل کیے اسکور کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔

...م ایک دم ہچکیوں سے رونے لگی۔

...ا یور نے بیک ویو مرر سے پیچھے دیکھا۔ لیکن اُس نے مداخلت کی کوشش نہ کی تھی۔ آخر وہ میڈم ...ال ...ز ینڈ ڈرائیور تھا۔ پھر وہ اکثر دیکھتا آیا تھا کہ جب یہ نیلی پیلی پریاں ڈرنک کر کے آتی تھیں تو ...ئے میں اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی تھیں۔

...ا یور کو ہدایات تھیں کہ لڑکیوں سے زیور اور کیش فوراً لے کر سنبھال لے۔ پھر لڑکی چاہے ہنسے، ...گائے یا ناچے اُس کی بلا سے...

...اں لی ڈیوٹی تھی کہ وہ لڑکی کو حفاظت سے اُس کے مقام پر پہنچا آئے۔

...ے بی کدھر جانا مانگتا...؟ رات ابھی باقی تھی یہ لڑکیاں تو صبح کے وقت ہی اپنے ٹھکانے پر اُترتی ...اں لیے اُس نے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

...مے... مجھے یہ کپڑے فوراً بدلنے ہیں! کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟'' ترنم کو اپنے ننگے لباس سے کوفت ...ی۔

...ے بی اس وقت تو ہر طرح کا اسٹور اور بوتیک بند ہو چکا ہوگا... رات کے پونے دو بج رہے ...'' ڈرائیور نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

...اپ کو کس قسم کا لباس درکار ہے؟'' ڈرائیور کو اُس کا لباس بدلنے کا پرابلم سمجھ نہ آ رہا تھا۔

...ہں...!'' ترنم سوچ میں پڑ گئی۔ آیا وہ اپنے دِل کی بات اُس سے شیئر کر سکتی ہے یا نہیں لیکن پھر کچھ ...ر بولی۔

...مے! مجھے نماز پڑھنی ہے!'' ڈرائیور کو شاید بجلی کا جھٹکا لگا تھا، تبھی بے اختیار اُس کے پیر ایک دم ...جا پڑے۔ تیز رفتار گاڑی اچانک جھٹکے سے جا رُکی تھی وہ تو شکر تھا کہ سڑک خالی تھی ورنہ شاید ...ٹ ہو جاتا۔

...یوں! کیا کسی کال گرل کا مذہب نہیں ہوتا؟'' ترنم تو ویسے ہی بھری بیٹھی تھی اُس کی اس حرکت اور ...ل کر حیرت کے اظہار پر اُلٹ ہی تو پڑی تھی۔

...ا ہر کے ممالک میں جتنی بھی پیشہ ور لڑکیاں ہیں، وہ ہر اتوار چرچ جاتی ہیں۔ اپنے گناہ کم کرنے ...اپنے سکون کے لیے... پھر ہمارے لیے اس طرح کے ردِ عمل کی وجہ؟'' ترنم نے اُسے یوں چپ ...تے دیکھ کر بھڑک کر کہا۔

...نہیں بے بی! وہ بات نہیں ہے!'' ڈرائیور نے گاڑی اِسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

...دراصل ہمارے مذہب میں تو ایسے کام کی سرے سے اجازت ہی نہیں ہے اور جو دین اسلام مانتا ...لمان کہلانے کا حق بھی اُس کا ہے۔

...مارا مذہب جس کام سے روکے اُس سے رُکنا چاہیے اور جس کام کے لیے حکم دے اُس کو ماننا چاہیے ...ایسا نہیں ہے تو کوئی کہاں کا اور کیسا مسلمان؟'' ڈرائیور کا لہجہ جھلسا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے ہی دیکھ لو بے بی! اچھا خاصا، سیدھا سادا بھولا بھالا انسان تھا، جب گاؤں سے آیا۔ پا[illegible] اور ماں بہنوں کی ذمّے داری نے دلالوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اب یہ دلالی کیا جائز ہے!

اب نماز برائیوں سے روکتی ہے! جب میں نماز کی خاطر برائی سے رُک نہیں سکتا تو میں اپنے کما[illegible] میں کیا ڈال رہا ہوں! کم بخت اِس منحوس پیٹ نے نہ دین کا رہنے دیا نہ دنیا کا رہنے دیا!" ڈرائیو[illegible] گاڑی ایک کچی بستی میں لا کھڑی کی، جہاں کوئی بھی اسٹریٹ لیمپ روشن نہ تھا، ہر طرف گھور اندھیرا[illegible]

"زندگی میں روشنی کی اُمید ختم ہوجائے تو ایسے ہی گھور اندھیرے دِلوں میں بس کر انسان کو ہمیشہ لیے ویران اور بدقسمت بنا دیتے ہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اُترا۔ ترنم نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا[illegible] اُسے کہاں لے آیا تھا۔

"یہاں میری میری منکوحہ رہتی ہے! گھر والے چاہتے ہیں کہ میں پہلے اپنی چھ بہنوں کی شادی[illegible] دھام سے کروں، پھر جا کر اپنے سر پر سہرا سجاؤں! اور... اور اگر میرے دِل اور جسم کو طلب ہو[illegible] ضرورت کہیں سے بھی پوری کرلوں لیکن شادی چھ بہنوں کی شادی کے بعد... کیوں کہ اُن کو ڈر[illegible] میری کمائی میں بٹوارہ ہوجائے گا... کیسا ظلم ہے نا! اپنے فائدے کے لیے راہ جاتے انسان کو زانی[illegible] جائے۔" ڈرائیور ترنم کو لیے ایک بوسیدہ سے گھر کے سامنے جا رُکا۔

"میں اگر یہاں کام نہ کرتا اور بُرائی اور اُس کے نقصانات کو اتنے قریب سے نہ دیکھتا تو اپنی ضر[illegible] کے لیے کہیں بھی منہ ماری کرلیتا۔ کم بخت طوائفیں! یہ سی کلاس طوائفیں ہمارے جیسے غریب اور مڈل[illegible] کے لیے خدمات انجام دے رہی ہیں۔" اُس نے ایک موٹی سی گالی دی، ترنم کو لگا، جیسے یہ گالی اُس[illegible] اُسے ہی دی ہو!

اِک عجیب سا توہین بھرا احساس تھا۔

"ایک رات میں اتنے مرد بھگتاتی ہیں کہ کیا کتیا بھی!" اُس نے موٹی سی گالی دے کر درواز[illegible] زنجیر بجائی۔

"جتنے مردوں کا ساتھ اتنی ہی بیماریاں ان طوائفوں کے ساتھ سزا کے طور پر منتقل ہوجاتی ہیں[illegible] دھیرے دھیرے یہ ہر شخص کو اپنے عذاب میں شریک کرلیتی ہیں۔ میں نے اِس عذاب اور تکلیف[illegible] بچنے کے لیے الگ گھر لے کر بیوی رکھ لی... جب وقت آئے گا تو بتا بھی دوں گا" ترنم اُس کی تڑتڑ[illegible] زبان کو سُن کر جان گئی کہ بھولے سے اُس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ اور یہ چھتہ بہت بُری[illegible] چھڑ بھی گیا تھا۔

دروازہ کھولنے والی اٹھارہ اُنیس سال کی ایک سانولی سی لڑکی تھی۔

"کتنی بار کہا ہے دروازے کھولنے سے پہلے پوچھ لیا کر۔" ڈرائیور نے اپنی بیوی کو دیکھتے ہی ڈا[illegible] پلا دی۔

"تیری گاڑی کی آواز پر میرا سارا دھیان ہوتا ہے۔" اُس نے بُرا منائے بغیر کہا اور پھر بولتے بو[illegible] رُک گئی۔

"یہ کون... یہ کون ہے؟" وہ اپنے سانولے سلونے شوہر کے ساتھ پریوں جیسی اِس خوب صورت[illegible]

[illegible] دیکھ کر بے حد حیران ہوئی تھی اور ترنم کے رعب حسن سے متاثر بھی ہوئی تھی۔

"اللہ کتنی سوہنی ہے! اندھیرے میں بھی لائٹیں مار رہی ہے!" اُس نے ترنم کو دیکھ کر دِل ہی دل میں [illegible]ہا

"چل پہلے رستے سے تو ہٹ!" ڈرائیور نے اُسے پرے کر کے ترنم کے لیے راستا بنایا۔

[illegible]رنم کچھ ہچکچاتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ گھر بہت بڑا نہ تھا۔ صرف ایک کمرا ایک برآمدہ اور برآمدے [illegible] آخر میں رکھا باورچی خانے کا سامان اور کچھ تھوڑا سا آنگن تھا۔ پورے چاند کی روشنی اِس قدر زیادہ [illegible] کہ صحن میں انرجی سیور لگا محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ ہماری مالکن ہیں! جاؤ ان کو اندر لے جاؤ اور جس چیز کی ضرورت اِن کو ہو، وہ لا دو۔" ڈرائیور صحن [illegible] بچھی چارپائی پر تکیہ رکھ کر بولا۔ اُس کا ارادہ تھا، جب تک میڈم اپنا مسئلہ حل کرتی ہیں، تب تک وہ [illegible] کچھ کمر سیدھی کرلے۔

"رانی! کیا کھڑی ٹکر ٹکر میرا تھوبڑا دیکھ رہی ہے۔ بیگم صاحبہ کو اندر لے جا..." ڈرائیور نے دبک کر بیوی [illegible]کہا جو حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔

"اِٹس اوکے! میں خود چلی جاتی ہوں۔" ترنم نے بہت دھیرے سے رانی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کا راستہ [illegible]لیا، جیسے وہ یہاں مہمان نہیں میزبان ہو۔

[illegible]م عمر رانی! وہ تو اتنی خوب صورت لڑکی دیکھ کر اپنے حواسوں میں نہ تھی بس گم سم، ٹکر ٹکر ترنم کو دیکھے جا رہی تھی۔ ترنم کو اُس کا تسلسل سے دیکھنا عجیب سا لگ رہا تھا۔

"وہ... رانی مجھے تمہاری کوئی شلوار قمیص مل جائے گی۔" ترنم نے گلا کھنکار کر پوچھا۔

"آں۔ ہاں باجی! کیوں نہیں!" رانی ایک دم ہوش میں آ گئی پھر وہ بے حد پھرتی سے اپنی پیٹی پر [illegible] صندوق کو اُتار کر نیچے بیٹھ گئی اور بے حد شوخ کپڑے نکال کر ترنم کے سامنے رکھنے لگی۔ یہ اُس کا [illegible] کے لیے بے حد پروٹوکول تھا۔

وہ اپنے عزیز، جھلمل کرتے کپڑے جو اُس نے اپنے شوہر سے فرمائشیں کر کر کے لیے تھے بے حد دیا لو [illegible] اُس کے سامنے رکھ رہی تھی۔ وہ اس قدر معصوم تھی اس نے ایک بار بھی کوئی سوال نہ کیا تھا۔

"یہ... یہ والا لے لو!" اُس نے اورنج اور آتشی رنگ کا چنگاڑتا ہوا سوٹ اُس کے سامنے لہرایا۔ ترنم کو [illegible] کی معصومیت بہت پیاری لگی، وہ دُکھی سی ہنسی ہنس دی۔ اُسے کیا بتاتی کہ اُس کی ذات تو ایسی سیاہ کار، [illegible] چوس، رنگ چوس بن گئی ہے کہ اُس کے لیے تو بس ایک کالا لباس باقی رہ گیا تھا۔ اُس کی ذات کی [illegible] نے ہر رنگ چوس ڈالا تھا۔

"نہیں رانی!" ترنم نے نرمی سے انکار کیا۔

رانی بے چاری کا پریشانی سے چہرہ اُتر آیا تھا۔ "پھر باجی یہ... یہ والا لے لو!" رانی نے ایک اور سوٹ [illegible] لہرایا۔

"نہیں رانی! مجھے کوئی سادہ سوتی سوٹ چاہیے کیا تمہارے پاس ہے؟" ترنم نے نرمی سے پوچھا۔

"ہاں! لیکن وہ تو پرانا ہے!" رانی نے پریشانی سے کہا۔ اتنی بڑی بیگم جو اتنی شان دار لگ رہی تھی اُس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ی کالے رنگ کی میکسی جانے کس کپڑے کی تھی دور سے ہی بے حد نفیس اور بے حد قیمتی لگ رہی تھی اُسے اُس کے سادے سے کاٹن کے جوڑے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔

''کیا ہے؟'' ترنم نے اپنا سوال دُہرایا تھا۔

''جی..جی ہاں!'' وہ فوراً ہی ایک سادہ سا بے رنگ جوڑا لے آئی۔

''یہ..یہ آپ کے قابل نہیں ہے!'' رانی بے اختیار بول اُٹھی۔

''تم کیا جانو رانی! میں تو کسی بھی چیز کے قابل نہیں ہوں، یہ تو بہت زیادہ ہے!'' ترنم دِل ہی دِل م بولی۔

''نہیں! یہ ہی ٹھیک ہے!'' ترنم نے جوڑا پکڑ کر اپنے گرد سے شال ہٹائی۔

رانی کو لگا خوشبو اور روشنی کا کوئی طوفان ہے، جو ایک دم برپا ہوگیا تھا۔ ترنم کا بے حد خوب صور وجود اُس کے حواس معطل کر گیا تھا۔ عورت ہو کر اُس کا یہ حال تھا تو ترنم تو مردوں کا پانی پتہ کر دیتی ہو رانی آنکھیں پھاڑے یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔

''میں کہاں بدلوں کپڑے؟'' ترنم کے سوال نے اُسے چونکا دیا۔

''یہ اِدھر ہی بدل لو میں باہر چلی جاتی ہوں۔'' رانی حواس باختہ سی باہر نکلی۔

''ہائے ربا! کیا کوئی اتنا بھی خوب صورت ہوتا ہے کہ دِل ہی رُک جائے!'' رانی کی چھوٹی سی دنیا م وہ پہلی اور آخری لڑکی تھی، جو اتنی خوب صورت تھی۔ بھلا اُس نے کہاں ایسے چہرے، ایسے وجود د رکھے تھے۔

ترنم نے بے حد سُرعت سے لباس بدلا، وہ اِس ننگے لباس کو مزید برداشت نہ کر پا رہی تھی، جو سا کی طرح لپٹے اُسے ڈس رہا تھا۔

رانی کا لمبا ڈھیلا لباس بے حد بے ہنگم تھا لیکن ترنم کو لگا اُس کی ننگی روح کو پہلی بار لباس میسر آیا رانی ہاتھ میں ٹرے اُٹھائے اندر آئی۔

''راجی تو خراٹے مار مار کر سو رہا ہے!'' وہ بے حد بے ہنگم انداز سے ہنسی لیکن ترنم کو وہ بالکل بُری لگی۔

''یہ کیا ہے؟'' ترنم نے ٹرے کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

''یہ باجی کڑھی ہے میں بہت چنگی بناتی ہوں۔ آپ نے روٹی نہیں کھائی ہوگی تو میں کھانا گر لائی۔'' رانی فوراً آداب میزبانی نبھا رہی تھی۔

''نہیں.. مجھے طلب نہیں ہے!'' ترنم نے بے حد سہولت سے انکار کیا۔

وہ جس طلب سے بے بس ہو کر یہاں ان جان گھر، ان جان میزبان کے سامنے تھی بھلا اُس اور طلب کے آگے کسی اور بات کی طلب کیسے ہو سکتی تھی۔

''مجھے وضو کرنا ہے!'' ترنم نے رانی سے کہا۔

''جی.. باہر نلکا لگا ہے وہاں سے کرلو۔'' رانی کو وہ حسین پری اور اُس کی حرکتیں عجیب سی لگ تھیں۔

نم نے چھوٹا سا صحن پار کر کے گھر کے کونے میں رکھی چوکی پر بیٹھ کر وضو کیا۔ پھر وہ پاس کھڑی رانی پاس سوئے راجی کو اور ان کے گھر اور اِس ان جان جگہ کو مکمل طور پر بھول گئی۔ وہ شاید۔ وہ شاید خود تھی! وہ تو خود کو ہی بھول گئی تھی۔

پنے جسم کے ایک ایک عضو کو بار بار دھو کر بے حد لگن سے وضو کرتے اُس کی آنکھوں سے جھڑی لگی گی۔ جس کے سامنے ابھی اُس کی حاضری تھی۔ وہ ذات کتنی پاک تھی اور وہ کتنی ناپاک!

ں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ رانی اُسے روتے دیکھ دیکھ کر خود بھی رو ی۔ وہ معصوم سی لڑکی بالکل نہ جانتی تھی کہ ترنم کیوں رو رہی تھی۔ وہ تو اتنی سادہ دِل تھی، جو کسی کو ہنستے ہنستی تھی اور روتے دیکھ کر روتی تھی۔

تے روتے ترنم کی ہچکی بندھ گئی اور وہ کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح سجدے میں گر گئی۔

باجی کیا ہوا؟'' رانی جو کسی پہرے دار کی طرح اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ دوڑ کر ترنم کی جانب بڑھی۔

نم آنکھیں بند کیے بے حس پڑی تھی۔ اتنی بے حس کہ رانی کو لگا کہیں ترنم مر گئی ہے! اُس کا ننھا سا م گیا۔

باجی!'' اُس نے پکارا۔

ھر وہ ایک دم پُرسکون ہوگئی کیوں کہ ترنم کی آنکھیں بند تھیں، جسم ڈھیلا تھا لیکن اُس کے جسم کے اندر س کی ہچکیاں چل رہی تھیں۔

نم روح میں غوطہ کھا کر رو رہی تھی۔

چھ لوگ اُوپر سے روتے ہیں! کچھ دل سے روتے ہیں اور بہت کم کو سعادت حاصل ہوتی ہے کہ وہ..
ح میں غوطہ لگا کر ڈوب کر روتے ہیں!
ور پھر ''یار'' کو منا لیتے ہیں!

❖❖○❖❖

سائیں وہ چھورا تو کہیں باہر کے ملک پڑھنے گیا ہے!'' سید سرفراز احمد کے خاص بندے نے آ کر ع دی۔

کتنے عرصے بعد آئے گا؟'' سید سرفراز احمد نے حنوط شدہ ''ہرن'' کو بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا جس انہوں نے کچھ روز پہلے شکار کیا تھا۔ آج وہ تیار ہو کر گھر آ گیا تھا۔

ن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن اُس کے چہرے پر درد اور موت کے تاثرات آ کر ٹھہر گئے تھے اس ے شک حنوط ہونے کی وجہ سے زندہ لگتا تھا لیکن جب پاس سے اُس کو دیکھا جاتا تو اس کے ا درد بہت نمایاں ہوتا تھا۔ اور یہ درد بھرے تاثرات سید سرفراز کو بہت مزہ دے رہے تھے۔

ائیں! سال بعد یا پھر ماہ بعد، ابھی کوئی پتا نہیں، میں نے یہ ساری معلومات شکھاں کو وہاں نوکری حاصل کی ہیں۔ شکھاں نے وہاں کے خاص ملازموں سے اچھی دوستی کر لی ہے اور باتوں ہی میں ہمارے لیے ہر طرح کی معلومات اکٹھی کر دی ہیں۔'' رفیق نے سینہ پھلا کر اپنی کارکردگی بیان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سید سرفراز کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اُن کو اس کی کارکردگی پسند آئی ہے۔

''ٹھیک ہے!'' انہوں نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

''سکھاں کو ابھی وہیں رہنے دینا، ابھی تو ہمارا کام شروع ہوا ہے!'' سید سرفراز مزید گویا ہوئے۔

''اچھا یہ بتاؤ اُن کے خاندان کی کیا کمزوری ہے؟'' سید سرفراز نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''سائیں! اُن کی لاڈلی بیٹی ''نگینہ'' جو لڑکے کی اکلوتی بہن ہے۔ گھر بھر کی جان اُس چھوکری ہے۔'' رفیق نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''ہوں!'' سید سرفراز نے کچھ سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

''اور ماں باپ کس ذات برادری کے ہیں؟'' سید سرفراز نے پوچھا۔

''وہ تو سائیں آپ کی ہی ذات کے ہیں!''

''احمد شاہ ہے اُن کے والد کا نام اور دولت بھی خاصی ہے۔ بہت اچھا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا گ کہلاتا ہے۔ اور... اور... سائیں لڑکا سُنا ہے بہت اچھا اور گھبرو جوان ہے!'' رفیق نے دانت نکوستے ہ کہا۔

''ہوں! اگر وہ ہر معاملے میں اتنے آگے اور اچھے ہیں تو ہوسکتا ہے رشتہ کرنے میں مشکل کریں لڑکا! نفیسہ کہہ رہی تھی کہ وہ مسکان کو پسند نہ کرتا تھا، اگر اُس نے اپنی مرضی چلائی تو مزید مشکل ہ گی!'' وہ بڑبڑائے۔

رفیق نے اُن کی بڑبڑاہٹ کا کچھ حصہ تو سمجھ لیا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔ حویلی کے ملازموں کی ٹریننگ کا حصہ تھا کہ وہ اتنا سنیں جتنا اُن کو بتایا جائے اور اتنا بولیں، جتنا اُ پوچھا جائے۔

''اور اگر انہوں نے کوئی مشکل پیدا کی تو گھی ٹیڑھی انگلیوں سے ہی نکالنا ہوگا!'' وہ مزید گویا ہو۔

رفیق اب بھی خاموش تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا سید سرفراز احمد یہ سب کچھ اُس سے نہیں کہہ رہے

''شادی تو اب میں ہر صورت اپنی بیٹی کی اُسی لڑکے سے کرواؤں گا۔'' سید سرفراز علی نے اٹل میں کہا۔

• وہ ہر معاملے میں اپنی مرضی کرنے کے عادی تھے۔ پہلے جب وہ مسکان کی شادی یہاں کر۔ خلاف تھے تو مسکان کی تعلیم سب کچھ چھڑوا کر ایک شادی شدہ آدمی سے بیاہ دیا۔ اور پھر دل میں بات سما گئی تھی کہ وہ اب اپنی بیٹی کو اُس کی محبت دِلا کر ازالہ کریں گے۔ یہ بات بھی دِل و دماغ میں گئی تھی وہ ایک بار پھر اپنی مرضی ۔ لگے تھے۔ دوسروں پر اپنی مرضی ٹھونسنے لگے تھے۔

''سائیں میرے لیے کیا حکم ہے؟'' رفیق نے تابع داری سے پوچھا۔

''آ... ہاں! وہ تم! تم مجھے وہاں کی پَل پَل کی خبر سے باخبر رکھو گے۔'' سید سرفراز علی نے چونک کر

''ٹھیک ہے سائیں! وہ ہی ہوگا، جو آپ چاہتے ہیں۔'' رفیق تابع داری سے کہہ کر اُلٹے قدموں

سید سرفراز علی اُس کے جانے کے بعد ایک بار پھر ہرن کو دیکھنے لگے۔ وہ ہرن کو بہت شوق سے پھیر پھیر کر دیکھ رہے تھے اُن کو یہ ہرن اپنے شکار کا ''ماسٹر پیس، ماسٹر اسٹروک'' لگ رہا تھا۔

انہوں نے ہرن کی زندگی کے آخری پَل اور درد بھرے احساس کو ''اسٹور'' کرلیا تھا۔

ان کے اندر کے **Bad Man** کو یہ سب کچھ دیکھ کر بے حد تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

سائیں! اندر آجائیں۔'' زنان خانے کی ملازمہ نے دروازے پر آکر پوچھا۔

ہاں آجاؤ!'' سید سرفراز کے چہرے پر ایک دم تناؤ آگیا تھا۔ ملازمہ کے ساتھ شہر بانو اندر داخل

بیٹھو!'' سید سرفراز نے اُس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لے کر کہا۔ ملازمہ شہر بانو کو چھوڑ کر باہر نکل

سرفراز کی سرخ سرخ آنکھیں شہر بانو کا دِل دہلا رہی تھیں، کتنے ہی پَل بے حد خاموشی سے گزر سید سرفراز علی جب کچھ نہ بولے تو شہر بانو کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

بابا سائیں! آپ نے مجھے بلایا تھا۔'' اُس نے اپنی چادر کو سر پر مزید درست کرتے ہوئے پوچھا۔

سرفراز علی پھر بھی کچھ نہ بولے وہ قہر بھری نظروں سے اُس لڑکی کو دیکھ رہے تھے، جس کے باپ لو تباہ کرنے کی، اُن کی انا توڑنے کی پوری کوشش کی تھی۔

اُس عورت کی بھتیجی تھی اور اُس عورت کی بیٹی تھی، جنہوں نے مسکان کو اِس حال تک پہنچایا کہ آج نہ زندوں میں تھی نہ مُردوں میں تھی۔

سرفراز علی کی بیٹی دن رات درد و تکلیف سے چلاتی رہے اور اظہر علی کی بیٹی ہمارے ہی گھر میں مقام پر رہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟

انصاف تو ہونا چاہیے!'' وہ ایک دم بڑبڑائے۔

بابا سائیں آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' شہر بانو نے پوچھا۔

ہاں! نہیں!'' سید سرفراز اپنی ظالمانہ سوچوں سے ایک دم نکل کر بولے۔

لڑکی!'' وہ بہت کچھ مسلسل سوچ رہے تھے۔

لو اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو کسی اور سے کہنے کے بجائے سیدھی میرے پاس آنا۔'' انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک دم اُس کی کمر پر ہاتھ پھیر کر اُس کی کمر سہلائی۔

بانو کے جسم میں عجیب سی جھرجھری پیدا ہوئی، اُسے سید سرفراز علی کا یہ لمس عجیب سا لگا تھا۔ اللہ عورت ہو یا لڑکی اُس کے اندر ایک خاص حِس رکھی ہے، لڑکی کتنی بھی چھوٹی یا معصوم ہو لیکن مرد اچھا ہے یا بُرا اُس کے اندر لگا الارم فوراً بتا دیتا ہے۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ شہر بانو کو سید سرفراز کا اس چھونا بے حد بُرا لگا تھا۔

چلوں بابا سائیں؟'' شہر بانو نے بیٹھی بیٹھی آواز سے پوچھا۔

ہاں! تم جاؤ۔'' سید سرفراز نے اُس پر بے حد گہری نگاہ ڈالی۔

جب جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس کے قدم سید سرفراز کی آنکھوں کے ارتکاز کی وجہ سے لڑ تھے۔

شہر بانو تم کو کوئی ضرورت پڑے۔ کبھی دن میں یا پھر ''رات'' میں تو تم صرف میرے پاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

!"

سید سرفراز نے اُسے دروازے سے جاتے جاتے پھر روکا۔

"جی اچھا..." شہر بانو نے نگاہ اور سر جھکا کر کہا اور دروازہ پار کرگئی۔

"تم لوگوں نے میری بیٹی کے جسم پر زخم لگائے تھے نا! اب دیکھنا میں تمہاری بیٹی کی روح پر کیسے زخم لگاتا ہوں!" سید سرفراز نے عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

اُن کی نگاہیں خوب صورت معصوم سے ہرن پر جاٹھہریں جس کی آنکھوں کا درد اُن کو بہت اُ تھا۔ پھر اچانک ہی منظر بدل گیا تھا اب ایک دم ہرن کی درد بھری آنکھوں کی جگہ اُن کو شہر بانو بھری آنکھیں نظر آئی تھیں۔

سید سرفراز کا فوراً دِل چاہا کہ وہ شہر بانو کو بھی ایک ایسا درد دے ڈالیں، جو ہمیشہ ہمیشہ کے کے چہرے اور آنکھوں میں ٹھہر جائے اور اُس کا وجود اِس حنوط شدہ ہرن کی طرح بے جان ہو جا۔

کوئی بہت بڑا ظلم اُن کے اندر کسی لاوے کی طرح پھٹنے کو بس تیار ہی تھا۔

❖❖○❖❖

گھر! میرا گھر!
میں اپنے گھر کیسے پہنچوں...
سوکھے حلقوم اور بیٹھتے دِل سے سوچتی ہوں
شاید میں رستہ بھول گئی۔
یہ راہ تو میری راہ نہیں
سب گلیوں پر یہاں نام لکھے
اس گلی پہ کوئی نام نہیں
اور دور دور تک دم سادھے
یہ سارے گھر انجانے ہیں
لو پیلے چاند کا ٹکڑا بھی
کالے پتوں میں ڈوب گیا
اب کچھ بھی نہیں...
بس میرے منہ میں خوف سے بھاری
اور مفلوج زباں ہے پاتلووں سے اوپر چڑھتی ہوئی
میرے انگ انگ میں رچی ہوئی
اِک خنکی ہے

رانی نے ساری رات ترنم کے سرہانے بیٹھ کر گزاری تھی۔ رانی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں مسلسل ماتھے پر رکھتی رہی تھی، تب جا کر ترنم کے بخار کو کچھ فرق پڑا تھا۔

ترنم ساری رات بخار میں مسلسل بولتی رہی تھی۔

اماں، بابا اور اُس کا گھر اُس کے گھر کی وہ دہلیز کے اندر صرف امان ہی امان تھی اور جس کے باہر شر لما بس شر نے اُسے کھالیا تھا۔ وہ سب کو یاد کرتی رہی تھی۔

رانی بے حد معصوم لڑکی تھی، وہ پریشان ہوتی رہی کہ باجی کے سر کو تاپ چڑھ گیا ہے تبھی تو وہ ساری ا بس بولتی ہی رہی تھی۔

رانی نے بہت احتیاط سے اپنے گھر کے واحد کمرے کا دروازہ بند کیا تا کہ ترنم تھوڑی دیر سکون سے لے۔ ساری رات تڑپنے کے بعد اُس کی اب جا کر آنکھ لگی تھی۔

"سوگئی؟" راجی نے نل سے منہ دھو کر تولیے سے منہ رگڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" رانی بے حد چپ تھی۔ ترنم کی تکلیف وہ دِل سے محسوس کر رہی تھی اس کا من موہنا چہرہ اور لما لہجہ اُس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ وہ ترنم کے لیے اپنے دِل میں بہت پیارے جذبات محسوس کر رہی ی جیسے ترنم اُس کی بہت قریبی رشتے دار ہو۔

"اچھا چل تُو مجھے چاء (چائے) بنادے، ذرا سُستی تو دُور ہو۔" راجی نے انگڑائی بھر کر وہیں چارپائی بنتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" رانی نے برآمدے میں پڑی ڈولی کا دروازہ کھولا، جس کے دروازے پر جالی لگنے سے ہوا کا ملہ بے حد آسان تھا۔ پرات میں پانی ڈال کر اُس میں دودھ کی دیگچی کو ڈھانپ کر رکھا ہوا تھا ایک اور ت میں پانی ڈال کر آٹا رکھا ہوا تھا۔

یہ طریقہ وہ چیزوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔

چائے کا پانی رکھ کر وہ پراٹھے بنانے لگی۔ دیسی گھی کی خوشبو نے سارے گھر کو گھیر لیا تھا۔ راجی کی ل ایک دم چمک اُٹھی وہ اُٹھ کر اُس کے پاس پڑی چوکی پر آ بیٹھا۔

رانی نے چائے، انڈا اور پراٹھا راجی کے سامنے رکھا تو راجی فوراً کھانا شروع ہو گیا۔

"ایک بات پوچھوں راجی!" رانی نے راجی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں پوچھو۔" راجی نے اپنے کھانے کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ باجی جو رات آئی تھی، اس کو کیا دُکھ ہے اس کو اتنا تاپ چڑھا، ساری رات وہ روتی، بولتی ۔" رانی نے آخر پوچھ ہی لیا۔ اُس کے لیے ترنم اور اُس کا رویّہ بالکل ایک نئی سی بات تھی۔ اُس نے ل کو بہت محدود پیمانے پر دیکھ رکھا تھا تب ہی تو اُس کی خوشیاں اور دُکھ بے حد چھوٹے چھوٹے تھے۔ ل رات جو کچھ ہوا تھا اُس کے لیے بہت بڑا اور انوکھا تھا۔

"ان کو کیا دُکھ ہو سکتا ہے رانی؟" راجی نے لاپروائی سے کہا۔

"ارے یہ تو لوگوں کو پیسے لے کر سکون بانٹتی پھرتی ہیں۔ لوگوں کے بے سکون لمحات کو خوشی دینے کا نتی ہیں، اِن کو کیا دُکھ ہونا۔" راجی کو ترنم لوگوں کے کام اور اِن لڑکیوں سے بہت شدید نفرت تھی۔ اں لی بے حد خواہش تھی کہ وہ کسی طرح یہاں کی نوکری سے جان چھڑا لے۔

لیکن اِن سب کے باوجود راجی کو زندگی میں پہلی بار اِن لڑکیوں میں سے کسی سے ہمدردی ہوئی تھی تو ۔ ف ترنم تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’وہ ساری رات روتی رہی، معافیاں مانگتی رہی یہ سب کیا تھا؟‘‘ رانی نے اپنا سوال اُس کے سامنے رکھا۔

’’رانی! تجھے اُس نے کچھ بتایا؟‘‘ راجی کو یہ فکر ہونے لگی کہ کہیں رانی کو اُس کے کام کی نوعیت کا نہ چل جائے۔

’’نہیں!‘‘ رانی نے سچائی سے جواب دیا تو راجی ایک دم پُرسکون ہوگیا۔

’’دیکھ رانی! یہ بڑے لوگ ہیں ان کی باتوں میں کبھی نہ پڑنا۔ یہ کبھی خوش ہوتے ہیں اور کبھی دُکھی ہوتے ہیں۔ یہ بھی جاننے کی کوشش نہ کرنا۔ ان کے دُکھ اوران کی خوشیاں اِن کے مزاج پر منحصر ہوتی ہیں اوران کا مزاج کب بدل جائے کچھ نہیں پتا چلتا۔ پَل پَل میں بدلتا ہے اور ہم جیسے لوگ اِن کی ہم دردی یا غصّے میں فوراً پھنس جاتے ہیں۔ تو اِن سے دُور ہی رہنا یہ ہی اچھا ہے!‘‘ راجی اپنا ناشتا چھوڑ کر رانی کو سمجھانے بیٹھ گیا۔

’’کچھ سمجھی؟‘‘ راجی نے گم سم رانی سے پوچھا۔

’’ہوں!‘‘ رانی نے اَن مانے جی سے جواب دیا۔

’’اچھا میں گھر سے ہو آؤں...کل امّاں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میں دس بجے آجاؤں گا تم صاحبہ کو آٹھ نو بجے اُٹھا کر چائے وغیرہ پلوا کر ریڈی رکھنا۔ اِن کو بھی اپنے ٹھکانے پہنچ کر اپنے پہنچنے کی اطلاع دینی ہوتی ہے۔ زیادہ دیر ہم یہاں رُک نہیں سکتے۔‘‘ راجی کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور پھر چلنے کی آواز آئی تو رانی گہرا سانس لے کر کمرے کی جانب بڑھی، جہاں ترنم لیٹی ہوئی تھی۔

رانی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر ترنم کو دیکھا پھر وہ حیران رہ گئی۔ ترنم بالکل الرٹ، ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ راجی کی کڑوی باتیں سُن چکی تھی۔

’’باجی توسی اُٹھ گئے کیسی طبیعت ہے آپ کی، آپ کے کھانے کو کچھ لاؤں؟‘‘ رانی نے ترنم کے پاس آ کر پوچھا۔

’’نہیں بہت شکریہ!‘‘ ترنم نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

’’تُسی راجی کی باتیں سُن کر ناراض ہوگئے ہو؟‘‘ رانی نے پوچھا۔

’’نہیں چندا! راجی تو بہت اچھا انسان ہے، جس کے اندر اچھائی بُرائی کو پرکھنے اور الگ رکھنے کی صلاحیت ہے وہ تو بہت ہی اچھا انسان ہے اُس پر اللہ کی خاص رحمتیں ہیں۔ مجھے بھلا اُس کی باتیں کیوں بُری لگیں گی۔‘‘ ترنم نے سچائی سے کہا۔

’’اب تو آپ کا تاپ (بخار) اُتر گیا توبہ توبہ اتنا پنڈا (جسم) آپ کا سڑ رہا تھا، جیسے آگ لگی ہو‘‘ رانی نے کہا۔

’’میرے اندر آگ ہی تو لگی ہے کچھ میرے گناہوں کے بانجھڑ ہیں کچھ میرے پچھتاووں کے ہیں اور میری اپنی لائی ہوئی، بلائی ہوئی بربادی ہے، اللہ جانے یہ آگ کب بجھے گی؟‘‘ ترنم دِل ہی دل میں بولی۔

"باجی میں پراٹھے بہت اچھے بناتی ہوں تُسی ناشتا کرلو، مینوں بہت خوشی ہوگی۔‘‘ رانی کی شدید خواہش تھی کہ ترنم اُس کے گھر سے ہرصورت کچھ کھا کر جائے۔

"ٹھیک ہے لیکن میں پہلے نماز پڑھنا چاہتی ہوں!‘‘ ترنم کی بے وقت نماز کی فرمائش پر رانی پھر سہم گئی۔

"اس ویلے کون سی نماز پڑھنی ہے؟‘‘ رانی سوال کیے بنا نہ رہ سکی۔ پھر اُسے رات کو ترنم کی حالت یاد آئی، اگر ہر بار وہ ایسی ہی نماز پڑھتی تھی تو کتنی خطرناک بات تھی کیوں کہ نماز کے دوران اُس پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔

"باجی اِس ویلے تو نماز کا وقت ختم ہوگیا ہے، عبادت کا وقت ختم ہوگیا۔‘‘ رانی اُسے روکنا چاہ رہی تھی۔

"مطلب؟‘‘ ترنم نے پوچھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی نقاہت بھرے وجود کے ساتھ باہر نکل کر اُس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

"مطلب اب ظہر ویلے، ہی ظہر کا ویلا ہوگا نا!‘‘ رانی نے معصومیت سے سمجھایا۔

"نہیں رانی! یہ تو اُن لوگوں کی موجیں ہیں، جو تابع دار رہ چکے ہوں میرے جیسے گناہ گار اگر سارا دن سجدے میں معافی مانگیں تو بھی کم ہے!‘‘ ترنم کی آواز میں بے حد نقاہت تھی۔

"نہیں باجی! آپ کو کس نے کہا ہر وقت عبادت کرنے والے گناہ گار ہوتے ہیں۔ وہ تو بہت چنگے ہوتے ہیں جو .. جو ربّ سوہنے دی عبادت کرے... ذکر کرے وہ تو چنگا ہی ہے نا۔‘‘ رانی ترنم کا دِل بہلانے کو بولی۔

جواباً ترنم کے چہرے پہ بہت کرب ناک سی مسکراہٹ تھی۔

"وہ ولی اللہ ہوتے ہیں بلکہ سب ہی لوگ اچھے ہوتے ہیں، سوائے میرے!‘‘ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"باجی! اللہ جنت نصیب کرے... میری ماں بڑی عبادت گزار تھی۔ جوانی میں بیوہ ہوگئی اُس نے اپنا دل اللہ سے لگالیا میں اکثر اُس سے پوچھتی تھی کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ کیوں رہتی ہے؟ تو وہ کہتی تھی کہ اُس نے اپنے من کو جہاں لگایا ہے، وہاں ساری لذتیں کم ہیں۔ وہ سارا دن عبادت کرتی، میں پوچھتی کہ اتنی عبادت کیوں کرتی ہے تو وہ کہتی کہ دنیا کی ہر چیز ہر ویلے عبادت میں لگی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ درخت جو رکوع کی حالت میں کھڑے ہیں۔ چوپائے سجدے کی حالت میں ہیں، پہاڑ تشہد کی حالت میں، چونٹیاں سجدے کی حالت میں، ہر شے رب کا ذکر کرتی ہر ہر ویلے ہر گھڑی اُس کی عبادت کرتی ہے پھر...انسان تو اللہ نے سب سے اشرف درجے پر پیدا کیا ہے وہ کیوں نہ اِن سب سے زیادہ رب کا ذکر کرے۔ وہ بھی آپ کی طرح بہت اچھی تھی!‘‘ رانی نے اپنی ماں کی یاد میں آنسو صاف کیے۔

"نہیں! تمہاری ماں تو بہت نیک تھی اور کسی نیک کا بد سے کیا مقابلہ؟‘‘ ترنم نے تاسف سے آہ بھری۔

’’رانی! تم تو پڑھی لکھی نہیں لگتیں لیکن تمہاری ماں کی باتیں تو بہت پڑھے لکھوں جیسی لگتی ہیں۔‘‘ ترنم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے سوال کیا۔

''لے باجی! میں پنج فیل ہوں!'' رانی نے فخر سے کہا۔

''میں تو امی سے کہیں زیادہ پڑھی ہوئی ہوں۔ امی کو تو سوائے قرآن مجید کے کچھ نہیں آتا تھا، کیو کہ امی کا من ہر وقت عبادت میں لگتا تھا اس لیے وہ ہر وقت ایسی باتیں کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں من لگاتے ہیں میری طرح وہ شاید ان پڑھ ہی لگتے ہیں! کیوں کہ ہر کوئی میری ماں کو بہت پڑ لکھا سمجھتا تھا حالاں کہ جس کوٹھی میں وہ کام کرتی تھی، وہاں کا ہر بندہ اُن کو بہت عزت دیتا تھا۔ با پڑھے لکھے آدمی ہی کی عزت ہوتی ہے نا؟'' رانی نے اپنی رائے کے ساتھ ہی سوال کر ڈالا۔

''عزت تو اللہ کے ہاں جو منظورِ نظر ہو جائے صرف اُس کی ہوتی ہے!'' ترنم نے طویل سانس بھرا۔

''میں قضا نماز پڑھنا چاہ رہی تھی، میں تمہاری ماں جیسا نہ کرم رکھتی ہوں نہ عمل، جو سارا دِن عباد میں گزار سکوں۔'' ترنم نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی پھر بیٹھ کر نماز ادا کی۔ پہلے اُس کو نماز میں سکون ملتا تھا لیکن ترنم پر اب یہ کرم ہونے لگا تھا کہ اُسے نماز میں بے حد سکون میسر آنے لگا تھا۔

ترنم نے سلام پھیر کر رانی کی طرف دیکھا، جو اُس کے لباس کو ہاتھ پھیر پھیر کر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ تم رکھ لو! لیکن یہ لباس تم صرف راجی کے سامنے ہی پہننا خاصا بولڈ ہے، اگر شال بھی لے جائے تو بھی!'' ترنم نے چارپائی کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

''نہ..نہیں باجی! میں تو ویسے ہی دیکھ رہی تھی۔'' رانی نے فوراً ہچکچا کر کہا۔

''ارے رکھ لو!'' ترنم نے دیوار سے ٹیک لگا کر کہا۔

''پھر آپ کیا پہنو گے؟'' رانی نے پوچھا۔

''پہن تو رکھے ہیں تمہارے یہ کپڑے، اگر تم کو اعتراض نہ ہو۔'' ترنم نے اُس کا لایا ہوا ناشتا کرتے ہوئے کہا۔

''ہو.. ہائے باجی! کیسی باتیں کرتے ہو، میں کیوں اعتراض کروں گی بھلا، پھر میرا والا تو سوٹ ہی ڈیڑھ سو کا ہے آپ والا تو اللہ جانے کتنے ہزار کا لگ رہا ہے! یہ شال، ایسی مخملیں شال تو میں نے حیا میں کبھی نہیں دیکھی۔'' رانی نے سچائی سے کہا۔

''رانی تمہارے پراٹھے واقعی بہت مزے کے ہیں میں نے سالوں بعد ایسا کھانا کھایا ہے لذت سے بھرپور۔'' ترنم نے رغبت سے رات کا بچا سالن اور پراٹھا کھاتے ہوئے کہا۔ وہ کھانے بیٹھی تو رانی کا رکھنے کے لیے تھی لیکن کھانے کا ذائقہ ہو بہو ترنم کی امّاں جیسا تھا۔ ترنم کھاتے ہوئے چونکی تھی کس قد اپنا اپنا سا احساس تھا اور کتنا مانوس ذائقہ تھا اس مانوس ذائقے کے لیے ترنم کی زبان ترس گئی تھی۔ را دھیرے سے مسکرا دی۔

''ویسے یہ ساگ تو میری خالہ بنا کر گئی تھی۔ وہ ہر وقت جانے کس خیال میں مگن رہتی ہے سودائیوں طرح لیکن کبھی کبھی تو بالکل ہوش مندوں کی طرح ہو جاتی ہے۔ باتیں کرتی ہے سیانوں جیسی، کام کر ہے مشورہ دیتی ہے۔'' رانی کو ہر بات شاید بے حد تفصیل سے کرنے کی عادت تھی۔

''واقعی بہت مزہ ہے اِس ساگ میں! میری امّاں بھی بالکل ایسا پکایا کرتی تھیں۔'' ترنم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''واقعی خالہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے لیکن خالہ نا پتا نہیں اُسے کیا ہو جاتا ہے۔ دنوں چپ رہتی ہے مہینوں غائب رہتی ہے لیکن پھر بھی ہمارے ہاں ضرور آتی ہے، چاہے مہینوں بعد آئے۔'' رانی نے ...ال میں کہا۔

''ہوں!'' ترنم نے رانی کی باتوں پر بہت زیادہ دھیان نہ دیا۔ پیٹ بھرتے ہی خیالات اُس کے ...ں میں گھومنے لگے تھے اُسے میڈم راگنی کی فکر ہوئی تھی۔ رات سے اُس سے رابطہ نہ تھا۔ وزیر کی موت ...تو اُسے فوراً ہو چکی ہوگی اور اب تک اُس کے رابطے میں نہ رہنے کی وجہ سے خاصی ناراض بھی ہوگی ...اں کی ناراضی کا مطلب اپنی زندگی کو مزید کرب ناک بنانا۔

...وہ کچھ سوچ کر اپنے بیگ میں رکھے موبائل فون کو آن کر رہی تھی، کل رات سے اُس نے موبائل ...لر رکھا تھا۔

...یڈم راگنی کی تین وائس میل اور سولہ میسج موجود تھے۔ ترنم ان کو کھولے بغیر بھی جانتی تھی کہ اِن میں کیا ...ام ہوگا اِس لیے اُس نے ڈائریکٹ میڈم راگنی کا نمبر ڈائل کیا اور اُس کی چنگھاڑ دھاڑ سننے کے بعد ...سے اپنا پتا بتایا کہ وہ جلد آ رہی ہے۔

...ون بند کر کے ترنم نے ایک گہری سانس لی۔ جانے اِس عورت سے اِس گروہ سے اُس کی جان کب ...ائی تھی، شاید جاں جا کر ہی چھوٹنی تھی۔

''باجی! باہر راجی آیا ہے آپ کو بلا رہا ہے کہ چلنا ہے۔'' رانی جو اُس کے فون کرنے کے دوران باہر ...ئی آ کر بولی۔

''ٹھیک ہے!'' ترنم نے اپنا بیگ اُٹھایا۔ پھر ایک دم واپس مڑ کر رانی کے گلے جا لگی، ترنم کے روّیے ...بے حد اپنائیت تھی۔ رانی بے حد خوش ہو گئی۔

ترنم نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا پھر مٹھی بھر کر ہزار ہزار کے ڈھیروں نوٹ نکال کر رانی کو دے ...یے۔

''یہ تم میری طرف سے رکھ لو آخر راجی کی نئی نویلی دلہن ہو۔'' ترنم نے بہانے سے اُن کی مدد کرنے کی ...ش کی۔

''ارے باجی ہمارے تو وہیا (بیاہ) کو تیسرا ورہ ہے۔ اللہ کوئی بال دے اب تو۔'' رانی نے شرماتے ...ئے کہا۔

''اللہ کرے۔'' ترنم مسکرا کر بولی اور باہر کو قدم رکھے۔

''اللہ حافظ!'' وہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''اللہ حافظ!'' رانی جواباً بولی اور ہاتھ ہلا کر ترنم کو رخصت کیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی رانی ابھی دروازہ ...رنے ہی لگی تھی کہ ایک دم خالہ سامنے آ گئی۔

''ارے خالہ کر آئی داتا صاحب کو سلام!'' رانی نے مسکرا کر پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ.. یہ کون تھی!'' خالہ نے پھٹی پھٹی نگاہوں اور پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔

''یہ راجی کی بیگم صاحب تھی۔'' رانی نے خالہ کو ہاتھ پکڑ کر اندر کیا۔ خالہ کو اکثر اٹھانا بٹھانا، کھلانا کروایا جاتا تھا۔

''بیگم صاحبہ؟

نہین! نہیں.. نہیں! یہ.. یہ تو میری!'' خالہ نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو! میری ایمان فاطمہ تھی! میری نظر کمزور ہوسکتی ہے، پر میرا دل اُس کی آہٹ پہچانتا ہے!، میری ایمان ہی تھی!'' خالہ کا لہجہ بے حد دھیما تھا، مگر بہت مضبوطی لیے تھا۔

''خالہ.. خالہ.. کیا ہوا؟'' رانی نے اُن کا سرد ہاتھ ہلا کر اُسے پکارا لیکن اگلے ہی لمحے خالہ لہرا کرا کے اوپر گری تھیں!

❖❖○❖❖

''یوں لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے! کیسے زور کی آندھی ہے!'' ملازمہ نے کمر کی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے کہا۔

''اب زندگی میں اور کتنے طوفان باقی ہیں؟'' ساجدہ بی بی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''حوصلہ کریں بڑی بی بی جی! مردوں کے ساتھ مرا تھوڑی جاسکتا ہے، اپنے اپنے حصّے کی زندگی تو کر ہی جانی پڑتی ہے۔'' بوڑھی ملازمہ چوں کہ خود بیوگی کی آگ کو جھیل چکی تھی شاید اِسی لیے اُسے ساج بی بی کی تکلیف کی شدت کا احساس اچھی طرح سے تھا۔

''اپنے اپنے حصّے کی زندگی میں دوسروں کی زیادتیاں پھر ہم عورتوں کو کیوں بھگتنی پڑتی ہیں؟'' ساج بی بی نے دکھ سے پوچھا۔

''کیوں بی بی اتنی پریشان ہو؟'' بوڑھی ملازمہ نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''ایک عورت کا دِل اپنے مرد میں اٹکتا ہے اور ماں کا دِل اپنی اولاد میں۔ شوہر تو اب میرا رہا نہ صرف اولاد کی خاطر زندہ ہوں، لیکن وہاں سے بھی کوئی سکون نہیں ہے۔ جانے کیوں میرا دل اُس را سے ہی ڈر رہا ہے، جب سے شہر بانو اپنے سسرال واپس گئی ہے!'' ساجدہ بی بی نے اپنا وسوسہ بیان کیا۔

''لیکن بی بی پریشانی کی کیا بات؟ اُسے تو وہ لوگ بہت آرام سے لے گئے تھے ورنہ تو سب کا خیا تھا کہ سید سرفراز علی جیسا بندہ اپنی بیٹی کی تکلیف کا بدلہ ضرور لے گا۔'' بوڑھی ملازمہ نے مالکن کا وسوسہ ا کرنے کی کوشش کی۔

''اتنے آرام سے وہ لے گئے یہ ہی تو اصل پریشانی کی وجہ ہے!'' ساجدہ بی بی نے کہا۔

''وہ شخص اتنے آرام سے نہیں بیٹھنے والا۔ ہر کوئی یہ ہی بتاتا ہے کہ وہ سید اظہر علی سے بھی سخت ہے پھر.. پھر وہ اُس روز جتنے غصّے سے مسکان کو لے کر حویلی سے گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ یقیناً خون کی ندیا بہادے گا اور یہ رشتے داری دشمنی میں بدل جائے گی.. لیکن؟ لیکن پھر کچھ بھی نہ ہوا! وہ بہت خاموشی سے آیا اور شہر بانو کو لے گیا، کیا وہ اتنا اعلیٰ ظرف ہے؟ لیکن دِل اس پر بھی نہیں ٹھہرتا، مجھے اُس کی اتنی خاموشی سے ڈر لگتا ہے!'' ساجدہ بی بی کا دل بے حد پریشان تھا۔

باہر بہت زور سے بجلی کڑکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ بجلی کہیں گری تھی کچھ پَل کو بوڑھی ملازمہ اور ساجدہ بی بی دونوں اتنی گرج کی آواز سے سہم کر چپ ہوگئے۔

''تمہیں پتا ہے ماسی جب بجلی گرتی ہے تو پہلے کیا ہوتا ہے؟'' ساجدہ بی بی نے بوڑھی ملازمہ سے کہا۔

''کیا ہوتا ہے؟''

ملازمہ نے مالکن کا دل رکھنے کے لیے پوچھ لیا ورنہ جتنی اُس کی عمر اور تجربہ تھا اُس کے پاس تو ہر سوال کا ریڈی میڈ جواب پہلے سے موجود ہوتا تھا۔

''بادل گرجنے سے پہلے بجلی کی روشنی نیچے زمین پر آتی ہے بنا آواز کے خاموشی سے۔ پھر۔ پھر دل ہلا دینے والی گرج سنائی دیتی ہے! تب جا کر پتا چلتا ہے کہ بجلی گری ہے! مجھے سید سرفراز علی کی آمد اور اُن کی خاموشی سے آنا یوں ہی محسوس ہوتا ہے!'' ساجدہ بی بی کا لہجہ سرسرا رہا تھا۔

اُن کے پاس ایک ماں کا دِل موجود تھا، جس کے ریڈار پر بہت ساری انہونیاں پہلے سے سنائی دینے لگی ہیں!

❖❖○❖❖

''بلال۔ بلال؟''

شہر بانو کی آنکھ اچانک کھلی تھی، یوں لگتا تھا، جیسے کچھ آس پاس مختلف ہوا ہو۔ اُس کا نیند سے بیدار ذہن اس ''مختلف'' کو فوراً جانچ نہ پایا۔ پھر اچانک ہی اُسے احساس ہوا کہ بلال کمرے میں نہیں ہے۔

''بلال!'' اُس نے بستر سے اُٹھتے ہوئے اسے آواز دی۔ لیکن اُسے اُٹھنے سے پہلے ہی کسی نے بے دردی سے گرفت میں لے لیا تھا۔ شہر بانو نے خوف زدہ نگاہوں سے حملہ آور کو دیکھا۔

''کا... کون ہو تم؟

''چھوڑو مجھے۔'' شیر بانو کی آواز خوف سے پھٹ گئی، ننھا سا دل خوف سے ڈوبنے لگا۔ باہر بجلی چمکی تو شہر بانو کو اُس کا چہرہ دکھائی دے گیا۔

''آپ؟'' شہر بانو کی دکھ اور تاسف سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ دوسری جانب سے دست درازی بڑھی تھی۔

''پلیز.. پلیز مجھے چھوڑ دیں۔ آپ کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا واسطہ! یہ ٹھیک نہیں ہے!'' شہر بانو نے روتے ہوئے خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی اور کچھ کامیاب بھی ہوگئی اور دوڑ کر دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ شاید باہر سے لاک کیا گیا تھا۔

لگتا تھا بکری کو ایک کمرے میں شیر کے ساتھ بند کردیا گیا ہو اور اِس کا نتیجہ سب ہی کو پتا تھا۔

کیا شیر نے بکری کو کبھی چھوڑا ہے؟

''کوئی فائدہ نہیں ہے، دروازہ نہیں کھلے گا!'' دوسری جانب سے نہایت سفاک لہجہ میں کہا گیا اور اُس کا دوپٹا کھینچ کر ہوا میں اُچھال دیا۔

''نہ.. نہ، نہیں!'' شہر بانو چیخی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بلال.. بلال.. بچاؤ۔''
''اللہ۔ اللہ جی!'' وہ دور ہٹنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔
''ہائے..نہیں..کوئی ہے! بچاؤ!
''پلیز نہیں! چھوڑ دو مجھے!''
مگر لگتا تھا کہ ہر چیز بہری ہوگئی ہو! جہاں اُس کی آواز کسی کو سنائی نہ دی ہو!
''نہیں!'' شہر بانو کی چیخ آسمان کو دہلا گئی، تب ہی شاید اتنے زور سے بجلی کڑکی تھی کہ دِلوں کو، زم دہلا گئی تھی!
''کہیں بجلی گر چکی تھی اور جلا کر خاک کر گئی تھی!''

❀

ذرا دھیرے سے تم چلنا کہ یوں تو آبگینے ہیں
یہی وہ آبگینے ہیں
کبھی ہو پیاس کی شدت تو یہ پانی پلاتے ہیں
کبھی سورج کی ہو حدت تو یہ سایہ بناتے ہیں
یہ ہیں آنگن کے تارے جو ہمیشہ جگمگاتے ہیں
مکاں کو گھر بناتے ہیں، انہی میں وہ قرینے ہیں
کہ یہ تو آبگینے ہیں کہ جو گھر بھر کی زینت بھی
یہی آنکھوں کی ہیں ٹھنڈک
یہی فرحت بھی، راحت بھی
ان ہی سے رونق محفل، ان ہی سے حرمتِ محمل
بھری شاداب دنیا میں، یہی سرسبز اِک حاصل
یہی جنت کے زینے ہیں کہ
ہیں یہ ماں یہی بیٹی، یہی بہنا
یہی ہیں ہاتھ کا گہنا
محاذوں پر جو نکلو تو
کبھی پیروں کی بیڑی بھی!
مگر تم توڑ مت دینا، انہیں مستور ہی رکھنا
یہ ''عصمت'' کے نگینے ہیں کہ یہ تو آبگینے ہیں!
کبھی سوچا بھی ہے تم نے؟ یہ کتنا دُکھ اُٹھاتی ہیں
تمہاری زندگی کو کس طرح شاداں بناتی ہیں
تمہاری راہ کے کانٹے یہ چن لیتی ہیں پلکوں سے
سفر آساں بناتی ہیں
سنور جائیں اگر اِک نسل کا ایماں بناتی ہیں
پھر اِن معصوم کلیوں کو یہی بصریؒ یہی سفیانؒ بناتی ہیں!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تم مگر......توڑ مت دینا! انہیں مستور ہی رکھنا!
یہ عصمت کے نگینے ہیں
کہ یہ تو آبگینے ہیں! یہ تو آبگینے ہیں!

''یہ اتنی صبح صبح کس کا فون آیا ہے؟'' ساجدہ بی بی نے مندھی مندھی آنکھوں سے بجتے ٹیلی فون کو دیکھا۔ پہلے تو وہ سستی سے فون کو چپ چاپ دیکھتی رہیں لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ دوسری طرف سے کوئی ہرصورت بات کرنا چاہتا ہے تو ناچار اُن کو اُٹھنا ہی پڑا۔ رات مسلسل جاگنے سے ان کا سر بھی بھاری ہورہا تھا۔

''اللہ خیر کرے۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھیں۔

خیریت نہیں تھی یہ اُن کا دِل کل رات سے کہہ رہا تھا۔ فون بڑی حویلی سے تھا، شہر بانو کی طرف سے پیغام تھا کہ وہ اُس سے فوراً مل جائیں یا پھر اُس کو بلالیں۔

ساجدہ بی بی نے تڑپ کر پوچھا آخر کیا بات ہے؟ کہ اُس کی بیٹی اُسے بلارہی ہے، جب کہ وہ جانتی بھی ہے کہ ماں عدت میں ہے باہر نہیں نکل سکتی لیکن ملازمہ نے مزید کوئی تفصیل بتائے فون بند کردیا تھا۔

ملازمہ نے بھی تو اتنا ہی بتانا تھا، جتنا کہ سید سرفراز علی نے کہلوایا تھا۔

ساجدہ بی بی کتنی ہی دیر ساکن بیٹھی رہیں، خالی الذہن! دِل میں عجیب طرح کی گھبراہٹ اور وسوسے جنم لے رہے تھے۔

''میں تو نہیں جاسکتی! عدت میں کہاں باہر نکلنے کی اجازت ہے، لیکن میں سعادت علی بھائی اور بھابی سے کہتی ہوں کہ شہر بانو سے جاکر مل کر آئیں، آخر بچی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے جو اُس نے خاص طور پر ملنے کا کہلوا بھیجا۔''

وہ ایک بار پھر تیزی سے فون کی جانب بڑھیں تاکہ بھائی اور بھاوج کو شہر بانو سے ملنے کے لیے کہہ سکیں۔

بھائی کے گھر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے اُن کی انگلیوں میں واضح لرزش تھی، چھٹی حِس اُسے بتارہی تھی کہ کچھ غلط ہوچکا ہے یا پھر ہونے جارہا ہے، ایک ماں کے دِل کے ریڈار پر ریڈنگ اچھی نہیں آرہی تھی۔

❖❖○❖❖

دروازہ بُری طرح کھٹکھٹایا جارہا تھا، آیا امّاں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔

''اللہ خیر کرنا!'' بے اختیار انہوں نے دھڑ دھڑاتے دِل سے دُعا کی تھی۔ وہ نیند کی دوا لے کر سوئی تھیں یوں اچانک آنکھ کھلنے سے اُن کا دل بے ترتیب ہوکر اپنی رفتار بھی بے ترتیب کرگیا، پھولتے سانس کے ساتھ انہوں دروازہ کھولا۔

''بڑی امّاں! وہ..وہ!'' بلال بُری طرح ہراساں تھا۔

وہ تو بہت گم سم رہنے والا بچہ تھا، کم ہی یوں کسی نے اُس کی کبھی آواز سنی ہوگی۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' آیا امّاں نے پریشان ہوکر اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''وہ..وہ دلہن کے خون نکل رہا ہے وہ رو رہی ہے۔'' بلال نے خود بھی سسکیاں لینی شروع کردیں۔

بے شک شہر بانو کے ساتھ اُس کے ازدواجی تعلقات نہ تھے نہ ہی اُس کا سویا ہوا دماغ اِس رشتے کی اہمیت کو سمجھتا تھا لیکن شہر بانو نے اپنے دھیمے انداز اور پیار سے بلال اور اپنے بیچ دوستی کا بے حد خوب صورت تعلق بنالیا تھا۔ شاید یہ ہی وجہ تھی بلال اُس پر اعتبار کرنے لگا تھا اُسے اپنے کمرے میں رہنے دینے لگا تھا اور اُس کا بے حد خیال رکھنے لگا تھا۔ اب بھی وہ شہر بانو کے لیے پریشان ہوکر آیا امّاں کی طرف بھاگا تھا۔

''بیٹا حوصلے سے...!'' آیا امّاں نے اُسے تسلّی دی اور سلیپر پیروں میں ڈال کر اُس کے ساتھ ہولیں۔

''مجھے تم بتاؤ کہ کیا ہوا؟ کہیں تم نے اپنی دوست کو مارا تو نہیں؟'' آیا امّاں نے بلال کے ساتھ چلتے چلتے پوچھا۔

''میں نے تو دلہن کو کچھ نہیں کہا، وہ تو بہت اچھی ہے! میرے سارے کام کرتی ہے مجھے پیار کرتی ہے اور جب مجھے آگ لگتی ہے تو وہ کچھ پڑھ کر میرے اُوپر پھونکتی ہے پھر میرے اندر آگ کم ہوجاتی ہے۔''

بلال کو عرصہ دراز سے عجیب وغریب بیماری تھی، اُس کا جسم اچانک بُری طرح جلنے لگتا تھا ایسے کہ جیسے اُسے آگ لگی ہو، ایسے میں وہ پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا تھا۔ اُس کے دماغ کی کچھ نسیں دب گئی تھیں جس کی وجہ سے وہ نارمل لڑکوں کی طرح بی ہیو نہ کرتا تھا۔ بلال کے لہجے میں بے حد سچائی تھی۔ آیا امّاں نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھا۔

''میرا بیٹا تو بہت اچھا ہے، بہت سمجھ دار ہوگیا ہے!'' آیا امّاں واضح طور پر اُس کے اندر شہر بانو کے آجانے کے بعد فرق محسوس کرتی تھیں۔ شہر بانو بلال کے لیے جلتی ہوئی آگ پر ٹھنڈی پھوار کا اثر کررہی تھی۔

''آیا امّاں! رات میں حمیدہ ماسی کے پاس تھا وہ مجھے فلم دکھانے لے کر گئی تھی سپر مین والی، پھر میں نے دلہن کے رونے کی آواز سنی، میں نے جاکر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن دلہن مجھے بلاتی رہی، روتی رہی لیکن دلہن نے دروازہ نہیں کھولا، میں تو دلہن سے ناراض ہوگیا تھا کہ وہ میری بات نہیں سنتی، لیکن جب مجھے بہت غصّہ آیا تو بابا جان نے دروازہ کھولا۔ بابا جان بہت اچھے ہیں وہ میری بات ہمیشہ مانتے ہیں لیکن دلہن گندی ہے، جب دلہن روتی ہے تو میں بہت دُکھی ہوتا ہوں۔ آپ اُس کو چل کر چپ کراؤ اُس کے خون بھی نکل رہا ہے!'' بلال ایک کے بعد ایک دھماکہ کررہا تھا۔

آیا امّاں صدمے کی حالت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں، دُکھ اور تکلیف کا ایک لاوا سا اُن کے دِل سے پھوٹا جس میں وہ پگھل پگھل کر ٹوٹ ٹوٹ کر بہے جارہی تھیں۔

''اُف میرے خدا! اللہ میرا خدشہ غلط کردینا!'' انہوں نے صدقِ دل سے دُعا کی لیکن دِل کسی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ وہ کسی بہت بڑی قیامت کی خبر دے رہا تھا۔

''آیا امّاں! چلیں نا۔ آپ رُک کیوں گئیں؟'' بلال نے ہاتھ پکڑ کر اصرار کیا۔

''میں آرہی ہوں بیٹا!'' آیا امّاں کسی زندہ مردے کی طرح خود کو گھسیٹتے ہوئے چلیں، یوں لگ رہا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے اُن کے سارے وجود کا خون نچڑ کر رہ گیا ہو۔

بلال کا کمرہ خاصا دُور تھا، دو تین راہ داریاں کراس کر کے وہ بلال کے کمرے تک گئی تھیں۔

''بڑی امّاں آ ؤ نا!'' بلال نے آپا امّاں سے کہا۔

آپا امّاں نے لرزتے قدموں سے کمرے میں قدم رکھا۔ کمرے کی اور شہر بانو کی ادھڑی حالت چیخ کر اُن کے خدشے کو درست ثابت کر رہی تھی۔

آپا امّاں کی جرأت نہ پڑ رہی تھی کہ وہ شہر بانو سے نگاہ ملائیں، پھر بھی وہ ہمت کر کے اُس کی طرف بڑھیں۔

''شہر..شہر بانو!'' انہوں نے خشک گلے کو تھوک سے تر کرتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔ جن نظروں شہر بانو نے اُن کو دیکھا، اُن کے ہونٹوں سے بے اختیار سسکی نکلی۔

اُن کی نظروں کے سامنے بہت برسوں پہلے کے منظر گھوم گئے۔ رانی کا خوب صورت وجود کا کٹا ہوا، اُس کی رحم مانگتی اَدھ کھلی نگاہیں! پھر...!!

پھر امنگوں بھری نفیسہ کی ادھڑی حالت! جو جیتے جی مرگئی تھی! زبیدہ کا بلکتا سسکتا وجود! اور کئی ایسے بے گناہ معصوم وجود ایک ہی بھیڑیے کا شکار ہوئے تھے۔

اور آج اتنے سالوں بعد پھر... پھر وہی کہانی سامنے تھی لیکن یہاں اتنے نازک اور پاکیزہ رشتے بے حرمتی ہوئی تھی... اس کہانی کا کیا انجام ہونا باقی تھا؟

آپا امّاں کا وجود تیز آندھیوں میں تھا۔

شہر بانو یوں گم سم ٹکر ٹکر سامنے دیوار کو گھور رہی تھی، جیسے وہ پتھر کی ہو چکی ہو، اُس نے بس ایک زخمی آپا امّاں پر ڈالی پھر دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔

نیم برہنہ کپڑوں سے بے پرواہ ساکن تھی، خاموش تھی۔

بھیڑیے نے نوچ نوچ اُسے کھا ڈالا تھا، مار ڈالا تھا۔ یہ تو اُس کا ''پنجر'' باقی تھا۔

''شہر بانو کچھ تو بولو بیٹا!'' آپا امّاں نے تڑپ کر اُسے ہلا کر کہا۔

شہر بانو نے ایک خالی نگاہ اُن پر ڈالی۔

''پنجر نہیں بولا کرتے!''

''شہر بانو کیا ہوا؟'' آپا امّاں رو ہی پڑیں۔

''قیامت آئی تھی۔ لیکن قیامت کے بعد تو روز حساب شروع ہوتا ہے نا! تو میرا حساب، میرا بدلہ کون لے گا؟ کب میرے ساتھ ہوئے ظلم کا حساب ہوگا؟ دیکھو اِس کے چوٹ لگی ہے! خو۔ خون۔ خون ہے۔'' بلال نے شہر بانو کا ماتھا چھو کر کہا۔ وہ تو تھوڑا سا خون دیکھ کر ہراساں ہو جاتا تھا، جب کہ شہر بانو کے ماتھے سے تو ٹھیک ٹھاک خون بہہ رہا تھا۔

''شہر بانو!'' آپا امّاں نے شہر بانو کو ہلایا تو وہ جھٹکے سے گری تھی یوں جیسے بے جان مٹی کا بُت ہو۔ امّاں نے گھبرا کر شہر بانو کو اُٹھایا، وہ بے جان گڑیا کی طرح اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''تُو کیوں واپس آئی تھی؟ تجھے معلوم بھی تھا کہ سید سرفراز وہ شیطان ہے، جو کبھی بھی اپنے ساتھ والی کی بھی حرمت کا بدلہ نہیں رکھتا، یہاں تو اُس کی بیٹی کا معاملہ تھا، کیسے تیرے گھر والے عقل کے اندھے تھے تجھے بھیڑیے کے حوالے کر دیا!'' آپا امّاں کے لہجے میں ایسا دُکھ تھا، جیسے کچھ کھونے پہ کوئی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

''میں بھی کل رات ہی واپس آئی تھی مسکان کو لے کر، مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ تم واپس آ گئی ہو، یہ تو بلال نے بتایا کہ...'' آپا امّاں صفائیاں دے رہی تھیں لیکن لفظ، تسلیاں کچے برتنوں کی طرح ٹوٹ رہی تھیں اور کچے برتن کہاں دُکھ کے آنسو اپنے اندر سنبھال سکتے ہیں۔ آپا امّاں کو اپنی ہر بات بے کار لگ رہی تھی۔

''شہر بانو!'' انہوں نے اُسے پھر ہلایا اور پھر بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

بلال نے مزید ہراساں ہو کر شہر بانو اور آپا امّاں کو دیکھا اور وہ بھی رونے لگا۔

وہ جو بلال کی ذرا ذرا تکلیف پر تڑپ اُٹھتی تھی آج اُس کے کانوں تک کسی آواز کا اثر نہ پڑ رہا تھا۔

''دلہن! آپا امّاں دلہن کو کیا ہوا، یہ بولتی کیوں نہیں؟'' بلال نے روتے ہوئے تڑپ کر پوچھا۔

''تم کیسے مرد ہو؟ اپنی بیوی کی حفاظت نہ کر سکے۔''

دُکھ تو یہ ہے کہ اپنی ہی ''چھت'' جس کو سائبان جانا وہ ہی سر پر آن گری!

''جب اپنی چھتیں سایہ دینے، پناہ دینے کے بجائے گر کر انسان کو ڈھا دیں تو باہر کی دنیا سے کیا گلہ!'' آپا امّاں سسک رہی تھیں۔

''بی بی جی! وہ... وہ چھوٹی بی بی کے گھر والے آئے ہیں۔'' ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔

ملازمہ کی بھی ہَوائیاں اُڑی ہوئی تھیں کل رات کی قیامت کا کچھ حصہ وہ بھی تھی، وہ ہی تو بلال کو کمرے سے اُٹھا کر لے گئی تھی۔ اب دِل و ضمیر پچھتاوے میں گھرا ہوا تھا۔ وہ شہر بانو سے نظر نہ ملا پا رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس نے کسی کا قتل کر ڈالا ہو۔

''اِس وقت! اُن کو کسی نے بتا تو نہیں دیا؟ یا اللہ یہ کیا قیامت ہے! اِس کا سامنا کیسے ہوگا؟'' آپا امّاں نے لرزتی ٹانگوں سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''کدھر ہے شہر بانو! یہ تم لوگ شہر بانو سے ملنے کیوں نہیں دے رہے؟'' سعادت علی نے اپنی بیوی ارم بی بی کے ساتھ داخل ہوتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اندر کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''شہر بانو! یہ تجھے کیا ہوا ہے۔'' ارم بی بی جو اُس کی ممانی اور پھوپھو تھیں، تڑپ کر لپکیں۔

سید سعادت علی کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں اور تنفس غصّے سے بے ترتیب ہو رہا تھا۔

شہر بانو نے ایک دم سر اُٹھا کر ماموں ممانی کو دیکھا، پھر ایک دم اُس کے چہرے پہ جیسے زلزلہ سا آ گیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ سب کی سوالیہ نظروں کا جواب نہیں دے پائے گی اور ایسا سچ کبھی بھی نہ بتا پائے گی جس کو بتانے سے بہتر تھا وہ مر جائے!

ہاں وہ مر جائے!! جیسے کسی نے ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا تھا۔ پھر وہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی کٹے پھٹے کپڑوں کے ساتھ بنا دوپٹے کے وہ سید سعادت علی کی غیرت کے لیے ایک بہت بڑا تازیانہ تھی۔ وہ اُس کی یہ حالت برداشت نہ کر پا رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''شہر بانو کدھر جا رہی ہو؟''

شہر بانو تیزی سے ماموں کے پاس سے گزرتی ہوئی باہر کو دوڑی۔

''بانو! گڑیا!'' ماموں نے اُسے پکارا اور پھر سب ہی باہر کو لپکے۔

''یہ... یہ کہاں جا رہی ہے؟'' ارم بی بی نے اُس کے پیچھے لپکنے کے ساتھ روتے ہوئے پوچھا۔

''بانو! آپا اماں نے شہر بانو کا رخ دیکھ کر ہراساں ہو کر اُس کی جانب دوڑ لگائی تھی کہ وہ اُسے روک سکیں، اُن کا دل خوف سے بند ہونے کو تھا۔

''شہر بانو! رکو بیٹا!'' آپا اماں نے بھی اُسے پکارا سب ایک دم ڈر کر چیخے تھے کہ وہ رُک جائے لیکن اُس نے مڑ کر سب کی جانب بس ایک نگاہ ڈالی تھی۔ کیا کچھ نہ تھا اُس کی نگاہ میں، پھر لیکن بس ایک پل!!

ایک پل لگا تھا وہ ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل گئی تھی۔

فضا میں شہر بانو کی آخری چیخ کے ساتھ بہت ساری بے یقین دُکھ بھری چیخیں اُبھری تھیں۔

''نفیسہ! یہ کنواں اندھا نہیں ہے، یہ تو زندہ لاشوں کی قبر ہے! جو اُس پل کھلتی ہے، جب جب یہاں کی روایات، یہاں کے مرد ہم عورتوں کی زندگی کو تنگ کر دیتے ہیں۔ فیصلوں کی سلیب بنا کر ہمیں لٹکاتے ہیں۔ تم نہیں جانتیں یہ اندھا کنواں نہیں یہ تو قبر ہے، جو اِس حویلی کی بہو، بیٹیوں کے لیے اِن دالانوں، کمروں کے ساتھ بنائی گئی ہے، ڈیزائن کی گئی ہے تاکہ وقت ضرورت اِس میں زندہ لاشیں ڈالی جا سکیں۔''

آپا اماں کے کانوں میں دُور کہیں سدرہ بی بی کی سسکی بھری آواز گونجی تھی، ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی اُبھری تھی۔

اُن کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

پھول سے چہرے اور کومل سے وجود کو اُس اندھیری قبر نے نگل لیا تھا۔

''ہائے شہر بانو! ارے کوئی میری شہر بانو کو دیکھو!'' سعادت علی کنویں میں جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے لیکن سوائے اندھیرے کے اُن کو کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔

ارم بی بی چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ سعادت علی باہر ملازموں کو لینے دوڑے تھے تاکہ مدد لے سکیں۔

آپا اماں کو دائیں جانب بہت شدت کے ساتھ درد محسوس ہوا تھا۔ لیکن ابھی وہ درد کو سنبھال ہی رہی تھیں کہ اُن کے پیچھے سے بلال نکل کر کنویں کی جانب ''دلہن... دلہن'' کرتا لپکا۔

''بلال!'' آپا اماں گرتی پڑتی اُس کی جانب لپکیں۔

''بلال!'' اُن کی آواز دُکھ اور خوف سے پھٹ گئی تھی۔

بلال...!! رُکو...!'' آپا اماں نے بلال کو روکنے کی کوشش کی...

❖❖○❖❖

چاندنی گنگنانے لگی کس لیے
تارے آنگن میں آنے لگے کس لیے

کس لیے رنگ منہدی کا کھلنے لگا
پھول ہم کو ستانے لگے کس لیے
بس تمہارے لیے...!
بس تمہارے لیے...!

''بہت خوش ہیں آپ!'' مہوش نے کھانے کی ٹرے طارق کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ طارق جو آنکھیں موندے تنگی کے خیالوں میں مگن تھا، شاید اُس کے چہرے پر بے حد خوب صورت مسکراہٹ بھی تھی جو اِس قدر بے خودی تھی کہ خود طارق جیسے محتاط انسان کو بھی اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

''یہ تم کیوں کھانا لائی ہو، زینت کدھر ہے؟'' طارق نے ٹانگیں سمیٹ لیں۔

''کیوں آپ کو میرا کھانا لانا بُرا لگا؟'' مہوش نے حسبِ معمول ایک دم حساس ہو کر پوچھا۔

''نہیں! مجھے تمہارا کھانا لانا بالکل بُرا نہیں لگا، لیکن جب ملازم موجود ہوں تو تمہیں ریسٹ کرنا چاہیے۔'' طارق نے بے حد نرمی سے اُسے سمجھایا۔

''ریسٹ ہی ریسٹ ہے، میں بھلا یہاں کرتی ہی کیا ہوں!'' مہوش نے اُداس ہو کر کہا۔

ایک وقت تھا کہ سب افراد خانہ موجود تھے، اُسی لحاظ سے رونق تھی، گھر کے کام موجود تھے لیکن اب اُس کے آس پاس کوئی نہ تھا اور نہ ہی کوئی کام تھا۔

زندگی جب تک متحرک رہے، زندگی لگتی ہے جیسے ہی وہ رُکتی ہے تو موت سی لگتی ہے۔ مہوش کو بھی یہ خالی، یہ بے انتہا فراغت موت سی لگتی تھی۔ اِس لیے جس روز طارق نے آنا ہوتا تو وہ پَل پَل اُس کے انتظار میں، اُس کے لیے سنگھار میں اور اُس کے کاموں میں گزارتی تھی۔

اُس کے لیے تو ہفتے میں وہ ہی دن زندہ ہوتے تھے، جب جب طارق آتا تھا۔

طارق کے چہرے پہ اپنی بات کا ردِعمل دیکھ کر بے حد شرمندگی دَر آئی تھی۔

''ایم ریئلی سوری! میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تمہارا دِل دُکھے!'' طارق نے فوراً معذرت کر لی۔

''تم خوش رہا کرو۔'' طارق نے دِل سے کہا۔

''اچھا...!'' مہوش نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''پہلے مجھے یہ تو بتائیں کہ آپ کیوں اتنے خوش ہیں؟ سم تھنگ اسپیشل؟'' وہ طارق کی آنکھوں کو بغور دیکھتے پوچھ رہی تھی۔

''کیوں! تم کو کیوں ایسا لگا؟'' طارق نے پوچھا۔

''کیوں کہ آپ کے چہرے پہ خاص طرح کی چمک ہے، مسکراہٹ ہے جو کچھ پا لینے پر چہرے پر ابدی کی طرح نقش ہو جاتی ہے۔''

''ارے! یہ تم کیسے اتنی بڑی اور گہری باتیں کرنے لگی ہو؟'' طارق نے خوش دِلی سے کہا۔

''ٹالیے نہیں۔ بتائیے نا!'' مہوش نے اصرار کیا۔

''کیا...؟'' طارق نے پلیٹ میں سالن ڈالتے پوچھا۔

''یہ ہی کہ آج آپ اتنے خوش کیوں ہیں کہ آپ کی ساری ذات اتنی چمک رہی ہے، کیا ایسا مل گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اتنی خوشی مل گئی۔'' مہوش نے دھیرے سے پوچھا۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ ایسا ہے!'' طارق نے چونک کر پوچھا۔

''جو دِلوں میں بستے ہیں، وہ خون میں دوڑتے ہیں طارق آپ کا مزاج، آپ میری انگلیوں کی پوروں پر ہیں، جتنا میں آپ کو سوچتی، دیکھتی ہوں اتنا تو شاید آپ کو بھی اپنے لیے وقت نہ ملا ہو۔'' مہوش نے سے کہا۔

''واقعی تم سچ کہتی ہو! میں خوش ہوں مجھے کچھ ایسا مل گیا ہے، جسے کھونے کا ڈر میری سانس بند کرلے لگتا ہے!'' طارق نے اقرار کیا۔ اقرار کرتے ہوئے شاید وہ خود میں بھی نہ تھا کہ اُسے اپنے لفظوں ا لہجے میں چھلکتے جذبات کا احساس تک نہ ہوا۔

مہوش کا چہرہ ایک دم سیاہ پڑ گیا۔

وہ طارق کے لیے بہت زیادہ حساس تھی!

''کیا مل گیا ہے طارق!'' مہوش کی آواز کنویں سے آئی تھی۔

طارق ایک دم ہوش میں آ گیا۔ اُسے اپنی بات اور لہجے کا ایک دم احساس ہوا۔

''ارے! تم میری بیوی ہو اور بیوی سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے، میں وعدہ کرتا ہوں وقت آنے پہ سب سے پہلے تم کو بتاؤں گا۔''

''تب تک تم ذہنی طور پر اتنی مضبوط ہو چکی ہو گی کہ کم از کم میرے دل کی بے بسی کا اندازہ کر کے سمجھ سکو گی کہ نگینہ میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہے اگر وہ مجھے نہ مل سکی تو میں شاید زندگی میں کبھی محبت نہ کر سکوں گا میری زندگی میں وہ محبت کا انسپائریشن ہے!''

''وعدہ...!'' مہوش نے دھیرے سے مسکرا کر اصرار کیا۔

''پکا وعدہ...!'' طارق نے بھی خوش دلی سے اقرار کیا۔ وہ جان گیا تھا، اُس نے مان لیا تھا اُسے اپنی زندگی میں مہوش اور نگینہ کو اب ساتھ ساتھ رکھنا ہو گا، مقام اور جگہ دینی ہو گی۔ کیوں کہ...

کیوں کہ ایک کو اللہ نے بن مانگے اُس کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور دوسری کے لیے اُس نے اپنے من کی جھولی اللہ کے سامنے پھیلا رکھی تھی اور قدرت کا تو یہ ہمیشہ سے قانون ہے کہ اگر انسان اللہ کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے تو ہی اُسے انعام کے طور پر اُس کی من کی مُراد نصیب ہوتی ہے۔

طارق بھی مہوش کو قدرت کی رضا جان کر دھیرے دھیرے قبول کرنے لگا تھا۔

''طارق آپ چائے پئیں گے یا کافی؟'' مہوش نے ایک دم اُس کے پاس سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کافی!'' طارق کا دھیان کھانے کی جانب تھا ورنہ وہ جان جاتا کہ مہوش کا رنگ بے حد پھیکا پڑ چکا اور خود کو ضبط کرنے کے لیے اُس نے کچن کا رُخ کیا تھا۔

طارق دیکھ لیتا تو اُسے مہوش کا یہ ایک پہلو دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی کہ اُس نے ضبط کرنا کافی سیکھ تھا۔

مہوش بے جان سے پاؤں گھسیٹتی کچن میں داخل ہوئی۔

''طارق! آپ کی زندگی میں ایسا کیا شامل ہوا ہے کہ آپ کے سارے وجود سے الگ طرح کی خو

روشنی نکل رہی ہے۔ وہ روشنی جس کی میں نے ہمیشہ تمنا کی ہے۔ میں خود غرض ہوں یا جنونی پاگل! میں آپ کی زندگی میں کسی کو حق جمانے نہیں دے سکتی نہ دوں گی... آپ صرف اور صرف میرے آپ کو کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔'' وہ جھلس کر بولی، اُس کے اندر ایک اَن دیکھے احساس سے لگی ہوئی تھی۔

''آپ صرف اور صرف میرے ہیں!'' ہوش مسلسل بولے جا رہی تھی، عجیب سی کھولن تھی اُس کے بالکل سامنے ساس پین میں رکھے کھولتے پانی کی طرح۔

جو کھول کھول کر، اُبل اُبل کر ختم ہوتا جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

وہ تو کاشف بالکل نہ تھا!

شاید اُس کا کوئی سایہ تھا یا اُس سے ملتا جلتا کوئی بوڑھا انسان تھا۔ وہ صحت مند، سرخ و سفید، کاشف تو جانے کہاں کھو گیا تھا۔

اس کاشف کو ایک موٹی سی زنجیر سے باندھا گیا تھا۔

''یہ.. یہ کیوں باندھی ہے؟'' انور صاحب نے تڑپ کر ڈاکٹر سے پوچھا۔

''مریض کو نشے کی عادت ہے، جب اُسے نشہ نہیں ملتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اِس لیے یہ ان لگانا بے حد ضروری ہیں۔'' ڈاکٹر کے تفصیلی جواب نے انور صاحب کو بے حد دُکھی کر دیا۔

طارق اُن کو یہاں تک لایا تھا۔ کاشف کے پاس اُن کو چھوڑ کر وہ خود بڑے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا تھا کہ انور صاحب بے یقینی سے کاشف کو دیکھتے رہے۔

چھ فٹ سے اونچا لمبا انسان، یہ اُن کا بیٹا اُن کا غرور تھا۔ آج اُن کا غرور ملیا میٹ ہو گیا تھا۔

''جنسی تشدد اور نشے کی عادت نے اِن کو فزیکلی اور مینٹلی دونوں طرح سے نقصان دیا ہے۔'' ڈاکٹر مزید بم پھوڑا۔

''یا خدایا! کیا مجھے یہ دن بھی دیکھنے تھے۔'' انور صاحب کاشف کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے اور اُتار کر اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے، وہ یک ٹک کاشف کو دیکھے جا رہے تھے اِس وقت اُن کو آپ بے حد خالی لگ رہا تھا، ہر طرف سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

اُسی پَل ایک دم ہی کاشف نے بیڈ کو جھٹکے دینے شروع کر دیے۔ بیڈ کو وہ اِس قدر طاقت سے کھینچ رہا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زلزلہ آ گیا ہو۔

وہ اتنی دیر سے نیند کی دوا کے اثر میں تھا۔ ہوش کی دُنیا اُس کی برداشت سے بالکل الگ تھی، بے چینی میں کیسے تکلیف ہوتی ہے وہ عام درد سے مختلف اور بے حد اذیت ناک ہوتی ہے۔

''چھوڑو مجھے...!'' کاشف چیخ رہا تھا۔

''کھولو مجھے... مجھے ایک.. ایک انجکشن لگا دو! بس ایک!!'' وہ سب سے منت کر رہا تھا۔ اُسے اپنی میں اپنے باپ کا چہرہ بھی نظر نہ آیا تھا۔ اُسے اِس پَل کسی سے غرض نہ تھی ماسوائے نشے کے...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کاشف! کاشف۔'' انور صاحب نے آگے بڑھ کر اُسے پکارا۔
''کون؟'' ایک پَل کو صرف ایک پَل کو اُس نے رُک کر پوچھا۔
''میں تمہارا باپ۔ تمہارا ابو!'' انور صاحب نے تڑپ کر اُس کا چہرہ تھاما۔
''اچھا! تم میرے باپ ہو، تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے اثبات میں جلا جلدی سر ہلایا۔
اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے نم تھیں۔
''تو پھر لاؤ میرا انجکشن!'' اُس نے اپنی غرض دکھائی۔
''تم میرے لیے لا سکتے ہو انجکشن، دیکھو تم نے وعدہ کیا ہے تم نے ابھی کہا ہے کہ تم مجھ سے کرتے ہو، دیکھو میرا کیا حال کردیا ہے اِن ڈاکٹروں نے۔'' اُس نے اپنی بیڑیوں کی جانب اشا کرکے کہا۔
''تم مجھے انجکشن لاکر دو گے؟'' وہ اصرار کررہا تھا۔
''دیکھو بیٹا!'' انہوں نے اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہا۔
''ڈاکٹر تمہارا علاج کررہے ہیں اور وہ بہتر کررہے ہیں تمہارے ساتھ، یہ سب کچھ تمہارے علاج حصہ ہے۔'' انور صاحب نے اپنی جانب سے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کاشف تو ایک دم بھڑ اُٹھا۔
''شٹ اَپ!'' وہ دھاڑا۔
''بیٹا!'' انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔
''چپ بڈھے! اگر تو نے مجھے انجکشن لاکر دینا ہے تو دے ورنہ مجھے یہ تقریر، یہ بھاشن نہ دے کاشف کی آنکھوں میں لال ڈورے تھے، کچھ دیر کو تو انور صاحب بھی گھبرا گئے۔
وہ ایک دم آپے سے باہر ہوگیا، اُس کے منہ سے چیخوں اور گالیوں کا طوفان اُٹھا تھا۔
انور صاحب دُکھ سے سکتے کی کیفیت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اُن کا دل اپنے پیارے اِس حالت میں دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
''انکل! حوصلے اور ہمت سے کام لیں!'' طارق جو ابھی وہاں پہنچا تھا، اُس نے اُن کو تسلّی دی۔
''یہ۔ یہ میرے کاشف کو کیا ہوگیا؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔
اولاد تو ہر انسان کی کمزوری ہوتی ہے لیکن کاشف تو اُن کی زندگی کی مضبوطی تھا، وہ جسے مضبوطی ما دیکھتے اور جیتے تھے آج کیسے خود کو اور اُن کو کمزور کر گیا تھا۔
منزہ کی موت نے اُن کے قلعے کی سنگلاخ دیواروں کو توڑ ڈالا تھا تو آج کاشف نے اُن کے موجود بے حد حساس دِل کو توڑ ڈالا تھا۔
''انکل پلیز! خود کو سنبھالیں!'' طارق اُن کو کھینچ کر باہر لے آیا۔
انور صاحب پیچھے مڑ مڑ کر کاشف کو دیکھ رہے تھے، جہاں نرسیں اور ڈاکٹرز کاشف کو قابو کر کوشش کررہے تھے، ڈاکٹرز نے کاشف کو باندھ کر بجلی کے جھٹکے لگائے۔

''امی!!'' کاشف کے مسلسل تڑپتے تڑپتے آخر میں کراہ کی طرح منہ سے نکلا۔
انور صاحب تو وہیں ڈھے گئے۔
''انکل! وہ ٹھیک ہوجائے گا۔ انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گا اُس کا مسلسل علاج چل رہا ہے۔''
ل نے اُن کو بے حد تسلّی دی۔
''وہ۔ وہ ایسا نہیں تھا۔'' انور صاحب نے جیب سے رومال نکال کر آنسوؤں کو پونچھ کر کہا۔
''سب ٹھیک ہوجائے گا!'' طارق نے اُن کو تسلّی تو دے دی تھی لیکن کاشف کی جسمانی اور ذہنی صحت بارے میں وہ ڈاکٹر سے بات کرکے آیا تھا۔ اِس کو بہت احتیاط اور توجہ کی ضرورت تھی اِس کے علاوہ کا علاج بھی خاصا مہنگا تھا، جو انور صاحب جیسے شخص کی استطاعت سے دور تھا۔ میں ولی سے بات وں گا تاکہ کاشف کا علاج اچھا ہوسکے۔ طارق نے انور صاحب کے ساتھ ہسپتال سے باہر آتے دِل ال میں سوچا۔

میں نے کیسے جتن سے تختی لکھی تھی
وقت نے کیسا مٹا دیا آسانی سے

انور صاحب بار بار مُڑ مُڑ کر ہسپتال کی عمارت کو دیکھ رہے تھے، جہاں اُن کا لختِ جگر موجود تھا۔ آج کی حالت دیکھ کر وہ خود ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ انسان جس بچے کو اپنا سہارا لگتا ہے کہ بڑھاپے میں وہ اُس کے بڑھاپے کی لاٹھی بنے گا تو ہمیشہ ہی اپنی توقع سے کم پاتا ہے۔ کا برتن ہمیشہ ٹوٹتا ہے! سہارا تو ہمیشہ صرف ایک ہی ذات کا ہونا چاہیے، سب سے بڑی ذات کا۔ اللہ سوہنے کی ذات کا، جو ہر بے سہارا کا اصل سہارا ہے۔ انور صاحب نے بھی اللہ سے سہارے کے گڑگڑا کر دُعا مانگی۔
وہ ہی انور صاحب تھے، جو حُسن آرا بیگم کی عبادتوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے، جن کے لیے اللہ اور کی عبادت بڑھاپے کی عمر کی ایک ایکٹویٹی تھی، لیکن آج جیسے ہر جانب آئینے آ کھڑے ہوئے تھے، ہاں جانب سے اُن کو اپنا قصور اور خطا نظر آنے لگی تھی۔
انسان اگر سرکش ہے تو وہ اللہ کی ذات ہمیشہ کی بے نیاز ہے!
انسان اگر تابع دار اور ماننے والا ہے تو بھی اللہ کی ذات نوازنے کے لیے ہمیشہ کے لیے بے نیاز

❖❖○❖❖

''ایمان!''
''ایمان فاطمہ!'' خالہ بے ہوشی میں اِدھر اُدھر سر مارتی مسلسل ایمان فاطمہ کو پکار رہی تھیں۔ رانی نے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا۔
''خالہ! خالہ یہ دیکھو، یہ میں ہوں رانی!'' رانی نے خالہ کو ہوش دلانے کی کوشش کی۔
''وہ۔ وہ میری ایمان فاطمہ تھی! تم نے اُسے روکا کیوں نہیں؟'' خالہ نے آنکھیں کھول کر نقاہت سے اُسے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''شکر ہے تجھے ہوش تو آیا۔'' رانی نے سکون بھرا سانس لیا۔

''دو دِن سے تو بے سُدھ پڑی بس بڑ بڑ کرتی رہی ہے کم بخت یہ ڈاکٹر بھی تو کچھ نہیں بتاتے، غر
اور اَن پڑھ کی بھی کوئی زندگی ہے! کوئی بھی اُن کو مریض کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔'' رانی حسبِ معمول ا
رہی تھی، خالہ کی بے ہوشی کے دِن اُس نے دہل دہل کر گزارے تھے۔

''بڑے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آج تمہارا ہوش میں آنا بے حد ضروری ہے۔ شکر اللہ کا اُس نے تجھے
دیا۔'' رانی نے کچھ سکون بھرا سانس بھرا۔ وہ دھیرے دھیرے خالہ کے بال سہلا رہی تھی۔

''رانی! وہ میری ایمان فاطمہ تھی۔'' خالہ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''خالہ کیسی باتیں کرتی ہو، تم کو تو ہر خوب صورت لڑکی اپنی بیٹی لگتی ہے۔ وہ تو راجی کی مالکن تھی۔ ا
تیری بیٹی کیسے اتنی بڑی ہوسکتی ہے؟ وہ بھی تو تیرے میرے جیسی ہی ہوگی نا! نہ ہر لڑکی کو دیکھ کر بھاگ
کئی بار تُو مرتے مرتے بچی ہے کبھی گاڑیوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی ہے تو کبھی سڑکوں پہ ماری ما
پھرتی ہے، تیرا حال سے بے حال ہوگیا لیکن مانتی نہیں ہے۔'' رانی بولتے ہوئے تھرماس سے چا
نکالنے لگی۔ اُس نے بسکٹ کا پیکٹ کھول کر دو بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور چائے اور بسکٹ لے
اُن کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

''اُٹھو۔ اُٹھ کر کچھ کھالو، کتنی پیلی پڑگئی ہو۔''

رانی نے پیار سے خالہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اِس عورت کے ساتھ اُس کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا لیکن
کبھی دِل کے رشتے، خون کے رشتوں سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

خالہ کے ساتھ بھی تو اُس کا دِل کا ہی رشتہ تھا۔

''رانی! مجھے اُس کے پاس لے جا۔'' خالہ نے ایک دم رانی کا ہاتھ تھام کر منت بھرے لہجے میں
اُن کی آنکھوں میں بے حد وحشت بھری ہوئی تھی۔ ایسی وحشت جو جنون کی حد کے پاس کھڑی زورا
ہے۔ ضد اور بے حد بے بسی دونوں ایک ہی تو پہلو ہیں لیکن جب جب ساتھ مل جاتے ہیں تو انسان
حواس تک ختم کرجاتے ہیں۔

''خالہ! کتنی بار بتاؤں وہ تیری بیٹی نہیں تھی وہ راجی کی مالکن تھی اور اُس کا نام ترنم تھا۔'' رانی نے
بات کو دوبارہ دُہرایا۔

''نہیں! وہ میری ایمان فاطمہ ہی تھی۔'' خالہ ایک دم چیخ کر بولیں۔

''میں! میں تجھے جھوٹی لگتی ہوں، میرا دِل اپنی ہی بیٹی کے لیے دھوکا کھا سکتا ہے، وہ میری بیٹی تھ
ایمان فاطمہ تھی!!'' خالہ نے پورے حلق سے چیختے ہوئے کہا۔

اُن کی آنکھیں باہر کو آرہی تھیں، بے حد سرخ ہورہی تھیں۔

''خالہ۔ خالہ!'' رانی نے پیار سے اُن کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے آپے سے باہر
تھیں۔

''وہ۔ ایمان تھی!!'' جیسے جیسے وحشت اور جنون اُن پر حاوی ہوتا جارہا تھا اُن کی آواز بھاری
جارہی تھی۔

''میری ایمان!'' اُن کے ہاتھ پاؤں ایک دم مڑنے لگے۔

''میری بیٹی! میری چندا!!'' اب اُن کے دانت ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے تھے۔

''اوہ نہیں!'' رانی نے اُن کو دیکھ کر بے حد دُکھ سے کہا۔

خالہ کا دورہ بے حد خطرناک ہوتا تھا، ایسے میں وہ مہینوں حواس کھوئے دنیا سے بے خبر ہوجاتی تھیں۔

''خالہ!'' رانی نے دُکھ سے خالہ کو تھامنے کی کوشش کی لیکن ان کا جسم بے حد اکڑ گیا تھا وہ اب ہر کسی
بے خبر عجیب سے سکتے میں تھیں۔

''بیٹی!
چندا!!
فاطمہ۔ ایمان!!'' لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر سرگوشیوں میں اُن کے لبوں سے آزاد ہوئے تھے۔

''خالہ۔'' رانی کی آواز روہانسی ہوگئی۔

لیکن خالہ اُس کو کہاں سُن رہی تھیں وہ تو ریت کی مانند اُس کے ہاتھوں سے پھسلی تھیں اور کٹے ہوئے
شاخ کی طرح بستر پر گری تھیں۔

رانی نے بے حد احتیاط سے اُن کو لٹایا اور ایک دُکھ اور تاسف بھری نگاہ اُن پر ڈالی۔

پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے بڑے ڈاکٹر کو ڈھونڈنے نکلی تاکہ کوئی آکر خالہ کو چیک کرجائے۔

اس کا دِل خالہ کے دکھ پر دُکھی ہورہا تھا۔

کیسی کرموں جلی عورت تھی۔ ایک مسلسل تلاش اور کرب میں تھی۔

''ربّ سوہنے اِس بلکتی تڑپتی ممتا کو سکون دے دے اِس کو اِس کی بیٹی سے ملوادے!'' رانی نے بے
صدق دِل سے اُس کے لیے دعا کی۔

❖❖○❖❖

میں اُداس رستہ ہوں شام کا، مجھے آہٹوں کی تلاش ہے
یہ ستارے سب ہیں بجھے بجھے، مجھے جگنوؤں کی تلاش ہے
وہ جو اِک دریا تھا آگ کا سبھی راستوں سے گزر گیا
ہمیں کب سے ریت کے شہر میں نئی بارشوں کی تلاش ہے

ترنم نے ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر اپنے عکس کو بغور دیکھا، اُس کے دِل میں ہمیشہ ایک خواہش
لاوے کی طرح اُبھرتی تھی کہ یہ ''نائٹ میرز'' ٹوٹ جائے اور وہ دوبارہ اپنے پاکیزہ عکس کو دیکھ سکے۔

انسان اگر آئینہ دیکھ کر اجنبیت کا احساس محسوس کرے تو وہ خود سے بچھڑ جاتا ہے پھر وہ ساری زندگی
آئینہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہ پاتا۔

ترنم آئینے کے آگے یوں کھڑی تھی، جیسے کسی اجنبی کے سامنے کھڑی ہو اُسی پَل اُس کے موبائل کی
اِن کامنگ ٹون بجی۔ ترنم نے غور سے ٹون کو سُنا۔ یہ اُس کے خاص سیل کی تھی، جس کا نمبر سوائے ماہی اور
طارق کے کسی کے پاس نہ تھا۔

ترنم تیزی سے موبائل فون کی جانب بڑھی، اسکرین پر طارق کا نمبر جگمگا رہا تھا، ترنم کا ایک پَل کو جی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہا کہ فون بند کردے، اُس کا کسی سے ملنے کو جی نہ چاہ رہا تھا، کوئی بات سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر فون اُٹھالیا۔

''ہیلو!'' اُس کی آواز بے حد مدھم تھی۔ طارق نے بھی اُس کی کیفیت کو شدت سے محسوس کیا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' طارق نے سچائی سے پوچھا۔

''بالکل نہیں! میں بہت غلط ہوں! یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے۔'' ترنم کا لہجہ بے حد کڑوا اور سرد تھا

ہر شخص چاہے وہ خوب صورت ہو یا پھر بدصورت، کالا ہو یا پیلا، اُسے اپنا چہرہ اور اپنا آپ بہت ا لگتا ہے۔

اِس لیے وہ ہمیشہ خود کو زیادہ نمبر دیتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ ہمیشہ اپنے دائرے سے اُکھڑا ہے۔ اپنے آپ کو بُرا کہلانا اور بُرا کہنا بہت مشکل ہے اِس لیے ایسا شخص... سب کے ساتھ بھی بس اُکھ اُکھڑا رہتا ہے۔ ترنم کے ساتھ بھی تو یہی تھا۔ وہ اپنے لیے جب جب اقرار کرتی کہ وہ بُری لڑکی ہے دِل خون کے آنسو روتا تھا۔

''کیا آپ کو میری کوئی بات بُری لگی؟'' طارق نے بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔ اُس کے لیے بہت قیمتی سورس تھی وہ اُسے ناراض کرنا یا کھونا نہیں چاہتا تھا۔

''میرا آپ سے کیا کوئی تعلق ہے، جو میں آپ کی باتوں کا بُرا مناؤں گی۔'' ترنم نے کچھ سرد لہجے کہا۔

طارق نہیں جانتا تھا کہ اُس نے غلط وقت پر فون کر ڈالا تھا۔ ترنم خود میں بالکل بھی نہ تھی، نہ اِس اُسے اپنے جذبات پر کنٹرول تھا۔

''میرا خیال ہے میں فون رکھتا ہوں، دراصل میرے سیل پر آپ ہی کی جانب سے مِس کال آئی اِس لیے میں نے رِنگ بیک کی تھی۔'' طارق نے سنجیدگی سے کہا۔

ترنم کو فوراً ہی کوئی بہت اہم بات یاد آئی۔ واقعی اُس نے تین چار گھنٹے پہلے خود طارق کو فون کیا تھا۔

''آئی ایم سوری! واقعی میں نے آپ کو فون کیا تھا۔'' ترنم نے کچھ آپے میں آتے ہوئے کہا۔

''وہ دراصل مجھے آپ کو انفارم کرنا تھا کہ محمود بٹ نامی فوٹوگرافر ہے۔ وہ مختلف کالجز میں لڑکیوں کے مینا بازار اور مختلف فنکشنز پر تصاویر لیتا ہے۔ لڑکیاں اُس وقت کچھ تصاویر کھنچوالیتی ہیں ا میں پیسے دے کر خرید لیتی ہیں ایسا کچھ عرصے سے مختلف کالجز میں چل رہا ہے لیکن یہ کم بخت محمود راگنی کے ہی گروہ کا آدمی ہے، چن چن کر اچھی لڑکیوں کی تصاویر اُتارتا ہے پھر راگنی تک پہنچاتا ہے لڑکیوں کو ہر ہر طریقے سے ٹریپ کیا جاتا ہے۔

کبھی اپنی لڑکی بھیج کر لڑکی کو ماڈرن لائف اسٹائل کے بہانے اُس کو تباہی کے قریب لایا جاتا ہے خوب صورت لڑکی کی ایک بار کی تباہی اُس کی آئندہ زندگی اور قسمت کو کالا کر ڈالتی ہے۔ کبھی اِن صورت لڑکیوں کو لڑکوں کے ذریعے ٹریپ کرتے ہیں لڑکے محبت کا فراڈ کر کے ان کو ورغلا کر راگنی کی کے پنجرے تک گھسیٹ لاتے ہیں۔ تیسرا طریقہ اُن لڑکیوں پر استعمال کیا جاتا ہے جو نہ کسی لڑکی کے آتی ہیں اور نہ ہی لڑکوں کے قابو آتی ہیں ایسی لڑکیوں کی تصویروں کو کمپیوٹر کے ذریعے ننگے دھڑوں

تھ جوڑ کر اسے استعمال کر کے بلیک میل کیا جاتا ہے اُن کو ہر صورت گناہ آلود کام کرنے کے لیے آمادہ ا جاتا ہے امیر لڑکیوں سے تو پیسہ بھی نکلوایا جاتا ہے۔ لیکن جو لڑکی محمود بٹ، راگنی کی منحوس نگاہ کے سامنے کردیتا ہے اُس کو سمجھو کوئی بہت بڑی دعا ہی بچا سکی ہے ورنہ اسّی فیصد لڑکیاں بُری طرح ٹریپ رہی ہیں۔ معصوم سی کلیوں جیسی یہ لڑکیاں راگنی کے زہرآلود ہاتھوں میں آکر مسلی جاتی ہیں۔'' ترنم اتنی ی بات کر کے تھک گئی تھی، اُس نے سانس لینے کو کچھ وقف کیا۔

اِس دوران طارق کاغذ قلم لے کر اہم نکات نوٹ کرتا گیا تھا۔

''طارق اِس ساری بُرائی کی جڑ کو آپ کاٹیں یا نہ کاٹیں، لیکن اس کے سورس یعنی محمود بٹ کا کچھ ریں۔ کم بخت خود بھی لڑکیوں کی عزت سے کھیلتا ہے۔ فیشن فوٹوگرافرز کی طرح بہت بڑا بلیک میلر ہے ر اس وقت شہر کے ٹاپ کالجز کے فنکشن کوریج کے لیے یہ ہی جاتا ہے اس کا بندوبست کروائیں۔ آج ح بھی اتنی چھوٹی عمر کی دو لڑکیاں اِس خبیث کی وجہ سے اِس دلدل بھری دنیا میں پھنسی ہیں کل تک وہ کیزہ تھیں، اپنے گھر کی رونق رحمت، اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھیں، لیکن اِس کم بخت نے اُن کو اِس اندھیری دنیا کا حصہ بنا کر سیاہ بخت کر ڈالا ہے۔'' ترنم کا تنفس غصّے سے بے ترتیب ہوگیا تھا اُس کا نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ محمود بٹ کو آن دی اسپاٹ شوٹ کردیتی لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی اسی لیے اِس نے طارق کو فون کیا تھا۔ وہ طارق کے ذریعے محمود بٹ کو انجام پر پہنچا سکتی تھی اور وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔

''طارق! کیا آپ مجھے سُن رہے ہیں؟'' ترنم نے دوسری جانب بے حد خاموشی محسوس کر کے پوچھا۔

''جی بالکل میں سُن رہا ہوں۔'' طارق نے اُسے تسلی دی۔

''طارق! کیا محمود بٹ کو سزا مل سکتی ہے؟'' ترنم نے بڑی آس سے پوچھا۔

''بالکل! اور انشاء اللہ آپ دیکھیں گی کہ ہم اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ یقین مانیے ترنم آپ کا برائی سے لڑنے کا جہاد آپ کو بہت بلند درجات عطا کرے گا۔'' طارق نے اُس کا مورال بڑھایا۔

''بلند درجات...؟'' ترنم کی ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی فون پر طارق کو سنائی دی۔

''طارق صاحب! میں ایسے نشیب میں جا اُتری ہوں، جہاں اُوپر آنے کے لیے کوئی رسی نہیں پہنچتی!'' ترنم کا لہجہ آنسو ہو رہا تھا۔

''جزا اور سزا کا فیصلہ صرف اللہ کرسکتے ہیں۔ آپ کا کام صرف امید باندھنا ہے وہ باندھے رکھیں، اتنا تو ہر انسان اپنے لیے کر ہی سکتا ہے نا!'' طارق نے بے حد نرم لہجے میں اُس کی آس بندھائی۔

''آپ کو قرآن پاک کی ایک آیت سناتا ہوں، مختلف حالات میں یہ ہر ایک کے کام آتی ہے۔ اللہ کی بات تو ہوتی ہی سب انسانوں کے لیے ہے ہر شخص کے پاس اپنی مشکل کا الگ اینگل ہوتا ہے لیکن کیا خوب صورت امید ہے کیا یقین ہے! اگر انسان تھام لے تو ہمیشہ کے لیے پار ہوجائے۔

(اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو!)

آپ کسی بھی نشیب میں ہوں، کتنی بھی گہرائی میں ڈوبے ہوں صرف ''اللہ کے ہونے کے احساس کی رسی'' آپ کو باہر نکالتی ہے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا میں آپ کو دعوت دے سکتا ہوں کہ آپ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں!" طارق نے پوچھا۔

جواباً ترنم نے آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ منہ سے صرف جی نکلا تھا۔

"بس تو پھر ہمیشہ اللہ سے خوش گمان رہیں کیوں کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جیسا ہم اُس سے گمان رکھتے ہیں وہ ہم کو ویسا ہی ملتا ہے۔" طارق کی باتوں نے ترنم کے سلگتے دِل پر ٹھنڈے چھینٹے ڈالے تھے۔

"اوکے! اجازت دیجیے! اُمید ہے کہ آپ آئندہ بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں گی اور رابطے میں رہیں گی۔" طارق نے فون بند کرنے سے پہلے اُسے یاد دہانی کرانی مناسب سمجھی!

"جی انشاء اللہ!" ترنم نے آنسوؤں کے گولے کو پیتے ہوئے جواباً یقین دہانی کرائی۔

یہ تو اُس کے بھی دِل کی شدید خواہش تھی کہ وہ راگنی کے سیٹ اپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کردے، ختم کردے چاہے اِس کے لیے اُس کو اپنی جان ہی کیوں نہ گنوانی پڑے!

❖❖○❖❖

"رائل ڈرامیٹک تھیٹر کی شام پانچ بجے کی ٹکٹس لی ہیں۔" عبداللہ نے ولی کو ٹکٹیں دکھاتے ہوئے کہا۔

"تم کو چین سے بیٹھنا نہیں آتا! لگتا ہے تم میں ابن بطوطہ کی روح گھسی ہوئی ہے۔" عبدالولی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

عبداللہ سے دوستی اُس کی یہیں آرٹ اسکول میں ہوئی تھی۔ وہ اُس سے خاصا چھوٹا تھا لیکن نہ جانے کیسے وہ دونوں مقناطیس کی طرح کھنچ کر ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ اب عالم یہ تھا کہ عبداللہ فلیٹ چھوڑ کر عبدالولی کے ساتھ شفٹ ہوگیا تھا، اُسے اپنی مرضی چلانے کا بے حد شوق تھا خاص طور پر عبدالولی کو ہر وقت اپنے ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ اِس لیے پورے دن کا پلان وہ خود ہی بناتا تھا، مجبوراً ولی کو بھی اُسے جوائن کرنا پڑتا تھا۔ اب بھی وہ ولی سے پوچھے بنا ہی تھیٹر کی ٹکٹیں اُٹھا لایا تھا۔

"یہ بالکل سچ ہے بڑے بھائی! میرا دِل کہیں نہیں لگتا، میں ایک جگہ ٹک کر بیٹھ نہیں سکتا۔ جا... میرے اندر کہاں سے اتنی بے چینی آگئی ہے کہ میں کہیں بھی ایک جگہ کچھ زیادہ دیر نہیں گزار سکتا۔ میں جگہ بہت شوق سے جاتا ہوں لیکن وہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ جگہ بھی اجنبی ہے۔" عبداللہ نے مسکراتے ہوئے اپنا مسئلہ بتایا۔

ولی اُسے یک ٹک دیکھے گیا، کتنا خوب صورت تھا وہ یا شاید ولی کو ہی سب سے زیادہ خوب صورت اور الگ سا نظر آتا تھا۔ بچوں جیسی معصومیت ہر وقت اُس کے چہرے سے چھلکتی تھی۔ گھور سیاہ آنکھیں کشادہ پیشانی اور عنابی ہونٹ، ستواں ناک! کس قدر کشش تھی اُس میں لیکن کیا یہ چیزیں ہونا اہم تھا؟

نہیں!! کیوں کہ یہاں چپے چپے پہ خوب صورت لوگ نظر آتے تھے، خود ولی بے حد خوب رو اور زبردست شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن!!

لیکن جو کشش ولی کو عبداللہ میں محسوس ہوتی تھی، جو اپنائیت اس اجنبی دیس میں عبداللہ کے لیے محسوس ہوتی تھی وہ کسی اور میں رتی بھر بھی نہ ہوتی تھی۔ اس لیے جب وہ بڑے بھیا کہہ کر اُسے بلاتا تو ولی

وہ اچھا اور اپنا سا لگتا تھا۔ جانے کیوں ولی کو لگتا تھا کہ وہ اُسے پہلے سے جانتا ہے۔ بہت سوچنے کے ...اور اُسے اپنے اِس دوست کے ساتھ اتنی اپنائیت کی وجہ کا سرا نہ ملتا تھا۔

"بڑے بھیا پاکستان کیسا ہے؟" عبداللہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تم اتنی اچھی اردو بولتے ہو، میں تو سمجھتا تھا کہ تم پاکستان ہی سے ہو۔" ولی نے اپنے دِل کی بات ...ڈالی۔

"میری مدر اور فادر کا تعلق پاکستان سے تو ہے لیکن آج تک انہوں نے نہ خود پاکستان جانے کی ...ش کی اور نہ ہی ایسی خواہش میرے اندر آنے دی۔ لیکن جانے مجھے کیوں وہ لینڈ آف فیئریز کی طرح ...ٹ کرتی ہے۔" عبداللہ کے چہرے پر دبا دبا جوش و خروش تھا۔

"پاکستان!!"

"پاکستان بہت پیارا ہے! اُس کی مٹی میں ہر دُکھ درد جذب کرنے کی گنجائش ہے، بہت فراخ دِل ...ن ہے۔ قربانیوں سے بنا یہ ملک اپنے لوگوں کی وجہ سے "میچ لیس" ہے۔ یہاں رہنے والے شدت ...ہیں، کچھ گڑبڑ کرنے والے بھی شدت پسند اور اِسے چاہنے والے بھی شدت پسند ہیں۔ بنیادی طور ...ے پاکستان بہت پسند ہے، ہر موسم کی شدت یہاں پر اُترتی ہے۔ یہ نہیں ہے چھ ماہ برف ہے تو برف ...ل جائے گی اور گرمی ہے تو گرمی ہی پڑتی جائے گی۔ اس کے چاروں موسم پیارے ہیں۔" عبدالولی ...چائی سے جواب دیا۔

"اور پاکستان کے رسم و رواج؟" عبداللہ کو آج ایسا بندہ مل گیا تھا، جو اُس کے من پسند ٹاپک پر بات ...رہا تھا۔ اُسے سن رہا تھا۔

"وہ بھی بہت اچھے ہیں، خوشی کو خوشی محسوس کرنا اِن رسموں کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ تم میرے ساتھ ...تان چلنا میں تم کو اپنے گھر والوں سے ملواؤں گا، سارا پاکستان بھی گھماؤں گا۔" عبدالولی نے ساتھ ہی ...دعوت دے ڈالی۔

"ہاں میرا بھی دِل کرتا ہے کہ پاکستان جاؤں، لیکن جانے کیا بات ہے کہ میری ممی ہمیشہ پاکستان ...الے سے گھبراتی ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا میں نے کبھی پرواہ نہ کی تھی، لیکن اب میرا دِل کرتا ہے کہ میں ...پریوں کی کہانی جیسی زمین کو ضرور دیکھوں۔" عبداللہ نے شوق سے کہا۔

"جانے پاکستان میں ایسا کیا ہے جو ممی اتنا گھبراتی ہیں۔" وہ دل ہی دِل میں بڑبڑایا۔

"ٹھیک ہے تم سمسٹر بریک میں میرے ساتھ چلنا۔" عبدالولی نے برش اور پلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ...ے کہا اور دور ہو کر کینوس کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ کو بے حد غور سے دیکھ رہا تھا، ڈرامیٹک ...اور کمپوزیشن کے ساتھ وہ ایک شاہکار لگ رہی تھی۔

عبدالولی نے یہاں ایمسٹرڈ آرٹ اسکول میں بھی اپنی دھاک بٹھانی شروع کردی تھی، اُس کا کام بولتا ...دیکھنے والے کو گھیرتا تھا اور چھا جاتا تھا۔ ولی نے یہ پینٹنگ ایک نظم کی تھیم پر بنائی تھی بلکہ وہ اپنی ساری ...میں مختلف نظموں غزلوں اور اشعار کے مین تھیم کو پینٹ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اِن نظموں ...اشعار کو اردو اور انگلش میں کمپوز کر کے الگ سے ہر پینٹنگ کے ساتھ فریم کرے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''واؤ! یہ بہت خوب صورت ہے!'' عبداللہ نے کینوس پر نگاہ ڈال کر کہا۔
جواباً عبدالولی کے چہرے پہ بہت بُردبار مسکراہٹ تھی۔
''پلیز مجھے اس پینٹنگ کا تھیم سنادیں۔'' عبداللہ نے فرمائش کی بلکہ بے حد اصرار کیا تو ولی کو نظ ہی پڑی۔

محبت میرا آنچل ہے
جہاں میں نے اُمیدوں کے
ہزاروں پھول ٹانکے ہیں
محبت میری دھڑکن ہے
کہ جس سے دِل یہ زندہ ہے
محبت میری آنکھوں میں بسی ہے
جوتم کو کھوجنے کی آس میں
دنیا میں زندہ ہیں
محبت اِک دعا ہے، جو کبھی تم نے مجھے دی تھی
وہی اب میرا قیمتی اثاثہ بن کے میرے دِل میں ہے
محبت تیرے گزرے راستوں کا نقش پا بن کر
ہمیشہ میرے دِل کے آئینے میں نقشِ رہتی ہے
محبت میرا آنچل ہے
جہاں میں نے امیدوں کے ہزاروں پھول ٹانکے ہیں

ولی نے مسکرا کر نظم ختم کی۔
''ارے! کیا آپ محبت پر یقین رکھتے ہیں؟'' عبداللہ نے اتنی شدت پسند تحریر سُن کر پوچھا۔
''آف کورس! اور ...تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس کو میں نے چاہا ہے وہ ہی کچھ عرص تمہاری بھابی بننے والی ہے۔'' ولی کے تصور میں چھم سے علیزے اُتر آئی۔ ولی کا موڈ ایک دم مزہا گوار ہوگیا۔
بے شک دِل پسند لوگ، دل کا موسم بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔
''بڑے چھپے رستم نکلے آپ تو۔ یہ کب ہوا؟'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے بے حد اشتیاق سے پو
''یہاں آنے سے پہلے میری اُس کے ساتھ منگنی ہوئی ہے۔'' عبدالولی نے دوبارہ پلیٹ اور بر کر کچھ ری ٹچنگ شروع کردی تھی۔ آج وہ اِس پینٹنگ کو فائنل کرنا چاہتا تھا۔
''گڈ گارڈ! مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ جیسے اصولی اور آئرن مین کی زندگی میں ایسا کوئی نرم پہل موجود ہوسکتا ہے۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کیوں! میں تم کو بے جان کھلونا لگتا ہوں کہ جس کے پاس دِل اور فیلنگ نہیں ہیں۔'' عبدالولی برش روک کر عبداللہ کی جانب مڑ کر کہا۔

''نہیں! لیکن جیسے وہ ہماری کلاس کی دو عدد خوب صورت لڑکیاں لِنڈا اور جینی آپ پر مر مٹنے کو ا رہیں اور آپ اُن کو ہمیشہ اگنور کرتے ہیں۔ ایسے میں لگتا نہیں ہے کہ آپ دِل ول رکھتے ہیں۔''
داللہ نے عبدالولی کو چھیڑا تو عبدالولی کا بہت دھیما قہقہہ کمرے میں اُبھرا۔
''تم۔تم کتنے شرارتی ہو!'' عبدالولی نے پیار بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔
عبدالولی کے دِل میں اُس کے لیے بہت سارا پیار تھا وہ خود نہ جانتا تھا کہ یہ لڑکا اتنا اچھا، اپنا سا کیوں لگا ہے اور وہ کیسے اپنے مزاج سے ہٹ کر اُس کی ہر ہر بات مان لیتا ہے۔
''اچھا چھوڑو اِن باتوں کو، مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری اُردو اتنی اچھی کیسے ہے۔تم بولتے تو بہت اچھے ہو نہ بھی لیتے ہو۔'' عبدالولی نے پوچھا۔
''مما اور پاپا نے سکھائی ہے، ممی کو اُردو بہت اچھی لکھنی بھی آتی ہے اُن کی تو ہینڈ رائٹنگ بھی بے حد اچھی ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔
''یار کسی روز اپنی فیملی سے ملواؤ، اتنا ذکر کرتے ہو آنٹی کا کہ وہ ایشین کھانے بہت اچھے پکاتی ہیں، قسم ے اس بدمزہ ملک آسٹریلیا میں ذائقے دار کھانا کھائے ہوئے عرصہ ہوگیا۔'' عبدالولی نے کہا۔
''بس یار! دو ماہ! پھر پاپا بھی اِدھر آجائیں گے۔ اُدھر سویڈن میں ایک ہسپتال کے ساتھ اُن کا پانچ سال کا کنٹریکٹ تھا، اب تو ختم ہونے میں تین ماہ رہ گئے ہیں۔ زہرہ اور ممی پہلے شفٹ ہوں گی اور پاپا ایک ماہ بعد آئیں گے پھر ہم سب اکٹھے رہیں گے!'' عبداللہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ وہ ایسے ہی ہر ہر بات پر پُرخوش ہوا کرتا تھا، اُس کے اندر کُوٹ کُوٹ کر زندگی بھری ہوئی تھی۔
''اِس کا مطلب ہے تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے!'' عبدالولی نے اُسے چھیڑنے کو کہا۔
''بڑے بھائی! آپ نے شاید میری بات پوری توجہ سے نہیں سُنی، میں نے کہا ہے کہ پھر ہم سب اکٹھے رہیں گے۔''
''ہم سب میں'' آپ بھی شامل ہیں!'' عبداللہ کے لہجے میں اصرار تھا۔
''کم آن یار! میں کیوں تم لوگوں میں ہڈی بن کر رہوں۔'' عبدالولی نے کینوس اُٹھا کر دیوار کے ساتھ سوکھنے کے لیے رکھتے ہوئے کہا۔
''خبردار! جو آپ نے میرے بڑے بھیا کے لیے اِس طرح کے الفاظ استعمال کیے ورنہ میں ناراض ہوجاؤں گا۔'' عبداللہ نے پیار بھری دھمکی دی۔
''میں فون پہ زہرہ اور ممی سے آپ کا اتنا ذکر کرتا ہوں کہ اُن سب کو آپ سے ملنے کا بے حد شوق ہے وہ دیکھنا چاہتے ہیں اُس مسیحا کو جس نے اُس روز برستی بارش میں کیسے غنڈوں سے اُن کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ میری زندگی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد آپ کی دی ہوئی ہے۔'' عبداللہ کہہ رہا تھا اور ولی کے ذہن کے پردے پر دو سبز سنہری آنکھیں لہرائی تھیں، ایک بار اِسی طرح ترنم نے اُسے موت کے منہ میں جانے سے بچایا تھا۔
''حیرت ہے وہ مجھے کیسے یاد آ گئی۔'' ولی نے سوچا۔
''اچھی لڑکی تھی لیکن جانے کیوں عجیب سی تھی۔'' ولی سوچے بِنا نہ رہ سکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ جب جب وہ مجھے بھولنے لگتی ہے، اچانک ہی وہ میرے سامنے آ جاتی ہے۔'' ولی نے سوچا۔

''بڑے بھیا!'' عبداللہ نے عبدالولی کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا کر اُسے چونکایا۔

''کدھر نکل گئے جناب! واپس آ جائیں ورنہ خیالی گاڑی کا پیٹرول ختم ہو جائے گا۔'' عبداللہ نے کہا۔

اُس کی باتیں ایسے ہی برجستہ ہوتی تھیں۔

''کدھر تھے! کن کے خیالوں میں تھے!

کیا بھابی صاحبہ تشریف لائی تھیں؟

اوہ! ہو پھر تو میں نے ڈسٹرب کر دیا۔'' عبداللہ نے شرارتی انداز میں کہا۔

''تم بھی نہ نان اسٹاپ ٹرین ہو، کہیں اسٹاپ لے لیا کرو یار!'' عبدالولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اُف مار ڈالا...'' عبداللہ نے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا...؟'' عبدالولی نے پریشانی سے پوچھا۔

''آپ کی قاتل ہنسی نے مار ڈالا، میں بھی کہوں کہ آپ اتنا کم ہنستے کیوں ہیں۔ ظاہر ہے لوگوں کو مارنا اچھی بات تھوڑا ہی ہے۔'' عبداللہ ایک بار پھر اپنی جون میں تھا۔

''تم ناواقعی باتوں کی پٹاری ہو۔'' ولی سر ہلاتا کچن کی جانب مُڑا۔

''میرے لیے بھی ایک کپ کافی پلیز! اگر سینڈوچ بن رہا ہے تو پلیز آدھا میں بھی کھاؤں گا۔ اپنے ہاتھ کی کافی اور سینڈوچ کھانے سے تو بہتر ہے بھوکا رہ لیا جائے۔ توبہ توبہ میرے ہاتھ میں کتنی بدمزگی ہے، بڑے بڑے لوگوں کی بھوک میرا کھانا چکھ کر اُڑ سکتی ہے۔'' عبداللہ اب با آواز بلند بول رہا تھا۔ جب کہ کچن میں کھڑا ولی بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں عبداللہ نے آملیٹ بنایا تھا اور اِس قدر بدمزہ تھا کہ ایک لقمہ نہ کھایا گیا تھا۔ اسی طرح وہ اکثر کافی اور چائے بھی بناتا تھا تو پینے والے کے صبر کا امتحان بن جاتا تھا۔

خود عبداللہ اپنی بے تکی کوکنگ سے نالاں تھا۔

''مجھے زہرہ اور ممی نے کسی کام کے قابل نہیں رہنے دیا، میرا ہر کام ایشیا کے مردوں کی طرح پروٹوکول کے ساتھ کرتی ہیں اور میں باہر آ کر مشکل میں گھر جاتا ہوں۔'' عبداللہ نے کافی اور سینڈوچ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں! تم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کر لینا، وہ ساری عمر عبادت سمجھ کر تمہارے کام کرے گی اور کبھی بھی منہ نہیں بنائے گی، ہماری لڑکیوں کا یہ بہت بڑا وصف ہے۔ وہ بہت خدمتی ہوتی ہیں۔'' ولی نے اُس کا مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں! پاکستانی لڑکی!!'' عبداللہ نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''واقعی گڈ آئیڈیا! یہاں کی لڑکیوں کی طرح اُس کی آنکھیں نیلی پیلی تو نہ ہوں گی۔ توبہ ہے میں یہاں کی رنگ برنگی شکلیں دیکھ دیکھ کر تنگ ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اوئے! تم تو لگتے ہی نہیں کہ تم پیدا یہاں ہوئے، کتنا دیسی سا پچ ہے تمہارے خیالات میں۔

عبدالولی کہے بِنا نہ رہ سکا تھا۔

''میری ممی کی وجہ سے۔ آپ ملو گے تو پتا چلے گا کہ میرے خیالات اور میں یہاں رہنے کے باوجود ان اتنے دیسی ہیں! اوہ یاد آیا آپ تو گئے ہوئے تھے ورکشاپ کے لیے، پیچھے کسی ٹی ٹو کا فون تھا۔

ے بھائی یہ کیسا نام ہے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''تم اُس سے ملو گے تو تم بہت خوش ہو گے کیوں کہ وہ بھی تمہاری طرح بے حد زندہ دِل ہے، میں تم اپنے دوستوں سے ضرور ملواؤں گا۔ میرے بہت کم دوست ہیں لیکن بے حد اچھے اور اپنی اپنی ذات ں بے حد اہم انسان ہیں۔ خاص ہیں، تم اُن سے مل کر بے حد خوش ہو گے۔'' عبدالولی نے سچائی سے کہا۔

''کیا میں اپنے آپ کو اتنا خوش نصیب سمجھوں کہ میں بھی آپ کے دوستوں میں شامل ہوں۔'' عبداللہ نے ایک دم ہی سامنے آ کر پوچھا۔

''تم! تم میرے لیے دوستوں سے زیادہ ہو عبداللہ!'' عبدالولی نے بے حد جذب سے کہا۔

''تمہارے وجود سے پھوٹتی خوشبو بہت مانوس ہے تم تو میرے دِل میں چھوٹے بھائیوں کی طرح ہو۔'' عبدالولی جو اقرار کے معاملے میں بے حد کنجوس تھا بے ساختہ اظہار کر گیا۔

عبداللہ ایک دم آگے بڑھ کر عبدالولی کے سینے سے جا لگا۔

''آپ میرے ہی بھائی ہیں، یقین جانیے میرا دِل کہتا ہے اللہ نے آپ کو میرا بھائی بنا کر بھیجا ہے۔'' عبداللہ نے بھی بے ساختہ اظہار کیا۔

دونوں کو ایک دوسرے کے سینے سے لگ کر بے حد آسودگی کا احساس ہوا تھا۔ ایسا احساس، جو ایک ہی ے پودوں کو ہوتا ہے!

❖❖○❖❖

ان تمہارے سُونے ہیں راستے محبت کے
ابھی جاؤ اب تو جاں واسطے محبت کے
تم کو کیا خبر!
یے بن تمہارے بستے ہیں
ر لو فرقت کے ناگ ہم کو ڈستے ہیں
ب یہاں نہیں ہو تم! چین کیسے آئے گا
ثق اب کے لگتا ہے جان لے کے جائے گا
ب بھی تیری یادوں کے ہم پہ جان پہرے ہیں
ل جہاں تھے اب بھی ہم اُس جگہ پہ ٹھہرے ہیں
لو تو پلٹ کے جاں ہم کو!
یے جیتے ہیں
جب تری آئے، اشک کیسے پیتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یاد ہے تمہیں
ہم کو! کل تلک جو دیتے تھے
آج! ہم ہیں دیتے وہ واسطے محبت کے
مار ہم کو ڈالیں ناں حادثے محبت کے
آ بھی جاؤ اب تو جاں واسطے محبت کے
دیکھ کتنے ہیں ویراں راستے محبت کے
آ بھی جاؤ اب تو جاں واسطے محبت کے!

محبت کے پیالے کی جانب ہر انسان اندھا دُھند دوڑتا ہے، بے حد جنونی ہو جاتا ہے اِس پیالے کو حاصل کرنے کے لیے۔ یہ اُس کی سرشت میں ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ جب جب وہ اس پیالے کا ''پریم امرت'' پیتا ہے تو پیاس بجھنے کے بجائے بڑھ جاتی ہے اور پھر ہمیشہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔

علیزے نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اُس کی زندگی میں بھی یہ ''پریم امرت'' پینا لکھا ہے۔ ولی جاتے جاتے یہ پیالہ اُسے تھما گیا تھا، جسے اُس نے دھیرے دھیرے پیا تھا لیکن اُس کے اندر پیاس بہت جلدی جاگ اُٹھی تھی۔

ولی کو وہ اتنا چاہنے لگے گی، اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اب تو کسی کام میں دِل نہ لگتا تھا۔ محبوب بے شک فاصلے پر ہو لیکن اپنے شہر میں ہو تو اُس کے آس پاس سے ہوتی فضائیں انسان کو اُداس اور بے چین نہیں ہونے دیتیں۔ وہ تسلی دیتی ہیں دِل کو کہ محبوب یہیں کہیں ہے لیکن جب محبوب دُور ہو تو بے چینی کی آگ زور پکڑ کر تن من جھلساتی رہتی ہے۔

علیزے کھانا پکاتے، گھر کا کام کرتے، پودوں کو پانی دیتے غرض ہر ہر وقت ولی کے گمان میں گم رہنے لگی تھی۔

وہ خود اپنی اِس کیفیت سے پریشان تھی۔ شاید اِسے ہی محبت کہتے ہیں۔ آخر وہ اقرار کرنے لگی تھی۔

''علیزے۔ علیزے!'' نیچے سے ایک دم اونچی اونچی آواز میں امی کی پکار سنائی دی۔

علیزے نے گھبرا کر کبوتروں کا دانہ دیوار پر رکھ کر نیچے کو دوڑ لگائی۔

''خدا خیر کرے!'' علیزے کا دِل اب بہت حساس ہو گیا تھا، ہر پَل الرٹ اور دعا گو کہ اب اللہ اُن پر رحم کرتے رہیں۔

علیزے نے دو دو سیڑھیاں ایک ایک قدم میں پار کی تھیں۔

''کیا ہوا امی!'' علیزے کی ہَوائیاں اُڑی ہوئی تھی۔

''آں۔ ہاں! وہ تمہارے ابّو کاشف سے مل کر آئے ہیں۔''

''کاشف! اب کاشف واپس آ جائے گا!!'' امی سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

''مبارک ہو آپ کو امی!'' علیزے نے اُن کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''آں۔ ہاں!

خ۔ خیر مبارک!!'' حسن آرا بیگم کا سانس پھولنے لگا تھا۔

ال اس قدر کمزور ہو چکا تھا نہ دُکھ اور نہ ہی خوشی سہار پاتا تھا۔

''ابو کدھر ہیں امی!'' علیزے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''وہ تو آتے ہی جانماز پر کھڑے ہو گئے ہیں۔'' حسن آرا نے بیٹے کی دستیابی کا سُن کر شوہر کے غیر معمولی روّیے کی بالکل پروا نہ کی تھی۔

ادر انور صاحب دروازہ بند کیے جانماز پر کھڑے ہچکیوں کے ساتھ رو رہے تھے۔

اج اُن کی واپسی ہو گئی تھی۔

انسان بھی تو کتنا پاگل ہے، ساری عمر دولت سے محبت کرتا ہے۔ اولاد سے محبت کرتا ہے اور پھر اپنی ساری محبت دنیا کے نام لگا دیتا ہے اور پھر اُس سے سب چھن جاتا ہے کچھ باقی نہیں بچتا۔

اگر وہ جان جائے کہ ہر چیز اور اُس کی محبت بھی فانی ہے تو وہ گھاٹے کا سودا کبھی نہ کرے، اپنے من کو وہاں لگائے، جہاں اُس کی بے حد قدر کی جائے۔

اج انور صاحب نہیں ٹوٹے تھے بلکہ اُن کا غرور ٹوٹا تھا۔ اُن کو اپنے بیٹے کی شان دار جوانی، خوب صورت چہرے پر کتنا مان تھا، کتنا غرور کرتے تھے وہ کہ ایک بے حد شان دار بیٹے کے باپ ہیں۔ فخر سے ان کا سینہ پھول جاتا تھا۔ لیکن آج وہ جان گئے تھے کہ اگر اللہ صرف ذرا سی ایک حس ہی واپس لے لے تو مال قدرت والا شخص بھی بے کار ہو جاتا ہے!

اب تک وہ پرائے مال پر ہی اِتراتے رہے، اور آخر کار اُن کو دکھ اپنا ہی ملا تھا۔

''اے اللہ! مجھے معاف کر دے۔!!

یہ سب کچھ، یہ مال یہ اولاد تیری ہی دی ہوئی ہے، تیری امانت ہے، میں نے تیری امانت پر قبضہ کر کے غرور کیا اور آج میں اپنی اولاد کے لیے بے بس ہوں! مجھے معاف کر دے۔ مجھے اولاد کی آزمائش سے نکال دے!

میرے اللہ مجھے اور میرے بچوں کو آسانیاں دے دے۔ میں جان گیا ہوں کہ میں ادنیٰ ہوں! کمزور ہوں، بس تو ہی ہر بات پر طاقت رکھتا ہے!

اے طاقت والے ہم کو سہارا دے!

ہم کمزور نفس والوں کو سہارا دے!!

سہارا دے!!'' وہ سجدے میں گر کر گڑگڑا رہے تھے۔

اج وہ واپس آ گئے تھے اور اللہ کو واپس مُڑ کر آ جانے والے بے حد پسند ہیں۔

بے شک اللہ سب سے زیادہ مہربان اور بڑا ہے!!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شب کی آغوش سے وہ صبح نکلی ہوگی
ساعت نحس بھی وہ اِس کے جلو میں ہوگی
سبز رستے وہ سبھی دُھند میں ڈوبے ہوں گے
زندگی جن سے کئی بار گزرتی ہوگی
سوچتی ہوگی فضا
آسماں آج یہ کیوں اُداس ہوا جاتا ہے
کس کے گھر درد کا سیلاب بلا جاتا ہے
پیڑ رستوں پہ یہ کیوں سر کو جھکائے چپ ہیں
پھول شاخوں پہ یہ کیوں منہ کو چھپائے گم ہیں
کس لیے کہر کی چادر میں ہیں گم نظارے چپ ہیں
چارسُو چھائی وحشت میں گھرے پیارے چُپ ہیں
دور تک آج گلی کوچوں میں بے بسی ننگے پاؤں گھومتی ہے

''بلال۔ بلال!'' آیا اماں کی دِل دوز چیخیں حویلی کے در و دیوار ہلا رہے تھے۔

''بلال!'' وہ کنویں کے کنارے لٹک کر چیخیں مار رہی تھیں۔

''تو کیا...تو کیا مکافاتِ عمل شروع ہو چکا ہے؟'' اُن کے درد سے پھٹتے ہوئے دِل سے آواز آئی۔

''نہیں! لیکن اِن معصوم بچوں کا کیا قصور تھا؟'' انہوں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر د کی کوشش کی، وہ کنواں کسی موت کی وادی کی طرح تھا، جہاں جو داخل ہو جاتا کبھی مُڑ کر نہیں آ سکتا تھا۔

''نہیں۔ نہیں!'' آیا اماں نے سسکتے ہوئے کنویں کی منڈیر پر سر مارا، پھر کسی کٹے ہوئے درخت طرح زمین بوس ہو گئیں۔

کوئی انجام سی آہٹ تھی ساعت سے پرے
آہ بھرتی ہوئی اِن سرد ہواؤں سے پرے
جب اچانک وہ خموشی ٹوٹی
سسکیاں لیتی فضا چیخ اُٹھی
گلِ صد برگ جُدا ہم سے ہوا چاہتا ہے

ر نایاب وہ مٹی میں ملا چاہتا ہے
ر نایاب وہ مٹی میں ملا چاہتا ہے

لال کی موت اور ایسی موت تو خود اُس کے باپ کی ڈیزائن کردہ تھی۔ اصل میں تو یہ موت اُس نے ہم علی کے خاندان کے لیے ڈیزائن کی تھی!

سید سرفراز علی نے جو گڑھا کسی اور کے لیے کھودا تھا، اُن کی اپنی اولاد اُس میں گر چکی تھی۔ بلال کی ایسا دھچکا تھا جس نے زلزلے کی طرح سید سرفراز کے مضبوط قلعے کی بنیادوں کو ہلا کے رکھ دیا۔

بنیادیں ہل جائیں تو قلعے اور عمارتیں زیادہ دیر تک سر اُٹھا کر کھڑے نہیں رہ سکتے۔

فضا میں اگربتیوں اور گلاب کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو رچی بسی تھی، سرگوشیوں میں بولتے ہوئے اُن کی بھنبھناہٹ خاصی تیز تھی۔

اندر خواتین کلمہ طیبہ پڑھ رہی تھیں جب کہ باہر بیٹھے مرد زیادہ تر گفتگو میں مشغول تھے۔ یہ گفتگو بلال بانو کی معمائی موت سے لے کر کرنٹ ایشوز تک پر معمور تھی۔

''بہت افسوس ہوا سرفراز صاحب!'' سیکریٹری صاحب خاص طور پر سید سرفراز کے ہاں تعزیت کے آئے تھے۔

آج صبح اخبار میں انہوں نے ''افسوس پر بلال'' کا اے فور سائز میں بڑا سا اشتہار پڑھا تھا کہ سید راز علی کا بیٹا اور بہو کار ایکسیڈنٹ میں موقعے پر ہی جاں بحق ہو گئے آج اُن کی نماز جنازہ عصر کے بعد ہوگی۔

اشتہار کے ساتھ بڑی نمایاں خبر اِس کار ایکسیڈنٹ کی بھی لگی تھی، کار جس میں بیٹا اور بہو سوار تھے بُری ح تباہ ہو چکی تھی، تباہ شدہ گاڑی کی نمایاں تصویر بھی خبر کے ساتھ موجود تھی۔

سید سرفراز افسوس کرنے آنے والے افراد کے ساتھ بہت کم گفتگو کر رہے تھے۔ زیادہ تر سر کے ارے سے سلام اور گفتگو کا جواب دے رہے تھے۔ ان کا معاون خاص جبار احمد سارے معاملات دیکھ رہا تھا وہ سید سرفراز علی کا برسوں کا ٹرینڈ آدمی تھا۔ اُس نے ایسے میں، جب مالک کو زندگی میں پہلی بار ٹے اور چپ ہوتے دیکھا تو معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے بلال اور بانو کی موت کو ایک حادثے کی ورت دے دی تھی اور اُس کا اشتہار بھی لگوا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی آس پاس کے سارے کاروباری اور سماجی ت جنازہ کے لیے پہنچ چکے تھے۔

سیاہ لباس میں سرخ ہوتی آنکھوں سے سید سرفراز علی بے حد خاموش تھا۔ وہ ایسا لاوا تھا جس کو جہاں دبایا جاتا، وہیں سے پھوٹ نکلتا اُس کے اندر گھٹن بڑھ رہی تھی، طوفان اُٹھ رہا تھا۔

''سائیں! بدائی کا وقت آ گیا ہے! آپ بیٹی اور بیٹے کو وداع کریں!'' خادم خاص نے سید سرفراز علی کان میں سرگوشی کی۔

سید سرفراز علی کو اپنے اندر عجیب سی تبدیلی کا احساس ہوا، اُن کو یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے کوئی رو رہا انہوں نے کان لگا کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن یہ آواز بالکل مختلف تھی اور بہت قریب سے آ رہی تھی۔

انہوں نے مزید بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اوہ خدایا!'' وہ ایک دم چونکے۔

ہاں واقعی کوئی رو رہا تھا! یہ تو کوئی اُن کے ہی اندر رو رہا تھا! یہ خبر اُن کو بے حد حیرت زدہ کر گئی تھی۔ وہ اُس کے گرتے آنسو اپنے اندر محسوس کر سکتے تھے۔

پھر ایک دم ہی اُن کا وجود لرز گیا۔

خدایا! یہ تو اُن کا اپنا ہی دِل رو رہا تھا۔

وہ جھکے کندھوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تو اُن کی کمر اور ٹانگوں سے ہڈیاں چٹخنے کی واضح آواز آئی اُن کی ہڈیاں یوں کڑکڑائی تھیں، جیسے کمزور چھت کی ٹوٹنے والی کڑیاں کھڑکھڑاتی ہیں۔

یہ تو وہ سید سرفراز علی نہ تھا جو کہتا تھا کہ ''میں جو چاہوں حاصل کر سکتا ہوں، میں ہاتھوں کی لکیروں کو اپنی مرضی سے بناتا ہوں۔'' آج وہ جو کھو چکا تھا اب کبھی دوبارہ حاصل نہ کر سکتا تھا۔

زنان خانے کے ہال کے بیچوں بیچ دونوں جنازے رکھے ہوئے تھے۔ صرف خاندان اور قریبی احباب کی خواتین جنازوں کے پاس بیٹھی تھیں جب کہ باقی آس پاس کے گاؤں کی خواتین لائن بنا کر ایک اک نظر دیکھ کر اگلے کمرے میں پہنچائی جا رہی تھیں، جہاں سفید چاندنی بچھا کر سپارے رکھے گئے تھے اور خواتین کھجور کی گٹھلیاں پڑھ رہی تھیں۔ تیز چلتا پنکھا اور پاس پڑی ہوئی برف کی سِلوں سے جو بڑے بڑے اسٹینڈز میں رکھی گئی تھیں کمرے میں خنکی کا احساس نمایاں تھا۔

سید سرفراز علی چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے جنازوں کے قریب آئے اور پھر ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹے، انہیں شہر بانو کے لب باقاعدہ مسکراتے ہوئے محسوس ہوئے اور یہ مسکراہٹ تھی بھی بے حد گہری اور واضح کہ سید سرفراز کو لگا شہر بانو زندہ ہے۔

انہوں نے ایک بار پھر غور سے چہرے کو دیکھا۔ خوف جس کو انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی جگہ نہ دی تھی آج اُس کا ذائقہ بھی محسوس کر لیا تھا۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیا اُن کی زندگی بدل رہی تھی۔

شہر بانو کا چہرہ بے حد پُر سکون تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ سوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اُس کے چہرے پہ رتی بھر بھی موت کی سیاہی نہ تھی بلکہ اُس کا چہرہ بے حد روشن اور پُر نور تھا۔

''کیا کبھی مرے ہوئے لوگوں کا چہرہ بھی اِس قدر فاتحانہ ہوتا ہے؟'' سید سرفراز علی کو لگا، وہ ابھی اٹھ کر اُن کا گریبان تھام لے گی اور اپنے اوپر کی جانے والی زیادتی کا حساب لے گی۔ وہ لاشعوری طور پر دو قدم پیچھے کی جانب ہٹے، اُن کو ایک بار وہم سا ہوا کہ اُن کے یوں پیچھے ہٹنے سے شہر بانو پھر مسکرائی تھی۔

''سائیں! اُدھر بلال سائیں!!'' خادم خاص کی بیوی نے سید سرفراز کو دوسری جانب متوجہ کیا کیوں کہ وہ شہر بانو کے جنازے کے پاس ٹک کر کھڑے ہو گئے تھے۔

سید سرفراز علی گھوم کر بلال کی میت کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ معصوم اور بے ضرر آنکھوں والا بلال آنکھیں موندیں لیٹا تھا۔ سید سرفراز کا دِل چاہا آگے بڑھ کر اُسے اُٹھا دیں تا کہ وہ اُٹھے اور اُن کے ساتھ ضد کرے فرمائش کرے۔

لیکن آج وہ ایسا چُپ ہوا تھا کہ ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہو گیا تھا، ہر غصّے، ہر طلب اور ہر تکلیف سے اُسے نجات مل گئی تھی اُس تکلیف سے بھی، جو اُس کے باپ نے اپنے اعمالوں کی وجہ سے اُسے منتقل کر کے دی تھی جس کی وجہ سے ہر وقت اُس کا سارا وجود ان دیکھی آگ میں جلتا رہتا تھا۔

''بلال!'' سید سرفراز کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔ اُن کو محسوس ہوا کہ وہ اندر سے ٹوٹ رہے ہیں۔

''شہر بانو!'' انہوں نے مڑ کر ایک بار پھر شہر بانو کو دیکھا، وہ جیت گئی تھی، آج تک جتنے ظلم وہ کرتے رہے تھے انہوں نے مظلوم کو بے بس ہی دیکھا تھا۔

بہت سارے شکستہ چہرے اُن کی آنکھوں کے سامنے لہرائے پھر یہ چہرے آپس میں گڈمڈ ہونے لگے اور آخر میں ایک فاتح چہرہ اُن کے سامنے اُبھرا، وہ شہر بانو کا چہرہ تھا، اُن کے دِل پہ بے حد کاری ضرب لگی تھی۔

وہ جاتے جاتے اُن کی جیت کو ہار میں بدل گئی تھی۔ اپنی موت کے ساتھ وہ اُن کی عزیز ترین چیز کو اپنے ساتھ لے گئی تھی، بلال کی صورت میں اُن کو بہت بڑا غم دے گئی تھی۔ جوان اولاد اور خاص طور پر جوان بیٹے کی موت کسی بھی باپ کی مضبوط عمارت کو جڑوں سے ہلا کر رکھ دیتی ہے وہ اچھی طرح جان گئے تھے۔

''بلال!'' وہ بلال کی چارپائی کے پاس دوزانو ہو کر دیکھنے لگے۔

''ہٹ جاؤ یہاں سے!'' آپا امّاں جو بلال کی چارپائی کے ساتھ سر نیہوڑائے بیٹھی تھیں، دھیمی آواز میں سید سرفراز علی سے مخاطب ہوئیں۔ رو رو کر اُن کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

''تمہارا منحوس و مکروہ سایہ بھی اِن معصوموں پر اب نہیں پڑنا چاہیے!'' آپا امّاں نے سوجی سوجی آنکھوں سے اُن کو گھورتے ہوئے کہا۔

سید سرفراز علی نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اُن کو دیکھا۔

پہلی بار اُن کا دِل چاہا کہ وہ کسی کے کندھے پہ سر رکھ کر رو دیں۔ پھر وہ جو سامنے بیٹھی تھی، وہ ہمیشہ اُن کی چاہتے ناچاہتے محرم راز تھی، اُن کے بچوں کی پرورش اُس نے کی تھی اور ایک اور بھی تو رشتہ تھا! ہاں ایک اور بھی تو رشتہ تھا اُس کے ساتھ جس کو اُس نے اپنی مرضی سے بھلا دیا تھا۔ بے شک اس رشتے کو وہ باقی نہ تھی لیکن وہ رشتہ موجود تو تھا۔ وہ کسی طور بھی دِل کا رشتہ نہ تھا بس مجبوری و تقدیر کا رشتہ تھا وہ تقدیر جس نے اُس کو اُن کی زندگی میں شامل کر دیا تھا اُن کی ''بیوی'' کا درجہ دے دیا تھا۔

''تم قاتل ہو اِن معصوموں کے...!!

تم نے قتل کیا ہے ان کا...!'' آپا امّاں نے بلال کا ہاتھ تھام کر اُسے چومتے ہوئے سید سرفراز علی سے کہا۔

''تم نے ظلم کی حد کر دی شہر بانو کے ساتھ اور اُس سے اُس کی زندگی کو چھین لیا اور بلال اُس کی وجہ سے مر گیا! اگر تم یہ ظلم نہ ڈھاتے تو آج دونوں بچے مٹی کی طرح، ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل نہ جاتے۔'' آپا امّاں روتے روتے بولیں۔

اِرد گرد کی خواتین کو اِس لیے بھی اندازہ نہ ہو سکا کیوں کہ آپا امّاں کی آواز نہایت مدھم اور بیٹھی بیٹھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔

''اللہ! یہ کیسا ظلم اس شخص نے کمایا ہے! یہ دیکھو سید سرفراز علی! تمہارے گناہوں کی پکڑ۔'' انہوں نے بلال کی جانب انہیں متوجہ کروایا۔

''تمہارے گناہوں کی سزا کا وقت شروع ہو چکا ہے سید سرفراز علی۔'' اُن کی ٹھنڈی سرد نگاہ اِس گرا میں بھی اُن کے اندر سرد لہر دوڑا گئی تھی۔

''اندر تمہاری بیٹی زخموں سے چُور چُور موجود ہے ابھی نہ تو اُس کا رشتہ زندگی سے ہے نہ موت سے اور یہ، یہ دیکھو اِس کو! کیا اِس معصوم نے اپنے ظالم باپ کا بھگتان نہیں بھگتا؟'' سید سرفراز علی کو نفیسہ بیگم کے سوالات اور باتیں کوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔

وہ ایک دم ہی وہاں سے تیزی سے نکلے، دُکھ درد تکلیف نے اُن کو بے چین کر دیا تھا۔ چوں کہ اِس ذائقے کو انہوں نے ساری عمر نہ چکھا تھا اِس لیے اب یہ ذائقہ ان کے اندر تک کڑواہٹ بھر گیا تھا۔

''سید سرفراز علی! ظالم ظلم کرتے ہوئے یہ ہمیشہ بھول جاتا ہے کہ ظالم کی رسی ہمیشہ دراز ہی ہوتی ہے لیکن جب اللہ اُس کی رسی کھینچتا ہے تو اُس کا پَل پَل سب کے لیے عبرت بن جاتا ہے!'' آپا امّاں نے ایک نظر شہر بانو کے مطمئن چہرے کو دیکھا اور دوسری نظر بلال کے معصوم چہرے پر ڈالتے ہوئے سوچا۔

کیا انجام کا بگل بج چکا تھا؟ دن کی طرح زندگی کی کہانی کے بھی تین حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے م سن رائز دوسرا حصہ سن شائن اور تیسرا حصہ سن سیٹ ہوتا ہے!

ظلم کا سورج طلوع ہوا پھر خوب چمکا اور اب پیچھے باقی تھا اِس کے غروب ہونے کا وقت!!

❖❖○❖❖

''یہ کیسا شور ہے؟'' ترنم نے اپنے کمرے سے باہر آ کر پوچھا۔ وہ نیند کی گولیاں کھا کر سوئی تھ اچانک شور سے اُس کی آنکھ بھی اچانک کھل گئی تھی اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے سر میں ایک دم سے درد شروع ہو چکا تھا۔

ترنم نے ایک ہاتھ سے اپنا پھوڑے کی طرح دُکھتا سر دباتے ہوئے کیتھی سے پوچھا۔

''بے بی! کوئی بہت اچھے گھرانے کا لڑکی لگتا ہے، یہ لوگ اُسے کڈنیپ کر کے لائے ہیں، اب ہو میں آتے ہی اُس نے شور مچا دیا ہے، میرے کو ڈر ہے کہ جتنا یہ شور کری ایٹ کرے گا، اتنی جلدی غل کروالے گا یہاں بپھری گھوڑی اور لڑکی دونوں کو خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کو قابو کرنے کا طریقہ تم جانتی ہو کہ کتنا مائیزرایبل ہے۔

''پور سِلی گرل!!'' کیتھی افسوس کر رہی تھی۔ اُس کے افسوس میں تعزیت کی خوشبو تھی، جیسے کوئی مر ہو۔

''ک۔ کہاں ہے وہ؟'' ترنم اپنا سارا درد بھول گئی تھی۔

جب سے وہ کفارے کی راہ کی راہی بنی تھی، وہ ہمیشہ خطرناک معاملے میں خود کو پھنسا لیتی تھی یہ جا ہوئے بھی کہ نئی چڑیا کے پاس پھڑ کنے کی کسی کو اجازت نہیں ہوتی تھی وہ کیتھی سے اُس کا پتا پوچھ ر تھی۔

''تم کاہے کو خطرہ مول لیتی ہے؟'' کیتھی نے اُسے باز رہنے کی تلقین کی۔

''لو کیتھی! شی نیڈز اَس! ورنہ! ورنہ ایک اور ایمان فاطمہ مر جائے گی۔'' ترنم نے تڑپ کر اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے شور کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''آر یو میڈ؟'' (کیا تم پاگل ہو گئی ہو)

اور یہ ایمان فاطمہ کون سا بے بی ہے؟'' کیتھی اُس کی باتیں سمجھنے کے قابل نہ تھی۔

''تم چھوڑو اِن باتوں کو، صرف مجھے یہ بتاؤ کہ اُس لڑکی کو کِس روم میں بند کیا گیا ہے؟'' ترنم نے اور منت بھرا اصرار کیا۔

''میں تم کو وہاں نہیں لے جائے گی، تم کو خود جانا ہے تو ضرور جاؤ...'' کیتھی اتنے برسوں سے اِن یوں کے ساتھ رہ رہی تھی اِس لیے اُس نے بے حد خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے میں اکیلی چلی جاؤں گی۔'' ترنم نے فوراً حامی بھری، اِسی دوران لڑکی کی دوبارہ نے کی آوازیں آئیں۔ ترنم کو اندازہ ہو گیا کہ لڑکی کو کس کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ وہ مزید اصرار کیے جانب بڑھی، کیتھی نے طویل سانس بھرا۔

''شی اِز میڈ!''

وہ جانتی تھی ترنم ایک ضدی اور سر پھری لڑکی ہے! لیکن یہ سر پھری لڑکی اگر میڈم راگنی کی نظر میں آ گئی ہو جائے گی۔

''مجھے یہاں سے فوراً جانا چاہیے!'' کیتھی نے خوف زدہ ہوتے ہوئے ترنم کو اُس لڑکی کے کمرے کا ازہ کھولتے دیکھا تھا۔

''یہ تو مرے گی اور دوسروں کو بھی مروائے گی...'' وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے تیزی سے نکل گئی۔

ترنم نے تھوڑی سی کوشش سے دروازہ کھول لیا تھا۔

یہاں پہ دروازوں پر کم ہی لاک لگائے جاتے تھے کیوں کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا بے حد قسم کی سیکورٹی تھی، یہاں سے ہر راستے پہ کیمرے لگے ہوئے تھے اور دو تین واچ مین اِن کیمروں ذریعے پَل پَل کی خبر رکھتے تھے اس کے علاوہ آسمان کو چھوتا ہوا مین گیٹ تھا، جہاں ہر وقت سخت رٹی کا انتظام تھا، اس لیے کارندے لڑکی کو کھلا چھوڑ دیتے تھے لیکن اگر کوئی شور مچائے تو اُسے عارضی پر باہر سے بند کر دیتے تھے۔

''مجھے جانے دو...!

پلیز مجھے جانے دو...!'' دروازہ کھلتے ہی اُس لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

نیس بیس سال کی نہایت معصوم لڑکی تھی۔ بے حد خوب صورت! اُس نے گاؤن پہن رکھا تھا جب کہ کا تھا یقیناً اُس نے اِن لوگوں سے بھاگنے یا خود کو بچانے کی کوشش کی ہوگی، اسی دوران اُس کے سر کا رف کہیں اُتر کر گر چکا ہوگا۔

''باجی! میں، مجھے جانے دو! میرے ابا جی... اگر مجھے گھر جانے میں دیر ہوگئی تو وہ مجھے زندہ گاڑ دیں'' لڑکی نے سسکتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترنم نے ایک دُکھ اور تاسف بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔

نادان لڑکی نہ جانتی تھی کہ گھر کی دہلیز کو پار کرتے ہی بابل اور بابل کی گلیاں ہمیشہ ہمیشہ کے چھوٹ چکی ہوتی ہیں۔

یہاں سے نکلنا تو ناممکن تھا۔

ترنم کے دِل میں عجیب سی خواہش نے کروٹ لی کہ کاش اِس لڑکی کی عزت مرنے سے پہلے یہ مرجائے، کم از کم حرام زندگی گزارنے سے عزت کی موت بے حد اچھی تھی۔ لیکن وہ اُسے کیسے احـ دلائے کہ اُسے اہم چیز کی چوائس (عزت) کرنا ہوگی۔

''میری بات غور سے سنو!'' ترنم نے نرمی سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''نہیں باجی! مجھے جانے دو...''

لڑکی کے چہرے پہ موجود درد ترنم سے سہا نہ جا رہا تھا۔ ایک بار وہ بھی واپس جانے کو یوں ہی طرح تڑپی تھی لیکن وہ اتنی بہادر ثابت نہ ہوسکی تھی، اُس نے مرنے کی جرأت نہ کی تھی اُس نے با موت کو چوائس نہ کیا تھا۔ بعد میں اُس نے خود بہت بار خودکشی کی کوشش کی تھی اور اُس کے نصیب موت بھی باقی نہ بچی تھی۔ ایک عذابِ مسلسل تھا، جو وہ جھیل رہی تھی۔

''کاش وہ میڈم چاندنی کی دی ہوئی موت سے نہ گھبراتی اور باعزت موت حاصل کرلیتی۔'' اُس بہت سارے پچھتاوؤں میں یہ پچھتاوا بھی شامل تھا۔

پھر اُس نے عظمیٰ کو (لڑکی نے یہی نام بتایا تھا) دھیرے دھیرے ساری سچائی بیان کردی کہ وہ جال میں آ پھنسی تھی، جس سے نکلنا ناممکن تھا۔ اِس زندان میں صرف ایک ہی دروازہ کھلتا تھا۔ موت کا دروازہ۔

ترنم نے نہایت سفاکی سے اُسے اِس دروازے کو پار کر جانے کو کہا۔

لڑکی یک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی، اُس کی آنکھوں کی حیرت بے حد نمایاں تھی۔ یقیناً ترنم نے ا کے حوصلے سے بڑی بات کہہ دی تھی۔

''تم اِن تک کیسے آئیں؟'' ترنم نے گہری سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔

''میں! میں نے واقعی بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' لڑکی کے لہجے میں پچھتاوا شامل تھا۔

''ساجد! جو مجھ سے محبت کے دعوے کرتا تھا جو کہتا تھا کہ میرے لیے وہ جان بھی دے دے گا نے اِن لوگوں کے ہاتھ مجھے فروخت کردیا۔''

''تمہیں ساجد کہاں مل گیا؟ تم تو بتا رہی تھی کہ تمہارے گھر کا ماحول بے حد سخت تھا۔'' ترنم نے کھو کھوئے لہجے میں کہا، وہ ایسا کہتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ماحول تو اُس کا بھی خاصا پابند تھا لیکن جب وقت آتا ہے بلکہ جب ہم اُسے آنے کا راستا دے دیتے ہیں تو وہ کہیں سے بھی گھس کر پہنچ جاتا ہے۔

Loop holes!! چاہے شخصیت کے ہوں یا پھر سوچ کے، ہمیشہ ہی آدمی کو نشیب کی طرف جاتے ہیں۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں میرے گھر کا ماحول بے حد سخت تھا اور میں اُس سے بے حد تنگ بھی تھی لیکن

اندازہ ہوگیا وہ سختیاں ہمیں باہر کی گندی نگاہ سے بچانے کے لیے ضروری تھیں۔ میں نے امی اور ابا جھوٹ بولا کہ میں دوست کے ساتھ کالج جاتی ہوں، میں تو کم و بیش ہی کالج میں کلاسیں اٹینڈ کرتی تھی۔''

''میری اور ساجد کی دوستی انٹرنیٹ پر ہوئی تھی ڈیڑھ سال وہ مجھے مجبور کرتا رہا کہ ہم باہر بھی ملیں لیکن ہمت ہی نہ کر پائی، مجھے اُس سے ملنے کے لیے ہمت ڈیڑھ سال بعد حاصل ہوئی تھی۔ انسان ایک کو پار کرکے نکل جائے تو وہ دعاؤں کی حد سے بھی نکل جاتا ہے وہ دعائیں جو اُس کی ہر جگہ حفاظت کرتی ہیں۔ میں نے ایک بار گھر کی دہلیز پار کی اور اُس کے بعد میری ہچکچاہٹ ختم ہوگئی۔ ساجد نے مجھے اندر پمپ کیا کہ میں بے حد نڈر اور بے خوف ہوگئی اور یہ ہی بے خوفی مجھے کھینچ کر یہاں لے آئی۔''

لیک تین ماہ مسلسل ملتے رہنے کے بعد ساجد نے اُس کے ساتھ بُری طرح دھوکا دہی کی تھی۔ اب وہ گالیاں اور بددعائیں دے رہی تھی۔

''باجی! یہاں سے نکلنے کا کوئی راستا!'' لڑکی نے آس بھری نظروں سے پوچھا۔

''ہاں! لیکن وہ راستا موت کو پار کرکے ملتا ہے۔'' ترنم نے بے حد سچائی سے جواب دیا۔

عظمیٰ کا چہرہ بے حد سیاہ پڑ گیا تھا۔

''اچھا! میں تم کو ایک بات سناتی ہوں، جو میں نے کچھ روز پہلے ہی پڑھی تھی۔'' ترنم نے کمرے میں اور بیڈ پر مزے سے لیٹتے ہوئے کہا۔ پھر ایک دم سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

''کالج میں کچھ پڑھا لکھا بھی تھا کہ سب عزت کی طرح ضائع کر ڈالا؟'' ترنم کو اُس لڑکی پر بے حد آ رہا تھا۔

''آخر یہ لڑکیاں اپنی چادر اور چار دیواری کی قدر کیوں نہیں کرتیں؟'' ترنم نے سوچا۔

''ایک مور اپنے خوب صورت پَروں کو نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا ایک حکیم کا گزر ہوا اُس نے معلوم کیا کہ اے طاؤس! ایسے خوب صورت پَروں کو اکھاڑ کر کیوں ناشکری کرتا ہے؟'' طاؤس نے کہا۔

اں نمی بینی کہ ہر سُو صد بلا۔

سوئے من آید پئے ایں بالہا

(کیا تو نہیں دیکھتا کہ ہر طرف سے سینکڑوں بلائیں انہی بازو کے لیے میری طرف آتی ہیں۔

اے شخص! اکثر اوقات ظالم شکاری انہی پروں کے لیے ہر طرف جال بچھاتا ہے۔

چوں ندارم روز ضبط خویشتن

زیں قضا وزیں بلا وزیں فتن

''جب میں دن کو اِن فضاؤں اور بلاؤں اور فتنوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے پر قادر نہیں ہوں تو اِس یہ بہتر ہے کہ میں اپنے پَروں کو دور کردوں اور اپنی صورت کو مکروہ بنالوں تاکہ پہاڑوں اور میدانوں میں بے فکر ہوجاؤں۔'' ترنم نے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اُس کے پاس آ کر کہا، یوں جیسے وہ اُس ای کو اُس کے حتمی فیصلے کے لیے مجبور کر رہی ہو۔

نزدِ من جاں بہتر از بال و پرست

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاں بماند باقی وتن ابتر ست

''میرے نزدیک جان کی حفاظت بال و پَر کی حفاظت سے زیادہ ضروری اور اہم ہے، جان تو
رہے، جسم کی ابتری کا جان کے مقابلے میں کیا غم۔

''سنو عظمیٰ! میں تمہاری ماں نہیں ہوں جو تم کو آ کر کہانی سنانے بیٹھی ہوں۔ وقت بہت تھوڑا ہے
بات دھیان سے سنو، اُس وقت اُس معمولی سے پرندے نے اپنی جان کو بچانے کے لیے اپنی
صورت ترین، عزیز ترین چیز قربان کر ڈالی تھی۔ اُس نے نہایت عقل مندی کا سودا کیا تھا کیا ہم لڑ
کے لیے اپنی عزت اپنی جان سے پیاری نہیں ہوتی؟'' ترنم اُس کی انا کو جگا رہی تھی۔

''اگر آج تم نے ابھی اِسی وقت کوئی فیصلہ نہ کیا تو میری طرح ناسور بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہو
گی جہاں پَل پَل موت ہے! ارے موت کے بعد تو ہر شخص کو سکون مل جاتا ہے جب کہ میں تو اِس
پَل کی موت کے بعد اور بے سکونی کے ریلے میں بہہ جاتی ہوں جہاں کوئی بھی ہاتھ تھام کر باہر نکالنے
نہیں ہوتا۔'' ترنم کی آنکھیں اور آواز بے اختیار نم ہوئی تھیں۔

عظمیٰ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ترنم کو دیکھ رہی تھی وہ ترنم کی بات کا مفہوم سمجھ چکی تھی، تب ہی اُس
بے اختیار لبوں پر زبان پھیری۔

موت کو گلے لگانا بے حد مشکل کام ہے۔ بڑے سے بڑا جیدار بھی خود کو اس کام کے لیے بے بس
ہے جب کہ وہ تو کمزور سی لڑکی تھی۔

''باجی!'' اُس نے لبوں پہ دوبارہ زبان پھیری۔

''خودکشی بھی تو حرام موت ہوتی ہے۔ اگر اِس پار حرام زندگی ہے تو دوسری پار حرام موت ہے، دونوں
ہی صورتوں میں ماری جاؤں گی۔'' عظمیٰ نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں! میں تم کو خودکشی کرنے کا تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں، میں تو تم کو حرام زندگی سے بچنے کے
لیے کہہ رہی ہوں۔ تم کو بس اِس زندگی سے بچنے کے لیے جان توڑ محنت کرنا ہوگی۔'' ترنم نے سرگوشی میں
کہا۔

''باہر سیکورٹی بے حد سخت ہے۔'' وہ کہتی ہوئی اُس کے قریب آئی۔ پھر ترنم نے اُس کے کان میں کچھ
کہا۔

''باجی!'' عظمیٰ نے سہم کر اُسے دیکھا۔

''کیا باجی باجی لگا رکھی ہے اُس مردود ساجد سے محبت کرتے ہوئے نہیں پتا تھا کہ خود کو کہاں کانٹوں
میں گھسیٹ رہی ہو۔'' ترنم نے ڈپٹ کر اُسے کہا۔

''جیسا میں نے کہا ہے ویسا کر ڈالو، آگے تمہاری قسمت، اگر تمہاری زندگی باقی لکھی ہے تو تم بچ جاؤ
گی ورنہ تمہاری عزت تو یقیناً بچ ہی جائے گی۔

''سودا مہنگا نہیں ہے۔'' ترنم نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

''بس تم کو ہوشیاری سے کام لینا ہے۔'' ترنم اُس کا کندھا تھپکتے ہوئے باہر نکل آئی۔

باہر آ کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اُس کی قسمت اچھی تھی باہر کوئی بھی نہ تھا۔ کمرے میں آ کر اُس نے

موبائل پر طارق کے نمبر پر لمبا چوڑا پیغام دیا۔

میسج سینڈ کر کے اُس نے Text clear کیا پھر سینڈ آئٹم کلیئر کیا اور سم نکال کر اپنے پرس میں
ادی اور عام روٹین میں استعمال ہونے والی سم فون میں ڈال دی۔ بعد میں وضو کر کے دو نفل حاجت
مے کھڑی ہوگئی۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر خاص طور پر عظمیٰ کے لیے دُعا کی۔

''اللہ اُس کے ساتھ بہترین معاملہ کرنا! بے شک ساری بھلائیاں تیری ہی جانب سے ہیں۔'' ترنم
نے بے حد صدقِ دِل سے دعا کی تھی اور سچے دِل سے کی دعا اور کام میں تو ہمیشہ ہی خیر پڑتی ہے!

❖❖()❖❖

''آنے والے وقت نے اِس گھر کے لیے کیا رکھا ہے اپنی جھولی میں؟'' نفیسہ بیگم نے قرآن پاک کو
دان میں لپیٹتے ہوئے سوچا۔

جب ہم عبادت کے بعد بھی دُعا کے بجائے فکر اور وسوسے سوچتے ہیں تو وہ ہمارا بہت بُرا وقت ہوتا
کیوں کہ دُعا کرنے کی نعمت ہم سے واپس لی جا چکی ہوتی ہے۔ اِس حویلی میں صرف آپا اماں ہی کا
وجود تھا جو اللہ تعالیٰ سے اپنے بچوں کی خاطر اِس کے مکینوں کی خیر مانگتی تھیں لیکن اب وہ بھی ہر وقت
سوچوں میں گھری رہتی تھیں لیکن جب گھر کا سربراہ ظلم کی حد توڑ دیتا ہے تو وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر
کے ہر فرد کے لیے بھی آزمائش بن جاتا ہے۔ سید سرفراز کے ظلم نے ہر حد پار کرلی تھی اب تو رسی کھینچنے کا
وقت تھا اِس کی شروعات مسکان کے گھر کے اُجڑنے سے ہو چکی تھی، بلال کی موت اتنا بڑا سانحہ تھا کہ سید
سرفراز علی کو جڑوں تک کو ہلا گیا تھا۔

''اب مزید کیا بُرا ہوگا؟'' نفیسہ بیگم نے بے جان ٹانگوں سے خود کو چند قدم چلنے پر مجبور کیا، وہ چھوٹے
چھوٹے قدم اُٹھاتی سید سرفراز کے کمرے کی جانب گئی تھیں۔

نفیسہ بیگم کے لیے حیرت کا دھچکا تھا آج پہلی بار انہوں نے سر پھرے شیر کو یوں بے حد خاموش، چپ
چاپ بلکہ بے بس دیکھا تھا۔

''مجھے تم سے بات کرنی تھی۔'' وہ اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں بولیں۔

''نفیسہ!'' وہ تڑپ کر اُن کی جانب مُڑے۔

''وہ۔ وہ کہہ رہی ہے کہ مجھے کبھی میری اولاد کا سُکھ نہیں ملے گا...'' انہوں نے ہَوا میں جانے کس کی
جانب اشارہ کر کے کہا تھا۔ نفیسہ بیگم کو تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

''کون! کس کی بات کر رہے ہو؟'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پہ بل ڈال کر کہا، ویسے بھی اُسے اِس شخص سے
کبھی ہمدردی نہ ہوئی تھی اِس لیے انہوں نے بے حد بیزاری سے پوچھا۔

''یہ! یہ زبیدہ! زبیدہ ہے نا، یہ کہہ رہی ہے۔'' انہوں نے سامنے فضا کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''میں اِس کو، تم کو سب کو بتا دوں گا کہ میرا نام سید سرفراز علی ہے میں جو چاہوں حاصل کر سکتا
ہوں۔'' وہ ہذیانی انداز میں گویا ہوئے۔

نفیسہ بیگم کو اُن کی ذہنی حالت کی درستگی پہ شک ہوا۔

''میں اپنی اولاد کے لیے ہر، ہر خوشی حاصل کروں گا! جیسا یہ کہہ رہی ہے کبھی نہیں ہونے دوں گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب جان لیں! سمجھی تم بھی زبیدہ!'' وہ آنکھیں نکال نکال کر کسی غیر مرئی نقطے پر چلّا رہے تھے۔

''ہنسنا بند کرو۔'' انہوں نے پاس پڑا لیمپ اُٹھا کر دے مارا جو فضا میں لہرا کر زمین بوس ہوتے ہی ٹوٹ گیا۔

''میں! میں ہر خوشی حاصل کروں گا، میں تقدیر پر یقین نہیں رکھتا، میں تو خود تقدیر کی لائنیں بناتا ہوں!'' وہ مسلسل بڑبڑا رہے تھے اور اپنے آپے میں نہ تھے۔

''سرفراز علی!'' نفیسہ بیگم نے آگے بڑھ کر انہیں زور سے پکارا۔

''آں۔ ہوں!'' سید سرفراز علی جو مسلسل ٹوٹے ہوئے کانچ کو دیکھ رہے تھے، ایک دم کسی خواب سے چونکے۔

''زبیدہ کون ہے؟'' نفیسہ بیگم اپنی بات تو بالکل بھول گئی تھیں۔

''زبیدہ!'' سید سرفراز علی نے سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

''کا۔ کوئی نہیں!'' انہوں نے ٹالا۔

''کیا ہوا سید سرفراز علی! تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو، تم تو کسی سے ڈرتے نہ تھے بلکہ خوف و دہشت تو تمہارے نام کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں نا؟ پھر آج! آج تم کو کیا ہوا؟'' نفیسہ بیگم کو اُس کے تڑپنے سے بے حد خوشی محسوس ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں، کچھ نہیں!!'' سید سرفراز علی کو اپنی انا بے حد پیاری تھی، ہوش و حواس میں آتے ہی وہ فوراً کمرے سے نکل گئے۔ نفیسہ بیگم نے گہری سانس خارج کی، دیواروں پر لگے مختلف جانوروں کے سر، جو سید سرفراز علی نے اپنی بہادری کے ثبوت کے طور پر لگا رکھے تھے نفیسہ بیگم کو وہ سب قہقہے لگاتے محسوس ہوئے، وہ گھبرا کر باہر نکل آئیں۔

اُن کا رخ مسکان کے کمرے کی جانب تھا، جہاں وہ نیند کی دواؤں کے زیر اثر زیادہ تر سوئی رہتی تھی۔ درحقیقت وہ سید سرفراز کے پاس مسکان کے علاج کا ہی کہنے گئی تھیں مشہور نفسیات دان ڈاکٹر زبیر سے وہ وقت لے چکی تھیں۔ بے شک دِل اور گھر میں ابھی تک بلال اور شیر بانو کا سوگ چل رہا تھا لیکن ان کو بہت جلد احساس ہوگیا کہ انہیں اب اُس کو بچانا ہے، جو باقی رہ گئی تھی، جو بچ گئی تھی۔ جو زندہ تھی اُس کا خیال بے حد ضروری تھا وہ جو زندگی سے ہاتھ چھڑا کر دھیرے دھیرے موت سے بھی خوف ناک وادی کا حصہ بننے جارہی تھی۔

نفیسہ بیگم نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا، مسکان سو رہی تھی اور نرس پاس بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ دن کے بائیس گھنٹے سوتی ہی رہتی تھی۔

''نہیں! میں تم کو کبھی ضائع نہ ہونے دوں گی! میں تمہارے لیے لڑ کر زندگی حاصل کروں گی، تم کو اُس کا حصہ نہ بننے دوں گی، جو ایسی خوف ناک وادی ہے جہاں پہنچ کر انسان خود بھی پہچان کھو دیتا ہے۔ میں تم کو ڈاکٹر زبیر کے پاس لے جاؤں گی! میں اپنی بیٹی کو ضرور لے جاؤں گی۔'' ایک ماں کے دِل نے خود سے ایک پُر یقین وعدہ کیا تھا۔

❖❖○❖❖

''کدھر ہو تم؟ یہاں قیامت گزر گئی تمہارے باپ پہ اور تم کو کچھ خبر ہی نہیں! ایسے کڑے وقت میں باپ کو اُس کے اپنے بیٹے کے کندھے کا سہارا درکار ہوتا ہے۔'' سید سرفراز علی، ناصر علی سے مخاطب تھے۔

''بابا سائیں! آج سے پہلے آپ نے کبھی میری خبر نہیں لی، آپ کا اور میرا رابطہ بس چیکوں کے ذریعے قائم رہا۔ پھر آپ کیسے مجھ سے رابطوں کے کٹنے کا شکوہ کر سکتے ہیں؟'' ناصر علی نے کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہاری ہر ہر ضرورت کا خیال رکھا، تمہیں کبھی پیسے کی کمی نہ آنے دی تو کیا بُرا کیا؟ کیا یہ بھی بُرائی ہے؟'' سید سرفراز علی تو اس قدر دُکھی تھے کہ انہیں ناصر علی کی بات کسی نیزے کی انّی کی طرح چبھی تھی۔

''پیسہ دینا برائی نہیں ہے بابا سائیں! پیسہ دے کر اولاد سے نہ پوچھنا کہ وہ کہاں خرچ کر رہی ہے مکمل آزادی دے دینا کہ وہ پیسے کو ایسی جگہ خرچ کر ڈالے، جہاں سے اُس کی بربادی ملتی ہو!''

''بابا سائیں! دوسروں کے والدین بھی اُن کو پیسہ بھیجتے تھے لیکن کبھی اُن کا پیسہ اُن کے لیے بربادی کر نہ لایا تھا پھر آپ کا پیسہ، آپ کی دی آزادی کیوں میرے لیے دلدل کا گڑھا بن گئے۔'' ناصر علی کی باتیں کسی کوڑے کی طرح سید سرفراز علی کا پنڈا نیلا کر رہی تھیں، حیرت سے اُن کا منہ کھل گیا تھا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' سید سرفراز علی نے شاک کی کیفیت میں پوچھا۔

وہ جو اُن سے فرمائشیں کر کر کے پیسہ منگواتا تھا، ہر طرح کا غلط شوق اُس نے پال رکھا تھا۔ آج سے پہلے وہ اپنے باپ سے بہت خوش تھا کہ اُس کا باپ اُس کا ہر طرح خیال رکھتا آیا تھا لیکن آج اُسے کیا ہوا تھا؟

''میں بعد میں فون کرتا ہوں بابا سائیں!'' ناصر علی نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

سید سرفراز علی کو یوں لگا، جیسے اُن کے اندر سے جان نکل گئی ہو۔

''یہ ناصر علی کیا کہہ رہا تھا؟'' وہ بے حد پریشانی سے سوچ رہے تھے۔

دوسری جانب ناصر علی سر نہوڑائے بیٹھا تھا۔ آج سے تین ماہ پہلے وہ کس قدر پرجوش اور عیاش نوجوان تھا صرف تین ماہ میں اُس کی ساری زندگی بدل کر رہ گئی تھی، اس کا ظاہری حلیہ بدل کر رہ گیا تھا یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اِس حلیے میں تو اُس کا سگا باپ اُسے پہچان نہ سکتا تھا۔

ہر حد توڑ دینے والا صرف ایک ہی مقام پر پہنچتا ہے وہ ہے تباہی کا مقام۔ دیر سے سہی لیکن اُسے اسی مقام پر کھڑا ہونا پڑتا ہے، ناصر علی نے وہ حد توڑی تھی جس کی وجہ سے قوم لوط پر عذاب اُترا تھا۔

اور ایک عذاب ناصر علی پہ بھی اُترا تھا وہ ایڈز کا عذاب تھا موت کو سر پر ناچتے محسوس کرنا اور دیکھنا بے حد اذیت ناک تجربہ تھا اور وہ اُس تجربے سے گزر رہا تھا۔ ہاں وہ اِس پُل صراط کی تکلیف سے گزر رہا تھا۔ اپنی اِس حالت اور تکلیف کا ذمے دار وہ اپنے ہی باپ کو سمجھتا تھا، جس نے اُسے اتنا پیسہ دیا کہ اُس نے اپنے لیے بربادی خرید لی تھی۔

بے سکونی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، جس میں وہ ہر وقت غوطے کھاتا رہتا۔ وقت سے پہلے وہ ہر روز مر رہا تھا اور یہ بہت بُری اذیت تھی جو لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی تھی، وہ شروع شروع میں سکون کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تلاش میں اپنے ایک بُدھ مت ماننے والے دوست کے انکل کے پاس جانے لگا، وہ مراقبے کے ذریعہ اعصابی سکون کی ورزشیں کروایا کرتے تھے لیکن اُسے وہ سکون حاصل نہ ہوسکا، جس کی اُسے تلاش تھی اس نے لاماز کی طرح کا لباس پہن کر سر منڈوا کر بھی دیکھ لیا تھا۔ لیکن پچھتاوے کی جو بے سکونی تھی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی تھی۔ روز کا سورج اُس کی زندگی میں سے ایک دن کم کرتا تھا ایسے میں وہ خود میں بھی نہ تھا۔

بلال کی موت پہ وہ گزشتہ سات دنوں سے رو رہا تھا اس کی موت کی خبر اُسے اپنے ایک دوست کے ذریعے ملی تھی کس قدر خوش قسمت تھا اُس کا بھائی ہر تکلیف، ہر حساب سے آزاد ہوگیا تھا۔ روتے روتے اکثر یہ سوچ اُس کے آنسو کم کردیتی تھی لیکن اب اُس کا کیا بنے گا؟

یہ سوال اُسے صبح سے شام تک رلاتا تھا۔

لیکن سکون پھر بھی کہیں نہ تھا۔

❖❖ ○ ❖❖

''کہتے ہیں دُکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہوجاتی ہیں لیکن وہ انسان کے اندر اُتر کر اُس گوشے کو ویران کردیتی ہیں جو کسی ایک انسان کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر زبیر اپنی الیکٹرک چیئر باہر آئے تو انہوں نے نفیسہ بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔

مسکان کے اندر کئی قسم کے دُکھ موجود ہیں جن سے لڑتے لڑتے وہ بُری طرح ٹوٹ چکی ہے، جس کی وجہ سے اُس کے اندر ذہنی انتشار پھیل چکا ہے۔ اُسے اپنی زندگی کے دونوں بڑے دُکھ اُن لوگوں سے ملے جن کو وہ بے حد چاہتی تھی، جو اُس کی محبت تھے جن سے اُس کو توقعات تھیں اور توقع کا احساس کانچ کی طرح نازک ہوتا ہے، جو ٹوٹ جائے تو چبھ کر لہولہان کردیتا ہے۔

پہلا شخص اُس کا باپ تھا۔ اُس کا مرکز محبت، توقع اور دوسرا وہ شخص، جس سے وہ یک طرفہ محبت کرتی تھی۔ تیسرا دُکھ اُسے اپنے باپ سے ملا جس کی وجہ سے اُس کی عزت نفس کچلی گئی تھی۔ یہ اُس کی کمر کی دیوار کو آخری اور بہت بُرا دھکا ثابت ہوا تھا جب کہ اس سے پہلے اُسے برین ہیمرج بھی ہوا تھا، حیرت ہے وہ مری کیوں نہیں یا مکمل پاگل کیوں نہیں ہوئی۔ لیکن اب بھی وہ مُردوں سے بدتر حالت میں ہے

''ہم شروع شروع میں اُسے نیورو لینگوسٹک (NLP) پروگرامنگ کے سیشن دیں گے، گو سیریس کنڈیشن میں بہت لائٹ ڈوز کی طرح ہوں گے لیکن بہرحال ہم کوشش شروع کریں گے تو کئی مرحلے طے ہوں گے۔'' ڈاکٹر زبیر نے طویل سانس بھرتے کہا۔

''میرے علاوہ آپ کسی اور کے پاس لے جائیں گے تو وہ آپ کو مشورہ دیں گے کہ اِن کو پاگل خانے لے جائیں، جو میرے خیال میں بہت بڑا ظلم ہے۔ بہرحال آپ اُمید رکھیں اللہ نے چاہا تو انشاءاللہ اِس خول کو توڑنے میں کام یاب ہوں گے، جو اِس وقت مسکان کے گرد تنا ہوا ہے۔

''ہاں اگر اِن کے والد اور وہ لڑکا اِن کے ساتھ محبت اور بہت ساری توجہ بھرا رویہ رکھیں تو بھی کام یابی ملے گی...'' وہ آپا امّاں کو وہ بات بتا رہے تھے جو مسکان کا اصل علاج تھا۔

''بہرحال! آپ مایوس نہ ہوں! آپ ماں ہیں اور ماں کے پاس سب سے بڑا اور کارگر ہتھیار دعا

ہے آپ دُعا کریں، اللہ بہتر کرے گا۔'' ڈاکٹر زبیر نے دھیمی مسکراہٹ سے آپا امّاں کو یقین دلایا۔

''انشاءاللہ!'' آپا امّاں نے بے اختیار دعائیہ انداز میں جواب دیا۔

❖❖ ○ ❖❖

''کھانا کھالو۔'' کیتھی نے کھانا عظمٰی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ جواباً عظمٰی نے غصّے سے منہ موڑ لیا۔

''بے وقوف لڑکی! اِدھر دیکھو! یہ جو کچھ تمہارے لیے ہے میں نہ لاتی۔ لیکن ترنم نے مجھے مجبور کر کے دیا ہے۔'' کیتھی نے ایک کاغذ کا ٹکڑا، جسے تہہ کر کے چھوٹا کیا گیا تھا اُس کی مٹھی میں دیا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

عظمٰی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور چور نگاہوں سے اپنے ہاتھ میں دبا کاغذ دیکھا۔

''آخر کیا ہے اس میں؟'' اُس نے خود سے سوال کیا۔

''اے لڑکی! جلدی جلدی کھانا ختم کرو!'' اچانک مارک نے اندر آ کر کہا۔

''کیوں! کیوں جلدی کھانا کھاؤں؟ کیا چاہتے ہو تم؟'' عظمٰی نے اکھڑ کر پوچھا۔

''ہاہاہا! سالی جتنی دیکھنے میں تیکھی ہے بولتی بھی تیکھا ہے، آئی لائیک اِٹ، یس آئی لائیک اِٹ! مجھے ایسی گھوڑی سُدھارنے میں بہت مزہ آتا ہے!'' اُس نے زبان سے یوں چٹخارہ لیا، جیسے کسی مزے دار چیز کا ذائقہ منہ میں آ گیا ہو۔

عظمٰی نے ایک کڑی نگاہ اُس کے مکروہ چہرے پر ڈالی۔

''تم واقعی مختلف ہو، کس قدر سکون سے بیٹھی ہو ورنہ یہاں آنے والی ہر لڑکی بے حد بپھری ہوتی ہے، اب شور شرابا مچاتی ہے پھر جب تک اُس سے اُس کی وہ ''قیمتی چیز'' چھین نہیں لی جاتی جس کے لیے وہ ماری لڑائی اور ہنگامہ کرتی ہے، وہ چپ نہیں ہوتی، کیا تمہیں اُس قیمتی چیز کے کھونے کا ڈر نہیں؟'' مارک نے خباثت سے ہنستے ہوئے پوچھا، جواباً عظمٰی نے غصّے سے منہ موڑ لیا۔

اب سے کچھ دیر پہلے وہ بھی تو باقی لڑکیوں کی طرح شور مچا رہی تھی اگر ترنم آ کر اُسے نہ روکتی۔

ترنم نے ہی سمجھایا تھا کہ ایسا کرنے سے ''بُرا انجام'' جلدی قریب آ جاتا ہے اس لیے اس وقت وہ کچھ کنٹرول میں تھی۔

''اوکے، اوکے! ابھی تم کھانا کھاؤ، ہم باقی کا کام کل کر لیں گے۔'' مارک اُس کے رویے سے مطمئن ہو کر بولا ورنہ وہ اپنا ایک ہی مجرب اور آزمودہ نسخہ آزماتا تھا۔ لڑکی کو بے بس کر کے اُس کی سی ڈی بنالی جاتی تھی، اُس کو نہیں مارا تو جاتا تھا لیکن اُس کی روح کو مارنے کا مکمل انتظام کیا جاتا تھا۔

مارک کے جانے کے بعد عظمٰی نے گہرا سانس بھرا اور اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ کی تہہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

''پیاری عظمٰی! سورۃ النساء آیت 17-18 خاص تمہاری ساری اُلجھنوں کو دور کرتی نظر آ رہی ہے۔ تم اِس کا سرا تھام کر آج ہی یہاں سے نکلنے، اپنی عزت بچانے کی کوشش کرو۔ اپنی عزت کو ہر صورت بچالینا چاہے اس کے لیے تم کو اپنی جان ہی گنوانی پڑے۔

زیرِ نظر آیت کا ترجمہ ہے اس کو دل سے پڑھنا اور جان لینا، چوں کہ میں اِن مرحلوں سے گزر کر بسم ہوئی ہوں اس لیے تمہارے لیے بالکل سچا راستا ہی بتاؤں گی اِس کو پڑھو۔

"خدا انہی لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو نادانی سے بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ پھر جلد توبہ کر لیتے ہیں پس ایسے لوگوں پر خدا مہربانی کرتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا اور حکمت والا ہے اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) بُرے کام کرتے رہیں یہاں تک کہ جب اِن میں سے کسی کو موت آ موجود ہو تو اِس وقت کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن کی (توبہ قبول ہوتی ہے) جو کفر کی حالت میں مریں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔"

پیاری عظمیٰ! اتنی وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر اللہ نے اپنا حکم سنایا ہے، آگے تمہاری مرضی ہے۔"

ترنم نے اُس کے اندر جو خوف کے بڑے بڑے کھڈے پڑ گئے تھے، اُن کو فل کر کے سارا فاصلہ مٹا دیا تھا، ساری اُلجھنیں سلجھا دی تھیں۔

عظمیٰ نے وہ کاغذ دوبارہ تہہ کر دیا لیکن اس مرتبہ اُس نے کاغذ کو بے حد خیال سے پکڑا ہوا تھا، جیسے کوئی قیمتی چیز اُس کے ہاتھ میں ہو۔

اللہ رحمٰن نے تو ہم سب کے لیے گائیڈ لائن (قرآن پاک) دی ہوئی ہے۔

یہ تو اب ہم پر ہے کہ ہم اِسے کس طور پر استعمال کرتے ہیں اور کسی فیصلے تک کیسے پہنچتے ہیں۔

❖❖○❖❖

میرے من کے آنگن میں کیوں اپنا روپ سجاتی ہو
سارے موسم بیت گئے اب سج دھج کر کیوں آتی ہو
کیوں من کو جلاتی ہو
تم میری بھلا کون ہوتی ہو؟
برسوں پہلے میں نے تم کو چپکے چپکے چاہا تھا
اپنے من میں بسایا تھا
دھیرے دھیرے پیار میں کھو کر من کو اپنے جلایا تھا
پہروں خود کو رلایا تھا
پیار ہی جینا پیار ہی کل سرمایہ تھا
پیار کی راحت کھو کر جانا جو کچھ تھا سب مایا تھا
تم جو مایا کی دیوی تھیں سپنوں میں کھوئی رہتی تھیں
نیل گگن سے آنے والے شہزادے کی
بانہوں میں سوئی رہتی تھیں
خواب سجا کر آنکھوں میں جب تم نے اپنی عمر گنوائی
پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھا کوئی صدا نہ تم تک آئی

پھر اب...
میرے من کے آنگن میں چپ چاپ کھڑی کیوں رہتی ہو
پیار کی کچی مالا میں اشکوں کے موتی پروتی ہو
تم میری بھلا کون ہوتی ہو؟
بھول گیا میں ساری باتیں
بیت گئیں جیون کی راتیں
بہتے آنسو آہیں نالے
لے لو سب اپنی سوغاتیں
اب کیوں تم پچھتاوا بن کر
میرے خواب چراتی ہو؟
تم میری بھلا کون ہوتی ہو؟
تم میری بھلا کون ہوتی ہو؟

سمعان بیڈ کے سرہانے سر رکھے شاید سو گیا تھا۔ جب سے اُسے اطلاع ملی تھی کہ مسکان کو ٹریٹمنٹ کے لیے ہسپتال میں رکنا ہوگا وہ مسکان کے ساتھ ساتھ تھا۔

اب بھی جب تین گھنٹے پہلے وہ سائرہ کے ساتھ ہسپتال آیا تھا تو سائرہ زبردستی آیا اماں کو گھر چھوڑنے گئی تھی، ایسے میں وہ مسکان کے پاس ہی رُک گیا تھا۔

مسکان کے سر کو سہلاتے اُسے چپ چاپ نیند کی دواؤں کے زیرِ اثر سوتے دیکھ کر وہ بے حد دُکھ میں ...لا ہو گیا تھا۔

کیسی سنہری سی لڑکی تھی وہ! پہلی بار، پہلی بار اُسے دیکھتے ہی اُس کے ذہن میں جو خیال آیا تھا وہ ...ولڈن گرل" کا آیا تھا۔ آج وہ گولڈن گرل اپنی ساری سنہری شعاعیں خود میں بند کیے پنجر کی طرح ...ر آ رہی تھی۔

...ہ اُس کا ہاتھ تھامے بہت ساری باتیں کرتا رہا اور پھر جانے کب اُس کی خود کی آنکھ بھی لگ گئی تھی۔

سائرہ دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوئی تو چھن سے کچھ اُس کے اندر ٹوٹا تھا، جن سے ہم محبت ...تے ہیں حقیقت کا کوئی منظر ہو یا تصور کا کوئی منظر کسی اور کا ساتھ اُس میں ہو تو ہمیں کبھی برداشت ...یں ہوتا۔

...یہ انسانی فطرت ہے!

...کی مسکان میں سائرہ کی جان تھی۔ تو پھر اُسے سمعان کے ساتھ دیکھ کر اُسے کیوں لگا کہ اُس کے جسم ...جان ہی نکل گئی ہے۔

"سمعان!" سائرہ نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اُسے اُٹھایا۔

"آں، ہاں!" سمعان ایک دم چونک کر اُٹھا۔

"سوری! میں شاید سو گیا تھا۔" سمعان نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے پہ آئے بالوں کے گچھے کو پیچھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا۔ جواباً سائرہ نارمل سی مسکراہٹ بھی اپنے چہرے پہ نہ لاسکی۔
''مسکان اُٹھی تھی کیا؟'' سائرہ نے سوپ والا تھرماس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔
ویسے تو ڈاکٹر نے اُسے ہر غذا کھانے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن چوں کہ مسکان کا زیادہ تر وقت سوتے گزرتا تھا اِس لیے اُسے بے حد ہلکی پھلکی غذا کھلائی جارہی تھی۔
''نہیں! یہ نہیں اُٹھی، تب سے سو رہی ہے۔'' سمعان نے یک ٹک مسکان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔
''مائی گولڈن گرل! پلیز ٹھیک ہوجاؤ۔ تمہاری تکالیف مجھے بہت زیادہ تکلیف دیتی ہے۔'' سمعان نے صدقِ دل سے دعا کی تھی۔
''سائرہ! میرا دِل کرتا ہے، جس جس نے مسکان کے ساتھ زیادتی کی، اُن سب کو شوٹ کردوں، جن لوگوں نے اِسے مارا پیٹا اُس سے زیادہ قصوروار تو مسکان کے پاپا ہیں۔'' سمعان نے اپنا غصہ اُتارا۔
''کس قدر زیادتی کی ہے! میں حیران ہوں کہ... ایک جیتے جاگتے انسان کے ساتھ وہ کیا کھیل کھیلتے رہے اور وہ کوئی اور نہیں اُن کی سگی بیٹی تھی! آئی ہیٹ دیٹ مین!'' سمعان نے اپنے دِل کا غصہ اور نفرت باہر نکالا۔
سائرہ اس سارے دورانیے میں چپ رہی خود اُسے بھی مسکان کے باپ پہ بہت غصہ تھا۔
''یو آر رائٹ! وہ ایک بے حد سخت دِل انسان ہے۔'' سائرہ نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پاس پڑی کرسی پہ بیٹھ گئی اُسی پَل دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔
سائرہ ایک دم اُچھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر آنے والے سید سرفراز علی تھے، اُن کی آنکھوں میں سرخی چھلک رہی تھی۔
سائرہ کو جانے کیوں لگا کہ وہ اُن کی گفتگو سن چکے ہیں۔
''ہو اِز ہی! کون ہے یہ؟'' سمعان نے پوچھا۔
''مسکان ز فادر۔'' سائرہ نے سرگوشی میں جواب دیا۔
''اوہ...'' سمعان جو اتنی دیر سے بڑے بڑے دعوے کررہا تھا، بس اتنا ہی کہہ سکا۔
سید سرفراز علی کے ساتھ ڈاکٹرز تھے جو ڈاکٹر زبیر کے اسسٹنٹ تھے وہ سید سرفراز علی کو مسکان کی کنڈیشن بتارہے تھے جب کہ سمعان خاموشی سے باہر نکل آیا تھا۔
''یہ شخص...؟'' سمعان کا دماغ اُلجھا ہوا تھا۔
''میں نے اِس کو کہاں دیکھا ہے؟'' سمعان کو یاد نہ آرہا تھا کہ اُس نے اِس شخص کو کہاں دیکھا تھا اُس کی شکل کیوں جانی پہچانی لگ رہی تھی۔
سمعان نے جب بہت ذہن پہ زور ڈالا تو اُسے یاد آیا کہ اُس نے اِس شخص کی تصویر اپنے ہی گھر اپنی ہی ماں کے پاس اُس کی الماری میں موجود ایک پرانے البم میں دیکھی تھی۔ وہ البم جس کو اُس کی بہت غور سے دیکھا کرتی تھی، بے شک وہ اس شخص کی جوانی کی تصویر تھی لیکن وہ پہچان گیا تھا۔
''کون ہے یہ اور ہمارا جاننے والا کیسے ہے؟'' سمعان ابھی تو خود سے سوال کررہا تھا۔ کچھ دیر بعد گھر جاکر یہ سوال اپنی ماں سے کرنا چاہتا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کا یہ سوال اُس کی ماں اور باپ دونوں کے زخم اکھاڑ سکتا تھا۔

❖❖ ( ) ❖❖

تری آنکھیں بڑی گہری
بہت ہی خوب صورت ہیں
اجازت ہو تو میں کچھ دیر
ان میں جھانک کر دیکھوں
کہ مجھ کو چاند کے مانند
جھیلوں میں اُترنا
للف دیتا ہے!

لی نے کتنی ہی بار یہ تحریر پڑھی تھی اور ہر بار شرما کر ڈائری کو بند کردیا تھا۔ شرم سے سرخ ہوتے اپنے چہرے کے ساتھ وہ بیر بہوٹی ہوئے جارہی تھی۔
''میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میری شدتوں کو، میری محبت کو جانو، تب سے جب سے میں تمہیں چاہتا ہوں۔'' طارق نے نگی سے کہا تھا۔
''یہ وہ ڈائری ہے جو میں نے پہلی بار تمہارے لیے اپنے دل کے جذبات لکھنے کے لیے استعمال کی تھی۔'' طارق نے گہرے سبز رنگ کی ڈائری سامنے کرتے ہوئے کہا۔
''ایسی اٹھارہ اور ڈائریاں ہیں۔'' طارق جیسے سنجیدہ، کم گو، لیے دیے رہنے والے شخص کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر نگی واقعی حیران رہ گئی تھی۔ ہر شخص کے اندر ایک بچہ موجود ہوتا ہے جو اپنی مرضی کرتا ہے اور اپنے اظہار کے لیے کوئی بھی راہ اپناتا ہے۔
''نگی! میں نے تم کو بہت چاہا ہے۔'' طارق نے اُس کے بے حد قریب آکر کہا۔
نگی نے حیرت سے طارق کو دیکھا۔
''یار پلیز! کچھ بول دیا کرو! لیکن... لیکن ایسے نہ دیکھا کرو، میری باتوں، میری فیلنگ کو سمجھا کرو۔'' نگی نے کچھ چڑ کر کہا۔
سہول سے شادی اور اُس کے مطالبوں کے بعد طارق بہت زیادہ بے صبرا ہوگیا تھا وہ اِس بات کو جانتا لگا تھا کہ وہ جب تک اپنے محبت کرنے کے سورس آف انسپائریشن کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرے گا وہ زندگی میں کسی سے بھی محبت نہ کرسکے گا۔ اس لیے وہ بے حد بے صبری سے چاہتا تھا کہ نگی اُس کو پورا جان لے، اِن ڈائریوں کے ہی ذریعے یا پھر کسی بھی بیرومیٹر سے اُس کی شدت کو جان لے۔
نگی نے اثبات میں سر ہلا کر ڈائری لی تھی۔
اور اب... جوں جوں وہ پڑھتی جارہی تھی تو شرم سے دُہری ہوئے جارہی تھی۔
''مجھے مزید طارق بھائی نہ کہنا۔'' وہ جاتے جاتے انگلی اُٹھا کر تنبیہ کرکے گیا تھا۔
اور جوں جوں وہ تاریخوں کے ساتھ ڈائری پڑھ رہی تھی حیران ہورہی تھی کہ طارق کتنے عرصے پہلے سے اُسے چاہتے آرہے تھے۔ حیرت و شرم کے علاوہ کچھ فخر سا اُسے محسوس ہوا تھا کہ اُسے چاہنے والا شخص

بے حد متوازن اور اچھا ہے۔

اُس کی زندگی میں صرف دو ہی مرد تھے اور اتفاق ایسا تھا کہ دونوں ہی بے حد کمپیوزڈ اور مشکل پسند تھے۔ اُن کی عادت کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہوسکتی تھیں۔ بے شک اُن کے والد اور بھائی کی پرسنلٹی کو کم ہی میچ کرسکتا تھا۔ البتہ نگی! وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ اُس کی زندگی میں طارق جیسے ہی مرد کی تھی، بے شک طارق ایک پرفیکٹ چوائس تھا اس سے کم سے وہ کبھی خوش نہ رہ سکتی تھی۔

''نگی! تم اب تک سوئی نہیں؟'' روشن آرا بیگم جو تہجد کے لیے اُٹھی تھیں، نگی کے کمرے کی لائیٹ دیکھ کر فکرمندی سے اسے دیکھنے چلی آئیں۔

نگی کے وجود میں اس قدر سادگی اور بھولپن تھا کہ اُس کے وجود میں آئی کوئی بھی معمولی، غیر معمو بات چھپ نہ سکتی تھی۔ روشن آرا بیگم کو بھی فوراً سے کچھ مختلف کی خوشبو آئی تھی۔

''امّاں جان! بس نیند نہیں آرہی تھی۔'' نگی نے کہا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی اُسے واقعی نیند نہیں آرہی اُس کی نیند تو جانے کہاں اُڑ گئی تھی۔

''خیریت بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' روشن آرا بیگم نے فکرمندی سے پوچھا۔

''جی امّاں جان! میں بالکل ٹھیک ہوں شاید دوپہر میں، میں سوئی تھی اس لیے ہوسکتا ہے میری ڈسٹرب ہوگئی ہو۔'' نگی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو کیسے مطمئن کرے۔ شرم و حیا اُسے رو رہی تھی کہ وہ یہ بات اپنے منہ سے اپنی ماں کو نہ بتائے ورنہ وہ اپنی ماں سے کوئی بات نہ چھپاتی تھی۔

''بیٹا! لائٹ بند کردو اور لیٹ جاؤ، کمرا روشن کرکے لیٹو گی تو نیند آتی بھی ہوئی تو نہیں آئے گی روشن آرا بیگم نے پیار سے اُس سے کہا تھا۔

''جی اچھا!'' وہ تابع داری سے لائٹ بند کرکے زیرو کا بلب آن کرکے لیٹ گئی، نگی کی اِس قدر داری نے روشن آرا بیگم کے دِل سے خیال نکال باہر کیا کہ شاید نگی اُن سے کچھ چھپا رہی ہے۔

''مجھے امّاں جان کو باخبر رکھنا ہوگا ورنہ وہ ناراض ہوں گی۔'' نگی نے کروٹ لیتے ہوئے سوچا، نے اپنی زندگی کی کوئی بھی بات آج تک امّاں جان سے نہیں چھپائی تھی تو اس کی وجہ روشن آرا کا اُس کے ساتھ دوستانہ رویہ اور آزادی و رائے دینے کا حق تھا۔

''مجھے کچھ بتاتے شرم آئے گی!

''طارق! طارق سے کہوں گی کہ وہ سب کو بتائیں۔ پھر وہ خود بھی تو کہتے ہیں کہ رشتے جب تک نام نہ پاجائیں معتبر نہیں ہوتے۔ اب تک انہوں نے اپنا اظہار بھی اِسی وجہ سے چھپا رکھا تھا لیکن والد سے چھپ کر کوئی رشتہ بنانا بھی تو غلط بات ہے نا!'' نگی کی ذات کا شفاف پن اُسے ہمیشہ شفاف سوچ شفاف رویے ہی بتاتا تھا۔

''ٹھیک ہے میں طارق کو یہ ڈائری واپس کردوں گی اور اُن سے صاف لفظوں میں کہہ دوں گی کہ اپنے والدین سے چھپ کر کوئی رشتہ نہیں بناسکتی، اگر طارق واقعی اِس رشتے کی کوئی حتمی شکل چاہتے گے تو کچھ آگے بڑھیں گے۔ مجھے اپنے والدین سے چھپ کر کوئی کام، کوئی نیا رشتہ منظور نہیں!'' اُس فیصلہ کیا۔ بے شک اُس کا دل سورج مکھی کے پھول کی طرح اُدھر ہی جھکے جارہا تھا، جہاں جہاں طارق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ام تھا لیکن اُس نے اپنے دِل کو پرے رکھ کر وہ فیصلہ کیا اور بے حد کٹھن فیصلہ کیا، جو اُس کے والدین کی بیت کا نتیجہ تھا۔

والدین کی اچھی تربیت تو ایسی روشنی کی طرح ہوتی ہے، جو زندگی کے ہر اندھیرے کو کھا جاتی ہے اور مان کو اندھیروں میں ڈوبنے سے بھی بچالیتی ہے۔

❖❖○❖❖

''سر! دیکھ تو آپ نے لیا ہے کس قدر سخت سکیورٹی ہے اب آپ کچھ سوچ بھی لیں۔'' آصف نے طارق کو مزید پیش قدمی سے روکنے کی کوشش کی۔

''تم اگر خوف زدہ ہو تو واپس جاسکتے ہو۔'' طارق نے بے حد سچائی سے جواب دیا۔

''نہیں سر! آپ کے خیال میں مجھے ایسا کرنا چاہیے؟'' آصف نے شرمندگی سے پوچھا۔

''غلط اور درست باتوں کا بیرومیٹر تو ہر شخص کے اندر اللہ نے ہمیشہ رکھا ہے کسی سے سوال کرنے سے پہلے ہر شخص کو اپنے اُس بیرومیٹر کو خود سے چیک کرلینا چاہیے۔'' طارق کی بات پر آصف کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے خوف زدہ تھا، ایک دم سے شرم سے سرخ پڑ گیا۔

''ہمیشہ وہی فوجیں کام یاب ہوتی ہیں، جن کے لیڈر آگے بڑھ کر کھڑے ہوتے ہیں، جن کو گولی لگ جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کوئی ڈر، کوئی خوف اُن کے پاؤں نہیں اکھاڑ سکتا۔ وہ دوسروں کے لیے ہمت کا انسپائریشن ہوتے ہیں۔''

''سوری سر!'' آصف نے شرمندگی سے کہا۔

''کس بات کا سوری یار! کم آن مجھے اپنے شیر جوان ہمیشہ مسکراتے اچھے لگتے ہیں۔'' طارق نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس کی ساری شرمندگی چوس ڈالی تھی۔

''اچھا تم دوسری گاڑی میں میرے پیچھے ہوگے اور تم اور رانا میری گاڑی کو کور کرو گے۔ کم آن جلدی کرو۔'' طارق نے اُسے دوسری گاڑی میں فوراً بھیج دیا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ سانپ کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اُس کا نوالہ چھین لینے کا پلان کررہے ہیں۔ شیر کے منہ سے نوالہ چھینتے ہوئے آپ کو جسمانی لڑائی لڑنی پڑتی ہے اور شیر بڑا غیرت مند جانور ہوتا ہے سامنے لڑتا ہے جب کہ سانپ بڑا زہریلا اور چھپ کر وار کرنے والا موذی ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے نوالہ چھیننے کا مطلب ہے کہ خود کو ڈسوا کر کچھ چھینا۔ لیکن طارق جیسے سچے اور کھرے جرأت مند لوگوں کے لیے کبھی بھی زندگی کے کھونے کا خوف، خوف نہیں رہا تھا۔

''بس یہ ہی موقع ہے ہمارے پاس، اس کے بعد ہم اُس لڑکی کو نہیں بچا پائیں گے۔ تم جانتے ہو کہ میں یہ آپریشن ان آفیشلی کررہا ہوں، اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔'' طارق نے وائرلیس پر عملے کو مختلف ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ یہ بات کہی تھی۔

''یس سر!'' آصف نے تابع داری سے کہا۔

مہرون وی ٹی آئی تیزی سے آگے بھاگ رہی تھی۔ ترنم کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق لڑکی اُسی کار میں لے جائی جارہی تھی، کل اِس لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں بھی لکھی جاچکی تھی۔ لیکن راگنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سورس کی وجہ سے کوئی بھی کارروائی دو دن کے لیے روک دی گئی تھی۔

''اوہ میرے خدایا! یہ تو پشاور جا رہے ہیں۔'' تین گھنٹوں کی مسلسل مسافت کے بعد طارق کو اندا ہوگیا تھا یعنی لڑکی آگے علاقہ غیر تک لے جائی جائے گی۔ وہ بے حد ذہین آدمی تھا۔ بہت ساری با اُسے وقت سے پہلے معلوم ہو جاتی تھیں۔

اُن لوگوں نے موٹروے وغیرہ پر چڑھنے کی کوشش نہ کی تھی بلکہ دوسرے راستوں سے جایا جا رہا تھا۔

''یار! اگر یہ پشاور کی طرف جا رہے ہیں تو کسی بھی پَل ہمارے ہاتھوں سے نکل سکتے ہیں۔'' طار نے وائرلیس پر آصف سے مشاورت کی۔

''سر! پشاور پولیس سے مدد لی جا سکتی ہے۔'' آصف نے کہا۔

''کمال ہے یار! ڈائریکٹر صاحب کی پرمیشن کے بغیر میں نکلا ہوں۔ اُن کا کہنا ہے کہ میں اُن کی کے کمانڈوز اُن کی اجازت کے بغیر کیوں استعمال کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ تم لوگوں کی نوکری جائے گی۔ اگر ڈائریکٹر صاحب نے کچھ عرصے تک آپریشن کی پابندی نہ لگائی ہوتی تو اِس لڑکی کو ہم ا ہی علاقے میں بازیاب کروا لیتے لیکن اب مسئلہ۔ باقاعدہ مسئلہ ہے۔'' طارق نے ماتھے پر بَل ڈال کر سامنے جاتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے کہا جو تیزی سے بھاگے ہی جا رہی تھی۔

''تو پھر سر آپ کیا کریں گے؟'' آصف نے پوچھا۔

''اُن کو میں روکوں گا اور تم لوگ صرف مجھے کور کرو گے فرنٹ پہ نہیں آؤ گے چاہے کچھ بھی ہو!'' طار نے سختی سے حکم دیا۔

''کیوں سر! کیا اجر نیکی کے صرف آپ حق دار ہیں۔'' رانا جواد کی آواز وائرلیس سیٹ پر اُبھری۔

''رات کو جگا کر گھر کے دروازے پر بلا کر آپ اِس لیے لے کر گئے تھے کہ ہمیں چوہوں کی طر چھپے رہنے کا حکم دیں اور خود شیروں کی طرح موت کے منہ میں جا گھسیں۔'' رانا جواد نے سلگتے ہوئے کہا وہ کسی طور طارق کو اکیلے آگے بڑھنے نہ دینا چاہ رہا تھا، اس لیے وہ لڑنے پہ اُتر آیا تھا۔

''پاگل نہ بنو! میں تم لوگوں کو کیسے مرنے کے لیے آگے کر دوں، اُن کے پاس جدید اسلحہ ہے، وہ تعدا میں ہم سے زیادہ ہیں جتنا میں نے کہا اتنا کرو۔ اِٹس مائی آرڈر!'' طارق نے سختی سے کہا جواباً دوسرا جانب مکمل خاموشی تھی۔

عظمٰی چپ چاپ بے حد خاموشی سے بیٹھی تھی۔

مارک نے کتنی ہی بار پیچھے مڑ کر حیرت سے اُس لڑکی کو دیکھا، جو بلا چون و چرا بیٹھی تھی ورنہ تو لڑکیا اتنی مزاحمت کرتی تھیں کہ اُن کو لڑکی ہمیشہ بے ہوش کرنی پڑتی تھی۔

''یہ اتنی چپ اور مطمئن کیوں ہے؟'' عظمٰی کا اتنا نارمل نظر آنا مارک کو ایب نارمل لگ رہا تھا۔

عظمٰی نے ہاتھ میں ترنم کا دیا خط مضبوطی سے تھام رکھا تھا، یہاں تک کہ کاغذ اُس کے ہاتھ کے پ سے گیلا ہونے لگا تھا لیکن اُس نے بے حد مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے سہارے کے لیے رسی کو تھاما ہ ہے۔

''اگر ترنم باجی نے کسی کو مجھے بچانے کے لیے نہ بھیجا تو میں گاڑی سے کود جاؤں گی لیکن اِس گندگی

ول میں نہ اُتروں گی۔'' وہ مسلسل دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کر رہی تھی۔

''یا اللہ میری مدد کر! میں ہر مشکل و تکلیف سے تیری پناہ چاہتی ہوں۔'' عظمٰی نے صدقِ دِل سے دُعا لی تھی۔

اِسی پَل جانے کیا ہوا کہ گاڑی ہچکولے کھاتی رُکی ساتھ ہی فائرنگ شروع ہوگئی۔ عظمٰی نے سختی سے ھیں بند کر لی تھیں۔

''کیا.. کیا موت سر پر کھڑی ہے؟'' اُس نے خود سے سوال کیا اور فوراً کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔

گاڑی میں موجود مارک کے ساتھیوں نے جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ پھر وہ لوگ گاڑی سے اُتر اُترنے لگے۔ عظمٰی کو جب احساس ہوا کہ وہ گاڑی میں اکیلی رہ گئی ہے تو اُس نے فیصلہ کرنے میں ایک پل بھی نہیں لگایا۔

دونوں جانب شدید فائرنگ ہو رہی تھی اور وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

''اوہ شٹ!'' آصف نے لڑکی کو گاڑی سے باہر نکلتے اور طارق کو لڑکی کو بچانے کے لیے آگے بڑھتے دیکھ کر غصّے و بے بسی سے کہا۔

''نو سر! پلیز سر آگے نہ بڑھیں۔'' آصف نے فائرنگ کا جواب مسلسل دیتے ہوئے دِل ہی دِل میں طارق کو مخاطب کیا۔ اُس کا بس نہ چل رہا تھا کہ کسی بھی طرح طارق کو روک لے۔

''سر!'' رانا جواد ایک دم چیخا تھا۔

اگلے ہی پَل طارق کی کمر کو چیرتی گولیاں خون کے فوارے پھوڑتی نکل گئی تھیں، اُس نے لڑکی کو بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ وہ لڑکی کے سامنے آ گیا تھا۔

آصف اور جواد دونوں نے جنونیوں کی طرح مارک اور اُس کے ساتھیوں پر حملہ کیا۔ اسکے سارے ساتھی ایک ایک کر کے ختم ہوگئے تھے۔ مارک نے بھاگنے سے پہلے غصّے سے طارق کو زمین پہ گرتے دیکھا۔

''اگر تم زندہ بچ گئے تو میرے بدلے سے کبھی نہ بچ پاؤ گے تم نے مارک سے پنگا لیا ہے۔'' وہ غصّے سے بل کھاتا وہاں سے نکلا۔

آصف اور جواد دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔

''سر! سر!'' آصف چیخ چیخ کر طارق کو پکار رہا تھا۔

طارق کی ڈوبتی سانسیں آصف کو پاگل کر رہی تھیں۔

''پلیز سر اُٹھیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' رانا جواد نے طارق کو کندھوں پر ڈال کر اُٹھا لیا۔

''آصف!'' رانا جواد نے مڑ کر آصف کو پکارا، جو زمین پر گھٹنے ٹیکے رو رہا تھا۔

''لڑکی کو گاڑی میں ڈالو اور فوراً چلو سر کو ہسپتال لے جانا ہے۔'' رانا جواد نے آصف کا انتظار کیے بغیر طارق کو طارق کی گاڑی میں ڈالا اور تیزی سے گاڑی بھگا لے گیا تو آصف کو ایک دم سے ہوش آیا اُس نے پاس پڑی لڑکی کو دیکھا، جو شاید خوف سے بے ہوش ہوگئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آصف نے لڑکی کو کندھوں پر ڈالا اور منہ سے آنسو صاف کرتا ہوا گاڑی کی جانب بڑھا...

''طارق سر! یہ کہاں کی دوستی ہے۔خبردار جو آپ ہم کو چھوڑ کر گئے۔'' آصف نے اپنے روانی سے آنسوؤں کے ساتھ دِل ہی دِل میں طارق کو مخاطب کر کے کہا اور گاڑی جواد کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ تیزی سے ہسپتال لے کر جا رہا تھا۔ طارق کی سانسیں ڈوبتے ڈوبتے بے حد مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ طارق کی سانسیں مدھم ہو رہی تھیں، جواد اُس سے زیادہ گاڑی کی رفتار بڑھا رہا تھا۔

موت زندگی کو پکڑنے کے لیے فاصلہ دھیرے دھیرے کم کرتی جا رہی تھی.....!!

لوگوں کے ساتھ انسان کا خون کا رشتہ نہیں ہوتا لیکن اُن پر جب جب تکلیف یا مصیبت آتی ہے ادل بُری طرح تڑپ اُٹھتا ہے، تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ تو ہمارا دِل کا رشتہ ہے۔ رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے خونی رشتوں کی طرح ڈیمانڈنگ نہیں ہوتا یہ تو بنا کسی گلے شکوے کے بس جاتا ہے محبت، دوستی، قربانی جیسے لفظ اس رشتے کو مزید سینچتے ہیں۔ طارق نے بھی ہمیشہ دِل کے بنائے تھے، ان میں محبت، دوستی اور قربانی کی کھاد ڈالی تھی۔

رانا جواد بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا کبھی اُس کی آنکھوں سے آنسو نہ بہے تھے لیکن وہ اِس وقت تھیٹر کے باہر کھڑا زار و قطار رو رہا تھا اور... اور جس شخص کے لیے وہ رو رہا تھا اس سے اُس کا نہیں دل کا ناتا تھا۔ طارق کا آپریشن شروع ہو چکا تھا۔ یہ سب اُس نے خود کیا تھا جب اے ٹی ایم پیے نکلواتے وقت اُس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے تو اُسے احساس ہوا تھا کہ طارق کو نے کا ڈر اُسے اندر سے کمزور کر رہا ہے، اُس کو اچانک احساس ہوا کہ وہ طارق سے بے حد پیار کرتا اور اب وہ کسی قریبی عزیز کی طرح باہر کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

"جواد! سر کے گھر اطلاع دے دیں۔" افسردہ سے آصف نے قریب آ کر مشورہ لیا۔

"آں ہاں! دینی تو چاہیے۔" جواد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

آپریشن اس قدر ارجنٹ تھا کہ اُن کو یاد ہی نہیں رہا کہ طارق کے گھر اطلاع کر دیں۔ پھر ضروری کارروائی، جس کو رانا جواد نے اپنے سورس سے فی الحال دبالیا تھا۔ سول پولیس میں اُس کے کچھ دوست تھے جو آج کام آ گئے تھے۔

"سر! طارق کے سیل پہ گھر کے نام پہ دو نمبر ایڈ ہیں کس پہ انفارم کروں؟" آصف نے فون انڈیکس ل کر دیکھا اور پھر رانا جواد سے مشورہ لیا۔

"دونوں پہ کر دو یار۔" رانا جواد نے بے دلی سے جواب دیا۔ اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس جواب دے رہی تھی۔

آصف نے دونوں نمبرز پر اطلاع کر دی تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ اَن جانے میں ایسی جگہ اطلاع کر بیٹھا طارق کی زندگی کا ایک بہت بڑا راز تھی، جس کو طارق نے سات پردوں میں چھپا کر رکھا تھا لیکن ...آج اچانک کسی کی اَن جان غلطی سے طارق کا بھرم کھلنے جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تانیہ کو میں کیا جواب دوں گی کہ میں بچی کا خیال نہ کرسکی۔" مرینہ آنٹی نے سحرش کے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔

"کس کا فون تھا؟" وہ ملازمہ سے پوچھ رہی تھیں۔

"پتا نہیں بیگم صیب! بی بی نے خود ہی سُنا تھا۔" سحرش کے بے ہوش ہونے پر ملازمہ دوڑ کر ساتھ والے گھر میں رہنے والی مرینہ آنٹی کو بلا لائی، جو اُن کے خاندان کی بڑی بزرگ بھی تھیں۔

"اچھا تم پہلے محمد حنیف سے کہو کہ ڈاکٹر کو گھر لے کر آئے، معلوم نہیں بچی کو کیا ہوا ہے۔" مرینہ آنٹی نے فکر مندی سے سحرش کو دیکھتے ہوئے کہا جو سرسوں کی طرح پیلی پڑ چکی تھی۔

"یا اللہ خیر کرنا۔" وہ بے اختیار دعا گو ہوئیں۔

ڈاکٹر نے سحرش کو انجکشن دیا۔

"فکر کی بات نہیں، ابھی کچھ ہی دیر میں ہوش آ جائے گا۔" ڈاکٹر تسلی دے کر چلا گیا۔

ڈاکٹر کی تسلی پر مرینہ آنٹی کو کچھ تسلی ہوئی، ان کے اعصاب پرسکون ہوئے تو وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوئیں۔

وہ فون کی جانب بڑھیں اور سی ایل آئی پر آئے نمبر کو نوٹ کر کے ڈائل کیا۔ آخری بار اسی نمبر سے کال آئی تھی، جس کو سن کر سحرش بے ہوش ہوگئی تھی۔

لیکن کچھ دیر بعد بھی ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھی تھیں۔

طارق!! طارق زندگی اور موت میں جھول رہا تھا۔

سحرش کی زندگی کا سینٹر آف سرکل طارق ہی کی تو ذات تھی، جب اُس کی زندگی کا سینٹر آف سرکل اُس سے کھونے لگا تو وہ اِس کھونے کے ڈر کو فیس نہ کرسکی اور بے ہوش ہوگئی۔

"سحرش! میری جان اُٹھو!" انہوں نے ہوش میں آتی سحرش کو الرٹ کیا۔

"آنٹی... آنٹی!" سحرش سسکتے ہوئے اُٹھی۔

"میرے طارق کو کچھ ہوگیا نا تو میں جی نہ پاؤں گی... میں مر جاؤں گی۔" سحرش اُن کی گود میں سر رکھے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا۔" مرینہ آنٹی نے خود بھی آنسو صاف کرتے ہوئے اُسے تسلی دی۔

"اللہ نے چاہا تو؟" سحرش نے ایک دم بپھری ہوئی شیرنی کی طرح سر اُٹھا کر سوال کیا۔

"اور اگر میرا طارق چھین لیا تو؟" سحرش سے بات مکمل نہ ہو رہی تھی، آنسوؤں کے گولے اُس کے گلے میں اٹک رہے تھے۔

"میرا تو پہلے ہی سب کچھ چھن گیا میری عزت، میرے خواب، میرا اُجلا پن، ڈیڈی، بھائی، ممی، دادو اور اِس معاشرے میں ایک باعزت مقام! اب میرے پاس صرف طارق ہیں۔" سحرش نے ٹوٹے مڑے ہاتھوں کے ساتھ پوچھا، وہ اِس وقت نارمل نہ تھی۔

"سحرش! خدا پر بھروسا کرو، اچھا گمان رکھو!" مرینہ آنٹی نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"آنٹی! مجھے کچھ نہیں چاہیے کوئی مال و دولت، کچھ نہیں، بس کوئی مجھ سے میرا طارق نہ چھینے۔" اُس نے مرینہ آنٹی کے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سحرش! ہوش کے ناخن لو، طارق کو اِس وقت تمہاری اور تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔" مرینہ آنٹی نے اُسے جھٹک کر کہا۔

"دعا...؟"

"دعا! مگر میری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟" سحرش نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کہا۔

"تم!"

"تم!" مرینہ آنٹی اُسے سمجھانے کے چکر میں پڑتے پڑتے رک گئیں۔

"او کے۔" انہوں نے طویل سانس بھر کر خود کو کمپوز کیا۔

"لیکن تمہارا تعلق طارق سے تو ہے نا! اور طارق کا اللہ سے بہت گہرا رشتہ ہے! تم جانتی ہو نا؟" انہوں نے اُسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہوں!!" سحرش نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر طارق کے لیے اللہ سے اُس کی زندگی مانگو۔" مرینہ آنٹی نے بے حد ٹھوس لہجے میں کہا تو سحرش نے گم سم انداز میں انہیں دیکھا۔

"اللہ سے طارق کو مانگوں؟ لیکن کیسے؟" بہت عرصہ ہوا اُس نے اپنی زندگی سے یہ تعلق یہ ناتا نکال باہر کیا تھا۔ اور آج!

سحرش کو ایک دم بہت ساری دھند اپنی آنکھوں کے سامنے چھائی محسوس ہوئی، چھن چھن کسی جھرنے کی طرح بہتی یہ آواز اُس کے دِل تک سنائی دی۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" سحرش نے غور سے سننے کی کوشش کی، جو اُسے اپنے ہی اندر سے آ رہی تھی۔

میں ہوں!

میں تھا... میں ہوں! اور صرف میں رہوں گا!

ذات لافانی کی آواز وہ غور سے سن سکتی تھی، اُس کا پورا وجود لرزا۔

میں ہوں... میں ہوں! میں ہوں!

حجابِ شب شب و تاب خواب رکھتا ہے
درونِ خواب ہزار آفتاب رکھتا ہے
کبھی خزاں میں کھلاتا ہے رنگ رنگ کے پھول
کبھی بہار کو بے آب و رنگ رکھتا ہے
کبھی زمین کا منصب بلند کرتا ہے
کبھی اسی پر بنائے عذاب رکھتا ہے
کبھی یہ کہتا ہے سورج ہے روشنی نہ گواہ
کبھی اسی پہ دلیل حجاب رکھتا ہے
کبھی فغاں کی طرح رائیگاں اثاثہ حرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھی دعا کی طرح مستجاب رکھتا ہے
میں صابروں کے قبیلے سے ہوں مگر میرا ربّ
وہ محتسب ہے کہ سارے حساب رکھتا ہے
میں ہوں، میں ہوں!!
ظاہر باطن۔ اندر باہر۔ زمین آسمان...
میں...بس میں ہوں!

دُھند چھٹ رہی تھی، ایک دم روشنی کا جھماکا سامنے آیا اِس بار سحرش نے آنکھیں بند کی تھیں لیکن اُس کے دِل کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور وہ سجدے میں ایک دم گر گئی تھی۔

❖❖○❖❖

"ماہی! یہ سب کیا ہے؟" ترنم نے دِل ہی دِل میں اُس سے سوال کیا۔

گئے دِنوں میں ماہی کا بدلا ہوا رویّہ ترنم کو حیران کرتا آیا تھا۔ وہ طوائف زادی تھی اور اُسے اپنی زندگی سے کوئی شکوہ نہ رہا تھا، پیسے اور دوستی کے علاوہ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ٹارگٹ نہ رکھا تھا، لیکن میڈم چاندنی کی اِس طرح اچانک کے موت کے بعد وہ مکمل طور پر بدل گئی تھی شروع میں یہ احساس نمایاں نہ تھا لیکن اب ترنم واضح طور پر اِس احساس کو محسوس کرسکتی تھی، آج ہر طرح کی دھند چھٹ گئی تھی
ماہی کب واپسی کے راستے پر چل پڑی، ترنم کو احساس تک نہ ہوسکا۔

"یہ سب کیا ہے؟" ترنم نے جائے نماز پر کھڑی ماہی سے دریافت کیا۔
ماہی کھڑے سے وہیں جائے نماز پر بیٹھ گئی۔
"ایسی بھی کوئی انہونی نہیں ہے!" ماہی ایک دم ہنس دی اور ہنستے ہنستے ایک دم رو پڑی۔
"مانتی ہوں کہ میں بہت گناہ گار ہوں، بہت سیاہ کار ہوں! لیکن وہ اکثر تم ہی تو سنایا کرتی تھیں مجھے۔" ماہی نے کچھ رک کر ترنم کو دیکھا۔

اِنَّ وَعْدَاللّٰہِ حَقٌّ !

سچے لوگ ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں سب تعریفیں اس کے لیے ہیں، جو فشارِ عزائم ہے اور جو کشادہ ارادہ ہے۔

میرے حضور ﷺ سے مرے خدا کا وعدہ ہے۔
خیر کے گھر میں جتنے دروازے کھلتے ہیں۔
اُن میں ایک توبہ کا بھی دروازہ ہے۔
اشک ندامت اپنی جگہ پر آپ بڑا خمیازہ ہے۔
مرے حضور سے مرے خدا کا وعدہ ہے!"

ماہی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رودی! چاند چہرہ اُس نے ہتھیلیوں میں چھپا رکھا تھا۔ ترنم اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔
"ماہی! یہ سب کب؟ کیسے ہوا؟ کیا میں اِس قابل نہ تھی کہ تمہاری رازداں ہونے، تمہارے بوجھ

کی حصّے دار بن سکتی؟" ترنم نے اِس کے ہاتھ اُس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔
آنسوؤں سے اُس کی ہتھیلیاں تک گیلی تھیں۔
"نہیں! ایسا نہ کہو! تم نہیں جانتیں، تم ہی کو دیکھ کر میرے اندر اس برائی سے چھٹکارے کی ہمت جاگی ی۔" ماہی نے نم آنکھوں اور نم لہجے میں جواب دیا۔
"لیکن میں تم کو کیا بتاتی؟ میرے اندر شرمندگی اِس قدر تھی کہ اُس کے بوجھ تلے میری روح اور زبان ی ہوئی ہے میں تم سے، اپنی سہیلی تک سے کہہ نہ پائی کہ مجھے اپنے کیے پر شرم ساری ہے!"
"کس زبان سے کہتی، کس منہ سے کہتی؟ تیری واپسی اور توبہ کا میں نے کتنا مذاق بنایا تھا نا!" ماہی نے ائے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔
"ماہی!" ترنم نے بے حد خوشی سے اُسے گلے لگالیا۔
"مبارک ہو!" ترنم اُسے مبارک باد دے رہی تھی۔
"یہ زندگی عمل اور اَجر کمانے کی جگہ ہے، یہاں کی گئی ندامت اور توبہ کا بڑا درجہ ہے، اُس دنیا میں تو ل جواب دہی ہوتی ہے۔ مبارک ہو تم کو اللہ سوہنے نے مہلت دی کہ تم توبہ کرسکو، غلط اور درست کو ان سکو۔" ترنم نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
"تم جانتی ہو میں خود دھوپ چھاؤں کی کیفیت میں رہتی ہوں کبھی کبھی میرے سیاہ اعمال مجھے اتنا الدہ کرتے ہیں کہ میری شرم ساری بھی اُن کے آگے کم پڑ جاتی ہے اور میں عجیب یاسیت میں گھری ل ہوں، لیکن پھر مجھے اللہ کی بڑائی یاد آتی ہے، اُس کا رحمان ہونا یاد آتا ہے تو میں پھر سے اطاعت ار ہوکر کفارے کی جانب لگ جاتی ہوں اور آج تمہارا یہ جملہ تم نہیں جانتی کتنا بھاری اور قیمتی ہے ے لیے کہ "تم کو واپسی کی ہمت میری وجہ سے ہوئی۔" اللہ تیرا شکر ہے میں مثالِ عبرت کے بجائے ل خیر کی حصّے دار ہوگئی، اللہ تیرا شکر ہے۔" ترنم زار و قطار رو رہی تھی۔ یہ آنسو خوشی کے تھے، بے شک الہ ابھی بنا نہیں تھا لیکن اُس کی شروعات ہوچکی تھی۔ ترنم کو یہ جنگ لڑنے کے لیے ایک ساتھی مل گیا ا۔
"ترنم! کیا میری توبہ قبول ہوگی؟ دراصل آخری وقت پہ توبہ کا اسٹیٹس بھی تو کم ہوجاتا ہے، ایسا میں ہ سنا ہے۔" ماہی نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔
"ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" ترنم نے فکرمندی سے کہا۔
"اور آخری وقت کا کیا مطلب ہے، آخری وقت تو مرنے والے کا ہوتا ہے اور جب تک موت نہیں ی توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔" ترنم نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔
"موت! موت ہی تو سر پہ کھڑی ہے۔" ماہی کی سہمی سہمی آواز کسی کنویں سے سنائی دی۔
"مطلب؟" ترنم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
"مطلب؟" ماہی ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ہنسی، اُس نے جائے نماز کو لپیٹا اور الماری میں رکھ دیا اور ماری کا پٹ بند کرکے اُس کے ساتھ ٹیک لگا کر چپ چاپ کھڑی ہوگئی، جیسے بات کرنے کے لیے تمہید دھ رہی ہو۔ پھر وہ ایک دم الماری سے گھسٹتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کتنی نادان تھی نا میں، کبھی سوچا ہی نہیں کہ میں جو یہ زندگی جیے جا رہی ہوں، کبھی ختم بھی ہوگی!'' ماہی نے اپنے بے حد حسین ہاتھوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

''لیکن پھر ایک دِن مجھے نہ صرف احساس ہوا بلکہ مجھے یہاں سے نکلنے کی تاریخ بھی مل گئی۔'' ماہی بات کرتے کرتے چپ ہوگئی۔ اُس کے گلے میں آنسوؤں کے پھندے لگ رہے تھے۔ ترنم آنکھیں پھاڑے، سانس روکے اُس کا انکشاف سن رہی تھی۔

''مجھے۔ مجھے!!'' ماہی نے تھوک سے حلق تر کرتے ہوئے بولنے کی کوشش کی۔

''مجھے۔ مجھے ایڈز ہے!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''کیا؟'' ترنم کے لب پھڑ پھڑائے، ایک بم تھا، جو عین اس کے سر پر پھٹا۔

''میرے اللہ!'' ترنم کو اپنے دل میں بے حد درد محسوس ہوا۔ سامنے بیٹھی لڑکی رو رو کر پانی ہوئی جا رہی تھی، ترنم کو ایک تلخ حقیقت کا احساس بے اختیار ہوا تھا۔ وہ لڑکی بہت جلد ہاتھوں سے پھسل کر نکلنے والی بھی تھی۔

❖❖○❖❖

میں اپنی بند آنکھوں سے
تمہارے پُرسکون جیون کا
سپنا دیکھتی ہوں
کھلی آنکھوں سے ہر پل میں
تمہارے واسطے خوشیوں کی برکھا مانگتی ہوں
میں چاہتی ہوں کہ
اِس دنیا کے سارے شبنمی رنگ
جو میری دسترس میں ہیں تمہیں دے دوں
وہ سارے خیال جو کہ تم!
تصور میں پروتے ہو
میں اُن میں آ کے چپکے سے
حقیقت کی دھنک بھر دوں

ولی کتنی ہی دیر سے کاغذ تھامے مسکرا رہا تھا۔ عبداللہ نے کچن کی کھڑکی، جو لاؤنج میں کھلتی تھی کتنی ہی بار جھانک کر ولی کے پوز کو دیکھا، جو اُس کی پُرتجسس طبیعت کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

''بڑے بھائی! کیا خوشی سے سکتہ ہوگیا ہے۔ اگر بھابی کا لیٹر اتنا پُر اثر ہے تو وہ خود تو خوب تباہی شباہی کر ڈالتی ہوں گی۔'' عبداللہ نے شرارت سے کہا۔

''یہ تباہی شباہی کیا بلا ہے؟'' ولی نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور خط تہہ کر کے اپنی ڈائری میں رکھ دیا۔ یہ علیزے کی جانب سے پہلی بار کوئی اظہار تھا، ولی کو حقیقتاً بہت مزا آیا تھا۔ جن سے آپ پیار کرتے ہوں، اُن کا اظہار بھی بہت پیارا ہوتا ہے، عزیز ہوتا ہے۔

''یہ پیارے پیارے لوگ عموماً بلکہ پیاری پیاری ایشین کڑیاں ہم بے چارے لڑکوں کے دلوں میں جو اودھم مچاتی ہیں۔'' عبداللہ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے کے جو تاثرات تھے، عبدالولی کی ہنسی بے اختیار تھی۔

''تم کو بڑا تجربہ ہے ایشین لڑکیوں کا؟'' ولی نے پوچھا۔

''بالکل! دو عدد ٹمیاریں تو میرے اپنے گھر میں موجود ہیں۔'' عبداللہ کا اشارہ اپنی بہن اور امی کی جانب تھا۔

ولی نے یوں سر ہلایا، جیسے وہ کبھی نہیں سُدھر سکتا، عبداللہ نے بڑبڑایا کیا اور بُرے بُرے منہ بناتا باہر نکلا۔

''بڑے بھائی! یہ اُبلی ہوئی سبزیاں کھا کھا کر میرا کباڑا ہوگیا ہے۔'' ولی عموماً مکس سبزیوں کا پیکٹ لے آتا تھا جس میں سیلری، مٹر، گاجر، گوبھی، آلو، مکئی وغیرہ ریڈی کر کے پیک کی ہوتی تھیں، جنہیں تھوڑے سے پانی سے نکال کر وہ ہلکی سی اسٹیم پر رکھ دیتا جو آدھے گھنٹے بعد گل جاتی تھیں، جس کو وہ کالی مرچ اور ہلکا سا نمک ڈال کر کھاتے تھے۔

عبدالولی تو بہت رغبت سے یہ اُبلی سبزیاں کھا لیتا تھا کیوں کہ ریڈی فوڈز میں ہر چیز میں حرام چیز کا گوشت یا آئل استعمال ہوتا تھا اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ سبزیاں اور چکن استعمال کرتا تھا، وہ گھر میں کھانا بھی اسی وجہ سے زیادہ بناتا تھا تاکہ ہر طرح کے رسک سے بچا جا سکے۔

''بڑے بھائی! پلیز اِس کھانے سے میری جان صرف آج کے دن کے لیے چھڑوا دیں، آج کچھ باہر کھاتے ہیں۔'' عبداللہ بچوں کی طرح منمنایا۔

''عبداللہ! ہم نے رات بھی باہر کھانا کھایا تھا۔'' ولی نے اُسے کچھ یاد کروانے کی کوشش کی۔

''رات بھی گزر گئی اور کھانا بھی ہضم ہوگیا پھر کھانے پینے کی باتیں کون یاد رکھتا ہے۔'' عبداللہ نے نہایت معصومیت سے کہا۔ اُس کی یہی معصومیت اور سادہ شفاف مسکراہٹ عبدالولی کو مجبور کر دیتی تھی کہ وہ اس کی مدد کرے، اُس کا کہا مان لے۔

''یار کھانا تو تقریباً ریڈی ہے نا۔'' ولی نے ایک اور عذر تراشا۔

''کم آن بڑے بھائی! یہ غذا کون سا آپ نے پھر کبھی نہیں پکانی، اگلے ڈنر میں کام آ جائے گی۔ بس آپ جھٹ پٹ تیار ہو جائیں۔'' عبداللہ فوراً ریڈی ہوگیا۔

''اوکے! تم جیتے میں ہارا! ویسے تم ہو بہت ضدی۔'' ولی نے اپنی لیدر کی جیکٹ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''بالکل جناب! میں اِس بات کو تسلیم کرتا ہوں لیکن میری نظر میں یہ کوئی خرابی والی بات نہیں بلکہ میں تو اِسے سراسر خوبی مانتا ہوں، بھئی جو عادت آپ کو کچھ حاصل کروا دے تو وہ فائدہ مند ہی ہوئی نا، میرے پاپا کہتے ہیں کہ ضدی لوگ ہی دنیا میں کچھ کر سکتے ہیں، کچھ پا سکتے ہیں، کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضد اور جنون کا ہونا ضروری ہے، اب دیکھیں نا بڑے بڑے اسکالر ضد کو Passion کا نام دے کر آ گے بڑھا دیتے ہیں اور جنون کو Detemination کا نام دے دیا ہے پھر یہ ہی Passion اور Determination ہی تو عام انسان کو کام یاب انسان میں بدل دیتے، ہیں اس لیے بڑے بھائی میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیال ہے کہ میری یہ عادت واقعی بہت بڑی خوبی ہے۔'' عبداللہ نے سنجیدہ بات کرتے کرتے آخر میں فرضی کالر شرارت سے جھاڑتے ہوئے کہا تو عبدالولی نے بے حد میٹھی نظر سے اُسے دیکھا۔

وہ بہت ذہین اور شرارتی تھا لیکن اِن سب سے بڑھ کر وہ بہت مخلص اور وفادار انسان تھا۔

''کمال ہے! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہو جو اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔'' عبدالولی نے اپنے جاگرز کے تسمے کستے ہوئے کہا۔

''ارے جناب! اگر آپ بھی کچھ دن میرے پاپا کے ساتھ رہ لیں تو ضرور اسکالر بن جائیں گے، پاپا ہمیشہ چھوٹی، مختصر لیکن بہت گہری باتیں کرتے ہیں۔'' عبداللہ اپنے پاپا کا ذکر کر رہا تھا تو اُس کے چہرے پر خاص طرح کی خوشی اور جوش تھا، آنکھوں میں بے حد چمک تھی۔

ولی نے دِل چسپی سے اُسے دیکھا۔

''آپ کو معلوم ہے میں نے پاپا سے ایک بار پوچھا کہ آپ اتنی عام سی باتوں میں بھی اتنے گہرے رزلٹ کیسے نکال لیتے ہیں تو وہ بولے جن کے دِل پر کوئی بہت گہرا گھاؤ لگا ہو تو وہ ساری زندگی کوئی عام سی بات نہیں کر پاتے کیوں کہ دل کی چوٹ، دل کا درد عجیب قسم کی قوت رکھتا ہے دیوار پار کیا ہو رہا ہے ہمیشہ دکھا دیتا ہے، مجھے اُن کی یہ بات کبھی نہیں بھولی۔ ہے نا عجیب بات!'' عبداللہ نے ولی سے پوچھا تو وہ جو عبداللہ کی گفتگو میں اِس قدر محو ہو گیا تھا، ایک دم چونکا۔

جانے کیوں، جانے کیوں اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ لہرایا تھا شکوہ کرتا، اُداس آنکھیں لیے! وہ بھی تو کہتی تھی نا کہ دِل کا گھاؤ بہت گہرا ہوتا ہے، کبھی نہیں بھرتا ساری عمر بس رستا ہی رہتا ہے، درد ہی دیتا رہتا ہے۔

یہ چہرہ مسکان کا تھا۔

عبدالولی حیران تھا کہ اُسے اِس پل اچانک وہ کیسے یاد آ گئی... لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ جب ہم کسی کو بہت شدت سے سوچتے ہیں، یاد کرتے ہیں تو وہ چاہے سمندر پار موجود ہو، ہماری شدت کی یاد ہمیشہ کرنٹ رکھتی ہے۔ دوسرے تک ضرور اپنا احساس چھوڑ کر جاتی ہے۔

لاکھوں میلوں دور اُسے بھی کوئی سوچ رہا تھا بہت شدت سے، بہت تڑپ سے... پھر یہ کیسے نہ ہوتا کہ وہ اپنا اثر ولی تک نہ پہنچا سکتی۔

''کدھر غائب ہو جاتے ہیں آپ؟'' عبداللہ نے ولی کے سامنے ہاتھ لہرا کر پوچھا۔

''آں ہاں! یار کہیں نہیں!'' ولی نے اُسے ٹالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ بعض لوگ جن کو ہم اپنی زندگی میں کوئی حصہ نہیں دیتے لیکن وہ اپنی قسمت کی وجہ سے ہماری زندگیوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔

❖❖○❖❖

دل کے آئینے میں اُترا تھا ترا عکس
تو پھر!
آئینہ ٹوٹا کیوں

اب نہ آئینہ ہے باقی، نہ ترا عکس نہ بہلاوا کوئی
رات، دن بہتے رہے
مری رگوں میں پھیلے سرخ قطروں کی طرح
شام و سحر اُڑتے رہے
بے نیازی کے بیابان میں ذرّوں کی طرح
تو کہاں ہے، میں کہاں
صرف پرچھائیاں ہیں
اور ہے یادوں کا دھواں

''ڈاکٹر! مسکان کب تک ٹھیک ہو جائے گی؟'' سمعان نے ماتھا مسلتے ہوئے پوچھا۔

وہ لڑکی جس نے اُس کے دِل کو دھڑکایا، تھا اب ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی، پہلے وہ گھنٹوں سوئی رہتی تھی اب وہ سوتی تو اتنا نہ تھی لیکن پوری طرح جاگی بھی نہ تھی، یوں جیسے وہ کسی چیز کسی چہرے، کسی شے سے دلچسپی نہ رکھتی ہو۔

''آپ دیکھ رہے ہیں پہلے سے کافی بہتر ہے لیکن وہ جان بوجھ کر اپنی بہتری بتاتا اور دکھانا نہیں چاہتی۔'' ڈاکٹر زبیر نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''یہ آپ! یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' سمعان نے حیرت سے پوچھا۔

''ایئر سن! آئی ایم ماہر ڈاکٹر! تم یہ کیوں بھول رہے ہو، ایک ڈاکٹر ہی ہوتا ہے جو مریض کے اندر والے ہر سگنل اور ٹریکس کو ریسیو کر سکتا ہے۔'' ڈاکٹر زبیر نے دھیمی مسکراہٹ سے سمعان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟'' سمعان کے پلے تو کچھ نہ پڑا تھا۔

''اوکے! آئی دِل شو یو ون تھنگ۔'' ڈاکٹر زبیر نے دراز سے ایک کاغذ نکال کر سمعان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

...ال آتا ہے
...اتوں سے، نیندوں سے، خوابوں سے
...آنکھیں اندھیری ہوئی جا رہی ہیں
...میں سی خوابوں میں آ کے ڈراتی ہیں
...ندوں میں آرام جاں اب نہیں
...اب آور دواؤں کی تلخی کھلی ہے
...ری نیند سے لطف کیف و اماں
...رے خوابوں کی سرگوشیوں سے
...ری کہکشاں لے گیا کون
...نو، دیے، شمعیں چاند اور تارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہاں چھپ گئے
رات کیوں کر بھیانک ہوئی
دن میں سورج بھی اب
روشنی کے بجائے محض آگ برساتا ہے
دِل میں بس خودکشی کا خیال آتا ہے
دل میں بس خودکشی کا خیال آتا ہے۔

سمعان نے حیرت وسوال بھری نظروں سے ڈاکٹر اکرم زبیر کو دیکھا۔

''یہ؟''سمعان بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''جی ہاں! یہ مسکان نے ہی لکھا ہے اُسی کی ہینڈ رائٹنگ ہے ہم نے کنفرم کروالیا ہے۔ دراصل ہم
نے مسکان کے کمرے میں اسکیچ بک، پنسل، کلرز اور کچھ کاغذ وغیرہ رکھوائے تھے۔ ایک عام آدمی
زندگی میں اتنا Expressionist نہیں ہوتا جتنا کہ ایک آرٹسٹ! وہ چھوٹی سی چھوٹی بات کو لے
بہت حساس ہوتا ہے اپنے احساسات کو فل Expressions کے ساتھ رنگوں کی صورت میں بورڈ
اُتارتا ہے، اسی طرح ایک رائٹر کاغذ قلم سے کبھی دور نہیں رہ سکتا۔ مسکان کی ہسٹری کی Study
دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ ڈائری بہت شوق سے لکھتی تھی، میں نے بہت خوب صورت دو عدد ڈائریاں
وہاں رکھوائی تھیں۔ شروع کے ایک ہفتے ہمیں کوئی نتیجہ نہ ملا، صفر رزلٹ تھا۔'' ڈاکٹر زبیر نے گہ
سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ابھی کچھ دن پہلے سسٹر ماریہ نے مجھے اُن دو ڈائریوں میں سے ایک ڈائری لاکر دی، تم یقین
نہیں کرو گے میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، مسکان نے یہ تحریر کاغذ پر لکھی تھی یعنی ہم اُس کا جمود توڑ
میں کامیاب ہو چکے تھے، دیوار سے پہلا پتھر ہی نکلنا مشکل ہوتا ہے لیکن بعد کا کام آسان ہوجاتا ہے
مشکل مرحلے سے نکل آئے ہیں۔'' ڈاکٹر اکرم زبیر نے خوشی سے کہا۔

''لیکن ڈاکٹر! وہ جو مسکان کا گھنٹوں ایک ہی جگہ دیکھنا اور بیٹھے رہنا، کسی سے بات نہ کرنا، وہ
ہے؟''سمعان نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ ابھی دوسروں کو کیا خود کو بھی یہ میسج نہیں کرنا چاہتی کہ اُس کے گرد کا جمود ٹوٹ رہا ہے۔'' ڈا
اکرم زبیر چیئر گھما کر کھڑکی کے پاس آ گئے۔

''یہ شیشے کی کھڑکی دیکھ رہے ہو تم؟''انہوں نے کھڑکی پر لگے ہوئے شیشے کی جانب اشارہ کر
ہوئے پوچھا۔

''جی۔''سمعان نے مختصراً جواب دیا۔

''شیشے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک جس کے پیچھے پارہ لگا ہوتا ہے اور وہ دوسری جانب کا عکس
دیتا ہے، یوں وہ آئینہ بن جاتا ہے جب ہم آئینے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں صرف اور صرف اپنا عکس
آتا ہے اپنی ذات، اپنا چہرہ اور اپنا وجود! اور بس!'' وہ کچھ دیر کو رُکے، جیسے وہ مسکان کی ذہنی کیفیت
مکمل طور پر خود یہ محسوس کر رہے ہوں۔

''اور دوسرا شیشہ جیسے یہ ونڈو گلاس ہے صاف شفاف دونوں جانب سے سادہ! اِس لیے ہم اِس کے
وجود منظر دیکھ سکتے ہیں، اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کو دیکھ سکتے ہیں اِس شیشے میں صرف ہمیں اپنا
نہیں نظر آتا بلکہ دوسروں کا وجود بھی نظر آتا ہے، کیوں؟''انہوں نے ایک دم سمعان سے سوال کیا۔

''اِس لیے کہ ایک آئینے کی پشت کوٹیڈ ہے اور وہ صرف اور صرف ہمیں ہمارا ہی عکس دکھاتا ہے، جب
دوسرا شفاف ہے۔''سمعان نے کہا۔

''بالکل! کچھ یہی کیفیت مسکان کی ہے، اُس کا دماغ شفاف نہیں ہے اس لیے ابھی وہ اپنے ہی عکس
میں اُلجھی ہوئی ہے، اُسے ہر جانب صرف اپنا آپ نظر آرہا ہے اِس کے علاوہ کچھ اور دیکھ نہیں پارہی
وہ دیکھ بھی نہیں سکتی، یہ اُس کی مجبوری نہیں بلکہ بے بسی ہے۔ ہمیں آج نہیں تو کل انشاء اللہ ضرور
کامیابی ملے گی کہ ہم اُس کے آئینے کو شفاف کرسکیں تا کہ وہ اپنے اِردگرد کے منظر کو دیکھ سکے محسوس
کرسکے، یہی وہ وقت ہوگا، جب وہ دوبارہ زندگی میں حصہ لے پائے گی۔'' ڈاکٹر اکرم زبیر نے ہر بات کو
کھول کر بہت تفصیل سے بیان کردیا تھا۔

''اور اِس میں کتنا وقت لگ سکتا ہے؟''سمعان نے پُرامید ہوکر پوچھا۔

''یہ تو اللہ کی ذات جانتی ہے، ہوسکتا ہے بہت جلد وہ نارمل ہوجائے لیکن اُسے نارمل ہونے کے لیے
لوگوں کا اعتبار دوبارہ چاہیے ہوگا، جن کو وہ سینٹر آف لائف سمجھتی تھی۔''

''کون دو لوگ؟''سمعان نے پوچھا۔

''ایک اُس کا باپ، جو اُسے ہتھیلی کے چھالے کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا، اُسے دوبارہ اپروو کرنا ہوگا
وہ قابلِ اعتبار ہے اپنی محبت، توجہ اور اپنے نرم رویے کے ذریعے۔''

''اور دوسرا کون ہے؟''سمعان نے پوچھا۔

''عبدالولی! اُس کا پہلا اور آخری پیار! جس کے لیے وہ اپنی قسمت سے لڑ بیٹھی، ہر وہ چیز، ہر وہ
خوشی قبول کرنے سے انکار کردیا، جس میں وہ موجود نہ تھا۔ بے شک عبدالولی اپنا کردار ایک محبوب والا
نہ نبھائے لیکن اتنا ضرور کرے کہ اچھے دوستوں کی طرح اُسے تسلی دے اور بتائے کہ وہ بھی اُس کے لیے
اہم ہے لیکن صرف دوستوں کی طرح! تو شاید... وہ اپنی ضد سے ہٹ جائے۔'' ڈاکٹر زبیر کہہ رہے تھے اور
سمعان کے گرد مزید کچھ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جن کو ہم چاہتے ہیں اگر اُن کی خوشی کسی اور کو چاہنے میں ہو تو ہم محبوب کی
خوشی میں خوش کیوں نہیں ہو پاتے؟ سارا کھیل تو اِس ناخوشی ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم اِس ناخوشی کو خود
پر حاوی نہ ہونے دیں تو ہم کبھی خود نہیں ٹوٹتے اور نہ ہی کسی اور کو ٹوٹنے دیتے ہیں اور نہ ہی توڑتے
ہیں۔ ہم اللہ کی Design کی ہوئی رضا کو جب نہیں مانتے تو بھی تو وہ ہی ہوتا ہے، جو شروع سے
Design ہے۔ پھر کیوں نہ جی سے مان لیا جائے اور یاد رکھا جائے کہ ایسے عمل سے اجر ملتا ہے اور
کبھی کبھی تو اللہ خوش ہوتے ہیں اِس شکرگزاری سے اتنا کہ وہ ہی نعمت اُس کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں
جس کے لیے اُس نے اللہ کی رضا کے لیے صبر کیا ہوتا ہے۔''

❖❖○❖❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لالہ!" سائرہ نے شیشے کے پار پٹیوں میں جکڑے طارق کو دیکھا تو بے اختیار اُس کے لبوں سے سسکی برآمد ہوئی۔

شہباز صاحب کی خود اپنی طبیعت بگڑ گئی تھی گھر میں اِس وقت ڈاکٹر نے اُن کو انجکشن دے کر ... تھا۔ سائرہ اِس قدر پریشان تھی کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فوری طور پر کیا کرے، احمد شہباز صاحب کے پاس رُک گئے تھے جب کہ سائرہ روشن آرا بیگم اور اُن کے کمپنی منیجر کے ساتھ آ گئی تھیں کیوں کہ طارق لاہور سے خاصی دور واقع ایک ہسپتال میں ایڈمٹ تھا۔

میجر ہارون نے دوڑ بھاگ کر ہر معاملہ چیک کر لیا تھا لیکن اُن کو کچھ کرنا نہیں پڑا تھا کیوں کہ آ... اور رانا جواد دونوں ہر طرح کے معاملات طے کر چکے تھے۔

"لالہ۔" سائرہ نے سسکتے ہوئے شیشے کے پار اُسے پکارا۔

کوئی بات کوئی لفظ اس وقت اُس کے منہ سے پوری طرح ادا نہ ہو رہے تھے، وہ بُری طرح ... رہی تھی۔ روشن آرا بیگم، جو پاس پڑے بینچ پر بیٹھیں مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھیں، انہوں نے فوراً اُٹھ کر ... گلے لگا لیا۔

"حوصلہ کرو، اللہ رحمان کی ذات سے پُر امید رہو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" روشن آرا بیگم ... سائرہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آنٹی! میرا ایک ہی بھائی ہے، بھائی بھی ایسا، جس نے جب مجھے ماں اور باپ جیسے رشتے کا ... احساس نہ ہونے دیا جب میں اِس دنیا میں ہر رشتے سے کنگال ہوئی کھڑی تھی، لالہ مجھ سے تھوڑے ... ہی تو بڑے ہیں آخر اُن کو خود کو بھی تو اِن رشتوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہو گی لیکن وہ صرف میری ... وقت سے بہت پہلے بڑے ہو گئے، میری ہر خوشی، ہر سُکھ اُن کی ہمیشہ پہلی ترجیح رہا ہے۔ ایسا ہیرا ... بھائی، ایسا چھتنار بھرا رشتہ! میں تو طارق لالہ کے بغیر خالی ہو کر رہ جاؤں گی۔" سائرہ پھوٹ پھوٹ ... رو دی۔ روشن آرا بیگم نے نہایت تحمل سے اُس کی پوری بات سُنی تا کہ وہ اپنے دِل کی بھڑاس نکال ... اپنے دِل کا بوجھ بانٹ سکے۔

"سائرہ! اُسے کھونے کے ڈر سے رونے کے بجائے اللہ رحمان کے سامنے جھک کر اور اپنے ... اُس کے سامنے درخواست پہ لگا کر اپنے بھائی کی صحت مند زندگی مانگو، دیکھنا انشاء اللہ وہ بالکل ... ہو جائے گا۔" انہوں نے سائرہ کو سمجھایا۔

"جی۔" سائرہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، روشن آرا بیگم نے اُسے وہاں سے ... اپنے پاس بٹھا لیا، وہ زار زار رو رہی تھی لیکن اب اِن آنسوؤں کی نوعیت مختلف ہو گئی تھی اب یہ ڈر، ... اور شکوے بھرے آنسو نہ تھے بلکہ دعا بھرے، درخواست بھرے آنسو تھے، جو اُس بڑی ذات سے ... بھائی کی زندگی مانگ رہے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ ہی نمکین پانی جو پہلے بھی بہہ رہا تھا لیکن ... عام سے آنسو تھے ایسی دوا جیسے تھے، جس میں سے اثر ختم ہو چکا تھا۔ اور اب بھی وہی آنکھیں تھیں ... وہی اِن میں بہتے ہوئے آنسو، لیکن اب ان میں واضح فرق تھا ان کی تاثیر بدل گئی تھی، اب یہ تاثیر ... تھے کیوں کہ اب یہ ایک عاجز دِل نے سچے دل سے اپنے رب سے امید رکھ کر بہائے تھے۔ اور ...

... چاہتا ہے کہ ہر چیز اُسی سے مانگی جائے کیوں کہ وہ دے کر خوش ہوتا ہے۔

... اُس کے ہاں ایک ہی شرط ہے کہ مانگنے کا سلیقہ بے شک ہو نہ ہو لیکن اُسے سب سے بڑا ماننے کا ... اقرار ہو، یہی اُس بڑی ذات کا حق ہے جو بندہ ادا نہ کر کے ہمیشہ ظلم کر جاتا ہے۔

اے اللہ! میرے لالہ کو صحت و زندگی عطا کر دیں بے شک تو سب سے بڑا دینے والا ہے!" سائرہ ... دِل سے بے اختیار دعا نکلی۔

... رحیم! تُو بیٹھا ہی ہمیں سننے کے لیے ہے یہ تو بس ہماری اپنے پکارنے کی دیر ہوتی ہے!

❖❖○❖❖

"یہ سب کیا ہے؟" نفیسہ بیگم نے پوچھا۔

"کیوں! تم نہیں جانتیں؟ عورتوں کو تو اِن چیزوں کا بہت پتا ہوتا ہے۔" سید سرفراز علی نے بے نیازی ... سے جواب دیا۔

"سید سرفراز! ہر بات کو اپنی نگاہ سے دیکھنا بند کر دو، یہ رشتے ناتوں کی باتیں بہت نازک ہوتی ہیں ان ... میں صرف کسی ایک فریق کی مرضی نہیں چل سکتی۔" نفیسہ بیگم نے اُن بڑے بڑے تھالوں کو دیکھا جو شگن ... کے مال سے بھرے ہوئے تھے۔

"اب بات شروع کی جاتی ہے تو فوراً یہ شگن وغیرہ نہیں لے کر جاتے، دوسرے فریق کی کیا مرضی ... ہے یہ دیکھا جاتا ہے۔" آپا اماں نے سید سرفراز علی کو اپنی سی سمجھانے کی کوشش کی۔

"... پھر ابھی تو ہمارے گھر میں سوگ چل رہا ہے تم کیسے شادی بیاہ کی باتیں کر سکتے ہو؟ کیوں... تمہارا ہر کام زبردستی کا عنصر لیے ہوتا ہے؟" آپا اماں ہانپنے لگیں وہ اِس شخص سے لڑتے لڑتے تھکنے ... لگی تھیں لیکن یہ شخص بڑے سے بڑے حادثے کے بعد بھی اپنی سرشت نہ بدل سکا تھا۔

... کی زیادہ بری حالت ہوتی ہے نا جب ہمیں ساری زندگی کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنا پڑتا ہے، جو نہ ... صبر کا امتحان ہو بلکہ ساری زندگی کو امتحان بنا دے۔

"تم جانتی ہو میں نے ہمیشہ جو چاہا وہ پایا ہے پھر مسکان تو لاکھوں میں ایک ہے اُس جیسی لڑکی تو ... قسمت سے ملتی ہے۔" آپا اماں نے سید سرفراز علی کو حیرت سے دیکھا۔

"تمہاری یادداشت کو دوبارہ میں کچھ یاد دلانا چاہوں گی کہ ایسا اب نہیں ہے کچھ... تم بھول رہے ہو ... اپنے شہر بانو کے ساتھ جو ظلم کی حد توڑی تھی، اُس کے بعد کیا تم نے وہ نتائج حاصل کر لیے جن کی تمنا ... کی تھی۔ نہیں! نہیں نا۔" آپا اماں نے دانت بھینچ کر کہا۔

"بجائے اس کے کہ تمہاری بدلے کی آگ ٹھنڈی ہوتی تم مزید آگ میں دھکیلے گئے، تم کو بیٹے کی ... کاری ضرب لگی، ایسا گھاؤ جو تم مانو یا نہ مانو، تمہیں بے حد تکلیف دیتا ہے۔" سید سرفراز علی کا چہرہ ... سیاہ پڑ گیا۔

"اب تک تم ہر کام میں اپنی مرضی چلا کر، طاقت اور پیسہ استعمال کر کے زبردستی فیصلے کر گے۔ پہلے ... تم نے مسکان کے ساتھ کر کے دیکھ لیا؟ دِلوں کی دنیا زبردستی آباد نہیں ہوتی۔ بیٹیاں بہت پیاری ... ہیں لیکن بیٹیوں کی قسمت اُن کے باپ کی دولت، طاقت سے نہیں اُس کی دُعا سے بنتی ہے۔ تم تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسکان کی قسمت کے ساتھ بھی تجربے کر چکے اب بس کرو!'' آپا اماں نے بیزاری سے کہا۔

''میں نے تمہیں تقریر کے لیے نہیں بلایا، اِس لیے بلایا ہے کہ تم جاؤ اور مسکان کا رشتہ طے کر آؤ؟'' سید سرفراز علی نے اُن کو یوں حکم دیا جیسے بازار سے جا کر کپڑا خرید کر لانا ہو۔

''بھلا رشتے کب خریدے جاسکتے ہیں یہ تو قسمت اور نصیب کے سودے ہوتے ہیں مجھے تو تم اِس سارے معاملے میں معاف ہی رکھو، میں اِس کام کے لیے ہرگز نہیں جاؤں گی۔'' آپا اماں نے صاف انکار کر ڈالا۔

''کیوں! ویسے تو تمہیں مسکان کی ماں ہونے کا بہت دعویٰ ہے، تم اس کی خوشیوں کی خاطر بھی نہ جاؤ گی؟'' سید سرفراز علی، نفیسہ بیگم کی ضد کو اچھی طرح جانتے تھے اس لیے انہوں نے اُن کو دوسرے طریقے سے گھیرنا شروع کیا کیوں کہ وہ جانتے تھے مسکان کا وجود اُن کے لیے زندگی کی طرح اہم ہے۔

''ماں ہوں اسی لیے تو اِس کام کو انکار کر رہی ہوں۔'' آپا اماں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ زیادہ اسٹریس سے ہمیشہ اُن کا بی پی ہائی ہونے لگتا تھا۔

''ٹھیک ہے تم نہ بھی جاؤ گی تو بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمہاری وجہ سے کوئی کام نہیں روکوں گا اور مجھے مسکان کا یہ رشتہ طے کرنے سے اب کوئی نہیں روک سکتا۔'' سید سرفراز علی نے کلف اُڑاتے ہوئے کہا۔

''میرے اللہ! یہ شخص بالکل دہریہ ہوگیا ہے اب مزید کیا کرے گا؟'' آپا اماں نے بیزار نظروں سے سید سرفراز علی کو باہر جاتے دیکھ کر کہا۔

''سید سرفراز علی! تم ایک بار، صرف ایک بار عبدالولی کا چہرہ دیکھ لو گے تو فوراً اپنا فیصلہ بدل لو گے کیوں کہ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں اگر تم نے کسی چہرے سے شکست کھائی تھی تو وہ سید عبداللہ کا تھا اور عبدالولی کے چہرے میں بھی تو سید سرفراز علی کی زندگی کی سب سے بڑی شکست موجود تھی۔''

''بے چارہ سید سرفراز علی!!

دعوے کرتا ہوا سرفراز علی!!

وہ نہیں جانتا کہ جس چیز کے لیے وہ اپنی سرتوڑ کوشش کرنے جا رہا ہے، اُس میں اُس کی کتنی بڑی ہار موجود ہے۔'' نفیسہ بیگم ایک دم ہنسنے لگیں۔

یہ عجیب سی ہنسی تھی، جس میں بہت سارے دکھ بین کر رہے تھے۔ اس بار بازی وقت نے اپنے ہاتھ رکھی تھی۔

❖❖○❖❖

یا اللہ!

اب فقط تیرے لیے ہی گونجتی ہیں

رات، دن

ایک پابند زماں کی

ایک محصورِ مکاں کی سسکیاں!

میں نے سجدے میں رکھا سر

آ گئی میں تیرے در پر

دل لیے! بے خوف و خطر

محروم ہونے سے بچالے

تجھ سے وابستہ ہیں اُمیدیں بہت

دامانِ رحمت میں چھپالے

ترنم ٹکٹکی باندھے سامنے دیوار پر دیکھ رہی تھی۔ دیوار خالی تھی لیکن اُس کی آنکھوں کے سامنے بہت سارے منظر کیمرے کی ریل کی طرح گھوم رہے تھے۔

ترنم کی گود میں ماہی سر رکھے کسی معصوم بچے کی طرح سو رہی تھی، روتے روتے وہ اِس قدر نڈھال ہو گئی تھی کہ اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ترنم کی ٹانگیں سُن ہو کر دکھنے لگی تھیں لیکن اُس نے ماہی کو ڈسٹرب نہ کیا اسے سونے دیا تھا۔ ترنم کے کانوں میں ماہی کے الفاظ گونج رہے تھے اور دِل کو اتھل پتھل کر رہے تھے۔

''ترنم! تم جانتی ہو کہ میں جب جب ٹی وی یا اخبار میں خودکش دھماکے کے متعلق پڑھتی یا سنتی تھی تو میرے اندر جھرجھری سی پیدا ہو جاتی تھی۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ آخر وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جو کسی کو اپنی جان ختم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو لیکن اپنی زندگی تو سب کو بہت پیاری ہوتی ہے؟'' اُس نے اپنی بڑی بڑی اور خوب صورت آنکھیں کھول کر ترنم سے پوچھا تھا۔

''کوئی کتنی بڑی مجبوری، کوئی کتنا بڑا لالچ زندگی کے ساتھ ہی تو ہوتا ہے؟ زندگی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن جب زندگی ہی نہیں رہے گی تو پھر کیسی سودے بازی! مجبوری کو فائدے میں بدلتے دیکھا نہیں سکتا اگر دولت کا لالچ ہے تو وہ دولت استعمال ہو نہیں سکتی تو پھر ایسی کون سی چیز ہے، جو اِن لوگوں کو موت قبول کرنے پر راضی کر دیتی ہے!'' یہ وہ سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ سوال مجھے بہت تنگ کرتا تھا، میں اُس فورس کو جاننا چاہتی تھی! لیکن مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔

''ترنم! دیکھو مجھے اِس سوال کا جواب کب ملا۔ تب جب میں زندگی کے بالکل آخری کنارے پر کھڑی ہوں!'' ماہی ایک دم سے ہنسی، ترنم نے اُسے چونک کر دیکھا، اُس کی ہنسی بہت خوف ناک تھی، اس کے ارادوں کو ظاہر کر رہی تھی۔

''ماہی! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' ترنم نے گھبرا کر اُس سے سوال کیا۔

''ترنم! میری زندگی تو میرے کسی کام نہیں آئی لیکن میری موت! میری موت تو میرے کام آ سکتی ہے نا!'' ماہی کے لہجے میں موجود پُراسراریت ترنم بہ خوبی محسوس کر سکتی تھی۔

''تم کیا کرنے والی ہو؟ جانتی ہو نا، اگر ہماری زندگی حرام تھی تو کیا تم حرام موت! میرا مطلب ہے خودکشی کرو گی۔'' ترنم کے پاس الفاظ نہ تھے کہ وہ کیا لفظ استعمال کرے، جو ماہی کو اُس کے ارادوں سے ٹال سکیں۔

''نہیں ترنم! میں اب ایک پَل کا بھی گھاٹے کا سودا نہیں کرنا چاہتی۔ میرے پاس مزید ضائع کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے کوئی چوائس ہی نہیں ہے، میں کیوں حرام موت چاہوں گی؟ میں بے مقصد زندگی جینے کے بعد با مقصد موت حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ترنم میں، میں اِس سارے نا سہی! لیکن اس سیٹ اپ کی سربراہ کو ختم کرنا چاہتی ہوں! کہتے ہیں کہ دیمک کو جگہ جگہ سے کتنی ہی بار مارلو لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جب تک دیمک کی ماں کو نہ مارا جائے۔'' ماہی نے ترنم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''تم! تم میڈم راگنی کو؟'' ترنم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' ماہی کے چہرے پر بہت مختلف مسکراہٹ تھی۔

I will kill that basterd few who had planed and lounched this set up in Pakistan

ماہی نے بے حد ٹھوس لہجے میں جواب دیا، جیسے وہ اِس سب پہ خاصا ہوم ورک کر چکی ہو۔

''تم پاگل ہوئی ہو؟ بگ باس تک پہنچنا ناممکن ہے پھر سُنا ہے وہاں تو یہاں سے بھی زیادہ سیکیورٹی ہوتی ہے، تم اکیلی آخر کیا کر پاؤ گی۔'' ترنم نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بس کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گی پھر میری نیت زندگی میں پہلی بار سچی ہے، مجھے بے حد یقین ہے، بے حد یقین ہے کہ اللہ پاک میری مدد کریں گے میرے پاس بہت پیسہ ہے، میں اِس پیسے سے ہر سوال خریدوں گی جو مجھے وہاں تک پہنچا دے۔'' ماہی کے ارادے بے حد مصمم تھے۔

''لیکن! لیکن وائے بگ باس؟ یہ بہت رسکی ہے، تم راگنی کو ٹارگٹ کروادو۔'' ترنم نے اُسے روکنا چاہا۔

''میرے پاس کون سا عمر کی بہت نقدی پڑی ہے، جو میں رِسک سے ڈروں، پھر ابھی تو میں نے تم کو بتایا تھا نا کہ دیمک کی ماں کو مارنا بے حد ضروری ہے!'' ماہی نے ترنم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں نے ایک بار نیشنل جیوگرافک پر دیکھا تھا وہ لوگ دیمک کو مار رہے تھے، انہوں نے نیچے گہرائی تک کھودنا شروع کر دیا، جانے کتنے کلومیٹر کھدائی کی تو جا کر انہیں زمین کی تہہ میں ایک مرغی نما سی شکل کی دیمک کی ماں بیٹھی مل گئی انہوں نے اُسے ختم کیا جو میلوں دور بیٹھی مسلسل انڈے دے رہی تھی۔ وہ لاکھ اوپر اوپر سے دیمک کو ختم کر دیتے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا، جب تک وہ اصل Suorce کو ٹارگٹ نہ کرتے۔''

''میں ایک راگنی کو آج ٹارگٹ کروں گی تو جیسے چاندنی کے مرنے کے بعد راگنی آ گئی اور اس کے بعد کوئی اور پیسے کے لیے ناچنے والی بندریا آ جائے گی اور یہ سیٹ اَپ کبھی ختم نہ ہو سکے گا۔ مجھے ہر صورت اِس ''سیٹ اَپ'' کو اپ سیٹ کرنا ہے۔'' ماہی نے مضبوط ارادے سے جواب دیا۔

''میں! میں نہیں چاہتی کہ میری موت کی اخبار میں سرخیاں لگیں کہ میں ایڈز سے مر گئی۔'' وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''میں نے زندگی تو اللہ کے لیے جی نہیں، لیکن میری موت تو اُس کی راہ میں قربان ہونے کا بہانہ بن جائے گی۔'' وہ ترنم ہی کی گود میں روتے روتے سو گئی تھی۔ ترنم کے اندر اتھل پتھل شروع ہو چکی تھی۔

کبھی کبھی ہم اِس بات پر غرور کرتے ہیں کہ ہم بے حد نیک ہیں دوسروں سے زیادہ اچھے اعمال رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ہم گناہ گار ہو کر بھی اِس احساسِ برتری کو نہیں چھوڑ پاتے کہ ہماری توبہ تو سب سے زیادہ ہے!

ہمارا کفارا تو بہترین ہے!

جب جب عبادت ہو یا ثواب یا پھر گناہ کے بعد توبہ ہو یا پھر کفارا! ہم اس کی اپنی سوچ کی ویٹ مشین میں ڈال کر تول لیتے ہیں تو ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں! ایسے میں اچانک کوئی اور ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں بتا جاتا ہے کہ وہ ہم سے کتنا بہتر تھا کس قدر بہتر عبادت کرنے والا، بہترین ثواب حاصل کرنے والا یا پھر بہترین کفارا ادا کرنے والا، توبہ کرنے والا!

ماہی نے بھی اچانک سامنے آ کر ترنم کو بتایا تھا کہ وہ اور اُس کی توبہ کی سچائی کی شدت بے حد زیادہ تھی۔

''ترنم! وہ ایک طوائف زادی ہو کر جب واپس پلٹی تو کس قدر نڈر اور سچی ہے اُس کی توبہ میں تو اِس قدر Passion ہے پھر تم تو جس مٹی کا پودا ہو تمہیں تو کفارے میں مزید آگے بڑھنا چاہیے۔'' ترنم کے دل میں جو ڈر، خوف اور ہر وقت کی بے چینی تھی وہ ختم ہو گئی تھی، ماہی کے وجود سے اُسے بے حد حوصلہ و ہمت میسر ہوئی تھی۔ ایک نیا جوش اور ولولہ اُس کے اندر پیدا ہوا تھا، عظمیٰ کو بھگانے میں جس طرح وہ کامیاب ہوئی تھی اس چیز نے تو اُس کا حوصلہ مزید بڑھا دیا تھا۔ ترنم نے بہت پیار سے سوئی ہوئی ماہی کا سر سہلایا، باہر ان کے نام کی ڈیوٹی لسٹ بن رہی تھی، میڈم راگنی نے ترنم اور ماہی دونوں کی ڈیوٹیاں خاص اہم بندوں کے ساتھ لگائی تھیں کہ وہ سینئر اور ٹرینڈ لڑکیاں تھیں۔

لیکن میڈم راگنی نہ جانتی تھی کہ جن لڑکیوں کو وہ اپنی بہترین لڑکیوں میں شامل کر رہی تھی وہ تو اُن کے لیے ایسا بارود بننے والی تھیں کہ اِس الیکٹرک سیل، جس میں وہ لڑکیوں کو کسی قبر کی طرح بند کر کے ہمیشہ کے لیے بے بس کر دیتی تھی یہ Confirment بہت جلد انہی لڑکیوں کے ہاتھوں تباہ ہونے والی تھی۔

❖❖○❖❖

''یا اللہ! تیرا شکر ہے۔'' شہباز صاحب نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں شکر ادا کیا۔

ابھی ابھی سائرہ نے ہسپتال سے فون کر کے بتایا تھا کہ طارق اب خطرے سے باہر ہے۔ میرے مولا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''چلو اب تم آرام کرو، اللہ نے مہربانی کر دی ہے۔'' احمد شاہ نے اُن سے کہا۔

''ہاں! اب میں آرام کر سکتا ہوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''صاحب! باہر وکیل صاحب آئے ہیں کہتے ہیں کہ ملنا ضروری ہے میں نے تو کہا تھا کہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں لیکن وہ پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ ملنا بہت ضروری ہے۔'' ملازم نے مالکوں کے خوف سے اپنی بات کو دوبارہ دہرایا۔

''خیریت ہے، یہ وکیل صاحب کس لیے آئے ہیں؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''وہ نیلوفر کی ضمانت کینسل ہونے والی ہے نا، دن ختم ہو گئے ہیں۔ اُسی کا وکیل ہے فون پہ بھی وہ مسلسل اصرار کر رہا تھا کہ یہ معاملہ کورٹ سے باہر طے کر لیا جائے۔'' شہباز صاحب نے طویل سانس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھرتے ہوئے اصل بات بتائی۔

''پھر! پھر تم نے کیا سوچا؟'' احمد شاہ نے شہباز صاحب کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں! میں اُس عورت کو کیسے معاف کر دوں، جو میری سارہ کی زندگی تباہ کرنے کا باعث بنی، میر بچوں کے بیچ میں جدائی کا باعث بنی، جس نے میری زندگی کے پھل کا سارا رس نچوڑ لیا۔ یہ قصور ا بڑے ہیں کہ میرا دِل اُسے معاف کرنے پر راضی نہیں ہوتا اِن قصوروں پر مشکل یہ ہے کہ اُسے کا عدالت سزا نہیں دے گی، لیکن جس کی سزا اُسے مل سکتی ہے اُسے میں کیوں روکوں، ہم وہی nerve کرتے ہیں جو ہم خود پلان کرتے ہیں۔'' شہباز صاحب نے واضح لفظوں میں اپنے خیالات کا اظ کیا۔

''تو تم اُسے معاف نہیں کرنا چاہتے!'' احمد شاہ نے اُن کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' شہباز صاحب نے واضح لفظوں میں جواب دیا۔

''دیکھو شہباز! میں تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ تم اُسے معاف کر دو، لیکن میں ایک بار ضرور کہوں گا ک زندگی ہر کسی کو ایک موقع ضرور دیتی ہے کہ ہم اپنی اپنی بازی کھیل سکیں۔ پہلے نیلوفر کی بازی تھی، بدلے ا آگ کی وجہ سے وہ جیتی ہوئی بازی بھی ہار گئی۔ طارق اور سائرہ کے دلوں کو ہار گئی، جو اُس کی سب سے بڑی شکست اور دُکھ ہے اس بار بازی تمہارے ہاتھ میں ہے کنڈیشنز بھی وہی ہیں، تم بھی بدلہ چاہتے ہو تم نے بدلے کی خاطر کھیلتے ہوئے لوگوں کا حال دیکھنا ہے تو نیلوفر کی طرف دیکھ لو اور فیصلہ کرو کہ فائ کس چیز میں ہے! آج طارق موت کے منہ سے واپس آیا ہے! اللہ نے تم پر ایک اور مہربانی بڑھا دی ہے تم کو پہلے تمہارے بچے واپس دلوائے اور اُن کے دِل تمہارے فیور اور محنت سے بھرے ورنہ نیلوفر تو اُن کو پوائزن کر چکی تھی کیا وہ تمہاری طرف پلٹتے؟'' احمد شاہ نے شہباز سے سوال کیا۔

''یہ اللہ کی ذات تھی، جس نے تمہیں Reward دیا تھا تمہارے اچھے صبر اور رویے کا، اللہ سے شکر اُس کی رضا پر صبر کرنے والوں کو ہمیشہ ہی نوازتا ہے۔ تمہیں تو اللہ نے ہمیشہ ہر چیز واضح طور پر کھول کر دکھائی ہے جس پر اللہ نے ہمیشہ نرم اور مہربان رویہ رکھا، وہ کیسے ایک بدلے کی خاطر اپنا گریڈ کم کر سکتا ہے کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟'' احمد شاہ کی بات تھی کہ کوئی **Smoke Cleaner** جو ہر چیز کو واضح کر گیا تھا۔ وہ میل جو سالوں سے دلوں پر چڑھ آیا تھا جس کو شاید اُترنے کے لیے بھی اتنا ہی عرصہ درکار تھا۔ آج احم شاہ کی وجہ سے اُسے اترنے میں پَل لگا تھا، ایک فیصلہ ہونے میں پَل لگا تھا ایک بہترین فیصلہ، معاف کر دینے والا فیصلہ ہوا تھا۔ بدلے میں اگر آمرزش کی جیت ہو تو معافی دینے والا ساری زندگی کی بازی جیت جاتا ہے۔

❖❖○❖❖

یہ نگینہ کا کوئی بیسواں فون تھا، سائرہ کو طارق کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح مسلسل بے چینی سے چکراتی پھر رہی تھی۔ جائے نماز سے فون اور فون سے دوبارہ جائے نماز تک اُس کا طواف جاری تھا۔ بالآخر طارق کی خیریت کی اطلاع پر اُس نے سجدہ شکر ادا کیا تھا، کون کہتا ہے کہ محبت اثر نہیں کرتی۔ محبت تو محبت ہوتی ہے چاہے یہ یک طرفہ ہو لیکن اپنی شدت کا احساس

مرے کے دِل تک ضرور پہنچاتی ہے۔

نگینہ نے طارق کی سچی چاہت کو اپنی روح تک محسوس کیا تھا اور اب اُس کا دِل طارق کی تکلیف پر ب رہا تھا۔

سکھ کے موسم انسانوں کو اتنا قریب نہیں کرتے جتنے دُکھ کے موسم دو لوگوں کو ایک دوسرے کے بے حد ریب کر دیتے ہیں۔

نگینہ نے طارق کی محبت کو اِن چند گھنٹوں میں قطرہ قطرہ نہ صرف محسوس کیا بلکہ وہ تو اِس سمندر میں خود اپتے، ڈوبتے بے بسی سے دیکھتی رہ گئی، اُسے ادراک ہوا کہ کوئی زندگی میں اتنا بھی اہم ہو سکتا ہے کہ ان بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ سانسوں کی طرح زندگی میں اہم ہو جاتا ہے۔

نگینہ نے روشن آرا کا موبائل فون ملایا۔

''السّلام علیکم امّاں جان!'' نگینہ پہلی بار ماں سے فون پر بات کرتی کچھ گھبرا رہی تھی۔ زندگی میں پہلی ا کوئی ایسا احساس تھا، جس کی وہ اکیلی امین تھی ورنہ تو وہ اپنے دِل کی ہر ہر بات اُن سے شیئر کرتی تھی۔

''وعلیکم السّلام! چندا تم ٹھیک تو ہو نا؟'' وہ ماں تھیں اور اولاد تو ماں کے فنگر ٹپس پر ہوتی ہے بھلے وہ دور ا کیوں نہ بیٹھی ہو، بچے کی گھبرائی آواز فوراً پہچان لیتی ہے۔

''جی میں ٹھیک ہوں، اب طارق بھائی کیسے ہیں؟'' نگینہ کی تسلی نہ ہو رہی تھی اس لیے سائرہ سے اپچھنے کے باوجود وہ ماں سے طارق کا حال دریافت کر رہی تھی۔

''اللہ نے معجزہ کیا، اللہ رحمان نے احسان کیا ہے، اُس سوہنے پروردگار نے ہماری دُعائیں سُن لی ہیں اور اب طارق خطرے سے باہر ہے۔'' روشن آرا بیگم کا لفظ لفظ شکر سے ڈوبا ہوا تھا۔

''شکر الحمدللہ!'' نگینہ نے ایک بار پھر کہا۔

''امّاں جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں سائرہ آپی کے ساتھ رکنا چاہتی ہوں، آپ بابا جان کے ان چلی جائیں اور شہباز انکل کو بھی صبح لے آیئے گا آپ بھی کچھ ریسٹ کر لیں گی۔ آپ کی نمازیں بھی مکان میں پڑھی جائیں گی۔'' وہ روشن آرا بیگم کی عشا اور تہجد کے متعلق کہہ رہی تھی۔

''ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو اُدھر شہباز بھائی کی خیریت بھی پتا کرنا ضروری ہے۔ ویسے تو شاہ صاحب ن کے پاس ہیں لیکن مجھے بھی جا کر باپ کو بیٹے کی اصل حالت بتانی چاہیے تاکہ اُن کی بھی تسلی ہو ئے۔'' روشن آرا بیگم نے فوراً حامی بھر لی تو نگینہ نے ایک بے حد سکون بھرا سانس خارج کیا۔

''میرے خدا! شکریہ۔ اب میں اُن کو دیکھ لوں گی تو میرے دِل کو قرار آ جائے گا۔'' نگینہ نے دل ہی ل میں کہا۔

''ٹھیک ہے امّاں جان! میں رحیم چاچا کے ساتھ اِدھر کے لیے نکلتی ہوں، اللہ حافظ!'' نگینہ تیزی سے ن بند کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ اُسے شدید بے چینی تھی کہ وہ کسی طرح طارق تک پہنچ ائے۔

''اے اللہ! طارق کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔'' نگینہ کا دِل شدت سے دعا گو تھا۔

❖❖()❖❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سنیے!'' حسن آرا بیگم نے اندر آ کر انور صاحب کو پکارا، جو تسبیح پڑھنے میں مصروف تھے۔ آج اُن کو صرف تین ہی کام تھے آفس سے مسجد، مسجد سے گھر اور ہر ویک اینڈ پر اسلام آباد کاشف سے جانا۔ اس کے علاوہ، وہ نہ کہیں آتے جاتے تھے اور نہ ہی بلاضرورت کسی سے بات کرتے تھے۔

''سنیے! آپ نہیں جائیں گے میں تو تیار ہوں۔'' حسن آرا بیگم آج بہت دنوں بعد کہیں جانے لیے تیار ہوئی تھیں اور اِس وقت وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں اور بہت خوش بھی تھیں۔

''اچھا جی! چلتے ہیں میں تم ہی لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔'' انہوں نے بے حد دھیمے لہجے میں جوا دیا۔

حُسن آرا بیگم نے اب اُن کے رویّے پر بالکل حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ شروع شروع میں وہ اِس شیر کو ایک دم معمولی آدمی میں ڈھلنے سے بےضرر بنتے دیکھ کر حیرانی سے سکتے کے عالم میں آ جاتی لیکن پھر دھیرے دھیرے اُن کو یقین آنے لگا تھا کہ یہ معجزہ واقعی رونما ہو چکا ہے۔ انور صاحب کی کا دار نگاہیں اور زبان کو ایسا سبق ملا تھا کہ وہ اپنی ساری تیزی بھول گئے تھے۔ آج حسن آرا بیگم کا آرا آپا کی طرف جانے کا بے حد من تھا، انہوں نے صبح صبح ہی انور صاحب سے ذکر کیا کہ ان کا دِل چاہ رہا ہے کہ وہ آپا کی طرف جائیں، آج آپا کی سالگرہ کا دن ہے۔

''میں اُن کی ہر سالگرہ پر اپنے ہاتھ کا کڑھا سوٹ یا چادر دیتی ہوں۔'' انہوں نے گہرے کائی کلر سوٹ پر اُسی کے ہم رنگ دھاگے سے کڑھائی کیے سوٹ، جس پر ننھے منے شیشے بالکل ستاروں کی طر لگ رہے تھے، انور صاحب کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''تو اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے چلے چلتے ہیں آپا کی طرف بلکہ بچیوں اور گڈو سے بھی کہنا تیار رہیں۔'' یہ وہی انور صاحب تھے جو کبھی اُن کو روشن آرا بیگم کی طرف جانا ہوتا تو انور صاحب اُن پہلے خون کے آنسو رُلاتے تھے پھر کہیں جا کر اجازت دیتے تھے لیکن آج انہوں نے خود سے اجازت نہ دی تھی بلکہ خود بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے تھے۔

''کہاں کھو گئیں تم؟ چلو باہر بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' انور صاحب نے سوچوں میں گم حُسن آ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ! ہوں، چلیے!'' انہوں نے انور صاحب کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''مجھے اب اپنی خوش قسمتی پر یقین کر لینا چاہیے کہ انور صاحب واقعی بدل گئے ہیں۔'' حُسن آرا بیگم نے دِل ہی دِل میں کہا۔

''وہ شخص جس کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ کبھی نہیں بدل سکتا، آج ایک بالکل مختلف انسان نظر آ رہا اور یہ سب اللہ کے کرم سے ہوا تھا، جس سے وہ کبھی مایوس نہ ہوتی تھیں۔''

❖❖○❖❖

''سلام بی بی صیب!'' چوکیدار نے حُسن آرا اور انور صاحب کو دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ پورچ میں پہلے ہی ایک پجیرو اور دو جیپیں کھڑی تھیں، ایک جیپ کے پاس باڈی گارڈ کھڑے تھے۔

''لگتا ہے اندر کوئی مہمان آیا ہے۔'' انور صاحب نے گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

''جی ابو میرا بھی یہی خیال ہے!'' علیزے نے اپنے سر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

''کہیں ہم غلط وقت پر تو نہیں آ گئے، خالہ کے ہاں تو آل ریڈی مہمان آئے ہوئے ہیں۔'' غزالہ نے اندر جانے سے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ارے! تمہاری سگی خالہ کا گھر ہے، ہم ان کے مہمان نہیں ہیں۔'' حسن آرا بیگم نے خوش دِلی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا، ویسے بھی بہن کے گھر آ کر ان کو میکے کا احساس ملتا تھا کیوں کہ روشن آرا بیگم اُن کا خیال بھی بہت رکھتی تھیں۔

حسن آرا بیگم کو روشن آرا سے ملنے کی بے حد بے صبری تھی اِس لیے وہ فوراً اندر کی جانب بڑھیں۔

''باجی صاحبہ اور صیب جی تو کل کے طارق باؤ کے پاس ہسپتال چلے گئے تھے۔'' ملازمہ نے اُن کو گھر کے اندرونی حصے کی جانب لے جاتے ہوئے کہا۔

''تو کیا نگینہ بھی گئی ہے؟'' علیزے نے پوچھا۔

''جی بی بی صیب! کل شام وہ بھی چلا گیا تھا۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

''کیا ہوا تمہارے طارق باؤ کو؟'' کاشف اور منزہ کے کیس کی وجہ سے وہ بھی طارق کو اچھی طرح جانتے تھے۔

''معلوم نہیں صیب! لیکن وہ ٹھیک نہیں تھی اِس لیے سب اُس کو ملنے واسطے گیا ہے۔'' چوکیدار کی پٹھان ای نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دیا۔

''اللہ کرم کرے، سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔'' انور صاحب نے با آواز بلند دعا دی۔

''تم اندر بیٹھو صیب! اندر پہلے سے کوئی اور صیب بھی بڑے صیب کا انتظار کرتی ہے، میں نے اُن کو بتائی کہ وہ لوگ خدا جانے کب آئیں پر وہ نہیں مانی اور اندر بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔'' ملازمہ نے تفصیل سے بتایا۔

''اچھا ہوا کوئی تو گھر والوں میں سے آیا ورنہ ہم کو اُس غصّے والی مہمان سے ڈر لگ رہا تھا۔'' پٹھانی نے کانوں کو توبہ کے انداز میں ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

ملازمہ انہیں سیدھے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

''علیزے! ذرا اپنی خالہ کو فون کر اور اُن کو بتا کہ ہم لوگ گھر آئے ہیں اور اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔'' حسن آرا بیگم نے علیزے کو دوسری جانب فون کرنے بھیج دیا۔ علیزے، نگینہ کے کمرے کی جانب بڑھی۔

''السّلام علیکم!'' انور صاحب نے آگے بڑھ کر مہمان سے ہاتھ ملایا۔

''میں احمد شاہ صاحب کا ہم زلف ہوں۔'' انور صاحب نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔

مہمان نے انور صاحب کا بھرپور نظروں سے جائزہ لیا۔ اب اگلا سوال انور صاحب کی آنکھوں میں تھا کہ مہمان اپنا تعارف کروا دے جو بڑی بے تکلفی سے بیٹھا شاہ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔

''میرا تعارف بھی اچھا ہی ہے!'' مہمان عجیب سے طریقے سے مسکرایا تھا۔

''دراصل احمد شاہ صاحب اور میں بہت جلد سمدھی بننے والے ہیں۔'' مہمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ نگینہ کے رشتے کی بات کب چلی، ہمیں معلوم ہی نہیں۔" حُسن آرا بیگم نے خوش اخلاقی اور دلچسپی سے پوچھا۔

"جی کون نگینہ!" مہمان نے سوال کیا۔

"احمد بھائی کی بیٹی اور کون۔" حُسن آرا بیگم نے نہ سمجھنے کے انداز میں جواب دیا۔

"ارے ارے نہیں! آپ غلط اندازہ لگا رہی ہیں، میں تو اُن کے بیٹے عبدالولی اور اپنی بیٹی مُسکان کے رشتے کی بات کر رہا ہوں۔" مہمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کوئی بم دھماکہ ہوا تھا اُن کے قریب اور یوں لگتا تھا کہ اِس گھر کی ساری عمارت اُن کے اوپر آ گری ہو۔ حُسن آرا بیگم نے حیرت و پریشانی سے انہیں دیکھا، یہی حالی کچھ انور صاحب کا تھا۔

"میرا نام سید سرفراز علی ہے! میری بیٹی اور عبدالولی ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے ایک محترمہ کے لیے اُن کی پسند کب محبت میں بدلی وہ جان نہیں پائے لیکن عبدالولی میری بیٹی کے ساتھ Commited ہے! مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ پس میں نے سوچا کیوں نہ اِس Commitment کو کنفرم کر دیا جائے اور اُن کا رشتہ طے ہو جائے۔ یہ شگن میں اِسی سلسلے کے لیے لایا ہوں، بس احمد شاہ صاحب کا انتظار ہے پھر ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔" سید سرفراز علی نے نہایت خود اعتمادی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے بھی رشتے داری برابری میں اچھی لگتی ہے! ہمارا اور اُن کا Status میچ ہوتا ہے۔" سید سرفراز علی کچھ اور بھی کہہ رہے تھے لیکن انور صاحب اور حسن آرا بیگم سے مزید کچھ اور سننا دُشوار ہو رہا تھا۔

رشتے داری؟ برابری میں رشتے داری؟ مسکان اور عبدالولی کی Commitment؟

"مسکان اور عبدالولی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟" انہوں نے ڈرائنگ روم میں پڑے تحائف اور قیمتی زیورات جو شگن کے نام پر سید سرفراز علی لائے تھے ایک دم جن بھوت بن کر اُن کو منہ چڑھانے لگے اُن کو ڈرانے لگے تھے۔

"لیکن! احمد بھائی نے تو عبدالولی کی منگنی کہیں اور کر دی تھی۔" انور صاحب کی آواز کہیں کنویں سے آئی اُن کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

"ارے جناب! منگنیاں تو ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔" سید سرفراز علی نے بہت بے رحمی سے کہا۔

"اہم بات تو یہ ہے کہ لڑکا ہماری لڑکی سے محبت کرتا ہے اور شادی بھی ہماری ہی لڑکی سے کرے گا!" سید سرفراز علی کا دعویٰ انور صاحب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا کر گیا تھا۔

"دعوے کسی بنیاد پر ہی تو کیے جاتے ہیں نا۔" انور صاحب کے اندر سے کوئی بولا تھا۔

اور پھر یہ آواز اُن کے سارے وجود میں ایک دم بہت ساری سوئیاں چبھونے لگی، درد کی کوئی لہر تھی، جو اُن کے دائیں جانب سے اُٹھی تھی۔

"ویسے احمد بھائی کب آئیں گے؟" سید سرفراز علی نے مزے سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر پوچھا۔ وہ اپنا تیر نشانے پر لگا چکے تھے۔

جیراں جو اُن کی خادم خاص تھی، روشن منزل میں رکھوالی تھی اُس نے بہت پہلے یہ آ کر اطلاع دے

دی تھی کہ عبدالولی کا رشتہ اُس کی اکلوتی خالہ کے ہاں ہو چکا ہے۔ جب انور صاحب نے سید سرفراز علی سے اپنا تعارف کروایا کہ وہ احمد شاہ کے ہم زلف ہیں تو سید سرفراز علی نے وہ ترپ کا پتا کھیلا، جو انور صاحب اور احمد شاہ کے بیچ بنے رشتے کو فوراً تباہ کر سکتا تھا۔

اور اب اِس تباہی کی واضح جھلک انور صاحب کے چہرے پر دیکھ رہے تھے۔ سید سرفراز علی کا دِل چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائیں، بہت دِنوں بعد انہوں نے کسی کو بے بس دیکھا تھا اور یہ تو اُن کا بے حد دل پسند منظر تھا۔

"میری بیٹی لاکھوں میں ایک اور کروڑوں کی جائیداد کی مالک ہے، عادات کی بے حد پیاری ہے اِس کے علاوہ ایک لڑکا اور کیا چاہے گا؟ کیوں انور صاحب میں درست کہہ رہا ہوں نا؟" اُن کا سوال انور صاحب کے دِل کو چیرتا ہوا گیا تھا۔

علیزے؟ میری بچی! اُس کا کیا ہوگا؟ اُن کے تصور میں ایک دم شرمیلی مسکان لیے علیزے کا چہرہ گھوما جو اِس رشتے پر بے حد خوش نظر آتی تھی۔ پھر دیکھتے دیکھتے یہ ہنستا مسکراتا چہرہ آنسوؤں میں ڈوب گیا، پھر سارے چہرے ایک دوسرے میں ضم ہونے لگے، پہلے منزہ کا چہرہ تھا، پھر کاشف کا اور اب علیزے کا تھا۔

"نہیں۔نہیں!" اُن کے دِل نے زور سے چیخ ماری تھی اور اُن کو لگا کہ اُن کا دِل پھٹ گیا ہے! انور صاحب بُری طرح لہرا کر زمین پر گرے۔

"ابو! ابو جی!" علیزے اور غزالہ کی چیخیں مشترکہ طور پر بلند ہوئی تھیں۔ وہ تیزی سے انور صاحب کی طرف بڑھیں جب کہ حسن آرا بیگم سکتے کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھیں اور سامنے بیٹھے سید سرفراز علی نے بہت آرام سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھاتے سامنے کا منظر دیکھا تھا اور اپنے سامنے پڑا لیمن اسکواش کا گلاس اٹھا کر مسکراتے ہوئے گھونٹ گھونٹ بھر کر اپنے اندر لذت کو اُتارا تھا!

❖❖○❖❖

پھر کبھی خواب ہی میں سہی
وہ بھرا گیت یوں گنگناؤ
کہ ساری حدیں ٹوٹ جائیں
ازل اور اَبد کی
زمانے ہم آغوش ہو جائیں
خواہش کی دہلیز پر
ہم تمنا سے سرشار
پھر اِک نیا عزم لے کر اٹھیں
زندگی کرنے کو
پھر سے ہم زندگی کی طرف چل پڑیں

رات کے اِس پہر جب ہر طرف خاموشی تھی سناٹا تھا لیکن دو دل اور اُن کی گفتگو باقاعدہ سنی جا سکتی

تھی۔

طارق نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو قریب نگینہ کو سویا پایا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی ا ایک ہاتھ طارق کے بازو پر تھا۔ یوں، جیسے کوئی اپنی قیمتی ترین چیز کو سوتے میں تھام کر رکھتا ہے۔

طارق کو اپنے سارے جسم میں بے حد درد محسوس ہو رہا تھا لیکن نگینہ کا وجود کسی مرہم اور آسودگی طرح اس کے دِل کو محسوس ہوا۔ اس نے اپنے جسم کو تھوڑی حرکت دینے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا نگینہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''طارق بھائی! اللہ کا شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا۔'' وہ اپنی نرم دھیمی آواز میں بولی، شکر سے اُس آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اگر تم نے یہ لفظ ''بھائی'' نہ ہٹایا تو میں اس کے درد سے پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔'' طارق نقاہت بھرے لہجے میں کہا تو نگینہ روتے میں مسکرا پڑی۔

''سائرہ آپی آپ کی دوا لینے گئی تھیں، باہر جو بھائی موجود تھے اُن کو شاید بتانے گئی ہیں، میں آپی کو بتا کر آتی ہوں۔'' نگینہ اُٹھنے لگی تو طارق نے اُسے روکا۔

''نگینہ! میرے قریب آؤ۔'' طارق نے اپنی تکلیف ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''جی!'' نگینہ نے پاس آ کر کہا۔

''میرے ماتھے پر ہاتھ رکھو۔'' طارق کے کہنے پر نگی نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''جی؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

نگینہ اُس کے لیے اتنا روئی، اتنا تڑپی تھی کہ اب اُس کا اپنے دِل سے کوئی حجاب باقی نہ رہا تھا کچھ چھپا پاتی کسی سے یا اپنے آپ سے، نگینہ نے نم آنکھوں سے اقرار کیا۔ وہ جان گئی تھی کہ طارق کھو کر وہ جی نہ سکے گی۔

''تھینک یو!'' طارق نے اُس کو جذب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور ادھ کھلے دروازے پر کھڑی سحرش کو یوں لگا کہ اُس کی کشتی بیچ سمندر میں ڈوبنے لگی ہے، اُسی طرح جیسے اُس کا دِل ڈوب رہا تھا۔

وہ روشنی جو طارق کی آنکھوں کا کچھ عرصے سے حصہ بنی تھی۔ وہ ہی روشنی وہ اِس وقت بھی آنکھوں میں دیکھ سکتی تھی۔

اور یہ روشنی اُس لڑکی کی وجہ سے تھی جو اِس وقت طارق کے بے حد قریب کھڑی اُس کا ہاتھ اپنی محبت کا اقرار کر رہی تھی۔ جوں جوں طارق کی آنکھوں کی روشنی بڑھ رہی تھی سحرش کے دِل میں اندھیرا اور سناٹا پھیلتا گیا تھا۔ پھر!

وہ ایک دم تیزی سے واپس پلٹی۔

❁

الم کے ساتھ اگر بے اعتباری بھی شامل ہو جائے تو زندگی کا سارا رس ہی کڑوا ہو جاتا ہے۔ دِل غلط، ط کی پہچان کرنے کی ساری خود اعتمادی سے محروم ہو جاتا ہے۔

علیزے بھی کچھ اِسی طرح کی کیفیت سے گزر رہی تھی اندر آئی سی یو میں اُس کا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور باہر.... باہر وہ سب مُردوں سے بھی بدتر حالت میں کھڑے بے یقینی کی تُند لُو دھوپ کو جھیل رہے تھے۔

سرفراز علی نے جو تُرپ کا پتا کھیلا تھا وہ اُن کے سارے خاندان کا دِل توڑ گیا تھا۔ انوار صاحب کو ابھی نہ آیا کہ احمد شاہ پہلے اُن کی بیٹی سے رشتہ کر کے بعد میں اپنی برابری کی سطح پر رشتہ کریں گے، اگر اس کا پرابلم تھا تو انہوں نے پہلے کیوں نہ سوچا؟ اگر اُن کے بیٹے کی کمٹمنٹ کہیں اور تھی تو وہ میری بیٹی کے دل سے کیوں کھیلا؟ بیٹی کا دُکھ اُن کے دِل سے برداشت نہ ہوا اور اب وہ آئی سی یو میں تھے، حُسن کو سب سے زیادہ گِلہ روشن آرا بیگم سے تھا۔ انہوں نے بہن ہو کر سب کچھ جانتے ہوئے بھی کیسے یہ سب ہونے دیا۔

علیزے کی نگاہوں میں ولی کی شدت بھری نگاہیں، اُس کی محبت بھری تحریریں، اُس کا پائل گفٹ کر کے پروپوز کرنا پھر آسٹریلیا جا کر اپنی بے چینیوں اور بے تابیوں کا اظہار کرنا سب کچھ گھوم گیا۔ یہ سب پل اُس کی زندگی تھا وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں ولی کا ہاتھ تھامے بہت آگے نکل آئی تھی پھر کیسے! یہ بے اعتباری اندھیرے کی طرح ہر چیز پر چھا گئی، کیسے اُس کے خواب کوئی چکنا چُور کر گیا۔

الم میں بدگمانی اِس قدر تھی کہ علیزے کے دِل پر غبار چڑھ آیا، ایسے میں ہر اچھا لمحہ دھند کے پار چلا گیا تھا اور وہ دُکھ کی شدت سے رو رہی تھی کیا سچ تھا کیا جھوٹ! اُس کا دِل سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔

''آپی! اب کیا ہوگا۔'' غزالہ نے بہن سے پوچھا، غزالہ نے خالی نگاہوں سے اسے دیکھا، اُس کی آنکھوں میں چھوٹی سی عمر میں ڈھیروں وسوسے اور اندیشے ہلکورے لے رہے تھے۔ وہ خود اِس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی کہ اُس کے پاس تسلی و تشفی کا کوئی لفظ نہ تھا۔

غزالہ روتے ہوئے آئی سی یو کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی، علیزے نے آنسو صاف کر کے بیگ سے موبائل نکالا، یہ وہ رابطہ تھا، جو ولی، علیزے کو گفٹ کر کے گیا تھا، اب تک تو یہ رابطہ اُن کے درمیان رشتے کو پکا کرتا آیا تھا آج یہی رابطہ ولی سے اُس رشتے کی سچائی پوچھنے والا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''زہے نصیب! آج یہ روزہ کیسے توڑلیا محترمہ نے۔'' ولی کی آواز اتنی دُور سے بھی بہت واضح تھی اُس میں موجود چہک اور خوشی کا عنصر صاف محسوس ہوسکتا تھا۔

علیزے نے لب بھینچ کر گہری سانس بھری، وہ خود کو کمپوز کررہی تھی کہ بات کیسے شروع کرے۔

''ولی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' علیزے نے آخر ہمت کرہی لی۔

''جی فرمایئے! ارشاد کیجیے!'' عبدالولی نے شوخی سے کہا۔

علیزے کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ! کیوں کہ عبدالولی کا لہجہ اور رویّہ بالکل ویسا جیسا تھا۔ پاس کھڑی غزالہ نے بہن کا منہ دیکھا جو عبدالولی کو سچائی بتانے سے گھبرارہی تھی۔

''لایئے آپی! میں بات کرتی ہوں، باپ ہمارا بستر مرگ سے جالگا اور آپ کو ابھی تک مروّتیں ہو رہی ہیں۔'' غزالہ نے ایک ایک لفظ چبا کرکہا۔

علیزے اپنی ہی جگہ چور ہوگئی تھی غزالہ نے فون پکڑ کر عبدالولی سے بات شروع کی تو علیزے کو اپنا رُکنا دوبھر ہوگیا۔ وہ گھبرا کر باہر کھلی فضا میں نکل آئی۔

''یااللہ! میں کیا کروں؟'' علیزے ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ عبدالولی جس کو اُس نے اپنا آف لائف جان لیا تھا، کیا وہ اُس سے چھن جائے گا؟

کتنی مشکل سے اُس نے خود کو یقین دلایا تھا کہ وہ آسمان کا چاند جس کی صرف تمنا ہی کی جاسکتی سچ مچ اُس کے نصیب کی روشنی بن چکا ہے اور جب دل بے قرار کو یقین آنے لگا تو یہ سب کیوں روتے روتے اُس کا حلق خشک ہورہا تھا وہ نڈھال سی وہیں ہسپتال کے لان کے بینچ پر بیٹھ گئی۔ باپ حالت علیزے کو اپنی جگہ مجرم بنارہی تھی اُسی کی وجہ سے آج اُس کا باپ وہاں بستر پر موجود تھا۔

''یا اللہ جی! پلیز مجھے اِس منجدھار سے نکال لیں اور میرے ابو کو بھی صحت اور زندگی عطا کردیں'' علیزے نے نم آنکھوں سے دُعا کرکے ہاتھ منہ پر پھیرتے ہوئے سامنے دیکھا۔

روشن آرا خالہ اور احمد شاہ خالو تیز تیز قدم اُٹھاتے اُسی کی جانب آرہے تھے، بے شک اللہ کسی کو اُس کی قوت سے زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتا۔

''السلام علیکم بیٹا۔'' احمد شاہ نے علیزے کے پاس آکر حسبِ عادت سلام کرنے میں پہل کی۔

''السلام علیکم خالہ، السلام علیکم خالو۔'' علیزے نے دونوں کو باری باری سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' روشن آرا بیگم نے علیزے کو عجلت کے ساتھ اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اُن کا دماغ اِس وقت بہن اور بہنوئی کی طبیعت کے لیے فکرمند تھا۔

غزالہ نے اُن کو ادھوری بات بتا کر انور میاں کی طبیعت کی خرابی بتائی تھی، سارے راستے روشن بیگم غزالہ کی ادھوری باتوں پر اُلجھی اور اٹکی رہی تھیں۔

''بھائی صاحب کدھر ہیں؟'' روشن آرا نے دریافت کیا۔

''آئی سی یو میں ہیں۔'' علیزے کا لہجہ بھی نم تھا۔

روشن آرا بیگم نے غور سے علیزے کا چہرہ دیکھا، پہلی بار اُن کو علیزے کے چہرے پر کچھ دبا دبا اور ناراضی نظر آئی، انہوں نے بات کی شدت کو شدت سے محسوس کیا تھا اور چھوٹے چھوٹے قدم

شاہ اور علیزے کے پیچھے چل دیں جو تیزی سے آئی سی یو کی جانب بڑھے۔ سامنے ہی بینچ پر حُسن آرا، غزالہ اور گڈو بیٹھے نظر آئے تینوں کے چہرے پر ایک چیز کامن تھی، تینوں ہی ہراساں تھے۔ روشن آرا تیزی سے بہن کی جانب بڑھیں لیکن انہوں نے بے حد سرد مہری سے ان کو راستے میں ہی روک دیا۔ روشن آرا کے لیے یہ رویہ کسی صدمے سے کم نہ تھا۔

''حُسن آرا؟'' روشن آرا نے حیرت سے اُن کو دیکھا۔

''آپا! حسن آرا بیگم نے سختی سے انہیں بات کرنے سے روک دیا۔

''میرا قصور کیا ہے؟'' روشن آرا بیگم نے ٹوٹے لہجے میں پوچھا، جو بہن ساری عمر واری صدقے جاتی تھی آج پہلی مرتبہ اُس کا اتنا سرد رویّہ انہوں نے دیکھا تھا اس لیے برداشت بھی نہ ہورہا تھا۔

''قصور آپ کا نہیں آپا، ہمارا ہے۔'' حُسن آرا بیگم نے غصّے سے کہا۔

''قصور ہماری غربت کا ہے، قصور تو ہماری بے وقوفی کا ہے جو آپ کے اور اپنے واضح طبقاتی فرق کے باوجود اپنی بیٹی کا رشتہ طے کردیا یہ جانے بغیر کہ بڑے لوگ اپنی برابری میں ہی رِشتہ نبھاتے ہیں، اپنے سے کم تر جگہ پر تو وہ کسی بھی وقت کسی بھی پَل ہر رشتے، ہر زبان سے مکر جاتے ہیں، یہی کچھ آپ نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ کیوں کیا ایسا، میں تو آپ کی سگی بہن تھی نا۔'' حُسن آرا بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے حُسن آرا! اس قدر بدگمانی اچھی نہیں ہوتی، پوری بات تو پتا چلے بِنا جرم کے تم کیسے کسی کو قصوروار ٹھہرا سکتی ہو؟'' روشن آرا نے بہن کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں! کیا یہ غلط ہے کہ آپ علیزے اور ولی کی منگنی کے باوجود ولی کا رشتہ کسی بہت امیر کبیر گھرانے میں کرنے جارہی ہیں۔'' حسن آرا نے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا خرافات ہیں کس نے کہا آپ سے یہ سب؟'' روشن آرا بیگم نے استفسار کیا۔

''انہوں نے خود ہمیں بتایا ہے، آپ کے ہی گھر میں کہ آپ اُن کی بیٹی کے ساتھ ولی کا رشتہ پکا کرنے جارہی ہیں۔'' حُسن آرا بیگم نے حیرت سے روشن آرا کو دیکھا، جس کے چہرے پر اس بات کی بے خبری بے حد واضح تھی۔

''لاحول ولاقوۃ!'' روشن آرا بیگم نے پوری بات سن کر ایک دم کہا۔

''علیزے میری بہو بنے یہ میرا برسوں پرانا خواب ہے اور اس خواب سے آپ بھی تو بے خبر نہ تھیں پھر اس رشتے کے لیے بھلا کوئی دباؤ تھا جو ہم وقتی طور پر کرکے کہیں اور آگے بڑھ جائیں گے، ایسا کچھ نہیں ہے حُسن آرا!'' روشن آرا نے بہن کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

''اِدھر دیکھو! میری آنکھوں میں دیکھو، کیا تم کو اپنی بہن کا یقین نہیں ہے؟'' روشن آرا بیگم نے حسن آرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے پوچھا۔

''آپا! کیا یہ یقین آپ اُس مرتے ہوئے شخص کو دلاسکتی ہیں جس کو آپ کا یقین ہی موت کی دہلیز پر لے گیا ہے!'' حسن آرا بیگم کا گلا رندھ گیا۔

''ہاں! میں اُسے یہ یقین ضرور دلاؤں گی اور تم دیکھو گی کہ تمہاری بہن اپنے قول کی کتنی پکی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روشن آرا بیگم نے ایک دم ٹھوس اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

حُسن آرا بیگم نے ایک دم چونک کر بہن کی آنکھوں میں دیکھا۔

''لیکن کیسے؟'' اُن کے ہونٹوں پر سوال تھا۔

''میں علیزے اور ولی کا نکاح کردوں گی۔'' روشن آرا بیگم نے کسی اہم فیصلے پر پہنچ کر کہا۔

''نکاح! لیکن ولی تو باہر ہے نا؟'' حسن آرا بیگم کو ڈوبتے میں سہارا ملا تھا اس لیے وہ فوراً سوال کے بھی قابل ہوئی تھیں۔

ٹیلی فون پر بھی تو نکاح ہوتے ہیں نا!'' روشن آرا بیگم نے تجویز پیش کی۔

''نہیں آپا! وہ اس قدر بے اوسان ہوئے بیٹھے ہیں کہ ان کو ٹیلی فون پر نکاح تسلی کے لیے کافی جب تک خود ولی راضی وخوشی آ کر اپنی مرضی علیزے کے ابو کو نہیں بتائے گا، وہ کہاں یقین کریں۔ عرصے سے مسلسل اولاد کا دُکھ ان کو اندر سے کھوکھلا کر گیا ہے!'' انہوں نے گہری سانس بھری۔

''وہ بے حس نظر آنے والا باپ جس کو کسی سے سروکار نہ ہوتا تھا ایک دم اپنی اولاد کے لیے اس حساس ہوگیا ہے کہ آج اُس کے غم میں ڈھے گیا، اُسے پکا یقین چاہیے۔ آپ اُسے یہ یقین دلا گی؟'' حُسن آرا نے روشن آرا کے سامنے ایک مشکل سوال رکھا۔

''لیکن جن کے دل صاف ہوتے ہیں، اُن کے لیے کوئی چیز ناممکن اور مشکل نہیں ہوتی۔'' روش بیگم کو ایک پَل سے بھی کم عرصہ لگا تھا فیصلہ لیتے ہوئے۔

''ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو یہ یقین میں بھائی صاحب کو ضرور دلاؤں گی انشاء اللہ تعالیٰ!'' آرا بیگم نے ٹھوس لہجے میں کہہ کر حُسن آرا بیگم کے مردہ وجود میں زندگی پھونک دی تھی۔

❖❖○❖❖

''تم کچھ کہتی کیوں نہیں ہو؟ پلیز کچھ تو بولو، تمہاری تکلیف میرے اندر آگ لگا دیتی ہے جانے کیوں مجھے اپنے اور تمہارے درمیان رشتہ سا محسوس ہوتا ہے، تم میرے نصیب میں نہیں ہو یہ میں ج ہوں پھر بھی میرا دِل تمہاری جانب کیوں کھنچتا ہے، تمہاری تکلیف پر کیوں تڑپتا ہے؟'' سمعان کتنی د چپ چاپ ٹکر ٹکر دیکھتی مسکان سے باتیں کررہا تھا۔

پہلے پہل وہ مایوس ہونے لگا تھا لیکن پھر ڈاکٹر اکرم زبیر نے اُس کو حوصلہ دیا تھا کہ وہ سُن سکتی سمجھ بھی رہی ہے لیکن اپنے خول سے باہر نہیں آرہی، صرف ہمارا Concern اُسے اِس خول سے نکالے گا اس لیے ایک گھنٹہ سید سرفراز بھی روز مسکان کے ساتھ گزارنے لگے تھے اُس کے بچپن کی چھوٹی باتیں دہراتے، اسی طرح آپا امّاں بھی گھنٹوں مسکان سے باتیں کرتی تھیں یہی حال سمعان وہ بھی مسکان کے پاس وقت گزرا کرتا تھا۔

اُسی وقت موبائل کی بیپ نے سمعان علوی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''السّلام علیکم ڈیڈی حضور!'' سمعان نے کچھ شوخی سے کہا۔ قاسم علوی صرف اُس کے باپ دوست بھی تھے۔

''کدھر ہو جناب عالی۔'' قاسم علوی نے پوچھا۔

''کدھر! اُدھر اپنی چندا کے پاس؟'' قاسم علوی کی شوخ شرارت سمعان کا دِل اُداس کرگئی۔ مسکان تو ں کے ہاتھ آنے سے پہلے ہی کھوگئی تھی۔

''جی!'' سمعان نے مختصراً کہا۔

''تو کیا ہمیں نہیں ملواؤ گے اس سے جو ہمارے اتنے شاندار بیٹے کے دِل میں آن بسی ہے۔'' سمعان ل ی ہلکی ہنس دیا۔

''ڈیڈی! ابھی تو وہ خود بھی خود سے بچھڑی ہوئی ہے آپ سے اُسے کیا ملواؤں؟'' سمعان نے سوچا۔

''کم آن ینگ بوائے! بار بار کدھر کھوجاتے ہو۔'' قاسم علوی نے فون پر ہی اُس کی کیفیت کو محسوس لیا تھا۔

ہو لوگ آپ کے اندر بستے ہوں، آپ چاہے کتنے ہی فاصلے پر بیٹھے ہوں وہ دِل کا حال فوراً جان ہیں۔ قاسم علوی بھی تو سمعان کے اندر بستے تھے سمعان کی ہر ہر ادا اُن کے فنگر ٹپس پر رہتی تھی۔

''کہیں نہیں پاپا! میں نے کہاں کھونا ہے!'' سمعان نے اپنی آواز کو بشاش بنانے کی کوشش کرتے ے کہا۔

''تو پھر ریڈی ہو جاؤ ہو ہم تمہاری ''گولڈن گرل'' کو ملنے آرہے ہیں۔'' قاسم علوی نے سمعان علوی سرپرائز دیا۔

''مطلب؟'' سمعان نے پوچھا۔

''مطلب تم دس تک گنو، میں تمہارے لیے ایک سرپرائز بھی لا رہا ہوں۔'' قاسم علوی آج سمعان کو وی طرح سرپرائز کرنے کے موڈ میں تھے۔

''پاپا پلیز! پہلے میری بات تو سنیں۔'' سمعان اُن کو کچھ بتانا چاہ رہا تھا لیکن وہ ان سنی کرکے فون بند ر چکے تھے۔

جس گولڈن گرل کا وہ قاسم علوی سے ذکر کرچکا تھا مسکان تو اس وقت اُس کی ایک پرچھائیں بنی لڑی تھی۔ سمعان نے بے اختیار گہرا سانس بھرا۔

''سرپرائز!'' قاسم علوی زبیدہ بیگم کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے، سمعان نے ہاتھ اونچے کرکے بے ں سا طویل سانس لیا۔

''ارے! تم ہمارے آنے پر خوش نہیں ہوئے؟'' قاسم علوی نے سمعان سے کہا۔

''پاپا! آپ ممی کو یہاں کیوں لائے؟'' سمعان نے زبیدہ بیگم کو کندھوں سے تھام کر کرسی پر لا بٹھایا، وہ ل کسی موم کی گڑیا کی طرح چپ چاپ بیٹھ گئیں۔

''کیوں! نہیں لانا چاہیے تھا۔'' قاسم علوی نے الٹا اُس سے سوال کردیا۔

''پاپا! زبردستی کی مہمان نوازی کروانے کا موڈ ہے کیا؟'' وہ اپنے باپ سے ایسا ہی فرینک تھا۔

''آف کورس! اچھا کہاں ہے تمہاری گولڈ گرل!'' قاسم علوی نے مسکان کی جانب بڑھتے ہوئے چھا۔

''السلام علیکم بیٹا۔'' انہوں نے حسب عادت تکلف کی پہلی دیوار پھاند لی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مائی گارڈ! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم کو بھی کوئی اتنی پیاری لڑکی مل سکتی ہے۔" قاسم علوی نے شرارت سے سمعان سے کہا۔

"کیوں زبیدہ! دیکھو کتنی پریٹی ہے نا؟" زبیدہ نے مسکان کو خالی نظروں سے دیکھ کر سر ہلایا۔

سمعان کے دِل کو ایک دم سے کچھ ہوا، اُس کے باپ نے ساری عمر ایک پتھر اور روبوٹ نما عورت کے ساتھ گزار دی، جو اُن کے احساسات کو کبھی پذیرائی نہ دے سکی تھی۔

"مائی گاڈ! مسکان اور ممی کے چہروں میں کس قدر مماثلت تھی چپ چاپ ... گم سم! اجنبی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے، کیا میں اپنے باپ کی طرح اتنی بہادری سے جی سکتا ہوں؟" اُس کے اندر سے سوال اُٹھا۔

"نہیں! میں ایسا کبھی نہیں کر پاؤں گا، مجھے تو زندگی سے بھرپور وجود کی ضرورت ہے جو میری برسوں کی پیاس بجھا دے، اس ویرانے جیسے دِل کو زندہ کر دے، محبت کی قبر پر راکھ ہوئی عورت ساری زندگی قبر کی مٹی کی طرح رہتی ہے وہ کبھی کسی کو کچھ نہیں دے سکتی۔" سمعان نے ایک نظر مسکان پر ڈالی۔

وہ اُسے جان سے زیادہ عزیز تھی لیکن کیوں اس کا دِل اُس کی خاطر رکنے اور جوگ لینے کو تیار نہ تھا وہ پرائی امانت ہی محسوس ہوتی تھی وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ احساس اُس پر کیوں اُترا تھا لیکن یہ بالکل احساس تھا، جو اَن جانے میں بہت ساری حقیقت اُس پر واضح کر گیا تھا۔

"تمہاری گولڈن گرل بولتی نہیں۔" قاسم علوی نے پریشانی سے پوچھا، سمعان اُن کو اِس پریشانی میں بالکل نہ دیکھ سکتا تھا۔

"پاپا! شی از مائی بیسٹ فرینڈ! بٹ شی از ناٹ مائی گولڈن گرل۔" سمعان نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ سمعان کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ سب کچھ وہ کہہ رہا تھا۔

"تو پھر کہاں ہے تمہاری "گولڈن گرل"؟" قاسم علوی نے اس سے سوال کیا۔

سمعان کی آنکھوں کے سامنے ایک دم معصوم اور بے حد سادہ سی سائرہ کا چہرہ لہرا گیا، اس کو بس ایک پَل کو حیرت کا سامنا کرنا پڑا پھر اسموک اسکرین ایک دم سے صاف ہو گئی۔ برسوں کی خاموش محبت ایک دم پردہ پھاڑ کر سامنے آ کر اپنا وجود منوا گئی تھی۔

"اُس کا نام سائرہ ہے!" سمعان کے اندر تک سکون اُتر گیا اس نے مسکان کا بیڈ ایزی کر کے اس طرح سنبھال کر بیڈ پر لٹایا جیسے کسی کانچ کے کھلونے کو سنبھالتے ہیں۔ مسکان بھی روبوٹ کی مانند چپ چاپ لیٹ گئی۔

"لیکن مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے تم نے تو مجھے مسکان نام بتایا تھا۔" قاسم علوی نے سمعان کو حیرت سے دیکھتے پوچھا۔

"پاپا! کبھی کبھی ہم اُس دروازے پر دستک کرنے دینے لگتے ہیں جو ہمارے گھر کا نہیں ہوتا لیکن اگر خوش قسمتی سے اپنے گھر کا دروازہ مل جائے تو اُسے کبھی مِس نہیں کرنا چاہیے۔" سمعان نے کسی اسکالر کی طرح جواب دیا تو علوی صاحب نے اُس کو چونک کر دیکھا۔

"پاپا!" سمعان نے زبیدہ کے گم سم وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ایک عظیم انسان ہیں اور میں ایک عام سا بندہ! میرے اندر آپ جیسی برداشت نہیں ہے لیکن میری محبت خاص ہو نہ ہو، میرا انتخاب ضرور آپ کی طرح خاص ہے۔" سمعان کی نظروں میں سائرہ کا چہرہ اور آنکھیں گھوم گئیں۔ وہ لڑکی اُسے کس قدر محبت سے دیکھتی تھی اور اُس نے آج تک اُس کی بات کو اون ہی نہ کیا تھا۔

"آر یو شیور! کہ تمہارا فیصلہ درست ہے؟" قاسم علوی نے گہری سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" سمعان نے بیڈ پر لیٹی مُسکان اور چیئر پر بیٹھی ماں کو باری باری دیکھتے ہوئے ایک طویل سانس بھر کے کہا۔

"پاپا! میرے اندر جواء کھیلنے کی ہمت نہیں۔" سمعان نے باپ کا کندھا دباتے ہوئے بے حد یقین سے کہا۔

"بعض اوقات انسان ساری عمر سوچتا رہتا ہے اور فیصلہ نہیں کر پاتا اور کبھی کبھی صرف ایک پَل میں سارے فیصلے ہو جاتے ہیں، ایسے فیصلے عموماً ننانوے فیصد درست نکلتے ہیں بیٹا جی!" قاسم علوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں بیگم جان! آپ کا کیا خیال ہے؟" قاسم علوی نے حسبِ عادت زبیدہ بیگم سے دریافت کیا۔ وہ جواب دیتیں یا نہ دیتیں لیکن علوی ان کو اپنی گفتگو اور فیصلوں میں ہمیشہ شامل کرتے آئے تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے زبیدہ بیگم کے وجود کو آج تک زندوں میں شامل کر رکھا تھا۔

"ہاں! ٹھیک کہتے ہو تم، ہمیں درست فیصلہ کرنے میں ایک پَل لگتا ہے اور غلط فیصلے پر رونے کو ساری عمر بھی ناکافی ہوتی ہے۔" زبیدہ بیگم ایسی ہی تھیں اپنی مطلب کی بات سنتی اور کرتی تھیں۔

"او کے بیٹا! مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ بے حد سوچ سمجھ کیا۔" قاسم علوی نے سمعان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"تھینکس پاپا!" سمعان نے کہا۔

"بیٹا! آپ کی دوست کو کیا ہوا ہے؟" علوی صاحب نے پوچھا۔

"پاپا! آپ نے سانپ کا ڈسا ہوا انسان تو سُنا ہوگا میری اس پیاری سی، چھوٹی سی دوست کو تو انسانوں نے ڈسا ہے اس کے لیے دعا کیجیے گا کیوں کہ یہ آپ کے بیٹے کو بے حد بے حد عزیز ہے اس کی تکلیف میرے دِل کو ہمیشہ بے چین رکھتی ہے۔" سمعان نے مسکان کو جوس پلا کر اُس کے منہ کو دھیرے سے پونچھا۔

"انسانوں کا ڈسا انسان!" علوی کے چہرے پر دُکھ بھری مسکراہٹ آن ٹھہری، اُن کی نگاہ زبیدہ بیگم کے چہرے پر آن ٹکی تھی۔

"سانپ کا زہر تو اتنا خطرناک نہیں ہوتا، جتنا انسانوں کا، تم اپنی ماں کو ہی دیکھ لو!" قاسم علوی نے دِل میں کہا۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گے یا پھر رکو گے؟" علوی صاحب نے سوال کیا۔

"میں رُکوں گا پاپا! اس کے بابا آنے والے ہوں گے وہ اِس کے پاس رکیں گے پھر میں چلا جاؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گا، اس کے پاس مسلسل کوئی نہ کوئی رہتا ہے۔" سمعان نے مسکان کے ماتھے پر آئے بال سمیٹ کر کیے۔

"سمعان! تم جس طرح اس کی کیئر کررہے ہو، جس طرح تمہارے ہاتھ، تمہارا دِل اس کی بے چینی پر بے چین ہے کیا یہ صرف تمہاری بیسٹ فرینڈ ہے؟" قاسم علوی نے سوال کیا۔

"پاپا! کوئی رشتہ ہے ضرور! محبت سے بھی بڑھ کر، یہ تو میں سمجھتا تھا کہ اِس سے محبت ہے لیکن جانا کیا بات ہے کہ جب یہ پرائی ہوئی تو بھی میرے دِل کے لیے پرائی نہ ہوسکی۔" سمعان دھیرے دھیرے بولتے ہوئے مسلسل مسکان کو دیکھ رہا تھا، جیسے کوئی سِرا تلاش کررہا ہو۔

"او کے! ہم چلتے ہیں۔" علوی نے گہری سانس بھر کر زبیدہ بیگم کی جانب رخ کیا اور اُن کو ہاتھ تھام کر اُٹھالیا۔

"یہ... یہ دونوں گھر نہیں آرہے؟" زبیدہ بیگم ایک دم چونک کر بولیں، جیسے ابھی ابھی وہ اس کمرے میں آئی ہوں، اُن کا کھویا دماغ جو زیادہ تر ماضی میں گھومتا تھا عموماً اسی طرح گاہے بگاہے حال سے جوڑتا تو وہ گفتگو میں حصہ لے پاتی تھیں۔

"لے چلیں ان کو؟" قاسم علوی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" زبیدہ نے جواب دیا۔

"سمعان کا تو وہ گھر ہے اس کا کیا کرو گی؟" علوی عموماً اِسی طرح سوال کرکے اُن کو حاضر دماغی پر مجبور کردیتے تھے۔

"اِس کو میں اپنی بیٹی بناؤں گی۔" زبیدہ بیگم کے سپاٹ چہرے پہ ہلکی سی کرن جیسی مسکراہٹ دَر آئی۔

"میرے پاس بیٹی نہیں ہے نا اِس لیے۔" وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتیں مسکان کے قریب آکھڑی ہوئیں، مسکان چپ چاپ سامنے دیکھ رہی تھی۔

"تم بولتی نہیں ہونا! تم ہنستی بھی نہیں ہو! تم کو بھی کیا سید سرفراز نے دلدل میں دھکیل دیا تھا۔" زبیدہ بیگم نے مسکان کے کان کے قریب آکر سرگوشی کی۔

"زبیدہ! چلو گھر چلتے ہیں، اس کو کیا معلوم کہ تم کس کا پوچھ رہی ہو!" قاسم علوی نے بے بس سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"رُکو نا قاسم! یہ دیکھو اِس کی آنکھیں میری طرح رو رو کر خالی ہوگئی ہیں، تمہیں یہ میرا آئینہ نہیں لگتی؟ تمہیں یہ زبیدہ جیسی نہیں لگتی جس کی ہنسی، خواب کسی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لیے۔" زبیدہ بیگم سرسراتے لہجے میں کہا۔

"مما! ایسی باتیں کیوں کررہی ہیں؟" سمعان ہمیشہ سے اپنی ماں کو اوٹ پٹانگ بولتے یا چپ دیکھ آرہا تھا لیکن آج وہ ہمیشہ سے مختلف نظر آرہی تھی اسی لیے اُس نے چونک کر پاپا سے سوال کیا۔

"یہ ہمیشہ سے ایسی باتیں کرتی ہے تم فکرمند نہ ہو۔" علوی صاحب نے سمعان کو تسلی دے کر ٹالا۔

"لیکن یہ!" سمعان ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر ایک قیامت اندر آئی۔

"السلام علیکم سر!"

"یہ میرے پاپا قاسم علوی اور یہ ہیں میری ماما۔" سمعان نے اندر آنے والے سے اپنے والدین کا تعارف کروایا۔

"اور یہ ہیں مسکان کے بابا سید سرفراز۔" سمعان نے مڑ کر علوی صاحب کی طرف دیکھا لیکن اُسے حیرانی نے آن گھیرا، قاسم علوی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"تم...!" قاسم علوی باقاعدہ غرائے۔

سرفراز علی کو اس شخص کا چہرہ جانا پہچانا لگا، انہوں نے اُسے کہاں دیکھا؟

ابھی وہ پوری طرح سوچ بھی نہ پائے تھے کہ علوی کے کندھے سے جھلکتا ایک چہرہ اُن کو پتھرا کر گیا۔

"زبیدہ!" انہوں نے خشک ہوتے حلق کے ساتھ کہا۔

یہ چہرہ! بلال کی موت کے بعد اُن کو ہر روز ڈرانے آتا تھا۔ اپنی زیادتی کا حساب مانگتا تھا، وہ اِس سے بہت ڈرنے لگے تھے۔

"کیا یہ سچ ہے یا پھر میرا ہمیشہ کی طرح تصور؟" انہوں نے خشک ہوتے حلق کو تھوک سے تر کرتے ہوئے سوچا۔

"سید سرفراز!" زبیدہ بیگم کی ہمیشہ سے اجنبی اور سپاٹ نگاہیں اس وقت شعلے برسا رہی تھیں۔

سارے درد! گزشتہ ستائیس سال کے درد... ستائیس سال کی وہ بے حسی جس نے زبیدہ بیگم کو کوئی خوشی، دکھ محسوس نہ ہونے دیا تھا کوئی رشتہ نبھانے نہ دیا تھا وہ ساری تکلیف جو خود سے بچھڑ کر انہوں نے جھیلی تھی، وہ پچھتاوا جو ستائیس سال انہوں نے بھگتا تھا ہر دُکھ، درد اور تکلیف بھرا لمحہ اُن کے چہرے اور آنکھوں میں آکر اکٹھا ہوگیا تھا۔

وہ غصّے سے چند قدم آگے بڑھیں، سید سرفراز کو زندگی میں پہلی بار لگا کہ وہ شاید اس بار خود کو بچا نہ سکیں۔

لیکن اگلے ہی پَل زبیدہ بیگم بُری طرح لہرا کر گریں۔ سمعان اور علوی تیزی سے زبیدہ کی جانب بڑھے۔

"زبیدہ!!"

زبیدہ! اُٹھو زبیدہ!" علوی نے فکرمندی سے زبیدہ بیگم کو اُٹھانے کی کوشش کی پھر وہ ایک دم بپھرے ہوئے شیر کی مانند سرفراز علی کی جانب مڑے۔

"آج... اگر اس کو کچھ ہوگیا تو خدا کی قسم میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔" وہ غرائے۔

"ستائیس سال... ستائیس سال سے میں نے جس زندہ لاش کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا، تمہاری وجہ سے آج اُس میں چلتی So-Called زندگی بھی منہ موڑ رہی ہے۔ میں تم کو تمہارا یہ قصور کبھی معاف نہ کروں گا، تم نے اُسے جو زخم دیا تھا اُس نے ستائیس سال اُس کی تکلیف کاٹی، اب تمہاری باری ہے سید سرفراز علی۔" انہوں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"اب تمہاری باری ہے، اِسے دیکھ رہے ہو؟" انہوں نے زبیدہ بیگم کے اُوپر جھکے ہوئے سمعان کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ہے تمہاری ناجائز اولاد...''

''ناجائز اولاد!'' قاسم علوی نے سرفراز علی کے سر پر ایک اور بم دھماکہ کیا۔

''ہاں! وہی بچہ اور لڑکی جسے آج سے ستائیس سال پہلے تم اپنی جانب سے قتل کروا چکے تھے لیکن یہ ا
ہیں اور تم سے حساب بھی باقی ہے۔'' سید سرفراز علی کے ماتھے پر پسینہ چمکا۔

''سمعان! اُٹھاؤ اپنی ماں کو، ان کو ایمرجنسی وارڈ میں لے کر چلتے ہیں۔'' وہ اِس وقت ہسپتال میں
تھے اِس لیے سمعان نے زبیدہ بیگم کو اُٹھایا اور تیزی سے باہر دوڑا۔

قاسم علوی بھی تیزی سے اُس کے پیچھے لپکے... پھر ایک دم رُک کر سید سرفراز علی سے مخاطب ہوئے
''یاد رہے تم سے ابھی حساب باقی ہے۔'' انہوں نے انگلی اُٹھا کر کہا۔

وہ کہہ کر باہر نکل گئے جب کہ سید سرفراز علی اپنے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے کرسی پر ڈھے گئے ا
گہری سانس بھر کر انہوں نے سامنے دیکھا۔ اُن کے دِل کو ایک دم سے کچھ ہوا کیوں کہ مسکان سا
دیوار کو تکتے ہوئے مسکرا رہی تھی، اُس کی مسکراہٹ ابنارمل اور بے معانی بالکل نہ تھی۔

''تو کیا مسکان؟'' سرفراز علی کو اپنی ذات کے اونچے قلعے میں دراڑیں پڑتیں محسوس ہوئیں۔

❖❖○❖❖

''آگ لگے اس ساری دنیا کو، مرجائیں اللہ کرے سب!'' سحرش ہر چیز اِدھر اُدھر پھینکتے ہوئے ہذیا
انداز میں بول رہی تھی۔

مرینہ آنٹی نے پریشانی سے سحرش کو دیکھا اُن کو ڈر تھا کہ اس کے دماغ پہ کوئی الٹا سیدھا اثر ا
ہوجائے، جس طرح کی کیفیت سے وہ گزری تھی کوئی بھی بڑا صدمہ اُس کے لیے بے حد نقصان دہ تھا۔

''سحرش! خدا کے واسطے بیٹا خود کو سنبھالو!'' مرینہ آنٹی اُسے سنبھالتے سنبھالتے تھکنے لگی تھیں۔

''وہ.. وہ لڑکی.. طارق اُسے! اُسے کتنے پیار سے دیکھ رہے تھے، کتنے پیار سے۔'' سحرش پھوٹ پھو
کر رودی۔

''اتنے پیار سے انہوں نے کبھی مجھے نہیں دیکھا میرے لیے تو اُن کی نگاہوں میں ہمیشہ ہمیشہ ہمدرد
اور شفقت نما پیار ہوتا تھا جیسے کسی بچے کو بہلانے کے لیے دیا جاتا ہے۔''

''آنٹی! طارق صرف میرے ہیں۔ میں اُن کو کسی کو چھیننے نہیں دوں گی۔'' وہ ایک دم بُری طرح چلا
ہوئے بولی۔

مرینہ آنٹی نے سہم کر اُسے دیکھا۔

''میں طارق کو اور خود کو شوٹ کرلوں گی لیکن اسے کسی اور کے حوالے نہیں کروں گی... نہیں کروں گی۔''
سحرش نے ایک بار پھر چیخ کر کہا اور اپنے کمرے میں جا کر دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔

مرینہ آنٹی نے ایک گہری تاسف بھری سانس بھری، وہ فی الحال سحرش کے پیچھے نہ گئی تھیں کیوں کہ
ابھی ابھی جو کچھ سحرش بول کر گئی تھی اُس لحاظ سے سحرش طارق سے حساب لیے بغیر خود کو کچھ نہیں کرنے
والی تھی۔

''لیکن جب طارق آئے گا تو پھر کیا ہوگا؟'' یہ سوال کسی بھوت کی طرح اُن کو ڈرا رہا تھا، اُن کے دل

ابھار رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''آج آپ کو ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی بھائی لیکن مجھے کب چھٹی ملے گی؟'' آصف نے طارق
سامنے آ کر پوچھا۔ طارق نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں آصف کو دیکھا۔

''مطلب؟'' طارق نے پوچھا۔

''صدقے جاؤں، قربان جاؤں سر جی آپ کے۔'' آصف نے باقاعدہ زچ ہو کر کہا۔

''سر جی! شوٹنگ میں یادداشت تھوڑی سی کم ہوجاتی ہے اور اگر کم ہوگئی ہے تو میں ہی بتا دیتا ہوں،
ری تو جان پر بن آئی ہے ایک عدد لڑکی کو میرے گھر چھوڑ رکھا ہے اوپر سے میرے ابا جی شہر آ رہے ہیں
نکھوں کا چیک اپ کروانے، سر جی میرا یقین مانیے اُن کی نظر کتنی بھی کمزور کیوں نہ ہو خ وہ ہم بھائیوں
ے آس پاس لڑکی سونگھ کر بھی پکڑ لیتے ہیں اس لیے برائے مہربانی وہ مدعا تو میرے گھر سے واپس
ائیں۔'' مدعا وہ عظمیٰ کو کہہ رہا تھا یہ وہی لڑکی تھی، جس کی بازیابی کے دوران طارق زخمی ہوگیا تھا۔

''لڑکی کے والدین نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں لکھوائی تھی اس لیے تمہیں فوراً اُن سے
رابطہ کرنا تھا۔'' طارق نے فوراً حل پیش کیا۔

''لے کر گیا تھا سر جی میں لڑکی کو اُس کے گھر! لیکن اس کے والدین نے اُس رسوائی کو قبول کرنے
سے صاف انکار کردیا۔ لڑکی کی اپنی دلی و ذہنی حالت بھی بہت بُری ہے، وہ چوبیس میں ساڑھے تیئس گھنٹے
رو کر گزارتی ہے اب بتایئے اُس لڑکی کا کیا کرنا ہے کہاں بھجوانا ہے؟ میرے تو ابا جی گاؤں سے آ رہے
ہیں، میں مزید اُسے گھر نہیں رکھ سکتا۔'' آصف نے ہر بات کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

''اوہ!'' طارق نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

''جی!'' آصف ہمہ تن گوش تھا کہ مزید کیا حکم ملتا ہے۔

''تم اُس کو روز دیکھتے ہو، کیسی لڑکی ہے؟'' طارق کا سوال آصف کو حیران کرگیا۔

''اچھی ہے، خوب صورت ہے۔'' آصف نے سچائی سے جواب دیا۔

''تمہیں کیسی لگتی ہے؟'' بھلا یہ کیا سوال ہوا۔ طارق کے سوال پر آصف نے زچ ہو کر اُسے دیکھا۔

''سر جی! بھلے گھر کی لڑکی ہے، بے شک وہ وقتی طور پر بہک گئی تھی لیکن میں نے اپنی اِس نوکری میں
رہتے ہوئے یہ تو سیکھ ہی لیا ہے کہ کھرا کیا ہے، کھوٹا کیا ہے۔ وہ نہ صرف بے حد معصوم ہے بلکہ بے داغ
بھی ہے اور میں اپنے دل میں اُس کے لیے ہمدردی محسوس کرتا ہوں کہ لڑکی ذات ہو کر وہ اپنی چار
دیواری سے محروم ہوگئی... اللہ جانے اب قسمت اُس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔'' آصف کو طارق کی ہر
بات پر تفصیلی رپورٹ دینے کی عادت تھی۔ اِس پَل بھی وہ عظمیٰ کے متعلق بالکل رپورٹنگ کے انداز میں
گفتگو کررہا تھا۔

''سنو آصف! اگر ہم لڑکی کو دارالامان بھجواتے ہیں تو مجھے ساری عمر دکھ رہے گا کہ جس لڑکی کو گندگی
سے نکالنے کے لیے ہم تینوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی اُسے ہم یوں لاپروائی سے دنیا کے
دھکے اور بھیڑیوں کی نظروں کا شکار ہونے کے لیے اس طرح لاوارث چھوڑ دیں۔ دوسرے ہماری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگیاں اتنی غیر اہم نہیں ہیں کہ لڑکی کو صرف دارالامان میں ڈالنے کے لیے رسک میں ڈالی جائیں
طارق نے اپنی بات کو درمیان میں روک کر آصف کی جانب دیکھا۔

"مطلب سر؟" آصف پوچھے بغیر نہ رہ سکا لیکن طارق کے گھورنے پر فوراً بولا۔

"جی.. جی سر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"تو پھر تمہارا کیا خیال ہے اُس لڑکی کو مکمل تحفظ نہ دے دیا جائے؟" طارق نے پوچھا۔

"بالکل سر!" آصف نے زور زور سے سر ہلا کر جواب دیا۔

"تو پھر آصف! تم اس لڑکی سے شادی کرلو!" طارق نے عام سے لہجے میں کہہ کر بم پھوڑا۔

"جی؟" آصف کی حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔

"کیوں! تمہیں وہ اچھی نہیں لگتی؟" طارق نے سوال کیا۔

"یہ بات نہیں ہے سر!"

"وہ! میں برادری والا ہوں، میرے والد صاحب تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہماری اِس عمر میں بھی ا... کر دیتے ہیں، وہ کہاں مانیں گے اِس رشتے پر۔" آصف نے سچائی سے کہا۔

"میں صرف تم سے پوچھ رہا ہوں، کیا تم اس رشتے پر راضی ہو، تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں؟" طا... نے اُسے باقاعدہ گھیرا۔

"پلیز سر! میں کیسے... اُس سے؟" آصف بوکھلا گیا۔

"آئی وانٹ اونلی یور آنسر!" طارق نے انگلی اُٹھا کر کہا۔

"مجھے اِس رشتے پر اعتراض؟" آصف سوچ میں ڈوب گیا، دو گہری جھیل جیسی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملاتی اس کے سامنے لہرائیں۔

بس ایک پل لگا تھا فیصلہ کرنے میں۔

"جی مجھے اِس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔" جب جب ہم کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو اِس کے ساتھ ہوئے ہر خوف سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں، یہی کچھ آصف کے ساتھ ہوا۔

"آصف! آئی ریئلی پراؤڈ آف یو!" طارق نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر خود سے لگالیا۔

اگر میری کوئی کمٹ منٹ نہ ہوئی ہوتی تو میں بھی کسی ایسی ہی لڑکی کی زندگی کا سہارا بننا پسند کرتا طارق نے سچائی سے کہا۔ یہ اور بات تھی کہ طارق نے آج تک کسی کو نہ بتایا تھا کہ وہ ایک ایسی ہی لڑکی کا سہارا بن چکا ہے۔

"اٹس مین کہ آپ کسی سے کمیٹڈ ہیں۔" آصف نے شوخی سے پوچھا۔

"یس!"

نگی کے اصرار کے بعد طارق کا دل ویسے ہی ہر وقت پَر لگائے اُڑنے لگا تھا ہر وقت چھپا کر رکھے ہوئے جذبے کو طارق نے خوش دلی سے عیاں کیا۔

"کون ہے... خوش قسمت جو اِس پارس کی زندگی میں قدم رکھ رہی ہے۔" آصف نے بے حد عقیدت بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے دیکھا ہے اُسے!" آصف نے مسکرا کر کہا۔

"اگر میں غلط نہیں ہوں تو احمد شاہ فیملی کا یہ گوہر نایاب ہے، جو آپ کی آنکھوں کی روشنی بنا ہے۔" آصف کے ذہن میں نگی کا فکرمند چہرہ گھوم گیا۔ رات وہ طارق کی بہن کے ساتھ جاگی تھی۔

"بالکل درست!" طارق مسکرایا۔

"السلام علیکم لالہ!" سائرہ نگی اور روشن آرا بیگم کے ساتھ داخل ہوئی۔ طارق کے چہرے کے رنگ سے اگر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اُس کا دِل کس کے لیے دھڑکتا ہے۔

"چلیں جناب! اب گھر تشریف لے جانے کی تیاری کریں۔" سائرہ نے طارق کا پیک سامان آصف کو گاڑی میں رکھنے کے لیے دیتے ہوئے کہا۔

"میں خود بہت اُکتا چکا اِس ہسپتال سے۔" طارق نے بیزاری سے کہا۔

"حیرت ہے اتنی پیاری اور دِل پسند اٹینڈنٹ کے ہوتے ہوئے بھی ایسے بیانات دیے جارہے ہیں۔" سائرہ نے شوخی سے طارق کے پاس آکر سرگوشی کی۔

طارق کھل کر مسکرایا۔

"کیسے ہو بیٹا! کیسا محسوس کر رہے ہو؟" روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

"الحمدللہ! بے حد اچھا محسوس کر رہا ہوں۔" طارق نے جواب دیا۔

"تم گھر چلو، شہباز بھائی تمہاری صحت کی خوشی میں فنکشن کرنا چاہتے ہیں اس کے علاوہ بھی ایک گڈ نیوز تمہاری منتظر ہے۔" روشن آرا بیگم نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" طارق کو بے حد تجسس ہوا کیوں کہ روشن آرا آنٹی نے آج تک اس طرح کا سسپنس پھیلایا ہی نہ تھا۔

"ولی کا نکاح ہونے جارہا ہے۔" روشن آرا بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مطلب! ابھی تو ولی کا سمسٹر مکمل نہیں ہوا نا!" طارق نے پوچھا۔

"ہاں! لیکن انور بھائی کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ہمیں یہ فیصلہ لینا پڑا، عبدالولی اپنی ایگزامینیشن کے فوراً بعد آرہا ہے۔ تقریباً دو ہفتوں کے بعد! تو انشاء اللہ یہ کام بھی انجام بخیر پائے گا۔" روشن آرا بیگم کے چہرے پر بے حد خوشی نمایاں تھی۔

"واؤ! کتنا مزہ آئے گا..." سائرہ نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اس کی نگاہوں میں مسکان کا بے روح چہرہ گھوم گیا وہ تکلفاً بھی نہ مسکرا سکی۔

"مبارک ہو آنٹی آپ کو!!" طارق نے مسکرا کر اُن کو مبارک باد دی۔

"خیر مبارک بیٹا! اللہ تمہیں بھی دین و دنیا کی خوشیاں عطا فرمائے۔" روشن آرا بیگم نے حسبِ عادت دعا دی۔

"انور صاحب کو کیا ہوا؟" طارق نے پوچھا۔

"اُن کی طبیعت خراب ہوگئی تھی، اٹیک ہوا تھا۔" روشن آرا بیگم کا موڈ کوئی بات سوچ کر بے حد خراب ہوگیا۔

''ایک عاقبت نااندیش شخص کی وجہ سے دو گھرانوں کے تعلقات اور ایک شخص کی زندگی داؤ پر لگ گئی۔''

''اوہو!!

''چلیں اللہ کی ذات اُن پر اپنا کرم کرے اور اُن کو صحت زندگی عطا کرے، اللہ کی ذات جو کرتی ہے بہتر ہی کرتی ہے۔ شاید ولی کا نکاح اِسی طرح ایمرجنسی میں ہونا تھا۔'' طارق نے کہا۔

''ہاں بیٹا! ہم ارادے باندھتے ہیں، فیصلے کرتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے، جو اللہ رحمٰن کو منظور ہوتا ہے اس لیے ہمیں ہمیشہ اُس کی رضا پر راضی ہونا سیکھنا چاہیے کیوں کہ وہ جو کرتا ہے اُس میں بڑی مصلحت ہوتی ہے وہی ہم سب کے لیے بہترین ہوتا ہے۔'' روشن آرا بیگم نے بہت بڑی بات کہی تھی۔

''بالکل! آپ ٹھیک کہتی ہیں انسان تو ارادے ہی باندھتا رہ جاتا ہے۔'' طارق کی نگاہوں میں سحرش کا چہرہ گھوم گیا۔ کیا وہ سوچ سکتا تھا کہ سحرش بھی اُس کی زندگی کا اہم ترین حصہ بن سکتی ہے۔

طارق کو ایک دم سحرش یاد آئی۔ اس کو حیرت کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی تھا کہ وہ اتنے دِن کیسے اپنی ذمے داری سے لاپروا رہا۔ نگینہ کی موجودگی اُس کے پاس کسی روشنی کی طرح رہی تھی تب ہی تو سحرش کا جاگتا وجود پر چھائی بن گیا تھا۔ طارق کو ایک دم سحرش کا خیال آیا اور پھر بے چین کر گیا۔

''وہ لڑکی! جس کا سینٹر آف سرکل اینڈ لائف اُس کی خود کی ذات تھی، اُس کے بِنا سحرش کا کیا حال ہوگا۔''

طارق کے دل فوراً نے کہا کہ وہ اُڑ کر سحرش کے پاس پہنچ جائے، احساس جرم تھا کہ بے چینی بڑھاتا جا رہا تھا۔

''سائرہ! میں گھر جانے سے پہلے آفس کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔'' طارق نے آصف کے سہارے گاڑی کی جانب جاتے ہوئے ایک دم کہا۔

''کیا! پاگل ہوگئے ہیں لالہ! گھر میں ابو جی اتنی شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ویسے بھی ابھی آپ کی حالت نہیں ہے کہیں آنے جانے کی؟'' سائرہ نے بڑی بوڑھیوں کی طرح طارق کو ڈانٹا۔

''دادی امّاں! پلیز میری مجبوری سمجھو، میرا جانا بے حد ضروری ہے۔'' طارق نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''پھر میرے ساتھ یہ نوجوان ہے نا۔'' طارق نے آصف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا خیال رکھے گا، میں زیادہ وقت نہیں لگاؤں گا لیکن میرا جانا بے حد ضروری ہے۔'' طارق نے سائرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اور ابو؟'' سائرہ بے قراری سے بولی۔

''لو یہ بھی میں بتاؤں؟ میں اپنی پیاری سی گڑیا کو کیوں سمجھا رہا ہوں۔'' طارق نے یہ ذمے داری بھی سائرہ کے سر ڈال دی۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' نگینہ نے بھی پاس آ کر طارق سے پوچھا جو آصف کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' طارق نے نگینہ کا ہاتھ دبا کر اُسے تسلی دی۔

''لالہ! ابو بہت ناراض ہوں گے۔'' سائرہ نے کہا۔

''پلیز! میری پیاری بہنا! تم تھوڑی دیر کو سنبھال لینا۔'' طارق نے سائرہ کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔

''نگی! تم اور سائرہ گھر چلو، میں بھی بس آ رہا ہوں۔'' طارق نے مسکرا کر نگی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے!'' سائرہ نے طویل سانس بھرا۔

وہ جانتی تھی اُس کا بھائی اپنے کام کے معاملے میں بے حد کریزی ہے، وہ جائے بغیر نہیں مانے گا اس لیے اُس نے نہ چاہتے ہوئی بھی طارق کو جانے دیا۔ طارق کی نظریں مسلسل نگی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ آصف نے طارق کی نظروں کے محور کو دیکھا اور چپکے سے مسکرا دیا۔

''سر! ایسا کیا ضروری کام ہے، ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' آصف نے گاڑی کو احتیاط سے سڑک پر ڈالتے ہوئے طارق سے پوچھا۔

''آصف! ہم آفس نہیں جا رہے، مجھے کہیں اور جانا ہے بے حد ضروری کام ہے اس ایڈریس پر۔'' اس نے بِنا کسی بحث اور سوال کے گاڑی دوسرے راستے پر ڈال دی۔

طارق نے جیب سے موبائل نکالا اور اُسے آن کیا اتنے دن سے موبائل بند پڑا تھا، آج بھی اسے سائرہ ہی گھر سے چارج کر کے لائی تھی۔

''السلام علیکم آنٹی!'' طارق نے مؤدبانہ انداز سے کسی کو سلام کیا۔

''آنٹی! میں گھر جانے سے پہلے اِدھر سے چکر لگاتا جاؤں گا صرف دس منٹ کے لیے، اس لیے اُسے بتا دیجیے گا، میں یہاں رک نہیں پاؤں گا... گھر میں سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔''

''بس میں آ رہا ہوں کوئی سات آٹھ منٹ میں ...اوکے اللہ حافظ!'' طارق نے کسی کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔

اور جیسے ہی گاڑی آصف نے ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے روکی۔ چوکیدار نے گیٹ سے باہر منہ نکال کر اُن کو دیکھا پھر تیزی سے گیٹ کھول کر سلام کیا۔

آصف نے گاڑی بڑے سے پورچ میں لے جا کر کھڑی کی تو سامنے سے ایک لڑکی تیزی سے دوڑتی ہوئی اُن کی جانب بڑھی، آصف نے طارق کو سہارا دے کر باہر نکالا ہی تھا کہ وہ لڑکی سیدھی طارق کے سینے سے آ لگی اور اُس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''آپ! ٹھیک ہیں نا؟'' سحرش ہر ناراضی بھلائے بچوں کی طرح طارق سے لگی پوچھ رہی تھی جب کہ طارق اُسے تسلی دے رہا تھا اور ...اور آصف کی آنکھیں حیرت اور پریشانی سے پھٹ رہی تھیں۔

''میری نگی کے ساتھ کمٹمنٹ ہے۔'' طارق کا جملہ آصف کے کانوں میں گونجا۔

''یہ...؟'' آصف پوچھے بِنا نہ رہ سکا۔

وہ اُس لڑکی کو پہچان گیا تھا۔ آج سے تین سال پہلے انہوں نے اس لڑکی کو تقریباً مردہ حالت میں داخل اسپتال کیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سر! یہ وہی لڑکی تھی، جسے مارک کے گروہ نے بری طرح بے آبرو کر کے بُری حالت میں اُسے ا
ویرانے میں پھینک دیا تھا۔''

''یہ میری بیوی ہے آصف!'' طارق کے الفاظ تھے کہ بم! آصف تو پورا کا پورا ہل گیا۔

''کیا...؟'' آصف کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

''ہاں!'' طارق نے اقرار کیا۔

''لیکن یہ!'' آصف کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''اِس کی حالت عظمیٰ سے بُری تھی لیکن دیکھو یہ بھی زندگی کی طرف پلٹ آئی، اب تمہیں بھی اپنا کہا
نبھانا ہوگا۔'' طارق نے دھیرے دھیرے اُسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، اور اگر طارق منہ سے نہ بھی کہتا
تو آصف طارق کی آنکھوں سے سب پڑھ سکتا تھا۔

''یس سر! انشاء اللہ!'' آصف نے طارق کو یقین دہانی کروائی۔

آصف کی نظروں میں طارق کا مقام پہلے سے بھی زیادہ بلند ہوگیا تھا۔

❖❖○❖❖

''یہ کدھر کی تیاریاں ہیں بڑے بھائی!'' عبداللہ نے ولی کو پیکنگ کرتے دیکھ کر کہا۔

''پاکستان کی!'' ولی نے آج کی ہوئی شاپنگ کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

''ہیں! لیکن آپ کا سمسٹر ...اور ایگزیمینیشن اُس کا کیا ہوگا؟'' عبداللہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''وہ دے کر ہی جاؤں گا۔'' ولی نے نہایت اطمینان سے کہا۔ اپنے کالج میں اُسے پریشر میں کام
کرنے کی ٹریننگ تھی۔ لوڈ آف ورک کبھی اُس کی کوالٹی آف ورک پر فرق نہ ڈالتا تھا۔

''ویسے خیریت ہے، جو یوں پاکستان اچانک جا رہے ہیں؟'' عبداللہ نے ولی کے قریب بیٹھتے ہوئے
کہا۔

''ہاں! میرا نکاح ہے۔'' ولی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا، وہ جانتا تھا عبداللہ اتنی بڑی خبر چھپانے
پر ناراض ہو جائے گا۔

''آپ نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟'' عبداللہ نے ناراضی سے پوچھا۔

''یار! تم اپنے گھر کی شفٹنگ اور فیملی کو سیٹل کرنے میں مصروف تھے میں نے سوچا تم آ جاؤ گے تو
بتا دوں گا۔'' ولی نے سچائی سے کہا۔

''بہت بری بات ہے بڑے بھیا! میں آپ کو بڑا بھائی کہتا ہی نہیں سمجھتا بھی ہوں۔ آپ کی زندگی کی
اتنی بڑی خوشی اور آپ نے مجھے جھوٹے منہ بھی پاکستان چلنے کو نہیں کہا۔'' عبداللہ نے سچ مچ ناراض
ہوتے ہوئے کہا۔

ولی نے حیرت سے عبداللہ کو دیکھا۔ وہ واقعی ولی کے معاملے میں بہت سنجیدہ رہنے لگا تھا، پَل پَل اُس
کا خیال کرتا تھا، ولی جہاں ہوتا اُس کا پیچھا کرتا تھا۔

''تم! تم اگر میرے ساتھ پاکستان چلو گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔'' ولی نے اُس کے پاس آ کر
کہا۔

''میں تو تمہاری فیملی کمٹ منٹ کی وجہ سے تمہیں دعوت دینے سے رک گیا تھا۔'' یہ سچائی بھی تھی کیوں
عبداللہ نے ایک بار ولی کو بتایا تھا کہ اُس کے والدین پاکستان جانے سے کتراتے ہیں۔

''اگر آپ کہیں تو میں ضرور چلوں گا بلکہ میری خواہش بھی ہے کہ میں آپ کے ساتھ پاکستان
جاؤں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اور تمہاری فیملی؟'' عبدالولی نے سوال کیا۔

''ایک بار آپ امی اور پاپا سے مل لیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے آپ کے ساتھ پاکستان جانے
کی اجازت دے دیں گے۔'' عبداللہ نے بے حد یقین سے کہا۔

''اس لیے آپ فوراً میرے ساتھ گھر چلنے کی تیاری کریں میں تو ویسے بھی آج آپ کو ہی لینے آیا تھا
اس لیے کہ میں امی اور زہرہ کے سامنے آپ کا اس قدر ذکر کرتا ہوں کہ آج انہوں نے بے حد اصرار سے
مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ ڈنر ہم گھر میں ہی کریں گے۔'' عبداللہ کی یہ پرانی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ
اپنا پروگرام ترتیب دیتا اور دوسروں کو صرف اطلاع دینے آتا تھا۔

''یار! آج مجھے ڈارک روم میں بہت سارا کام کرنا ہے تم نے پہلے مجھ سے پوچھ لینا تھا۔'' ولی کہے بنا
نہ رہ سکا۔

''پہلے میں نے کبھی آپ سے پوچھا ہے؟'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ بے چاری لنڈا میرا انتظار کرتی رہے گی ہوسکتا ہے مجھے گالیاں بھی دیتی رہے، آج مجھے اُسی کے
ساتھ ڈارک روم میں کام کرنا تھا۔'' لنڈا، ولی کی گروپ فیلو تھی اور یہ اسائنمنٹ اُن کو اکٹھی کرنے کے
لیے ملی تھی۔

''آئے ہائے! چھوڑیں بھی، آپ کو کہاں صنف نازک کا خیال...اگر ہوتا تو شاید میں رعایت کر دیتا۔
ویسے یہ آپ کا اسٹائل ہے ٹائم دے کر نو لفٹ کرانا! تو اب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ بس آپ جلدی سے تیار
ہو جائیں وہاں والدہ حضور نے میرے والد کو سارے شہر کی سیر کروادی ہے ایشین سبزیاں اور مصالحے
تلاش کر لانے کے لیے۔ اگر ہم دیر سے پہنچے اور اُن کے کھانوں کو فوراً جا کر شرف قبولیت نہ بخشا تو میری
شامت آ جائے گی۔'' عبداللہ نے مسخرے پن سے کہا۔

''یار اتنی اچھی اردو بولتے ہو یقین ہی نہیں آتا کہ تم کبھی پاکستان نہیں گئے۔'' ولی نے تیار ہوتے
ہوئے کہا۔

''بڑے بھائی! آپ ہمارے گھر چل کر دیکھیں، آپ کو اس انگریز ملک میں مکئی کی روٹی اور سرسوں
کے ساگ کی اپنائیت نہ ملی تو میرا نام بدل دیجیے گا۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یار! میرا دل کر رہا ہے کہ آنٹی اور بہنا کے لیے کوئی تحفہ لے کر چلوں، تم بتاؤ اُن کو کیا پسند ہے؟''
ولی نے عبداللہ سے پوچھا۔

عبداللہ نے ایک دم چونک کر ولی کو دیکھا۔

''اوہو... فارمیلٹرز!'' عبداللہ نے کہا۔

''نہیں یار! سچ.. میں کچھ لے کر جانا چاہتا ہوں یہ میرے دِل کی خوشی ہے۔'' اُس نے عبداللہ سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو پھر آپ وہ کپڑے پہن جائیں جو پاکستان میں آپ نے پہنے ہوں لیکن اُن کی دھلائی نہ کی ہو۔ میری ماں کو اپنے وطن کی خوشبو اور مٹی سے عشق ہے، اُس کے لیے ہر پاکستانی کسی بھی پیر سے کم نہیں۔" عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

ولی نے غور سے عبداللہ کو دیکھا اور دھیمے سے مسکرا دیا اور اپنے کمرے سے ایک پینٹنگ اُٹھا لایا۔ دراصل اُس کے زمانہ طالب علمی کی تھی، اُس نے اس پر کلچرل کمپوزیشن پن اینڈ انک سے بنائی تھی۔ یہ ایک گاؤں کے گھر کا منظر تھا جس کے پس منظر میں کھیت اور کچے گھر تھے جس کے فرنٹ پر کھلا صحن تھا۔ ایک بوڑھی ماں گندم صاف کر رہی تھی جب کہ چارپائی پر ایک آدمی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور اُس کی بیوی اسے رنگین پنکھا جھل رہی تھی، چارپائی پر ہی اُن کا گود کا بچہ بیٹھا تھا۔ نیچے اسٹیل کا گلاس رکھا تھا۔ صحن کے ایک حصے میں مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں کمپوزیشن میں ہلکی سی جھلک بکری اور بھینس کی بھی تھی اور اُن کی ایڈیشن ہاف میں تھی جو کمپوزیشن کو مزید خوب صورت بنا رہی تھی۔ اس کمپوزیشن کو ولی نے اس خوب صورتی سے پورٹریٹ کیا تھا کہ ایک ہی منظر میں کتنے ہی منظر بول رہے تھے یہ اُس کی بہترین پینٹنگ تھی جس پر اُسے پرائز بھی ملا تھا، اس پینٹنگ کی ٹرانسپرنسی ایک بینک نے خرید کر اپنی ڈائری اور کیلنڈر میں استعمال کی تھی۔

"یہ میرے پاکستان کا ایک گھر ہے، یہ میں آنٹی کو گفٹ کروں گا۔ یہ وہ پینٹنگ ہے جس کو اور بھی میں کئی لوگ خریدنا چاہتے تھے لیکن میں نے اسے بہت دل سے بنایا تھا اس لیے میں نے ٹرانسپرنسی سیل کر دیں لیکن اوریجنل کو سیل نہ کر سکا۔ آج مجھے لگا کہ اس کی اصل حق دار وہ عورت ہے جو رہتی پردیس میں ہے لیکن جیتی وہ اپنے ہی دیس میں ہے۔" ولی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آئی ہوپ یہ اُن کو پسند آئے گی۔" ولی نے کہا۔

"یقیناً! ٹرسٹ می! اِٹس ریئلی اے بیوٹی فل گفٹ!" عبداللہ نے ولی کا ہاتھ دبا کر اُسے یقین کروائی۔

❖❖❖○❖❖❖

"آپ ٹھیک نہیں ہوں گے تو ہم سب بیمار پڑ جائیں گے خدارا جلدی ٹھیک ہو کر گھر آ جائیں اب سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہے۔" حسن آرا بیگم نے انور صاحب سے کہا۔

"حسن آرا! جانے کیوں دل کو قرار نہیں آ رہا..." انور صاحب نے اپنے سینے کو مسلتے ہوئے کہا۔

"ناشکری نہ کریں۔ اُس مولا نے سارے ہی کام سنوار دیے ہیں۔" حسن آرا بیگم نے انور صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"خدا کی ذات مجھے معاف فرما دے اور مجھے اپنے شکر گزار بندوں میں سے کر دے میں خوش ہوتا ہوں پر خوشی اندر سے پھوٹتی ہی نہیں، یوں جیسے دل کی زمین بنجر پڑ گئی ہو۔" انور صاحب نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ وہم نہ پالیں اور خود کو پرسکون رکھیں انشاءاللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" حسن آرا نے انور صاحب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

برسوں کی رفاقت میں کبھی حسن آرا گاڑی کا رواں پہیہ نہ بن پائیں اور کبھی انور صاحب! زندگی کی گاڑی ٹھیک سے چل نہ پائی تھی، بہت بار حسن آرا نے اکیلے ہی تکلیف کو جھیلا تھا۔ رفیق زندگی کا سکھ وہ کبھی نہ پا سکی تھیں لیکن آج! آج دونوں پہیے ایک دوسرے کی رمزوں کو جان کر چل رہے ہیں تو مشکل لمحوں میں بھی حسن آرا کا حوصلہ بلند تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک کڑی آزمائش اور دھوپ کے بعد سایہ دے ڈالا تھا اور اب اُن کو زندگی کے دکھ بھی دکھ نہ لگتے تھے۔

"اللہ کرے جیسا تم کہتی ہو ویسا ہی ہو جائے۔" انور صاحب نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے دعائیہ انداز میں کہا۔

لیکن جانے کیوں اُن کی چھٹی حس کے ریڈار پر سگنل اچھے نہ آ رہے تھے۔

❖❖❖○❖❖❖

"کمال ہے امی! آپ ابھی تک کچن میں ہوئی ہیں۔" زہرہ نے تیار ہو کر ماں کو تلاش کیا تو وہ اُس کو ابھی کچن میں کھڑی نظر آئیں۔

"بس ہو گیا۔" انہوں نے گاجر کے حلوے کو ڈونگے میں نکال کر اُس پر پستے بادام کی ہوائیاں ڈال کر زہرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کوئی اچھا سا سوٹ پہن لیتیں۔" انہوں نے زہرہ کو بلیک فل سلیو ٹاپ اور بلیک لانگ اسکرٹ جو ٹخنوں تک آتا تھا اور بلیک ہی اسکارف لیے دیکھ کر کہا۔

"امی! آپ بھی کمال کرتی ہیں، وہ عبداللہ کا دوست ہے، کوئی لڑکی تھوڑی ہے جو ڈریسنگ وغیرہ دیکھے گی۔" زہرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ پاکستان سے آیا ہے۔" انہوں نے بہت عقیدت سے کہا۔ پاکستان اور پاکستانی اُن کے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔

"اوکے امی! پر اب دیر بہت ہو گئی! آپ بھی جلدی جلدی تیار ہو جائیں۔" زہرہ نے ان کو ان کے کمرے کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ اُسی پل باہر بیل ہوئی۔

"میرا خیال ہے بھائی آ گئے۔ آپ بھی جلدی جلدی تیار ہو کر آ جائیں۔" زہرہ نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا جب کہ امی سر ہلاتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

"السلام علیکم!" زہرہ نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔ وہ Spy eye سے پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ باہر عبداللہ کھڑا ہے اسی لیے اُس نے بلا جھجک دروازہ کھول دیا۔

"وعلیکم السلام!" عبداللہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بونے بھائی! یہ میری آپی ہیں زہرہ بی بی! ویسے اِن میں کوئی اچھا پن ہے نہیں، اگر کوئی بات برداشت نہ ہو تو... اللہ توبہ اِن کے ہاتھ ہیں بہت بھاری! محترمہ ڈاکٹر بن رہی ہیں، والد صاحب کے نقش قدم پر چل رہی ہیں اور ان کے میاں بھی ڈاکٹر ہیں، لیکن ابھی تک وہ ان کے عتاب سے بچے ہوئے ہیں اس لیے کہ رخصتی ڈگری کے بعد ہو گی۔" عبداللہ نے وہیں کھڑے کھڑے تعارف کروایا۔

جواباً زہرہ نے اُس کی کمر پر ایک دھول جمائی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہائے مرگیا۔'' عبداللہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

''دیکھا بڑے بھائی! آپی کے فن کا مظاہرہ!''

''تم بھائی کو دروازے پر ہی کھڑے رکھو گے کہ اُن کو اندر بھی آنے دو گے؟'' زہرہ نے اُس کی غلطی کی طرف نشان دہی کروائی کہ وہ Excitment میں مہمان کو اندر بھی نہ لایا تھا۔

''کیسی ہیں آپی آپ؟'' ولی نے سلام کے بعد زہرہ کی خیریت دریافت کی۔

''شکر الحمدللہ! آپ ٹھیک سے بیٹھو بھائی۔'' زہرہ نے ولی کو ٹھیک سے بیٹھنے کو کہا۔

''عبداللہ آپ سب کا اس قدر ذکر کرتا ہے کہ میرا بہت دل کرتا تھا آپ سے ملنے کو۔'' ولی نے سچائی سے کہا۔

''ارے جناب! آپ سے زیادہ تو میری امی بے قرار ہو رہی تھیں آپ سے ملنے کے لیے۔'' زہرہ نے گرم گرم کافی کے مگ اُن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''کافی امی تیار کر گئی تھیں اس لیے جناب جھٹ پٹ کافی حاضر ہے۔'' زہرہ نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپی! امی اور پاپا کدھر ہیں؟'' عبداللہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''پاپا کو تو ہسپتال سے ایمرجنسی کال آ گئی تھی، اس لیے اُن کو فوراً جانا پڑا لیکن ڈونٹ وری، وہ ڈنر پر ضرور جوائن کریں گے۔'' زہرہ نے کہا۔

''اور امی تو آتی ہی ہوں گی وہ ذرا چینج کرنے گئی ہیں یہ کیا ہے ولی بھائی؟'' زہرہ نے ایک بڑی پیکنگ میں لپٹی پینٹنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میں آنٹی کے لیے لایا ہوں، مجھے یقین ہے کہ یہ ان کو پسند بھی آئے گی اور اُن کے دل کو چھوئے گی کیوں کہ جب میں اس کو پینٹ کر رہا تھا تو میری اپنی بھی کچھ ایسی فیلنگز تھیں۔'' ولی نے کہا۔

''گڈ! چلیں امی آئیں گی تو وہ ہی کھولیں گی۔'' باوجود بے حد اشتیاق کے زہرہ نے صبر کیا۔

''لیں امی بھی آ گئیں۔'' زہرہ نے ولی کے پیچھے سے آتی امی کی جانب اشارہ کیا۔

جیسے ہی ولی اُن کو سلام کرنے کے لیے پلٹا امی کے پاؤں ایک دم زمین سے اکھڑے اور وہ لڑکھڑا گئیں۔

''لالہ! عبداللہ بھائی؟'' وہ بے اختیار بولی تھیں۔

''یا میرے اللہ! یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟'' وہ بولیں، اُن کے چہرے کے تاثرات سے وہ پریشان کر گئے، خود ولی بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

''وہی قد، وہی جسم، وہی رنگت اور وہی آنکھیں! میرے مولا یہ کیسا معجزہ ہے؟'' وہ دل ہی دل میں بولیں۔

اُن کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

''یہ؟'' امی نے ولی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی تو میرے بڑے بھیا ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''کیا نام ہے بیٹا تمہارا؟'' اُن کی آواز گہرے کنویں سے آئی تھی۔ آج تک وہ عبداللہ کے منہ سے بڑے بھیا کا ذکر سنتی آئی تھیں، عبداللہ نے نام اُن کے سامنے بھی نہ بتایا تھا۔

''جی میرا نام عبدالولی ہے۔'' ولی نے نام بتایا۔

''عبد..عبدالولی!'' امی نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے دہرایا۔

''جی!'' ولی نے عبداللہ کی والدہ کی عجیب و غریب حالت دیکھ کر پریشانی سے کہا۔

''تمہاری ایک بہن بھی ہے نا؟'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ہاں جی!'' ولی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ن..نگینہ ہے نا اُس کا نام؟'' انہوں نے دِل تھام کر پوچھا۔

''جی!'' اب چونکنے کی باری ولی کی تھی کہ وہ نگینہ کو بائے نیم کیسے جانتی تھیں۔

''یا میرے اللہ! اب تو کسی شک کی گنجائش نہ تھی۔'' اُن کے دل کو ایک دم دُکھ اور خوشی کی شدت نے گھیرا جو اُن کا دل برداشت نہ کر سکا۔

''عبدالولی!!

نگینہ!!

سید عبداللہ! میرا بھائی!'' وہ ایک دم سے لہرائی اگر ولی اُن کو بڑھ کر تھام نہ لیتا تو وہ یقیناً زمین پر گر جاتیں۔

''امی! امی کیا ہوا؟'' زہرہ پریشانی سے آگے بڑھ کر ماں کو دیکھنے لگی۔

''عبداللہ دوڑ کر اندر سے میرا بی پی آپریٹس لاؤ۔'' زہرہ نے پریشانی سے کہا۔

عبداللہ اندر کی جانب دوڑا جب کہ ولی حیران و پریشان اُن کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں یہ نقش جانے پہچانے لگے تھے۔ اتنے جانے پہچانے جیسے، وہ اُن کے بہت قریب رہ چکا ہو۔

''کون ہیں یہ؟'' ولی نے دوبارہ اُن کو دیکھتے ہوئے اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے خود ہی سے سوال کیا۔

❖❖◯❖❖

''جی! کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟'' احمد شاہ نے مہمان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

اتنے رکھ رکھاؤ والا انسان اور چہرے پر بے حد رعب موجود تھا۔ احمد شاہ نے پہلی نظر میں ہی جائزہ لیا۔

''جاننے کے لیے جناب ایک دوسرے کے قریب آنا پڑتا ہے، ہم بھی آپ کے قریب آنا چاہتے تھے۔'' مہمان نے مسکرا کر کہا۔

''معاف کیجیے گا میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا، دوسری معذرت اس لیے بھی ہے کہ میں بے حد مصروف ہوں اب سے کچھ دیر بعد میری بہت ضروری میٹنگ ہے۔'' احمد شاہ نے ساتھ ہی معذرت کر لی۔

''میں بھی آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، میں مسکان کا باپ ہوں، یہ وہ لڑکی ہے، جسے آپ کے بیٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے پہلے محبت بھرے خواب دکھائے اور پھر کسی اور لڑکی طرف چلا گیا، آج میری بیٹی نہ زندوں میں نہ مُردوں میں اور اُس کا ذمے دار صرف اور صرف آپ کا بیٹا ہے۔'' سید سرفراز علی نے وہ پتّا استعمال کیا جو تھا تو حقیقت لیکن استعمال ایسے کیا تھا کہ وہ اُن کے حق میں چلا گیا۔

انہوں نے مسکان کی ساری حالت کا ذمے دار ولی کو ٹھہرا دیا۔

احمد شاہ کا سارا خون چہرے پر آن جما تھا۔

''میرا بیٹا ایسا بالکل نہیں ہے، وہ ایسا بیٹا ہے، جس کی قسم میں فخر سے کھا سکتا ہوں میں نہیں مانتا میرے بیٹے نے کوئی ایسا قدم اِٹھایا ہو۔'' احمد شاہ کے لہجے میں بے حد اعتماد تھا۔

''اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو چلیں میں آپ کو ایک زندہ لاش سے ملواتا ہوں، پھر اِس سار معاملے کی گواہ آپ کے ہی دوست کی بیٹی سائرہ ہے جو مسکان کی بھی بہترین دوست ہے۔'' سید سر نے اتنے اعتماد سے کہا تھا کہ احمد شاہ کو اپنا اعتماد ڈگمگاتا محسوس ہوا۔

''میں بیٹی کا باپ ہوں، مجبوری میری قسمت ہے لیکن کیا ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کا حق آپ بیٹے کو دے دینا چاہیے؟'' سرفراز علی نے مزید ضرب لگائی۔

احمد شاہ کا چہرہ پھیکا پڑنے لگا اُن کا دل ماننے کو تیار ہی نہ تھا کہ ولی ایسی بھی کوئی حرکت کر سکتا ہے۔

''اگر یہ بات غلط نکلی تو؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''نہیں نکلے گی آپ اپنے بیٹے سے پوچھ لیجیے۔'' سید سرفراز نے اطمینان سے کہا۔

''میری مجبوری تو مجھے آپ کے گھر بھی لے گئی تھی، میں آپ سے آپ کے بیٹے ولی کا رشتہ اپن مسکان سرفراز علی کے لیے مانگتا ہوں امید ہے ایک مجبور باپ کی مجبوری کو آپ سمجھیں گے۔'' سید سر علی نے بہت درد سے کہا۔

''میں معافی چاہتا ہوں جناب! جو ہوا وہ میرا دِل ماننے کو تیار نہیں اور اگر ہوا بھی ہے تو بھی میں ہوں۔ عبدالولی کا اگلے ہفتے نکاح ہے اور میں اس رشتے کو توڑ نہیں سکتا۔'' احمد شاہ نے صاف لفظوں سرفراز علی سے معذرت کر لی۔

''آپ کو وہ رشتہ توڑنا ہوگا۔'' سرفراز علی نے غصّے سے اِٹھتے ہوئے اصرار سے کہا۔

''سوری جناب! یہ نہیں ہو سکتا۔'' احمد شاہ نے اٹل اور بردبار لہجے میں کہا، جو سید سرفراز علی کو آ لگا گیا۔

''شادی تو عبدالولی کی مسکان کے ساتھ ہی ہوگی آپ نہیں جانتے میں کون ہوں؟ میرا نام سید سر ملی ہے اور ...اور مُسکان میری بیٹی ہے، آپ میرے دیئے رشتے کو رَد نہیں کر سکتے۔'' سید سرفراز علی ہانپتے ہوئے کہا۔

''سید سرفراز علی صاحب! یہ میرا آفس ہے اور میں آپ کو اس طرح اونچا بولنے کی اجازت ہرگز نہ دوں گا۔'' احمد شاہ نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''اور ہاں! ولی کی شادی علیزے سے ہی ہوگی، ہماری طرف سے آپ کو معذرت ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں کیسے ولی کی شادی کہیں اور ہوتی ہے آپ ابھی سید سرفراز علی کو نہیں جانتے۔''

السلیوزمی! مجھے میٹنگ میں جانا ہے۔'' احمد شاہ نے اپنے ضبط کی حد پر جاتے ہوئے نہایت تحمل یا۔

اگلے ہفتے میں سات دن ہیں اور سات دن میں بھی آپ کو دیتا ہوں، اگر آپ نے ہمارا رشتہ قبول نتائج کے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔'' سید سرفراز علی دھمکی دے کر دھپ دھپ پاؤں مارتا باہر یا جب کہ احمد شاہ ماتھے پر بل ڈال کر اُسے جاتے دیکھتے رہے۔

'ہونہہ!'' احمد شاہ کو شاید زندگی میں پہلی بار غصہ آیا تھا۔

''لی کی شادی صرف علیزے سے ہوگی۔'' انہوں نے بے حد اٹل لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''امی جان! کیسی ہیں آپ؟'' عبداللہ نے جھک کر پوچھا۔

وہ ساری رات نیم بے ہوشی میں بھول بھلیوں میں گھومتی رہیں، اُن کا ماضی بھی تو بھول بھلیاں تھا جس میں وہ گم ہو جاتیں تو باہر آنے کو راستا نہیں ملتا تھا۔ بار بار وہ مختلف ناموں کو پکارتی اور بلاتی تھیں۔ یہ الفاظ اِس قدر واضح تھے کہ پاس بیٹھا ولی بھی بار بار چونک کر اُن کو دیکھتا رہا۔

''امی! پلیز آنکھیں کھولیں اور بتائیں آپ کیسی ہیں آپ نے تو ہمیں ڈرا کر رکھ دیا۔ پلیز کچھ بولیں۔'' زہرہ نے اُن کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ بند آنکھوں سے مسلسل روئے جارہی تھیں۔

ولی نے بے حد بے چینی سے پہلو بدلا، اُس کی ذات کسی کے لیے آزار کا باعث بنی، یہ بات اس کے لیے بے حد تکلیف کا باعث تھی۔

''امی! دیکھیں میں اور آپی دونوں آپ کے قریب ہیں، بتائیں آخر کیا بات ہوئی؟''

''ولی! کیا عبدالولی چلا گیا؟'' وہ ایک دم تڑپ کر اُٹھیں۔

''امی پلیز ریلیکس! ولی اِدھر ہی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ دیکھیں۔'' زہرہ نے ولی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''دیکھیں آپ کی طبیعت کی وجہ سے وہ بھی کتنا پریشان کھڑا ہے۔'' زہرہ نے ماں کو محبت اور احتیاط سے تھام کر دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا۔ امی نے ہاتھ کے اشارے سے ولی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھا۔

پھر وہی ایک دم ان کے رویے پر حیران نہیں ہوا بلکہ وہاں موجود عبداللہ اور زہرہ کے لیے بھی یہ حیران کن تھا۔ امی ولی کو سینے سے لگائے زار زار رو رہی تھیں، اُسے بے اختیار چوم رہی تھیں۔

''میرا بچہ! میرا عبدالولی، میرے بھائی کی نشانی!'' اُن کے منہ سے نکلنے والے الفاظ ولی کے ساتھ ساتھ سب ہی کو چونکا رہے تھے۔

''آپ؟'' ولی نے بے اختیار سوال کیا۔

''میں تیری پھوپو! تیری پھوپو ہوں بیٹا!'' ان کا یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔

''پھوپو! میری! لیکن بابا نے تو بتایا تھا کہ وہ اکلوتے بیٹے تھے۔'' ولی نے پُرسوچ انداز میں با آواز کہا۔

''نہیں بیٹا! ہمارے بھائی اکلوتے ضرور تھے لیکن اُن کی دو بہنیں تھیں۔'' عبداللہ کی امی سانس لینے کو رکیں۔

''ہم بد قسمت اُن کی دو بہنیں تھیں سدرہ بی بی اور مریم بی بی! جو اُن کی خوشیوں اور بنی بنائی دنیا کو کھا گئیں!'' عبداللہ کی امی نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کہا۔

''دو بہنیں؟ کمال ہے بابا جان نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔'' ولی نے حیرت سے سوچا۔

''میں پاکستان جاؤں گا تو بابا سے ضرور پوچھوں گا!'' ولی نے اُن کے سینے سے لگتے ہوئے کہا۔

''بابا؟'' اس بار چونکنے کی باری اُن کی تھی۔

''عبداللہ بھائی اور عائشہ بھابی کو تو زندہ جلا دیا گیا تھا پھر یہ کس کی بات کر رہا ہے؟'' وہ سوچے بنا نہ رہ سکیں۔

اسی پل باہر گاڑی کا ہارن بجا۔

''پاپا آگئے۔''

''پلیز امی! یہ ملکہ جذبات بن کر جو آپ اپنی ہر بار طبیعت خراب کر لیتی ہیں اس کو پاپا کے سامنے کنٹرول میں رکھیے گا۔ وہ چھ گھنٹوں پر مشتمل اتنا بڑا آپریشن کر کے آرہے ہیں بے حد تھکے ہوئے ہوں گے، آپ کی طبیعت بگڑی دیکھ کر وہ پریشان ہو جائیں گے۔ سو پلیز بی اے گڈ بے بی۔'' زہرہ نے ماں کے آنسو صاف کرتے ہوئے اُن سے نارمل رہنے کی گزارش کی۔

عبداللہ کے ساتھ جو شخص کمرے میں داخل ہوا، وہ بے حد خوبرو تھا۔ عبداللہ تو اُن کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔

''واقعی عبداللہ کے پاپا بے حد گریس فل ہیں۔'' ولی کے دماغ میں پہلی بات یہ آئی۔

''السلام علیکم! آج صبح صبح ہمارے کمرے میں دھاوا بول رکھا ہے خیر ہے؟'' عبداللہ کے پاپا نے زہرہ کو اپنے کمرے میں پا کر ہلکے پھلکے انداز میں استفسار کیا۔

''جی پاپا! بالکل خیریت ہے۔'' زہرہ نے جواب دیا۔

اُسی پل اُن کی نگاہ کمرے میں موجود ایک اور شخص پر پڑی، وہ گنگ رہ گئے۔

''یا میرے اللہ!'' وہ حیرت سے ولی کو دیکھے جارہے تھے۔ سامنے کھڑا لڑکا ہو بہو سید عبداللہ کی کاربن کاپی تھا اُن کے دل کی حالت تو مختلف ہونی ہی تھی۔

''پاپا! یہ میرے وہی دوست ہیں، جن کو میں اپنا بڑا بھائی مانتا ہوں۔'' اُن کی حالت بھی اپنی بیوی سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

''تم! آپ سید عبداللہ کے ہی بیٹے ہو نا۔'' وہ دھیمے لہجے میں پوچھ رہے تھے ایسے کہ اُن کی آواز کنویں سے آرہی تھی۔

''نہیں! میرے بابا سائیں کا نام احمد شاہ ہے اور میرے دادا کا نام عمر شاہ تھا۔'' ولی کو محسوس ہوا کہ اُسے ان لوگوں کی وہ غلط فہمی ختم کرنی چاہیے، جو کسی مشابہت کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔

''احمد شاہ؟'' عبداللہ کی امی نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں،نہیں! تم میرے بھائی کے بیٹے ہو، میرا دل کہتا ہے اور دل ہمیشہ سچی گواہی دیتا ہے۔''

''یا خدا... اس قدر کسی میں کیسے مشابہت ہوسکتی ہے؟'' عبداللہ کے پاپا نے حیرت سے دل ہی میں کہا۔

انہوں نے ایک بار پھر ولی کا بھرپور جائزہ لیا لیکن اُن کو تو بس یہی لگ رہا تھا کہ سامنے اُن کا دو سید عبداللہ ہی کھڑا ہے۔

''فیصل! یہ ہمارا ولی ہی ہے نا؟'' اُن کی بیوی نے اُن سے تائید چاہی۔

''دل تو یہ ہی کہتا ہے۔'' وہ دھیمے سے بولے۔

ولی نے نہایت بے چینی سے پہلو بدلا۔ خود عبداللہ اپنی جگہ پریشان تھا کہ اُن کے ماں باپ اس طر کا ہی ہیو کیوں کررہے ہیں؟

''ولی بھائی! میں بہت شرمندہ ہوں، ہم نے بلایا تو آپ کو ڈنر پر تھا لیکن صورتِ حال ایک دم چینج ہوگئی۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ساری رات بے آرام رہے۔'' زہرہ نے ولی سے معذرت کی۔

''مجھے اجازت دیں آنٹی، انکل! انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی میں شرمندہ ہوں کہ کسی غلط فہمی کی وجہ آپ سب کو دقت کا سامنا کرنا پڑا۔'' ولی نے جانے اجازت چاہی۔

''فیصل! اُسے روکیں یہ کہاں جارہا ہے؟'' عبداللہ کی امی تڑپ کر بیڈ سے اُتریں۔

''امی پلیز! یہ کیا کررہی ہیں؟'' زہرہ نے اُن کو کندھوں سے تھاما۔

''وہ ہمارا مہمان ہے، دیکھیں آپ نے اُسے کتنا تنگ کیا ہے وہ کیا سوچے گا؟'' زہرہ نے اُن سمجھاتے ہوئے کہا۔

''زہرہ! اِسے جانے نہ دو، یہ میرا عبدالولی ہے۔'' وہ تڑپ کر بے قراری سے بولیں۔

ڈاکٹر فیصل گم صم بس سب کو دیکھ رہے تھے اَن جانے میں ماضی کے زخم اُدھڑ گئے تھے۔

''میں کہیں نہیں جارہا، ابھی آسٹریلیا میں ہی ہوں آپ سے دوبارہ ملنے آؤں گا۔ آپ آرام کریں ا طرح آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔'' ولی نے اُن کے ہاتھوں پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ اُس کا ہا چھوڑنے پر تیار نہ تھیں لیکن زہرہ نے اُن کو الگ کرکے دوبارہ لیٹنے پر مجبور کیا اور اُن کو جوس کے ساتھ کی گولی دے دی تھی۔

عبداللہ، ولی کو لیے باہر آیا۔

''سوری بڑے بھیا! سوری فار ان کنوینس۔''

''اٹس او کے یار! کبھی کبھی ہمارے ساتھ ہماری زندگیوں میں وہ بھی شامل ہوجاتا ہے جس کو ہم ا نہیں کرتے، جن کو ہم پلان نہیں کرتے اور اگر یہ ہمارے سامنے آجائیں تو منہ نہیں بنانا چاہیے۔'' ا نے اُسے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، تب کہیں جاکر عبداللہ کے چہرے کے تاثرات دُرست ہوئے۔

''خدا حافظ۔'' وہ کہہ کر باہر نکل آیا۔

لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے جب وہ پیدل ہی سڑک پر نکلا تو گھر کی اوپر والی منزل ـ ایک کھڑکی کھلی، کسی نے بے حد اُداس نظروں سے اُسے جاتے دیکھا۔ جب تک وہ دور جاتے جا

ـلا کی طرح غائب نہ ہوگیا وہ اُسے دیکھتے رہے وہ بہت تھکے ہوئے تھے لیکن اُن کو نیند نہیں آرہی ـی، وہ تھک کر ایزی چیئر پر جا بیٹھے، انہوں نے ماضی کی یادوں کے سامنے سرنڈر کردیا تھا وہ اُن ـ دور بھاگتے بھاگتے اب تھک گئے تھے پھر ایک دم اُن کے کمرے میں جہاں روشنی نہ تھی شعاعوں ـا طرح روشنی بھر گئی اس روشنی کے ساتھ بہت سارے منظر یوں چلنے لگے جیسے پروجیکٹر پر فلم چلتی ـ۔ انہوں نے دھندلی آنکھوں سے آنسو صاف کیے تو منظر واضح ہوتے چلے گئے۔ یہ منظر اُن کے ـر کا تھا۔

''دیکھ فیصل! مجھے تو رانی بہت پسند ہے بڑی پیاری بچی ہے!'' ماسی صابراں نے فیصل کے سامنے بھنا ـشت اور ساتھ گھی سے چپڑی روٹی رکھی۔ آج اس نے اپنی سب سے عزیز مرغی حلال کرکے بیٹے کے ـ خاص طور پر بھنا گوشت بنایا تھا، یہ اُس کی محبت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔

''اماں پلیز!'' فیصل اِس موضوع پر بات نہ کرنا چاہ رہا تھا۔

''یہ پولیس پولیس ماں کو کیوں سنا رہا ہے اِس معاملے میں بھلا پولیس کہاں سے آگئی؟'' ماسی صابراں ـ معصومیت سے کہا۔ فیصل جو اِس موضوع پر بُرا سا منہ بنا کر بیٹھا تھا ایک دم مسکرا دیا۔

''اوہ میری بھولی پیاری ماں! میں پولیس نہیں پلیز کہہ رہا ہوں جس کا مطلب ہے اے میری پیاری ـاں ''براہِ مہربانی'' ابھی شادی کا موضوع نہ چھیڑیں، میں ہسپتال کے کام میں بے حد مصروف ہوں، ـی تو ہسپتال کی عمارت تیار ہورہی ہے تو اِس قدر مصروفیت ہے پھر اُس کے لیے مشینری اور عملے کا ـظام بھی کرنا ہے یہ ساری ذمّے داری سید عبداللہ نے مجھ پر ڈال دی ہے، اگر وہ شخص معاشی اور اخلاقی ـور پر میرا اِس قدر ساتھ دے رہا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ میں پوری ایمان داری اور توجہ سے اِس کام ـمل کروں۔''

''لیکن پُتر! میں تو صرف رشتے کی بات کررہی ہوں بیاہ تو پھر سال چھ مہینے بعد سہی۔'' ماسی صابراں کو ـلے کا بار بار اِس موضوع سے جان چھڑانا فکرمند کررہا تھا۔

''لتاں! مجھے کچھ سال شادی نہیں کرنی۔'' فیصل نے آخر دوٹوک جواب دے دیا۔

''لیکن کیوں! اگلے سال تُو پورے انتیس کا ہوجائے گا یعنی بلقیس کے پتر جتنا، جس کا پہلا بیٹا پانچویں ـں پڑھتا ہے، نہ پتر! میں نے اب تجھے بڈھا کرکے نہیں بیاہنا، لوگوں کے بیٹوں کے ہاں بچے بھی آگئے ـر تو ابھی تک کنوارا کا کنوارا ہی پھر رہا ہے۔''

''اماں! آپ کو پتا ہے کہ باہر کے ممالک میں چالیس سال شادی کے لیے بہترین عمر سمجھی جاتی ـہے۔'' فیصل کی بات نے ماسی صابراں کو دہلا کر رکھ دیا۔

''ہائے ربا!''

''نہ پُتر! اِس عمر میں تو بندہ اپنے بچے بیاہنے کی سوچتا ہے توبہ توبہ انگریز بڈھے ہوکر شادی کرتے ہیں ـم کو نہیں کرنی، اُن کی رِیس (نقل) میں تو تیری شادی جلد از جلد کردوں گی۔ اگر تو باہر پڑھنے نہ جاتا تو ـں ضرور تیرا بیاہ وقت پر کردیتی۔'' ماسی صابراں نے یوں کہا، جیسے بہت سارا وقت گزر گیا ہو۔

''اماں! مہربانی کریں، اب بس کریں میں سکون سے کھانا کھالوں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کھا پتر! رج رج کھا لیکن... یہ تیرے بیاہ کا معاملہ میں نئیں ٹالنے والی۔'' ماسی صابراں کے ارادہ خطرناک حد تک اٹل تھے۔ فیصل نے شدت سے محسوس کیا۔

''لمّاں! آپ قیصر بھائی کی شادی پہلے کردیں۔'' فیصل نے اپنی جان چھڑانے کے لیے قیصر کا ا کردیا۔

''لو بھلا! میں اُس کی شادی پہلے کیسے کردوں؟ ٹھیک ہے وہ صرف دو سال تم سے چھوٹا ہے پھر شادی کی باری پہلے تمہاری ہے۔'' ماسی صابراں نے پریشانی سے بیٹے کو دیکھا جو بالکل اُلٹ پلٹ کر تھا۔

''کبھی بھلا چھوٹوں سے بھی شادیاں شروع ہوئی ہیں؟'' وہ معصوم عورت حیرت سے بیٹے کی با سوچ رہی تھی۔

''لمّاں! تم باریوں کا انتظار نہ کرو بلکہ سب سے پہلے نفیسہ کی شادی کرو۔'' فیصل کو نئی سوجھی۔

''باہر سے پڑھ کر آیا ہے جانتی ہوں میں، لیکن یہ پٹی مجھے نہ پڑھا۔'' ماسی صابراں کو فیصل کا آ ذرا نہ پسند آیا۔

''بس مجھے رانی پسند ہے! اگر تجھے کوئی اور کُوی پسند ہے تو بتا ورنہ میں رانی سے تیرا رشتہ پکا کر گی۔'' ماسی صابراں کی دھمکی پر فیصل پہلی بار گڑبڑا گیا۔

''فیصل پتر! اپنی ماں کی دھمکیوں کو ایویں نہ سمجھنا یہ جو کہتی ہے وہ کردیتی ہے اور بندہ اس کے د دلیے پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔'' فیصل کے بابا جو دوسری چارپائی پر لیٹے ماں بیٹے کی گ خاموشی سے سن رہے تھے بیچ میں لقمہ دے کر فیصل کو ڈرادیا۔

''وہ جو محلوں میں رہنے والی رانی ہے، میرے دِل میں آن بسی ہے، اُس کے بعد تو کسی اور کا تصور ا ممکن نہیں ہے۔'' فیصل نے دِل میں کہا۔

''لمّاں! مجھے کوئی اور پسند ہے۔'' فیصل نے بم پھوڑ ہی دیا جو تباہی بھی لاسکتا تھا، وہ اپنے دل کی ہا کہنے جارہا تھا۔

''کون ہے وہ؟'' ماسی صابراں بیٹے کی شادی کے ارمان میں کوئی ناراضی نہ دکھانا چاہتی تھیں اس۔ انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''آپ اُسے جانتی ہیں اور اُسے دیکھا بھی ہے۔'' فیصل نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔

''کون ہے وہ؟'' ماسی صابراں نے کچھ سوچتے دوبارہ پوچھا۔ فیصل کے بابا بھی اشتیاق سے اس کو ت رہے تھے۔

''وہ... اُس کا نام... اُس کا نام سدرہ ہے، وہ سید عبداللہ کی چھوٹی بہن ہے۔'' فیصل نے دھماکا کیا۔ ماسی صابراں کے ہاتھ میں پکڑا اسلور کا گلاس ایک دم چھوٹ گیا اور بابا ایک دم لیٹے سے اُٹھ بیٹھے

''دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا...'' وہ دھاڑے۔

''اگر سید عبداللہ دو لفظ پیار کے بول کر تجھے اپنے برابر بٹھالیتا ہے تو اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ان کی برابری کرنے اُٹھ کھڑے ہو۔'' بابا کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا اُن کا بیٹا ایسی حماقت کرے گا، اُ

ان نہیں آرہا تھا۔

''پتر! مخمل میں کبھی ٹاٹ کا پیوند لگا ہے۔'' ماسی صابراں جوان بیٹے کو رام کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

''اماں! کسی کو پسند کرنے کا حق تو سب کو ہے۔'' فیصل نے دھیمی آواز میں کہا۔

''تم اس بارے میں سوچنا بھی مت! سید نوازش علی کو تمہارے ارادے کی خبر مل گئی تو وہ تمہارے وجود کے اتنے ٹکڑے کروائے گا کہ ہمیں، تمہیں رونے کے لیے کوئی قبر بھی نہ مل سکے گی۔'' بابا نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

''کیسی خوف ناک باتیں کررہے ہیں فیصل کے ابا!'' ماسی صابراں نے دہل کر شوہر کو ٹوکا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں، اسے کہو اپنی اِس ناسمجھی کو اپنے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردے ورنہ ہمیں اس عمر میں زندہ درگور کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ سیدوں کی لڑکیاں ہمیشہ خالص رہتی ہیں وہ باہر شادی نہیں کرتے پھر ہم جیسے کمیّوں کے ساتھ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیوں تو اِس عمر میں میرے سر خاک ڈلوانا چاہتا ہے؟'' بابا کی آواز ایک دم رندھ گئی۔

فیصل جو سر جھکائے اُن کی ڈانٹ سُن رہا تھا ایک دم تڑپ کر اُن کے پاس آبیٹھا۔

''بابا! میں جانتا ہوں کہ میں نے آسمان کا چاند مانگا ہے لیکن بابا اللہ جب اِس دل میں اُس کا عشق ڈال دے تو پھر وہ کیا کرے؟'' فیصل نے بے بسی سے سوال کیا۔

''کیا مطلب!'' بابا نے چونک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور جو انہوں نے دیکھا وہ لرز کر رہ گئے۔

''نہیں بیٹا! تم کو ہر صورت اِس راستے سے واپس آنا ہوگا میں تمہیں اپنے سامنے موت کے کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگانے دوں گا۔'' بابا نے اِدھر اُدھر سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

''بابا میں مجبور ہوں!'' فیصل نے اپنا سینہ مسلتے ہوئے کہا۔

''اگر تم اس قدر مجبور ہو تو اِس سے میرا اور اپنی ماں کا سر کاٹ ڈالو۔'' انہوں نے لکڑیوں کے ڈھیر سے کلہاڑی اُٹھا کر فیصل کے ہاتھ میں دے دی۔

''بابا!'' فیصل نے لرز کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہی بہتر ہے، تمہاری ضد ہمیں تمہارے بعد بھی مار دے گی، اِس سے بہتر ہے کہ تم ہمیں اپنے ہاتھوں سے ختم کردو۔'' بابا نے تھک کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

فیصل نے دُکھ بھری نگاہ اپنے ماں باپ پر ڈالی جن کی آرزوؤں اور تمناؤں کا محور اُن کی اولاد تھی اور آج اُس کی بے بسی نے انہیں دُکھی کردیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور بنا کچھ کہے باہر نکل گیا۔

''فیصل!'' ماسی صابراں نے پیچھے سے آواز دی۔

''جانے دو اُسے۔'' بابا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''جوان بیٹے سے یوں بات کی جاتی ہے تھوڑی نرمی رکھتے ہیں۔'' ماسی صابراں نے گھبرا کر کہا۔

''وہ بے حد دُکھی ہوکر نکلا ہے، اُسے پیار سے سنبھالتے۔''

''نہیں! اُسے اِس راستے سے روکنا ہوگا یہ کون سا دور ہے جہاں ہیر رانجھا یا سسی پنوں کی محبت کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح جان گنوادی جائے۔ اُسے ہماری خاطر اِس سے دور رہنا ہوگا وہ نہیں جانتا کہ سید نوازش اور م سرفراز وہ ظالم بھیڑیے ہیں، جن کے پاس دِل نہیں ہے۔'' بابا نے بیوی کو سمجھایا۔

تم جورے کو بھول گئی ہو کیا؟ اُس کے معصوم بچے کے ساتھ اُس ظالم شخص نے کیا کیا؟ صرف اُس کے کتوں کی خوراک سے ایک بوٹی کھانے کا گناہ گار تھا وہ ننھا سا بچہ اور اُس بچے کی بوٹی بوٹی اُس کے کتے کھا گئے تھے۔ ایک انسان کے بچے کو سید نوازش علی نے کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ وہ کس قدر جابر ا ظالم ہے اِس سے اندازہ کرلو۔''

''جو شخص اپنے کتوں کے معاملے میں اتنا سخت ہے تم سوچو اپنی بیٹی کے معاملے میں تو وہ ہم سب ا ذلیل کر کے مار ڈالے گا۔'' بابا نے ماسی صابراں کو حقیقت بتائی۔

''تمہیں اُسے روکنا ہوگا۔ یہ میرا فیصلہ ہے اِسی میں ہم سب کی زندگی اور بھلائی ہے۔'' بابا کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل گئے۔

ماسی صابراں اپنے پیروں میں گرے سلور کے گلاس کو دیکھ رہی تھی جس میں سے پانی چھلک کر مٹی میں جذب ہوگیا تھا اُن داستانوں کی طرح جو سید نوازش علی کے ظلم سے پیدا ہوئی تھیں اور ایک کے بعد ایک اس پانی کی طرح مٹی میں جذب ہوگئی تھیں اور اُسے کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا۔

❖❖○❖❖

فیصل نہیں جانتا تھا کہ اُس کے قدم بے اختیار درگاہ کی جانب کیوں اُٹھ رہے تھے بوڑھے برگد تلے وہ سر نہواڑ کر بیٹھ گیا یہ وہی جگہ تھی جہاں سے اُسے عمر بھر کا روگ لگ گیا تھا، وہ موتیا سے ملا تھا۔ بس کچھ پل، کچھ جادو اثر پَل اُس کی زندگی کو بدل گئے تھے، وہ خوشبو جیسی لڑکی اُس کے حواسوں پر ایسی چھائی کہ اُسے ہمیشہ کے لیے بےبس کر گئی۔

''یا میرے اللہ! اچھی خاصی زندگی تھی تو نے اُس سے کیوں ملوایا اور پھر اِس دل میں اُس کی اتنی طلب کیوں ڈالی کہ... میں خود اپنی شدتوں پر حیران ہوں... کیا چند پَل زندگی پر اِس طرح بھی حاوی ہوسکتے ہیں؟''

''ہوسکتے ہیں؟'' وہ سوال جو اُس نے خود سے کیا تھا، اُس کا جواب اُسے اُس کی پشت پر کھڑے کسی شخص نے دیا تھا۔

فیصل نے ایک دم سر اُٹھا کر پیچھے دیکھا۔ وہی درویش کھڑا تھا۔

''محبت ایک ایسا احساس ہے جو کسی کو چھو جائے تو وہ ربّ کو پہچان لیتا ہے، محبت ہی انسان کو انسان کی پہچان دیتی ہے، محبت کا فیض بھی کسی کسی کو ملتا ہے عشق مجازی ہی عشق حقیقی کی پہلی سیڑھی ہے، محبت ہی حق کے ساتھ تعارف کرواتی ہے ایک ایسے جذبے سے جو بالکل سچا ہے۔'' درویش حسبِ عادت اپنے آپ میں نہ تھا۔ فیصل کسی معمول کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ شخص ہمیشہ میرے دل کے بھید پڑھ لیتا ہے یہ کون ہے؟'' فیصل نے سوچا۔

''نہ... نہ ایسا نہ کہہ۔'' درویش نے اپنی لاٹھی زمین پر ماری، جس کے ساتھ گھنٹی بندھی تھی گھنگھرو بجنے لگے۔

''بھید سارے صرف ایک ذات جانتی ہے، وہ جانتا ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے اور کوئی کچھ نہیں جانتا!'' درویش کہتا ہوا مست انداز میں آگے بڑھا۔

''بابا، بابا!'' فیصل ایک دم اُس کے پیچھے بھاگا۔

''تم میرے متعلق اتنا کچھ جانتے ہو تو اتنا تو بتاؤ کیا مجھے میری محبت ملے گی۔'' فیصل نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہٹ پرے... تجھے کہا نا کہ جاننے والا صرف ایک ہی ہے، میں بھلا کیا جان سکتا ہوں؟'' فقیر نے بُرا مناتے ہوئے کہا۔

''بابا پلیز! میری مدد کرو میں اِس جذبے کی تپش سے جھلس رہا ہوں کہ تن من عجیب سے اوپرے اوپرے لگتے ہیں۔'' فیصل کو اپنے احساسات کو ٹھیک سے بتانا بھی نہ آرہا تھا۔

''تن میں لگی ہے؟'' فقیر نے مڑ کر ایک دم دِل چسپی سے پوچھا۔

''ہاں!'' فیصل نے اقرار کیا۔

''من میں بھی لگی ہے؟''

''ہاں بابا ہاں...'' فیصل بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے تیرا جذبہ سچا ہے تُو ضرور پائے گا۔'' فقیر کے منہ سے یہ سُن کر فیصل ایک دم خوش ہوگیا۔

''لیکن!'' فقیر کہتے کہتے رُکا۔

''لیکن یہ ضروری نہیں کہ تُو اپنی مرضی ہی کی مراد پائے، یہ تو دینے والے پر منحصر ہے کہ وہ کیا دیتا ہے، وہ تجھے بھی دے گا، ضرور دے گا اُس کی بہت قدر کرنا کیوں کہ وہ تیرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے!''

''تو ضرور پائے گا! ضرور پائے گا اب یہ دینے والے پر منحصر ہے وہ تجھے کیا دیتا ہے۔'' فقیر اپنی بات مسلسل دُہرا رہا تھا، فیصل اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ ایک بار پھر اپنے چہرے پر ازلی اجنبیت سجائے بڑے بڑے قدم اُٹھاتا چلا گیا۔

الف اللہ! بس تو ہی سچا۔
الف اللہ اک تیرا رشتہ، بس وہ ہی سچا۔
الف اللہ! بس تو ہی سوہنا!
الف اللہ! بس تو ہی سوہنا!
الف اللہ! بس تو ہی ہے باقی رہنا
الف اللہ! بس تو ہی سچا

فقیر کی آواز میں بے حد مٹھاس تھی، جیسے وہ اپنے محبوب سے دُلار کر رہا ہو، اپنے پیار کا اظہار کر رہا ہو۔

الف اللہ! تُو ہی سب سے بڑا۔

فقیر کی آواز دُور جارہی تھی۔ فیصل بالکل سیدھا کھڑا ہاتھ چھوڑے اُسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مجھے دل کی لگی ہے بابا، تم دعا کرو کہ وہ مجھے مل جائے۔'' فیصل نے اپنے سینے کو مسلتے ہوئے کہا۔
سینے کے دائیں جانب ہر وقت خُلا کیسی آگ لگائے رکھتا تھا کوئی اُس سے پوچھتا۔
''موتیا! تم اگر مجھے نہ ملیں تو میں ادھورا رہ جاؤں گا۔'' فیصل نے آہ بھرتے ہوئے بے حد دُکھ سے کہا۔

❖❖○❖❖

''وہ ہر وقت چپ چپ رہتا ہے فیصل کے ابّا، میرا تو بہت جی گھبراتا ہے۔'' ماسی صابراں نے مٹھائی کا تھال چارپائی پر رکھتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔
''رہنے دے اُسے اُداس! آج کی اُس کی آنکھوں کی اُداسی کل کی ہمارے گھر کی ویرانی کو بچائے گی۔ ہماری اتنی اوقات نہیں ہے کہ سید نوازش علی کے ساتھ کوئی کھڑاک پالیں، رہنے دے اُسے اُداس۔'' فیصل کے بابا نے حقے کی نلی کو منہ لگا کر حقے کو گڑگڑایا۔
''چل تُو بھی اُٹھ، ہر وقت اِسی مسئلے کو لیے لسّی بناتی رہتی ہے، جس راہ جانا نہیں اُس کا پتا کاہے کا پوچھنا، جوان خون ہے وقت کے ساتھ ہی ٹھنڈا ہوگا نا! اُٹھ اتنا سارا کام پڑا ہے مہمان آتے ہوں گے، شگنوں کی گھڑیوں میں اوپرے قصّے نہیں چھیڑتے۔'' فیصل کے بابا نے فوری طور پر بیوی کو اُٹھایا، آج ان کے گھر کا بہت خاص دِن تھا۔
آج نفیسہ اور میرو کی منگنی تھی۔ نہ نہ کرتے بھی خاصے مہمان اکٹھے ہوگئے تھے گھر میں خوب چہل پہل تھی لیکن جب ماسی صابراں فیصل کا اُترا اُترا چہرہ دیکھتی تو دُکھی ہو جاتی۔
''رب سوہنے میرے پُتر کے من کی مراد پوری کردے۔'' وہ ماں تھیں ایسی ہی دُعا دے سکتی تھیں کیوں کہ دنیا میں دو ہی لوگ ہوتے ہیں، جو جمع تفریق اور حاصل کے بغیر دُعا کرسکتے ہیں ان کی دعائیں اس لیے پوری ہوتی ہیں کیوں کہ وہ ربّ کی بڑائی پر یقین کرتے ہیں، اُن کے سامنے مسئلے کی بڑائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔
''امّاں! دیکھو نا رانی کا حال، گھر جا ہی نہیں رہی۔ اِدھر ہی جم کر بیٹھی ہے۔'' نفیسہ نے آکر ماں سے شکایت لگائی۔ رانی سہیلی کی محبت میں دو دن سے یہاں تھی اُدھر میرو کی ضد تھی کہ رانی کے بغیر رسم کے لیے نہیں نکلنا۔
صبح سے کتنی بار انہوں نے بلا بھیجا تھا لیکن رانی کو یہاں مزا آ رہا تھا سب سہیلیاں یہاں اکٹھی تھیں۔
''کیوں جی! تم کو ویر کی انگوٹھی پہننے کا بڑا شوق ہو رہا ہے بڑی جلدی ہو رہی ہے۔'' رانی نے شرارت سے نفیسہ کو کہا تو نفیسہ کی سرخ و سفید رنگت حیا سے مزید دہکنے لگی۔
ماسی صابراں نے دِل ہی دِل میں اپنی بیٹی کی نظر اُتاری۔
''ربّ تیرے چہرے اور آنکھوں کی خوشیاں آباد رکھے۔'' انہوں نے دعا دی۔
''چل پُتر! گھر جا وہاں سب تیرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' انہوں نے رانی کو فوراً جانے کو کہا۔
''یہ نمی کی ماں اُدھر ہی جا رہی ہے تجھے بھی گھر چھوڑ دے گی، چل جا شاباش۔'' وہ اُن کو کہہ کر باہر کی طرف لپکیں جہاں دیگوں والا آدمی آواز دے رہا تھا۔

اندر آنگن میں لڑکیاں ڈھولک پر ایک نیا گیت اُٹھا چکی تھیں۔ رانی مچلی۔
''بس نفیسہ! یہ آخری گیت، پھر چلتی ہوں۔'' وہ کہہ کر اندر کی طرف بھاگی تو نفیسہ بے بس طویل سانس بھر کر رہ گئی۔
''یہ لڑکی تو بس پاگل ہے! اُدھر جانے میرو کتنا بے چین ہوگا۔'' نفیسہ نے دھیمی مسکان کے ساتھ کہا، میرو کا نام لیتے ہی اُس کے دِل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔

سوہے وے چہرے والیا میں کینی آں
کر چھتری دی چھاں میں چھانویں بہنی آں
ماپیاں نے چن لیا ساتھی تینوں میرا
جندڑی توں پیارا ہن پیار مینوں تیرا
رکھ قدماں دے نال میں پیریں بہنی آں
کر چھتری دی چھاں...

رانی کی آواز سب لڑکیوں میں نمایاں تھی۔
''اِس لڑکی کو تو زبردستی اُٹھانا پڑے گا، چاچی تو لگتا ہے نکل گئیں، ہائے ربا اب یہ کیسے جائے گی؟'' نفیسہ پریشانی سے اندر کی جانب لپکی۔
''رانی کی بچی! امّاں کو پتا چلا کہ تو اب تک نہیں گئی تو وہ بہت خفا ہوں گی۔'' نفیسہ نے رانی کو کھینچ کر محفل سے باہر نکالا۔
''ہائے ربا!'' رانی نے بھی فکرمندی دکھائی۔ اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ خود بھی بہت لیٹ ہوگئی ہے۔
''چاچی تو چلی گئی رانی اب تُو کیسے جائے گی؟ کسی اور کو کہا تو امّاں کو پتا لگ جائے گا، تُو بھی نا پوری ایک مصیبت ہے۔''
''توبہ توبہ! ابھی تُو گھر آئی نہیں اور بھرجائیوں والا سلوک ابھی سے شروع کردیا میرے ساتھ۔'' رانی پریشانی میں بھی نفیسہ کو چھیڑنے سے باز نہ آئی۔
''وے جیدے تُو آنا ذرا اِدھر!'' نفیسہ نے دس گیارہ سالہ بچے کو جو اُن کے ہاں مہمان آیا تھا بلایا۔
''ہاں جی!'' جیدا اِس وقت گُڑ کی پٹیاں پکڑے کھڑا تھا۔
''ذرا باجی کو اُس کے گھر تو چھوڑ آ، اُسی گھر میں جہاں تُو کل گیا تھا امّاں کے ساتھ۔'' نفیسہ نے ذمہ داری بچے پر لگائی۔
''نا۔ نہ باجی! اُدھر پگڈنڈی کے پار بہت کتے ہوتے ہیں یہ اونچے اونچے بھیڑیوں جیسے، مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔ اگر میرے ساتھ کوئی اور ہو تو چلا جاتا ہوں۔'' جیدے نے شرط کے ساتھ حامی بھری۔
''لو کرلو گل! اب ایک راکھا اس کے ساتھ بھی چاہیے۔'' نفیسہ نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
''چلو ہٹو، تم لوگوں کا مسئلہ لگتا ہے مجھے ہی حل کرنا ہوگا۔'' نفیسہ اندر سے مخملی سبز چادر اوڑھ کر آئی، سارا چہرہ چھپانے کے باوجود اُس کے مہندی سے رچے ہاتھ بہت نمایاں تھے۔
''تو باہر چلے گی ہمارے نال؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں! اب تجھے ڈانٹ سے بھی تو بچانا ہے۔'' نفیسہ نے باہر نکلنے کی کوشش کی، کہیں اماں کی نظر پڑ گئی تو لینے کے دینے پڑ جانے تھے۔

''نفیسہ! تجھے پتا ہے نا، بڑے کہتے ہیں کہ ورے دنوں میں دلہن یا دولہے کو باہر نہیں نکلنا چاہیے انہوں ہمیشہ تاڑ میں رہتی ہے۔'' رانی نے تیز تیز چلتی نفیسہ کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''چل دفع ہو، نہ تو اتنی دیر کرتی نہ مجھے مجبوراً نکلنا پڑتا۔ اُدھر تیرے ویر نے ضد پکڑی ہے کہ تُو آئی تو وہ آئے گا، اِدھر تُو دماغ خراب کیے جاتی ہے۔'' نفیسہ نے پھولی سانس کے ساتھ کہا۔

ہر طرف گھپ اندھیرا تھا، چاند کی آخری تاریخیں تھیں بندے کو بندا نہ دکھائی دے رہا تھا دور کتوں کی غراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

''بچپن سے ہی مجھے یہاں کے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔'' رانی نے ہمیشہ کی طرح اپنا مخصوص جملہ بولا جو وہ سالوں سے کہتی آ رہی تھی۔

''چل جلدی قدم اُٹھا، اُدھر اماں کو میں نہ ملی تو شور پڑ جائے گا۔'' نفیسہ کو اس اندھیرے سے زیادہ اماں کی ڈانٹ اور ناراضی سے ڈر لگ رہا تھا۔

''باجی! میںوں وی بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' جیدے نے بھی اپنے جذبات پہنچانا عین فرض جانا۔

''لو ایک نہ شد دو شد۔'' نفیسہ نے زِچ ہو کر کہا۔

جیسے ہی وہ پگ ڈنڈی سے اُترے اُسی پل کچے پر جیپ کی لائیٹیں روشن ہوئیں، رانی کے ساتھ ساتھ نفیسہ کا دِل بے اختیار دھڑکا کیوں کہ گاؤں میں صرف اور صرف ایک گھرانہ تھا جس کے پاس جیپیں تھیں وہ تھا سید نوازش علی کا گھرانا۔

''یا اللہ! وہ منحوس آدمی نہ ٹکر جائے۔'' رانی کو سید سرفراز علی کا خیال فوراً آیا۔

روشنی عین اُن کے چہروں پر پڑی تھی تینوں نے بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے، دودھیا روشنی میں نفیسہ کے مہندی لگے ہاتھ اِس قدر خوب صورت لگے کہ سید سرفراز علی کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''اوئے رفیق! جس لڑکی کے ہاتھ اتنے خوب صورت ہوں وہ خود کتنی سوہنی ہوگی۔'' سید سرفراز علی نے کہا۔

جواباً رفیق اور بشیر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے، جو جانتے تھے کہ اس جملے کا اصل مطلب کیا ہے۔

''حضور ساتھ والا دانہ بھی برا نہیں ہے، بس رنگ سے مار کھا گیا، یہ لڑکی آپ کچھ عرصے پہلے طلب کر چکے ہیں کہیں تو اِس کو بھی ساتھ ہی لے آئیں۔'' رفیق نے جیپ سے اُترتے ہوئے کہا۔

''نہیں! وہ مہندی کے ہاتھوں والی چاہیے۔'' سید سرفراز کے منہ میں مسلسل پانی آ رہا تھا۔

رانی، نفیسہ اور جیدے تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے تیزی سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے، جب بشیر اور رفیق دونوں نے اُن کی راہ روک لی تھی۔

''کدھر جناب! پہلے مالکوں سے تو مل لو اُن کا بلاوا ہے!'' ایک خباثت سے ہنسا۔

نفیسہ فوراً اُن کا مطلب سمجھ گئی۔

''رانی بھاگ۔'' اُس نے رانی کا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگائی، وہ جانتی تھی سید سرفراز کے ہاں جنگل کا قانون

تھا، ابھی اگر وہ خود کو نہ بچا سکیں تو ماری جائیں گی۔ دونوں نے تیز دوڑ لگائی تھی۔

جیدا بھی پیچھے بھاگا لیکن رفیق نے بچے کو پکڑ لیا۔

رانی ایک پل کو رُکی جب کہ نفیسہ آگے بھاگ گئی تھی۔ بس وہ ایک پل رُکنا ہی رانی کی قسمت کو گرہن لگا گیا۔

نفیسہ نے فوراً کھیت میں گھس کر پناہ لی تھی۔

سامنے جیپ کی پڑتی روشنی میں وہ واضح طور پر دیکھ سکتی تھی کہ سید سرفراز علی کے بندوں نے رانی کو اُٹھا کر جیپ میں ڈال لیا تھا۔

''ہائے ربا!'' نفیسہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ جیسے ہی جیپ آگے بڑھی وہ دوڑ کر باہر نکلی، جیدا بے ہوش پڑا تھا، راستے پر اس وقت اُس کی خبر گیری سے زیادہ ضروری رانی کی خبر دینا ضروری تھا۔ رانی کا گھر پہلے قریب تھا وہ اندھا دھند بھاگتی وہاں پہنچی۔

مشعل جلا کر اُن کی گلی میں روشنی کر رکھی تھی میرو نے نفیسہ کے لیے اپنے ارمان بہت سنبھال کر رکھے ہوئے تھے لیکن گھر کی سجاوٹ سے اُس کی خوشی ہر ہر کونے میں دکھائی دے رہی تھی، اتفاق سے سامنے گھوڑے پر کاٹھی ڈالتے نظر آ گیا۔

ان کے گھر بھی ڈھولک کی آواز آ رہی تھی۔

''اس رانی کی بچی کو خود ہی لانا پڑے گا۔'' میرو بڑبڑاتا ہوا کاٹھی کس رہا تھا لیکن سامنے ہانپتی کانپتی نفیسہ کو ننگے سر ننگے پاؤں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''نفیسہ؟'' اس کا یہاں اِس حالت میں سامنے ہونا کسی انہونی کی اطلاع دے رہا تھا۔

''نفیسہ!'' میرو نے آگے بڑھ کر لرزتی کپکپاتی نفیسہ کو تھاما۔

''کیا ہوا، کیا بات ہے؟'' اُس نے ہچکیوں کے ساتھ روتی نفیسہ سے پیار سے پوچھا۔

''وہ۔ را۔ رانی!''

''میرو! رانی کو۔ رانی کو بچاؤ!'' نفیسہ نے بہ مشکل اپنا جملہ پورا کیا۔

''کیا ہوا رانی کو؟'' میرو کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔

اُسی پل رانی کی ماں بھی کچھ لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلی تھی تا کہ وہ لوگ آہستہ آہستہ پیدل کا رستہ طے کریں لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر وہ پہلے ٹھٹکیں اور پھر لپک کر آگے بڑھیں۔

''نفیسہ پتر خیر اے؟''

''رانی کو بچاؤ میرو! اُسے سید سرفراز علی اُٹھا کر لے گیا ہے۔'' نفیسہ اتنا کہہ کر میرو کی بانہوں میں جھول گئی۔

''اماں! اِس کو سنبھالو۔'' میرو نفیسہ کو ماں کو پکڑا کر دوڑ کر گھوڑے کی طرف لپکا۔

گھوڑے پر چڑھنے سے پہلے وہ درخت کے ساتھ لگی کلہاڑی لینا نہ بھولا تھا۔

''لڑکیو! پانی لاؤ۔'' رانی کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے نفیسہ کے منہ پر پانی چھڑکا اُس کی ناک دبا کر اُسے ہوش دلایا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''رانی! ہائے میری رانی کا کیا ہوگا؟'' رانی کی امّاں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''رانی کو بچالو ماسی!'' نفیسہ نے ہذیانی انداز میں کہا۔

پھر وہ باہر کو دوڑی، جانے اُس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔

''ارے اس باؤلی کو پکڑو۔'' رانی کی ماں نے روتے ہوئے لڑکیوں کو نفیسہ کو پکڑنے کے لیے دوڑایا

''رانی کو بچالو... میری بہن کو بچالو۔'' نفیسہ لڑکیوں کی گرفت میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔

رانی کی ماں نے روتے ہوئے نفیسہ کو دیکھا۔

''ہائے ربّا، خیر کرنا۔'' باہر کسی نے دین محمد کو بھی اطلاع دے دی تھی وہ بھی پریشانی سے اندر آیا۔

''میں، میں بڑی حویلی ہو کر آتا ہوں۔'' دین محمد نے دو ایک اور محلے کے لوگوں کو ساتھ لیا۔

سید نوازش علی کے قتل کے بعد سید عبداللہ کے نام سے اب یہ حویلی چل رہی تھی۔

''سید عبداللہ نیک روح ہے وہ ہماری مدد کرے گا۔'' دین محمد نے جلدی جلدی باہر نکلتے ہوئے اُن تسلی دی یا پھر خود کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

نفیسہ نے چاچا دین محمد کے لڑکھڑاتے قدموں کو غور سے دیکھا اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو اُس کا دل کسی بڑی انہونی کی خبر دے رہا تھا۔

❖❖○❖❖

جیدے کو ہوش آیا تو وہ سیدھا گھر بھاگا، جہاں نفیسہ کی گمشدگی سب کو پریشان کیے ہوئے تھی۔ ا فیصل، نفیسہ کو تلاش کرنے اپنے دوسرے بھائی قیصر کے ساتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ جیدے کی خبر لرزا والی تھی۔

''ہائے ربّا! ان کڑیوں کو اکیلے نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔'' ماسی صابراں نے سینے پہ دو ہتڑ مار کر کہا

ماسی صابراں کے ساتھ بہت ساری مہمان عورتیں اور مرد بھی ساتھ ہولیے تھے وہ کھیتوں میں لڑک تلاش رہے تھے کیوں کہ جیدے نے بے ہوشی سے پہلے لڑکیوں کو کھیتوں کی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔

''میرے مولا کرم کرنا۔'' ماسی صابراں لالٹین تھامے روتے ہوئے آگے بڑھیں۔

بیٹیاں تو دل کی رانیاں ہوتی ہیں اور آج اُن کو لگ رہا تھا، جیسے کسی چیل کوے نے اُن کا دل اُچک ہو۔

❖❖○❖❖

صبح کا سورج قیامت ساتھ لایا تھا۔ سید سرفراز نے میرو کے سامنے اُس کی بہن کو بے لباس کر کے پرانا بدلا اُتارا تھا۔

جواباً میرو آپے سے باہر ہو گیا اُس نے اُن بھیڑیوں پر حملہ کر دیا تھا رفیق، بشیر کو عین موقع پر مارا تھا جب کہ سید سرفراز علی نے پستول نکال کر میرو کے سینے میں چھ کی چھ گولیاں اُتار ڈالی تھیں۔

اپنی عزت کے کھونے اور بھائی کی لاش دیکھ کر رانی کو سوائے موت کے کوئی پناہ نہ نظر آئی، وہ ڈ کے کنویں میں کود گئی تھی۔

سید سرفراز علی نے سارا الزام رفیق اور بشیر پر ڈال دیا اور خود کو معصوم اور بے خبر بتایا تھا۔ وہ سب

اسے صاف بچ نکلا تھا۔

''نہیں! میں سید سرفراز علی کو بچنے نہیں دوں گی، میں پنچایت اور پولیس کو گواہی دوں گی کہ رانی کو سرفراز علی نے اُٹھایا تھا اسی نے اُس کے ساتھ زیادتی کی اور اُسے مار ڈالا، اُسی نے میرو کو مار ڈالا۔'' نفیسہ نے بین کرتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا تو ماسی صابراں نے دوڑ کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''چپ! چپ کر جا... آواز گھونٹ لے کچھ نہیں بولے گی تو!'' انہوں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''نہیں! میں چپ نہیں رہوں گی!'' نفیسہ نے ماں کا ہاتھ ہٹا کر چیخ کر کہا تھا۔

جواباً ماسی صابراں نے کھینچ کر اُس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

''خبردار! دوبارہ میں نے تیری آواز بھی سنی۔'' وہ اُسے سختی سے کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''نہیں امّاں! میری بہنوں جیسی سہیلی اور میرے محبوب کا خون اتنا سستا نہیں ہے کہ میں سید سرفراز کو معاف کر دوں، میں کل پنچایت ضرور جاؤں گی!'' نفیسہ نے دل ہی دل میں اٹل فیصلہ کیا تھا۔

❖❖○❖❖

''امّاں جان! کیوں آئے ہیں یہ لوگ؟'' سید عبداللہ نے عبدالولی کو اپنے کندھے پر بٹھا رکھا تھا وہ ولی سے بے حد پیار کرتے تھے اس وقت بھی وہ جب ماں کے پاس آئے تو انہوں نے بچے کو اُتار کر اُس کا موڈ خراب کرنا بہتر نہ سمجھا، اِسی لیے اُس کو ساتھ لے آئے تھے۔

''مہمان ہیں بیٹا! اور اس کو نیچے اُتارو اب یہ بڑا ہو گیا ہے تم ابھی تک اِس کو ایسے اُٹھاتے ہو، جیسے کوئی اپنے گود کے بچے کو اُٹھاتا ہے۔'' زلیخا بی بی نے بیٹے کو پیار سے کہا کہ کہیں اتنے بڑے بچے کو کندھے پر اُٹھانے سے اُن کے بیٹے کی کمر یا کندھوں میں تکلیف نہ ہو جائے۔

''چل شیر جوان نیچے اُتر۔'' سید عبداللہ نے ولی کو نیچے اُتارا۔

''بابا ہم ہیرے سے کھیلنے جائیں؟'' ولی نے اپنے گھوڑے کے متعلق پوچھا تھا۔ یہ گھوڑے کا بچہ خاص طور پر ولی کی دِل چسپی کو دیکھتے ہوئے منگوایا گیا تھا۔

''بشیراں، او بشیراں۔'' زلیخا بی بی نے ملازم کو آواز دی۔

''جی بی بی!'' ملازمہ نے آ کر تابع داری سے پوچھا۔

''بچے کو اصطبل لے جاؤ، خود بھی ساتھ رہنا اور راکھے کو بھی کہنا کہ خاص دھیان کرے، ابھی ہمارے پوتے کو ٹھیک سے گھڑسواری نہیں آتی۔''

ملازمہ بچے کو لے کر باہر نکل گئی۔

''کون مہمان ہیں اور اُن کے آنے کا مقصد؟'' سید عبداللہ نے ماں سے پوچھا تھا۔

''تیری بہن کا رشتہ لینے آئے ہیں، اپنی ہی برادری کے ہیں۔'' زلیخا بی بی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا کون؟'' سید عبداللہ نے دِل چسپی سے پوچھا۔

''تیری بڑی امی کے رشتے دار ہیں۔'' زلیخا بی بی نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سید نوازش علی کی موت کے بعد سید سرفراز علی میں خاصا فاصلہ آ گیا تھا بے شک آج تک یہ ثابت نہ ہوسکا تھا کہ اُن لوگوں کی گاڑی پر کس نے حملہ کروایا تھا لیکن سدرہ بی بی نے جب سید سرفراز کا نام لیا تو سید سرفراز علی نے اپنے حق میں سارے گواہ اکٹھے کر لیے تھے اور اپنے ہاتھ صاف ثابت کر دیے تھے اس لیے ابھی تک اُن کے بیچ کھل کر دشمنی نہ ہوئی تھی لیکن خاموشی اور گریز کی دیوار بہت بلند ہو گئی تھی۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی بڑی امی کی مدد لینے کی؟'' سید عبداللہ کا منہ بن گیا تھا۔

''اچھا بتائیں لڑکا کیا کرتا ہے؟'' سید عبداللہ نے ماں کا اُترا چہرہ دیکھ کر بات کو وہیں ختم کر دیا تھا کیوں کہ یہ اُن کی بہنوں کی زندگی اور خوشیوں کا سوال تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو۔

''تم مل کر تو آ رہے ہو بھا عبدالغنی سے...'' لتاں کی آواز بہت دھیمی ہو گئی تھی۔

''لتاں جان!'' سید عبداللہ غصّے میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ غیر انسانی سلوک آپ نے کیسے سوچ لیا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اگر یہ نہ ہوا تو وہ ہمیشہ کنواریاں بیٹھی رہیں گی۔'' ماں نے کہا۔

''لیکن میں نہیں مانتا۔''

''بیٹا! یہ پشتوں سے چلا آ رہا ہے، باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹیوں کو قربان کرتے آ رہے ہیں یہ زمینیں ہمیشہ بیٹیوں کے خوابوں کا خون مانگتی آئی ہیں۔ مجھے ہی دیکھ لو اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو آج میری بھی شادی نہ ہوتی لیکن میں اپنے باپ کی تین بیویوں سے واحد اولاد تھی میرے بابا سائیں کو لاکھ چاہنے سے مزید اولاد نہ مل سکی اِس لیے مجھے اہمیت دینے پر وہ مجبور ہو گئے اور پھر میری شادی تمہارے بابا سائیں کے ساتھ ہوئی جو پہلے سے شادی شدہ تھے مجھے ساری عمر سوکن کا خطاب ملا۔ تمہاری بڑی لتاں ہمیشہ مجھ سے نفرت کرتی رہیں لیکن میں پھر بھی خوش ہوں کہ تنہائی کاٹنے کے لیے دیواریں نصیب میں نہیں لکھی گئیں میری گود میں تمہاری صورت میں اور سدرہ، مریم کی صورت میں اولاد کا سکھ ملا۔ ربّ سائیں نے میری زندگی تم لوگوں کے وجود سے ہری بھری کر دی اور میں ہر بات بھول گئی۔'' زلیخا بی بی نے گہرا سانس لیا۔

''اولاد ایسی نعمت ہے جو ہر عورت کو مکمل کر دیتی ہے، اُس کے من کے خالی پن کو بھر دیتی ہے۔ ٹھیک ہے سدرہ، مریم کے جوڑ خاندان میں نہیں ہیں لیکن لیکن بے شک بھا عبدالغنی شادی شدہ اور بڑی عمر کا ہے لیکن سدرہ کنوارے پن کی تنہائی سے تو بچ جائے گی۔'' انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' سید عبداللہ نے باقاعدہ اپنا سر تھام لیا۔

''لتاں جان پلیز! میری پھول سی بہنوں کے متعلق آپ کیا سوچے بیٹھی ہیں اگر بابا سائیں آج زندہ نہیں ہیں تو آپ بھی تو اُن کے لیے مشکل زندگی کا انتخاب سوچے جا رہی ہیں، کیا یہ انصاف ہے۔'' سید عبداللہ کی گوری رنگت ایک دم غصّے سے سرخ پڑ گئی۔

''پتر! تو کیوں نہیں سمجھتا، کم از کم وہ اِن دیواروں کی قید سے تو بچ جائیں گی میں تو کچھ عذاب والا راستا دیکھ رہی ہوں۔ اُن کے پاس اچھی زندگی کا راستا ہے ہی نہیں تو پھر ایسے میں کم عذاب والا راستہ

...ری کی کچھ خوشیاں اُن کی جھولی میں ڈال سکتا ہے، اُن کو اولاد مل سکتی ہے، گھر داری کی مصروفیت مل سکتی ہے یہ بہت کافی ہوگا اُن کے لیے...'' زلیخا بی بی نے آخری سطح کو سوچ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ اپنی نند کی (...لمہ پھوپو) کی عبرت ناک زندگی اُن کو اِس طرح کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر گئی تھی۔

''پلیز لتاں جان!'' سید عبداللہ شدّت جذبات سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہاں صرف دوسرے لوگوں کے حقوق کی پامالی کی جاتی ہے لیکن نہیں یہاں تو اپنے ہی گھر کی بیٹیوں کو بھی کوئی حق حاصل نہیں، یہ سب کیا ہے۔''

''پتر! یہ تو ہماری پشتوں سے چلا آ رہا ہے اور اِس سارے نظام کو آج تک کوئی نہیں بدل سکا۔'' زلیخا بی بی نے بات سنبھالنے کی کوشش کی، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ برادری یا سید سرفراز علی، سید عبداللہ سے اس معاملے پر اُلجھیں۔

''لیکن میں ایسے نظام کو نہیں مانتا، جو انسان کو انسان نہ سمجھے، نظام انسانوں کے لیے بنائے جاتے ہیں نہ کہ نظاموں کو چلانے کے لیے انسانوں کی بھینٹ چڑھا دی جائے، میں اپنی بہنوں کی شادی خود اپنی جگہ کروں گا چاہے مجھے اس کے لیے کسی سے بھی ٹکر لینی پڑے۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے اور آپ سے بھی کہ میں اِس ظلم کو روکوں گا۔'' یہ بات کہتے ہوئے سید عبداللہ کو علم نہ تھا کہ سید نوازش علی کے بعد ہی اُس کے اصولوں سے ٹکرانا اِس قدر آسان نہ تھا۔ بہتے دھارے کے ساتھ بہنا چاہیے پانی صاف ہو یا گدلا! ہمیشہ آسان ہوتا ہے اِس کی مخالف سمت تیرنے کے لیے مضبوط قوتِ ارادی کی ہی نہیں مضبوط اعصاب کی بھی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاں نسل در نسل ماننے والے، اطاعت کرنے والے ہی پیدا ہوتے ہیں وہ چاہے اولاد ہو یا ملازم! ہر دو صورتوں میں اِن کی اور صورتیں اکثر اپنے بڑوں کی پیروی کرنے اور رضا پانے کی جستجو میں ویسی ہی ہو جاتی ہیں!

بے شک ان سب میں سید عبداللہ کی صورت اور سوچ دونوں اِن کی اپنی تھیں، یہ اُن کی مضبوطی بھی تھی اور کمزوری بھی۔

''آپ فوراً اِن مہمانوں کو واپس کر دیں۔'' سید عبداللہ نے اٹل لہجے میں کہا۔

اُسی پل باہر شور سنائی دیا۔

''یہ کیسا شور ہے؟'' زلیخا بی بی نے پوچھا تھا۔

''سائیں باہر گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوئے ہیں، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اندر آ کر ملازمہ نے اُن کو اطلاع دی۔

''کیوں؟'' سید عبداللہ نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''دین محمد کا بیٹا اور بیٹی مارے گئے وہ انصاف کے لیے آئے ہیں، آج یا کل وہ پنچایت کے لیے بھی فیصلہ لیں گے۔'' ملازمہ نے اطلاع دی۔

''کس کے خلاف الزام ہے؟'' سید عبداللہ نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''وہ۔ وہ سائیں!'' ملازمہ نے ہچکچا کر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ سائیں سرفراز کے خلاف!'' ملازمہ نے بم پھوڑا۔

❖❖○❖❖

''سرفراز پُتر! یہ سب میں کیا سن رہی ہوں؟'' ریحانہ بی بی نے سرفراز علی کو گھیرا، وہ اُس کے لیے بے حد پریشان تھیں۔

''کیا لمّاں جان؟'' سید سرفراز علی نے بے فکری سے پوچھا اُس کے چہرے پر کوئی پریشانی کے آثار نہ تھے۔ وہ ہمیشہ ہی بڑے سے بڑا کام کر کے بہت پُراعتماد رہتا تھا۔

''یہی ڈیرے سے دین محمد کے پُتر کی لاش ملی ہے اور اُس کے کنویں سے گُوی کی لاش ملی ہے۔ ریحانہ بی بی نے حیرت سے بیٹے کی شکل دیکھی تھی کہ وہ کیسے اتنا بے خبر ہو سکتا ہے؟

''لمّاں! ہر انسان اپنے اپنے عمل کا جواب دہ ہے۔''

''جنہوں نے یہ حرکت کی وہ خود بھی مارے گئے۔'' سید سرفراز علی نے سارا الزام رفیق اور بشیر کے سر ڈال دیا۔

''تو نہ پریشان ہو پیاری ماں! تیرے بیٹے پر آنچ بھی نہ آئے گی۔'' سید سرفراز علی نے بے نیازی سے کہا۔

''سید سرفراز! اب تو سُدھر جا، تو بھی اب بال بچوں والا ہو گیا ہے، تیرے گھر والی کیا سوچے گی؟'' ریحانہ بی بی کے لہجے میں سچی تشویش موجود تھی۔

سید نوازش علی کی موت کے بعد وہ بالکل بدل کر رہ گئی تھیں، اب وہ سید سرفراز علی کو اُس کی ہر حرکت پر ٹوکنے لگی تھیں اُن کا دل ہر وقت ہولتا رہتا تھا لیکن سید سرفراز علی اپنی بُری عادتوں میں اِس قدر پکا ہو چکا تھا کہ اُسے ماں کی نصیحت بُری لگنے لگی تھی۔ کبھی تو وہ مڑ کر جواب دے دیتا ورنہ وہ اُن کی بات کو یونہی اُڑا دیتا تھا۔

''او چھوڑیں لمّاں جان! بیویوں کو کون اتنا سر چڑھاتا ہے اُن کو مرد کے کاموں اور باتوں میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔'' سید سرفراز علی نے نخوت سے کہا تھا۔

''رب کو مان پُتر! بیویوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔'' ریحانہ بی بی نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے خود ہی اپنے بیٹے کو اتھرا گھوڑا اور بپھرا سمندر بنایا تھا، جواب کسی طور قابو نہ آ رہا تھا۔ اب اکثر پچھتاتی تھیں۔

''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر وقت وعظ کے موڈ میں رہتی ہیں۔'' سید سرفراز علی نے بیزاری سے کہا۔

''بیٹے اگر ان دونوں بچوں کے خون سے تیرے ہاتھ رنگے ہیں تو اتنا یاد رکھنا خون کبھی چھپتا نہیں، سالوں بعد بھی اپنا بدلہ لے لیتا ہے۔'' ریحانہ بی بی نے سید سرفراز علی کو ڈرانے کی کوشش کی۔

''لمّاں جان! مجھے زمینوں پر نکلنا ہے بہت ضروری کام ہے، اجازت دیں۔'' سید سرفراز علی نے حسبِ عادت ماں کے پاؤں چھوئے اور باہر نکل گیا۔

جب کہ ریحانہ بی بی مٹی کے ڈھیر کی طرح کرسی پر ڈھیر ہو گئیں پھر ایک دم چونک کر سیدھی ہوئیں، سامنے صائمہ کھڑی تھی اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

''تو کیوں غم کرتی ہے! تیری تو پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' انہوں نے بہو کو اُٹھ کر تسلی دی۔

''خالہ! کس کس بات کا غم کروں اور کس کس کو چھوڑوں۔ وہ بدنظر ہے اِس کا دُکھ مناؤں کہ کوئی لڑکی اس کی بھیڑیا صفت سے بچ نہیں پاتی، ہر لڑکی سے وہ اپنے کھونے کے احساس کا بدلہ لیتا ہے یا پھر اِس بات کا دُکھ مناؤں کہ وہ انسان کو انسان ماننے پر تیار نہیں لیکن خود کو سب کا خدا مانتا ہے۔'' صائمہ ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی، ہنسی تھی۔

''یا پھر اس بات پر دُکھ مناؤں کہ وہ دنیا میں صرف ایک عورت سے محبت کرتا ہے اور باقی سب سے اس کے نہ ملنے کا انتقام لیتا ہے۔'' صائمہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''بھابی عائشہ کی یہ بڑی سی تصویر ہمارے کمرے میں لگی ہے اور میری اِن چار سالوں میں مجال نہیں ہے کہ اِس تصویر کو ہٹا سکوں۔ سید سرفراز علی کے دو بیٹے پیدا کرنے کے بعد بھی میں اُس کے دل اور زندگی میں کوئی مقام نہ حاصل کر پائی۔ اِن چار ساڑھے چار سالوں میں، میں اُس کے تیسرے بچے کو جنم دینے جا رہی ہوں پھر بھی میری کوئی اہمیت نہیں، ایسے پتھر کے ساتھ جی کر کیا کرنا۔'' وہ آہ بھرتی وہاں سے اُٹھ گئی جب کہ ریحانہ بی بی ٹکر ٹکر اُسے جاتا دیکھتی رہ گئی تھیں۔ اُن کے پاس کوئی ایسا لفظ نہ تھا، جو جھوٹی تسلی کا بھی بھیس بنا پاتا۔ سید سرفراز علی کی اتنی سچائیاں ہر تسلی کو توڑ دیتی تھیں۔

''کاش! کاش! میں نے لالچ میں آ کر سید سرفراز کو ایسا نہ بنایا ہوتا! کاش میں نے اُس کی پہلی غلطی پر شاباشی دینے کے بجائے سزا دی ہوتی تو آج میرا ضمیر اس مسلسل سزا سے بچ جاتا جس میں، میں دِن رات جل رہی ہوں۔'' انہوں نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے آہ بھرتے ہوئے بے حد پچھتاوے سے سوچا تھا۔

''یا اللہ! میں کیوں بھول گئی کہ اگر اولاد نیک ہو تو مرنے کے بعد صدقہ جاریہ بن جاتی ہے اور اگر بد ہو تو عذابِ مسلسل کا سبب بنتی ہے! مجھ سے کتنی بڑی بھول ہو گئی میں نے اپنے ہی بیٹے کو بُرا آدمی بنا دیا۔ اب وہ اتنا بُرا بن گیا ہے کہ سب لوگ اِس کو گاؤں میں فرعون سمجھنے لگے ہیں اور فرعون کی تو ہدایت قسمت سے نکال دی گئی تھی۔ تباہی اور عبرت انگیز انجام اُس کے اعمال کی وجہ سے لکھ دیا گیا تھا۔

''تو کیا میرا بیٹا بھی تباہی اور عبرت انگیز انجام پائے گا!''

''نہیں خدایا! اِس سے پہلے مجھے موت آ جائے!'' انہوں نے شدت سے دعا کی تھی۔

اُن کے اعصاب پر اِس قدر بوجھ پڑا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑیں، اُن کی زبان اور جسم کے زیریں حصے پر فالج کا زبردست اٹیک ہوا تھا۔

❖❖○❖❖

''یہ تو بہت بُری خبر ہے!'' فیصل نے اطلاع دینے والے آدمی سے بے اختیار کہا۔

''اچھا یار! تم بیٹھو میں اندر اطلاع دے کر آتا ہوں۔'' فیصل نے آدمی کو گھر کے باہر بچھی چارپائی پر بٹھایا اور خود اندر کی جانب بڑھا۔ اُس کے قدم بے حد بوجھل تھے، اُس کا دل تو اِس سے بھی زیادہ بوجھل تھا۔

''کون ہے باہر؟'' فیصل کے بابا نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چاچا دین محمد کے محلے سے آیا ہے!" فیصل کا حوصلہ نہ پڑ رہا تھا کہ کیسے اگلی اطلاع دے لیکن مجبوری تھی کہ بات پوری کیے بغیر گزارہ نہ تھا۔

"اب کیا ہوا؟ ویسے اب اور کتنا بُرا ہوگا؟ میرے یار کا تو سارا گھر ہی اُجڑ گیا۔" فیصل کے بابا نے لمبی آہ بھری تھی۔

"ماسی کا ایک گھنٹے پہلے انتقال ہوگیا۔" فیصل نے آخر وہ خبر دے ہی ڈالی۔

بے چاری ماں سے اپنی اولاد کا دُکھ جھیلا نہ گیا تھا جس بیٹی کو رانیوں کی طرح رکھا تھا وہ یوں اذیت بھری موت مرے گی یہ سوچا بھی نہ تھا اور جس بیٹے کے شگن کرنے وہ نکلنے لگی تھی اُس کی لہو لہان لاش اُس کے سارے حواس ختم کر گئی تھی اور اب! اُس کی زندگی تمام کر گئی تھی۔

چار دن سے سید سرفراز علی مسلسل اپنے اثر رسوخ سے پنچایت منسوخ کروا رہا تھا۔ دین محمد پاگلوں کی طرح کبھی تھانے جاتا اور کبھی پنچایت کے لوگوں کے پاس جاتا، آخر سید عبداللہ نے تین دن بعد حتمی طور پر کہا کہ پنچایت ضرور بیٹھے گی اور انصاف کرے گی اور پنچایت کی بیٹھک اب مزید منسوخ نہیں ہوگی۔ بے چارا دین محمد انصاف حاصل کرنے میں ایسا مصروف ہوا کہ اُسے بیوی بھول گئی جو گیلی لکڑی کی طرح اتنے دن سے چیخ رہی تھی اور آج وہ ایسی چیخی کہ اُس کا دِل چیخ کر پھٹ گیا اور اُس نے دم دے دیا۔

"ہائے ربا!" ماسی صابراں نے یہ اطلاع سن کر اپنے سینے پر دو ہتڑ مارے تھے۔

"برباد ہوں اُن کی نسلیں جنھوں نے میری بہن پر یہ ظلم اُٹھایا تھا۔ ہائے ربا میری بہن کا تو سارا گھر برباد ہوگیا وہ خود چلی گئی اور ہمیں ایک اور دُکھ رونے کو دے گئی۔" ماسی صابراں کی وہ خالہ زاد بہن ہی نہیں بلکہ بچپن کی سہیلی بھی تھی، شادی کے بعد بھی اُن میں کبھی دوری نہ آئی کیوں کہ دونوں کے شوہر پہلے سے بہت اچھے دوست تھے۔

چند دن پہلے وہ اِس دوستی کو ہمیشہ کی رشتے داری میں بدلنے والے تھے لیکن ایسی بُری نگاہ اُس کم بخت سرفراز علی کی پڑی کہ اُس کا پورے کا پورا گھر برباد کر دیا تھا۔

نفیسہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، اُس کے ارادے مزید مصمم ہوگئے تھے کہ وہ آئندہ دنوں میں گواہی ضرور دے گی، چاہے اُسے چوری ہی جانا پڑے۔

❖❖○❖❖

رانی کی ماں کے آج قُل تھے جب فیصل چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا گھر کی جانب جا رہا تھا اُسے بڑی حویلی کا ملازم ملا تھا۔

"آپ کو سید عبداللہ نے یاد کیا ہے۔" وہ پیغام دے کر آگے بڑھ گیا جب کہ ڈاکٹر فیصل بوجھل دل اور قدموں سے بڑی حویلی کی جانب بڑھا تھا۔

حویلی کے مین گیٹ پر ہی اُسے سید عبداللہ مل گئے تھے جو اُسے اپنے کمرا خاص میں لے آئے۔

"مجھے تم سے بے حد اہم بات کرنی ہے۔" سید عبداللہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"جی کہیے!" ڈاکٹر فیصل نے مرجھائے لہجے میں کہا۔

اُس کا دل اندر تک مرجھایا ہوا تھا گزشتہ دنوں کے حادثات نے اُسے اندر تک ہلا دیا تھا۔

"سرفراز کا نام دین محمد کے معاملے میں لیا جا رہا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری بہن موقعے کی گواہ تھی، میں چاہتا ہوں تم اپنی بہن کو لاؤ گواہی کے لیے، کل پنچایت ہے اُس بوڑھے آدمی کی ساری دنیا اجڑ کر برباد ہوگئی اسے انصاف ضرور ملنا چاہیے اور ایسا تمہاری بہن کی گواہی سے ممکن ہوگا۔" سید عبداللہ نے گم صم ڈاکٹر فیصل کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میری بہن کو اِس کمزور معاملے میں نہ ڈالیں۔ دُکھ نے اُسے اعصابی طور پر بہت کمزور کر دیا ہے وہ بار بار بے ہوش ہو جاتی ہے۔" ڈاکٹر فیصل نے معذرت کی تھی۔

"پلیز! تم اچھے انسان ہو، تم تو اچھائی کا ساتھ دو۔" سید عبداللہ نے اُسے جذباتی طور پر گھیرا تھا۔

"پلیز عبداللہ بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن میں اپنی بہن کو جانتے بوجھتے کیوں مشکل میں ڈالوں جب کہ میں جانتا ہوں کہ سید سرفراز علی اپنے سامنے کھڑے ہونے والے کو ہی نہیں اُس کے سارے گھرانے کو ختم کر دیتا ہے۔" ڈاکٹر فیصل نے صاف لفظوں میں معذرت کی تھی۔

"پلیز فیصل! یہ کوئی جنگل کا قانون تھوڑی ہے، ہم گواہ سامنے رکھ کر انصاف کریں گے۔" سید عبداللہ نے بے حد خوشی سے کہا۔

"عبداللہ بھائی! آپ بھول رہے ہیں کہ یہ چند روز پہلے جو کچھ ہوا وہ جنگل کا قانون ہی تھا مجھے اجازت دیں، مجھے اور میری بہن کو اِس معاملے سے دور رکھیں۔" ڈاکٹر فیصل کہہ کر جانے کے لیے اُٹھا۔

"فیصل پلیز! ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو، اِن روایات کو اور اُس کے آسیب کو ختم کرنے کے لیے بارش کا پہلا قطرہ تو کسی کو بننا ہی ہوگا پھر اس نیک کام کے لیے تم کیوں نہیں! میں کل تمہارا پنچایت میں انتظار کروں گا۔" سید عبداللہ نے اُسے پیچھے سے کہا۔

جب کہ فیصل تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

❖❖○❖❖

"اُس لڑکی کی اتنی جرأت کہ اُس نے میرے خلاف گواہی دی۔" سید سرفراز علی کو آج کی پنچایت کے فیصلے کی اطلاع ملی تو وہ آدم خور شیر کی طرح غرایا تھا۔

"سائیں! یہ وہی لڑکی ہے، جو ڈاکٹر فیصل کی بہن ہے۔" خادم خاص نے جلتی پر تیل ڈالا تھا۔ سید سرفراز علی کو گاؤں میں ہسپتال کی تعمیر بہت ناپسند تھی لیکن وہ سید عبداللہ کی زمین پر ہسپتال بنا رہا تھا اس لیے وہ اُسے فوری طور پر نہ روک سکتے تھے لیکن وہ اس فیصل کے دشمن ہوگئے تھے، جس نے اس گاؤں کی ترقی کے لیے پہلا خطرہ بننے کی کوشش کی تھی۔" اِس طرح اُن کے خادموں کے اندر آگہی پیدا ہو سکتی تھی۔

آگہی کا غلامی سے بیر ہوتا ہے! اور یہی غلامی تو اتنے برسوں سے اتنی نسلوں سے اُن کو آقا کا درجہ دلاتی رہی تھی اس کو اپنے سروائیول کے لیے اِس آگہی پر پابندی لگانی ضروری تھی اور سید عبداللہ اور ڈاکٹر فیصل اِس پابندی کی راہ میں حائل ہو رہے تھے، سید سرفراز زبانی کلامی کئی بار ڈاکٹر فیصل کو دھمکا چکا تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اِس کام سے رک جائے لیکن ڈاکٹر فیصل نے بہت سختی سے انکار کیا تھا اور یہ انکار سید سرفراز علی کو اپنے لفظوں میں منہ زوری محسوس ہوتی تھی اس لیے فیصل اُن کے ناپسندیدہ ترین بندوں میں تھا، آج اُس کی بہن نے بھی منہ زوری کر ڈالی تھی۔ سید سرفراز علی کا نام اِس معاملے میں لے لیا تھا۔

پنچایت نے جو فیصلہ کیا تھا وہ سید سرفراز علی کے لیے کسی شکنجے سے کم نہ تھا۔ اگلی پنچایت میں پولیس نے بھی آنا تھا اور بیان اکٹھے کرنے تھے جو سید سرفراز علی کے لیے پھانسی کا پھندا بن سکتے تھے۔

''اِس لڑکی کو اپنا بیان بدلنا ہوگا ورنہ اس کا اور اس کے خاندان کا انجام بہت بُرا ہوگا۔'' آج تک سید نوازش اور سید عاشق علی نے سیاہ سفید کیا، اُس کو کوئی بھی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا اِس لیے ظلم ہوتے، خون بہتے اور گواہی نہ ہونے کے سبب اُن پر کبھی الزام نہ آیا تھا، لیکن آج یہ اِس گاؤں کی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا کہ گاؤں کے مالکوں کے خلاف کسی نے آواز اُٹھائی تھی۔

''سائیں! باہر ایس ایچ او صاحب آئے ہیں۔'' ملازم نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''ہاں لے آؤ!'' سید سرفراز نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا اُس کا شیطانی دماغ بہت تیزی سے چل رہا تھا۔

''السّلام علیکم سر!'' ایس ایچ او نے اندر آ کر باقاعدہ جھک کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' سید سرفراز نے نہایت خراب موڈ میں جواب دیا۔

''سائیں! میں کوئی تفتیش نہیں کرنے آیا نہ ہی کوئی اور بات ہے میں تو بس اتنا کہنے آیا ہوں کہ بڑے سر نے کہلوایا ہے کہ پنچایت نے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے آپ بتایئے اب کیا کرنا ہے؟ اس لڑکی اور بچے کی گواہی پھانس کی طرح اٹک گئی ہے۔'' ایس ایچ او نے فکری مندی سے کہا تھا۔

''گاؤں کا مولوی کہاں مر گیا تھا، عورت کی گواہی آدھی ہوتی ہے اور بچے کی گواہی تو پونی بھی نہ ہو گی۔

لیے پھرتے ہیں یہ گواہ!

پھر یہ گواہ پورے نہیں ہیں تو... کہاں کا کیس کیسی پنچایت!

معاملے کو بگاڑ ڈالو، کچھ حامی پیدا کرو شرعی طور پر گواہی کا مسئلہ اُٹھائیں، نمبر دو اُس لڑکی اور اُس کے خاندان کو مزا چکھاؤ کہ آئندہ وہ گواہی کے لیے کبھی سوچ بھی نہ سکیں۔

تنویر الٰہی!'' سید سرفراز علی نے خادم خاص کو مخاطب کیا۔

''جی سائیں! حکم۔'' خادم خاص نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تابع داری سے پوچھا۔

''دو لاکھ صاحب کو دے دو۔'' یہ رقم اُس دور کے حساب سے بیس لاکھ کے برابر تھی۔

''دو لاکھ؟'' خادم خاص کے منہ سے تو کچھ نہ نکلا تھا البتہ چہرے پر حیرت ہی حیرت رقص کر رہی تھی۔

دوسری جانب تھانے دار نے بے اختیار لبوں پر زبان پھیری تھی۔ وہ دِل ہی دِل میں اپنے حصے کے متعلق حساب لگا رہا تھا کہ اُس کے حصے میں کیا آتا ہے۔

''سر! کام ہو جائے گا آپ بے فکر رہیں۔'' تھانے دار سیلوٹ کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے

وہ سیلوٹ اُس رقم کو تھا جو اُسے اِس کمرے سے باہر نکلتے ہی ملنے والی تھی۔ سید سرفراز کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

وہ ایک بار پھر شطرنج کی بساط بچھا چکا تھا اور اپنا من پسند کھیل شروع کر چکا تھا، جہاں بازی صرف اُسی کی ہی تھی۔

❖❖○❖❖

لڑکی کی گواہی! خاص طور پر نابالغ لڑکی کی گواہی کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں ہے عورت کی تو گواہی ہوتی ہی آدھی ہے! اسلام میں کسی پر جرم تب تک ماننے سے منع کیا گیا ہے، جب تک دو گواہ پورے نہ ہو جائیں، اگر ادھوری گواہی پر کسی کو سزا سنائی جائے تو وہ سراسر گناہ ہوتا ہے! توبہ کرو توبہ سیدوں کے خاندان پر الزام؟

اگلے دن گاؤں میں جگہ جگہ لوگ ٹولیاں بنائے یہ باتیں کر رہے تھے۔ ان ٹولیوں کو بنانے والے سید سرفراز علی کے حامی تھے جو باقاعدہ لوگوں کی سوچ کے دھارے کو بدلنے کے کام پر معمور ہوئے تھے۔

نتیجہ حسب توقع ملا تھا!

دین محمد کے بعد بیٹے، بیٹی کا خون شام کے سائے میں دھندلا گیا تھا جب ''خالص'' میں شک کا پانی مسلسل ڈالیں تو بات کا تاثر اور مسئلے کی شدت اور نوعیت بدل کر رہ جاتی ہے اور یہی کچھ سید سرفراز علی نے کروایا تھا۔

کل تک ہر گاؤں کا آدمی ایک دم سے اُس کے خلاف کھڑا ہو رہا تھا آج وہ لوگ کسی جھاگ کی مانند بیٹھ گئے تھے۔

بہت ساری عورتیں ماسی صابراں کو بھی دہلا آئی تھیں کہ اُن کی بیٹی نے جھوٹا الزام سید سرفراز پہ لگایا ہے یقیناً اللہ کا قہر اُن پر نازل ہونے والا ہے۔

ماسی صابراں نے سہم کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تھا وہ دیکھ رہی تھیں کہ یہ قہر کس کی جانب سے نازل ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر فیصل تو ہسپتال کے سامان کے لیے کچھ ہی دیر پہلے نکلا تھا۔ انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے قیصر جو شہر میں کالج میں اردو کا استاد ہو گیا تھا اور میرو نفیسہ کی منگنی کے لیے گاؤں آیا ہوا تھا لیکن مسلسل حالات، ماں باپ اور بہن کی غیر حالت اور حالات کی سنجیدگی و پیچیدگی کی وجہ سے واپس نہ جا سکا تھا اسے فوراً تیار کیا کہ وہ نفیسہ کو لے کر شہر اُن کی سہیلی کے ہاں چلا جائے اور اُن کو پیغام دے کہ وہ نفیسہ کو کچھ عرصے کے لیے اپنے ہی پاس رکھے، اُن کی یہ سہیلی اُن کی ماں کی خالہ زاد بہن کے ہاں بیاہی گئی تھی صرف وہ اُن کی رشتے کی بھابی لگتی تھیں بلکہ اُن کے بچپن کی سہیلی بھی تھیں، اس لیے وہ نفیسہ کو وہاں بھیجنے پر بالکل یک سو تھیں۔

''لیکن امّاں! یہ فیصلہ کیوں؟'' قیصر نے اُن کو نفیسہ کا اتنا سارا سامان اکٹھے کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''تو چپ کر... پہلے بڑے نے بہادری کے ڈنگے بجا کر بہن کو لے جا کر پنچایت میں کھڑا کر دیا اور اب چھوٹا سوال کر رہا ہے۔ ارے ایسی بے وقوف اولاد میرے ہی نصیب میں تھی۔'' ماسی صابراں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

قیصر نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

''چلو تم لوگ صبح ہونے سے پہلے گاؤں سے نکل جاؤ، میں نے تانگہ منگوایا ہے ابھی آتا ہی ہوگا'' ماسی صابراں اٹل فیصلہ ہی نہیں مکمل تیاری بھی کر کے بیٹھی تھی۔

ماں کا دِل ایک ایسی معجزانہ مشین ہے، جو ہر انہونی کا سگنل بہت پہلے سے ریسیو کر لیتی ہے۔ کچھ ایسے ہی سگنلز نے ماسی صابراں کو الرٹ کر دیا تھا۔

❖❖○❖❖

فضا میں منڈیوں اور ٹڈیوں کی آواز نمایاں تھی بیچ میں کہیں کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز اِن آوازوں کے تسلسل کو توڑتی تھی۔

سدرہ بی بی کا دِل اب نہیں ڈرتا تھا۔ وہ تو اب اِن کچے پکے راستوں پر آنکھیں بند کر کے چل سکتی تھی۔ اس کے قدموں میں بہت تیزی تھی۔ بشیراں جو پیغام لائی تھی اُس کے مطابق وہ دو گھنٹے لیٹ وہ کیا کرتی امّاں اور بھابی سوئی ہی اتنی دیر سے تھیں کہ اُسے نکلنے کا موقع اب ملا تھا۔

''یا میرے اللہ! کہیں ڈاکٹر باؤ چلا نہ گیا ہو۔'' دل میں وسوسے آ رہے تھے کیوں کہ بہ قول بشیراں کے ڈاکٹر باؤ شہر کے لیے نکلنے والے تھے اور شہر سے نکلنے سے پہلے وہ اُس سے ملنا چاہ رہا تھا۔

کنویں کے پاس خالی جگہ دیکھ کر سدرہ کا دل دھک کر کے رہ گیا اُسے ایک دم بہت کچھ کھو لینے کا احساس ہوا تھا۔ اُس کی روح کی پیاس مزید بڑھ گئی جو ڈاکٹر باؤ کو دیکھنے سے بجھ سکتی تھی۔

''خدایا! وہ تو چلے گئے۔'' سدرہ کی جھیل جیسی براؤن آنکھوں میں بے اختیار موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

''موتیا!'' تبھی اُس کے پیچھے سے جو آواز آئی وہ اُس کے اندر زندگی دوڑا گئی۔

''ڈاکٹر باؤ!'' وہ دوڑ کر اُس کے کندھے سے جا لگی۔

''موتیا!'' ڈاکٹر فیصل کا لہجہ کس قدر تڑپ رکھتا تھا وہ سدرہ کے تن من کو شانت کر گیا۔

''کیا ہوا پگلی! رو کیوں رہی ہو؟'' ڈاکٹر فیصل نے سدرہ کے چہرے پر آنسو محسوس کر کے پوچھا۔

''میں ڈر گئی تھی کہ کہیں میں آپ سے ملے بغیر نہ رہ جاؤں۔'' سدرہ نے معصومیت سے کہا۔

جواباً ڈاکٹر فیصل نے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''یار اب اور برداشت نہیں ہوتا! یہ دوری یہ جدائی مجھے اندر ہی اندر سلگا کر کھوکھلا کر دے گی۔ میں ہسپتال کے مکمل ہوتے ہی عبداللہ بھائی سے تمہارا ہاتھ مانگوں گا۔'' فیصل نے سدرہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''کمال ہے فیصل باؤ! اتنے عرصے سے ایک ہی بات آپ کو سمجھا رہی ہوں کہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے چاہے لڑکی بوڑھی ہو کر مر جائے۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ، اب کیا کریں؟''

''کیا تم میرے بِنا رہ لوگی؟'' ڈاکٹر فیصل نے کہا تو سدرہ نے تڑپ کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میرا ہاتھ تھام کر مجھے اتنی دور لے آئے ہو اب تو تمہارے بِنا مر جاؤں گی تمہارے بِنا جینا ناممکن ہے۔'' سدرہ نے سچائی سے اعتراف کیا۔

''ہم یہاں سے کہیں دور چلے جاتے ہیں!'' سدرہ نے ہمیشہ کی طرح اپنی بات دُہرائی۔

''کہاں! ڈھونڈنے والے تو پاکستان کے ہر کونے سے ڈھونڈ نکالیں گے، پھر میں اپنے والدین بہن ...ال سب کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں اور یوں چوروں کی طرح بھاگنا ہوتا تو اتنے سال کیوں ضائع ...رتا۔ نہیں موتیا! میں تمہیں سب کے سامنے اپناؤں گا... سب کے سامنے حاصل کروں گا۔''

''تو پھر ڈاکٹر باؤ! میری لاش تمہیں مل سکتی ہے، میں نہیں! کاش ہم کسی دوسرے ملک چلے جاتے، اپنا گھر بسا لیتے۔'' موتیا نے دُکھی لہجے میں کہا۔

''کہاں چلے جاتے؟'' فیصل نے اُس کا موڈ بحال کرنے کے لیے دِلچسپی سے پوچھا۔

''ولایت! جہاں سے ویر عبداللہ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے، وہاں سے لوگ اچھے بن کر آتے ہیں، جیسے ...اور ویر عبداللہ۔'' سدرہ نے معصومیت سے کہا تھا۔

...اکٹر فیصل مسکرائے بنا نہ رہ سکا، وہ اِس بھولی معصوم روح کو بھلا کیا سمجھاتا کہ اچھائی تو انسان کے ...ر سے اُگتی ہے اُسے کسی اور ملک کی ہوا یا پانی نہیں اُگا سکتا۔

''میری جان! تم صرف اور صرف میری ہو میرا نصیب ہو میرے دل کی دھڑکن اور میرے اندر بسنے ...لی زندگی ہو، جسم سے روح کو کوئی جدا نہیں کر سکتا نہ کوئی روایت نہ کوئی رسم! میں ہر چیز سے تم کو چرا لوں ...ا۔'' ڈاکٹر فیصل کی اٹل باتیں سدرہ کے ''ناممکن'' کی دیوار کو کمزور کر رہی تھیں اور سدرہ اِس دیوار کے ...زور ہونے پر اندر ہی اندر بے حد خوش تھی۔

''شکریہ ڈاکٹر باؤ!'' وہ بے اختیار بولی۔

''اچھا یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟'' ڈاکٹر فیصل نے گولڈ کی چین جس میں لاکٹ لٹک رہا ...اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے؟'' سدرہ جس کے پاس کلو کے حساب سے سونا تھا یہ چین پا کر بے حد خوش تھی۔

''ہاں میری جان! اِس کے باہر سدرہ لکھا ہے اور جب تم اِسے کھول کر دیکھو گی تو اندر میری تصویر ہو۔'' ڈاکٹر فیصل نے خاص طور پر یہ دل کی شکل کا لاکٹ بنوایا تھا، جس کے باہر سدرہ کا نام کندہ تھا اور ...اس کو کھولنے پر ڈاکٹر فیصل کی تصویر نظر آتی تھی۔

''ابھی اندھیرے میں نظر نہیں آئے گا تم اس کو گھر جا کر روشنی میں دیکھنا کہ سدرہ کے دل کے اندر ...ل اور صرف فیصل کی تصویر ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے چین کا لاک لگاتے ہوئے کہا۔

سدرہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دَر آئی چہرہ اور کانوں کی لویں تک شرم سے دہکنے لگی تھیں۔

''چلو موتیا! تمہیں چھوڑ آؤں، مجھے شہر بھی نکلنا ہے۔'' موتیا کو بشیراں آدھے راستے پر مل جاتی تھی پھر ...نوں اکٹھے حویلی واپس جاتی تھیں۔ اِس ساری راز داری اور کام کا بشیراں کو منہ مانگا انعام ملتا تھا اس ...وہ یہ کام بے حد راز داری اور خوشی سے کر رہی تھی۔

اسی پَل مسلسل اور بھیانک قسم کی فائرنگ کی آواز فضا میں گونجی تھی، ڈاکٹر فیصل نے تشویش اور سدرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔
"یہ آواز تو اِدھر سے آرہی ہے، پگ ڈنڈی کے اُس پار! اُدھر تو ڈاکٹر باؤ آپ کا گھر ہے۔" سدرہ نے
پریشانی سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس گاؤں میں اسلحے کا استعمال صرف حویلی والے کرتے تھے اس لیے اُس
کا دل بے حد ڈرا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔
"اللہ خیر کرے گا تم جاؤ میں دیکھتا ہوں۔" ڈاکٹر فیصل نے موتیا کو اُس کے راستے بھیج کر تیزی سے
اپنے گھر کی جانب دوڑ لگائی۔
جوں جوں وہ گھر کے قریب پہنچ رہا تھا، اُس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا کیوں کہ فائرنگ کی آواز
اور رفتار بڑھ گئی تھی۔ فیصل کا دِل بُری طرح ڈوبا، سامنے اُس کے گھر کے باہر کتنے ہی گھڑ سوار موجود تھے
اور وہ اُس کے گھر کے اندر فائرنگ کر رہے تھے، دور سے کہیں کھیتوں سے اسپیکر پر پولیس کے ہرکارے
اعلان کر رہے تھے۔
"مچھمو ڈاکو تجھے چاروں جانب سے گھیر لیا گیا ہے اپنے ہتھیار پھینک دو۔" یہ اعلان بار بار کرنے
سے سب گھروں میں سنائی دے گیا تھا۔
لیکن ڈاکٹر فیصل کی آنکھیں مختلف منظر دیکھ رہی تھیں۔ گھوڑوں پر سوار بھی پولیس کی وردی میں تھے
جو اُن کے گھر کو گھیرے کھڑے تھے اور شاید اندر بھی گھسے ہوئے تھے اور کھیتوں میں کھڑا سپاہی اسپیکر پہ
اعلان کر رہا تھا۔ وہ بہت سکون سے اعلان کر رہا تھا۔
"میرے خدایا! یہ کیا ڈراما ہے؟"
ڈاکٹر فیصل کا دماغ ابھی یہ ڈراما سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک سنسناتی گولی اُس کے آ کر لگی، وہ
بے اختیار چیخا، ایک اور گولی کمر میں لگی تھی اور پھر اُس کے اندر آگ لگا کر جسم کو جلا گئی۔ وہ لہرا کر گرا۔
ڈاکٹر فیصل نے شدت کرب سے ہونٹ کاٹے تھے۔
"پاپا، پاپا!" ایک دم سامنے کا منظر فضا میں تحلیل ہو گیا، جہاں ڈاکٹر فیصل خون میں لت پت پڑا تھا
باہر سے زہرہ کی مسلسل آواز اور دستک جاری تھی۔
"پاپا!" زہرہ کی آواز آئی۔
ڈاکٹر فیصل ماضی کا طویل سفر کر کے واپس آئے تھے اس لیے پسینے سے شرابور تھے انہوں نے بہ مشکل
اُٹھ کر دروازہ کھولا، زہرہ نے پریشانی سے باپ کو دیکھا تھا جو ہانپ رہا تھا۔
"پاپا آر یو آل رائٹ؟"
زہرہ نے پریشانی سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اُس کا اتنے مضبوط اعصاب والا باپ، یورپ کا مشہور
ہارٹ سرجن، کسی چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔
"وہ۔ وہ۔ اُس نے میرے بابا کو، لمّاں کو، بھائی کو مار ڈالا۔ سب کو مار ڈالا۔"
وہ جانے کس کی بات کر رہے تھے۔ برسوں کے رُکے آنسو سیلاب کی طرح اُمڈ آئے تھے، ہر باندھے
گئے بند کو توڑتے ہوئے۔ پھر وہ ایک دم ہی دو زانو بیٹھ کر منہ پر ہاتھ رکھ کر پاگلوں کی طرح روتے ہوئے
چیخے۔

"میرے بابا! میری لمّاں!
"بابا۔ لمّاں!" انہوں نے اپنے والدین کو پکارا۔
"قیصر۔ قیصر! میرا بھائی۔" آہ دِل سے نکلی تھی۔
"نفیسہ میری پیاری بہن! سب کو ظالموں نے مار ڈالا۔"
برسوں پرانا دُکھ جو ہمیشہ سے تازہ تھا، آج منہ کھول بیٹھا تھا اور وہ رو رہے تھے۔ زار زار رو رہے تھے
یہ کہ زہرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پریشانی سے اپنے پہاڑ جیسے مضبوط باپ کو نمک کی طرح گھلتے دیکھ
رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ سب ہے اک فریب نظارہ نہیں جیے
جو مر گئے تھے لوگ دوبارہ نہیں جیے
آخر میں جب حساب کیا تو پتا چلا
اپنے لیے تو ایک بھی لمحہ نہیں جیے
اکثر ہی رائیگا چلی جاتی ہے زندگی
زندہ تھے بے ثبات لہٰذا نہیں جیے
جینے کی خوب ڈھیر دُعائیں ملیں ہمیں
سو بڑھ گیا گمان ہمارا ، نہیں جیے
یہ لذتِ یقین کہ زندہ ہیں دوستو
کچھ اس قدر بڑھی کہ زیادہ نہیں جیے
ہر ایک لمحہ جیے تشنگی کے ساتھ
پھر یہ دُعا کہ کوئی بھی پیاسا نہیں جیے

''کیوں پاپا! آپ نے ہم سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟'' زہرہ نے اپنے باپ کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر سوال کیا۔

''پیاری بیٹی! انسان اچھی باتیں اور یادیں تو شیئر کرلیتا ہے درد اور تکلیف سے چور لمحوں کو وہ کیسے شیئر کر کے اپنے پیاروں کو بھی درد آشنا کردے۔'' ڈاکٹر فیصل نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''پاپا! آپ اتنے سالوں سے اتنا بڑا بوجھ دل پہ لیے جی رہے ہیں کیا آپ کی اولاد صرف آپ کی خوشیاں، پیسہ اور وراثت شیئر کرنے دُنیا میں آئی ہے، کیا اُسے اپنے ماں باپ کا غم شیئر نہیں کرنا چاہیے'' زہرہ نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ڈاکٹر فیصل اُسے چپ چاپ دیکھتے رہے، وہ ہو بہو سدرہ جیسی باتیں کرتی تھی پھر زہرہ کی آنکھیں آنکھیں اور ٹھوڑی پہ موجود تل بالکل سدرہ جیسا تھا۔

''فاصلے اور دوری ہم کو دور نہیں لے جاسکتے! ہم کہیں نہیں جاتے، اگر ہم دل میں رہتے ہوں تو ساتھ رہتے ہیں اور پھر جب کوئی ہمارا اپنا ہماری محبت کا حصے دار بنتا ہے تو ہمیں اپنے محبوب کی ادا اُس کا چہرہ اُن میں نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اُن کے چہروں میں کبھی چھلک کر اور کبھی چھپ کر خود

...کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ ہم کہیں نہیں جاتے، ہم تو آس پاس ہی رہتے ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل کو ...کی کہی بات یاد آئی، اُن کا دل مسوس کر کے رہ گیا تھا۔

''...! آپ نے میرے پیارے پاپا اور امی پہ یہ ظلم کر کے اچھا نہیں کیا! اتنے برس آپ لوگ پاکستان ...کرتے رہے، لیکن پاکستان جانے کے نام سے بھاگتے رہے، خود پہ ظلم کرتے رہے۔'' زہرہ کا انداز ...در خوب صورت اور پیارا تھا کہ ڈاکٹر فیصل کو بے اختیار اُس پہ پیار آ گیا۔ انہوں نے اُسے بہت ...پیار کیا۔

...یاں تو ہوتی ہی Absorbing Paper کی طرح ہیں جو غموں کو چوس کر ہماری زندگیوں کو ...شفاف رکھنے کا باعث بنتی ہیں، کبھی کبھی یہ پین کشن بن جاتی ہیں، ہمارے تکلیف دہ رازوں کی ...اپنے اندر کھبو کر بھی چپ رہتی ہیں، بنا کسی ڈیمانڈ اور ناخوشی کا اظہار کیے۔

''پاپا! اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔'' زہرہ نے باپ کو کافی کے ساتھ سینڈوچ زبردستی کھلایا تھا اور ...وہ اُن سے اُن کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔ برسوں کے رُکے سارے آنسو اور یادیں ڈاکٹر فیصل نے ...اُس کے کندھے پر سر رکھ کر بہائی تھیں۔

...آج وہ اُن کی محرمِ راز ہوگئی تھی۔

''ہاں اب میں ٹھیک ہوں!'' انہوں نے بستر پر لیٹتے ہوئے آرام کی غرض سے آنکھیں بند کرتے ...ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ کچھ دیر آرام کرلیں تب تک میں امی کو دیکھ لوں۔'' زہرہ نے کہا پھر جاتے جاتے ...

''پاپا! اگر مائینڈ نہ کریں تو آپ مجھے بتائیں گے نا کہ سدرہ بی بی اب کہاں ہیں؟'' مریم نے پُرتجسس ...لہجے میں پوچھا۔

''ہوں۔'' ڈاکٹر فیصل نے آنکھیں موندے موندے ہی حامی بھری۔ وہ ابھی مزید کوئی بات نہ کرنا ...چاہتے تھے وہ اندر تک تھکے ہوئے تھے۔

''اوکے پاپا! آپ آرام کریں۔'' زہرہ نے کمرے کی لائیٹ آف کر کے دروازہ بند کرتے ہوئے ...

لیکن ڈاکٹر فیصل اپنے دل کا کیا کرتے جو سدرہ کے نام پہ پھر یادوں کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ بھلا کہاں کی نیند اور آرام ہونا تھا۔

...وہ بیڈ سے اُتر کر ایک بار پھر راکنگ چیئر پر آ بیٹھے، سدرہ کا مسکراتا چہرہ چھم سے اُن کے سامنے ...آیا۔

کچھ سپنے تو
...پاروں کے پنچھی جیسے ہوتے ہیں
...اکھ اڑاؤ آنکھ سے اُن کو
...پھر واپس آ جاتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر .... لوٹ کر واپس آ جاتے ہیں!
ماضی ایک بار پھر زندہ ہو کر ڈاکٹر فیصل کے اِرد گرد چلنے لگا!
''کون ہے وہاں؟'' سید سرفراز علی نے اونچی آواز میں پوچھا۔
سدرہ بی بی اور بشیراں دم سادھے جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آنا کی آخری تاریخوں کا اندھیرا ہی ہر جانب نہیں ہے بلکہ اُس کے مقدر کی سیاہی بھی اُس کے اِرد گرد ہوئی تھی۔
''بی بی جی! اب کیا ہوگا؟'' قریب بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ پر بشیراں نے گھگھیا کر بی بی سے پوچھا۔
سدرہ بی بی اُسے کیا تسلی دیتی وہ تو خود سر سے پاؤں تک لرز رہی تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ ہر زندگی سے بیزار رہتی تھی۔ ہر پَل اُس کا دل کرتا تھا کہ کاش!
کاش وہ مر جائے!
ہر آنے والا دن اُسے خود پہ بھاری محسوس ہوتا تھا لیکن اب! اب زندگی میں محبت شامل ہوگئی زندگی کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ اُسے زندگی سے پیار ہونے لگا تھا، اُس کے لیے زندگی اہم ہو۔ تھی، وہ جینا چاہتی تھی یہی وجہ تھی کہ اپنی جانب بڑھتے قدموں کی آہٹ سن کر وہ بُری طرح لرز رہی
''میں پوچھ رہا ہوں کون ہے وہاں؟'' سید سرفراز علی جو ڈاکٹر فیصل کے گھر پولیس کا حملہ کروا کر کی کارروائی کا آنکھوں دیکھا حال دیکھ کر واپس آ رہا تھا تو اُس نے دو زنانہ سائے بڑی حویلی کے کی جانب تیزی سے بڑھتے دیکھے تھے۔
سید سرفراز علی نے جب اُن کا پیچھا کیا تو وہ جھاڑیوں میں چھپ گئی تھیں۔ اس نے ٹارچ کی جھاڑیوں پہ ڈالی۔ روشنی کے لپکے نے جو منظر لپک کر پکڑا تھا وہ سید سرفراز علی کا سارا خون کنپٹیوں اکھٹا کر گیا۔
''سدرہ؟'' اُن کی آنکھیں خون رنگ ہوئی تھیں۔
سدرہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی جب کہ بشیراں کی تو اتنی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کھڑی ہو اُس کی تو گھگھی بندھ گئی تھی۔
''سدرہ! تم اس وقت! رات کے اس پہر حویلی کے باہر؟'' سید سرفراز علی کی آواز میں غراہٹ نمایاں تھی۔
سدرہ کو اپنے گلے میں کانٹے اُگتے محسوس ہوئے۔

❖❖○❖❖

''اللہ جانے یہ نمانی روئے کیوں جا رہی ہے؟'' بچوں کی آیا نے نگینہ کو کندھے سے تھپکتے ہوئے بلند کہا۔
نگینہ تو بہت پرسکون بچی تھی بلکہ عائشہ بی بی کے دونوں بچے ہی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے کبھی نہ کیا تھا۔

آیا اماں کو سید عبداللہ شہر سے لائے تھے وہ میٹرک پاس تھیں، بیوہ تھیں، بے سہارا تھیں۔ سید عبداللہ کو اان کی نوکرانیوں سے ہٹ کر اپنے بچوں کی کیئر ٹیکر چاہیے تھی۔ آیا اماں اس نوکری کے لیے بالکل الحد تھیں اُن کی بول چال اور تربیت بے حد اچھی تھی پھر وہ بچوں سے بے حد محبت بھی کرتی تھیں ااس سالہ یہ خاتون چاق و چوبند تھیں۔ بڑی عمر کی ہونے کی وجہ سے سب اُن کو اماں کہنے لگے تھے۔
گینہ بے حد سکون سے حسبِ معمول سو رہی تھی، جب اچانک ہی اُٹھ کر وہ رونے لگی۔
آیا اماں نے اُسے بہت کوشش کی سلانے کی لیکن بچی تو جیسے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ تبھی وہ گھبرا ار سید عبداللہ کے کمرے کی جانب لپکیں۔
''خیریت اماں؟'' سید عبداللہ تو گھر میں نہ تھے اس لیے دروازہ ذرا سی دستک پہ کھل گیا۔ عائشہ بی بی لیہ کی آواز پہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔
''بی بی! یہ رو رہی ہے، شاید پیٹ میں درد نہ ہو!'' آیا اماں نے پریشانی سے روتی ہوئی بچی عائشہ اابی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
اسی پَل باہر بلی کے رونے کی آواز آئی، ساتھ ہی گھر میں موجود کتے اُونچی آواز میں رونے لگے۔
''اللہ خیر کرے! یہ بے زبان کس دکھ پہ رو رہے ہیں!'' آیا اماں نے دہل کر سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
خود عائشہ بی بی بھی گھبرا گئی تھیں۔
''عائشہ! عائشہ پتر!'' زلیخا بی بی ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئیں۔
''جی تائی جی!'' عائشہ نے نگینہ کو سینے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔
''وہ .... وہ سدرہ حویلی میں نہیں ہے!'' زلیخا بی بی نے ایک نظر آیا اماں پہ ڈالتے ہوئے بے حد سر راتے لہجے میں کہا۔
''حویلی میں نہیں ہے؟''
''وہ بھلا حویلی کے علاوہ کہاں جائے گی؟'' عائشہ نے حیرت سے دریافت کیا۔
''اس حویلی کی عورتیں زنان خانے سے مردانے میں نہیں جا سکتی پھر حویلی سے باہر کیسے جا سکتی ہیں۔'' یہ ایسا ناممکن تھا جس پہ عائشہ فوراً کیسے یقین کر لیتیں۔
''پتر! مریم نے بتایا ہے کہ وہ کمرے میں نہیں ہے بلکہ ہم نے پوری حویلی دیکھ ڈالی اور وہ بشیراں بھی کہیں نہیں ہے۔ حویلی کا پچھلا پھاٹک کھلا پڑا ہے، وہاں کا تالا کنڈی سے لٹک رہا ہے!'' زلیخا بی بی دل تھام کر وہیں بستر پر بیٹھ گئیں۔
اُسی پَل باہر فائرنگ ہوئی۔
''ہائے میں مر گئی، عائشہ یہ گولیاں تو اپنے ہاں ہی چلی ہیں نا۔'' زلیخا بی بی نے ہراساں ہو کر پوچھا۔
''آواز تو بہت قریب سے آ رہی ہے۔'' عائشہ نے بچی آیا اماں کے پاس چھوڑی اور ساس کو لیے باہر نکل گئیں۔
اس وقت عبداللہ گھر میں نہ تھے اس لیے عائشہ ہی باہر نکلی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بی بی جی باہر!'' اللہ رکھی کا رنگ فق ہو رہا تھا۔
''کیا ہوا! بولتی کیوں نہیں!'' زلیخا بی بی کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔
''سید.... سرفراز نے بی بی جی.... بی بی جی کو!'' اللہ رکھی سے بولنا دُشوار ہو گیا تھا۔
زلیخا بی بی نے اللہ رکھی کی بقیہ بات سُنے بغیر ہی اُسے پرے دھکا دیا اور باہر نکل دوڑیں۔
زنان خانے کے باہر صحن میں کنویں کے پاس بشیراں کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی جب کہ سدرہ کے اُوپر اُس کی پھوپو فاطمہ خونم خون پڑی تھیں۔ وہ بے زبان سدرہ کو بچاتے بچاتے اپنے بھتیجے ہی کی گولی کا نشانہ بن گئی تھیں۔
''سرفراز!'' زلیخا بی بی کسی چیل کی طرح سرفراز پر جھپٹیں۔
''ظالم! یہ کیا کیا؟'' وہ دھاڑیں مار کر روئی تھیں۔
''ہٹو چھوٹی اماں... اس بے غیرت کو میں مار ڈالوں گا اس کی اتنی ہمت کہ یہ حویلی کی عزت کو رات کے اندھیروں میں پامال کرے۔'' سید سرفراز نے جھٹکے سے زلیخا بی بی کو پرے کیا۔
''دفع ہو جاؤ یہاں سے، یہ میرا گھر ہے، میرے بیٹے کی حویلی ہے! اس حویلی کا مردہ ہے۔ وہ ہی ہر طرح کے فیصلے لینے کا حق رکھتا ہے!'' زلیخا بی بی نے حلق کے بل چیخ کر کہا۔
''ہونہہ! وہ بے غیرت کیا کرے گا!'' سید سرفراز علی نے غصے سے زمین پہ تھوکتے ہوئے کہا۔
''وہ تو اپنی غیرت ولایت چھوڑ آیا ہے اور .... میں اس کم بخت کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ اس نے ہماری روایات کو توڑنے کی جو کوشش کی ہے اس کا خمیازہ تو اسے بھرنا ہی پڑے گا۔'' سید سرفراز علی نے بندوق کا رخ سدرہ کی جانب کرتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ٹریگر دبا دیا۔
عائشہ نے کسی شیرنی کی طرح جھپٹ کر بندوق کا رخ موڑا تھا۔
سید سرفراز علی، عائشہ کا چہرہ دیکھ کر یوں مدھم پڑا جیسے جلتی ہوئی آگ پر ٹھنڈا پانی پڑ جائے۔
وہ جانتا تھا کہ عائشہ واحد عورت ہے جو سید سرفراز علی کے غرور کا توڑ تھی، جس کے آگے سید سرفراز کا دل اور وجود ہمیشہ جھک جاتا تھا۔
''چوکیدار! کہاں مر گئے ہیں سارے ملازم!'' عائشہ نے چیخ کر کہا۔ لیکن اندر کوئی نہ آیا تھا۔ سید سرفراز علی کے رکھوالوں نے سب کو گن پوائنٹ پر محصور کر رکھا تھا۔
''لے جاؤ اس کو اور باندھ کر رکھو اس جانور کو، یہ اب بنا حساب دیے اس حویلی سے نکل نہیں سکتا۔'' عائشہ کے لہجے میں پھنکار تھی۔
جواباً سید سرفراز علی بڑی مختلف ہنسی ہنسا۔
''یہ ہمارے گاؤں ہیں عائشہ بی بی! یہاں طاقت کی حکمرانی چلتی ہے اور طاقت ور صرف یہاں سید سرفراز علی ہے!'' اس نے اتنی خطرناک سچویشن میں بھی عائشہ کو گہری گہری نظروں سے دیکھا تھا۔
''دفع دور۔'' زلیخا بی بی نے سید سرفراز کو گالی دیتے ہوئے سدرہ بی بی کی طرف دیکھا، جو درد اور تکالیف سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی اُس کی گردن سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔
''ہائے میری بچی!'' انہوں نے روتے ہوئے سدرہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

سید سرفراز علی نے ایک نگاہ سدرہ پہ ڈالی اور اُس کے زخموں کا گہرا جائزہ لیا۔
''ہوں... یہ نہیں بچے گی!''
ان کے دل کو بے حد سکون محسوس ہوا کہ وہ جو کام کرنے آیا تھا وہ اُدھورا نہ گیا تھا۔ اس لیے وہ مزید ...اں ضائع کیے بغیر بڑے مضبوط قدموں سے باہر کی جانب بڑھا۔
''سرفراز! تیرا بیڑہ غرق ہو، تو نے میری معصوم بچی پہ گولیاں چلائیں۔ آگ لگے ایسے بھائی کو جو بہن ...ن بہاتا ہے۔'' زلیخا بی بی سدرہ بی بی کا بھل بھل خون دوپٹے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے ...ل انداز میں بولی۔
''کدھر جا رہے ہو خونی.... قاتل!'' عائشہ بی بی نے اُسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''میرے رستے سے ہٹ جاؤ عائشہ بی بی! تم مجھے نہیں روک سکتیں، سید سرفراز علی اتنا کمزور ہرگز نہیں ...کہ اُسے باندھ کر روک لیا جائے اس لیے تم مجھ پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی آخری سانسیں ...کی فکر کرو۔'' سید سرفراز علی بے نیازی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔
...ب کہ عائشہ نے نہایت بے بسی محسوس کی وہ غصے میں ایک بار پھر سید سرفراز کے پیچھے بھاگی۔ سر اور ...لپیٹے وہ ملازموں کو آوازیں دے رہی تھیں۔ جب سید سرفراز علی کی جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی ...ازم اندر داخل ہوئے۔
''کہاں مر گئے تھے تم لوگ، تم نے سرفراز کو روکا کیوں نہیں؟'' عائشہ نے چیختے ہوئے کہا۔
''بی بی! سائیں کے بندوں نے ہم پہ بندوقیں تان رکھی تھیں۔'' ملازم نے سر جھکا کر کہا۔
''میرے خدایا!'' عائشہ بی بی نے بے اختیار اپنا ماتھا مسلا اُن کے آنگن میں دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں ...سدرہ کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔
''تم ڈرائیور سے کہو فوراً گاڑی نکالے، اسپتال جانا ہے!'' عائشہ بی بی نے اندر کی جانب دوڑتے ...ے کہا۔
''جی بی بی!'' ملازم نے فوراً حکم مانتے ہوئے کہا تھا۔
''عائشہ پتر! ہائے میری بیٹی!'' زلیخا بی بی نے روتے ہوئے کہا۔
سدرہ کا خون بہت بہہ چکا تھا اور وہ نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔
''اس وقت سید سرفراز سے نمٹنے کے بجائے سدرہ کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔'' عائشہ نے کچھ ...تے ہوئے کہا۔ اُسی پل اس افراتفری کے دوران عائشہ کی نظر مریم پہ پڑی، جس کی آنسوؤں سے ہچکی ...ی ہوئی تھی اور وہ بری طرح لرز رہی تھی۔
''پھوپو مر گئیں!
پھوپو مر گئیں!'' مریم مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔
''آپی.... آپی بھی مر جائے گی! ہم سب مر جائیں گے! ہمیں سرفراز بھائی مار ڈالیں گے۔'' وہ بچوں ...طرح گھٹنوں میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔
عائشہ کے اپنے آنسو بند نہ ہو رہے تھے لیکن عبداللہ کی غیر موجودگی میں اُسے ہی سارے کام دیکھنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ ہمت کرنی تھی تاکہ سدرہ کی جان بچائی جا سکے۔

''مریم! حوصلہ کرو، انشاء اللہ سدرہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' عائشہ بی بی نے اپنے پرس میں رقم چیک کرتے ہوئے مریم سے زیادہ خود کو تسلی دی، اسپتال شہر میں تھا اور اُن کو موت سے لڑائی کر کے زندگی کی جانب کا راستا جلد از جلد طے کرنا تھا۔

''بھابی.... پھوپو! پھوپو مر گئیں نا؟'' مریم نے ہچکیوں میں فاطمہ پھوپو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عائشہ نے فاطمہ پھوپو کی خون میں لت پت لاش کو دیکھا، اُن کا چہرہ عائشہ نے پہلی بار بے حد سکون سے دیکھا تھا۔ اس کا دل چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہیں بیٹھ کر رونے لگے لیکن وہ مجبور تھی۔ سدرہ کو اسپتال لے جانا بھی بے حد ضروری تھا۔

عائشہ جب زلیخا بی بی کے ساتھ پاؤں گھسیٹتی گاڑی میں بیٹھی تو اُن کو لگا کہ اُن کی بھی روح پرواز کر جائے گی۔

سدرہ کا سر انہوں نے گود میں لے لیا تھا اُس کی گردن پہ بہتے خون پر جو دوپٹا رکھا ہوا تھا، وہ خون سے نچڑ گیا تھا۔

سدرہ نے اپنی نم آنکھیں کھولیں، گاڑی بے حد تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ زلیخا بی بی دل تھامے [illegible] کر رہی تھیں۔

''بھا... بھا..بی!'' سدرہ نے بہ مشکل عائشہ کو پکارا۔

''ہاں جی آپی!'' عائشہ نے نے پیار سے اُس کے بال سہلائے، جو خون سے چپ چپ کر رہے تھے۔

''بھابی! میرا قصور.... ہی بڑا تھا، مم... مجھے سزا تو ملنی ہی تھی!'' سدرہ کی آنکھوں سے آنسو درد کی تکلیف سے مسلسل نکل رہے تھے۔

''یہ... یہ میری اما... نت!'' سدرہ نے خون آلود مٹھی کھولتے ہوئے عائشہ کے سامنے کی تو زلیخا بی بی نے بھی چونک کر اُسے دیکھا کہ اُن کی بیٹی کچھ کہنے کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ کیا ہے پتر؟'' زلیخا بی بی نے سونے کا لاکٹ سدرہ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

''میری... میرا... اُدھورا خواب ہے اماں!'' سدرہ نے روتے ہوئے کہا۔

اس کی تعبیر اور حقیقت کو جینے کی تیری بیٹی نے کتنی دعائیں اور کتنی منتیں کی تھیں پر! میرے خواب بھول گئے کہ حویلی کی لڑکی کی آنکھوں میں خواب نہیں، صرف تنہائی اور اُداسی کو اُترنے کی اجازت ملی ہے!'' سدرہ کا سانس بری طرح اُکھڑا تھا۔

''نہ بول پتر! تیری تکلیف بڑھے گی!'' زلیخا بی بی نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا اُن کی آنکھیں چھلک چھلک جا رہی تھیں۔

''بو... لنے!

بولنے... دیں اماں! اس کے... بعد... کہاں بولنے کا موقع آئے گا!'' سدرہ اُکھڑتی سانسوں کے باوجود بولنے سے باز نہ آ رہی تھی۔

''اماں! کاش... کاش اس حویلی میں... آئندہ کوئی لڑکی پیدا نہ ہو!'' سدرہ کی بات پہ زلیخا بی بی کی چیخیں نکل گئیں۔

''میری مریم... میری نگی کی قسمت... میرے جیسی... پھوپو جیسی نہ ہو!

بھا... بی! یہ میری خواہش نہیں ہے! یہ تو... میری دعا ہے ایک مرتی... ہوئی لڑکی... کی دعا!'' سدرہ نے روتے ہوئے کہا۔

جواباً عائشہ نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''ایک...ایک دعا میں اور کرتی ہوں... کہ سرفراز کے ہاں بیٹی ہو... اور اُس کے دل میں رب سوہنا... بیٹی کی محبت ڈال دے...!

اور پھر... اُس کو بیٹی کے... دکھ... میں ڈال دے!'' سدرہ کہہ کر بے ہوش ہو گئی۔

زلیخا بی بی کے رونے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا جب کہ عائشہ گم سم سدرہ کے نچڑے ہوئے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے دھیرے سے زلیخا بی بی کے ہاتھ سے لاکٹ پکڑ کر کھولا۔

''فیصل...! ڈاکٹر فیصل! اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو یہ تو عبداللہ کے دوست ہیں! وہی دوست، جس کی مدد سے عبداللہ اس گاؤں میں اسپتال بنانے کا سوچ رہے ہیں۔''

عائشہ نے کئی بار جیپ میں بیٹھے ہوئے سید عبداللہ کو فیصل کے ساتھ ملتے دیکھا تھا۔ کالے شیشوں والی اس جیپ میں اندر سے سب دکھائی دیتا تھا۔

''تو کیا؟ تو کیا سدرہ آپی رات کے اس پہر ڈاکٹر فیصل سے ملنے گئی تھیں! اگر سدرہ آپی کی یہ حالت سرفراز نے کی ہے تو ڈاکٹر فیصل کو کہاں چھوڑا ہو گا۔'' عائشہ بی بی نے دکھ سے سوچا۔

کاش آپی! آپ ہمیں اعتماد میں لے لیتیں!

کاش! آپ ہمیں بتاتیں تو شاید آج یہ قیامت صغریٰ نہ برپا ہوتی۔'' عائشہ نے پچھتاوے سے سوچا۔

''لیکن سدرہ آپی آپ کا بھی کوئی قصور نہیں ہے! جب سارے دروازے بند ہو جائیں تو چور کھڑکیاں تو آپو آپ کھل جاتی ہیں۔'' عائشہ نے سدرہ بی بی کا سر احتیاط سے سیدھا کرتے ہوئے سوچا۔

''عبداللہ کو پتا چلے گا تو اُن کا کیا تاثر ہو گا؟ وہ کیسے یہ سب کچھ برداشت کریں گے۔'' عائشہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ انہیں لگا کہ آج کی یہ تاریک گہری رات صدیوں پہ پھیل گئی ہے، جس کا اندھیرا جانے کیا کیا نگل جائے گا...

❖❖○❖❖

''وہ اپنی بھابی سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔'' نرس نے باہر آ کر کہا تھا۔

ڈاکٹرز نے سدرہ کے لیے جواب دے دیا تھا۔

سدرہ کی حالت خطرے کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، اس کا خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ گولی گردن کو چھو کر گزری تھی لیکن بہت گہرا زخم بناتے گزری تھی۔

ڈاکٹرز نے بہر حال اُس کو ایڈمٹ تو کر لیا تھا کیوں کہ ابھی اُس کے وجود میں جان باقی تھی وہ سانس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو لے رہی تھی۔ نا اُمیدی کے باوجود وہ اپنی سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ مریضہ بچ جائے۔

سدرہ کو بیچ بیچ میں تھوڑا سا ہوش آتا تھا پھر غنودگی میں چلی جاتی تھی۔

عائشہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے نرس کے ہم راہ اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کئے ہوئے س کو دیکھا وہ ہلدی کی طرح پیلی پڑی ہوئی تھی جیسے اُس میں خون کی بوند اور زندگی کی کوئی رمق باقی نہ ہو

''سدرہ!'' عائشہ نے سدرہ کا ہاتھ تھام کر اُسے پکارا تھا۔

''سدرہ۔'' عائشہ کے کتنی ہی بار پکارنے پر سدرہ نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔

''بھابی!'' سدرہ نے آنکھیں کھول کر عائشہ کو دیکھا۔ اس کو اپنے کمرے کی لائیٹ اور اِرد گرد کی ا نیلی اور کچھ دھندلی دکھائی دے رہی تھیں۔

''بھابی! میرا دل اس نیلی روشنی کو دیکھ کر گھبراتا ہے مجھے... مجھے سب کچھ صحیح اور پورا کیوں نظر نہیں رہا؟'' سدرہ کی آواز میں بے چینی تھی۔ وہ اپنا سر اِدھر اُدھر پٹخ رہی تھی۔

''سب... سب... نیلا... نیلا کیوں ہے؟

''بھابی!'' سدرہ ایک دم ہی ایسے اُٹھ بیٹھی، جیسے اُسے کچھ نہ ہوا ہو۔ جیسے اُس کے بدن میں بہ طاقت ہو۔

بھابی!'' سدرہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِردگرد دیکھا پھر ایک دم اُس کے دماغ میں سنسناہٹ ہو اور اُسے روشنی پہلے جیسی دکھائی دی، وہ ایک دم سے ہی بے حد پرسکون ہوگئی تھی۔

''اوہ میرے خدایا! مجھے لگا کہ میں مرنے لگی ہوں!'' وہ عائشہ کا ہاتھ تھام کر بے حد اُونچی آواز م بولی۔

عائشہ اُسے کندھے سے تھام کر دوبارہ لٹانے لگی۔ خود عائشہ کو بھی حیرت ہو رہی تھی کہ سدرہ میں اتن طاقت کیسے آ گئی؟ اور اسے اپنے زخم کے درد کا احساس کیوں نہیں ہو رہا ہے، گردن پہ پٹی کرنے کے باوجود خون رس رہا تھا۔

''ڈاکٹرز تو کہہ رہے تھے کہ سدرہ کی زندگی کی اُمید نہیں تو پھر یہ ایسے کیسے بھلی چنگی ہوش م ہے؟'' عائشہ کا اپنا دماغ ان سوالات کے جوابات دینے سے قاصر تھا۔

''بھابی! میں جینا چاہتی ہوں!'' سدرہ نے معصوم بچوں کی طرح عائشہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''میں... بچ جاؤں گی نا!'' وہ پوچھ رہی تھی جب کہ عائشہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اُسے مسلسل تک رہی تھیں۔

''انشاءاللہ تم بالکل ٹھیک ہو کر ہمارے ساتھ گھر چلو گی۔'' عائشہ نے سدرہ کو دعائیہ انداز میں تسلی دی۔

''ہوں!'' سدرہ نے دوبارہ سر تکیے سے ٹکاتے ہوئے کہا۔

''بھابی! میں زندگی کی کبھی حریص نہ تھی۔'' سدرہ بنا اکھڑے سانس کے بول رہی تھی۔

''لیکن اب میں جینے کی تمنا کر رہی ہوں تو زندگی مجھ سے ہٹ ہٹ کر دور جاتی ہے! جانے کیوا موت کی آہٹ بہت قریب سے سنائی دے رہی ہے!'' سدرہ نے یوں کان لگا کر سنا، جیسے وہ واقعی کم آہٹ کو محسوس کر رہی ہو۔ عائشہ نے اُسے بہت دکھی نظروں سے دیکھا۔

''بھابی مجھے کاغذ قلم چاہیے۔'' سدرہ نے فرمائش کی تھی۔

''اچھا تم لیٹ جاؤ، میں تمہیں دیتی ہوں۔'' عائشہ نے پاس پڑی ٹیبل سے ڈاکٹرز فائل نکالی، جس میں اکٹر سدرہ کی ہسٹری لکھ کر گیا تھا۔

''سدرہ اس میں تو کوئی صفحہ خالی نہیں، میں باہر کسی سے منگوا لیتی ہوں۔'' عائشہ نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں یہ... یہی دے دیں!'' سدرہ کے چہرے پہ ایک بار پھر درد کے آثار واپس آ گئے تھے۔

''یہ لو!'' عائشہ نے بال پوائنٹ اور فائل آگے رکھ دی اور سدرہ کا بیڈ گھما کر اُونچا کیا، تا کہ وہ آسانی سے لکھ سکے۔

سدرہ نے صفحے کے پیچھے بچی خالی جگہ پر مختصراً ایک تحریر لکھی تھی۔

''بھا... بی!'' سدرہ نے درد کو ضبط کرتے ہوئے عائشہ کو مخاطب کیا۔

''یہ خط! اگر میں نہ رہوں تو... یہ میری امانت ہے! وہ لاکٹ اور یہ خط آپ ڈاکٹر باؤ کو دے دینا۔''

سدرہ نے ایک دم پسینے پسینے ہوتے ہوئے کہا۔

''بھا... بی!'' سدرہ کے ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھنڈے ہو کر چھوٹے۔

''اماں... اماں کو دیکھنا ہے۔'' سدرہ کی سانس ایک بار پھر بے ترتیب ہوگئی تھی۔

''اماں!'' سدرہ نے لب پھڑ پھڑائے۔

''تائی جان!'' عائشہ نے دروازے کے باہر جھانک کر تائی اماں کو آواز دی، زلیخا بی بی دوڑتی ہوئی اندر آئیں۔

''اماں!'' سدرہ کے نیلے پڑتے ہونٹ ماں کو دیکھ کر بس ایک پل کو ہی مسکرائے تھے۔

''جی میری جان!'' زلیخا بی بی نے سدرہ کو بڑھ کر تھاما۔

''اماں! دم کر کے پھونکو نا! میں م... جے... ڈر... لگ... رہا ہے!'' پھر درد کی لہر اُٹھنے پر سدرہ نے س قدر مضبوطی سے ماں کا ہاتھ دبوچا کہ زلیخا بی بی کی ''سی'' نکل گئی تھی۔

''میرے بچے! میں تیرے پاس ہوں، ابھی دم کر دیتی ہوں!'' زلیخا بی بی کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ سدرہ کی گرفت ڈھیلی پڑ کر ایک دم ریت کی مانند پھیلی۔

''سدرہ!'' انہوں نے متوحش آنکھوں سے عائشہ کی جانب مڑ کر دیکھا، جیسے وہ اس حقیقت سے انکار کردے گی۔ جواباً عائشہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی چیخیں روک رہی تھی۔

''سدرہ!'' زلیخا بی بی نے سدرہ کو جھٹکا دیا لیکن وہ تو اُن کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔

زلیخا بی بی سر پہ ہاتھ رکھے نیچے بیٹھتی چلی گئیں، ان کا کلیجے کا ٹکڑا اُن سے جدا ہوگیا تھا۔

''میری سدرہ!........ میری سدرہ!'' وہ سدرہ کو پکارتے ہوئے مسلسل سسک رہی تھیں۔

عائشہ نے بے اختیار سدرہ کی بند آنکھوں کو پیار سے چھوا، وہ کس قدر حسین تھیں۔

''کیا سدرہ آپی کا خون خاموش رہے گا!'' عائشہ کو بے حد شدت سے کسی ایسے طوفان کی آہٹ محسوس ہو رہی تھی، جو شاید سب کچھ تہس نہس کرنے والا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

❖❖○❖❖

ہم لوگ سمندر کے بچھڑے ہوئے ساحل ہیں
اِس پار بھی تنہائی اُس پار بھی تنہائی

ساری رات آنکھوں میں جل جل کر پگھلی تھی۔ ڈاکٹر فیصل کے جسم کا بند بند دکھ رہا تھا۔

اسپتال کے پیجر پہ مسلسل پیغام آرہے تھے، یہ پیجرز ڈاکٹر کو اسپتال کی جانب سے دیے جاتے تھے اسپتال کا اپنا میسج سسٹم تھا جو ڈاکٹر کو پل پل ہر مریض کی اطلاع دیتا تھا اس لیے پرسنل موبائل صرف پرسنل کام کے لیے رکھے جاتے تھے، ان پیجر سروس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی ڈاکٹر اپنے موبائل آف ہونے کا ایکسکیوز نہ کرسکے اس لیے یہ پیجرز چوبیس گھنٹے ایکٹو رہتے تھے۔

ڈاکٹر فیصل بھی مسلسل میسجز کی بزر پہ چونک کر اُٹھے تھے، اسپتال سے کال تھی اُن کو نکلنا تھا، دوپہر میں ایک بہت بڑا آپریشن تھا۔

وہ بہت بڑے سرجن تھے، بہت نام اور پیسہ کمایا تھا جانے اتنے برسوں میں قسمت کیوں ان پہ اتنی مہربان رہی تھی کہ مشکل سے مشکل اور کم سے کم پرسنٹ چانس رکھنے والا آپریشن بھی اُن کے ہاتھوں سے کامیاب ہو جاتا تھا۔

قسمت نے اُن کے نام کے ساتھ ''کامیاب سرجن'' کا ٹیگ لگا دیا تھا، آج تک اُن کا ایک بھی آپریشن ناکام نہ ہوا تھا۔ قسمت نے اُن کی زندگی کے پہلے ہاف میں اُن سے اُن کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ ماں باپ بہن بھائی، وطن کی مٹی اور... اور ان کا دل... ان کی محبت بھی!

وہ جب بالکل خالی ہاتھ، خالی دامن ننگے پاؤں اور ننگے سر کھلے آسمان تلے کھڑے ہوکر روئے تھے تب اللہ نے اُن کی قسمت بدل ڈالی۔ وہ قسمت جو ان کا سب کچھ چھینتی آئی تھی اسے بدل کر اللہ نے انہیں قسمت عطا کی جس نے آج تک ان کو اتنا دلوایا تھا کہ وہ اکثر حیران رہ جاتے تھے۔

انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع اسپتال میں کنفرم کی اور تیار ہونے کے لیے اُٹھنے لگے۔

وارڈ روب کھول کر جیسے ہی وہ کھڑے ہوئے تو بے اختیار ان کے ہاتھ اندرونی سیف کی جانب بڑھے، انہوں نے سیف کھولا اور اُس میں سے ایک چھوٹا سا جیولری بکس نکالا، بکس میں ایک چھوٹی سی ڈبیا پڑی تھی انہوں نے احتیاط سے ڈبیا کھولی جس میں سرخ و سبز کانچ کی چھوڑیوں کے ٹکڑے تھے، اُس پرفیوم کی خالی شیشی تھی جو انہوں نے کبھی سدرہ کو دی تھی اور شرارت سے اُس پر پوری کی پوری چھڑک دی تھی۔

ایک لاکٹ تھا اور ایک کاغذ تھا۔

انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ لاکٹ نکالا اور پھر اس کو ہاتھ میں تھام کر کتنی ہی دیر دیکھتے رہے۔

''موتیا!'' ایک سسکی کی طرح یہ نام ان کے لبوں سے نکلا۔

لاکٹ پہ سدرہ کا نام کندہ تھا بالکل اُسی طرح جیسے ان کے دل پہ کندہ تھا۔ انہوں نے خط کھولا، یہ ان کی موتیا کی آخری تحریر تھی، اس کی وصیت تھی۔

''ڈاکٹر بابو! میری زندگی میں ربّ سے ایک ہی شکوہ تھا کہ آخر حویلی کی لڑکی کی قسمت ہی کیوں سیاہ

سے لکھی جاتی ہے! نسلوں سے حویلی کی لڑکیاں ان آسیب زدہ دیواروں میں چنی جاتی رہی ہیں، مجھے بچپن سے ان دیواروں، ان آئینوں سے ڈر لگتا تھا کہ میرا انجام کہیں سب جیسا نہ ہو جائے۔ اور آج میں بھی آپ کی موتیا مرجھا رہی ہے، کسی پل موت کا سامنا ہو جائے گا میں نے کہا تھا نہ کہ مجھے یہاں سے اس ملک سے لے چلو، پر تم نہ مانے، لیکن میری ایک بات ضرور مان لینا، میری روح پر پڑا بوجھ اُتر جائے گا میں تمہارے ربّ سے ناراض ہوکر نہیں جاؤں گی۔ تم میری مریم سے شادی کر لینا، اُسے اس زندان سے نکال کر لے جانا ورنہ ریت رسموں کا آسیب اُسے بھی کھا جائے گا، مریم کو وہ پیار دینا، جو تم مجھے دینا چاہتے تھے۔

مریم کو لے جانا! مرتی ہوئی لڑکی کی یہ خواہش ضرور پوری کر دینا۔ تمہاری موتیا!'' ڈاکٹر فیصل کی آنکھوں سے دو موتی نکلے، یہ بہت قیمتی تھے۔ وہ کہتی تھی کہ آنکھ سے نکلنے والا ہر آنسو، آنسو نہیں ہوتا ڈاکٹر جو دل سے نکلے وہ پانی تو جیسے سیپوں میں بارش کا قطرہ جا کر موتی بنتا ہے ویسے ہی دل سے نکلا آنسو بھی موتی ہی ہوتا ہے۔ آج یہ موتی وہ موتیا کی یاد میں اُسے نذر کر رہے تھے۔

انہوں نے موتیا کی بات رکھ لی تھی اور مریم کو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہاں لے آئے تھے انہوں نے اُسے ہمیشہ پیار سے رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے دل سے مجبور تھے جو آج بھی صرف اور صرف موتیا کا تھا۔

کچھ وعدے ایسے بھی پورے ہوتے ہیں
جو زندگی بھر کے سودے ہوتے ہیں

❖❖○❖❖

''امی جان! آپ کیسی ہیں؟'' زہرہ نے مریم کے کمرے میں آکر پوچھا۔

''ٹھیک ہوں!'' وہ کہتی ہوئی جائے نماز سے اُٹھیں۔

''تمہارے پاپا آگئے؟''

باہر گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی، گزرے دنوں میں مریم بی بی نے ڈاکٹر فیصل کو کسی دیوتا کی طرح پوجا تھا وہ ان کی زندگی کا سینٹر آف انٹرسٹ تھے۔ وہ اُن کی زندگی کا ایسا محور تھے، جس سے وہ خود کو زندہ محسوس کرتی تھیں۔ اتنے سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تین روز سے وہ اپنی ہی سوچوں اور ماضی کے محور میں گھوم رہے تھے۔

آج مریم کو احساس ہوا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہیں۔ جس شخص نے ساری عمر ان کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا وہ اپنے ماضی کے درد میں اُن کو اگنور کر گئی تھیں۔

میاں بیوی تو شریکِ زندگی ہوتے ہیں، اگر وہ سکھ آپس میں بانٹ کر جیتے ہیں تو دکھوں کے موسم اکیلے کیوں جھلیں؟ دکھ میں ساتھ ہو تو دکھ آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔

''امی! پاپا تو کب کے آگئے، آپ کا پوچھ رہے تھے میں نے کہا کہ نماز پڑھ رہی ہیں تو وہ اپنی اسٹڈی میں چلے گئے ابھی ان کو کافی دے کر آرہی ہوں۔'' زہرہ نے کمرے میں موجود بے ترتیبی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

یہ اُن کی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ ایسے بے ترتیب کمرے میں بے حد بے نیازی سے رہ رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں۔

جب من کے اِرد گرد انتشار ہو تو دکھائی نہیں دیتا چاہے وہ کتنا بھی ترتیب ہو یا بے ترتیب!

"میں اُن سے مل لوں۔ تم نے ڈنر میں کیا بنایا ہے؟" انہوں نے اتنے دن بعد کسی کام میں دل
تھی۔

"روسٹ پوٹیٹو اور چکن گرل کیا ہے عبداللہ ہی فرمائش کر کے گیا تھا۔" زہرہ نے بیڈ شیٹ د
کرتے ہوئے جواب دیا۔

"زہرہ! عبداللہ کہاں گیا، آج تو اُس کی کلاس نہ تھی۔ فرائی ڈے کو عبداللہ کا آف ہوتا تھا۔" وہ
جاتے رک کر پوچھ رہی تھیں۔

"وہ ولی بھائی کے ہاں گیا ہے ان کی کوئی ایگزیبیشن ہے اور ان کو پاکستان اسی ویک جانا ہے
لیے عبداللہ ان کو ڈسپلے میں ہیلپ کرنے گیا ہے۔" زہرہ نے لفظ لفظ ماں کے گوش گزار کر دیا وہ
بتاتی تو مریم نے سوال کر کر کے پوچھ ہی لینا تھا۔

"ولی پاکستان جا رہا ہے!"

"نہیں! وہ کیسے جا سکتا ہے!" وہ دل ہی دل میں بولیں۔

"میں تمہارے پاپا سے مل لوں!" وہ ایک بار پھر کھوئی کھوئی سی تھیں۔

"السلام علیکم!" مریم نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام! آپ نماز پڑھ رہی تھیں میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا اچھا نہ سمجھا اس لیے
آ گیا۔" ڈاکٹر فیصل نے راکنگ چیئر سے اُٹھتے ہوئے اسٹڈی روم کی مین لائیٹ آن کر دی، وہ
بہت کم روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

مریم نے بغور ان کو دیکھا۔ رتجگوں سے آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں، ان کی آنکھیں ہمیشہ
کی چغلی کھاتی تھیں۔

"آپ سوئے نہیں نا!" مریم نے فلور کشن پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تم بھی تو جاگتی رہی تھیں!" وہ دھیرے سے ہنسے۔ مریم نے ایک دم نگاہ چرائی۔

"آئی ایم سوری! میں شاید خود میں نہ تھی، کبھی کبھی گہرے زخم اچانک ہی منہ کھول بیٹھتے ہیں ک
آپ بس میں نہیں ہوتا۔"

"نیور مائینڈ! تم دل پہ نہ لو!" ڈاکٹر فیصل نے حسبِ معمول ان کو ہمیشہ کی طرح کسی بھی وضاحت
بچاتے ہوئے کہا۔

"جانے کیسا ہے یہ شخص، ساری عمر بس دیتا ہی آیا ہے اور بدلے میں کبھی ایک پل بھی نہیں ما
مریم نے ڈاکٹر فیصل کو بے حد پیار سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

یہ شخص اَن مول ہیرا تھا جو ان کی آپی کی محبت تھا اور... اس کی بڑے دل والی آپی اپنی جان گنوا ک
ہیرا ان کی جھولی میں ڈال گئی تھیں اور کتنے بڑے دل والا! یہ شخص تھا کہ آج تک اپنے دل کی کہے
صرف اور صرف ان کے دل کی سنتا اور دیکھتا آیا تھا، ان کے اپنے دل میں کیا چل رہا ہے کبھی نہ بتا

ہے۔

"آپ نے مجھے ساری عمر اتنا کچھ دیا ہے فیصل کہ میں آپ کی کتنی بھی مشکور رہوں کم ہے۔" مریم نے
کہا۔

"استغفراللہ! میں کون ہوتا ہوں دینے والا۔" ڈاکٹر فیصل نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"نہیں فیصل! مجھے کہنے دیں، جو اللہ کے بندوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا وہ بھلا اللہ کا شکر کیسے ادا کرے
گا۔" مریم نے دھیرے سے جواب دیا۔

"فیصل پلیز! ایک اور چیز! آخری بار!" وہ رک رک کر بولیں۔

"آپ پلیز پاکستان جانے کی بندش ختم کر دیں۔" مریم نے بے حد آس بھری نظروں سے ڈاکٹر فیصل
کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر فیصل نے بے حد گہری نظروں سے ان کو دیکھا۔

"اب وہاں کیا رہ گیا ہے اور کس کے لیے جائیں؟" ڈاکٹر فیصل کی نگاہوں میں اماں ابا اور بھائی
بھر کی لاشیں گھوم گئی تھیں اور نفیسہ! اس کی تو لاش بھی نہ مل سکی تھی۔

"مٹی! مٹی کا رشتہ تو سب سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے نا، وہ ہمارا وطن ہے وہاں کے سارے لوگ
ہمارے اپنے ہیں۔" مریم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ! اپنے!" ڈاکٹر فیصل نے "اپنے" کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔

"تم بھول رہی ہو تو میں یاد کروا دیتا ہوں ان اپنوں نے ہمارے پیاروں کو کس بے رحمی سے مار ڈالا
تھا۔ میرے پیاروں کو ان اپنوں نے مارا تھا نا! سید سرفراز علی نے پولیس بھیج کر جھوٹ ڈاکو کا ڈراما رچا کر
ان کے پورے خاندان کو مروا ڈالا اور گاؤں کے کسی ایک فرد نے ان کے قتل کی گواہی نہ دی تھی کیوں کہ
ہمارے گاؤں والے ایک گواہی دینے والے کے گھر کو عبرت کا نشانہ بنا دیکھ چکے تھے۔ اور تمہارے...
تمہارے گھر والوں کو بھی تو سب کے سب کو زندہ جلا ڈالا گیا تھا۔" ڈاکٹر فیصل کی بات پہ مریم کا چہرہ سیاہ
ہو گیا۔

"میرا دوست عبداللہ! اس کا اتنا ہی قصور تھا نا کہ وہ صدیوں سے چلی آئی خون آشام رسموں کے
خلاف تھا۔" ڈاکٹر فیصل کا سید عبداللہ کا تصور آتے ہی لہجہ بھیگ گیا تھا۔

"سنیے، وہ بچہ! وہ عبدالولی ہمارا بچہ ہے، میرا دل کہتا ہے۔"

"لاکھ کسی کی شکل کسی سے کتنی کیوں نہ ملتی ہو وہ اپنا نہیں ہوتا مریم!" ڈاکٹر فیصل نے سپاٹ لہجے میں
کہا۔

"نہیں فیصل! میں نے اس کی شکل میں کچھ نہیں پایا بلکہ میں نے تو اسے اس کی خوشبو سے پہچانا
ہے، اور خوشبو دھوکا نہیں دے سکتی۔" مریم نے بے حد وثوق سے کہا۔

ڈاکٹر فیصل نے چونک کر ان کی جانب دیکھا بالکل یہی احساس انہوں نے بھی ولی سے مل کر پایا تھا۔

"اور اگر تم کو وہاں جا کر مایوسی ہوئی تو؟" ڈاکٹر فیصل نے پوچھا۔

"نہیں! میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہماری پہچان ہے!" مریم نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پلیز آپ جانے کی حامی بھرلیں، میرا دل کرتا ہے کہ میں اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔''مریم نے شدت سے اظہار کیا۔

ڈاکٹر فیصل نے بہ غور اُن کو دیکھا، کیا کچھ نہ تھا اُن کی آنکھوں میں۔ڈاکٹر فیصل کو لگا کہ اگر انہوں نے انکار کردیا تو مریم کے دل میں ساری عمر کسک اور محرومی رہ جانی تھی۔

''ٹھیک ہے ہم چلیں گے۔''مریم کو یوں لگا جیسے ان کو دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔

''شکریہ فیصل۔''مریم نے فوراً ممنون ہوتے ہوئے کہا۔

''میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں!''مریم نے جاتے جاتے کہا۔

''کیا؟''ڈاکٹر فیصل نے تھکے تھکے انداز میں پوچھا۔

''میں جلد از جلد جانا چاہتی ہوں۔''مریم نے کچھ ہچکچاہٹ سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے!''ڈاکٹر فیصل نے بے جان ہوتے دل سے کہا۔بعض اوقات وعدے نبھانے میں انسان خود پہ بہت ظلم کر جاتا ہے۔

مریم کو ہمیشہ خوش رکھنے کا وعدہ کر کے وہ اب تک نبھاتے آئے تھے اور آج بھی اُسی وعدے کو نبھانے کے لیے انہوں نے دل پہ بے حد جبر کر کے پاکستان جانے کی ہامی بھرلی تھی۔

ہیں خزاں کے دن کوئی گل کھلا نہیں سکتا
دل میں جو بس جائے دل سے جا نہیں سکتا
ہم اُسی کی یادوں میں رات دن رہیں کھوئے
لوٹ کر جو جیون میں اپنے آ نہیں سکتا

''میں وہاں کبھی نہیں جانا چاہتا تھا۔اُن فضاؤں میں جہاں تم نے آخری سانسیں لی تھیں لیکن تم ہی کیا وعدہ پورا کروں گا،مریم کی خوشی کی خاطر جاؤں گا۔''

کچھ فیصلے یوں بھی ہوتے ہیں!
دل پہ پاؤں رکھ کر پورے ہوتے ہیں۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم خالہ!''دروازہ غزالہ نے کھولا تھا روشن آرا بیگم کو دیکھ کر وہ خوشی سے کھل گئیں۔

''وعلیکم سلام! جیتی رہو۔''روشن آرا بیگم نگی کے ساتھ اندر داخل ہوتے بولیں۔

''امی! روشن خالہ آئی ہیں، نگینہ باجی بھی ہیں۔''غزالہ تقریباً اچھلتی ہوئی اندر اطلاع دینے گئی۔

''ارے! آپا آئی ہیں؟''حسن آرا، انور صاحب کو سیب کاٹ کر دے رہی تھیں ایک دم ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''السلام علیکم خالہ!''نگینہ نے کمرے میں قدم رکھتے ہی سلام کیا۔

''السلام علیکم خالو! آپ کیسے ہیں؟''نگینہ نے حسن آرا بیگم کے گلے لگتے انور صاحب کا دریافت کیا۔

''السلام علیکم بھائی صاحب!''روشن آرا بیگم نے بہنوئی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام!''انور صاحب نے نقاہت سے جواب دیا، وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے، ان کا چہرہ ایسا لگتا جیسے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو چہرے کی پیلاہٹ اور پھیکا پن بے حد واضح تھا۔

''حسن آرا! علیزے کو بلواؤ میں اُس کا جوڑا لائی ہوں، اللہ کرے بچی کو پسند آ جائے۔''انہوں نے کہتے ہوئے سی گرین اور مسٹرڈ کلر کا شرارہ سوٹ سامنے پھیلا دیا۔

اس قدر شان دار اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والا کام حسن آرا بیگم نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

''بلاشبہ علیزے اس لباس میں شہزادی لگے گی۔''یہ خیال فوری تھا جو حسن آرا بیگم کے دل میں آیا۔

انور صاحب نے بھی بے حد دلچسپی سے لباس کو دیکھا، یہ صرف شادی کا جوڑا نہیں بلکہ انور صاحب کی بیٹی کا سب سے بڑا ارمان تھا۔

''آپا! کیوں نہیں پسند آئے گا! آپ اتنے پیار سے لائی ہیں اور پھر اتنا خوب صورت ہے کہ علیزے اسے پہن کر شہزادی لگے گی۔''

''ارے! علیزے تو پہلے ہی شہزادی ہے، میری شہزادی کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ پر وہ میری اتنی پیاری بیٹی ہے کہ میرا دل کرتا ہے میں اُس کے لیے دنیا کی سب سے بہترین چیز خریدوں۔''روشن آرا بیگم کو علیزے اور ولی سے بے حد محبت تھی اور وہ اس شادی میں ہر ہر موقعے پر اپنی محبت کا اظہار عملی طور پر کرنا چاہتی تھیں۔

''اللہ کتنا پیارا ہے! ہے نا آپی؟''غزالہ نے اپنی عمر کی طرح اپنے شوق اور پسندگی کا اظہار کیا۔

وہ اور علیزے دونوں چائے اور کچھ لوازمات ٹرے میں اُٹھائے اندر آئی تھیں، علیزے نے گڈو کو ارجنٹ سروس کا الگ انعام دیا تھا، جو بازار سے بھاگ کر اشیا خرید کر لایا تھا۔

''السلام علیکم خالہ جان!''علیزے نے چائے کی ٹرے تپائی پہ رکھتے ہوئے اپنا سر روشن آرا بیگم کے سامنے جھکاتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام! اللہ تمہیں زندگی کی ہر ہر نعمت سے نوازے۔''روشن آرا بیگم نے حسب عادت دُعا کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔

''بیٹا! اِدھر میرے پاس آ کر بیٹھو!''انہوں نے ہاتھ تھام کر علیزے کو اپنے پاس بٹھالیا۔

''یہ تمہارا شادی کا جوڑا ہے، تمہیں پسند آیا، اگر کلر میں کوئی پرابلم ہو تو وہ بدلا جاسکتا ہے۔''روشن آرا نے جوڑا علیزے کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

جواباً علیزے کے چہرے پہ شرم و حیا کا عکس تھا وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا گئی۔

اور یہی شرم و حیا ولی کا دل چرا گئی تھی ساری عمر لڑکیوں کے لیے ہاٹ کیک کی طرح رہنے کی وجہ سے اسے وہ لڑکی پُرکشش لگی تھی، جو دل بھر کر حیا دار تھی۔ اُسے علیزے میں روشن آرا بیگم کی جھلک نظر آتی تھا۔

''بھابی کو پسند آ گیا ہے اماں جان!''نگینہ نے مسکراتے ہوئے علیزے کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔''روشن آرا بیگم نے علیزے کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔

علیزے نے شرما کر سر مزید جھکا لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بھائی آرہے ہیں بھابی!" نگینہ نے علیزے کے کان میں سرگوشی کی، جواباً علیزے کے چہرے پر بہت شرمیلی مسکان تھی۔

"بس کریں بھابی! اور کتنا سرخ ہوں گی۔" نگینہ نے ہنستے ہوئے کہا تو علیزے نے وہاں سے اُٹھنے کی کی۔

"بھابی! جلدی جلدی تیار ہو جائیں، ابھی جیولر کے ہاں جانا ہے۔" نگینہ نے اُس کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

"نہیں چندا! تم جو چوائس کروگی یقیناً بہترین ہوگا پلیز مجھ سے نہیں ہوتی یہ جیولری کی شاپنگ۔" علیزے نے بے حد سہولت سے انکار کیا۔

"جانا تو پڑے گا، اماں جان کا حکم ہے۔" نگینہ نے بسکٹ کا ٹکرا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا! چلی جاؤ، آپا اتنے پیار سے کہہ رہی ہیں انکار کرنا اچھی بات نہیں۔" حسن آرا بیگم بھی اُن کے پیچھے چلی آئیں۔

"امی پلیز! مجھے کہاں کوئی تجربہ ہے سونے کے زیور خریدنے کا، خالہ تو بہت بہترین شاپنگ کرتی ہیں۔" علیزے نے اپنے من کی بات کہی۔

"چلی جاؤ بیٹا! بات پسند نہ پسند کی نہیں ہے بات تو اُن کی چاہت کی ہے تمہارا ساتھ ان کی خوشی کو بڑھائے گا۔" حسن آرا بیگم کی بات پہ علیزے نے اثبات میں سرہلایا اور لباس تبدیل کرنے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

انور صاحب کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے سامنے کھڑکی سے نظر آتا منظر اُس کے قدم روک گیا۔

انور صاحب ہاتھ جوڑے روشن آرا بیگم کے سامنے لیٹے تھے۔

"شرمندہ نہ کریں بھائی صاحب!" روشن آرا بیگم نے نم آنکھوں سے کہا۔

"کتنے سال میں نے آپ کو اس راز کے لیے بلیک میل کیا ہے، کتنا ہی پیسہ میں نے کھایا لیکن آپ نے کبھی کچھ نہیں کہا، کبھی بھی کسی بات کی تردید کی نہ تائید، بس مجھے دیتی ہی چلی گئیں۔" انور صاحب کے لہجے میں بے حد دُکھ تھا۔

"سوچتا ہوں کہ میں نے آپ کو کتنے برس کتنا زیادہ ستایا۔" انور صاحب کے لفظ لفظ میں شرمندگی تھی۔

"جو بیت گیا وہ بیت گیا، اب اُس دکھ پر مزید دکھی ہونا کہاں کی عقل مندی ہے۔" روشن آرا بیگم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

واقعی! کتنے سال انور صاحب اُن کو عبدالولی اور نگینہ کے راز کو لے کر بلیک میل کرتے آئے تھے، بات نہ احمد شاہ کو معلوم تھی اور نہ ہی حُسن آرا بیگم کو... لاکھوں کے حساب سے انور صاحب نے پیسہ لے کر اُڑایا تھا لیکن آج وقت نے ان کے دل پہ اتنی کاری ضرب لگائی تھی کہ وہ بے اختیار بلبلا اُٹھے تھے۔

"درد جب تک خود پہ نہ اُترے کہاں اپنا احساس کروا پاتا ہے، میں بہت شرمندہ ہوں۔" انور صاحب

ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے معاف نہ کریں گی تو میں خود کو پُرسکون محسوس نہیں کرسکوں گا۔" انور صاحب نے بے حد ملال سے کہا۔

"اگر آپ کو میرے کہنے سے تسلی ملتی ہے تو ٹھیک ہے میں آپ کو معاف کرتی ہوں۔" روشن آرا بیگم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

انور صاحب کا چہرہ ایک دم پُرسکون ہوگیا۔

"یہ کس راز کے متعلق بات کررہے ہیں اور کس بات کے لیے معافی مانگ رہے ہیں؟" علیزے نے الجھن سے سوچا۔

"بھابی! دیر ہورہی ہے آپ کہاں گم ہیں؟" نگینہ نے علیزے کے پیچھے آکر کندھے سے لگتے ہوئے کہا۔

"آں... ہاں! بس دو منٹ!"

علیزے ابھی تک اُلجھی ہوئی تھی لیکن نگینہ کی جلدی جلدی پکار پر آخر وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

اور جب وہ روشن آرا بیگم اور نگینہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے روشن آرا بیگم کا چہرہ بغور دیکھا۔

"یہ عورت! جو میری ماں کی ماں جائی ہے ہمیشہ ہمارے خاندان کی مدد کرتی آئی ہے، اس بار کون سے قصور کی معافی دے کر یہ مزید بلندی کا سفر طے کرگئی ہے۔" علیزے نے اُن کے چہرے پہ کچھ پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ حاصل کرپائی کیوں کہ وہاں ہمیشہ کی طرح نرم سی مسکراہٹ تھی۔

علیزے کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی سی ضرور ان جیسی بڑے دل والی بن جائے۔

کچھ لوگ تو خوشبو کی طرح ہوتے ہیں جس کے پاس ہوں دل و دماغ کو معطر کردیتے ہیں۔ بُرے لوگوں کی مثال بالکل گندے جوہڑ کی طرح ہوتی ہے، جو دل و دماغ کے لیے سڑاند بھری فضا جیسے ثابت ہوتے ہیں۔

علیزے نے بھی روشن آرا بیگم جیسی خوشبو دار شخصیت بننے کی شدت سے دعا کی، گاڑی ہلکے سے جھٹکے سے رکی۔

"بیٹا اُترو! یہ شیخ عبدالرحمٰن ہمارے خاندانی جیولر ہیں، تم جیسا زیور چاہو گی یہ ڈیزائن کردیں گے۔" روشن آرا نے دکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے علیزے سے کہا۔

اسی پل علیزے سامنے سے آتے ہٹے کٹے شخص سے ٹکرائی تھی۔

"آپ کو نظر نہیں آتا؟" نگینہ نے فوراً علیزے کا ہاتھ تھام کر اسے سہارا دیا اور سامنے والے شخص سے ...ی تھی۔

"معافی چاہتا ہوں خاتون!" بظاہر بدمعاشوں جیسے حلیے والے شخص نے معذرت کر کے علیزے اور نگینہ دونوں کو حیران کردیا۔

اس آدمی کے ساتھ موجود عورت جو کہ نیم برہنہ ساڑی میں ملبوس نگینہ کو بہ غور دیکھ رہی تھی۔ اُس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں کی چمک نگینہ کو دیکھ کر کچھ اور بڑی تھی۔

جیسے ہی نگینہ اور علیزے جیولر شاپ میں گئیں وہ عورت اُس مرد کی جانب دیکھ کر بہت معنیٰ خیز انداز میں مسکرائی۔

"ایسا حُسن! یہاں بازاروں میں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں!" وہ گاڑی کی جانب بڑھی تو تھی لیکن گاڑی میں جا کر بیٹھی نہ تھی۔

اُس کی نگاہیں مسلسل شیشے کے پار موجود لڑکیوں پہ تھی۔

"اُف توبہ! کیا گڑیا جیسی ہیں۔ اتنا حُسن اور معصومیت بہت کم ایک ساتھ ہوتی ہیں۔" وہ تقریباً ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

"جی میڈم! لڑکیاں واقعی بہت زبردست ہیں۔"

"اور اس میں بھی ایک بڑی زبردست اطلاع ہے آپ کے لیے۔" مرد نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

جواباً عورت نے اَبرو چڑھا کر اشارے سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ان میں سے ایک اَن مول ہیرا طارق صاحب کی بہن ہے!" پرویز نے ہنستے ہوئے اطلاع دی تھی۔

"اوہ!" میڈم راگنی نے اپنی آنکھیں تھوڑی سی میچ کر پُرسوچ نگاہوں سے شیشے کی دیوار کے پار دیکھا۔

"ان میں سے کون سی والی ہے؟" اس بار اُس کا لہجہ انگارے بھرا ہوا تھا۔

"وہ جس نے نیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔" پرویز نے نگینہ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

"جس وقت انہوں نے طارق پہ حملہ کیا تھا تو نگینہ اُس کے ساتھ تھی، پھر کئی بار جب انہوں نے طارق کا پیچھا کیا تھا تو نگینہ ہی اُس کے ساتھ تھی اس لیے وہ نگینہ کو سائرہ کی جگہ سمجھ بیٹھے تھے۔"

"پرویز! سانپ کا وار تب کبھی خالی نہیں جاتا جب اُس کے اندر بدلے کی آگ اُسے جھلسا رہی ہو۔" میڈم راگنی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"پرویز!" میڈم راگنی نے ایک دم اُس کی جانب مڑ کر اُسے پکارا۔

"جی میڈم!" پرویز نے فوراً تابع داری سے پوچھا۔ وہ اپنی مالکن کے ہر تیور کو پہچانتا تھا وہ جان گیا کہ میڈم راگنی کی آنکھوں سے نکلنے والے شرارے یقیناً اب کسی کو ضرور بھسم کریں گے۔

"مارک کو کہو کہ انڈر گراؤنڈ سے نکل آئے، بدلے کا اور کام کا وقت آ چکا ہے۔" میڈم راگنی کا لہجہ حد سرد تھا۔

پھر اُس نے نگینہ کی جانب انگلی سے اشارہ کر کے پرویز کی جانب دیکھا۔

"اوکے میڈم! میں سمجھ گیا۔" پرویز نے اپنے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

دور جیولر کی شاپ میں بیٹھی معصوم نگینہ کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ کسی کی میلی نگاہ اُس کے گرد آزمائش کا شکنجہ کس رہی تھی۔

وہ کسی کی غلط فہمی کا شکار ہونے جا رہی تھی۔

میڈم راگنی نے تسلی سے گاڑی میں بیٹھ کر ایک بار پھر لڑکیوں کی جانب دیکھا۔

"انمول ہیرے ہمارے ہاں ہی بکتے ہیں!" وہ باآواز بلند بولی۔

"اُن کے قدر دان بھی ہمارے ہاں ہیں اور صحیح قیمت بھی!" اور آگے بیٹھا پرویز دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اُس نے اتنی اہم اطلاع میڈم راگنی کو دی تھی یقیناً بگ باس تک اُس کی رپورٹ اچھی جائے گی۔

بعض اوقات جو کسی کے لیے اچھا ہوتا ہے، وہ دوسرے کے لیے بہت برا ہوتا ہے۔

❖❖○❖❖

احمد شاہ عشا کی نماز پڑھ کر ابھی لیٹے ہی تھے کہ ان کے موبائل پر مسلسل بیل ہوئی۔ احمد شاہ نے موبائل اُٹھا کر اسکرین پر آئے نمبر کو دیکھا، یہ اَن نون نمبر تھا۔

"یہ کس کا نمبر ہے؟" انہوں نے سوچا پھر اُسے اگنور کر دیا وہ اَن نون نمبر لیا نہیں کرتے تھے۔ لیکن پھر کیا سوچ کر انہوں نے فون اٹینڈ کر لیا۔

شاید دفتر میں کسی کو ضرورت پڑی تھی ورنہ اس وقت اُن کو کس نے فون کرنا ہے۔

انہوں نے جیسے ہی فون اُٹھایا، دوسری جانب سے بے حد بھاری آواز میں سلام کیا گیا۔

"وعلیکم السلام! کون صاحب بات کر رہے ہیں۔" احمد شاہ نے پوچھا، دوسری جانب سے کوئی ہنسا تھا۔

"کمال ہے اب تو رشتے داری ہونے والی ہے، آپ ہمیں کیسے بھول گئے۔" سید سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کون؟" احمد شاہ کے ماتھے پر تیوری بے حد واضح تھی وہ شاید ٹھیک ٹھیک بندے تک پہنچ گئے تھے۔

"سید سرفراز علی عرض کر رہا ہوں!" اس نے بے حد خوش گوار موڈ میں کہا اور دوسری جانب احمد شاہ کا اضطراب ہونے لگا۔

"مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی، حیرت ہے میرا پرسنل نمبر آپ تک کیسے آ گیا۔" احمد شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"وہی تو! اس سے اندازہ کر لیں کہ ہم جو پانا چاہیں وہ ہمیشہ پا لیتے ہیں۔" سید سرفراز نے رعونت سے کہا۔

"ہونہہ! فون نمبر حاصل کرنا کوئی بہت بڑی بات نہیں۔" احمد شاہ نے کہا۔

"جناب! آپ سید سرفراز کو بہت انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہیں، آپ مجھے جانتے نہیں ہیں۔" سید سرفراز نے بے حد پُرسکون انداز میں کہا۔

"اور میں آپ کو جاننا بھی نہیں چاہتا۔" یہ کہہ کر احمد شاہ نے فون بند کر دیا، لیکن فوراً سید سرفراز علی کا فون پھر آ گیا۔

"فون بند نہ کیجیے گا جناب! میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔" وہ کڑک کر بولا۔

احمد شاہ نے ناگواری سے فون کو دیکھا۔

"آپ سے میں جو بات کر کے آیا تھا آپ نے اُس بات کے متعلق کیا سوچا؟" سید سرفراز علی نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوچھا۔

’’میرا خیال ہے آپ سمجھ دار انسان ہیں انکار کا مطلب انکار ہی ہوتا ہے۔‘‘احمد شاہ نے بے حد ٹھل سے کہا۔

’’ایسا کیسے ہوسکتا ہے!‘‘سید سرفراز علی نے اونچی آواز میں کہا۔

’’آپ کا بیٹا میری بیٹی کی زندگی تباہ کرکے کسی اور سے شادی نہیں کرسکتا۔‘‘سید سرفراز نے فون پر گرجتے ہوئے کہا۔

’’میرا بیٹا ہے عبدالولی! اور میں جانتا ہوں کہ میرے بیٹے نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندگی ہو یا پریشانی اُٹھانی پڑے۔‘‘احمد شاہ نے بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔

’’تو آپ آرام سے میری بات نہیں مانیں گے۔‘‘ سید سرفراز علی نے کہا۔

’’عبدالولی کا نکاح ہماری بھانجی سے ہورہا ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔‘‘احمد شاہ نے کہہ کرفون کال پہلے بند کی اور پھر فون سیٹ بھی بند کردیا۔

سید سرفراز علی نے ہاتھ میں تھاما فون سیٹ زور سے کھینچ کر دیوار پہ دے مارا۔

’’پاشا!‘‘انہوں نے گرج کر اپنے خادم خاص کو آواز دی تو ایک نہایت اونچی اور مضبوط ڈیل ڈول کا مرد اندر داخل ہوا۔

’’جی سائیں!‘‘وہ ہاتھ باندھ کر پوچھ رہا تھا۔

’’پاشا!عبدالولی کی ایک بہن ہے نا!‘‘انہوں نے پرسوچ انداز میں پوچھا۔

’’کسی کالج میں پڑھتی ہے سائیں!‘‘پاشا نے جواب دیا۔

’’ٹھیک ہے اُسے اُٹھالو۔‘‘سید سرفراز علی نے بے حد ظالمانہ لہجے میں کہا۔

’’جی سائیں؟‘‘خادم خاص نے حیران ہوکر سید سرفراز کی شکل دیکھی، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ سید سرفراز اس خاندان میں چھوٹی بی بی کی شادی کرنا چاہتے ہیں تو پھر وہ دشمنی مول کیوں لے رہے ہیں۔

’’سائیں چھوٹی بی بی کے لیے مسئلہ نہ بن جائے۔‘‘

اُس نے وفاداری نبھاتے ہوئے مشورہ دیا۔

’’وہ لوگ رشتہ نہیں دے رہے اور سید سرفراز کو زبردستی ہر چیز لینی آتی ہے...میں دیکھتا ہوں کہ اپنی لڑکی کو بچانے کے لیے کیسے یہ رشتہ نہیں کرتے۔اگر نہ کیا تو میں اس لڑکی کے ساتھ وہ کروں گا کہ احمد شاہ کی سات نسلیں یاد کریں گی کہ اُس نے کس کو انکار کیا تھا۔‘‘سید سرفراز نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے سائیں! کام ہوجائے گا۔‘‘

پاشا کہہ کر باہر نکل گیا جب کہ سید سرفراز علی اپنی مونچھیں مروڑتے مسلسل ایک شیطانی منصوبہ بنا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

’’ہیلو میڈم!مارک بول رہا ہوں،آپ نے یاد کیا تھا۔‘‘ مارک نے راگنی میڈم کو فون کیا۔

"ہاں!تمہارے لیے کام آیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تم اس کام کو ضرور کرنا چاہو گے۔‘‘

اور پھر میڈم راگنی نے جو کچھ مارک سے کہا تھا اُس کو سُن کر مارک نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"مان گئے اُستاد راگنی!آپ تو واقعی بہت بڑا دماغ رکھتی ہیں۔‘‘مارک نے خوش ہوکر میڈم راگنی کی بات کی،وہ بگ باس کا خاص بندہ تھا اور میڈم راگنی کا بھی منہ چڑھا تھا۔

"میڈم! آپ نے کمال کا بدلہ سوچا ہے کہ طوطے میں پھنسی طارق کی جان اب تو ضرور نکلے گی کیوں جب اس کا طوطا تو ہم اُٹھا لائیں گے۔‘‘جواباً میڈم راگنی اور مارک کا قہقہہ ایک ساتھ بلند ہوا۔

❁

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں
تم مجھے اچھے لگتے ہو
بہت زیادہ
بہت ہی زیادہ!

طارق نے مسکرا کر کارڈ بند کیا، اُس کا چہرہ کسی ستارے کی طرح دمک رہا تھا۔ بے حد نمایاں ا خوشیاں دِل سے تعلق رکھتی ہیں، وہ چہرے پر بھی چمکتی ہیں۔

یہ ننھا منا اور بے حد سادہ الفاظ میں اظہار نگینہ کی جانب سے تھا۔

رات شہباز صاحب نے طارق کی صحت یابی کی خوشی میں اپنے احباب کو ڈنر دیا تھا۔ نگینہ بھی آئی بہ ظاہر وہ اُسے Get well soon کا کارڈ سب کے سامنے دے کر گئی تھی لیکن طارق کے دل خوش گمانی تھی کہ کارڈ میں اُس کے لیے کچھ اور بھی ہوگا اِس لیے اُس نے یہ کارڈ فوراً الگ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

خوش گمانیاں جو دُعا کے ریپر میں لپٹی ہوں، وہ ہمیشہ پوری ہوتی ہیں۔ کارڈ کھولتے ہی طارق چہرے پر بے اختیار سی مسکراہٹ تھی۔

واقعی نگینہ کا چھوٹا سا اظہار طارق کو بے حد خوشی دے گیا تھا۔

''لالہ! کس بات کو لے کر اتنا مسکرایا جارہا ہے۔'' سائرہ ہاتھ میں چائے کا مگ اُٹھائے کمرے داخل ہوئی تو اس نے مسکراتے بھائی سے پوچھا۔

''گیس؟'' طارق نے خوش دلی سے اُسی سے پوچھا۔

''نگی؟'' سائرہ نے گرم گرم چائے کا کپ طارق کو تھماتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''زبردست! مبارک ہو آپ تو ولی ہوگئی ہیں، الہامی طاقت تو بہت اچھی ہے آپ کی۔'' طارق ہنستے ہوئے اقرار کیا۔

''میں کیا ولی اللہ ہوں گی، آپ کے تو چہرے پر ساری کہانی لکھی ہے، کوئی ان پڑھ بھی جانا ہے۔'' سائرہ نے بے حد اطمینان سے بیڈ سے کمر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''کیا اتنا Obvious ہے؟'' طارق نے چونک کر پوچھا۔ کیوں کہ آج کل سحرش بھی بہت کرا لگی تھی۔ شاید طارق کا چہرہ ہی راز افشا کرتا رہا تھا۔

''جی جناب!'' سائرہ، بھائی کی بوکھلاہٹ پر محظوظ ہوئی۔

''اوہ!'' طارق نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

بھائی کو یوں پریشان دیکھ کر سائرہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''لالہ! آپ سے ایک بات کہوں؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''ہوں!'' طارق نے صرف ہوں کہہ کر اجازت دی۔

''لالہ! بہت انتظار کرلیا آپ نے نگینہ کا، اب آپ کو کوئی لیگل اسٹیپ اُٹھالینا چاہیے، آئی مین اب ل بھیجنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ابھی تو یہ بالکل پراپر ٹائم ہے لیکن مزید ویٹ کریں گے تو لیٹ! کیوں کہ اچھی لڑکی ہے کوئی بھی لے کر اُڑ سکتا ہے۔'' سائرہ نے بے حد اہم پہلو کی جانب دلائی تھی۔

''میں نہیں چاہتی کہ میرے لالہ کی اتنے برسوں کی محبت کسی Loss کو فیس کرے۔'' سائرہ نے گی سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' (اب تو ہم سے دور بھی نہیں رہا جارہا ہے) طارق نے بات کا دوسرا حصہ دِل کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، دیر تو ایک دن کی کیا ایک پَل کی بھی نہیں ہونی چاہیے میں ابھی ابو سے بات کروں اس سے پہلے کوئی اور پروپوزل آپ کی محبت میں ظالم سماج بن کر آجائے۔'' سائرہ نے کھڑے ے ہوئے کہا۔

''تم ابھی بات کروگی؟'' طارق نے حیرت سے اُس کی جلد بازی کو دیکھا۔

''بالکل جناب! نیک کام میں ویسے بھی دیر نہیں کرنی چاہیے یہ کام تو آل ریڈی آپ کی شرم و حیا کی سے بہت لیٹ ہوچکا۔'' سائرہ نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔

''ارے! رکو تو سہی۔'' طارق اس کی جلد بازی پر بوکھلا کر رہ گیا۔

''اگر کوئی ٹیکنیکل پرابلم نہیں ہے تو پلیز! پلیز لالہ لیٹ می گو۔'' سائرہ چاہتی تھی کہ مکان کے بعد جو ل کا خانہ زندگی سے خالی ہوگیا، وہ نگی کی ذات سے بھر جائے، اس لیے وہ بہت جلد باز ہورہی تھی۔

''نہیں! کوئی ایسا ویسا پرابلم تو نہیں ہے لیکن...''

طارق کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے سحرش والے پرابلم کو ڈس کلوز کرے، وہ بُری طرح پھنس گیا نگینہ اُس کی زندگی تھی اور وہ اپنی زندگی سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا۔

اس لیے اُس نے سوچا کہ اُسے سائرہ کو روکنا نہیں چاہیے۔

''اوکے! کرلو بات!'' طارق نے حتمی فیصلے پر پہنچ کر مسکرا کر کہا۔

''ویٹس گریٹ!'' سائرہ خوش ہوکر باہر کی جانب لپکی۔

طارق کچھ دیر تو بے چینی سے کمرے کے چکر لگاتا رہا۔ پھر جب اُس سے برداشت نہ ہوا تو وہ بھی ائرہ کے پیچھے لپکا۔ سامنے لان میں ڈاکٹر شہباز چیئر پر بیٹھے تھے اُن کا پالا ہوا مور کا بچہ جو اب کچھ بڑا ہوگیا تھا اُن کے اِرد گرد منڈلا رہا تھا۔ سائرہ ان کے کندھے سے لگی راز و نیاز کرنے میں مشغول تھی،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طارق جیسے با اعتماد شخص کو ایسے موقعے پر بے حد جھجک محسوس ہوئی۔

طارق پر پہلی نظر شہباز صاحب کی ہی پڑی۔

"یار! اِدھر آ جاؤ، وہاں کیوں کھڑے ہو؟" شہباز صاحب نے میٹھی نظروں سے طارق کو دیکھتے ہوئے کہا اُن کے چہرے پر خوشی بے حد نمایاں تھی۔ طارق چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ان کے سامنے آ بیٹھا طارق کا شدت سے دِل چاہا کہ وہ اپنے والد کے تاثرات جان سکے کہ وہ اِس رشتے کے حامی ہیں یا نہیں۔

"طارق! یار تمہارا انتخاب بالکل اچھا نہیں ہے۔" شہباز صاحب کی بات پر سائرہ اور طارق کے چہروں کا رنگ بے اختیار بدل گیا۔

"انتخاب اچھا نہیں ہے! لیکن لاجواب ضرور ہے۔ یارنگی تو بہت پیاری اور نیک بچی ہے۔" شہباز صاحب کی بات پر دونوں کے رُکے سانس اور پھیکے چہرے بحال ہو گئے۔

"لو جان! آپ خوش ہیں نا؟" طارق نے ایسے سوال کیا جیسے کوئی چھوٹا بچہ آس سے پوچھتا ہے۔

"بالکل! پھر احمد شاہ تو میرا بہت پیارا دوست ہے اُس کی ذات کی روشنی اُس کی اولاد میں سے پھوٹ رہی ہے وہ لڑکی ہمارے گھر کا نصیب بنے اِس سے زیادہ ہماری خوش قسمتی کیا ہوگی۔" شہباز صاحب نے طارق کی پسند کو اپنے لفظوں سے مزید مان دے ڈالا۔

"تھینک یو لو جان!" سائرہ نے اُن کے سر پر اپنا چہرہ جما کر کہا۔ وہ اِس وقت اُن کی کرسی کے ہتھے پر اُن کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔

اُسی پل باہر سے ایک دم شور کی آواز بلند ہوئی۔ چوکیدار کسی پر برس رہا تھا۔

"یہ کیسا شور ہے؟" طارق نے کھڑے ہوتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

"کیا بات ہے خان! کیوں شور مچا رکھا ہے؟" طارق چوکیدار سے سوال کرتے کرتے ایک دم رُک گیا۔

دل کو کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

وہ سامنے کھڑی تھیں، کس قدر بدل گئی تھیں، نہ اُن کی شخصیت کی وہ شائننگ باقی رہی تھی جو اُن کی شخصیت کا خاصہ رہی تھی، سادہ کاٹن کی شلوار قمیص میں وہ ایک عام سی عورت لگ رہی تھیں، ساری انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک ساڑی کا استعمال کیا تھا۔

اور آج وہ اتنے عام سے حلیے میں تھیں کہ اُن کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔

"آنی!" طارق کے لب پھڑ پھڑائے۔

اِس عورت سے طارق نے کس قدر پیار کیا تھا! اِس سے نفرت کرنے کے چکر میں وہ خود کو ہمیشہ ہوا محسوس کرتا تھا۔

"طارق! طارق میری جان!" نیلوفر کسی پیاسی ہرنی کی طرح اُس کی جانب لپکیں، چوکیدار نے رکاوٹ ڈالنی چاہی تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔

"صیب! بڑے صیب نے اِس بی بی کو یہاں آنے سے روکا ہے لیکن یہ مانتا ہی نہیں، پھر آ جاتا ہے۔"

چوکیدار بولا۔

"تم جاؤ۔" طارق نے اُسے بھیج دیا۔

"طارق! پلیز میری بات سُن لو ورنہ میں مر جاؤں گی۔" نیلوفر بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

طارق کا دِل اُن کے آنسوؤں پر پگھلنے لگا لیکن پھر بھی وہ گیٹ میں راستہ روکے منہ دوسری جانب کیے کھڑا تھا اس بے نیازی میں بھی اُس کا سارا دھیان آنی ہی کی جانب تھا۔

"یوں منہ نہ موڑو، ایسے نہ کرو میری جان! تمہاری اجنبی نگاہیں مجھے مار دیں گی۔" وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔

ساری زندگی غرور سے گردن اکڑا کر کھڑی رہنے والی عورت آج خود کو اور اپنی عزتِ نفس کو زیرو کر کے کھڑی تھی لیکن آج اُسے کسی پلس مائنس کی پروا نہ تھی، اُسے پروا تھی تو بس اتنی کہ طارق اُسے معاف کر دے۔

"آپ پلیز یہاں سے چلی جائیں، میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔" طارق نے بے حد ضبط سے کہا۔ اُسے ان کا یوں ہاتھ جوڑے کھڑے رہنا بُرا لگ رہا تھا۔

"طارق! میں شہباز کی، تمہاری اور سائرہ کی گناہ گار ہوں، میرا سب سے بڑا قصور تو سائرہ کے کھاتے میں کھلتا ہے، جب مجھے یہاں کوئی معاف کرنے پر تیار نہیں تو وہاں، وہاں کیسے معافی ملے گی۔" انہوں نے آسمان کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

طارق کا دِل کوئی اندر سے مسلنے لگا، دانت دانت پر جمائے اُس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جان پا رہا تھا کہ اُسے آنی پر اِس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ انہوں نے اُن سب کی زندگی کے ساتھ سازش کی یا اِس بات پر غصہ تھا کہ یہ عورت جس نے ہمیشہ ماں کی طرح اُن کی ہر ضرورت پوری کی تھی، زمانے کے سرد گرم سے بچایا تھا وہ یوں اُن کے دروازے پر آ مرزش کی بھیک مانگنے کے لیے بھکارن بنی کھڑی تھی۔

اُس کی ہر بات جھوٹ سے شروع اور جھوٹ پر ختم ہوتی تھی لیکن اِس عورت کی زندگی کا ایک سچ یہ بھی تھا کہ اُس نے طارق اور سائرہ سے شدید ترین محبت کی تھی۔ بے شک شروع میں اُس نے یہ محبت Planed رکھی تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ بچے اُس کی کمزوری بن گئے تھے اور آج وہ دنیا کی سب سے کمزور عورت بنی کھڑی تھی۔

"پلیز طارق، چندا! میرے بچے مجھے معاف کر دو! میں تم سب کے بغیر نہیں رہ سکتی... میں تم لوگوں کی محبت نفرت میں بدلتے دیکھ کر جی نہیں پا رہی۔" نیلوفر نے طارق کے دونوں ہاتھ کو تھام کر بوسہ دیا۔

طارق کی آنکھوں سے دو ضدی آنسو ہر طرح کی بندش توڑ کر باہر نکل آئے جن کو چھپانے کے لیے اُس نے دوسری جانب منہ موڑ لیا۔

"کون ہے لالہ؟" سائرہ کی آواز طارق کی پشت پر سنائی دی۔

نیلوفر کی طبیعت میں بے چینی شدید ہو گئی۔

"گڑیا! سائرہ گڑیا! میں... میں تمہاری آنی!" نیلوفر نے اُچک اُچک کر طارق کے پیچھے سائرہ کو دیکھنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

طارق نے تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور دوسری جانب ہوکر انہیں دیکھنے کے لیے راستہ دے دیا۔

''سائرہ! اِن سے کہو اگر ابّو اِن کو معاف کردیتے ہیں تو ہم دونوں کی جانب سے بھی معافی مل جائے گی اور اگر ابو معافی نہیں دیتے تو یہ یہاں آ کر اپنا وقت برباد نہ کریں۔'' طارق کہہ کر رُکا نہیں بلکہ گھر کے باہر کھڑی جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی سے نکل گیا۔

نیلوفر پشیمانی سے اُسے جاتا دیکھتی رہ گئیں۔

''گڑیا! سائرہ! پلیز مجھے معاف کردو۔'' آنی نے مڑ کر اس سے کہا۔

''آنی! آپ نے شاید لالہ کی بات غور سے نہیں سُنی، آپ کی معافی ابو کی معافی سے مشروط ہے۔'' سائرہ نے دھیرے دھیرے کہا۔

خود سائرہ کو لگ رہا تھا، جیسے اُس کی آواز کسی کنویں سے آ رہی ہو، آنی کی محبت بھول جانا ممکن نہ تھا۔

''سائرہ بیٹا! آپ اندر جائیں۔'' شہباز صاحب نے جب دیکھا کہ طارق اور سائرہ کو گیٹ پر بہت دیر ہوگئی ہے تو وہ بھی وہیں چلے آئے۔

''جی ابو۔'' سائرہ نظریں چُرا کر اندر چلی گئی۔

آنی نے اُسے ایسے دیکھا، جیسے کسی بچے کی آنکھوں میں اُس کی من پسند چیز چھن جانے پر شکوہ اُتر آئے۔

''خطاوار ہوں شہباز! معاف کردو۔'' نیلوفر اب شہباز صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔

''میں تم کو تمہارے وکیل کے ذریعے تحریری معافی دے چکا ہوں، اب تم کو مزید کیا چاہیے جاؤ، چلی جاؤ یہاں سے اور ہماری زندگیوں سے، ہم اب تم کو دوبارہ سوچنا بھی نہیں چاہتے۔'' شہباز صاحب کے لہجے میں دُکھ ہی دُکھ تھا۔

''نہیں شہباز! مجھے دِل سے معافی چاہیے، تم لوگ مجھے معاف کردو، میں بچوں کے بِنا بنجر ہوگئی ہوں، میں نے اِن سے ہمیشہ سچی محبت کی ہے، مجھ میں لاکھ برائیاں سہی! لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے ان سے بے حد محبت کی ہے۔''

''تم مجھے معاف کردو تاکہ! تاکہ بچے بھی مجھے معاف کردیں۔'' نیلوفر نے بلکتے ہوئے کہا۔

جواباً شہباز صاحب نے ایک زخمی نگاہ اُن پر ڈالی اور واپس اندر جانے کو مڑے۔

''تمہارا قصور چھوٹا نہیں ہے، تم نے میاں بیوی کو الگ کیا، اُن کے بچوں کے اندر زہر بھرا، کیا کچھ نہیں کیا تم نے اور اب تم معافی کے نام پر دوبارہ ہماری زندگیوں کا حصہ بننا چاہتی ہو۔ نہیں! یہ بالکل نہیں ہوگا۔'' وہ باآواز بلند کہہ کر گیٹ بند کر کے اندر چلے گئے۔

''دروازہ کھولو، دروازہ کھولو شہباز! میں معافی لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' نیلوفر نے گیٹ بجاتے ہوئے زور سے کہا۔

یہ پوش ایریا تھا، یہاں کنالوں پر پھیلے گھروں کے اندر مکین اپنی زندگی میں اتنے مگن تھے کہ کوئی بھی

[...]ر کی آواز سُن کر باہر نہ آیا تھا، وہ کیسی تہی داماں تھیں کہ ہر جانب سے دھتکار اور تنہائی مل رہی تھی۔

ان کی تو اِس عبرت ناک حالت کو دیکھنے کے لیے بھی کوئی نہ تھا۔

"شہباز! میں نہیں جاؤں گی!

"میں معافی کے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' نیلوفر کا گلا چیخ چیخ کر بیٹھ گیا تھا وہ تھک کر وہیں گیٹ کے ساتھ [...]ل کر زمین پر بیٹھ گئیں، اُن کی آنکھیں آسمان کی جانب تھیں۔

سمندر آگ ہے، وحشت ہوا ہے
تُو جدا ہے مجھ سے، اے میرے خدا!
لاانتہا پھیلا خُلا ہے
خوف نے جکڑا ہے دل کو
میری آنکھوں سے رواں، اشکوں کی صورت
روز و شب کا سلسلہ ہے
میں نے زخموں کا چراغاں
تیری راہوں میں کیا ہے
تو کہاں ہے؟

نیلوفر کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے، نگاہیں آسمان پر تھیں اب وہ اپنے ربّ سے مجسم طلبِ آمرزش تھیں۔

❖❖○❖❖

سائرہ مسلسل گلے میں موجود چین کو بے چینی سے ہاتھ میں لیے گھما رہی تھی، آنی کی آوازوں نے اُس کو [...]ڈسٹرب کردیا تھا اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر جائے اور آنی کو گلے سے لگا لے۔

''یا اللہ! اگر تو نے ہمارے دلوں سے آنی کی محبت ختم نہیں کی تو اُس کا مطلب ہے اُن کا وجود ہماری زندگیوں سے نہیں نکلا۔ اب تُو ہی کوئی راستہ نکال! لاکھ اُس عورت نے برائی کی ہے لیکن اب وہ معافی مانگ رہی ہے اور تُو تو مڑ کر آنے والے کو ہمیشہ محبوب رکھتا ہے۔ اے اللہ کوئی راہ نکال!'' سائرہ نے بے اختیار ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی، جب جب معاملات انسان کے دِل کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں وہ شاید تاہی کمزور پڑ جاتا ہے۔

اُسی پَل سائرہ کا سیل فون بجا۔

''جی لالہ!'' فون طارق کا تھا۔

''کیوں لالہ! ٹھیک ہے!'' سائرہ نے اُداسی سے فون بند کردیا۔

طارق جس قدر اپ سیٹ ہوکر گھر سے نکلا تھا اُس کا گھر آنے کا موڈ نہ تھا اُس نے اطلاع دی تھی کہ وہ گھر نہیں آ رہا، رات کو آفس میں کام کرے گا۔

سائرہ سر تھام کر بیٹھ گئی وہ بے حد بے چین تھی پھر ایک دم اُٹھی اور موبائل پر ایک نمبر ملانے لگی۔ اُسے ایک راستہ اللہ نے دکھا دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ احمد شاہ انکل کو فون کر رہی تھی۔

❖❖○❖❖

''یہ کیا انسانیت ہے خان؟'' احمد شاہ چوکیدار پر برس رہے تھے۔

''وہ بڑے صیب کا حکم تھا جی!'' چوکیدار منمنایا۔

''ایک عورت گزشتہ پندرہ سولہ گھنٹے سے دروازے پر بیٹھی ہے اور تم اُسے اندر نہیں جانے د[ے] رہے۔'' وہ مسلسل سات آٹھ گھنٹے کا سفر طے کر کے ابھی ابھی شہر پہنچے تھے اور سیدھے شہباز کی طرف آ گئے تھے۔

''اُٹھیے نیلوفر!'' احمد شاہ نے ان کے قریب جا کر کہا جن کا رو رو کر گلا بیٹھ چکا تھا، آنکھیں اور منہ [سو]جا ہوا تھا۔

احمد شاہ کو بے حد تکلیف اور شرمندگی ہوئی۔ وہ عورتوں کو ہمیشہ اونچا درجہ اور مقام دیتے آئے [تھے]۔ نیلوفر کی حالت دیکھ کر اُن کو زندگی میں پہلی بار شاید اتنا غصہ آیا تھا۔

''نہیں! میں واپس نہیں جاؤں گی۔''

''نہیں! مجھے معافی چاہیے۔'' نیلوفر نے وحشت بھری آنکھیں اُٹھا کر اُن کو دیکھا جو کچھ اُن کی آنکھوں میں تھا احمد شاہ جیسا صاحب نظر بھی لرز گیا۔

''اگر اِس عورت کو انصاف نہ ملا تو اللہ مجھے کبھی معاف نہ کرے گا۔'' احمد شاہ نیلوفر کو وہیں چھوڑ کر آ[گے] بڑھے۔

''کہاں ہیں تمہارے صاحب؟'' انہوں نے ملازمہ سے پوچھ کر بیڈروم کا رُخ کیا۔

انہوں نے جب دروازہ کھولا تو شہباز صاحب ایزی چیئر پر بیٹھے کہیں گم تھے۔

''شہباز!'' انہوں نے شہباز صاحب کو پکارا۔

شہباز صاحب نے ایک دم چونک کر انہیں دیکھا۔

''ارے احمد تم؟ کب آئے تم؟'' شہباز نے احمد شاہ کی اچانک آمد پر حیران ہو کر پوچھا کیوں کہ [وہ] جانتے تھے احمد شاہ صبح ہی تو گاؤں روانہ ہوئے تھے اور اب ایک دم یہاں کیسے؟

''مجھے آنا ہی پڑا۔'' احمد شاہ نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے کمرے کی باقی لائٹیں بھی آن کر دیں۔

''کبھی کبھی ہم اپنے اِرد گرد کچھ اہم چیزوں کو اِس لیے بھی نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ ہم وہاں سے روشنی گزرنے نہیں دیتے۔ تم اگر اندھیرا کر کے کمرا بند کر کے بیٹھے رہو گے تو کیا اللہ کے احکامات اور زندگی [کی] حقیقتیں بدل جائیں گی۔'' احمد شاہ نے اُن کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب؟'' شہباز صاحب نے پوچھا۔

''مطلب یہ ظالم آدمی! وہ کمزور عورت گزشتہ پندرہ سولہ گھنٹے سے باہر زمین پر تمہارے گیٹ پر کسی بھکارن کی طرح بیٹھی ہے۔'' احمد شاہ نے غصّے سے کہا۔ احمد شاہ تو بے حد دھیما بولنے والے تھے لیکن شہباز کی حرکت اور بے نیازی اُن کو تپا گئی تھی۔

''میرا اُس سے کوئی لینا دینا نہیں، تمہارے کہنے پر میں نے تحریری طور پر اُسے معاف کر دیا تھا اب

ائے یہاں کیا کر رہی ہے۔'' شہباز صاحب نے سلگتے لہجے میں کہا۔

''تم جانتے ہو وہ اپنے ضمیر اور بچوں کی محبت سے مجبور ہو کر آئی ہے، کیوں جان کر بھی اَن جان بن رہے ہو؟'' احمد شاہ نے شہباز کو بہ غور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو... تو میں کیا کروں؟'' شہباز صاحب نے پوچھا۔

''تم اُسے معاف کر دو! جو وہ چاہتی ہے۔'' احمد شاہ نے رسان سے کہا۔

''احمد! وہ میری بہت خطہ کار ہے! میری سارہ کا خون اُس کی گردن پر ہے۔''

''شہباز! تم جانتے ہو جب فرعون اللہ کے حکم اور حضرت موسیٰ علیہ سلام کی بد دعا کی وجہ سے زمین میں دھنس رہا تھا تو فرعون نے بہت معافی مانگی تھی، یہاں تک کہ وہ زمین میں دھنس کر مر گیا۔ جانتے ہو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنے نبی سے کیا کہا؟''

اللہ رحمان کریم نے فرمایا ''اے موسیٰؑ! تیرا دل کتنا سخت ہے! کتنا سخت ہے! قسم ہے مجھے اپنی بڑائی کی اگر فرعون ایسے گڑگڑا کر مجھ سے ایک بار بھی معافی مانگتا تو میں بے شک اُسے پہلی بار ہی معاف کر دیتا۔''

اے موسیٰؑ! تیرا دِل کتنا سخت ہے۔

''شہباز! وہ اللہ جب سب کچھ معاف کرنے پر تیار رہتا ہے تو ہم کیوں نہیں، انسان ہو کر جن کی کوئی اوقات ہی نہیں کسی دوسرے کو معاف کرتے؟'' شہباز صاحب نے چونک کر احمد صاحب کو دیکھا، اُن کا دل بے اختیار پشیمانی اور شرمندگی میں ڈوب گیا تھا۔

شہباز صاحب جو اِس قدر مغرور اور سخت دِل ہوئے بیٹھے تھے، کسی کی بات ماننے کو تیار نہ تھے، احمد شاہ نے اُن کو بے حد مختصر الفاظ میں قائل کر لیا تھا۔

یہ احمد شاہ صاحب کی خاصیت تھی کہ وہ کبھی بِنا دلائل کے بے وزن بات نہ کرتے تھے۔

انسان کے پاس لاکھ دلائل کا ڈھیر موجود ہو، لیکن اچھی نیت کا وزن موجود نہ ہو تو اُس کی بات کبھی دِل پر اثر نہیں کرتی اور احمد شاہ تو ہر کام میں اپنی اچھی نیت کو ضرور شامل کرتے تھے۔

شہباز صاحب کے چہرے کا رنگ جب بدلا تو احمد شاہ نے اُن کو مزید کچھ کہنے نہ دیا۔

''چلو، باہر چلو! اللہ تعالیٰ کی ذات کو راضی کرو ہم ساری عمر دوسروں اور اپنے دل کو راضی کرنے میں لگا دیتے ہیں اور ہمارے ہاتھ خالی رہتے ہیں اور جب اللہ کو راضی کرتے ہیں تو ہمیشہ پاتے ہیں۔'' احمد شاہ دھیرے دھیرے کہتے ہوئے شہباز صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھے باہر کی جانب بڑھے۔

شہباز صاحب کے دل میں احمد شاہ کی باتوں نے یوں جھاڑو پھیر دی تھی کہ اب وہاں کوئی غصّہ، بدلہ یا ناراضی باقی نہ بچی تھی، وہ اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔

کون کہتا ہے کہ ہم کسی دوسرے کو معاف کرتے ہیں بلکہ خود کو معاف کرتے ہیں، خود کو آسانی دیتے ہیں۔

''اُٹھو نیلوفر!'' شہباز صاحب نے نیلوفر کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

نیلوفر نے بے یقینی سے شہباز صاحب کو دیکھا کہ کہیں یہ اُس کا وہم تو نہیں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن یہ حقیقت تھی۔
اُن کو معافی مل گئی تھی۔
''تم نے مجھے معاف کردیا؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھیں۔
''ہاں! میں تم کو ہر گناہ، ہر بات کے لیے معاف کرتا ہوں۔'' شہباز صاحب نے بڑے دِل سے کہا۔
نیلوفر نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیے۔
''میں سارہ باجی کی، تمہاری اور بچوں کی قصوروار ہوں۔'' وہ سسک رہی تھیں۔
''بس اب رونا بند کرو، تمہاری حالت پہلے ہی بہت خراب ہوگئی ہے میں نے کہا نا کہ میں نے تم کو معاف کردیا۔'' شہباز صاحب نے دھیرے سے کہا۔
احمد شاہ نے بے حد مطمئن نظروں سے اُن دونوں کو دیکھا پھر انہوں نے موبائل پر وہیں کھڑے کھڑے فون ملایا۔
''سائرہ بیٹا! فوراً باہر آؤ اور اپنی آنی کو سہارا دے کر اندر لے جاؤ، اُن کی حالت اچھی نہیں ہے انہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' سائرہ نے جواب میں کچھ کہا تو وہ ایک دم مسکرادیے اور فون بند کردیا۔
''زندگی میں ہر ایک کو موقع ملتا ہے کہ وہ اچھا کام کرے لیکن اس قافلے میں شامل ہونے کا حوصلہ توفیق ہی سے ملتا ہے۔ اور یہ توفیق احمد شاہ کو ربّ العزّت نے انعام کی صورت میں ہمیشہ کے لیے دے رکھی تھی۔

❖❖○❖❖

محبت کیا نہیں ہوتی
محبت پھول ہوتی ہے، محبت خار ہوتی ہے
محبت بوند بھر پانی، محبت دھار ہوتی ہے
محبت کونج اکلوتی، محبت ڈار ہوتی ہے
محبت یار ہوتی ہے، محبت جیت بھی شاید
محبت ہار ہوتی ہے
محبت بخت ہوتی ہے، محبت وار ہوتی ہے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
محبت پاس رکھتی ہے، مگر اُس پار ہوتی ہے

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم ساری زندگی اپنے خول میں بند رہ کر گزارتے ہیں تو کبھی محسوس نہیں کرپاتے کہ ہم زندگی کی ہر ہر نعمت اور خوشی سے دور ہوچکے ہیں اور زندگی اپنا بڑا حصّہ گزار کر جا بھی چکی ہوتی ہے، پھر جب یہ خول ہاتھ سے شیشے کے برتن کی طرح چھوٹ کر گرتا ہے تو ہمیں ایک دم سے ہر چیز واضح نظر آنے لگتی ہے، تب وقت کے ضیاع کا احساس بہت شدید ہوتا ہے۔ زبیدہ بیگم کا وہ سخت خول جو سالوں سے نہ ٹوٹا تھا ایک دم کسی شیشے کے برتن کی مانند ٹوٹ گیا تھا۔ زبیدہ کو یوں لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند سے جاگی ہوں، اور نیند کے دوران مسلسل ایک ڈراؤنا خواب دیکھتی رہی ہوں۔

پچھتاوے کا احساس اُن کی زندگی پر اس طرح حاوی ہوا تھا کہ انہوں نے ساری عمر جلتے کوئلوں پر گزاری تھی اور اُن کے ساتھ اِس راہ پر قاسم علوی برابر چلے تھے۔
اُن کی تکلیف شاید زبیدہ سے زیادہ تھی کیوں کہ انہوں نے اپنے لیے زبیدہ کی آنکھ میں کبھی محبت نہ دیکھی تھی اور ایک غیر کی ناجائز اولاد کو اپنا نام دے کر پالتے رہے تھے جو اُن کو کبھی بھی چھوڑ کر جاسکتا تھا۔
''چاند!''
زبیدہ بیگم ٹی وی لاؤنج میں آئیں تو قاسم علوی کو ٹی وی کی آواز مکمل بند کیے بیٹھے دیکھا۔ وہ شاید ذہنی طور پر موجود ہی نہ تھے، لیکن زبیدہ بیگم کی آواز اور تخاطب سُن کر ایک دم مڑے۔ وہ گلابی لباس پہنے کھڑی تھیں، ان کی رنگت لباس کے ہم رنگ محسوس ہورہی تھی۔ قاسم علوی کو پہلی بار محسوس ہوا کہ سامنے کوئی مری ہوئی نہیں بلکہ زندہ عورت کھڑی ہے۔
''میں... مم... مجھے تم سے بات کرنی ہے!'' زبیدہ بیگم جھجک رہی تھیں۔
''کہو...!'' قاسم علوی نے اپنے قریب صوفے پر جگہ خالی کر کے پاس پڑی سفید چادر جو زبیدہ بیگم کے لیے بچھائی جاتی تھی، اُسے بچھانے لگے تو انہوں نے ایک دم ان کا ہاتھ تھام کر انہیں روکا اور پھر وہیں اُن کے ساتھ بنا چادر کے بیٹھ گئیں۔
قاسم علوی نے بے حد حیرت سے زبیدہ بیگم کو دیکھا۔
''کیوں؟'' ساتھ ہی انہوں نے سوال کیا۔
''جو گندگی میں اپنی روح پر محسوس کرتی رہی تھی وہ ان چیزوں میں نہ تھی قاسم! یہ میں جان گئی ہوں۔ وہ رُک رُک کر بولیں۔
قاسم صاحب نے بے حد حیرت سے زبیدہ کو دیکھا، وہ اتنی نارمل نظر آرہی تھیں کہ قاسم علوی کو وہ ارمل لگیں ساری عمر اس عورت کی سرد نگاہیں اور رویّے جھیلتے جھیلتے اُن کو اپنا آپ برف محسوس ہونے لگا ۔ اور آج...
''وہ! اچانک...!
''قاسم! کیا میں تم کو اِس گندگی کے ساتھ قبول ہوں؟'' وہ معصوم بچوں کی طرح پوچھ رہی تھیں۔
''کیا اللہ کو میں اس گندگی کے ساتھ قبول ہوں گی؟'' اب وہ خوف زدہ ہوکر پوچھ رہی تھیں جب کہ م صاحب بہت نرم نظروں سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔
''واپس آجانے والے لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں زبیدہ!'' قاسم علوی کے لہجے میں خوشی کی آمیزش ۔
''مم... مجھے معاف کردو قاسم!''
''جس شخص نے میرے ہر عیب کو ڈھانپا، میری اولاد کو اپنا نام دیا، اپنی ساری زندگی کو انتظار بنالیا، نے اُسے کچھ... کچھ بھی نہیں دیا۔'' زبیدہ بیگم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو یوں سامنے کیا جیسے اُن کے ں سے کوئی چیز چھوٹ گئی ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قاسم علوی نے ایک دم اُن کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''زبیدہ! آج سے پچیس سال پہلے میں نے تمہاری سالگرہ پر ایک پوئم کہی تھی، یاد ہے؟''

دل اک خواب نگر ہے
جس میں لمحہ لمحہ اُس کے سپنے
بند آنکھوں میں نئے دریچے وا کرتے ہیں
ہر چہرے میں اُس کا چہرہ رکھ دیتے ہیں
میرے اور اُس کے بیچ ہزاروں دیواریں ہیں
رسموں اور رواجوں کی
بیگانوں کی قاتل نظروں اور اپنوں کی باتوں کی
اُس کی بے پروائی کی اور اپنی پاگل سوچوں کی
کالی، دشمن راہوں کی
میں اِس ظالم، اندھی اور منہ زور فضا
میں ایک بے مایہ ذرہ تھا
جو اپنے سے لاکھوں میں گم تھا۔
اُس کے خواب نے میری آنکھیں روشن کی ہیں
خاموشی میں جادو ہے تو پھر وہ جادوگر ہے
اُس کی چپ نے میرے دل کو نطق دیا ہے
میں قطرہ تھا اُس کی ذات سمندر ہے
اُس کی محبت نے مجھ کو تخلیق کیا ہے
ارمانوں کی بانجھ ہوائیں
آنکھوں کے گمنام جزیروں میں چلتی ہیں
اور خواہش کے خشک درختوں کی شاخوں میں
سائیں سائیں کرتی ہیں
موسم آنکھیں پھیر کے
دل کے درد نگر سے چل دیتے ہیں
بادل ویرانے پر گھر کر دِن برسے چل دیتے ہیں
اُس کے بِنا آواز کی کرنیں
آنکھیں، پھول، ستارے، پتھر
دِل اک شہرِ سنگ ہے
جس میں گلیاں، باغ، منارے، پتھر
خواہش جادو کی بستی ہے

مڑ کے دیکھو، سارے پتھر
راہوں کے دھارے پتھر!
وہ آئے تو پتھر کو آواز ملے
شہرِ سنگ کے دروازوں کو وا کرنے کا راز ملے
شہرِ سنگ!

قاسم علوی کی آواز بھرا گئی، پچیس سال پہلے کیا گیا اظہارِ محبت محبوب کے ہاں آج مقبول ہوا تھا۔

دل اِک خواب نگر ہے
اس کے خوابوں کو آغاز ملے۔

قاسم علوی تو آج بھی آس اور یقین کے اُس کنارے پر کھڑے تھے جہاں برسوں پہلے زبیدہ بیگم کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں سے چھوٹا تھا۔

بہت بار لفظ چھوٹے پڑ جاتے ہیں اور بات آنکھیں کہہ جاتی ہیں اور تفصیل اِن سے بہنے والے آنسو کہہ جاتے ہیں۔ زبیدہ بیگم، قاسم علوی کے ہاتھوں پر اپنا سر گرا کر اِس شدت سے روئیں کہ اِس میں ہر گلہ، غم، دُکھ اور نارسائی کی شدت ڈھل گئی۔

قاسم علوی نے آگے بڑھ کر زبیدہ بیگم کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''میں نے اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کیا سید سرفراز علی۔'' زبیدہ بیگم نے قاسم علوی کے کندھے پر سر رکھے دِل میں کہا۔

وہ ایک دم پُرسکون ہو گئی تھیں۔

''انسان جب جب خود جزا اور سزا کے چکر میں پڑتا ہے ہمیشہ مارا جاتا ہے خود کو سزا سنانے والا ہر انسان ایک ایسے شکنجے میں پھنس جاتا ہے، جو کبھی نہیں کھلتا، جب کہ ہر بات کو اللہ رحمان کے سپرد کر کے اس سے سچے دِل سے معافی مانگنے والا ہمیشہ ہی نواز دیا جاتا ہے۔''

زبیدہ بیگم نے خود کو اُس سزا سے نکال لیا تھا جو انہوں نے ایک مدت سے خود کو سنا رکھی تھی اتنی سزا کاٹنے کے بعد بھی وہ غیر مطمئن تھیں۔ اُن کا دِل ہر وقت سید سرفراز علی کی زیادتی پر انصاف کا تقاضا کرتا تھا، نہ وہ اُسے سزا دے پائیں اور نہ خود کو سرخرو کر سکیں، اپنی ہی کھڑی کی اِس عدالت میں انہوں نے بہت سزا بھگتی تھی لیکن آج یہ!

The local court is adjurned!

اُن کے دِل اور ضمیر نے کہا تھا اور فیصلہ و انصاف ''بڑی عدالت'' کو فارورڈ کر دیا تھا۔

اور بڑی عدالت نے اُن کو تو معاف کر دیا تھا کیوں کہ اُس بڑی سرکار نے قاسم علوی کے دِل میں زبیدہ بیگم کی محبت اور مقام کو کم نہ کیا تھا بلکہ ایک نئی زندگی، خوشیوں بھری زندگی کی شروعات تھما دی تھی۔

ہاں! ابھی انصاف باقی تھا!

سید سرفراز کے کھاتے کا انصاف تو باقی تھا۔

❖❖ ❖❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محبت کے سفر میں
زندگانی سے محبت پہلی منزل ہے
مگر کم لوگ ہیں جو جانتے ہیں
یہ پڑاؤ آخری بھی ہے بھلانا کارِ مشکل ہے
مگر تسلیم کرلینا تو آسان ہے
ہمیشہ خواہشوں کو
خالی ہاتھوں کا حوالہ کیوں بنائیں ہم
بہت کچھ ہے جو بے چاہے ملا ہے
ابھی جینے کے تابندہ حوالے اور آئیں گے
جو شب سے سرخرو نکلا، اسے معلوم ہو جائے
اُجالا اب ہے جو
ایسے اُجالے اور آئیں گے!

ڈاکٹر فیصل نے کاغذات اور ٹکٹ لاکر مریم بی بی کو تھمائے تو انہوں نے بے حد حیرت سے دیکھا۔

''اتنی جلدی! یہ سب کیسے ہوگیا؟'' وہ پوچھے بِنا نہ رہ سکیں۔

''کیوں! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ پاکستان جلد از جلد جانا چاہتی ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟''

''اتنی جلدی بھی....!'' مریم بی بی اپنی حیرت کا اظہار کیے بِنا نہ رہ سکیں۔

''آپ کا پاسپورٹ Duel Nationality والا ہے آپ کے لیے فوراً ویزا حاصل کرنا مشکل ہے پھر ویسے بھی پیسہ خود میں خاصی طاقت رکھتا ہے، جتنا پیسہ لگائیں اتنی جلدی کام کروالیں، یہ دنیا ہر جگہ چلتا ہے ایشین ممالک تو خوامخواہ بدنام ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے حسبِ عادت مریم بی بی کو ہر تفصیل سے بتائی تاکہ وہ مطمئن ہوجائیں۔

''وہ مریم بی بی کا ضرورت سے زیادہ خیال کرتے تھے، یوں جیسے کسی بچے کی ہر ہر فرمائش پوری فرض ہو، وہ بے حد باوفا انسان تھے، وعدے پورے کرنا بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

''میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں، آپ نے ہمیشہ میری ہر بات مان کر اوپر کا درجہ حاصل کیا آپ اتنی سیڑھیاں چڑھ گئے ہیں کہ مجھے اکثر اپنا آپ بونا لگنے لگتا ہے میں تو کبھی آپ کا ٹھیک سے تک نہیں ادا کرپائی۔'' مریم بی بی نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایسا نہ کہو مریم! تمہارے میرے بیچ شکریہ کا کوئی رشتہ نہیں ہے، ہم لائف پارٹنر ہیں، اگر تمہارے لیے کچھ کرتا ہوں تو یہ تمہارا حق ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے رسان سے کہا اور اپنے کپڑوں کی الماری میں سر گھسا کر کھڑے ہوگئے، پھر ایک ڈائری سے ایک ایڈریس نکالا۔

''یہ ڈاکٹر جواد کا ایڈریس ہے، ویسے تو تم لوگ ہوٹل میں رہائش رکھنا، لیکن وہاں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو ...ے رابطہ کرنا۔ ویسے میں پیشگی تم لوگوں کے پہنچنے کی اطلاع بھی کردوں گا۔''

...الٹر جواد ڈاکٹر فیصل کے بہت قریبی دوستوں میں سے تھے، دو سال پہلے وہ اپنی بچیوں کی تربیت اور ...ل کی وجہ سے پاکستان شفٹ ہوگئے تھے لیکن وہ مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔

''آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟'' مریم نے اُن کے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

...الٹر فیصل کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا وہ اُس ملک میں، اُس زمین میں دوبارہ جانے کا خود ...اصلہ بالکل نہ رکھتے تھے، جہاں انہوں نے اپنی ''زندگی'' ہار دی تھی۔

''تم جانتی ہو میرے مریضوں کے آپریشن کی ڈیٹ شیٹ مہینہ پہلے ہسپتال بنالیتا ہے ایسے میں، میں ...ہ جاسکتا ہوں، یہ بہت ساری زندگیوں کا مسئلہ ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے تصویر کے ایک رخ کی سچائی ...تھی، دوسرے رُخ کی سچائی اُن کے دِل کی تھی، جو پاکستان جانے کے نام سے ڈوبنے لگتا تھا۔

...انہیں محسوس ہوتا تھا کہ جس تکلیف میں انہوں نے پاکستان کو چھوڑا تھا وہاں جاکر وہ تکلیف دوبارہ ری ...ہوجائے گی اور وہ اِس درد کو دوبارہ جھیلنے کی خود میں ہرگز سکت نہ رکھتے تھے۔

''جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن آپ اگلے مہینے کوئی آپریشن نہ رکھیے گا اور ہمارے پاس چلے آیئے ...'' مریم بی بی نے مزید فرمائش کی۔

''کیا آپ کا اتنی زیادہ دیر رُکنے کا پروگرام ہے، ہم تو آپ کے بِنا اُداس ہوجائیں گے جناب!'' ...فیصل نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، غالباً وہ مریم کو ٹالنا چاہ رہے تھے۔

''تو آپ.. پاکستان نہیں آئیں گے۔'' مریم اپنے سوال سے دستبردار نہ ہوئیں۔

''یاد رہے! آپ بھی کچھ عرصے کے لیے جارہی ہیں ہمیں وہاں جاکر بھول نہ جایئے گا۔'' ڈاکٹر فیصل شرارت سے کہا۔

''اگر اجازت ہو تو میں چینج کرلوں؟ نماز کا وقت نکلا جارہا ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے اپنے کپڑوں کی ...ب اشارہ کرکے کہا۔

''جی!'' مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔

...ڈاکٹر فیصل نے وہاں سے ہٹنے کی بہت جلدی کی تھی۔

''جانتی ہوں آپ کس سے بھاگتے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں کہ آپ ساری عمر آپا کو نہیں بھلا پائے اور میں یہ چاہتی بھی نہ تھی کہ آپ ان کو ...لتے، یہ اُن کا حق تھا کہ آپ کی محبت تا عمر وہی حاصل کرتیں لیکن آپ اتنے اچھے ہیں، کیا اتنے اچھے ...ن کا حق نہیں ہے کہ جس پہلو سے اُن کے دل میں درد اُٹھتا ہو، وہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غم کا ...ا نکل جائے، جیسے مُردے کو دفن کر آنے کے بعد ہر انسان یہاں تک کہ ماں کو بھی صبر آجاتا ہے اسی ...ح کچھ باتوں، کچھ نا آسودہ یادوں کو دفن کردینا چاہیے ورنہ، نہ تو صبر آتا ہے اور نہ ہی سکون ملتا ...۔'' جانے کیوں مریم کو لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر فیصل ایک بار پاکستان کی زمین کو چھو لیں گے تو اُن کے درد ...، اُس کی شدت میں کمی آجائے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن وہ تو کسی طرح قابو ہی نہ آ رہے تھے۔

''فیصل کو کیسے پاکستان لے کر چلوں؟''

گویا وہ با آواز بلند خود سے پوچھ رہی تھیں۔

❖❖ ( ) ❖❖

''یو آر ریئل آرٹسٹ عبدالولی۔'' یہ کمپلمنٹ عبدالولی کی ایگزیبیشن پر اُس کے ٹیچر نے دیا تھا اس کا پروجیکٹ بے حد پسند کیا گیا تھا کوئی یقین نہیں کر رہا تھا کہ پاکستان جیسے ملک سے آئے ہوئے طالب علم نے اتنا آؤٹ اسٹینڈنگ کام پریزنٹ کیا ہے۔

''سر! ہمارے ملک میں بے حد ٹیلنٹ ہے اتنا کہ شاید کہیں اور اتنی Creativity کم ہی نظر آئے لیکن بہتر مواقع کی کمی اور ناسازگار ماحول کی وجہ سے یہ ٹیلنٹ کم ہی سامنے آ پاتا ہے ورنہ تو مجھ سے کہیں بڑے بڑے جن وہاں موجود ہیں۔ میرے اپنے اساتذہ میں کچھ ایسے ہیں، جو حیران کر دینے والوں میں سے ہیں لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ باہر آ کر اپنے کام کو سامنے لانے سے قاصر ہیں۔ لیکن اب بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے لیے کچھ گولڈن چانسز پیدا ہوئے ہیں تو ہم لوگ بھی اس قابل ہوئے کہ یہاں آ کر کچھ سیکھ پائیں اور اپنے ٹیلنٹ Creativity اور آرٹ کو باقی لوگوں کے سامنے لا سکیں۔'' عبدالولی نے عام لوگوں کی طرح سارا کریڈٹ خود کی ذات پر لینے کے بجائے ایک مختلف جواب دے کر سب کو حیران کر دیا۔

ایگزی بیشن بے حد کامیاب گئی تھی، آرٹ اسکول نے عبدالولی کی پانچ عدد پینٹنگز اسکول گیلری کے لیے رکھ لی تھیں اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

''مان گئے بڑے بھیا آپ کو!'' عبداللہ نے عبدالولی کے ساتھ گیلری سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ لِزا اور الفریڈ بھی تھے۔

''واقعی ولی! تم ایک بہت بڑے جن ہو۔'' لِزا نے کہا۔

جواباً عبدالولی کے چہرے پر بہت مدھم مسکراہٹ تھی۔

''ارے! آپ کو تو ان Comments پر پھول کر کُپا ہو جانا چاہیے تھا لیکن آپ پر تو کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا'' عبداللہ نے ٹیڑھا سا منہ بنا کر کہا۔

''یار! انسان تو اتنا بے بس ہے اگر اُس کی ایک چھینک رک جائے تو اُس کا سارا سسٹم درہم برہم ہو جاتا ہے، پھر کیا اوقات ہے ہماری!'' عبدالولی نے چلتے چلتے بالکل احمد شاہ کے اسٹائل میں کہا۔

(ایک وقت آتا ہے کہ بیٹا ہو بہو باپ جیسا نظر آنے لگتا ہے)

''لیکن بڑے بھیا! اسی انسان نے چاند پر بھی قدم رکھا، جو اس نے سوچا وہ کیا۔ تو اُسے ماننے میں کیا حرج ہے۔'' لِزا بھی کہے بنا نہ رہ سکی۔

''دوستو! میرے بابا کہتے ہیں کہ اگر ''سپر پاور'' کی اجازت نہ ہو تو ہم اپنے اندر کی کسی قسم کی پاور تک کو محسوس کرنے سے قاصر ہیں، آج تک انسان نے جو کچھ کیا وہ ''سپر پاور'' کی مرضی سے کیا اگر وہ نہ چاہتا تو ہم ابھی تک بغیر کسی پروگریس کے Cave civilization (غاروں کی تہذیب) میں رہ رہے ہوتے، اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے اگر اُس نے پہلے سے Progress ہمارے دماغوں میں Design کر کے فیڈ نہ کی ہوتی تو ہم یہ سب کچھ نہ کر پاتے۔'' عبدالولی نے لوجک کے ساتھ کہا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ انسان خود کچھ نہیں ہے ہم جو سوچتے ہیں وہ سپر پاور کی وجہ سے ہے ورنہ ہم [illegible] ہیں۔'' الفریڈ نے بھی عبدالولی کے نقطۂ نگاہ پر اعتراض کیا تھا وہ اپنے اپنے ممالک کے اسکول [illegible] کو بہترین طور پر پریزنٹ کرنے والوں میں سے تھے بے حد ذہین اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ [illegible] والے، لیکن اُن کو عبدالولی کی بات ہرگز ہضم نہ ہوئی تھی۔

''یار! انسان ایک کمپیوٹر جب Design کرتا ہے تو اُس میں ہر چیز فیڈ کر دیتا ہے اگر ہم اُس میں [illegible] کی کمانڈ فیڈ کریں گے تو وہ پرنٹ آؤٹ نکالے گا ورنہ ہم لاکھ چاہیں اچھے سے اچھا پرنٹر اُس کے [illegible] اٹیچ کر لیں، لیکن اگر اُس کے سسٹم میں یہ کمانڈ نہیں ہے تو وہ کبھی بھی پرنٹ آؤٹ نہیں نکالے گا۔''

[illegible] عبدالولی کی بات پر لِزا ایک دم چلتے چلتے رک گئی۔

''مطلب ہم سب Puppet's ہیں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے؟''

''نو! ہم Puppet ہرگز نہیں ہیں بلکہ ہم کو تو ہمیشہ چوائس ملتی ہے۔'' عبدالولی نے بے حد اعتماد سے کہا۔

اس وقت عبدالولی کی آنکھوں میں خاص طرح کی چمک تھی وہ عام اداروں سے پڑھا ہوا نہ تھا بلکہ دنیا کے بہترین اداروں سے تعلیم یافتہ تھا، جس نے اس کے اندر خود اعتمادی کا ایسا قلعہ بنا دیا تھا جو روز بہ روز [illegible] اور مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔

عبدالولی کی سب سے اسٹرانگ طاقت اس کا سچا Religion تھا، اس کی اپنے ربّ اور اصل سپر پاور سے محبت اور تعلق تھا۔

''اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جو فل آف لاجک ہے۔ یہ ایسا مذہب ہے جو ہر سوال کا جواب رکھتا ہے۔''

عبدالولی کے خود اعتمادی کے قلعے کی سب سے مضبوط بنیاد اُس کا اپنے مذہب پر یقین تھا وہ لندن میں بھی ایسی کئی بحثیں کر کے بہت سے گوروں کو اصل سوچنے پر مجبور کر چکا تھا۔

''اگر سب کچھ Super Power کا ہی Design کردہ ہے تو ہم تو صرف ڈمیز ہیں اور کچھ بھی نہیں۔'' الفریڈ نے غصّے سے کہا تو عبداللہ کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو جائے لیکن جب اُس نے عبدالولی کا چہرہ دیکھا تو وہ بے حد پرسکون تھا۔

''سپر پاور نے ہمارے اندر برائی اور اچھائی دونوں فیڈ کر دی ہیں، اب یہ ہماری چوائس ہے کہ ہم کس کو سلیکٹ کرتے ہیں۔ اچھا بننا اور بُرا بننا ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' عبدالولی نے کہا۔

''تو جو ہم اچھا کرتے ہیں وہ صرف ہماری کوشش سے ہی ہوتا ہے نا، اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنے ٹیلنٹ، اپنی کوشش، اپنی اچھائی اور اپنے اچھے کام کا کریڈٹ خود لے سکتے ہیں۔'' الفریڈ نے فاتحانہ انداز میں کہا، جیسے وہ عبدالولی کو ہرا چکا ہو، جیسے وہ عبدالولی کو اُس کے ہی جواب میں مات دے چکا ہو۔

''پیارے دوست! تم میری بات کا پہلا حصہ بھول رہے ہو۔'' عبدالولی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا؟'' الفریڈ نے پوچھا۔

''یہ ہی کہ سپر پاور نے ہمارے اندر اچھائی کا سسٹم رکھا تھا تو ہم اچھے ہوئے، ہمارے اندر Creativity کا سسٹم رکھا تو ہم Creative ہوئے نا۔'' عبدالولی کی بات پر الفریڈ کے چہرے کا رنگ جس طرح بدلا تھا عبداللہ کا اپنی ہنسی ضبط کرنا دشوار ہوگئی تھی۔

''کیا ہر مسلم تمہاری طرح ہی اتنا اسٹرانگ بی لیو رکھتا ہے۔'' لِزا مسمریزم میں تھی۔

''لو یہ تو گئیں!'' عبداللہ نے ولی کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں! ہر سچا مسلمان اِس پر یقین رکھتا ہے۔'' ولی کی آنکھیں بے حد شفاف تھیں، جن کے من صاف ہوتے ہیں اُن کی آنکھیں ہمیشہ شفاف ہوتی ہیں۔

''دراصل یہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے اگر انسان اُسے شروع سے ہی Realize کر لے تو اُس کے لیے بہترین ہوتا ہے وہ تعریف اور خود پسندی کے جال میں پھنس کر Average پرسن بننے سے بچ جاتا ہے۔'' ولی نے الفریڈ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، جہاں کچھ کچھ غصہ بے حد نمایاں تھا۔

''میرا خیال ہے ہم اب چلتے ہیں، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' عبداللہ نے بیچ میں آتے ہوئے کہا۔

''یس! او کے گائز، اللہ حافظ!'' عبدالولی نے شائستہ انگریزی میں کہا۔

''ون منٹ ولی! تم ہمیں اپنے گاڈ یعنی اللہ کے سپرد کیوں کر رہے ہو؟'' الفریڈ نے غصے سے اعتراض کیا۔

''یار ڈونٹ مائنڈ! میں مسلم ہوں اور میرے Structure میں اللہ فیڈ ہیں، تمہارے ہاں اللہ کا نام بدل کر گاڈ کا لفظ فیڈ ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔'' عبدالولی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر اُس کے کندھے کو دبایا اور عبداللہ کے ساتھ باہر کا رخ کیا۔

لِزا چپ چاپ عبدالولی کے شان دار سراپے کو جاتے دیکھتی رہی، جب کہ الفریڈ کسی اور ہی بڑائی میں تھا۔

اللہ؟

واٹ اللہ؟

کون ہے یہ اللہ؟

اور اسے ولی کیوں سپر پاور کہہ رہا تھا۔

کیا مسلمز کا گاڈ ہی سپر پاور ہے؟

الفریڈ کے اندر جو سوال اُٹھے تھے، وہ اُسے اب سکون سے کہاں بیٹھنے دینے والے تھے۔

وہ اگر ان سوالوں کو Positive چوائس کرتا تو یقیناً اُس کی گڈ لک شروع ہونے والی تھی کیوں کہ وہ اُس کو مسلمانوں کے قافلے میں شریک کرنے کے لیے کافی تھے۔

اللہ۔ اللہ۔ اللہ!

الفریڈ کے دماغ میں یہ لفظ جیسے پہلے سے فیڈ تھا۔

(روحوں کے اندر تو ہمیشہ سے یہ لفظ فیڈ ہوتا ہے)

الی کا اللہ؟

میں اس کو جاننا چاہتا ہوں جس کو ماننے والا اتنا کامیاب ہے۔ یقیناً یہ ایک کامیاب Religion ہے۔

الفریڈ نے خود سے کہا تھا۔

❖❖○❖❖

"تم پاکستان آ رہے ہو، مجھے یقین نہیں آ رہا!'' ولی نے واقعی بے یقینی سے کہا۔

"کیوں! آپ کی شادی ہے تو میں نہ آؤں، ورنہ تو ہر بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ ہوتا ہے نا۔'' عبداللہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"لاحول، یار! محاورتاً نام عبداللہ استعمال کیا جاتا ہے۔'' عبدالولی کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہی تھی۔

"اور جناب میرا نکاح ہے، شادی نہیں۔'' عبدالولی نے کپڑوں کی تہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تو آپ نہیں چاہتے کہ میں آؤں؟'' عبداللہ نے روٹھے روٹھے لہجے میں پوچھا۔

"لاحول ولا! میں کیوں منع کروں گا یار! تمہیں دِل کی ساری گہرائیوں اور سچائیوں سے ویلکم بلکہ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے بہت زیادہ خوشی ہو رہی ہے۔'' ولی نے بے حد سچائی سے کہا۔

"اوکے! تو پھر وعدہ کریں آپ مجھے پاکستان دکھائیں گے!'' عبداللہ نے کہا۔

"ڈن!'' ولی نے خوش دلی سے کہا۔

"وعدہ کریں کہ میرا بھی ٹانکا کسی اچھی سی مشرقی بالکل بھابی علیزے جیسی لڑکی سے جڑوا دیں گے۔'' عبداللہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہیں! یہ بات ٹریول پیکیج میں کب سے شامل ہوگئی؟'' ولی نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

"ہوے بھیا! شادی کرنی ہے تو پاکستانی لڑکی سے ورنہ نہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

"لیکن کیوں؟''

"کیوں کہ میری ماں پاکستانی ہیں اور وہ دنیا کی بہترین عورت ہیں۔'' عبداللہ نے ایمان داری سے جواب دیا۔

"اوہو! لیکن موجودہ دور کی لڑکیاں مختلف ہیں بھائی۔'' ولی نے شرارت سے کہا۔

"کیوں! آپ کو علیزے بھابی اِسی دور میں دستیاب ہوئی تھیں کیا!'' عبداللہ نے دو بہ دو جواب دیا۔

"باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔'' ولی نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ڈن! میرے لیے بھی اچھی سی لڑکی آپ ہی تلاش کریں گے۔'' عبداللہ نے اصرار کیا۔

"لیکن میں ہی کیوں؟'' ولی نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں کہ آپ میرے بھائی ہیں۔'' عبداللہ نے آسانی سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں لقاں جان کے سپرد کر دوں گا تمہارا کام، اُمید ہے کہ اچھا ہی ہوگا لیکن اب جب کہ تم آ رہے ہو تو تم بھی آنکھیں اور دل کھول کر رکھنا تا کہ کوئی تمہاری آنکھوں کے رستے دل میں جگہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بنا سکے۔'' ولی نے مشورہ دیا۔

''لیکن اُسے بھی آپ اوکے کریں گے تب ہی وہ اوکے ہوگی۔'' عبداللہ نے کہا۔

''یار! تم بہت عجیب ہو۔'' ولی نے اُس کی اتنی بے انتہا محبت کو دیکھ کر بے اختیار کہا۔

''جو بھی ہوں آپ کا بھائی ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''واقعی تم میرے ہی بھائی ہو۔'' ولی کا دل بھی اندر سے گواہی دے رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''بھائی کتنے بجے کی فلائٹ ہے۔'' نگینہ نے پُر جوش انداز میں پوچھا، اتنے مہینوں بعد اُن کی ملا ہوئی تھی۔

''میں تم کو فلائٹ کا ٹائم نہیں بتا سکتا، خوامخواہ امّاں جان اور بابا جان بے آرام ہوں گے۔'' ولی جواب دے دیا۔

''بھائی پلیز!'' نگینہ نے ضد کی۔

''نو! آرام کرو، میں گھر آ جاؤں گا بلّی، مجھے گھر کا راستہ معلوم ہے۔'' ولی نے پیار سے کہا۔

''بھائی اتنے دنوں بعد ملنا تھا۔ اِٹس ناٹ فیئر۔'' نگینہ نے اصرار کیا۔

''نو۔'' ولی نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔

''اگر علیزے بھابی کو لانے کی آفر کروں تب بھی نہیں۔'' نگینہ نے شرارت سے کہا۔

''تب بھی نہیں! میری فلائٹ رات کو ہو سکتی ہے یا پھر فجر کے وقت پاکستانی ٹائم کے مطابق اور نہیں چاہتا کہ تم سب ساری رات بے آرام رہو۔'' ولی نے سچائی سے کہا۔

''اوکے!'' نگینہ نے سرینڈر کیا۔

''اچھا بتائیں بھابی کے کس کلر کے کپڑے ہیں؟'' نگینہ نے پوچھا۔

''یار پلیز! میں آسٹریلیا سے بات کر رہا ہوں، یہاں پنڈی سے نہیں۔''

''اچھا بچو! آپ لاہور واپس تشریف تو لائیں سارے حساب بے باق کریں گے۔'' نگینہ نے ہوئے کہا۔

''میری پیاری بلّی! تمہارے لیے تمہارے بھائی کی جان بھی حاضر ہے، مانگو کیا چاہیے۔'' ولی پوچھا۔

''استغفراللہ بھائی! آپ بس خیریت سے آ جائیں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی عطا کرے، یہ باتیں کرتے ہیں۔'' نگینہ نے دہل کر کہا۔

''وقت آنے پر تیرا یہ بھائی تیرے لیے جان دے سکتا ہے اور اللہ نہ کرے کبھی کوئی بُرا وقت آئے'' ولی نے دل میں کہا۔ اس کی نگاہوں میں ایک منظر گھوم گیا تھا، ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔

''اللہ حافظ بھائی!'' نگینہ نے کہا۔

''اللہ حافظ بلّی!'' ولی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

''یہ خواب آخر میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟''

''کچھ نامعلوم، ناآشنا سے چہرے کیوں اس دماغ میں گھومتے ہیں؟'' ولی سر تھام کر بیٹھ گیا پھر وہ ا دم اُٹھا اور اپنے ایزل کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ولی نے ساری رات کام کیا تھا صبح جب وہ سونے کے لیٹا تو اُس کے ایزل پر کچھ منظر بے حد واضح تھے، کچھ چہرے بے حد واضح تھے، اُس نے اپنا سارا اب اور اُن کے کردار کینوس پر اُتار دیے تھے۔ ولی کی قسمت جانتی تھی لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ اُس نے ی پہچان کو رنگ دیے ہیں، جو بہت جلد حقیقت کا روپ دھارنے والے تھے۔ پودا اپنے اصل کی جانب مڑ رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''اِس وقت کس کا فون ہے؟''

روشن آرا بیگم عشا کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی ب تک وہ وہاں تک پہنچتیں، دوسری جانب سے احمد شاہ فون اُٹھا چکے تھے۔

''میں نے آپ کو شریفوں کی زبان میں سمجھایا تھا کہ آپ ولی کا پیچھا چھوڑ دیں۔'' احمد شاہ کی غصّے اور ل سے بھری آواز روشن آرا بیگم نے پہلی بار سنی تھی ان کا دل ایک دم سہم گیا۔

''یہ کون ہے جس سے شاہ صاحب اس لہجے میں بات کر رہے ہیں۔

''سوچ لیں! اگر اِس کے نتائج بُرے نکلے تو میں ذمّے دار نہ ہوں گا۔'' سید سرفراز نے سلگتے لہجے میں ا۔

''ہمارے ہاں خون کا بدلہ خون، بیٹی کا بدلہ بیٹی ہوتی ہے۔'' سید سرفراز نے ڈائریکٹ دھمکی دی۔

''بکواس بند کرو، ہم نے کیا چوڑیاں پہن رکھی ہیں اور کیا میں تمہیں بے بڑی کا انسان لگتا ہوں جس کی اشرے میں عزت، مقام اور طاقت نہیں ہے، تم نے میری شرافت کو میری کمزوری جان لیا ہے، غور سے سید سرفراز علی! اگر تم نے میری اولاد پر بُری نگاہ ڈالی تو میں تمہاری بدمعاشی کا کچومر نکال دوں گا، میں ی بار بتا رہا ہوں۔ Take your way! اگر میں سانپ کو شرافت سے نکلنے کا موقع دے رہا ہوں میری چوائس ہے ورنہ مجھے اس کا سر کچلنا بھی آتا ہے۔'' احمد شاہ نے کہہ کر فون پٹخ دیا۔

''بہت پچھتاؤ گے!

''لیکن تم نہیں جانتے کہ شادی تو ولی کی مسکان سے ہی ہوگی۔'' سید سرفراز علی نے اٹل لہجے میں کہا

❖❖○❖❖

''آج تم کالج نہ جاتیں بیٹا!'' روشن آرا بیگم نے جلدی جلدی نگینہ کو ناشتا کرتے دیکھ کے کہا۔

''امّاں! آج میں اپنا اسائنمنٹ جمع کروا آؤں، کل یا آج رات بھائی کی آمد متوقع ہے اور میں بھائی ی اور نکاح بھرپور انجوائے کرنا چاہتی ہوں میں اپنی کچھ سہیلیوں کو بھی آج انوائٹ کر آؤں گی۔'' ہ نے سر پر دوپٹا جما کر کہا۔

ید لباس میں وہ حور لگ رہی تھی۔ اس کی معصومیت اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتی تھی۔

''اچھا اللہ کی امان میں۔'' روشن آرا بیگم نے اُسے حسبِ معمول جاتے ہوئے دعا دی۔

"لتاں جان! بابا کو میرا سلام دے دینا، وہ ابھی تک واش روم میں ہیں۔" نگینہ نے باہر نکلتے ہو کہا۔

"توبہ ہے آج بھائی کی خوشی میں یہ لڑکی گھوڑے پر سوار ہے، آیت الکرسی بھی نہیں پڑھی اور چلا ورنہ تو آندھی آئے طوفان آئے دیر ہو یا سویر! ہر صورت وہ اُس وقت تک ٹھہرتی تھی، جب تک روشن بیگم آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم نہیں کر لیتی تھیں۔

"اللہ کے سپرد!" روشن آرا بیگم کو نگینہ کی جلد بازی اچھی نہیں لگی تھی لیکن وہ بات بے بات ناپسند کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

❖❖○❖❖

"نگینہ! یہ تیرا دوپٹا بہت پیارا ہے۔" کاشفہ نے کہا۔

"تمہیں اچھا لگا؟" نگینہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"بہت!"

کاشفہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھی اور نگینہ اُسے ہمیشہ تحفوں سے نوازتی رہتی تھی۔

"تم رکھ لو کاشفہ!" نگینہ نے فوراً اس کا دوپٹا خود لے کر اپنا اُسے دے دیا جس پر بھرپور دھاگے شیشے کا کام کیا بنا ہوا تھا۔ روشن آرا بیگم نے بہت شوق سے اُسے لے کر دیا تھا لیکن وہ نگینہ تھی، دیالو باپ کی بیٹی جو قیمتی سے قیمتی چیز بھی عزیز نہ رکھتی تھی۔ ہمیشہ چیریٹی کے لیے تیار رہتی تھی۔

"ارے، ارے! یہ کیا؟ میں تو یوں ہی تعریف کر رہی تھی۔" کاشفہ نے بہ ظاہر تکلف سے کہا، لیکن سے وہ دوپٹا پا کر خوش ہو گئی تھی۔

"میری جان! رکھ لو، تمہیں اچھا لگ رہا ہے۔" نگینہ نے عام شکل وصورت کی کاشفہ کو بھی پیار دیکھ کر کہا۔ اُس کی نظر میں خوب صورت بدصورت کبھی الگ الگ نہ تھے۔ اُس کی تربیت ہی ایسے پر ہوئی تھی کہ ہر انسان کو وہ اہم جانتی تھی۔

"تھینک یو نگی! تم بہت اچھی ہو۔" کاشفہ نے سچائی سے کہا۔

"اچھا میں چلتی ہوں، میری بس آ گئی ہوگی۔" کاشفہ نے ایک دم گھڑی دیکھ کر بیگ اُٹھایا اور سے مل کر گیٹ پار کر گئی۔

سامنے سڑک پار واپڈا کی بس کھڑی تھی، کاشفہ کے ابو واپڈا میں تھے، اس لیے واپڈا کی بس اُسے سے پک کر کے گھر کے پاس ڈراپ کرتی تھی ابھی اُس نے سڑک پار کی ہی تھی کہ بلیک شیشوں والی جیپ اُس کے پاس رُکی۔ بس ایک پَل لگا تھا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک پَل میں وہاں سے لڑکی غائب تھی۔

"السلام علیکم رحیم چاچا!" نگینہ نے اپنا بیگ اور فائل گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے ڈرائیور سے ا

"وعلیکم السلام بیٹا! جیتی رہو، چلیں؟" رحیم چاچا نے نگینہ سے پوچھا۔

"جی چاچا!" نگینہ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا جی! صبح آپ کے اس سفید سوٹ کے ساتھ بڑا اچھا شیشوں والا دوپٹا تھا، وہ کہاں گیا؟" رحیم چا نے نگینہ سے پوچھا۔ اُس نے کاشفہ کا پنک کلر کا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔

"ارے واہ چاچا! آپ کو یاد ہے صبح میں نے کس کلر کا دوپٹا لے رکھا تھا۔" نگی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تم تو ہمارے ہاتھوں کی پوروں میں ہو نہ چاہتے ہوئے بھی تمہارا دھیان گیان رہتا ہے۔" رحیم چا نے ایمان داری سے جواب دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"وہ میری ایک دوست کو پسند آ گیا تھا، میں نے اُسے دے دیا اور اُس کا رکھ لیا۔" نگینہ نے بے حد گی سے جواب دیا۔

"رحیم چاچا! مجھے پہلے مارکیٹ لے چلیں، ولی بھائی کی کل صبح کی فلائٹ ہے میں اُن کے کمرے کو ڈیکوریٹ کرنا چاہتی ہوں اور اُن کی پسند کا بلیک فارسٹ کیک اپنے ہاتھ سے بنانا چاہتی ہوں مجھے چیزیں چاہئیں۔" نگینہ، ولی کی آمد پر بے حد پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

"جی اچھا بیٹا!" رحیم چاچا نے گاڑی سپر مارکیٹ کی طرف جانے والی روڈ پر ابھی ڈالی ہی تھی کہ ایک وی ٹی آئی اُن کے سامنے آ کر راستا روک گئی۔

"خانہ خراب! ابھی ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو اپنے ساتھ ساتھ ہمارا بھی کام خراب کروانا تھا۔" رحیم چاچا بروقت بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

ابھی نگینہ یا رحیم چاچا مزید کچھ سوچتے کہ گاڑی سے کئی اسلحہ بردار لوگ نکلے اور ایک دم اُن پر حملہ دیا۔ رحیم چاچا نے ڈیش بورڈ سے پستول نکال لی تھی۔ وہ ایک وفادار اور بہادر انسان تھے، ہمت نے والے تھے نہ حوصلہ ہارنے والے۔ لیکن وہ اتنے سارے مسلح اسلحہ بردار کا مقابلہ نہ کر سکے، غنڈوں نگینہ کے منہ پر رومال رکھا اور اُسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ نگینہ بے ہوش ہو چکی تھی، رحیم چاچا نے پور مزاحمت کی لیکن وہ چھ لوگ تھے، جاتے جاتے انہوں نے رحیم چاچا کو گولی مار دی، خون زیادہ بہہ نے سے وہ بے ہوش ہو چکے تھے لیکن بے ہوش ہونے سے پہلے مسلسل لوگوں کو مدد کے لیے پکار رہے

تھے۔ بے شک یہ سڑک زیادہ گنجان نہیں تھی لیکن ویران بھی نہ تھی اکّا دُکّا لوگ تھے، جنھوں نے یہ حا دیکھا اُن کو لگا کہ پرائے پھڈے میں کیوں پڑیں وہ بالکل آگے نہ بڑھے۔

غنڈوں نے نگی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور زن سے گاڑی بھگا کر لے گئے کسی راہ گیر نے فوراً پولیس کو اطلاع کی تھی، پولیس ریسکیو پانچ سات منٹ میں وہاں آ گئی تھی لیکن بے سود تھا۔ یہ سب کچھ کوئی پا چھ منٹ میں ہوا ہوگا، نگی کی گاڑی کھلی پڑی تھی، اُس کی فائل سیٹ سے نیچے اور بیگ روڈ پر گرا ہوا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر رحیم چاچا خون سے لت پت پڑے تھے۔

''بزرگ کو ایمبولینس میں ڈالو۔'' ریسکیو کے ایک جوان نے ماتحتوں کو کہا اور خود جھک کر زمین سے بیگ اُٹھایا، بیگ کے اندر موجود ڈائری اور نیم پلیٹ سے وہ جان گئے کہ یہ بیگ نگینہ احمد کا تھا۔ ریسکیو ملازم نے جیب سے موبائل نکال کر ڈائری سے نمبر لیا۔

''ہیلو! جی ہم ریسکیو پولیس ہیں، ہمیں ابھی ابھی ایک حادثے کے پاس آپ کی بیٹی کا بیگ پڑا ملا ہے!''

''جی! جی..جی.. اور ڈرائیور کی حالت بھی تشویش ناک ہے، بہ ظاہر یہی لگتا ہے آپ کی بیٹی کا اغوا ہوگیا ہے۔''

اُس نے اور ایک دھماکا کیا تھا۔

❖❖○❖❖

''اب آئے گی عقل اُس احمد شاہ کے بچے کو!'' سید سرفراز علی نے فون بند کر کے با آواز بلند کہا اور آیا امّاں کے کمرے میں آ گئے، وہ سجدے میں گری دُعا کر رہی تھیں۔

''اُٹھ جا نفیسہ! لگتا ہے تیری دعاؤں میں دم ہی نہیں، اتنے برسوں سے میرے خلاف دعائیں مانگ رہی ہے لیکن مجال ہے مجھے کچھ ہوا ہو، تیری دعائیں تو مسکان کی قسمت نہیں بدل سکیں لیکن دیکھنا اُس کے باپ کی وجہ سے اب کیسے اُس کی قسمت بدلتی ہے!'' سید سرفراز علی نے ہنستے ہوئے وہیں قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

آیا امّاں نے تسلی سے منہ پر ہاتھ پھیرے اور آمین کہہ کر سید سرفراز علی کی جانب دیکھا۔

''ضروری نہیں کہ صرف آنکھیں رکھنے سے ہی اِرد گرد کے منظر نظر آئیں، اس کے لیے دل کی آنکھ کا کھلا رہنا ضروری ہے۔ اگر تم دیکھ سکتے تو تم نے دیکھنا تھا کہ مسکان کی تو واقعی قسمت تمہاری وجہ سے بدل کر رہ گئی۔'' آیا امّاں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''لیکن تم دیکھ نہیں پا رہے کہ یہ قسمت سیاہی میں بدلی ہے!''

ایک بیس سال کی بچی کو تم نے اُس کی عمر سے دُگنے دکھ دیے ہیں کیسی قسمت ہے اُس بے چاری کی کہ وہ اب تک اپنے باپ کا کیا بھگت رہی ہے۔'' آیا امّاں نے دُکھ سے کہتے ہوئے جائے نماز لپیٹا۔

''لو پھر لیکچر شروع ہوگیا! لیکن کوئی مسئلہ نہیں ابھی میرا موڈ بہت اچھا ہے اس لیے مجھے تمہاری باتیں بُری نہیں لگ رہیں۔'' سید سرفراز نے کمال مہربانی سے کہا۔

''نفیسہ! مجھے اپنی فتح قریب نظر آ رہی ہے۔'' سید سرفراز علی کا لہجہ کھنک رہا تھا۔

آیا اماں نے سرد نگاہوں سے اُس کو دیکھا، سید سرفراز علی کو اس وقت کسی کی پروا نہیں تھی۔

''میں نے اُس لڑکے ولی کی بہن کو اغوا کروالیا ہے۔'' سید سرفراز علی نے مسکراتے ہوئے آیا اماں کے سامنے بم پھوڑا۔

''میرے خدا!'' آیا اماں نے بے اختیار دل تھاما۔

''تیرے ہاتھوں سے دنیا کی کوئی لڑکی محفوظ نہیں ہے، چاہے وہ تمہاری خود کی بیٹی ہو یا پھر کسی اور کی۔'' آیا اماں نے اپنا سر تھام لیا۔

''یہ میں نے اپنی بیٹی کے لیے ہی کیا ہے۔'' سید سرفراز لی نے دلیل دی۔

''اپنی بیٹی کے لیے دوسرے کی بیٹی کی زندگی برباد کرنا کہاں کا انصاف ہے؟'' آیا اماں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کہاں ہے وہ؟ کیا تم نے اُسے دیکھا ہے؟'' آیا امّاں نے پوچھا۔

''کچھ ہی دیر بعد وہ حویلی پہنچ جائے گی اور بے فکر رہو مجھے اتنی عقل ہے کہ جہاں میں نے اپنی بیٹی رکھی ہے وہاں کی لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم اُسے اپنی نگرانی میں رکھ سکتی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں، بے شک ہم اُسے زبردستی اُٹھا کر لائے ہیں لیکن وہ رہے گی یہاں ایک مہمان کے طور پر۔'' سید سرفراز علی نے بے حد مطمئن لہجے میں کہا۔

''سرفراز! تم نے کبھی عبدالولی کو دیکھا ہے؟'' آیا امّاں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں! لیکن اگر مسکان کو وہ پسند ہے تو وہ مسکان کا ہی ہوگا یہ میرا فیصلہ ہے۔'' سید سرفراز علی نے بے نیازی سے کہا۔

''سرفراز! تم عبدالولی کا سامنا نہیں کر سکتے۔'' آیا امّاں کا لہجہ کچھ عجیب ہی معنی لیے ہوئے تھے۔

''اوہ! کرلیں گے سامنا بھی، اس کی بہن یہاں مہمان بن کر رہے گی، ہم نے کون سا اُسے کچھ کہنا ہے۔'' سید سرفراز علی نے کہا۔

''اچھا تم لڑکی سے مل لینا اور میں شہر جا رہا ہوں آج مسکان کو ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی اُس کو لانا ہے۔'' سید سرفراز علی کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

''سید سرفراز علی! اللہ کی اس زمین پر تم ایسے موذی ہو، جس کے شر سے کوئی محفوظ نہیں۔'' آیا امّاں کی آنکھوں میں نگینہ کا بھولا بھالا حسین چہرہ گھوم گیا۔ مسکان، سائرہ کی سالگرہ پر جو تصویریں کھینچ کر لائی تھی ان میں عبدالولی اور نگی کی تصویریں بھی تھیں۔

عبدالولی کا چہرہ سید عبداللہ کے چہرے کی ہو بہو کاپی ہے اور سید سرفراز کیسے اس چہرے کا سامنا کرے گا، اس اتفاق میں کوئی راز موجود ہوا کہ عبدالولی اور نگینہ کے نام اور شکلیں سید عبداللہ کے مرے ہوئے بچوں سے ملتی ہیں تو حقیقت کا کیا رنگ ہوگا؟

آیا امّاں وہیں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

❖❖○❖❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''شاہ صاحب! میری بچی!'' روشن آرا بیگم کو تو ایک غش آتا اور جاتا تھا۔
''میری بچی! میری پھولوں جیسی پاکیزہ بچی، جانے اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا؟'' احمد شاہ کا اپنا دل کسی نے مٹھی میں لے رکھا تھا۔
'میرے خدا! یہ آزمائش میری برداشت سے زیادہ ہے۔'' انہوں نے بے اختیار اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے فون ملایا۔ کمشنر اُن کا دوست تھا وہ چھوٹی موٹی رپوٹ لکھوا کر خود کو تسلی دے کر نہیں بیٹھ سکتے تھے، اُن کا تو دل کوئی اندر سے نوچ رہا تھا۔
''میری گڑیا! اللہ اُسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔'' وہ دل ہی دل میں مسلسل دُعا کر رہے تھے۔
''طارق بیٹا! کچھ پتا چلا؟'' جیسے ہی طارق گھر میں داخل ہوا، روشن آرا بیگم اُس کی جانب لپکیں۔ ضبط کرتے کرتے طارق کی آنکھیں شدت سے سرخ ہو رہی تھیں، نگینہ تو اُس کے دل کی دھڑکن تھی، اُسے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔
''آنٹی! میری ساری ٹیم بے حد متحرک ہے، اِن شاءاللہ نگی چند گھنٹوں میں مل جائے گی۔'' طارق نے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا جس نے احمد شاہ کے پی ٹی سی ایل فون کو ٹیپ پر لگایا اور سیل فون میں ایک ننھا آلہ نصب کیا، جو بتاتا تھا کہ فون کتنی دوری کی رینج پر کیا جا رہا ہے۔
طارق کو اب ایک عدد کال کا انتظار تھا جو اُس کے خیال میں فوراً احمد شاہ کے فون پر آنی چاہیے تھی لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ یہ کال احمد شاہ کے فون پر نہیں اُس کے خود کے موبائل پر آنے والی تھی۔
''انکل! آپ کو کسی پر شک ہے؟'' طارق نے معمول کی تفتیش شروع کی تھی۔
''شک؟'' احمد شاہ کے کانوں میں سید سرفراز علی کی دھمکی آمیز فون کال گونجی۔
''مجھے سید سرفراز علی پر شک ہے! ہوسکتا ہے اُس نے ایسی گھٹیا حرکت کی ہو لیکن کوئی شخص ایسی حرکت کیسے کرسکتا ہے خالصتاً ایک بیٹی کا باپ دوسرے کی بیٹی کو کیسے اٹھا سکتا ہے؟'' احمد شاہ جیسا نرم دل اور نیک انسان تو ایسے ہی سوچ سکتا تھا۔
''کیوں کہ جو اچھا ہے وہ برائی کی حد کو محسوس نہیں کرسکتا، اسی طرح جو بُرا ہے وہ بھی اچھائی کی حد نہیں جان سکتا۔''
''سید سرفراز علی!''
''کون؟'' طارق کو لگا اُس نے یہ نام کہیں سُن رکھا ہے۔
''مسکان کا باپ!'' احمد شاہ نے دھماکا کیا۔
''کیا؟''
''اوہ مائی گاڈ!'' طارق نے تاسف سے کہا۔
''آئی کانٹ بلیو!'' طارق حیران تھا۔
''کیا انہوں نے آپ سے ایسی کوئی بات کہی تھی۔'' طارق نے پوچھا۔ جواباً احمد شاہ نے اپنی اور سرفراز کی ملاقات سے فون کال تک ساری گفتگو اے ٹو زیڈ تک کہہ سنائی۔
طارق کا غصّے سے حال بے حال ہوگیا تھا۔

''انکل! آپ نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟ آپ نے اِس ساری بات کو کیسے اتنا غیر اہم جان لیا۔'' طارق نے فکرمندی سے کہا۔
''میرا خیال تھا کہ وہ بیٹی سے رشتے سے انکار کی وجہ سے غصّے سے ایسی باتیں کر رہا ہے۔'' احمد شاہ نے ایک طویل اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔
''ایسے لوگ!'' طارق جی بھر کر گالی دینے کے موڈ میں تھا۔
''میں ابھی سرچ وارنٹ کا بندوبست کرتا ہوں، ہمیں لیگلی اور بہت احتیاط سے یہ کام آگے بڑھانا ہوگا تاکہ نگی کو کوئی نقصان نہ ہو۔'' طارق کہتا ہوا وہاں سے نکلا تھا۔
احمد شاہ وہیں ڈھے گئے ان کو لگ رہا تھا کہ اُن کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں، انہوں نے مڑ کر روشن آرا کو دیکھا جو گھٹی گھٹی سسکیوں سے مسلسل رو رہی تھیں۔
صبح عبدالولی پاکستان پہنچ رہا تھا اور گیارہ بجے اُس کا نکاح تھا اور یہ حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جانے قسمت اُن کے لیے کیا لے کر بیٹھی تھی۔
پنڈورا باکس اب کھل ہی جاتا تو اچھا تھا۔ احمد شاہ اور روشن آرا بیگم نگی کی بازیابی کے لیے بے حد پریشان تھے۔

❖❖ ( ) ❖❖

''میں! میں..کہاں ہوں؟'' نگی تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔
ایک شان دار کمرا تھا، جہاں نگی کو لا کر لٹایا گیا تھا سامنے کیمرا اور شوٹنگ اسپاٹ وغیرہ بھی موجود تھے جیسے یہاں تصویریں وغیرہ کھینچی جاتی ہیں۔
نگی نے چکراتے سر کے ساتھ کھڑے ہوکر کمرے کا جائزہ لیا، کمرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔
وہ دروازے کی جانب بڑھی۔
''کھولو! دروازہ کھولو!'' نگی کی گھبراہٹ اور خوف سے آواز بہ مشکل نکل رہی تھی۔
''کھولو! دروازہ کھولو!'' نگی کو جیسے ہی اپنے اغوا کے پل دماغ میں آئے، وہ بدحواس ہوکر اونچی آواز میں دروازہ کھولنے پر اصرار کرنے لگی ساتھ ہی دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔
''میرے اللہ! مجھے بچا! میں کہاں ہوں اور مجھے کیوں اغوا کیا گیا ہے۔'' وہ ننھی چڑیا جیسا دل رکھنے والی خوف سے کانپتے ہوئے خود سے سوال کر رہی تھی۔
تھک کر بیٹھ گئی لیکن کچھ ہی پل بعد وہ پھر زور شور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی کوئی خوف، کوئی نقصان کی آہٹ کا احساس اُسے وحشت زدہ کر کے زور آور کر رہا تھا۔

❖❖ ( ) ❖❖

''ارے بھیا! بڑی رنگت نکالی ہے۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اوہ یار بس کرو!'' ولی نے ہنستے ہوئے کہا کیوں کہ عبداللہ مسلسل عبدالولی کو چھیڑ رہا تھا۔
''اچھا تم لوگ کب پہنچ رہے ہو؟'' ولی نے پوچھا۔
''آپ کے پاکستان پہنچنے کے تین گھنٹے بعد ہم بھی پہنچ رہے، ہیں میں نے کوشش تو کی تھی کہ آپ کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ہماری سیم فلائیٹ ہو جائے لیکن ممکن نہ ہو سکا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''او کے یار! یہ بھی اچھا ہے کہ میں تم کو خود ویلکم کرنے کے لیے موجود ہوں گا، اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ہوگی نہ کوئی اچھی مصلحت کہ میں تم کو پہنچ کر ویلکم کروں گا۔'' ولی نے خوش ا... سے کہا۔

''بھائی میاں! آپ کی نکاح کی تقریب کب ہے؟ کہیں میں لیٹ نہ ہو جاؤں۔'' عبداللہ نے پُر... انداز میں کہا، اُسے فکر لگی ہوئی تھی۔

''یار! مِس علیزے کا نکاح عبداللہ کی غیر موجودگی میں ہرگز نہ ہوگا۔ تُو ہوگا تو نکاح ہوگا۔... خوش!'' ولی نے اندر جانے سے پہلے کہا۔

''اور تم بھی فوراً گھر جاؤ، جا کر آنٹی کو لاؤ کہیں اِس آنی جانی میں تمہاری فلائٹ نہ مِس ہو جا...

ولی نے ڈپارچر لاؤنج کی جانب بڑھنے سے پہلے عبداللہ کو گلے لگایا اور پھر اندر بڑھ گیا۔

''یار عبداللہ! تُو تو دولہے کی طرح وی آئی پی ہو گیا ہے، تیرے بغیر مِس علیزے مسز نہیں بنے گی...

عبداللہ ہنستے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھا، گھر پر سب اُس کا ویٹ کر رہے تھے خود کچھ دیر بعد اُس کی امی کی فلائٹ پاکستان کے لیے تھی لیکن وہ ولی کی محبت میں باؤلا ہوئے ایئر پورٹ اُسے سی آف کر... آ گیا تھا۔

ولی نے کہا بھی کہ تم کیوں آئے لیکن یہ اُس کا نظریہ تھا کہ سی آف اور ویلکم کے لیے کوئی موجو... انسان کو لگتا ہے کہ اُس کا اپنا کوئی ہے ورنہ تو عجیب خالی خالی زندگی لگتی ہے۔

''پاکستان! لینڈ آف مسٹری!

لینڈ آف فینٹسی! لینڈ آف مائی مدر اینڈ پاپا!

آئی ایم کمنگ!'' عبداللہ مسکراتے ہوئے کہا، وہ بہت خوش تھا۔ جانے کون سی چیز اُسے پاکستان طرف کھینچ رہی تھی، کوئی مقصد تھا یا ذمے داری!

لیکن اللہ نے اِن میں سے کچھ اُس کے لیے لکھ دیا تھا۔

❖❖()❖❖

''کمال کرتی ہیں آپی! صبح سے کام میں لگی ہیں، رات ہو گئی لیکن آپ کے کام ختم نہیں ہو ر...

غزالہ نے اندر آ کر علیزے کو ٹوکا، جو کھیر کے بڑے سے دیگچے کے ساتھ لگی کھیر پکا رہی تھی۔

''یہ دیگ پکانے سے بہتر تھا کہ آپ امی سے کہہ کر بازار سے منگوا لیتیں۔'' غزالہ نے بیزاری کہا۔

''پھر تقریب تو ہوٹل میں ہے، کھانا وانا تو خالہ لوگوں نے ارینج کیا ہے پھر یہ کیوں؟'' غزال... بیزاری سے اِس سارے بکھیڑے کو دیکھا۔ دس کلو کی کھیر سنبھالنا خاصا مشکل کام تھا۔

''میری پیاری بہنا! نکاح ابو کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اِدھر گھر میں ہوگا، جس میں صرف گھ... لوگ شامل ہوں گے اور بعد میں ہال میں مہمانوں کے لیے ریسپشن وغیرہ ہے۔ خالہ اور خالو کے مہا... ہال میں ہی آئیں گے لیکن گھر کے افراد کو منہ تو میٹھا کروانا ہوگا نا! اور تم جانتی ہو کہ اُن کو کھیر بہت...

...اس لیے امی نے کہا کہ کھیر بنا لیتے ہیں سب خوش ہو کر کھا لیں گے۔'' علیزے نے شرماتے ہوئے ...ا۔

''اوہو! تو یہ سب تردّد صرف ولی بھائی کے لیے ہو رہا ہے۔'' غزالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بالکل!'' علیزے نے کچھ استحقاق بھرے انداز میں کہا۔

''آپی! آپ ولی بھائی کو بہت چاہتی ہیں نا!'' غزالہ نے اُس کے چہرے پر اَن گنت رنگ دیکھ کر ...اختیار سوال کیا۔

''آں.. ہاں!'' علیزے نے مسکرا کر کہا، کچھ چولھے کی تپش اور کچھ علیزے کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا ...غزالہ کو وہ بنا کسی ہار سنگار کے دلہن سی لگی تھی۔

''کون کہتا ہے کہ سرخی پوڈر کا سنگار کرنے سے دلہن کو روپ آتا ہے! روپ تو سچی خوشی سے آتا ہے، ...اس وقت علیزے کے انگ انگ سے چھلک رہا تھا تبھی تو اتنی رات گئے بھی وہ مسلسل کام میں مشغول ...اور تھکن کا رَتی بھر احساس تک نہ تھا۔''

''اچھا پیاری بہنا! مہربانی کر کے جلدی فارغ ہو کر ذرا ریسٹ کر لیں، کل کا سارا دِن آپ کو دلہن بن ...ٹھنا ہوگا امی نے کہا ہے کہ آپ اب آرام کریں اور کوئی کام ہے تو ہم کو بتائیں۔'' غزالہ نے امی کا ...علیزے کے گوش گزار کیا۔

''ارے میں نہیں تھکتی، تم جا کر امی کو دوا دو اور اُن کو سلا دو، ان کا وقت پر سونا ضروری ہے۔'' علیزے ...غزالہ سے کہا۔

''او کے! مرضی ہے! میں ابھی امی کو بتاتی ہوں کہ آپی کو تو دلہن بننے کی خوشی میں تھکن اور نیند بالکل ...ہے۔'' غزالہ شرارت سے کہتی وہاں سے بھاگی کیوں کہ علیزے نے گھورتے ہوئے کفگیر اُٹھا لیا تھا۔

❖❖()❖❖

اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
جس پر تیرا نام لکھا ہے اُس تارے کو ڈھونڈوں گا
تم بھی ہر شب دیا جلا کر پلکوں کی دہلیز پر رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمہارے شہر کی جانب بھیجوں گا
ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
پانی کی ہر سطر پر میں کچھ دِل کی باتیں لکھوں گا
جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھیگے تھے
تم بھی اُس کو چھو کے گزرنا، میں بھی اُس سے لپٹوں گا
خواب مسافر لمحوں کے ہیں، ساتھ کہاں تک جائیں گے
تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میں بھی اب کچھ سوچوں گا

''ہیلو!'' ولی نے ایئر پورٹ پہنچتے ہی موبائل آن کیا اور علیزے کو فون کیا۔

...اے ایک مختلف سا احساس گھیرے ہوئے تھا مسکراہٹ خوامخواہ چہرے کا بار بار احاطہ کر رہی تھی پُھ...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پالینے کا احساس، خوشی کا احساس اُس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' علیزے کی مدھر آواز ولی کو اندر تک خوش کرگئی۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہو؟'' ولی نے مسکرا کر یوں کہا، جیسے علیزے سامنے کھڑی ہو۔

''اچھی ہوں!'' علیزے کی دھیمی آواز اُس کے اندر بہت سارے سُر جگا گئی۔

''یار! تمہاری آواز میں کیا جادو ہے زندگی جاگ اٹھتی ہے، صبح بخیر!'' ولی نے اپنا مختصر سا سا کلیئرنس سے اُٹھایا اور ٹرالی میں لاکر رکھا۔

''صبح بخیر!'' علیزے نے بے حد خوشی سے جواب دیا۔

''بہت جلد تمہاری قسمت بدلنے والی ہے میری جان! بس چند گھنٹوں بعد آپ مسز ہو جاؤ گی۔'' نے شوخ سی شرارت کی۔

علیزے کے اندر کوئی چیز گدگدائی تھی، جو اُس کے ہاتھوں تک کی ہتھیلیوں کو پسینے سے بھگوگئی۔

''میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں ولی!'' علیزے نے اقرار کی پہلی گرہ کھولی۔

''جناب! تمہارا دولہا پاکستان پہنچ گیا ہے، چند گھنٹوں بعد تم تک بھی پہنچ جائے گا۔ اچھا بتاؤ کس لباس پہن رہی ہو؟''

''خالہ لائی ہیں بہت اچھا ہے، پہن کر ہی آپ کو دکھاؤں گی۔''

''صرف دیکھنے پر ہی گزارا کرنا ہوگا یا چھونے کی بھی اجازت ہوگی؟'' ولی کی اتنی شوخ باتیں علیز کیسے سنبھلنی تھیں۔

''میں.. میں فون رکھتی ہوں!

او کے اللہ حافظ!'' علیزے نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اُس کی اِس حرکت پر ولی نے ہلکا سا قہقہہ لگا فون بند کر کے وہ جیسے ہی ایئر پورٹ سے باہر نکلا کہ ٹیکسی کرے تو اس کا موبائل دوبارہ بج اُٹھا۔

ولی نے مسکراتے ہوئے فون آن کیا اسکرین پر طارق کا نام جگمگاتا وہ دیکھ چکا تھا۔

''السلام علیکم جناب یارمن!'' ولی کا موڈ بہت اچھا تھا وہ باقاعدہ چہکا۔

''کیا؟'' اگلے ہی پل ولی کے منہ سے بے یقینی سے نکلا۔

''طارق! کہو یہ جھوٹ ہے! میری بہن کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوسکتا۔'' ولی کی آواز تو باقاعدہ ر ہوگئی تھی۔

نگینہ میں تو ولی کی جان ہوئی تھی۔

''میں... میں گھر ہی آرہا ہوں۔'' ولی نے عجلت سے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اس قدر پریشان تھا کہ اُسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر اُسے وہ ہی خود پر حاوی ہوتا محسوس ہوا تھا۔ آگ کے شعلے لپک لپک کر اُس کی جانب اور نگینہ کی جانب بڑھ تھے۔

''نہیں!'' ولی نے بے اختیار اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

''کیا ہوا صاحب! یہی روڈ تو ڈیفنس جاتا ہے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے سمجھا کہ وہ غلط راستے پ

''آں.. ہاں! یہ ٹھیک راستا ہے۔'' ولی نے اتنی سردی میں بھی اپنے ماتھے پر پسینا پونچھا۔

''میری بہن کو جس نے اغوا کیا ہے میں اُس کی جان نکال دوں گا۔'' ولی کا خون غیرت سے کھولنے

❖❖○❖❖

''یہ کیسا شور ہے؟'' ترنم نے ماہی سے پوچھا جو نقاہت سے بستر پر پڑی تھی۔

''کوئی بدنصیب پھر اِن کے ہاتھ چڑھ گئی ہوگی۔'' ماہی نے نقاہت سے کہا۔

ترنم ایک دم بے چین ہوگئی ابھی کچھ عرصے پہلے اُس نے یہاں سے ایک لڑکی بھگائی تھی اور طارق ا موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا اس کے علاوہ بھی یہاں آج کل بے حد سختی ہوگئی تھی۔ کسی لڑکی کی مدد کرنے کا مطلب موت کو کھلے ہاتھوں دعوت دینا تھا۔

''میرا دل کرتا ہے کہ میں اُس لڑکی سے مل کر آؤں!'' ترنم نے رات گہری ہونے پر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''چلی جاؤ! یہ تو ایسا قید خانہ ہے کہ اگر وہ قید ہے تو ہم بھی قید ہیں! جانے کب اِس قید خانے سے ان چھوٹے گی۔ شاید موت واحد دروازہ ہے لیکن ترنم! یہ دروازہ پار کرنا کس قدر مشکل ہے نا!'' ماہی کی از میں خوف بے حد نمایاں تھا۔

''ترنم! ہم جیسوں کو تو موت بھی سخت آتی ہوگی نا؟'' ماہی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''نہیں! کیوں کہ ہر Hidden Reality+Non Hidden کی پاور صرف اللہ کے پاس ہے Taste Of Death کس پر کیسا اُترے گا یہ اس کے ہاتھ میں ہے ہمارے ہاتھ میں صرف Confessio ہے اور اس سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔'' ترنم نے بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔

''ترنم! میں کوئی ایسا کفارہ کرنا چاہتی ہوں، جس سے مجھ پر Taste Of Death آسان اُترے۔ ا میں کس قدر آرام اور آسائش والی زندگی جی چکی ہوں، موت کی سختی Face کرنے کا مجھ میں حوصلہ ں، مجھے شارٹ کٹ چاہیے!'' ماہی نے آس سے کہا۔

''ماہی! تم تو یوں کہہ رہی ہو، جیسے تم ابھی مرنے والی ہو۔'' ترنم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ڈیئر! موت کا شیڈول بھی اللہ کے ہاں Hidden ہوتا ہے۔'' ترنم نے کہا۔

''لیکن اُس کی تیاری تو ہر وقت رکھنی چاہیے نا!'' ماہی کی بات پر ترنم چونکی۔

''ماہی! تم مجھے اپنی دوست سمجھتی ہو نا!'' ترنم نے اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''دوست سے زیادہ، بہن سے زیادہ، شاید ایک ماں کا آسرا بھی تمہارے وجود میں ڈھونڈتی ہوں۔'' ماہی نے نم آنکھوں سے کہا۔

''تو پھر مجھے بتاؤ، آخر تجھے کیا ہوا ہے؟'' ترنم نے بے حد پیار سے پوچھا۔

''کیوں ایسی ہوگئی ہو تم، تمہیں کیا بیماری ہے اور یہ کیا ہے؟'' ترنم نے دراز میں موجود دواؤں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ کس مرض کی دوا کھا رہی ہو؟" ترنم نے اکٹھے کتنے ہی سوال کر ڈالے تھے۔
"مرض! موت کا مرض کہلاتا ہے یہ! مجھے ایڈز ہے ترنم!" ماہی نے دھماکا کیا تھا۔
"ک...کیا؟" ترنم نے حیرت و دکھ سے اس کی جانب دیکھا۔
"کیوں ڈر گئیں؟ دور ہٹ کر بیٹھو!" ماہی نے ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔
"بکواس بند کرو!" ترنم نے غصے سے اُسے دیکھا۔
"اگر چھوت کا مرض بھی ہوتا تو میں تم کو کبھی نہ چھوڑ کر جاتی، تم نے مجھے اتنا گھٹیا سمجھا ہوا ہے۔" ا
نے سلگ کر کہا۔
"لیکن مجھے دکھ یہ ہے کہ تم نے اپنا درد اور مرض مجھ سے چھپایا، کیا اتنے سالوں کی "روم میٹ" کا
بھی حق نہ تھا کہ میں تمہاری تکلیف کو تھوڑا سا ہی بانٹ سکتی!" ترنم نے غصے سے "روم میٹ" پر زور د
ہوئے کہا تھا۔
"اب تم روم میٹ کا لفظ استعمال کر کے خود کو پرایا بنا رہی ہو۔" ماہی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔
"تو پھر میری جان! کیوں تم نے اکیلے اس درد کو جھیلا؟" ترنم کی سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، ا
مہینوں سے وہ ماہی کو کسی موم کی طرح پگھل پگھل کر ختم ہوتے دیکھ رہی تھی لیکن وجہ آج جان پائی تھی۔
"ماہی میری جان! تم اِن شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گی، ہم تمہارا بہت اچھے ڈاکٹروں سے علاج کروا
گے۔" ترنم نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"کیوں! تم کو نہیں لگتا کہ میں نے اپنے علاج کے لیے دوڑ دھوپ نہ کی ہوگی۔" ماہی ہنسی۔
"مجھے تو زندگی سے پیار ہی بہت تھا، میں تو زندگی کے لیے اتنا بھاگی ہوں ان دنوں کہ مجھ پر سار
کی تھکن حاوی ہوگئی ہے۔" ماہی نے اپنے بکھرے بالوں کی لٹوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔
"میں بہت تھک گئی ہوں! آرام کرنا چاہتی ہوں اور یہ آرام اب موت ہی سے حاصل ہوگا ا
اکٹھا ہی آرام کرنا ہے۔" ماہی نے کہا، ترنم نے بے حد دکھ سے اُسے دیکھا۔
"تم!" ترنم کو الفاظ نہ مل رہے تھے۔
بعض اوقات تسلی اور یقین کے لیے ہر طرح کے الفاظ ختم ہو جاتے ہیں، ترنم خود کو بھی اس وقت ات
تہی داماں محسوس کر رہی تھی۔
"بہت بُری ہوں نا! دراصل ہم بری لڑکیوں کی نمائندہ ہیں، ہم ہی سے تو بیڈ گرلز کا Concept
ہوتا ہے۔"
درد انسان کو زندگی کا ہر طرح کا سبق سکھا دیتا ہے اور اُسے زندگی کی ہر معانی سمجھ آنے لگتے ہیں،
بھی شاید اس لیے اتنی گہری باتیں کرنے لگی تھی۔ ترنم ایک دم سسک پڑی۔
ماہی نے ترنم کو گلے لگا کر پیار کیا۔
"یار! صرف تمہارا وجود ہے جو مجھے احساس دلاتا ہے کہ میں لاوارث نہ مروں گی دنیا میں ایک ص
تم ہوگی جس کو میرے مرنے کا دکھ ہوگا اور میرے مرنے کے بعد میرے لیے دعا کے لیے ہاتھ اُ
گے۔" ترنم کی سسکیوں میں اضافہ ہو گیا تھا اُسے پہلے دن سے لے کر اب تک کا وقت یاد آ گیا تھ

ہی نے ہر پل اُس کا پاگل پن خوش دلی سے بھگتا تھا، کیسے اُس کے آنسو ہر بار صاف کیے تھے اس
الی دنیا میں ماہی کا وجود صرف اس کو احساس دلاتا تھا کہ کوئی خیال کرنے والا ابھی تک موجود

روترنم! تمہارے آنسو جہاں مجھے دکھ دیتے ہیں، وہاں خوشی بھی دے رہے ہیں کہ یہ آنسو میرے
لیکن پلیز تم نہ رو۔" ماہی نے کہا۔
م چپ چاپ صرف اُسے دیکھ رہی تھی۔
نم! آج کل ہر وہ کام کرنے کو دل کرتا ہے جو آج سے پہلے میں نے کبھی نہ کیا، میں آج کل
کرتی ہوں لوگوں کے لیے اچھا سوچتی ہوں اور مختلف بکس پڑھتی ہوں۔ اس طرح ویٹ فار دِس
ٹائم ذرا آسان لگتا ہے ابھی کل ہی میں نے ایک واقعہ پڑھا تھا۔
پہلی جنگ عظیم کا واقعہ ہے، لڑائی کے دوران سپاہی نے اپنے جگری دوست کو گرتے ہوئے دیکھا
و دہشت سے بے حواس ہو گیا، وہ خود اُس وقت ایک مورچے میں تھا اور سنسناتی گولیوں کی
مسلسل اُس کے سر سے گزر رہی تھی، سپاہی نے اپنے افسر لیفٹیننٹ سے پوچھا کہ کیا وہ مورچے
ہر جا کر خندقوں کے درمیان "نومینز لینڈ" سے اپنے گرے ہوئے ساتھی کو اُٹھا کر لے آئے۔
م جا سکتے ہو۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔
لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس ایثار سے کچھ حاصل ہوگا تمہارا دوست غالباً مر چکا ہے اور تم بھی اپنی
ے ہاتھ دھو سکتے ہو۔" لیفٹیننٹ کے مشورے کی پروا کیے بغیر سپاہی مورچے سے نکل گیا، معجزانی
وہ اپنے دوست تک بنا کسی رکاوٹ اور بغیر زخمی ہوئے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اُس نے
کو شانوں پر اُٹھایا اور گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرتا اُسے واپس اپنی کمپنی کے مورچے میں لے آیا۔
ب وہ گرتا پڑتا مورچے کے نشیب میں پہنچا تو افسر نے زخمی سپاہی کا معائنہ کیا اور پھر ہمدردی سے
سپاہی کی طرف دیکھا، جسے اُس کا دوست جان ہتھیلی پر رکھ اُٹھا کر لایا تھا۔
میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اس جاں بازی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔
"تمہارا دوست مر چکا ہے اور تم بھی شدید زخمی ہو۔"
ناب! اس کے باوجود میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔" سپاہی نے کہا۔
"رائیگاں نہیں گئی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" افسر نے پوچھا۔
"تمہارا دوست مر چکا ہے۔"
"جی جناب!" سپاہی نے جواب دیا۔
"لیکن میری محنت کا پھل مجھے مل گیا کیوں کہ جب میں اُس کے پاس پہنچا تو وہ اُس وقت تک زندہ
اُس کے منہ سے یہ سن کر مجھے جو تسکین ہوئی، اُس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔" اُس نے کہا!
"جم! میں جانتا تھا، تم آؤ گے۔"
ماہی نے ترنم کی نم آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا اور اپنے بازو کھول دیے۔
ترنم فوراً اُس کے گلے لگ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر وہ دونوں گلے لگ کر اس قدر روئیں کہ ہوا اور دھوپ کو بار بار شک ہوا کہ شاید ساون آ گیا ہے۔ ماہی کچھ نہ کہہ کر بھی ترنم کے لیے جو احساس رکھتی تھی، وہ جتا گئی تھی۔

"مجھے بھی یقین ہے کہ تم اس دنیا کی واحد ذی روح ہوگی، جو مجھ سے Concern؛ میرے مرنے سے Concern رکھے گی۔" ماہی نے فخر سے کہا۔

ترنم ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ رودی۔

اس سمندر جیسی لہروں جیسے وقت میں کب کیسے دونوں کے ہاتھ چھوٹ جائیں وہ دونوں ہی نہ جانتی تھیں۔

❖❖○❖❖

"کیا... کیا بنا؟" سائرہ نے بھائی کی شکل دیکھ کر اندازہ تو کرلیا تھا لیکن پھر بھی پوچھ بیٹھی۔

طارق ایک دم سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"ساری رات! ساری رات اُس کو اس شہر کے چپے چپے میں تلاش کیا ہے لیکن وہ کسی سوئی کی طرح جانے کہاں کھوگئی۔" طارق کی آواز روہانسی تھی۔

محبت جہاں انسان کو طاقت ور کرتی ہے وہیں اُسے کمزور بھی بناتی ہے۔ طارق جیسا مضبوط اعصاب کا مالک خود کو اس وقت بے حد کمزور محسوس کر رہا تھا۔

"سائرہ! میں اِس وقت تم سے کچھ خاص معلومات لینے آیا ہوں، مجھے مسکان کے والد کی اُن رازدار جگہوں کے پتے درکار ہیں جو تم جانتی ہو اور کیا تم سید سرفراز علی کے گھر سے کسی کو اتنا اچھا جانتی ہو کہ وہ ہماری مدد کر سکے، یعنی کچھ انفارمیشن دے سکے کہ نگینہ کو کہیں سید سرفراز نے تو نہیں اغوا کیا۔" طارق کی بات سن کر سائرہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"میرے خدا! کیا واقعی مسکان کے بابا نے یہ اغوا کروایا ہے۔" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی حیرت چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

"حیران بعد میں ہولینا، جو میں نے پوچھا ہے اُس کا جواب دو!" طارق نے پریشانی سے سائرہ کو دیکھا۔

"ہاں میں مسکان کی آیا اماں سے رابطہ کر کے پوچھ سکتی ہوں، وہ بہت خوف خدا رکھنے والی خاتون ہیں اور مسکان کے بابا کی حرکتوں کو نہایت ناپسند کرتی ہیں۔" سائرہ نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے اُن سے فوراً پوچھو۔" طارق نے بے صبری سے کہا۔

سائرہ نے اپنا فون اُٹھا کر آیا اماں کو ملایا۔ طارق نے بے حد بے چینی سے سائرہ کو دیکھا۔ اُس کی بے چینی اس قدر زیادہ تھی کہ وہ انتظار نہ کر پا رہا تھا اس لیے اُس نے بڑھ کر سائرہ کے موبائل کا لاؤڈ اسپیکر آن کر دیا، اب وہ بھی سائرہ کے ساتھ ساتھ فون پر ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا اسی دوران طارق کا اپنا سیل بجا۔

طارق نے بیزاری سے اسکرین پر آتا نمبر دیکھا اور اُسے ریجکٹ کر دیا، وہ یہ نمبر صبح سے اگنور کر رہا تھا لیکن سحرش تو جیسے کریزی ہوئی جارہی تھی اُس سے بات کرنے پر، وہ مسلسل کال کر رہی تھی۔

طارق نے تھک کر فون اُٹھالیا اور باہر نکل آیا۔

"کیا تکلیف ہے؟" طارق غرایا۔

طارق نگی کے لیے اتنا پریشان تھا کہ اُسے کوئی چیز اچھی نہ لگ رہی تھی۔

"میرا فون تو اُٹھاؤ!" سحرش چہکی تھی۔

طارق نے بے حد غصہ خود کے اندر محسوس کیا۔ اُس کا دِل ناخوش تھا، اُسے سحرش کا خوش ہونا بے حد بُرا لگا تھا۔

"میں تم کو ہر وقت فارغ لگتا ہوں کہ تمہارا فون اٹینڈ کرتا پھروں، کام کے وقت تو فون اٹھانا مشکل ہے اور پلیز تم تب تک فون نہ کرنا جب تک میں خود رابطہ نہ کروں۔" طارق باقاعدہ چلایا۔

"طارق پلیز اتنا تو بتادو کہ ایسا کیا ہوگیا ہے کہ میرا طارق اپنی نرمی تک بھول گیا۔" سحرش نے لاڈ سے کہا۔

"دیکھ.. دیکھو برا نہ منانا، میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ دُعا کروں گی اور میرے جیسی کملی کی دعا تو اکثر پوری ہوتی ہے۔"

سحرش کی بات پر طارق کو ایک دم سے یقین ہوگیا تھا اس لیے وہ جھجکتے ہوئے بولا کہ تم دعا کرو کہ مجھے میرا پیار مل جائے) یہ بات اس نے دل ہی دل میں کہی تھی۔

"تم دعا کرو کہ میں جس لڑکی کے کیس پر کام کر رہا ہوں وہ خیر و عافیت سے جلد از جلد مل جائے، اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں ساری عمر خود کو معاف نہ کر سکوں گا!" یہ کہتے ہوئے طارق نے فون بند کر دیا اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا، جس پر سحرش باقاعدہ چونک گئی بلکہ بے حد اُداس ہوگئی تھی۔

طارق ہاتھ میں فون پکڑے گم سم کھڑا تھا۔ وہ شاید کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔

"لالہ... لالہ!" سائرہ نے اُسے پیچھے سے آ کر چونکایا۔

"آں.. ہاں!" طارق نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"آپ کا شک بالکل درست ہے مجھے تو حیرت اور دُکھ دونوں ہو رہا ہے کہ مسکان کے بابا ایسی کریمنل حرکت بھی کر سکتے ہیں انہوں نے ہی نگی کو اغوا کروایا ہے۔" سائرہ نے باقاعدہ دھماکا کیا تھا۔

"آیا اماں باقاعدہ رو رہی تھیں لیکن انہوں نے مجھے تسلی دی ہے کہ وہ نگینہ کا بھرپور خیال رکھنے کی کوشش کریں گی۔" سائرہ نے کہا۔

"یہ سید سرفراز علی کی زندگی کی سب سے بھیانک غلطی ہوگی کیوں کہ اس کا اُسے بھیانک انجام بھگتنا ہوگا۔" طارق باقاعدہ پھنکارتے ہوئے باہر نکلا۔

❖❖○❖❖

"کیوں؟" ولی زندگی میں پہلی بار احمد شاہ سے شکوہ کر رہا تھا۔

"کیوں کہ میرے نزدیک اس ساری بات کی کوئی اہمیت نہ تھی مجھے اپنی اولاد پر پورا یقین تھا کہ وہ کسی لڑکی کی زندگی تباہ کر ہی نہیں سکتا اس لیے میں نے اُس کی کسی بات کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔" احمد شاہ نے چائی سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیکن بابا! آپ کو مجھے تو بتانا چاہیے تھا نا! آج میری بہن میرے نام پر سولی چڑھادی گئی۔" ول
سر اپنے ہاتھوں پر گراتے ہوئے کہا۔

"صاحب! بڑی بی بی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔" ملازمہ نے اندر آ کر اطلاع دی۔

احمد شاہ اور ولی دونوں آگے پیچھے روشن آرا بیگم کے کمرے کی جانب بڑھے۔

جیسے ہی ولی، احمد شاہ کے پیچھے کمرے میں داخل ہونے لگا تو اُس کا موبائل فون بج اُٹھا۔

"جی!" ولی نے فون آن کر کے پوچھا۔

نمبر اَن نون تھا۔

جیسے جیسے ولی مقابل کی گفتگو سنتا جارہا تھا اُس کے چہرے پر تناؤ آرہا تھا وہ چپکے سے باہر آ گیا۔ کم
ڈور کے پار وہ اپنی ماں کی غیر ہوتی حالت کو ٹھیک سے دیکھ سکتا تھا۔

"اگر میری بہن کو کچھ ہوا تو یہ دیکھ لیجیے گا کہ میں ساری دنیا کو تباہ کردوں گا۔" ولی نے شدت
سے کہا۔

"تو پھر میری بات مان لو!" سید سرفراز علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ زبردستی میں نہ مانوں تو؟" ولی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تو پھر سوچ لو کہ تمہاری بہن ہمارے پاس ہے یہ تم تو جانتے ہو، لیکن قانونی طور پر اس کو ثابت
کرو گے۔ یہ میری دنیا ہے میری دنیا کی سرحدوں میں میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا ہے۔" سید سرا
علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ دنیا اور اِس کی سرحدیں سب اللہ کی ہیں، آپ نے کیا خود کو خدا سمجھ رکھا ہے۔" ولی نے بڑا
سے کہا۔

"ہم کچھ ہیں تو یہ سب کچھ ہورہا ہے نا! تم بتاؤ تم کو ہماری بات قبول ہے، تمہاری بہن باعزت طر
سے واپس پہنچ جائے گی۔" سید سرفراز علی نے کہا۔

تمہارا خیال ہے کہ ہم بغیر ہڈی کے لوگ ہیں جو اپنی بہن کو بازیاب نہیں کرواسکتے اور ہمیں ہر صورت
تمہارے ساتھ کمپرومائز کرنا پڑے گا۔" ولی نے کہا۔

"یہ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور میرے ساتھ پنگے کے سائیڈ ایفیکٹس کیا ہیں، تم اگر پولیس ا
انوالو کرو گے تو Difinatly اپنی بہن کی Dignity کو برباد کروالو گے۔" سید سرفراز علی کی بات پر ول
غصے سے چیخ اُٹھا۔

"شٹ اپ... شٹ اپ...!"

"خبردار میری بہن کو کسی نے ہاتھ بھی لگایا۔"

"تو پھر آؤ اور ہمارے ساتھ ڈیل کرلو۔"

"کیا گارنٹی ہوگی کہ میں اپنی بہن کو چھڑانے کے بعد آپ کی بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔" ول
نے سید سرفراز علی کو دھمکی دی۔

"سیکورٹی اور گارنٹی کی شرائط نکاح نامے پر میں لکھوا چکا ہوں، تم کو ان شرطوں کے ساتھ ہی مسکان

ساتھ نکاح کرو گے۔" سید سرفراز علی بے حد چالاک آدمی تھا۔

"تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب، دو گھنٹے تمہیں میں سوچنے کو دیتا ہوں، چلو میں تم کو سوچنے اور ہر
طرح کی کوشش کرنے کے لیے دو دن اور ایک رات دیتا ہوں۔ اگر اس سے زیادہ ایک منٹ بھی زیادہ
لیا تو میں تمہاری بہن کی سلامتی کی کوئی گارنٹی نہیں دیتا۔" سید سرفراز علی نے اتنا کہہ کر فون رکھ دیا۔

ولی نے بے اختیار ماتھا مسلا اور فوراً طارق کو فون کیا اور اے ٹو زیڈ ساری بات اُسے بتادی۔

لیکن وہ خود میں اِس قدر اُلجھ گیا تھا کہ وہ یہ تک بھول گیا کہ آج اُس کا نکاح ہے۔

"میں!"

سید سرفراز مسکان کے کمرے میں آئے لیکن اُن کو الفاظ نہ مل رہے تھے کہ وہ کیا بات کریں کیوں کہ
مسکان اُن کو ایسی نظروں سے دیکھتی تھی کہ وہ اندر تک شرمندہ ہوجاتے تھے۔

کتنی عزیز تھی وہ اُن کو... کیسے آنکھ کا تارا بنا کر انہوں نے اُسے پالا تھا۔ لیکن اُن کے ایک غلط قدم
سے ہر چیز ہر بات غلط ہوگئی تھی اور اب وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد ہر چیز ٹھیک کرلیں۔ لیکن وہ یہ جانتے
بلکہ وہ اپنی فطرت کی وجہ سے زندگی بھر جان بھی نہ سکتے تھے کہ "رشتے" کوئی پنسل سے لگی لائن تھوڑا
ہی ہوتی ہے، جو خراب ہونے پر ربڑ سے مٹا کر ٹھیک کرلیں۔ رویے اگر خراب ہوجائیں تو یہ تو اُلجھے
ہوئے دھاگوں کی طرح بن جاتے ہیں کہ اگر احتیاط نہ کی جائے تو یا تو ٹوٹ جاتے ہیں یا پھر مزید اُلجھ
جاتے ہیں۔

"میں بیٹا! یہ کہنا چاہتا تھا کہ..." سید سرفراز علی مسلسل اٹک رہے تھے وجہ مسکان کی اجنبی نگاہ اور رویہ
تھا۔

"میں تمہیں زندگی دوں گا! وہ زندگی جو میری وجہ سے تم سے چھن گئی تھی یہ میرا وعدہ ہے تم سے...
ہوسکے تو اپنے باپ کو معاف کردینا۔" سید سرفراز علی جس کی لائف ڈکشنری میں "معافی" کا لفظ نہ تھا
لیکن وہ مسکان سے اس قدر پیار کرتے تھے کہ انہوں نے ادھار مانگ کر یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

لیکن اب وہ ہر صورت اپنی بیٹی کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینا چاہتے تھے۔

"مسکان بس تھوڑا سا اور انتظار! بہت تھوڑا سا! تمہارا باپ تمہاری زندگی کی خوشیاں بہت جلد واپس
لے آئے گا۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئے۔ مسکان نے اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے اُن کو جاتے دیکھا۔

❖❖○❖❖

"انور صاحب گیارہ بج گئے آپ کے مہمان کدھر ہیں؟" محلے داروں میں سے انور صاحب نے ایک
معزز بزرگوں کو بلایا تھا۔ ان ہی میں سے ایک بولا۔

"کمال ہے روشن آرا آپا اور بھائی صاحب تو بہت وقت کے پابند ہیں۔" انور صاحب منہ ہی منہ
میں بدبدائے۔

"ارے جناب! یہ کون سا دور ہے کہ مہمانوں کا دُور بیٹھ کر خالی خولی انتظار کیا جائے، یہ تو موبائل کا
دور ہے آپ موبائل سے فون کریں۔ ابھی معلوم پڑ جائے گا کہ وہ لوگ گھر سے نکلے بھی ہیں کہ نہیں..."
دوسرا محلے دار بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ دراصل مجھے ہی خیال نہیں رہا کہ ہمارا فون خراب ہے اُسے ٹھیک کروالوں۔'' انور صاحب
شرمندگی سے کہتے ہوئے اندر کی جانب بڑھے۔

وہ اب کیا بتاتے کہ منزہ کی موت اور کاشف کی حالت کی وجہ سے وہ ہر وقت اتنے پریشان اور سوچوں میں گم رہتے تھے کہ ان کا دھیان عام ضروریات زندگی کی طرف بہت کم جاتا تھا اس لیے انہوں نے شاہ صاحب کو ایک بار بھی خود سے فون نہ کیا تھا حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ علیزے کے پاس موبائل سہولت تو گھر میں موجود ہے۔ بے شک ان کا لینڈ نمبر مہینوں سے خراب پڑا تھا۔

حسن آرا بیگم بھی بے حد سادہ عورت تھیں وہ تو ویسے ہی بہت بوکھلائی پھر رہی تھیں۔

بس دونوں میاں بیوی میں سے کسی نے یہ غیر معمولی پن بالکل محسوس نہ کیا کہ آخر احمد شاہ اور آرا بیگم کی جانب سے کوئی فون کیوں نہیں آیا۔

''ارے بیگم صاحبہ! بچیوں سے کہو کہ بھائی صاحب کے موبائل کا نمبر مجھے ملا کر دیں۔ دیکھیں تو کہ وہ کتنی دوری کے فاصلے پر ہیں، ساڑھے گیارہ ہونے کو ہیں، نکاح خواں بھی آ کر بیٹھے ہیں، دوپہر کے کھانے کا وقت ہال والوں کو دیا ہوا ہے کب سارے کام نمٹیں گے۔'' انور صاحب نے حسن آرا بیگم سے کہا۔

''جی اچھا!''

حسن آرا بیگم جو علیزے کے لیے اپنے کنگن الماری سے نکال رہی تھیں شوہر کا حکم سن کر بچیوں کے کمرے کی جانب بڑھیں۔ واقعی یہ درست تھا کہ ٹائم خاصا زیادہ ہو چکا تھا۔

''علیزے بیٹا! تمہارے ابو موبائل مانگ..'' حسن آرا بیگم کہتے کہتے ایک دم سے رک گئیں۔

سامنے علیزے تیار کھڑی تھی، وہ تو کسی ملک کی شہزادی لگ رہی تھی اس قدر حسین کہ خود حسن آرا کی نگاہ نہ ٹک رہی تھی۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ! چشم بد دور!'' انہوں نے چٹ پٹ بیٹی کی بلائیں لے ڈالیں۔

''میری بیٹی بہت بہت زیادہ پیاری لگ رہی ہے۔''

''امی میں ٹھیک لگ رہی ہوں۔'' علیزے نے پوچھا۔

''میرے چاند! آج تو تم سچ مچ کا چاند لگ رہی ہو۔'' وہ ہنستی ہوئی بولیں، حسن آرا بیگم شاید برس بعد یوں ہنسی تھیں، آج بیٹی کی خوشی ان کے انگ انگ میں پھوٹ رہی تھی۔

''آج تو ولی بھائی آپی کو پہچان نہیں پائیں گے۔'' غزالہ بھی ہنسی۔ علیزے نے شرما کر سر نیچے کر لیا۔

''اچھا بیٹا! اپنا موبائل دو، تمہارے ابو نے احمد بھائی سے بات کرنی ہے۔'' حسن آرا بیگم فون لے پلٹیں۔

غزالہ مٹھائی کی پلیٹ لے کر کچن کی جانب گئی جب کہ علیزے سامنے لگے آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ ولی کے بہت سے جملے اُس کے کانوں میں گونجنے لگے تھے اور وہ خود کو دیکھتے ہوئے خود سے ہی ہنسی...

❖❖ ❖❖

''صاحب! یہ کوئی سی ڈی دے کر گیا ہے۔'' ولی کی ملازمہ نے آ کر کہا۔

اس وقت ولی اور طارق بے حد پریشانی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ طارق نے ہر وہ جگہ دیکھ لی تھی، جہاں نگی کے ہونے کا امکان تھا۔

ابا اماں نے بتایا تھا کہ نگی اُن کے ہی پاس ہے اس لیے طارق نے سید سرفراز کی ہر رہائش پر نگی کو تلاش کیا تھا لیکن بے سود تھا۔ وہ وارنٹ لے کر بڑی حویلی تک ہو آیا تھا لیکن ناکام ہوا تھا اب وہ اور ولی یہاں بیٹھے تھے طارق نے اپنے مخبر گاؤں میں اور سید سرفراز کے شہر کے ہر ٹھکانے کے اِرد گرد چھوڑ رکھے تھے لیکن ابھی تک حوصلہ افزا کوئی خبر نہ تھی۔

''کون دے کر گیا سی ڈی؟

تم نے ایسے ہی لے لی؟

اسے روکا نہیں؟

اور یہ واچ مین کہاں ہے کوئی کیسے... کیسے کوئی بھی چیز اندر دے جائے گا؟'' طارق نے سارا غصہ ملازمہ پر اُتار دیا۔

''وہ... وہ صاحب! لال شرٹ والے موٹر سائیکلوں پر جو ڈاکیے ہوتے ہیں نا! واچ مین کہہ رہا تھا کہ وہ دے کر گیا ہے۔''

''ولی! دیکھو پھر تو سینڈر کا ایڈریس ضرور ہوگا۔'' طارق نے سی ڈی کا لفافہ ولی سے لیا۔

''کوئی فائدہ نہیں! کڈنیپر بہت چالاک ہے، اُس کا بندہ بھیس بدل کر سی ڈی ڈلیور کر گیا ہے۔'' ولی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کڈنیپر کی ہی طرف سے سی ڈی ہے۔'' طارق نے پوچھا۔

''اس پر لکھا ہے نگینہ کا نام!'' ولی نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''اگر نگی کو کچھ ہو گیا تو طارق... میں... میں مر جاؤں گا، وہ میرے وجود کا حصہ ہے۔'' ولی نے چھوٹے بچوں کی طرح کہا۔

''کیا... کیا ہوگا اس سی ڈی میں، آخر کیا ہو سکتا ہے؟'' ولی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''شاید کوئی پیغام وغیرہ!'' طارق نے سی ڈی آن کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اگلے ہی پل دونوں کے چہروں پر بہت دُکھ تھا۔

نگی کا فل اسکیپ چہرہ اسکرین پر تھا رو، رو کر اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''بابا... بابا.. اماں.. بھیا!

بھیا! بچاؤ! مجھے یہاں سے لے جاؤ!

طارق... طارق آپ مجھے ڈھونڈھ لو! پلیز لے جاؤ!

یہ لوگ بہت برے ہیں! یہ... یہ!...

برے!...'' ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

ولی بے اختیار اسکرین کی جانب بڑھا، جیسے بہن کو گلے لگا کر اُس کے آنسو پونچھنے لگا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن سی ڈی ختم ہوگئی تھی۔ ولی وہیں بیٹھتا چلا گیا۔

ضبط شدت سے اُس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں، یہی کچھ حالت طارق کی تھی۔

"آئی ول کل ہم!" طارق غرایا۔

"نو.. طارق.. نو! ہم کچھ نہیں کر سکتے ہماری بہن اُن کے پاس ہے، مجھے اس سے پہلے اندازہ نہ تھا ہمارے ہاتھ اس بُری طرح بندھے ہوئے ہیں۔" ولی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب تم میں سے کوئی سید سرفراز علی کو کچھ نہیں کہے گا مجھے اتنی دیر کرنی ہی نہیں چاہیے تھی، میں تو نگی سے کہتا تھا کہ میں اُس کی خاطر جان دے سکتا ہوں تو پھر طارق میں نے اُس کا مان کیوں توڑا! یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہوں؟ کیا اپنی بہن کے لیے اپنی خوشی کی قربانی نہیں دے سکتا۔ مجھے خود پر شرم آ رہی ہے کہ وہ ایک دن اور ایک رات سے مسلسل آنسوؤں اور خوف میں ہے اور میں اپنے کہے تک کی لاج رکھ سکا۔

نو.. نیور! میں ایسا کیسے سیلفش ہو سکتا ہوں۔" ولی کی آواز شدت جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" طارق نے پوچھا۔

"مجھے روکنا مت، میں رکوں گا نہیں!" ولی نے ایک چھوٹے سے بیگ میں اپنا ریوالور، لائسنس اور پیسے رکھے، پھر موبائل اور گاڑی کی چابیاں لے کر باہر کو لپکا۔

"اسٹاپ اٹ ولی! کہاں جا رہے ہو!" طارق اُس کے پیچھے دوڑا تھا۔

"تم یہ سی ڈی دیکھنے کے بعد بھی پوچھ رہے ہو کہ کہاں جا رہا ہوں، میں نگی کو لینے جا رہا ہوں۔" ولی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تم اکیلے؟" طارق نے غصے سے پوچھا۔

"مجھ اکیلے سے ہی سید سرفراز، مسکان کا نکاح چاہتا ہے۔" ولی نے دھماکا کیا۔

"مائی گاڈ! تم خودکشی کر رہے ہو۔" طارق نے بے اختیار کہا۔

"اور اگر نگی کو کچھ ہو گیا تو میں ویسے بھی مر جاؤں گا... میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا، میری غیرت مجھے کبھی جینے نہ دے گی۔" ولی نے طارق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اور علیزے بھابی!" طارق نے ایسا سوال کیا تھا، جس کا جواب ولی کے پاس نہ تھا۔

"بابا اور اماں جان کو نہ بتانا۔" ولی نے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی، واچ مین گیٹ کھول چکا تھا اور اس کی گاڑی باہر نکل گئی تھی۔

طارق نے بے اختیار سر تھاما تھا۔

احمد انکل روشن آنٹی کے پاس ہسپتال میں تھے۔

"اب کیا ہوگا؟"

بے اختیار یہ سوال طارق کے سامنے آیا تھا۔

❖❖○❖❖

"ک... کیا؟" موبائل فون بے اختیار انور صاحب کے ہاتھوں سے چھوٹا۔

"میری علیزے!" وہ لہرا کر گرے۔

دوسری جانب احمد شاہ ہیلو ہیلو کر رہے تھے لیکن ان کو مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ افرا تفری کی آوازیں...

اس وجہ سے ہی انہوں نے ابھی تک انور صاحب کو اطلاع نہ کی تھی کہ ان کی طبیعت اچھی نہیں رہتی تھی لیکن کیا وہ اتنے غیر ذمے دار ہو سکتے تھے کہ ان کو نکاح کے پوسٹ پون ہونے کی بھی اطلاع نہ کرتے۔

انہوں نے فوراً گھر فون کیا کہ ولی سے بات کر سکیں کیوں کہ وہ ولی کے ذمے یہ کام لگا کر آئے تھے کہ وہ علیزے کی جانب خود جا کر سارے حالات گوش گزار کرے اور وقتی طور پر نکاح کی ڈیٹ بدلنے کا کہہ آئے۔

"پھر ولی ابھی تک وہاں گیا کیوں نہیں؟"

وہ بے حد پریشانی سے سوچ رہے تھے فون طارق نے اٹھایا تھا وہ بھی ولی کے پیچھے نکلنے والا تھا۔ لیکن پہلے اپنے ماتحتوں کو کچھ کام سونپ رہا تھا کہ وہ ہر فون کال کی لوکیشن وغیرہ سے مسلسل طارق کو انفارم کریں گے کہ احمد انکل کا فون آ گیا تھا۔

"ولی کہاں ہے؟" احمد شاہ نے عجلت سے پوچھا۔

"وہ انور صاحب سے معذرت کرنے اور سارے حالات بتانے کیوں نہیں گیا؟" احمد شاہ نے غصے سے پوچھا۔

وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ دل کے مریض انور صاحب کو کوئی بھی خبر اچانک سننے سے جان لیوا اٹیک ہو سکتا تھا اس لیے وہ بے حد فکر مند تھے۔

"ولی.. انکل وہ!" طارق ہچکچایا۔

"بولو یار! کیا مسئلہ ہے۔" احمد شاہ اتنے مسئلوں سے واقعی گھبرائے ہوئے تھے۔

"وہ.. انکل!" طارق نے گہرا سانس بھرا تھا تاکہ وہ خود کو کمپوز کر سکے۔

"وہ سید سرفراز کی حویلی گیا ہے۔" طارق نے دھماکا کیا۔

"کیوں؟" احمد شاہ نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

"ڈیل کرنے!"

"کیسی ڈیل؟" احمد شاہ نے پوچھا۔

"اپنی زندگی بیچ کر نگی کی زندگی خریدنے۔" طارق نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

احمد شاہ کو لگا، وہ ایک دم خسارے کے پلڑے میں جھول رہے ہیں جہاں کھڑے ہو کر وہ جانے کیا کیا کرنے والے تھے۔

❖❖○❖❖

"کیسے ہو مارک؟" راگنی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کیسے ہو سکتے ہیں جناب!" مارک نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ فتح کا نشہ اُس کے انگ انگ میں پھوٹ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چڑیا پھنس گئی؟" راگنی نے پوچھا۔
"بالکل.....اور کم بخت اتنی حسین ہے کہ جب جب پھڑ پھڑاتی ہے اپنا تو حال خراب ہو جاتا ہے مما
بس ایک رات اور انتظار کروں گا، جب تک اُسے دیکھ نہ لوں تب تک مزا کہاں آئے گا۔ دیکھتا ہوں ا
طارق کیا کرتا ہے؟"
اب اُسے اندازہ ہوگا کہ کس زہریلے سانپ کو اُس نے چھیڑا تھا۔ نہ سارا زہر اُس کی زندگی میں گ
گیا تو میرا نام مارک نہیں!..." مارک نے قہقہہ لگایا۔
"میڈم راگنی! تم نے مارک کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اس طارق سے بدلا نہ لیتا تو شاید میں زندگ
تڑپتا رہتا۔ لیکن اب تڑپے گا، طارق۔ اور یاد کرے گا کہ کس کے بل میں ہاتھ ڈالا تھا، میں اس کی
کے ساتھ وہ کروں گا کہ نہ وہ جی سکے گا نہ مر سکے گا!" مارک کا لہجہ بے حد خوف ناک تھا۔
"میری جان! ٹیک یور ٹائم! جو چاہتے ہو کرو میری طرف سے کھلی اجازت ہے اِس طارق کم ب
نے میرا بڑا نقصان کیا ہے اِس کو سزا تو ملنی ہی چاہیے۔" راگنی کے لہجے کی پھنکار کسی معصوم کی ز
جلانے والی تھی۔

"وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" علیزے نے ہاتھوں میں لگی مہندی کو بہ غور دیکھتے ہوئے اُداسی سے
ا۔
لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو ولی کے اِس قدر فیور میں تھا کہ ہر شک ہر سوال پلٹ پلٹ کر واپس
اتا تھا۔ لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی اُس کا باپ ایک بار پھر اپنی زندگی اُس کی زندگی کے لیے
ے میں ڈال چکا تھا۔
"یا اللہ! تیرا وعدہ ہے کہ تُو انسان پر اُس کی برداشت سے زیادہ آزمائش نہیں ڈالتا، یہ آزمائش میری
اشت سے زیادہ ہے!" علیزے مہندی لگے ہاتھ منہ پر رکھ کر بلک بلک کر رو دی۔
"علیزے! مجھے ولی کا نمبر ملا کر دو۔" حُسن آرا اس کے قریب چلی آئیں، اُن کی آنکھیں رو رو کر
ل ہو چکی تھیں اور آواز بُری طرح بیٹھ گئی تھی۔
"آپ! آپ کیا بات کرنے والی ہیں۔" علیزے نے ماں سے سوال کرتے ہوئے نمبر ڈائل کیا۔
"تم مجھے نمبر ملا کر دو، آج اگر نکاح نہ ہوا تو تمہارا باپ سکون سے جینا تو کیا مر بھی نہیں سکتا۔" حسن
بیگم نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔
"امی! ابو آئی سی یو میں ہیں اور آپ نکاح کی بات کرنے کے لیے اصرار کر رہی ہیں۔" علیزے نے
رکھا۔
"وہ سامنے شیشے کے پار اپنے باپ کو دیکھ رہی ہو نا؟ وہ بڑا مضبوط اور ضدی انسان تھا۔ بڑی سے
مشکل کو وہ کبھی سر پر سوار نہ کرتا تھا لیکن آج اپنی اولاد کی محبت میں وہ کمزور ہو چکا ہے محبت اگر
ا دیتی ہے تو مار بھی دیتی ہے۔" انہوں نے دکھ سے طویل سانس بھرتے ہوئے فون تھاما۔ فون ری
پر تھا کیوں کہ ولی فون نہ اٹھا رہا تھا۔
"آج تمہارا باپ مر رہا ہے! میں اُسے ایسے کیسے مرنے دوں، میں ولی سے ضرور بات کروں گی۔ آج
ں نے تیرے ساتھ نکاح نہ کیا تو خدا کی قسم میں تیرا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دوں گی چاہے وہ
لتا کوئی فقیر ہی کیوں نہ ہو۔" حُسن آرا غصے اور توہین کے احساس سے اپنے حواس کھو رہی تھیں۔
"امی پلیز! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" علیزے نے روہانسی ہو کر پوچھا۔
"کیوں! عزت اور دل اُن کا ہی ہے، ہماری کوئی عزت نہیں، کیا ہمارے دل روئی سے بنے ہیں کہ
بھی ریشہ ریشہ کر کے اڑا دے۔
یں ایسا نہیں ہے! ہم غریب ضرور ہیں لیکن انسان ہیں اور میں ان کو یہی محسوس کروانے کے لیے

فون کرنا چاہ رہی ہوں۔" حسن آرا بیگم نے غصّے سے کہا۔
فون مسلسل ری ڈائل پر تھا۔ ولی کا دیر سے فون اٹھانا بھی اُن کو بُرا لگ رہا تھا لیکن وہ مصمم ارادہ کیے
ہوئے تھیں کہ آر یا پار! جو ہوگا آج ہی ہوگا۔ ابھی ہوگا۔
اِس فیصلے کی نوک پر انور صاحب کی زندگی جھول رہی تھی وہ آج ایک ماں بن کر نہیں صرف ایک بیوی
بن کر سوچ رہی تھیں چاہے اس کا نقصان کچھ بھی ہوتا۔

❖❖○❖❖

"نفیسہ بیگم........ نفیسہ بیگم!" سید سرفراز علی خوشی اور فتح سے گلنار چہرہ لیے آیا امّاں کے کمرے میں
داخل ہوا۔
نفیسہ بیگم نے قرآن پاک بند کر کے منہ پر اُنگلی رکھ کر سید سرفراز علی کو اشارہ کیا کہ وہ شور نہ مچائیں،
مسکان اُن کے پاس ہی تو سو رہی تھی۔
"کیا ہوا؟" نفیسہ بیگم نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر پوچھا۔
"وہ مان گیا ہے!" سید سرفراز علی خوشی سے دیوانا ہو رہا تھا۔
"کون...اور کیا مان گیا؟" نفیسہ بیگم نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔
"وہ۔ ولی! ولی آ رہا ہے اور وہ مسکان سے شادی کرنے کو تیار ہے! میں نہ کہتا تھا کہ وہ ضرور آئے
گا!" سید سرفراز علی نے چہکتے ہوئے کہا۔
"کیا! وہ مان گیا ہے!" نفیسہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ پھر ایک بھرپور نگاہ مسکان کے معصوم چہرے
پر ڈالی، وہ سوتے ہوئے کسی ننھے بچے کی طرح لگ رہی تھی، کس قدر پاکیزہ چہرہ تھا اُس کا۔
"سید سرفراز علی! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ زبردستی کا بندھن آئندہ دنوں میں مسکان کی خوشی کا
باعث بنے گا۔" نفیسہ بیگم نے خدشے کا اظہار کیا۔
"ہاں! وہ اِس سے پیار کرے گا! آخر مسکان میں کیا کمی ہے؟ کوئی خرابی ہے کیا اِس میں؟" سید
سرفراز علی نے بے حد مطمئن لہجے میں جواب دیا۔
"مسکان کی ایک خرابی یہ ہے سید سرفراز علی! کہ وہ تمہاری بیٹی ہے اور آج تک اِس کے لیے جو بُرا
ہے وہ اِس لیے ہوا کہ وہ تمہاری اولاد ہونے کا خمیازہ بھگت رہی ہے اور تم پوچھتے ہو کہ مسکان میں کیا
ہے ہونہہ! اُس کی قسمت کی کمی ہے کہ وہ دنیا میں تمہاری بیٹی بن کر آئی ہے۔" نفیسہ بیگم نے غصّے سے کہا۔
"لو! پھر شروع ہوگئیں! بہت خر دماغ عورت ہو تم، ساری زندگی تم نے میرے خلاف محاذ بنائے رکھا
کیا اِس جنگ کا فائدہ ہوا؟" سید سرفراز علی نے بے تحاشا ہنستے ہوئے نفیسہ بیگم کا مذاق اڑایا۔
"آج تک سوائے ہار کے، تمہیں کچھ نصیب ہوا، تم کیوں نہیں اِس ہار کو مان لیتیں؟ حالاں کہ یہ
آج سے بائیس سال پہلے تمہارے مقدر کا حصہ بن چکی تھی۔" سید سرفراز علی نے نفیسہ بیگم کے تاریک
چہرے کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ ان کو بے بس چہرے، خوف زدہ آنکھیں ہمیشہ سرور دیتی تھیں۔
"اچھا تم جلد از جلد مسکان کو ذہنی طور پر تیار کرو اور اُسے بتاؤ کہ اُس کے باپ نے قسمت کے
ہوئے پہیے کو الٹا چلا دیا ہے اب خوشیاں اُس سے دور نہیں۔" سید سرفراز علی نے چہکتے ہوئے کہا اور

جب کہ نفیسہ بیگم کا چہرہ بے حد سرخ ہوگیا اور دِل ابھی تک سید سرفراز علی کے "ہار" والے جملے پر
جل رہا تھا۔
"کیا یہ ضروری ہے کہ ہار ہمیشہ میرا ہی مقدر ہو؟" نفیسہ بیگم نے عجیب طرح مسکراتے ہوئے با آواز
کہا اور مڑ کر مسکان کو دیکھا۔ اُس کے ماتھے پر آئے بالوں کو انہوں نے بے حد پیار سے سمیٹا۔
"اس بار ہار تمہارا مقدر ہے سید سرفراز علی!"
پھر سوچ کر آپ ہی آپ مسکرائیں۔

❖❖○❖❖

"ہیلو!" ولی نے گاڑی کا موڑ کاٹا، ساتھ ہی موبائل آن کیا۔ وہ کتنی دیر سے مسلسل سارے نمبرز اگنور
کر رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اِس قدر پریشان تھا کہ اُس نے کسی قسم کی کال اٹینڈ نہ کی تھی لیکن احمد شاہ کی
کالز کو وہ اگنور نہ کر سکا۔
"السلام علیکم بابا سائیں!" ولی کا لہجہ بے حد بجھا ہوا تھا۔
"وعلیکم السلام! بیٹا جی آپ کہاں ہیں؟" احمد شاہ نے بے حد فکرمندی سے پوچھا۔
ولی نے دکھ سے گہری سانس بھری، وہ کیا بتاتا کہ وہ کہاں ہے، وہ تو ایک ایسی منزل کی طرف گامزن
تھا اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہارنے جا رہا تھا۔ دل کی بربادی زندگی کی سب سے بڑی ہار

"بابا سائیں! میں نگینہ کو لینے جا رہا ہوں۔" ولی نے جواب دیا۔
"پاگل ہو گئے ہو کیا، وہاں تنہا کیوں جا رہے ہو اور کیا یہ شیور ہے کہ واقعی وہ ہماری بیٹی کو اغوا کر چکا
ہے؟" احمد شاہ نے ولی کو روکنا چاہا۔
"جی بابا سائیں! وہ قبول کر چکا ہے کہ اُس نے نگینہ کو اغوا کیا ہے، میں اُس سے بات کر چکا ہوں اور
میرے لیے میری بہن سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں۔" ولی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
"ولی بیٹا! تم رکو، اکیلے نہ جاؤ، وہ شخص کریمنل ہے اور ہرگز کوئی سودے بازی نہ کرنا۔" احمد شاہ نے
اسے روکنا چاہا۔
"بابا سائیں! میں نے ساری زندگی جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ آپ کا کہنا
مانوں۔ پلیز آج میری درخواست قبول کریں اور کوئی ایسا حکم نہ دیں جو میرے ظرف سے بڑھ کر ہو،
میری اتنی عرصے کی تابع داری داؤ پر لگ جائے گی... میں اتنے بڑے خسارے کا سودا کرنے جا رہا
ہوں کہ ماں باپ کی نافرمانی کے خسارے کا بوجھ اٹھانا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوگا!" ولی کے لہجے
میں منت تھی۔ احمد شاہ تو تڑپ ہی اٹھے۔
"بیٹا! مجھے ہمیشہ تم پر ناز رہا ہے، تم میرا فخر ہو، تم ہمیشہ میرے تابع دار رہے ہو لیکن پلیز تم وہاں اکیلے
نہ جاؤ۔" احمد شاہ نے بے حد فکرمندی سے کہا۔
"ابا جان! آپ ہمارے لیے دعا کیجیے گا کہ میں اور نگینہ خیر و عافیت سے آپ کے پاس آ جائیں،
میں مسلسل آپ سے رابطے میں رہوں گا۔" ولی نے باپ کو تسلی دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’ولی! تم کنویں میں چھلانگ لگانے جارہے ہو، اُس لڑکی سے رشتہ بنا تو لوگے لیکن نبھاؤگے؟‘‘ احمد شاہ نے ولی کو دوسری جانب سے گھیر کر روکنے کی کوشش کی۔

’’اللہ مالک ہے! اس وقت نگینہ کی زندگی سے اہم کوئی چیز نہیں۔‘‘ ولی نے کہا۔

’’اور علیزے! وہ کیا کہے گی! اُس کے تم جواب دہ ہو!‘‘ احمد شاہ نے پوچھا۔

’’بابا جان! پلیز دعا کیجیے گا۔‘‘ ولی نے اُن کے سوال سے کنی کترا کر کہا اور فون بند کردیا۔ ا[بھی اُس]
نے فون بند ہی کیا تھا کہ علیزے کا نمبر سیل پر جگمگانے لگا۔

ولی نے ایک دم ہی فیصلہ کیا کہ بجائے کال اگنور کرنے کے اُسے بات کرنی چاہیے۔

’’السلام علیکم!‘‘ ولی نے فون آن کر کے سنجیدگی سے کہا۔

’’کیسی سلامتی اور کیسی خیر و عافیت! تمہاری غیر موجودگی نے ہمیں کیسی مشکل میں لاکھڑا کیا ہے
اندازہ ہے تمہیں ولی؟‘‘ حسن آرا بیگم نے چھوٹتے ہی کہا۔ اُن کے تو من کو لگی ہوئی تھی اسی لیے اُ
لہجے میں انگارے دہک رہے تھے۔

’’حسن خالہ! میں واقعی آپ کا قصور وار ہوں، مجھے معاف کردیں، میں مجبور ہوں!‘‘ ولی نے
کی۔

’’تمہاری مجبوری نے میرے شوہر کو موت کی دہلیز پر دوبارہ لاکھڑا کیا ہے اور اگر آج تم نہ پہنچے
علیزے کا نکاح کسی سے بھی کردوں گی، چاہے وہ کوئی ایرا غیرا ہو۔ تم نے ایک بار بھی سوچا کہ ایک
دلہن بنی اپنے باراتی اور دولہے کا انتظار کر رہی ہو اور دلہا اچانک غائب ہوجائے، لاکھ دولہے کی غلط
لیکن بدنامی تو لڑکی کے کھاتے میں تا عمر آجاتی ہے، تم غیر سنجیدہ تھے تو پہلے بتاتے۔‘‘ حسن آرا
غصے سے چلا کر کہا۔

’’حسن خالہ! پلیز ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں مجبور تھا اور میری مجبوری سن لیں، سنیں گی تو آ
مان جائیں گی کہ میں غلط نہیں ہوں۔‘‘ ولی نے بہ مشکل اُن کو ٹوک کر اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش

’’ولی! مجھے تمہاری کوئی مجبوری نہیں سننی، تم کو میں دو گھنٹے دیتی ہوں فوراً پہنچو اور علیزے
کرو۔ ورنہ میں اس کا نکاح کسی سے بھی کردوں گی اُس کا باپ اپنی بیٹی کی بدنامی کے خوف
کے منہ میں جارہا ہے اور میں آج کا سورج ڈوبنے سے پہلے اپنی بیٹی کا نکاح کردوں گی کیوں کہ
کا دن نکل گیا تو یہ رات کی سیاہی نہ ہوگی بلکہ اُس کے مقدر کی سیاہی بن جائے گی اِس لیے میں
کے ڈوبنے سے پہلے اپنی بچی کے مقدر کو بچاؤں گی۔ تم نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ہم سب تمہارے لیے
اور مرے ہوئے لوگ کوئی رشتہ نہیں نبھاتے ہیں۔‘‘ حسن آرا بیگم نے کہہ کر فون بند کردیا۔ آ
سننے کے لیے آمادہ نہ تھیں۔

ولی نے ایک دم جھٹکے سے گاڑی روک دی، اُس نے ضبط کرنے کے لیے بے اختیار لب کا
ساڑھے تین گھنٹے کا سفر وہ طے کرچکا تھا اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کا سفر مزید باقی تھا۔

وہ بہت آگے نکل آیا تھا۔ واپسی تو ویسے بھی ناممکن تھی وہ خود تو اِس منجدھار میں کھڑا تھا کیا وہ
کو بھی بیچ راہ میں چھوڑ دیتا، تاکہ اُس کی ماں اُس کی زندگی کے ساتھ کوئی بھی کھیل کھیل جائیں۔

ں کرسکتا، وہ تو علیزے سے محبت کرتا تھا اور محبت کرنے والے کانٹوں میں گھسیٹتے نہیں بلکہ راہ کے
ُن لیتے ہیں چاہے بدلے میں اُن کے ہاتھ لہولہان ہوجائیں۔ ولی نے بھی ایک فیصلہ کیا تھا کہ
ے اور اُس کی زندگی کو کانٹوں میں الجھنے نہ دے گا۔
ہ نے بہت سوچ سمجھ کر ایک نمبر ملایا۔ آج یہ نمبر وقت پر نہ ملا تو اُسے تا عمر علیزے سے دستبردار
ا تھا۔
بر مل گیا تھا دوسری جانب بیل جارہی تھی۔

❖❖○❖❖

ھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو!‘‘ سارا وقت یہ آوازیں ترنم اور ماہی کو ڈسٹرب کرتی رہی تھیں۔ جب مارک
ے چلا گیا تھا تو ترنم کے ساتھ ماہی بھی اُس اغوا شدہ لڑکی کو دیکھنے اُس کے کمرے میں آئی تھی۔
کیا ہم اِس لڑکی کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے؟‘‘ ترنم نے دروازے پر پہنچ کر ماہی سے پوچھا۔
م جانتی ہو کہ اس پنجرے سے نکلنا ناممکن ہے۔‘‘ ماہی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
و کیا اِس طرح ایک اور لڑکی کی زندگی تباہ ہونے دیں؟‘‘ ترنم نے سلگ کر پوچھا۔
س کی زندگی کے لیے ہم میں سے کسی کی زندگی کا داؤ پر لگنا ضروری ہے۔‘‘ ماہی نے صاف لفظوں
ا اور ہینڈل پر دباؤ ڈال کر دروازہ کھولا۔
منے جو لڑکی بکھری ہوئی حالت میں نظر آئی تھی اُسے دیکھ کر ان کو بہت زور دار جھٹکا لگا۔
ـ نگینہ! تم..؟‘‘ ترنم نے بے حد دُکھ سے خشک ہوتے گلے کے ساتھ حیرت سے پوچھا۔
کو بہت عرصے بعد ایک بار پھر ساری کائنات گھومتی محسوس ہوئی، بے بسی، دکھ، خوف اور کسی
ی تکلیف کا احساس اُسے اندر تک سے کاٹ رہا تھا۔
ینہ چندا تم... تم یہاں کیسے؟‘‘ ماہی تڑپ کر نگینہ کے پاس آئی۔ نگینہ کالج میں اُن کی بہترین
ں میں رہی تھی ماہی ہمیشہ اُسے پسند کرتی آئی تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نگی جیسی بے حد
اور پاکیزہ لڑکی مارک کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔
نے پہلے اُن دونوں کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھا، چند پَل اُس کی نظروں میں پہچان کی رمق باقی
ن جیسے ہی اُس نے ماہی اور ترنم کو پہچانا، وہ لپک کر ماہی کے گلے جا لگی۔
ہم.. مجھے بچالو! میں، گھر... مجھے گھر جانا ہے۔‘‘ نگی نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔
ہوں نے تمہارے ساتھ.... میرا مطلب ہے تمہارے ساتھ کچھ کیا تو نہیں؟‘‘ ماہی نے اٹک اٹک
چھا۔
جاننا چاہ رہی تھی کہ نقصان کس حد تک ہوچکا ہے، نگی نے روتے ہوئے اپنی کلائیاں سامنے کردیں
گریٹ سے داغا گیا تھا۔
ی کو جہاں نگی کی جلی ہوئی کلائیاں دیکھ کر دُکھ ہوا، وہیں اُسے ایک دم سکون میسّر ہوا کہ صرف
ں ہی داغ دار ہوئی تھیں، نگی کی روح ابھی داغ دار ہونے سے بچ گئی تھی۔ لیکن کب تک؟ یہ تو
یے کا اپنا ہی ٹھکانا تھا وہ کبھی بھی کسی بھی وقت نگی کا بہت بڑا نقصان کرسکتا تھا اُن کو اگر نگی کو بچانا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو ہر صورت ابھی سے کچھ کرنا تھا۔

ترنم نے بے اختیار نظروں ہی نظروں میں ماہی سے سوال کیا جو نگی کو گلے لگائے چپ کروانے کی کوشش کررہی تھی۔

نگی روتے روتے بے ہوش ہوچکی تھی۔

''ترنم! ہمیں اِسے بچانا ہوگا۔'' ماہی نے دھیمی آواز میں کہا۔

ترنم نے لب کچل کر اثبات میں سر ہلایا۔

ماہی ٹھیک کہتی تھی کہ انہیں نگی کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا ہوگا اور وہ نگی کی خا کچھ بھی کرنے کو تیار کھڑی تھیں۔

❖❖○❖❖

''بڑے بھیا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' عبداللہ نے ولی کی بات سُن کر اٹک اٹک کر کہا۔

''دیکھو! تم نے کہا تھا کہ تم اُسی لڑکی سے شادی کرو گے، جو مجھے پسند ہوگی اب تم کیوں انکار کرر ہو؟'' ولی نے سوال کیا۔

''استغفراللہ! میں نے کب انکار کیا؟ اور بڑے بھیا! میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ علیزے بھا کیوں! وہ تو آپ کی محبت ہیں پھر کیا وہ خود مان جائیں گی؟'' عبداللہ نے حیرانی و پریشانی سے سوال

''اُس کے پاس چوائس نہیں ہے! مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت دُکھی ہوجائے گی لیکن مجھے یہ بھی م ہے کہ تم اُس کے سارے ملال دھو دو گے۔'' ولی نے ٹوٹتے لہجے میں کہا۔

''لیکن میں ہی کیوں؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

ولی نے بے اختیار گہرا سانس بھرا۔

''تم جب آسٹریلیا میں مسلسل مجھ سے اصرار کررہے تھے کہ تم صرف میری پسند کی ہوئی لڑکی شادی کرو گے تو میرے دل میں خیال آیا تھا کہ تم اتنے بہترین انسان ہو تو کیوں نہ تم باقاعدہ ہماری کا حصہ بن جاؤ، میں نے نگینہ کے لیے تمہارا سوچا تھا۔ نگینہ مجھے بہت عزیز ہے اُس کے لیے میں ؛ بہترین سوچتا اور چاہتا ہوں۔ نگینہ کے لیے آج تک طارق جو میرا بہترین دوست ہے اُس کا انتخا ذہن میں آتا تھا یا پھر اب تمہارا...

تم جو مجھے بہت عزیز ہوگئے ہو! مجھے تم پر یقین ہے کہ تم کسی بھی فرد کے لیے آسودگی اور خوشی کا با بن سکتے ہو اِس لیے میں نے علیزے کی خوشیوں کے لیے تم کو منتخب کیا ہے۔ کیا میں تسلی رکھوں کہ تم ا قول سے نہیں پھرے اور میری پسند کی ہوئی لڑکی سے ہی شادی کرو گے۔'' ولی نے بے چینی سے پوچ

''میں اپنے قول سے نہیں پھرا!'' عبداللہ نے سرنڈر کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر پلیز تم جلد از جلد حُسن خالہ کے پاس پہنچو، میں اُن کا ایڈریس تم کو سینڈ کردیتا ہوں تم اُن مل کر بتاؤ کہ میں نگی کی وجہ سے مجبور ہوں، ساری بات کلیئر کرکے تم اپنا پرپوزل آنٹی کے ذریعے دو؛ وہ کوئی غلط فیصلہ کرنے سے رک جائیں، تم میرے بعد علیزے کے لیے بہترین انتخاب ہو، اور می بھائی دِل میں ملال لائے بغیر جان لو کہ علیزے بھی تمہارے لیے بہترین انتخاب ثابت ہوگی وہ ا

امت سادہ دِل اور پاکیزہ لڑکی ہے کوئی بھی اُس کو اپنی شریک زندگی بنا کر فخر محسوس کرسکتا ہے۔'' ولی نے ہ اللہ کا کوئی بھی متوقع وسوسہ ختم کرنے کے لیے کہا۔

''بڑے بھیا! مجھے آپ پر اعتبار ہے، مجھے خوشی ہوگی کہ میں آپ کے کام آیا، آپ کے اعتبار کے ال ہوا۔'' عبداللہ نے بے حد سچائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے پیارے بھائی! اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، تم نے واقعی ایک بھائی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔'' ولی نے کہا۔

''اچھا میں فون بند کرتا ہوں، اللہ حافظ!'' ولی نے اُسے کہہ کر فون بند کردیا اور گاڑی کی سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

اُس کے اپنے کانوں میں اپنی ہی آواز کسی بازگشت کی طرح گونجی۔

''یار میرے! مِس علیزے کا نکاح عبداللہ کی غیر موجودگی میں ہرگز نہ ہوگا۔ تُو ہوگا تو نکاح ہوگا۔'' ولی نے ٹھنڈی سانس بھری، اُسے اپنی ماں کی بات یاد آگئی تھی کہ لفظ اور جملے ہمیشہ سوچ سمجھ کر منہ سے نکالنے چاہئیں جانے کون سی گھڑی قبولیت کی ہو۔

ولی کو اپنی کہی بات یاد آئی تھی جب اُس نے آسٹریلیا سے چلنے سے پہلے کہا تھا کہ یار عبداللہ تُو تو دولہے کی طرح وی آئی پی ہوگیا ہے، تیرے بغیر مِس علیزے کو میں مسز نہیں بننے دوں گا۔

واقعی یار عبداللہ! تُو تو دولہے ہی کی طرح وی آئی پی ہوگیا ہے۔''

ولی نے اپنی نم آنکھیں جھپک جھپک کر صاف کیں اور گاڑی ایک بار پھر سے اسٹارٹ کرکے سفر شروع کیا۔

❖❖○❖❖

چھونے سے قبل رنگ کے پیکر پگھل گئے
مٹھی میں آنہ پائے کہ جگنو نکل گئے
پھیلے ہوئے تھے جاگتی نیندوں کے سلسلے
آنکھیں کھلیں تو رات کے منظر بدل گئے

کب حدتِ گلاب پہ حرف آنے پائے گا
تتلی کے پَر اُڑان کی گرمی سے جل گئے
آگے تو صرف ریت کے دریا دکھائی دیں
کن بستیوں کی سمت مسافر نکل گئے

''یہ سب کیا ہے ولی! آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتے۔'' علیزے نے سسکتے ہوئے ولی سے سوال کیا۔

وہ سید سرفراز علی کے گاؤں سے آدھے پونے گھنٹے کے فاصلے پر تھا، جب علیزے کا روتے ہوئے فون آیا۔

''یہ سب کچھ میں نہیں چاہتا تھا علیزے! یہ تم بھی جانتی ہو۔'' ولی نے بے حد پشیمانی سے ماتھا مسلتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔

جب آپ کا دل تسلی سے محروم ہو تو آپ کسی اور کو بھی تسلی نہیں دے سکتے، ولی کا دِل بھی پھوڑے کی مانند دُکھ رہا تھا وہ علیزے کو کیسے تسلی دیتا۔

"لیکن! مجھے یہ قبول نہیں ہے۔" علیزے نے پہلی بار اونچی آواز میں بات کی۔

"ہمیں بعض اوقات جو چیزیں اور رشتے ناپسند ہوتے ہیں پھر بھی قبول کرنا پڑتے ہیں کیوں کہ وہ ہماری قسمت میں لکھ دیے جاتے ہیں اور علیزے یہ ہماری قسمت ہے اسے ہمیں قبول کرنا ہوگا کیوں کہ قسمتیں تو اللہ جی Design کرتے ہیں، ہمیں اِن کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔" ولی نے بہت سبھاؤ سے علیزے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے اپنے دل کا ملال علیزے کے دُکھ کو بڑھا دے۔

"ولی! میں نے صرف آپ کو چاہا ہے۔" علیزے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

ولی کو لگا اُس کا ضبط علیزے کے آنسوؤں میں بہہ جائے گا۔

"اگر تم نے مجھے چاہا ہے تو میری مجبوری بھی سمجھو، میری بہن اور تمہاری کزن کی زندگی صرف میری وجہ سے داؤ پر لگی ہوئی ہے، کیا ہم اتنے سیلفش ہو سکتے ہیں کہ اپنی خوشیوں کی خاطر اپنی بہن کو تباہ کر دیں۔" ولی نے اُسے بہت رسان سے سمجھایا۔

"ولی! پلیز ولی! میں آپ کا انتظار کرلوں گی، آپ امی کو کسی طرح روک لیں۔" علیزے نے منت کی تو خود ولی کا دل پسیج گیا۔ اُس نے بے اختیار اپنا ماتھا مسلا۔

"انتظار! علیزے میں کیسے تم کو انتظار کرنے کے لیے کہوں... میں تو خود اتنا Uncertain ہو رہا ہوں، کیسے تم کو کوئی یقین دے سکتا ہوں اپنے لیے میں تمہاری زندگی کو کیوں برباد کروں، میرا کوئی حق نہیں ہے۔" ولی نے دِل توڑنے کی حد تک سرد لہجے میں کہا۔

"اور یہی حسن خالہ کا بھی خیال ہے۔" اس بار ولی کا لہجہ مدھم تھا۔

"حق...؟"

"کیا ہمارا رشتہ اتنا کم زور تھا کہ ہم ایک دوسرے پر حق جتا نہیں سکتے۔" علیزے نے تڑپ کر پوچھا۔

"علیزے پلیز! تم بات کو سمجھو تو سہی!" ولی نے غصے سے کہا۔

"میری بہن نگینہ کی زندگی کی قیمت ایک دوسری لڑکی کے ساتھ شادی ہے اور وہ ایک سرپھرے اور طاقت ور انسان کی بیٹی ہے جس کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے اُس نے اپنی شرائط پر مبنی نکاح نامہ Design کروایا ہے، وہ کہاں برداشت کرے گا کہ کوئی اور لڑکی میری زندگی میں آئے، میں تم کو کوئی آس نہیں دلا سکتا لیکن دعا دیتا ہوں کہ تمہیں زندگی میں اتنی خوشیاں ملیں کہ تمہارے سارے ملال ڈھل جائیں۔" ولی نے دعا دی۔

"آپ نہ ملے تو خوشیاں کیسے ملیں گی؟" علیزے نے تڑپ کر ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے کہا۔

ولی کا ضبط بھی ٹوٹ گیا تھا وہ گاڑی چلاتے ہوئے ایک بار پھر رک گیا اُس کے منہ سے بھی ایک دم سسکاری نکلی۔

"تم جو قریب ہوتیں تو!
تمہیں گلے لگا لیتا...
تمہارے آنسوؤں کو اپنی پوروں پر لے لیتا...
اور تمہارے دِل کی ساری کرچیاں چن کر
پیار سے جوڑ دیتا...
لیکن...
تم میرے کیوں پاس ہوتے؟

قریب تو وہ لوگ ہوتے ہیں نا، جن سے کوئی رشتہ ہوتا ہے! اور میں قسمت کی اِس شرارت پر بے بس ایسا ہوں میں تو یہ حق بھی کھو چکا ہوں کہ تمارے نکلے آنسو ہی اپنے دل پر لے لیتا، اپنی پوروں پر محسوس کر لیتا!" ولی نے ٹوٹتے ضبط کے ساتھ کہا۔

علیزے کے رونے میں مزید تیزی آ گئی تھی۔

ولی کا سمجھانا اُسے وہ کچھ سمجھا نہ سکا تھا، جو وہ اُسے سمجھانا چاہ رہا تھا۔ لیکن ولی کا اظہار اُسے ایک دم سے شانت کر گیا تھا۔

محبت کا بچھڑنا اتنا تکلیف نہیں دیتا جتنا محبت کا ریجکٹ ہونا تکلیف دیتا ہے، ولی کا اظہار علیزے کو محسوس کروا گیا تھا کہ وہ بدلا نہ تھا۔

"سُنو لڑکی!" ولی نے اپنے آنسو پیتے ہوئے اُسے پکارا۔

"جی!" علیزے نے سوں سوں کرتے پوچھا۔

"تم عبداللہ ہی سے شادی کرنا، میں چاہتا ہوں کہ تم ایسے شخص کے پاس رہو، جو تمہیں سینت سینت کر بہت پیار اور خیال سے رکھے اور وہ ایسا ہی ہے۔" ولی نے علیزے سے کہا۔

"لیکن وہ آپ نہ ہوں گے!" علیزے کے لہجے میں اِس بار تڑپ ضرور تھی لیکن آمادگی بھی موجود تھی۔

"اور ایک وعدہ کرو کبھی روؤ گی نہیں، ہمیشہ زندگی کو انجوائے کرو گی!" ولی نے اچھے دوستوں کی طرح کہا۔

"اب آپ جدا کر کے زبردستی خوش رہنے کی گارنٹی بھی مانگیں گے؟" علیزے نے ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا۔

"تم مجھے بہت عزیز ہو اور ہمیشہ رہو گی، رشتہ بدلنے کے باوجود ہمیشہ تمہارے لیے دعا گو رہوں گا۔"

"ولی! سنیں، ابھی فون بند نہیں کیجیے گا!" علیزے نے ایک دم فرمائش کی۔

ولی پوچھ نہ سکا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔

"میں آپ کو چند پَل جی بھر کر محسوس کرنا چاہتی ہوں!" علیزے نے دِل ہی دِل میں کہا۔

"ولی! میں آپ کو ہمیشہ مِس کروں گی!" اس بار بھی اُس نے یہ ولی سے نہ کہا۔ دوسری جانب ولی فون پر کان لگائے گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔

"او کے اللہ حافظ!" علیزے کی آواز آئی۔

"اللہ حافظ! پلیز اپنا خیال رکھیے گا۔" پھر اُس نے فون بند کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ولی نے بےاختیار سانس بھرنے کی کوشش کی لیکن اُسے ایک دم آکسیجن کی کمی کا احساس ہوا۔

❖❖○❖❖

میں دھڑکن ہوں
اور اپنا سینہ توڑ کے اُس کے دِل میں سمانا چاہتی ہوں جو میری حدوں سے باہر ہے
میں دھرتی ہوں
بادل کے لیے آغوش کشا
اور دھوپ میں جلتی رہتی ہوں
میں پچھلی رات کا سپنا ہوں
اور جاگنے والی آنکھوں سے
ہونے کی گواہی مانگتی ہوں
میں شام ازل کی تنہائی
انجان کسک مرے تن من میں
اور خوف کے سائے دُور افق تک لرزاں ہیں
میں کون سی رُت میں زندہ ہوں
میں کون سی رُت میں زندہ ہوں!

''آیا لتاں! مجھے یقین نہیں آرہا۔'' مسکان نے معصومیت سے کہا۔

آیا لتاں پھیکی سی ہنسی ہنسی اور بڑھ کر مسکان کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''یہ ہونے جارہا ہے! لیکن یہ کیسے ہورہا ہے یہ نہ پوچھنا!'' آیا لتاں نے اُس کے ماتھے پر آئی لٹوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''آیا لتاں! میں نے اُسے بہت چاہا تھا، بہت مانگا تھا۔'' مسکان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

وہ مرجھا کر رہ گئی تھی اُس کے چہرے کی ازلی شگفتگی ختم ہوگئی تھی اتنی بیماری اور اعصابی جنگ کے بعد وہ بالکل کم زور ہوگئی تھی۔

پہلے جو اُس کی آنکھیں ہر وقت قمقموں کی طرح روشن رہتی تھیں اب بجھی بجھی، بنا چمک کے تھیں لیکن اتنے عرصے بعد صرف ولی کے ذکر پر دوبارہ کچھ روشن ہوئی تھیں لیکن یہ جوت بھی اتنی کم تھی کہ آیا لتاں کو بے حد افسوس ہو رہا تھا۔

مسکان نے اپنی زندگی کی ڈور ولی سے باندھی تھی اِسی لیے تو جب وہ اُس سے محبت کر رہی تھی تو خوش اور صحت مند تھی۔ پھر اُس سے نفرت کرنے لگی تو قطرہ قطرہ پگھلنے لگی کیوں کہ وہ صرف تب ہی خوش رہ سکتی تھی جب وہ ولی سے محبت کرتی رہتی۔ اِس جنون کی راہ میں روک ٹوک اور بندشوں نے اُسے توڑا ضرور تھا لیکن وہ اُسے اُس کی بےخودی سے باہر نہ نکال سکی تھی۔

''تیری چاہت میں اِس قدر شدت تھی کہ اُس نے تقدیر کے بہاؤ کو بدل دیا ہے۔'' آیا لتاں نے کہا۔

''میری دعا ہے کہ اب اِس شادی کے جو منفی اثرات ہیں، وہ بھی تیری محبت کی سچائی کی وجہ سے مثبت ہو جائیں کیوں کہ تُو تو خود بہت اچھی ہے۔'' انہوں نے دِل میں سوچا۔

''آیا لتاں! وہ اب بھی اُس لڑکی کو چاہتا ہے؟'' مسکان نے سوال کیا۔

''ہاں!'' آیا لتاں نے اُسے پہلے ہی بتا دینا بہتر سمجھا تا کہ وہ آئندہ کسی مزید صدمے سے نڈھال نہ ہو جائے۔

''تو پھر اب وہ میرے لیے کیوں آرہا ہے؟'' مسکان نے معصومیت سے پوچھا۔

''مجبور ہو کر۔'' آیا لتاں نے آدھی بات کر کے خاموش رہنا بہتر جانا۔

''اُسے کیا مجبوری ہوگئی؟ آپ ہی تو کہتی تھیں کہ مجبوری کے رشتے کبھی مضبوط نہیں ہوتے۔'' مسکان نے بہ غور اُن کو دیکھتے پوچھا۔

پہلے اور اب والی مسکان میں زمین آسمان کا فرق آچکا تھا۔

پہلے والی مسکان ''ناممکن'' پر غصہ کرتی تھی اُس پر ضد کرتی تھی، بےصبری تھی جب کہ اب کی مسکان ہر ناپسندیدگی کی بات پر بھی تحمل سے بات کرتی تھی۔ اُس کے اندر ضد اور غصہ دم توڑ چکے تھے وہ اب صابر ہو چکی تھی وہ بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔

''وہ تیری محبت کی شدت سے مجبور ہو کر آرہا ہے یہ تیری راتوں کو تڑپ تڑپ کر اُٹھ اُٹھ کر ہوئیں دعائیں ہیں جن کی وجہ سے تیری محبت قسمت کی لکیروں سے لڑ کر اُسے یہاں آنے پر مجبور کر رہی ہے۔'' آیا لتاں نے کسی حد تک سچائی کہی تھی۔

''لیکن بیٹا! اُس کی مجبوری کو تُو اپنی محبت سے رضا میں بدل دینا۔ ہوسکتا ہے وہ پہلے جیسا ولی نہ ہو، ہوسکتا ہے تم پر بہت غصہ آتا ہو، وہ تم کو اہمیت دینے سے انکار کرے گا، یہ سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن تم اپنے اللہ اور اپنی محبت پر یقین رکھنا، اگر وہ کسی معجزے کی طرح تیرا ہونے جارہا ہے تو یقیناً اللہ نے اُسے تیرے ہی لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اب تمہیں اپنی جگہ اللہ کی مدد سے اور اپنی محبت سے حاصل کرنی ہوگی۔'' آیا لتاں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

''آیا لتاں! اللہ نے میری پہلے کیوں نہ سنی، مجھے اتنا درد اور آنسو کیوں دیے اگر اُسے میری دعا قبول کرنی تھی تو پہلے کیوں نہیں کی، میں احساس کم تری اور کم اعتمادی کی اِس دلدل میں نہ پھنستی!'' مسکان نے شکوہ کیا۔

''وہ اللہ ہے نا! اس کائنات کو ازل سے چلا رہا ہے، وہ بہتر جانتا ہے کہ کون سی چیز کا وقت کون سا بہتر ہے، بہترین ہے! وہ جو کرتا ہے، بہترین کرتا ہے کیوں کہ وہ مکمل ہے، وہ کبھی کم کر ہی نہیں سکتا۔'' آیا لتاں نے بےحد مضبوط اور ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''بہت سال پہلے میں بھی بےیقینی کی دلدل میں دھنسی تھی مجھے بھی شکووں نے توڑ ڈالا تھا لیکن تب جتنا میں خود پر زیادتی کو سوچتی اور جتنا میں شکوہ کرتی بےسکونی میں گھرتی جاتی تھی۔

لیکن جب میں نے شکوہ کرنا چھوڑ دیا تو اُس نے مجھے سکون بھی عطا کر دیا اور مجھے یقین ہے کہ میرے آنسو رائیگاں نہیں جائیں گے اور ظالم کی رسی ہمیشہ دراز نہیں رہے گی۔'' آیا لتاں نے کھوئے کھوئے لہجے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کہا۔

''تو کیا اللہ مجھے بھی سکون اور ولی کی محبت دے دیں گے؟'' مسکان نے پوچھا۔

''جب اُس نے نہیں دینی تھی تو تجھے لاکھ تڑپنے پر کچھ نہ ملا! اب وہ دینا چاہتا ہے اِسی لیے تُو قسمہ پہیہ الٹا چلا ہے ورنہ تیرے باپ کو تو سب سے زیادہ زمین پیاری تھی اور غیر خاندان میں لڑکی بیاہنے پ بھی راضی نہ ہوتا۔ لیکن بلال کی موت نے اُس کو تم سے دوبارہ اس طرح قریب کر دیا کہ وہ تمہا خوشیوں کے لیے جنونی ہو گیا ہے دِل، قسمتیں، تقدیریں سب اللہ بدل دیتا ہے تم بھی بس ہمیشہ اللہ بھروسا پکڑے رکھنا۔'' آپا اماں نے پیار سے کہہ کر اُس کے سامنے شادی کا لباس پھیلا دیا۔

''واہ! کس قدر خوب صورت ہے نا!'' مسکان نے جوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری ماں نے تمہارے لیے رکھا ہوا تھا۔'' آپا اماں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ شا ماضی میں کھوئی ہوئی تھیں۔

''یہ میری امی کا ویڈنگ ڈریس ہے کیا؟'' مسکان نے پیار سے جوڑے کو چھوا۔

''نہیں! یہ ایک بہت نیک بخت عورت کا جوڑا ہے، جس کے متعلق تمہاری ماں کا خیال تھا وہ اللہ بہت منظورِ نظر تھی، جیسے تیرے باپ کا بھی پیار ملا تھا۔'' آپا اماں نے دھیرے سے راز سے پردہ اٹھا ہوئے کہا۔

''مطلب؟'' مسکان سمجھ نہ پائی کہ اُس کی ماں کو وہ عورت کیوں محبوب تھی، جو اُن کے شوہر کے ل میں بستی تھی، بجائے اُس سے حسد کرنے کے وہ اُس کی ماں کو کیوں عزیز تھی۔

''تیری ماں جانتی تھی کہ وہ نیک بخت تھی اور اُس کا تو کوئی دوش بھی نہ تھا۔ ہاں لیکن وہ اُسے خو قسمت ضرور تصور کرتی تھی! اِسی لیے اُس نے مرنے سے پہلے مجھ سے خواہش کی تھی کہ یہ جوڑا تجھے تیر شادی پر پہناؤں تا کہ تجھے بھی اپنے شوہر کی اتنی ہی زیادہ محبت اور قدر ملے جو، اِس جوڑے کی دلہن کو تھی۔ میں جانے کیوں تیرے پہلے نکاح پر یہ جوڑا بھول گئی، شاید میں ذہنی طور پر اُس نکاح کے لیے آمادہ نہ تھی، تیری ماں اس جوڑے کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ تُو اس کو بے شک خوش قسمتی جان کر نہیں ا ماں کی خواہش جان کر پہن لینا۔'' آپا اماں نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

مسکان بھی کھو سی گئی تھی وہ بھی شاید اپنی ماں کے تصور کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

''تُو اسے پہنے گی نا؟'' آپا اماں نے پوچھا۔

جواباً مسکان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تُو اِسے پہن کر دیکھ، اگر کوئی کم زیادہ کرنا ہے تو درزن آئی بیٹھی ہے ٹھیک کر دے گی۔'' آپا اما نے اُسے جوڑا پکڑاتے ہوئے کہا۔

مسکان جوڑا پکڑے ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ گئے دنوں میں سید سرفراز علی نے حویلی کو بالکل مختلف کر دیا تھا وہ جدید زمانے کی ہر ضرورت کو پورا کرتی تھی، باتھ رومز، ڈریسنگ رومز وغیرہ جدید طرز ۔ بنوائے گئے تھے۔

جب مسکان شادی کا جوڑا پہنے باہر آئی تو آپا اماں حیرت سے گنگ رہ گئیں! وہ جوڑا مسکان کے ت

اِس طرح تھا جیسے اُس کے ہی ناپ کا بنا ہو۔ بنا ہار سنگار کے بھی وہ بہت موہنی لگ رہی تھی لیکن اِن ب سے بڑھ کر جو بات نمایاں تھی وہ یہ کہ وہ ہو بہو عائشہ بی بی جیسی لگ رہی تھی۔

''آپا اماں! آپ مجھے اُن کا نام بتائیں گی، جن کا یہ جوڑا ہے۔'' مسکان نے خود کو حیرت سے شیشے ما دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اُن کا نام عائشہ بی بی تھا۔'' آپا اماں نے مختصراً جواب دیا۔

''وہ کون تھیں اور میری امی کی کیا لگتی تھیں؟''

''وہ تمہاری امی کی جیٹھانی تھیں اور تمہارے بابا کی چچا زاد بہن بھی تھیں۔'' آپا اماں نے کہا۔

''آپ نے پہلے کبھی نہیں بتایا!''

''ابھی میں نے تجھے بتایا تھا نا کہ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔'' آپا اماں نے کہا۔

''اور ہاں تیرا نکاح ہو جائے تو میں تجھے یہ بھی بتاؤں گی کہ اِس جوڑے سے صرف تمہارا ہی نہیں ولی کا بھی تعلق ہے!'' آپا اماں نے دِل میں کہا۔

انہوں نے مسکان کو ایک بار پھر دیکھا، کچھ ہی منٹوں میں اُس کا چہرہ اور آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''یا اللہ! مسکان پر اب کوئی اور آزمائش نہ ڈالنا۔'' انہوں نے بے اختیار دعا کی۔

❖❖○❖❖

اور اُس کی آنکھیں گواہ بنتیں
کہ آؤ اِس سرزمیں پہ آؤ
یہاں جزیروں کی سرمئی شام کا سکون ہے
یہاں ستاروں کی چھاؤں، پھولوں کی دھوپ
لہروں کی نغمگی ہے اور اَن کہے اَن سنے
بہت سے حسیں خیالوں کی نرم خوشبو
جب اُس کے سانسوں کی ریشمی گھاس میں
ہوا بن کے تیر جاتی
تب اُس کے ہونٹوں پر ساحلوں کا گمان ہوتا
نہ اُس کی آنکھوں میں جھوٹ تھا
اور نہ اُس کی باتیں فریب آسا
جزیرہ آنکھیں تھیں
بات خوشبو تھی
ہونٹ ساحل
مگر یہ سب جیسے خواب سا تھا
یرے مقدر میں پانیوں کا سفر لکھا تھا

ملیزے نے ولی کی دی ہوئی وہ Painting جو اس نے منگنی کے وقت دی تھی، اُسے بہ غور دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج بھی اُس Painting پر لکھے گئے لفظ جگمگا رہے تھے اُس پر علیزے کا بنا آدھا چہرہ اپنے سار
رنگوں کے ساتھ موجود تھا۔ پھر کیوں کہانی چلتے چلتے رُک گئی؟

کیوں وہ اختتام کی جانب نہ بڑھ سکی۔
تیری اور میری قسمتیں تو...
کیسی پکی سہیلیوں جیسی تھیں
ہاتھ تھامے...
کچے پکے رستوں پر چلتے انہوں نے یہ قسم کھائی تھی
کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے!
ہمیشہ ساتھ نبھائیں گے
لیکن!
ہم میں سے کس کی قسمت نے دغا دے دی
منزل کے قریب!
بیچ سمندر، بیچ راہ میں
ہاتھ چھوڑ دیا
ساتھ چھوڑ دیا!

علیزے منہ پر ہاتھ رکھ کر بلک بلک کر رودی، اُسی پل کمرے کا دروازہ کھول کر غزالہ، حُسن آرا بیگم
اور محلے کے ایک بزرگ حاجی صاحب نکاح خواں کے ساتھ داخل ہوئے۔
حُسن آرا بیگم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کے دوپٹے کا آنچل منہ کے آگے کر دیا۔
"علیزے انور آپ کو عبداللہ فیصل سے حق مہر بیس لاکھ اور دس تولے سونا قبول ہے۔" نکاح خواں
پوچھ رہا تھا۔
وہ دوسری بار پھر پوچھ رہا تھا۔
"علیزے انور آپ کو عبداللہ فیصل سے حق مہر بیس لاکھ، دس تولے سونا قبول ہے؟" علیزے کی
آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو تیزی سے بہنے لگے۔
حسن آرا بیگم نے علیزے کے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی۔
"تیرا باپ ہسپتال میں تیری وجہ سے زندگی اور موت کی کش مکش میں ہے، دنیا کا کوئی علاج اُسے
زندگی کی جانب کھینچ کر نہیں لاسکتا سوائے تیری اِس ہاں کے، بول دے علیزے! اور یہ رشتہ ولی نے ا
بھیجا ہے اور ولی تیرے لیے بہترین ہی سوچتا ہے! علیزے ہاں کر!" حسن آرا بیگم نے سرد لہجے میں کہا۔
"قبول ہے!" علیزے نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔
"مجھے قسمت کی یہ زیادتی، یہ ستم ظریفی قبول ہے!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی، حُسن آرا بیگم نے نڈھا
ہو کر اُسے گلے لگالیا۔
"مبارک ہو!

مبارک ہو! بہن جی آپ کو مبارک ہو۔ اللہ بچی کی قسمت اچھی کرے۔" حاجی صاحب نے علیزے
سر پر ہاتھ رکھ کر کہا اور نکاح خواں کو لیے باہر نکل گئے جہاں دولہے کے ساتھ اُس کی والدہ بھی بیٹھی
اور بے حد خوش تھیں۔ اب نکاح خواں دولہے کو کلمے پڑھوا کر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو گواہ
دولہے کی منظوری لے رہے تھے۔
"مبارک ہو بہن جی!" مریم بی بی نے آگے بڑھ کر حسن آرا کو گلے سے لگایا۔
"آپ کو بھی مبارک ہو!" حسن آرا بیگم نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے کہا۔
کل تک اُن کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ اُن کی بیٹی کی قسمت ایسے لڑکے کے ساتھ جڑ جائے گی جو
زندگی میں پہلی بار پاکستان آیا تھا جن کو انہوں نے نکاح سے کچھ دیر پہلے پہلی بار دیکھا تھا جس کو
طرح جانتی تک نہ تھیں لیکن عبداللہ کی شفاف آنکھیں اور تابع دار لہجہ اُن کے بہت سارے وسوسے
گیا تھا۔

وہ بے شک اپنے شوہر کی بیماری اور اپنی بہن سے رشتے داری چھٹنے پر پریشان تھیں لیکن علیزے کے
کل کی جانب سے مکمل مطمئن تھیں اُن کا دِل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں تب ہی تو
انہوں نے اتنے کم عرصے میں فیصلہ لے لیا تھا اور علیزے کا ہاتھ اُن کو دے دیا تھا۔
"عبداللہ بیٹا! یہ شادی اتنی اچانک ہے کہ میں ٹھیک سے خوش بھی نہیں ہو پائی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ ولی
کہاں ہے جس نے یہ رشتہ جھٹ پٹ کروایا۔" مریم بی بی نے عبداللہ سے پوچھا۔
عبداللہ نے بہت ساری باتیں اپنی ماں سے چھپائی تھیں اور حقیقت کو کچھ اپنے رنگ پہنا کر اپنی ماں کو
بتایا کہ علیزے ولی کی خالہ زاد ہے اور اُس کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اُن کی خواہش ہے کہ فوراً
اپنی بیٹی کا نکاح کروادیا جائے اور چوں کہ ولی کا نکاح تو ہو رہا ہے اِس لیے وہ خود یہ قربانی نہیں دے
سکتا اور اِس اچھے کام کے لیے اُس نے عبداللہ سے درخواست کی ہے اور گارنٹی دی ہے کہ علیزے سے
اچھی لڑکی اُس کو نہیں ملے گی۔ پھر جب مریم بی بی علیزے سے ملیں تو اُن کا دِل بھی بے حد مطمئن
تھا، ان کو چاند سے چہرے والی وہ بے حد حسین اور نازک لڑکی پہلی ہی نظر میں اِس قدر پیاری لگی کہ وہ
کچھ نہ سوچ سکیں اور فوراً ہاں کر دی۔
"عبداللہ! بیٹا میں نے پوچھا ہے کہ ولی کہاں ہے؟ اور اُس کے والدین، مجھے اُن سے ملنا ہے۔"
انہوں نے بے چینی سے سوال کیا۔
ولی کی پہچان جاننے کے لیے ہر صورت جلد از جلد اُس کے والدین سے ملنا چاہتی تھیں۔
"وہ میرا ہی خون ہے! میرا دل گواہی دیتا ہے۔" انہوں نے دل ہی دِل میں کہا۔ جب سے وہ ولی
سے ملی تھیں اُن کو پہلی ہی نظر میں جو اپنے بھائی کا احساس ملا تھا وہ اُسے اگنور نہ کر پائی تھیں۔
"امی جان! ولی کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اِس لیے وہ لوگ آ نہ سکے۔ انور انکل کی ضد کی وجہ
سے علیزے کا نکاح فوراً کیا، اِس لیے ہم لوگ اُن سب کا ویٹ نہیں کر سکتے تھے۔ میں آپ کو خود ملوادوں
گا۔" عبداللہ نے اُن کو تسلی دی۔
"ہاں! میں اُن سب سے فوراً ملنا چاہتی ہوں اب تو تھوڑا سا بھی انتظار نہیں ہوتا۔" مریم بی بی نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔
''انشاء اللہ جلدی ملیں گے!'' عبداللہ نے ماں کو تسلی دی۔
''لیکن ولی بھائی خود کہاں ہیں؟'' عبداللہ نے خود سے سوال کیا۔

❖❖○❖❖

''نفیسہ بیگم! نفیسہ بیگم!'' سید سرفراز علی نے زنان خانے میں آ کر اُن کو پکارا۔
''میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے اس طرح نہ پکارا کرو!'' نفیسہ بیگم نے کچن سے باہر آتے ہوئے ا
وہ اس وقت نگینہ کے لیے کھانا بنوا کر ٹرے میں رکھوا رہی تھیں، ملازمہ نے آ کر نفیسہ بیگم کو بتایا کہ
لڑکی شاہ صاحب کے بندے چھوڑ گئے ہیں، اُس نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا اور وہ مسلسل رو رہی ہے
لیے نفیسہ بیگم نے سوچا کہ وہ نگینہ سے خود مل لیں تا کہ لڑکی کا خوف دور ہو جائے اور اُسے کچھ کھلا
دیں۔
''کیوں تم کو احساس ہوتا ہے کہ تم میری گھر والی ہو؟'' سید سرفراز کا موڈ اچھا تھا اس لیے انہوں
نفیسہ بیگم سے شرارت کی تھی۔
''لاحول ولا! میری زندگی کا تو یہ دُکھ ہی سب سے بڑا ہے کہ تم، تمہارے جیسے خبیث انسان کے
میرا تعلق ہے!'' نفیسہ بیگم نے جل کر کہا۔
''تم کچھ بھی کرلو لیکن تم میری گھر والی ہونے سے انکار نہیں کر سکتیں۔'' سید سرفراز علی نے قہقہہ ا
اُسے تو دوسروں کو تکلیف دے کر ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔
''ہونہہ!'' نفیسہ بیگم نے ہنکارا بھرا۔
''اچھا چھوڑ! میں تم کو بتانے آیا تھا کہ ولی پہنچ گیا ہے میری ابھی ابھی اُس سے بات ہوئی ہے
اُسے لینے جا رہا ہوں، آخر وہ میرا داماد ہے اور میرے پروٹوکول کا حق دار ہے۔'' سید سرفراز علی
رہے تھے۔
''سنو سرفراز علی!'' نفیسہ بیگم اُس گھڑی سے گھبرا گئیں، جس کا اُن کو خود شدت سے انتظار تھا۔
سید سرفراز علی نے رُک کر مڑ کر پوچھا۔
''تمہارے خاندان میں ایک رسم ہے تمہاری ہی ماں نے بتائی تھی کہ دولہے کو سہرا پہنایا جاتا
اُسے تب تک نہیں دیکھا جاتا جب تک نکاح نہ ہو جائے اور دولہا دولہن آر سی مصحف کی رسم میں
دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اگر دولہے کا چہرہ کوئی اور پہلے دیکھے گا تو وہ بدشگونی ہوگی۔'' نفیسہ بیگم نے
جلدی بات بنائی اور یوں کہا کہ سید سرفراز علی کو ایک پل کے لیے بھی شک نہ گزرا کہ نفیسہ بیگم ا
لینے کے لیے جھوٹ بول رہی ہیں۔
''یہ کیسی رسم ہے اِس سے پہلے میں نے تو نہیں سنی؟'' سید سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔
''یہ رسم ہے! اور تم لوگوں کے ہی خاندان کی ہے۔'' نفیسہ بیگم نے جان بوجھ کر بے نیازی دکھائی
سید سرفراز علی کو کسی قسم کا شک نہ گزرے۔
''اور اگر اِسے نہ مانا جائے تو؟''

''تو پھر دولہا یا دولہن میں سے کسی ایک کی موت جلدی ہو جاتی ہے اور جوڑی اَدھوری رہ جاتی ہے۔''
بیگم کی بات سن کر سید سرفراز علی کی ہنسی نکل گئی۔
''تم عورتیں دقیانوسی ہوتی ہو۔'' سید سرفراز علی نے نفیسہ بیگم کا مذاق اڑایا۔
''دقیانوسی!''
''ہونہہ! یہ لفظ میرے اوپر استعمال کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو کہ کون دقیانوسی
ا تمہاری روایات، تم، یہ حویلی! کس کس کو اس لفظ سے بچاؤ گے؟'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پر بل ڈال کر

''عورت خوشی کے موقعے پر بھی لڑنے سے باز نہیں آتی!'' سید سرفراز علی نے غصّے سے کہا۔
''اب تم کیا چاہتی ہو؟'' سید سرفراز علی نے پوچھا۔
''صرف اتنا کہ مسکان کو ترس ترس کر کوئی خوشی ملنے جا رہی ہے تم اِس کے لیے تھوڑا سا خیال کرلو تا کہ
ا بچی کے ساتھ مزید بُرا نہ ہو۔'' نفیسہ بیگم نے سختی سے کہا۔
''کتنا مشکل ہوتا ہے کسی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنا اور اِس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے
ے اپنی بات کو منوانا۔
''اگر ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا تو!'' سید سرفراز علی خود ہمیشہ غلط سوچتا اور کرتا تھا اس لیے اُسے کسی
ے پر اعتبار نہ تھا۔
''کیسا دھوکا؟'' نفیسہ بیگم نے پوچھا۔
''کہ وہ کوئی اور ہو یعنی ولی نہ ہوا، اُس کی جگہ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے، ہم نے اُسے پہلے نہیں دیکھا،
ہاں مسکان کے باڈی گارڈز نے دیکھا ہے وہ اُسے پہچان لیں گے۔'' سید سرفراز علی اعتراض کرتے
ئے خود ہی اُس کا حل جان گئے۔
''چلو ٹھیک ہے میرے بندے مجھے بتا دیں گے کہ وہ ہی ٹھیک بندہ ہے، تم بندھوا دو اُسے سہرا!'' سید
علی مسکان کی خوشی کی خاطر مان گئے۔
''ہم پھر اُسے نکاح کے بعد ہی دیکھ لیں گے! تم مسکان کو تیار کروا دو، میں نے بہت اچھی بیوٹیشن
ہے وہ آتی ہی ہوگی۔''
د سرفراز علی کے گاؤں سے پونے گھنٹے کے فاصلے پر شہر موجود تھا عموماً ہر طرح کی چیز اور سہولت اِس
ے حاصل کی جاتی تھی۔ سید سرفراز علی مسکان کو خوش کرنے کے لیے ہر کام کر رہا تھا۔ بلال کی موت
ے مسکان کی جانب دوبارہ دھکیلا تھا وہ ہر صورت مسکان کے نقصان کا خمیازہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔
''سنو سرفراز علی! ذرا تحمل اور نرمی سے بات کرنا وہ تمہارا داماد ہوگا۔ پھر تم نے اُس کی بہن کو اغوا کیا
ہے وہ غصّے میں بھی ہوگا۔'' نفیسہ بیگم نے اُن کو نصیحت کی۔
''ارے ہم نے اُس کی بہن کو پوری عزت و احترام سے گھر میں مہمان رکھا ہوا ہے، غصّہ کس بات
ب وہ ہماری بات مان رہا ہے تو ہم اُس کو پوری عزت و احترام سے جانے بھی دیں گے۔'' سید
علی نے بے نیازی سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہونہہ! زبردستی کا مہمان!'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔
''تم پھر شروع ہوگئیں! جاؤ اپنا کام کرو، مجھے جلدی ہے۔'' باہر نکلتے ہوئے انہوں نے کہا۔
سید سرفراز علی صرف مسکان کی خاطر نفیسہ بیگم کی اتنی باتیں سن رہے تھے یہ ایک بہت بڑی تبدیلی آ رہی تھی، ورنہ تو وہ صرف حکم دینا ہی جانتے تھے۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم انکل!'' طارق نے جیپ چلاتے چلاتے کہا۔
''وعلیکم السلام!'' احمد شاہ نے مرجھائے مرجھائے انداز میں جواب دیا۔
''انکل! میں نے سرچ وارنٹ اور گرفتاری کے وارنٹ نکلوا لیے ہیں اب میں سید سرفراز علی کے گا کی جانب روانہ ہوں، میں بہت دیر سے آپ کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا لیکن آپ کا نمبر بند پڑا تھا۔'' طا نے کہا۔
''بیٹا! تمہارا خیال ہے کہ یوں ریڈ کرنا نگینہ کے لیے سیف ہوگا؟ سید سرفراز ایک کریمنل مائنڈ ہے۔'' احمد شاہ نے کہا۔
''انکل میں جانتا ہوں، پھر نگینہ جتنی مجھے عزیز ہے میں بہت احتیاط کروں گا!'' طارق کا بے اختیار سے اظہار منہ سے نکلا۔
احمد شاہ بھی ذہنی طور پر پریشان تھے، ورنہ شاید وہ بھی نوٹس لیتے۔
''ٹھیک ہے بیٹا! اللہ کے سپرد، مجھ سے رابطے میں رہنا اور ولی کو منع کرو وہ کسی قسم کی سودے سے رُک جائے۔'' احمد شاہ نے طارق سے اصرار کیا۔
''جی انکل! میں کوشش کروں گا کہ وہ باز آ جائے ہم پہنچ ہی رہے ہیں۔'' طارق نے اُن کو تسلی دی
''اچھا انکل اللہ حافظ! دعا کرتے رہیے گا''
طارق نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

❖❖○❖❖

''سائیں! رحیم بخش کو ہوش آ گیا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے!'' ملازم جو رحیم بخش کے ساتھ شاہ نے رکھا تھا اُس نے آ کر اطلاع دی۔
اتفاقاً روشن آرا بیگم بھی اِسی ہسپتال میں تھیں، اس لیے احمد شاہ کو پَل پَل کی خبر مل رہی تھی، بخش کی جانب سے بھی بے فکر تھے۔
''اچھا! اُسے ہوش آ گیا؟ الحمدللہ!'' احمد شاہ ملازم کے ساتھ رحیم بخش کے کمرے کی جانب بڑھ
رحیم بخش نے جیسے ہی احمد شاہ کو دیکھا تو روتے ہوئے لرزتے ہاتھوں کو جوڑ دیا۔
''میم۔ مجھے معاف کر دیں! میں بٹی کو نہیں بچا پایا۔'' رحیم بخش کو اپنی جسمانی تکلیف سے زیادہ تکلیف تھی کہ نگینہ کو وہ نہیں بچا پایا۔
''رحیم بخش! تم نے پوری کوشش کی تھی۔ تم تو اپنی جان پر بھی کھیل گئے، بس آزمائش آنی تم کرو کہ یہ آزمائش اب ختم ہو جائے، تمہاری بی بی اور میں اِس آزمائش کے قابل نہیں۔'' احمد شا

لموں کے ساتھ کہا۔
''بٹی، کو، کس نے اغوا کیا؟'' رحیم بخش نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ اُسے بولنے میں بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔
''سید سرفراز علی ہے اُس کا نام اور وہ اُدھر تمہارے گاؤں والے ایریا میں رہتا ہے، اپنی بیٹی کی وجہ سے اس نے ہماری بیٹی کو اغوا کر ڈالا، کیسا باپ ہے؟'' احمد شاہ نے تاسف سے کہا۔ وہ اپنی بات کے دوران رحیم بخش کے تاثرات نہ دیکھ سکے، جس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔
''کیا ہوا رحیم بخش! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' احمد شاہ نے اُس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھ کر کہا۔
''سید۔ سرفراز علی!'' رحیم بخش کے ہونٹ پھڑ پھڑائے۔
''ہاں!'' احمد شاہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں ہامی بھری۔
''وہ، وہ۔ تو عبدالولی اور نگینہ بٹی کا چاچا ہے شاہ جی! وہی چاچا، جس نے سید عبداللہ اور اُس کے سارے خاندان کو جلا ڈالا تھا۔''
''شاہ جی! ولی بیٹا کو روکیں!!
روکیں اُن کو!!'' رحیم بخش کی سانس بے ترتیب ہونے لگی، احمد شاہ کو محسوس ہوا، جیسے ہسپتال کی عمارت اُن پر آ گری ہو، یہ کیسی آزمائش تھی جس کے ساتھ مزید آزمائشوں کی کڑیاں تھیں۔
''یا اللہ!'' احمد شاہ نے بے اختیار سر تھاما۔
''لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔'' احمد شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے خود کو تسلی دی۔
''آپ بھول رہے ہیں شاہ صاحب! آپ بھول رہے ہیں!'' رحیم بخش نے سر اِدھر اُدھر مارتے ہوئے بے چینی سے کہا۔
''کیا؟'' احمد شاہ پریشانی سے رحیم بخش کو دیکھ رہے تھے۔
''یہی کہ... کہ ولی بیٹا کی شکل ہو بہو اپنے باپ جیسی ہے، اتنی مماثلت کہ... سید سرفراز علی جیسا گھاگ ضرور اِس بات کو جاننے کی کوشش کرے گا کہ ولی کی پہچان کیا ہے، وہ ضرور ولی کو پہچان جائے گا۔ ولی کی ساری ادائیں اپنے باپ سے ملتی ہیں جو سید عبداللہ کے قریب رہ چکا ہوگا وہ فوراً سے جان جائے گا کہ یہی اُن کا بیٹا ہے۔'' رحیم بخش اتنی بڑی بات کہہ کر ہانپ رہا تھا جب کہ خود احمد شاہ کا دِل بھی ڈوبنے لگا تھا۔
اپنی اولاد بہت بڑی آزمائش ہے، مضبوط سے مضبوط اعصاب والے مالک انسان کو کم زور کر دیتی ہے۔ خود احمد شاہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔
''یا اللہ مدد کر! رحم کر!'' ایک طرف بٹی اور دوسری جانب بیٹا دونوں ہی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔
''اللہ رحمان! مدد کر!'' احمد شاہ نے ولی کو مسلسل فون ملاتے ہوئے دعا کی، اس بار وہ ہر صورت ولی کو روکنا چاہتے تھے لیکن ولی کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔
احمد شاہ نے بے اختیار ماتھا پکڑا، زندگی بھی تو ایک دم سے بند گلی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

WWW.PAKISTANIPOINT.COM پاکستانی پوائنٹ PAKISTANIPOINT

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور سامنے کوئی راستہ نہ تھا۔

❖❖❖○❖❖❖

طارق نے اپنے موبائل کی اسکرین کو دیکھا جہاں مسلسل ایک نام آ رہا تھا۔

طارق کو حیرت ہوئی کہ ان کی تو ایک دوسرے کے ساتھ Commetment تھی کہ ابھی کچھ ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ نہیں کریں گے حالات بہتر ہونے پر مزید کارروائی کا آغاز کریں گے فون کیوں آ رہا تھا۔

طارق نے کچھ سوچتے ہوئے فون آن کیا۔

”جی!“ طارق نے محتاط انداز میں کہا۔

”طارق ایک بہت بڑی خبر ہے، مارک نے کل ایک اور لڑکی اغوا کی ہے۔“ ترنم کہہ رہی تھی۔

”ترنم! دیکھو اس وقت ہم کسی اور کیس کے لیے جا رہے ہیں اور میں اتنے زیادہ فاصلے پر ہوں نہیں آ سکتا اس کے علاوہ ہم میں Understanding ہوئی تھی کہ ہم ابھی بات نہیں کریں گے۔

”طارق! وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔“ ترنم کی آواز سرگوشی میں تھی۔

”ترنم پلیز! میں ابھی تمہاری بات نہیں سن سکتا، میں پرسنلی ایک کیس کے لیے مصروف ہوں۔“ نے کچھ زچ ہو کر جواب دیا۔

”طارق! وہ نگینہ ہے، نگی کو مارک نے اغوا کیا ہے اس کی زندگی اور آبرو خطرے میں ہے۔“ تر دھماکا کیا تھا۔

طارق کی گاڑی ایک جھٹکے سے رکی، ساتھ ہی اُس کے پیچھے آتی دو جیپیں بھی رکی تھیں۔

”کا...کیا؟“ طارق ایک دم چیخا۔

”نگی کو مارک نے اغوا کیا ہے؟“

طارق کے اِرد گرد دھماکے ہوئے تھے۔

❖❖○❖❖

پھر نئے خواب اُترنے لگے آنکھوں پہ مری
پھر مری جان سسکنے لگی تعبیروں کو
دل میں جو درد تھا، اب حد سے بڑھا جاتا ہے
آگ سینے میں جو تھی، آہ و فغاں تک پہنچی
چارۂ غم نہیں کچھ پاس، بجز حرفِ دعا
گریۂ شب میں جو آفاق کو چھو لیں
وہ حرف لڑیاں ہیں موتیوں کی
نذر گزاروں سرِ دربارِ قبول
اے خدا! تو میری تنہائی میں شامل یوں ہے
پھول جیسے سدا آباد رہے خوشبو سے

انے دیکھا ہے مرے اشکوں کا سیل بے حد
لہ سے پوشیدہ نہیں شدتِ غم، شوق فزوں
ک تُو ہی تو ہے ہم رازِ مرا، چارہ ساز!
ے نیازانہ نہ سُن حرفِ دُعا کو میرے
ں ترے در پہ زمانوں سے جھکی ہوں، مجھ کو
ا الطاف و کرم بخش دے، اتنا کہ میں پھر
ت بے وقت!
لے نالہ بے تاب سُنا بھی نہ سکوں
یرا در چھوڑ کے جا بھی نہ سکوں!

ہی نے سجدے سے سر اٹھا کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے پھر دُعا مکمل کر کے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا چیک کیا، اُس میں موجود ریوالور پہلی بار جیب میں رکھا۔ اُسی پل ترنم اندر داخل ہوئی۔

'ماہی! طارق تو دور ہے آنے میں وقت لگے گا، اب کیا کرنا ہے؟'' ترنم نے پھولی سانسوں کے اندر آتے ہوئے کہا۔

'اب کچھ نہیں ہو سکتا اِس کے بعد موقع نہیں ملے گا ہمیں فوراً نکلنا ہے ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔'' نے اٹل لہجے میں کہا۔

'لیکن یوں نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' ترنم نے ماہی کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

'خطرہ، زندگی کے لیے ہے نا! موت کو تو کوئی خطرہ نہیں ہوتا نا؟'' ماہی نے ہنستے ہوئے کہا۔

رنم نے دُکھ سے اُسے دیکھا۔

'کیا ہوا چندا! ارے تم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میں بہادر ہوگئی ہوں اور بہادری کے ساتھ اپنی موت Fac کرنے جا رہی ہوں۔'' ماہی نے کہا۔

'کچھ نہیں ہوگا تمہیں! طارق پہنچ جائے گا وہ دیر سے یا جلدی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

'میں مرتی ہوں، جیتی کوئی فرق نہیں پڑتا، فرق صرف یہ پڑتا ہے کہ ہماری محنت رائیگاں نہ جائے، یہ بچ جائے، چلو جلدی کرو وقت کم ہے۔'' ماہی نے ترنم کے ساتھ باہر نکلتے کہا۔

'اللہ حافظ!'' ترنم نے کہا۔

'الوداع!!'' ماہی نے کہا۔

رنم کو اس کے یوں الوداع کرنے پر جھرجھری آ گئی۔

ہ جانتی تھی کہ ماہی جان بوجھ کر اپنی مرضی سے اِس راستے پر جا رہی ہے۔

'اے اللہ نگینہ کو بچالینا۔ ہماری قربانی کو بچالینا۔'' ترنم نے بے اختیار دعا کی۔

ور وہ نہیں جانتی تھی کہ ساری دعائیں فوراً قبول نہیں ہوا کرتیں۔

❁

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’طارق! آپ کدھر ہیں؟‘‘ ترنم کی گھبرائی ہوئی آواز طارق کے دل کی دھڑکن تیز کرگئی۔

’’میں آرہا ہوں انشاء اللہ بہت جلد! لیکن پھر بھی مجھے وقت لگے گا کیوں کہ فاصلہ بہت زیادہ ہے! پلیز نگی کا خیال رکھنا!‘‘ طارق نے ہونٹ کچلتے ہوئے کہا۔

احساس بے بسی تھا کہ مار مار کر طارق کو غصہ دلا رہا تھا۔ فاصلہ تھا کہ ہر میل دگنا ہوگیا تھا اور وقت لگا کر اُڑنے لگا تھا۔ طارق، سید سرفراز کے ہاں ریڈ کرنے اپنے سارے کارآمد بندے لے کر نکلا تھا اُسے سمجھ نہ آرہا تھا کہ نگی کو نکالنے کے لیے کس کے سپرد یہ کام کرے کہ وہ اس کو بہ حفاظت بازیاب کروالائے۔ اگر وہ سول پولیس کو کہتا تو نگی کی جان کو خطرہ تھا کیوں کہ سول پولیس میں راگنی کے بہت سارے بندے تھے جو اُسے ہر ریڈ کی پہلے سے خبر کردیتے تھے اِس کے علاوہ کوئی بھی کام کرنے کے لیے Process چاہیے ہوتا ہے اجازت، نفری کا تیار ہونا وغیرہ وغیرہ! اور نگی کی بازیابی اگر جلد از جلد نہ کی گئی تو بہت سارے نقصان ہوسکتے تھے۔ اور جسم فروشی کروانے والے یہ بھیڑیے کب تک ایک لڑکی کو چھوڑ سکتے تھے۔

’’نگی! وہ۔ نگینہ!‘‘ ترنم کی آواز میں موجود خوف طارق کے اردگرد بہت سارے وسوسوں کے کانٹے اُگا گیا۔

’’کیا ہوا نگی کو؟‘‘ طارق کی آواز بے چینی سے پھٹ رہی تھی۔

’’اُسے ماہی لے کر نکل گئی!‘‘ ترنم نے دھماکہ کیا۔

’’کیا! یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے تو کہا تھا تم میرا انتظار کروگی۔‘‘ طارق نے پریشانی سے پوچھا۔

’’موقع! طارق موقع تو قسمت سے ملتا ہے نا! انتظار کرتے تو موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔‘‘ ترنم نے سمجھایا۔

’’اوہ! لیکن وہ اُسے کہاں لے کر گئی؟ میں کہاں ملوں؟‘‘ طارق نے پوچھا کیوں کہ بہ قول ترنم کے کاٹھ کاٹا شہر سے خاصا دُور تھا۔

’’وہ اُسے اُسی جگہ تمہارا انتظار کرے گی، جہاں میں آپ سے پہلی بار ملی تھی، اچھا میں بعد میں بات کرتی ہوں۔‘‘ ترنم نے کمرے کے باہر قدموں کی آواز سن کر فوراً فون بند کردیا۔

طارق نے زور سے مکا اسٹیئرنگ پر مارا تو گاڑی ایک دم لہرا گئی، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مارک

نگینہ کو اُس کی بہن سمجھ کر اغوا کرے گا، یوں انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔ آج نگینہ کی جگہ اگر سائرہ ہوتی تو بھی اُس کی حالت ایسی ہی بُری ہونی تھی۔

’’مارک! یہ تم نے اچھا نہیں کیا، میں تمہیں وہ سزا دوں گا کہ تمہاری سات نسلیں بھی گناہ سے باز رہیں گی۔‘‘ غصہ، بے بسی طارق کے مضبوط اعصاب کو بُری طرح جھنجوڑ رہی تھی۔

’’اور یہ ولی! اِس نے کیوں فون بند کردیا یہ سید سرفراز علی کے بنائے جھوٹے جال میں کیوں پھنس رہا ہے؟ کیوں اُلو کا پٹھا بننے جارہا ہے، فون اٹھاؤ ولی، کم آن! پک اپ دا فون!‘‘ طارق با آواز بلند بڑبڑایا تھا۔

’’اگر آج تم نے فون نہ اٹھایا تو بہت پچھتاؤ گے! کسی کے پھیلائے جھوٹے جال میں پھنس کر بہت کچھ گنوا دو گے اس لیے فوراً فون اٹھاؤ یار۔‘‘ طارق کو ایک ہی وقت میں دو جگہوں پر محاذ آرائی کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔

اُس نے اپنی زندگی کی اِس مختصر نوکری میں بہت زیادہ اعصابی، جسمانی اذیتیں اور مشقتیں جھیلی تھیں لیکن جس لڑائی میں اپنے شامل ہوں وہاں انسان خود کو حساس ہونے سے نہیں روک سکتا، یہی طارق کے ساتھ بھی ہورہا تھا۔ وہ نازک سی، معصوم سادہ لڑکی! جس کے دُکھ بھی اُس کی خوشیوں کی طرح سادہ اور معصوم تھے۔ وہ اب کے بار کیسے ایسا دُکھ جھیلے گی، جو اُس کے ہر دُکھ اور تکلیف سے انوکھا اور بڑا ہے! ظالم ہے!

’’اے اللہ! تُو اُس کو اپنی حفظ و امان میں رکھ لے، ہم سب یہاں بیچ رستوں میں بے بس بیٹھے ہیں، صرف تُو ہی اُسے بچا سکتا ہے۔

’’اے اللہ نگی کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔‘‘ طارق نے بے حد صدق دل سے دُعا کی اور جیپ کی ریس پر دباؤ مزید بڑھا دیا۔

❖❖○❖❖

میں رنگ میں دیکھتی تھی
خوشبو میں سوچتی تھی
مجھے گماں تھا
کہ زندگی اُجلی خواہشوں کے چراغ لے کر
میرے دریچوں میں
روشنی کی نوید بن کر اُتر رہی ہے
مجھے کہر میں چاندنی پہن کر
بنفشی بادلوں کا ہاتھ تھامے
فضا میں پرواز کررہی تھی
ساعتوں میں سحاب لمحوں کی بارشیں تھیں
بصارتوں میں گلاب چہروں کی روشنی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا کی ریشم رفاقتیں تھیں
صبا کی شبنم عنایتیں تھیں
حیات خوابوں کا سلسلہ تھا
کھلی جو آنکھ تو سارے منظر
دھنک کے اس پار رہ گئے
نہ رنگ میرے، نہ خواب میرے
ہوئے تو بس کچھ عذاب میرے
نہ چاندراتیں، نہ پھول باتیں
نہ نیل صبحیں، نہ جھیل شامیں
نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی دستک
حروف مفہوم کھو چکے تھے علامتیں بانجھ ہوگئی تھیں
گلابی خوابوں کے پیرہن راکھ ہو چکے تھے
حقیقتوں کی برہنگی اپنی ساری سفاکیوں کے ہمراہ
جسم و جاں میں اُتر رہی ہے وہ مہرباں سایہ دار بادل
عذاب کی رُت میں چھوڑ کر مجھ کو جاچکا ہے
زمین کی تیز دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی ہے

''بیٹا! جاؤ اندر!''

''علیزے! تمہارے ابو تم کو دیکھنا اور ملنا چاہتے ہیں۔''حُسن آرا بیگم نے باہر آ کر کہا۔ اُن کے ہمراہ عبداللہ اور مریم بی بی بھی تھیں، جو ابھی ابھی انور صاحب سے مل کر آئے تھے۔

انور صاحب کو نئی زندگی ملنے کے ساتھ ساتھ اُن کو کچھ نئے رشتے بھی ملے تھے۔ لیکن وہ اپنی بیٹی سے مل کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتے تھے کہ اُس کے لیے یہ نئے رشتے کس حد تک خوشی کا باعث تھے اور باعث بننے والے تھے۔

علیزے نے سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی اور کچھ اس طرح سے کہ اس کا آدھا چہرہ اُس میں چھپ چکا تھا وہ گم سم اپنی ہتھیلیوں کو کھولے جانے کیا سوچ رہی تھی، جب یہ لوگ باہر آئے تھے اپنی ماں کی آواز سن کر وہ ایک دم چونک کر اُٹھی۔

عبداللہ کا علیزے کا جائزہ لینا بے اختیار تھا۔

''ماشاء اللہ!'' عبداللہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ مجسم اُس کے آئیڈیل جیسی تھی، بے حد حسین اور معصوم، نگاہوں میں محسوس کیا جانے والا حیا کا عکس! ایک مکمل مشرقی تصور جو عبداللہ کے خیالوں میں چلتا رہتا تھا آج مجسم حقیقت بن کر اُس کا نصیب بن چکا تھا۔ وہ ولی کی منگیتر رہ چکی تھی یہ ملال بھی علیزے پر نگاہ پڑتے ہی جانے کہاں گم ہوگیا تھا۔

تم میرا نصیب تھیں میری دعا تھیں۔

تم کو تو میرا ہی ہونا تھا!

عبداللہ کا دِل بے اختیار پکارا۔ علیزے کے پیچھے اِس قدر دعائیں تھیں کہ اُس کی زندگی کا مشکل ترین رحلہ اللہ نے خود ہی آسان کر دیا تھا۔ عبداللہ کے دل کے اندر، مریم بی بی کے دل کے اندر، علیزے کے لیے محبت اور گنجائش پہلی ہی نظر میں ڈال دی تھی کیوں نہ ڈلتی! کسی نے بے حد دل سے علیزے کی الیوں کو مانگا تھا اپنے دل کو دار پر چڑھا کر اُس کا مستقبل محفوظ کیا تھا، علیزے جب انور صاحب کے کرے کی جانب بڑھنے لگی تو حسن آرا بیگم نے ایک دم اُسے کندھے سے پکڑ کر روکا اور سا سائیڈ پر لے اکر اُس کا چہرہ اوپر کیا۔ وہاں اتنی اُداسی تھی کہ حُسن آرا بیگم کا اپنا دِل بھی لرز گیا۔

''علیزے! میں تجھ سے کچھ نہیں کہوں گی سوائے اِس کے کہ اگر باپ کی زندگی کی خاطر تم نے اپنے ل کی قربانی دے ہی ڈالی ہے تو اُسے ہنسی خوشی نبھا کر بھی دکھاؤ۔ تیری آنکھوں کی یہ اُداسی تیرے باپ کو دوبارہ مار ڈالے گی، اگر تو چاہتی ہے کہ وہ زندگی کی دہلیز کے کنارے لگ جائے تو اپنی آنکھوں کی داسی کسی ضائع شدہ چیز کے چھلکے کی طرح اُتار کر اِسی دروازے کے باہر پھینک کر جا، ورنہ تیری قربانی ی ضائع جائے گی اور تیرے باپ کی زندگی بھی!'' حسن آرا بیگم کی بات پر علیزے نے بے اختیار لب اٹے۔

''امی!'' دو آنسو ضبط کرتے کرتے بھی نکل آئے۔

''بس!''حسن آرا بیگم نے اُس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کام بڑا کیا ہے تو دِل بھی بڑا کر! دیکھنا تیری اِس تابع داری کو اللہ سوہنے نے اتنے بھاگ لگانے ہیں کہ سارے ملال ڈھل جائیں گے انشاء اللہ!'' ماں کی تسلی پر علیزے نے اثبات میں سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔

عبداللہ تھوڑے فاصلے پر کھڑا مسلسل اُسے دیکھ رہا تھا۔

''ارے! تم دلہن کو کیسے دیکھ رہے ہو اب تو وہ تمہاری اپنی ہے۔'' مریم بی بی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''امی! یقین نہیں آ رہا کہ جسے میں تصور میں کئی بار دیکھ چکا تھا وہ مجسم حقیقت میں بھی موجود تھی حیرت کی بات ہے نا والدہ!'' عبداللہ نے مسکراتے لبوں سے سرگوشی کی۔

''دعائیں جب قبول ہوتی ہیں تو حیرت نہیں شکر ادا ہونا چاہیے، یہ تمہارے پاپا کہتے ہیں۔'' مریم بی بی نے کہا تو عبداللہ نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

''آپ پاپا کو بہانے بہانے سے یاد کر رہی ہیں، اُن کو Miss کر رہی ہیں نا؟'' عبداللہ نے ماں سے کہا۔

''ہاں!'' اُن کے ساتھ اور اُن پر Depend کرنے کی اس قدر عادت ہو چکی ہے کہ ہر لمحہ جو اُن کے بغیر زندگی میں آتا ہے بالکل ادھورا لگتا ہے۔'' مریم بی بی نے بے حد جذب سے کہا۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہو؟'' مریم بی بی نے عبداللہ کے ہاتھ میں موبائل دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''والدہ! آپ کے جذبات پاپا تک ڈائریکٹ جا رہے ہیں۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطلب؟'' مریم بی بی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مطلب میں نے آپ کے کہے کو ریکارڈ کر کے پاپا تک پہنچا دیا۔" عبداللہ نے مسکراتے ہوئے موبائل دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"امی! ایک بات پوچھوں؟" عبداللہ نے ماں کے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کہو!" مریم نے اجازت دی۔

"پاپا بھی آپ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا کہ آپ؟" عبداللہ نے پوچھا تھا۔

"جو وہ کرتے ہیں اور جو وہ نبھا چکے ہیں وہ محبت کے درجوں سے کہیں بلند ہے!" مریم بی بی نے کھوئے لہجے میں کہا۔

"مطلب؟" اِس بار عبداللہ الجھا تھا۔

وہ باتیں کرتے کرتے ہسپتال کے لان میں آ بیٹھے کیوں کہ اندر زیادہ افراد کا رُکنا منع تھا اِس لیے مریضوں کے بہت سارے عزیز، رشتے دار لان میں بیٹھے تھے کچھ تیز دھوپ میں لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔ مریم اور عبداللہ بھی اُن کے بیچ موجود ایک بینچ پر جا بیٹھے۔

"وہ تو ایک شجرِ سایہ دار جیسے ہیں!" مریم بی بی کے چہرے پر محبت بھرے رنگ تھے۔

"Husband Worship؟" عبداللہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"نو! یہ ان باتوں، اِن رشتوں سے زیادہ ہے کیوں کہ تمہارے پاپا نے جو رشتہ نبھایا ہے اُس کا مقام بھی بہت بلند ہے، تمہارے پاپا بے حد عظیم انسان ہیں۔" مریم بی بی نے صدقِ دِل سے ڈاکٹر فیصل کی گواہی دی۔ عبداللہ اُن کی کسی بات کے بیک گراؤنڈ کو نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی ماں کو دیکھ کر عقیدت سے مسکرا دیا۔

"میں بھی! میں بھی علیزے کے ساتھ اتنا اچھا Relation Ship بناؤں گا کہ وہ بھی میرے لیے بہترین گواہی دے گی! میں اُسے بہت پیار دوں گا، جیسے میرے پاپا نے میری امی کو دیا۔" عبداللہ نے عہد کیا۔

❖❖○❖❖

میں اب
سو جانا چاہتی ہوں!
میں اور میری روح تمام زیست
مسلسل مشقت
مسلسل حالتِ سفر رہی ہے!
اب میں تھک گئی ہوں!
میں اب
سونا چاہتی ہوں!
میری زندگی جو ایک کڑے دن کی طرح
گزری ہے!

جس میں میری کوئی اپنی رات نہ تھی
زمانے چیختے رہے میرے کانوں میں
خموشی کیسے ہوتی
مری آنکھوں میں سورج آ بسے تھے
رات کیسے ہوتی؟
لیکن اب
میں اب سو جانا چاہتی ہوں!

"ہیلو!"

"ترنم!" ماہی کی آواز میں عجیب طرح کا جوش تھا ترنم نے واضح طور پر محسوس کیا۔

"کیا حالات ہیں۔" ماہی نے سوال کیا۔

"بہت بُرے ہیں! باہر کی سیکورٹی کو تھوڑی سُن گُن مل گئی ہے کہ کوئی لڑکی مِس ہے اِس لیے تمام لڑکیوں کی ڈیوٹی لسٹ دیکھی جا رہی ہے کہ آج کون کون سی لڑکی کی **Booking** تھی۔" ترنم نے اپنی آواز مدھم کر کے کہا۔

"اوہو! یہ تو بہت بُرا ہوا۔" ماہی نے کہا۔

"کیوں کہ آج میری کوئی بکنگ نہیں ہے اور میں بھی اپنی جگہ سے غائب ہوں اس طرح تو صاف میں پکڑی جاؤں گی۔" ماہی نے صاف آواز میں کہا اِس وقت اُس کے لہجے میں بے حد بے خوف تھا۔

"تم جلد از جلد نگی کو پہنچا کر واپس آؤ، ابھی مارک اور میڈم نہیں آئے۔" ترنم نے کہا۔

"میری جان! واپس آنے کے لیے کون یہاں سے نکلا تھا۔" ماہی کی ہنسی بہت دنوں بعد اتنی کھل کھلاتی تھی۔

"تو پھر؟" ترنم نے گھبرا کر پوچھا۔

"ترنم! میری بات غور سے سنو! تمہارے پاس بہت کم وقت ہے اگر تم نے یہ وقت نہ پکڑا تو اپنی موت کو بھی ضائع کر دو گی، ساری زندگی تو گناہ میں ضائع کر ڈالی، کم از کم ہماری موت تو با مقصد ہو، کچھ آسانی روح کے برتن میں بھی آ جائے۔"

"مطلب؟" ترنم نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میں یہاں سے غائب ہوں گی تو سب سے پہلے تم کو پکڑ کر مارا جائے گا کہ تم ہی میری واحد دوست اور قریب ترین روم میٹ تھیں، یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے اِس لیے تمہارا بھی اب یہاں رُکنا خطرے سے خالی نہیں، دوسری بات مارک کے ساتھی کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ سکتے ہیں، اُن کے ہاتھ لمبے ہیں ہم صرف اُس صورت میں بچ سکتے ہیں، جب ہم اُن کو تھوڑا دھوکہ دیں۔ جب تک فارق آ نہیں جاتا ہم میں سے ایک نگی کو لے کر محفوظ مقام تک پہنچے اور دوسرا مارک کو اپنے پیچھے لگائے رکھے، اس طرح وہ لوگ فوری طور پر ہم کو ٹریس نہیں کر پائیں گے اور نگی بچ جائے گی۔ دوسری صورت میں ہم تینوں کا انجام بہت بُرا ہوگا۔" ماہی نے بے حد سمجھ داری سے ساری صورت حال بیان کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لیکن میں نکلوں کیسے؟'' ترنم نے گھبرا کر پوچھا۔

''تم میڈم راگنی کے کمرے تک کسی طرح پہنچو وہاں پر اُن کی ڈریسنگ کے پیچھے سے راستہ نکلتا ہے اِس کے ساتھ کوئی سیکورٹی الارم نہیں لگا ہوا، یہ تمہیں فوراً باہر کا راستہ دے گا۔''

''لیکن ان کے کمرے کے چپے چپے پر کیمرے لگے ہیں۔'' ترنم نے کہا۔

''وہ تو ویسے بھی پتا چل جانا ہے کہ ہم دونوں نے ہی یہ بغاوت کی ہے، کیمرے میں آ گئیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' ماہی نے پُرسکون ہو کر کہا۔

''تمہیں اس راستے کا کیسے پتا چلا؟'' ترنم پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''تم بہت بھولی ہو! اگر مجھے موت کی لذت کی آشنائی نہ ہوئی ہوتی تو میں نے کہاں سُدھرنا تھا میں بھی تو اِس سسٹم کا حصہ بن کر خوش تھی۔ بہر حال تم جلدی کرو۔'' ماہی نے کہا۔

''لیکن ماہی! میں وہاں سے بنا گاڑی کے کیسے نکلوں گی؟'' ترنم نے پریشانی سے کہا۔

''جمی باہر گاڑی چھوڑ کر جا چکا ہے، چابی گاڑی کے میٹ کے نیچے ہے۔'' ماہی نے عجلت میں کہا۔

''اور تم؟'' ترنم نے سوال کیا۔

''میں تم سے دوبارہ رابطہ کرتی ہوں، اللہ نگہبان۔'' ماہی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

اور وہ جو ہمیشہ کہتی تھی کہ اِس بند قلعے میں باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے آج وہاں اُسے بھی دروازہ مل ہی گیا تھا اور وہ اُسے کسی صورت گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

ترنم نے اپنا بیگ گلے میں ڈالا اور جاگرز پہن کر ایک چادر سے خود کو لپیٹا اور باہر بھاگی، اُس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہ تھے کیوں کہ سکیورٹی کسی بھی وقت اِس منزل پر پہنچ کر لڑکیاں گننے والی تھی۔ اللہ کا شکر تھا کہ مارک اور میڈم راگنی قسمت سے کسی بڑے پروجیکٹ کے لیے اکٹھے باہر تھے ورنہ تو چند منٹ کیا چند پل بھی نصیب نہیں ہونے تھے۔

''اللہ جی! مدد کریں!'' ترنم نے پھولی سانسوں اور کپکپاتے ہاتھوں سے راگنی کے کمرے کے دروازے کو کھولتے ہوئے دُعا کی۔ اُس کے کان موت کی آہٹ کو واضح طور پر سُن سکتے تھے۔

''جلدی کرو ترنم!'' اُس نے خود کو حوصلہ دیا اور دروازہ پار کر گئی۔

❖❖○❖❖

''بی بی جی!'' وہ بی بی کچھ نہیں کھا رہی، بیج دہاڑ سے بھوکی ہے، کہتی ہے اُسے گھر جانا ہے۔'' ملازمہ نے آ کر نفیسہ بیگم کو اطلاع دی۔

''چلو میں چلتی ہوں، مسکان کی بیوٹیشن کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی ورنہ تو میں پہلے ہی جا رہی تھی جانے دماغ سے یہ بات کیوں نکل گئی۔'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''تم ایک اور تازہ کھانے کی ٹرے لاؤ، میں ابھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔'' نفیسہ بیگم بھی اُس کے ساتھ فوراً چل دیں۔

''جی بی بی جی!'' ملازمہ نے تابع داری سے سر ہلایا اور باہر نکل گئی جب کہ نفیسہ بیگم خراماں خراماں نگینہ کے کمرے کی جانب بڑھی تھیں۔

مجھے پہلے ہی بچی سے مل کر اُسے تسلی دینی چاہیے تھی بھلا وہ کیا سوچتی ہوگی اور کتنی ڈر بھی گئی ہوگی! کس قدر بڑی کوتاہی کی، میں نے بہت بُرا کیا ہے۔'' وہ تاسف سے باآواز بلند بول رہی تھیں اور خود کو ادہ کوس رہی تھیں۔

جیسے ہی انہوں نے ملازمہ کے بتائے ہوئے کمرے میں قدم رکھا وہ تو جیسے بُت بن گئیں۔

''یہ! یہ کون ہے؟'' بے اختیار انہوں نے پوچھا۔

''جی وہی لڑکی جو بڑے سائیں لائے ہیں۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

''لیکن یہ! یہ تو نگینہ نہیں ہے!'' نفیسہ بیگم کی آواز میں شاک تھا۔

انہوں نے ایک نگاہ اُس سانولی سی روتی بلکتی لڑکی کو دیکھا جو مرغی کی طرح بیٹھی تھی اور زار زار رو رہی تھی۔

''یہ! یہ کون ہے؟'' نفیسہ بیگم نے تھک کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''یا اللہ! اب کوئی اور امتحان؟ اگر ولی کو اپنی بہن نہ ملی تو مسکان کا نکاح کیسے ہوگا۔''

''وزیراں!'' انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔

''جی! بی بی جی!'' ملازمہ تابع داری سے آگے بڑھی۔

''سید سرفراز علی کو فوراً بلاؤ! کہنا غضب ہو گیا!'' انہوں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر اُس سانولی لڑکی کو دیکھا اور ماتھا بے اختیار پکڑ لیا۔

''اب۔اب کیا ہوگا؟''

یہ سوال بھوت بن کر اُن کو ڈرا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''سائیں! دولہا آپ سے پہلے ملنا چاہتا ہے!'' سید سرفراز علی کے ملازم خاص نے آ کر کہا۔

''کیوں؟ تم نے بتایا نہیں کہ ہمارے ہاں دولہے کو نکاح سے پہلے دیکھنا بدشگونی ہوتی ہے۔'' سید سرفراز علی نے گردن اکڑا کر کہا۔ کیسے سب کچھ اُن کی مرضی سے ہونے جا رہا تھا۔

''سائیں! وہ نہیں مان رہا، آپ اُس سے فون پر بات کر لو۔'' ملازم خاص نے اپنے مالک کو اچھا مشورہ دیا تھا۔

''لاؤ کر لیتے ہیں بات بھی!'' سید سرفراز علی کا موڈ بے حد اچھا تھا۔

''ہاں بچے! کیا ہم پر اعتبار نہیں ہے؟'' سید سرفراز علی نے چہکتے ہوئے کہا۔

''اعتبار! ہونہہ!!''

''جس طرح آپ نے مجھے یہاں بلوایا ہے میری بہن کو اغوا کر کے مجھے مجبور کیا ہے ایسے میں، میں آپ پر اعتبار کیسے کر لوں۔'' ولی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

سید سرفراز علی بے اختیار ہنسے، اُن کو اِس وقت کوئی بات بُری نہ محسوس ہو رہی تھی۔

''ارے نہ کرو غصہ! اب تو خوشی کی بات ہونے جا رہی ہے، سب ملال ختم کرو۔ اگر تمہارے باپ نے ہماری بات عزت سے رکھ لی ہوتی تو مجھے کبھی دوسرا رستہ اختیار نہ کرنا پڑتا اس میں ہمارا قصور کم ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سید سرفراز علی نے مطمئن انداز میں کہا تو عبدالولی نے بے اختیار ہونٹ بھینچ لیے وہ کوئی سخت بات کر حالات خراب کر کے اپنی بہن کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہ چاہتا تھا۔

”مجھے اپنی بہن سے بات کرنی ہے، اُس سے ملنا ہے میں پھر ہی اِس نکاح نامے اور آپ کی اِ بھر شرائط پر سائن کروں گا۔“ عبدالولی نے اٹل لہجے میں کہا تو سید سرفراز علی کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے لڑکا اُن کی سوچ سے زیادہ تگڑا، ہوشیار اور بہادر تھا اِس کے ساتھ ساتھ بے حد ذہین بھی تھا۔

”تم اس سے ابھی بات کر سکتے ہو، ہاں نکاح کے فوراً بعد ہم تمہاری ملاقات تمہاری بہن کروا دیتے ہیں۔“ سید سرفراز علی نے بے حد سفاک لہجے میں کہا۔

عبدالولی کا شدت سے دِل چاہا کہ کاش اُس نے زندگی میں کوئی گالی سیکھی ہوتی، وہ اِس وقت گالی کا استعمال سید سرفراز علی کے لیے کرتا۔

”مجھے اپنی بہن سے بات کرنی ہے۔“ ولی نے غصّے سے اصرار کیا۔

”ٹھیک ہے بات کر لو، لیکن ملاقات نکاح کے بعد!“ سید سرفراز علی نے بے حد فیاضی دکھائی۔

ولی کے اندر اِس قدر غصّے کا ابال اٹھا کہ اُس سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ غیرت کو رشتے کی میں جب جب باندھا جاتا ہے تب تب بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ولی کے ہاتھ اور زبان اپنی بہن کی سا کی وجہ سے بندھے ہوئے تھے ورنہ وہ اتنا مجبور تو ہرگز نہ تھا کہ سید سرفراز علی کو منہ توڑ جواب نہ دے سا

”ٹھیک ہے پہلے میری نگی سے بات کروائیں۔“ ولی نے تھک کر ہتھیار ڈالے۔

”کروا دیتے ہیں جناب، ابھی کروا دیتے ہیں میرا بندہ آپ کے پاس فون لے کر آ رہا ہے آپ کریں، جتنی مرضی تسلی کریں لیکن آپ کے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔“ سید سرفراز علی نے مسکرا کر بند کر دیا۔

❖❖○❖❖

”ماہی! تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ ترنم نے اس کو کندھوں سے تھام کر بے چینی سے پوچھا۔

”یہ ضروری ہے یار!“ ماہی نے بے حد احتیاط سے نگی کے نڈھال وجود کو بانہوں میں لے کر تر گاڑی میں لٹایا۔

”لیکن تمہاری جگہ میں بھی تو جا سکتی تھی!“ ترنم نے ماہی کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

”نہیں! ابھی تم کو بہت جینا ہے میری جان!“ ماہی نے ترنم کے گلے لگ کر کہا۔

”ماہی!“ ترنم نے اُسے دوبارہ گلے سے لپٹا کر پیار کیا۔

”نہ جاؤ! ہم دونوں اکٹھے ہی چلتے ہیں۔“ ترنم نے اُسے ایک بار پھر روکا۔

”اگر میں نہ گئی تو ہم تینوں مارے جائیں گے، اگر میں جاؤں گی تو تم دونوں بچ جاؤ گی اور پلیز معصوم روح پر ترس کھاؤ اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ، اگر یہ لڑکی اُن بھیڑیوں کے ہاتھ لگ گئی تو ساری محنت بیکار جائے گی۔“ ماہی نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”ترنم! اب فوراً نکلو ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی، نگی کے زخموں سے بہت زیادہ خون بہہ چکا میڈیکل ایڈ کی فوراً ضرورت ہے، دیکھو بخار سے اِس کی آنکھیں تک نہیں کھل رہیں اور ہاں یہ کچھ

اات ہیں اور یہ موبائل! اس میں موجود سم ابھی استعمال نہیں ہوئی اس کے میموری باکس میں میرے اا کے نمبر ہیں اور لاکرز کی چابیاں تم کو سکارنا بازار کی مصباح سے ملیں گی۔ تم اُس رقم سے یہاں سے لر بہت اچھی زندگی گزار سکتی ہو، یہ رقم میں نے اپنے بڑھاپے کے لیے محفوظ کی تھی!“ ماہی نے ٹوٹے اکا جیسی ہنسی ہنستے کہا۔

”انسان کتنا کچھ پلان کرتا ہے نا ترنم!“ ماہی نے ترنم کے لگاتار بہتے آنسو اپنی پوروں میں لیتے ئے روہانسی آواز میں کہا۔

”لیکن انسان بھول جاتا ہے کہ مین پلانر تو صرف اللہ ہے! یہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔“

”ہم پہلے کیوں نہیں سوچتے کہ ضروری نہیں ہے ہر انسان بچپن، جوانی اور پھر بڑھاپے کی Stage کو Meet کرے۔“ ماہی کے اندر بہت سارے پچھتاوے اکٹھے ہو کر بول رہے تھے۔

”اچھا! الوداع!“ ماہی نے اُس کے ہاتھوں کو زور سے دباتے ہوئے کہا۔

”الوداع؟“ ترنم نے سوالیہ نظروں سے کہا۔

”ہم پھر ملیں گے!“ ترنم نے شاید خود کو حوصلہ دیا تھا۔

”نہیں چندا! تم Reality کو کیوں اگنور کر رہی ہو، تم میرے لیے دعا کرنا کہ میری منزل آسان ۔“ ماہی کہہ کر رکی نہیں بلکہ فوراً گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی ریورس کی اور تیزی سے نکال لے گئی۔ اُڑتی ل نے ترنم کی آنکھوں میں ایک بار پھر مرچیں بھر دیں۔ وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، جانتی اکہ وہ ماہی کو آخری بار زندہ دیکھ رہی ہے۔ ترنم کچھ منٹ وہیں بیٹھی روتی رہی پھر چادر سے اپنا منہ ل کر کے گاڑی کی جانب بڑھی، جہاں نگی زخموں اور بخار کی شدت سے چُور بے ہوش پڑی تھی۔

”یا اللہ! طارق کو جلدی بھیج دے، میں اکیلی ہسپتال بھی نہیں جا سکتی، مارک کے بندے یقیناً نگی کی حالت کی وجہ سے ہسپتالوں میں چیک کر رہے ہوں گے۔ اب جب تک نگی محفوظ ہاتھوں میں نہیں مجھے اِس کو لے کر کہیں چھپنا ہوگا۔ لیکن کہاں؟“ ترنم خود کلامی کرتے ہوئے ڈرائیو کر رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر نگی کو دیکھا، جو بالکل بے سُدھ تھی ترنم کے دماغ میں مسلسل جوڑ توڑ چل رہے ۔ اُس نے ایک بار پھر طارق کو فون کیا لیکن شاید اس کا فون اِس وقت Out of singale تھا اس رابطہ نہ ہو رہا تھا۔

ترنم نے فون آف کر کے فوراً ایک خطرناک فیصلہ لیا۔ اُس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جائے اور نگی کو خود اُس کے گھر پہنچا کر آئے۔

شہر جانا بہت خطرناک تھا لیکن اُس کے پاس اِس کے علاوہ کوئی آپشن نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماہی کچھ تک مارک اور اُس کے ساتھیوں کو بھٹکا کر رکھے گی، اتنی دیر تک ترنم کے پاس مہلت تھی۔

”اے اللہ! میری مدد کرنا! ترنم نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے دُعا کی۔

”ترنم! وہاں وہ بھی ہوگا!“ اس کے دل میں بیٹھے کسی چور نے کہا۔

”کون؟“ ترنم نے سوال کیا۔

”وہی جس میں تم کو پہلی بار انسان نظر آیا تھا، وہی جس کے نام پر تمہارا دِل دھڑکتا ہے تو تم کو احساس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا ہے کہ تم زندہ ہو، وہی واحد ہے جس سے تم اپنا یہ غلاظت بھرا ماضی چھپانا چاہتی ہو، وہی
سامنے تم ایک اچھی لڑکی بنے رہنا چاہتی ہو۔‘‘ اُس کے اندر بیٹھے چور نے کہا۔

’’تم اگر نگینہ کو اُس کے گھر چھوڑ کر آ ؤ گی تو تمہاری اصلیت تو کھل جائے گی نا۔‘‘ اُس کے اندر
چور نے اُسے ڈرایا۔

’’زندگی ایک پُر خار کی طرح گزری ہے کچھ خار، کچھ کانٹے اور کچھ خاک اوڑ سہی!‘‘ ترنم نے
صاف کر کے خود سے کہا۔

’’تمنا کی وادی میں حریص ہمیشہ منہ کی کھاتے ہیں، میں نے تو سارے سودے ہی نقصان کے
تھے پھر ڈر کیسا؟ یہ پہلا سودا ہوگا، جو میری ذات سے ہٹ کر ہے شاید کچھ خسارے کا احساس
جائے گا۔‘‘ ترنم نے خود کو تسلی دی، اُسے ایک دم گاڑی روکنی پڑی، اُسے شک سا ہوا تھا کہ سڑک پر
موجود گاڑیوں میں سے ایک گاڑی رانی میڈم کے کارندوں کی ہے۔

’’میرے اللہ! کیا کروں؟‘‘

ترنم کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔

❖❖○❖❖

نشاں اس کے ہیں سب اور بے نشاں وہ ہے
چراغ اور اندھیرے کے درمیاں وہ ہے
میں ہوں درد کی دستک، درِ اماں وہ ہے
زبانِ اشک سے میں مانگتا ہوں دعا
بے شک بے شک وہ ہے
بڑا رحیم، نہایت ہی مہرباں وہ ہے

احمد شاہ نے سر سجدے سے اٹھایا تھا کہ انہیں محسوس ہوا شاید روشن آرا بیگم نے اُن کو پکارا ہے۔
کے کمرے میں ہی جانماز بچھا کر نفل حاجت ادا کر رہے تھے۔

’’شاہ جی!‘‘ روشن آرا بیگم نے اپنی سوجی آنکھیں بہ مشکل کھول کر اُن کو پکارا۔

’’روشن! تم ٹھیک ہو؟‘‘ احمد شاہ نے بے حد محبت سے اُن کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

’’شاہ جی! اب آزمائش جھیلی نہیں جاتی، اب صبر نہیں ہوتا۔‘‘ روشن آرا بیگم نے بے بسی سے سر
ادھر اُدھر پٹخا۔

’’روشن! تم تو بہت بہادر ہو، بہت صبر والی ہو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے، کچھ صبر کرلو۔‘‘ احمد
نے اپنے دل کی پریشانی کو دبا کر کہا۔ خود اُن کا دل تھا کہ گھبرائے جارہا تھا۔

’’آپ کے اندر ہے اتنا صبر، آپ بہت ظرف والے ہیں میرا ظرف بہت چھوٹا ہے میں، میں ہا
ہوں۔‘‘ روشن آرا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

’’آج سے بیس سال پہلے میں نے جو دنیا بنائی تھی جس میں، میں نے اپنی مرضی کے رنگ بھرے
آج وہ پرائے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے میں اپنے بچوں کو نہیں بچا پائی۔‘‘ روشن آرا بیگم کے دل

رہا تھا۔

! نہ کہو ایسے! تم تو میری مضبوطی ہو۔ تم ہمیشہ میرے کم زور لمحوں کی مضبوطی اور مضبوط لمحوں کی
رہی ہو، لیکن تمہاری مضبوطی ہی نے مجھے آج تک احساس نہیں ہونے دیا کہ میں لاولد ہوں۔
اللہ نے ہمیں پہلے بے نام و نشان نہیں رہنے دیا اب کیوں وہ ہمیں اکیلا کرے گا، تم اُس پر
رکھو دیکھنا، وہ تو ہمیشہ بھروسے قائم رکھنے والا تو ہے، بس تھوڑا سا انتظار۔‘‘ احمد شاہ سمجھا تو روشن آرا
ہے تھے لیکن آگ اُن کے من میں بجھ رہی تھی، کوئی چیز اُن کے اندر کو شانت کررہی تھی۔
انہونی کے آنے کا احساس وقت سے پہلے اندر سے صاحب حال لوگوں کو ان شانت کر دیتا ہے
رح سے اب سب ٹھیک ہوجائے گا کا احساس بھی سب سے پہلے اِن ہی لوگوں کو ملتا ہے۔ جانے
احساس احمد شاہ کو اسی پل ہوا تھا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

ب ٹھیک ہوجائے گا نا؟‘‘

ری بچی مل جائے گی نا؟‘‘

ی سلامتی سے واپس آجائے گا نا؟‘‘

آرا بیگم نے بچوں کی طرح سوال کیا۔

! انشاء اللہ تعالیٰ!‘‘ احمد شاہ نے ٹھوس اور مضبوط لہجے میں کہا۔

پل اُن کے موبائل پر طارق کی کال آئی۔

کی کال تھی کہ دھماکہ!

یک ہے بیٹا! تم نمبر میسج کرو، میں اُس بچی سے بات کرتا ہوں اور اُن کو خود لے کر آتا ہوں۔‘‘ احمد
ے بے چینی سے کہا۔

نے احمد شاہ کو ترنم کا نمبر سینڈ کیا تا کہ وہ اُس کی لوکیشن پتا کر کے نگی کو فوراً لے آئیں، وہ اتنے
فاصلے پر تھا کہ فوراً آنا ممکن نہ ہورہا تھا۔

کیا ہوا شاہ صاحب؟‘‘ روشن آرا بیگم نے نڈھال لہجے میں پوچھا۔

گی کو سید سرفراز علی نے اغوا نہیں کیا۔‘‘ احمد شاہ نے ماتھے کو پریشانی سے مسلتے ہوئے دھماکہ کیا۔

ک۔ کیا؟‘‘

تو پھر میری بچی کہاں ہے۔‘‘ روشن آرا بیگم نے پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔

وہ کسی لڑکیاں اغوا کرنے والے گروہ کے پاس تھی لیکن وہاں موجود ایک بچی نے جان پر کھیل کر
وہاں سے نکال لیا ہے، اب وہ نگی کو بہ حفاظت ہم تک لانا چاہتی ہے لیکن وہ بچی بھی شہر سے باہر
ی لیے طارق کا فون تھا کہ میں فوراً اُن تک پہنچوں، ورنہ خدانخواستہ اُن کی جان کو خطرہ ہے۔‘‘ احمد
بات پر روشن آرا بیگم کا رنگ فق ہوگیا۔

میرے اللہ! اب کیا ہوگا؟‘‘ روشن آرا بیگم نے بے اختیار کہا۔

’’آپ اکیلے جاؤ گے؟‘‘ روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

دیکھتا ہوں۔‘‘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم پریشان نہ ہونا، دُعا کرنا، میں منیجر کو کہتا ہوں اُس کی وائف آ جائے گی تمہارے پاس، کچھ دیر میں سائرہ بھی آ جائے گی، میں تم سے رابطے میں رہوں گا، تمہارا موبائل سائیڈ ٹیبل پر ہے۔'' احمد شاہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے۔

''اے اللہ! تیرا ہی آسرا ہے! اگر یہ مشکل تیری جانب سے آئی ہے تو اِس مشکل سے نکالنے والی ذات بھی تیری ہے۔ مدد کر، میرے خاندان کی حفاظت فرما۔'' روشن آرا بیگم نے صدق دل سے دُعا کی

❖❖○❖❖

عصر کے کناروں تک
آفتاب آ پہنچا
اور صحنِ دل میں بھی شام ہونے والی ہے
یاد کے درختوں پر جھنڈ ہیں پرندوں کے
آنکھ میں گزرتے پل خواب جیسے لگتے ہیں
کوئی دھیان کی انگلی تھام کر لے جائے
بارشوں میں، پھولوں میں
چاندنی میں، تاروں میں
بچپنے کے موسم میں محفلیں بہت سی ہیں
بے خودی کے عالم میں
میں تو جانا چاہوں گی
ہر طرف مگر اب تو
عصر کے کناروں تک آفتاب آ پہنچا
اور صحنِ دل میں بھی شام ہونے والی ہے

''بتاؤ تم نے لڑکی کہاں بھگائی ہے؟'' مارک نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ وہ ماہی کو مار مار کر تھک گیا تھا لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔

ماہی کی آنکھیں مار کھا کر نیل پڑنے سے سوجی ہوئی تھیں ایک آنکھ تو کھلی ہی نہ رہی تھی اُس نے بمشکل ایک آنکھ کھول کر مارک کو دیکھا اور مسکرا دی۔

''تُو سالی!'' مارک نے اپنے بوٹوں سے ماہی کو مزید کچلا، اُسے اس کی مسکراہٹ آگ لگا گئی تھی۔

''بول! کہاں ہے لڑکی؟'' وہ تو غصّے سے ایسے ناگ کی طرح بل کھا رہا تھا جو شکار نہ ملنے پر پاگل ہوا مزید زہریلا ہو جاتا ہے۔

''وہ اب تمہاری پہنچ سے دور ہے، اب وہ تم کو کہیں نہیں ملے گی۔'' ماہی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

''تو تُو نہیں بتائے گی کہ طارق کی بہن کہاں ہے؟'' مارک نے غصّے سے چلّا کر پوچھا۔

''طارق کی بہن؟'' ماہی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! اُس طارق کے بچے نے ہمیں اِس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ اب اُسے سبق سکھانا بہت ضروری تھا۔ اُس کی بہن کے ساتھ ہم نے وہ سلوک کرنا تھا کہ وہ کسی ریتیلے پہاڑ کی طرح نیچے آ جاتا، لیکن تم نے ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔'' مارک نے ماہی کو ایک اور ٹھوکر ماری۔

''بول کہاں ہے لڑکی؟ کیوں کہ لڑکی اتنی جلدی اِن حدود سے نہیں نکل سکتی اِس لیے وہ ہماری پہنچ سے نہیں نکل سکتی۔'' مارک با آواز بلند جوڑ توڑ کر رہا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم!'' ماہی نے پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے کہا۔ اُس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔

''یہ ایسے نہیں بتائے گی۔'' مارک نے غصّے سے تیزاب کی بوتل کا ڈھکن کھولا۔ یہ تیزاب وہ آخری حربے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

اس تیزاب کے ڈر سے ضدی سے ضدی لڑکی ان کے کہے کو ماننے لگتی تھی اور کبھی جو ایک آدھ نے نہ مانی وہ ہمیشہ کے لیے عبرت کا نشان بن کر رہ گئی تھی۔

کھولتے تیزاب کو ماہی نے بہ غور دیکھا۔

''اے اللہ! تو نے حضرت ابراہیم کو آگ کی تکلیف سے بچایا تھا، مجھ گناہ گار کے ساتھ بھی معاملہ اچھا فرمانا۔'' ماہی نے زمین پر سر رکھتے ہوئے دعا کی۔

اور پھر واقعی مارک نے دیکھا کہ کچے گوشت کی طرح تبدیل ہوتی ماہی نے ایک سی بھی نہیں کی، اُس نے آخری بار مسکرا کر آنکھیں بند کی تھیں، ایسے جیسے اُس کے منہ سر اور جسم پر تیزاب نہیں عرق گلاب ڈال کر ٹھنڈک پہنچا دی گئی ہو۔ مارک نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ماہی کو دیکھا اُسے لگا کہ آج شکستوں کا دن ہے پہلے ایک لڑکی بھاگ گئی، ایک ایسی قید جو بند موری کی طرح تھی، جہاں سے نکلنا ناممکن تھا لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ ناممکن کو ممکن کی گیم میں بدلنے والی صرف اور صرف ایک ہی باکمال ذات ہے اُس کے آگے بڑے بڑے ہی مین (He man) ڈفر بن جاتے ہیں۔ ایک اور لڑکی اس بری طرح مار کھا کر اور تیزاب سے جھلس کر مر گئی اُس نے مرنا پسند کیا لیکن مارک کے آگے سرنڈر کرنا پسند نہیں کیا اور ریت کی طرح اُس کے ہاتھوں میں آ کر پھسل گئی۔

''یہ! یہ تم نے کیا کیا؟'' مارک کے ساتھی نے پریشانی سے پوچھا۔

اُسے بھی یقین نہ آ رہا تھا کہ ماہی نے اتنی آسانی اور خوش دلی سے موت قبول کر لی۔ اُس نے مارک کو اتنا زیادہ غصّہ دلا دیا کہ وہ خود پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے بُری طرح ماہی کو مار ڈالا۔ اُسے ایک دم شدید قسم کی شکست کا احساس ہوا، اُس نے بے اختیار پورے زور سے تیزاب کی بوتل دیوار پر دے ماری، سارے کمرے میں جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

''میڈم راگنی کو کیا بتائیں گے، یہ تو مر گئی!'' مارک کے ساتھی کے لہجے میں پریشانی اور خوف بے حد نمایاں تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ میڈم راگنی کے نرم و نازک وجود کے اندر بے حد ظالم اور پتھر دل رہتا ہے جس کے فیصلوں کے آگے چھ چھ فٹ کے سانڈ بھی سر جھکاتے تھے اُس کی ناراضی پر کانپ جاتے تھے۔

''تم اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرو کہ طارق کے گھر کی سخت نگرانی کریں، جو بھی اُس لڑکی کو لے کر گیا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ضرور طارق کی بہن کو اُس کے گھر پہنچانا چاہے گا۔'' مارک نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''لیکن یہ دوسرا شخص کون ہے اور کس نے ماہی کی مدد کی تھی۔'' مارک نے سوال کیا۔

''سر! پانچ لڑکیاں ڈیوٹی پر ہیں، صبح تک معلوم ہوگا کہ اُن میں سے کوئی ماہی کے ساتھ تو نہیں لی ہوئی۔'' مارک کے پاس شاکر نے آ کر اطلاع کی۔

''کیوں! تم ابھی اُن کے کلائنٹس اور ڈرائیوروں کو فون لگاؤ، اگر ہر لڑکی ٹھکانے پر ہے تو پھر یہ کا ہماری کسی لڑکی کا نہیں بلکہ باہر سے کوئی بندہ انوالو ہے۔'' مارک نے شاکر کو حکم دیا۔

''سر! تین تو ٹریس ہوگئیں، وہ اپنے کلائنٹس کے ساتھ ہیں لیکن روجا، ترنم اور اُن کے ڈرائیوروں کے فون نہیں مل رہے اور دونوں کی ڈیوٹی آؤٹ آف سٹی تھی میں نے وہاں پر موجود اپنے کچھ ساتھیوں کو اُن کے ٹھکانوں پر بھیجا ہے یقیناً جلد اطلاع آ جائے گی۔ لیکن کچھ وقت لگے گا، شاید صبح ہو جائے۔'' شاکر نے کہا تو مارک نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اوئے! میں تم کو وہاں جانے کو نہیں کہہ رہا، وہاں ہمارے جو سورس بیٹھے ہیں وہ تو ہمیں اطلاع کر سکتے ہیں؟ تم جلد از جلد مجھے باقی دو لڑکیاں بھی کنفرم کرو، قسم ہے مجھے عیسٰی کی اگر ان میں سے کوئی لڑکی اس معاملے میں شامل ہوئی تو اُس کا انجام ماہی سے بھی ابتر ہوگا۔'' مارک نے اس کے جلے ہوئے وجود کو دیکھا۔ اُسے اب تک ماہی کی مرتے دم کی مسکراہٹ اور پُرسکون آنکھیں نہیں بھول رہی تھیں۔

''جاؤ مجھے جلد از جلد اطلاع دو، اس لڑکی کے جانے کا دُکھ اتنا بڑا نہیں، ہمیں اس بات کی سزا مل گئی ہے کہ ہمارے Set up میں جھول آ چکا ہے، Security اِس قدر ناقص ہو چکی ہے کہ دو کم زور لڑکیاں ہمیں ڈاج دے کر فرار ہو گئیں اور ابھی تک اُن میں سے ایک ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی، جاؤ فوراً اور ہر طرح کی حکمت عملی کام میں لاؤ۔ اور مجھے رزلٹ لا کر دینا، خالی اپنا چہرہ دکھانے مت آ جانا۔'' مارک دھاڑا، شاکر نے اُلٹے قدموں مڑنا ہی بہتر جانا۔

❖❖○❖❖

''یہ کچھ گڑبڑ ہے!'' مارک نے شوکت الفریڈ سے کہا، جو ابھی ابھی ایک چونکا دینے والی خبر لایا تھا۔ مارک نے طارق کے گھر نگرانی کروانے کا کہا تو شوکت نے آ کر عجیب سی بات بتائی کہ شاکر نے نگی کی بتائی ڈی جس گھر میں ڈیلیور کی تھی وہ طارق کا نہیں بلکہ اُس کے دوست کا گھر ہے کیوں کہ جو ایڈریس شوکت طارق کے دفتر سے لایا تھا وہ مختلف تھا۔

''ایڈریس کی گڑبڑ کیوں ہوئی شاکر؟'' مارک نے شاکر کو ایک بار پھر لائن حاضر کر لیا تھا۔

''کیوں کہ جو لڑکی ہم نے اغوا کی تھی وہ اُسی گھر سے صبح نکلی تھی اور ہم اُسے اتنے دنوں سے آتے جاتے نوٹ کر رہے تھے۔ آپ نے اُسی لڑکی کو اٹھانے کا آرڈر دیا تھا۔'' شاکر نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

''تو پھر! طارق کی بہن اُس کے دوست کے ہاں کیوں رہ رہی تھی۔'' مارک نے سوال کیا۔

''کہیں ہم نے غلط لڑکی تو اغوا نہیں کر لی؟'' شوکت نے بے حد اہم نکتہ اٹھایا۔

''نہیں، نہیں! لڑکی تو وہی تھی، جس کو میں نے طارق کے ساتھ دیکھا تھا۔'' مارک نے یقین سے

کہا کہ وہ کتنی ہی بار نگینہ کو طارق کے ساتھ دیکھ چکا تھا اس لیے اُس کا خیال تھا کہ نگینہ ہی طارق کی بہن ہے۔

''تو پھر وہ لڑکی طارق کے دوست کے گھر کیا کر رہی تھی؟'' شوکت نے پھر نکتہ اٹھایا۔

''ہوں! کچھ مختلف ہے ضرور!'' مارک نے اقرار کیا۔

''تم ایک بار پھر ٹھیک سے معلوم کرو، آخر بات کیا ہے ورنہ میڈم نے ہم سب کی تکہ بوٹی کروا دینی ہے۔'' مارک نے الجھتے ہوئے کہا۔

''جی سر!'' شاکر اور شوکت دونوں اکٹھے باہر نکلے۔

''خود تو لاٹ صاحب ایک کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں اور حکم چلاتے رہتے ہیں، پہلے کہا لڑکیوں کے ٹھکانے معلوم کروں، اب یہ نیا کام بھی سونپ رہا ہے۔ میں انسان ہوں، جن تھوڑی کہ ایک وقت میں کئی کام کروں۔'' شاکر نے بیزاری سے کہا۔

''اوپر سے اُس ہٹلر کی ماں کا ڈرا لگ ہے ابھی آئی نہیں ہے، جب آئی اور گڑبڑ کی بھنک اُسے ملی تو ہم میں سے کسی کی خیر نہیں ہوگی۔'' شوکت نے میڈم راگنی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چل یار! دیکھی جائے گی ابھی تو پتا کر لڑکیوں کا ٹھکانہ، میں طارق کے ایڈریس والا معاملہ دیکھ لیتا ہوں۔'' شوکت نے خود ہی کام تقسیم کیے اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم بیٹا!'' احمد شاہ نے کوئی تیسویں بار فون ملایا تھا تب جا کر ترنم نے ریسیو کیا۔

''آ۔ آپ کون بول رہے ہیں؟'' ترنم کی آواز سہمی ہوئی تھی، یہ نمبر صرف طارق کے پاس تھا کیوں کہ ترنم نے آخری بار طارق سے ہی بات کی تھی۔

''بیٹا! میں احمد شاہ بول رہا ہوں عبدالولی اور نگینہ بیٹی کا والد۔'' احمد شاہ نے فوراً وضاحت کی۔ انہیں ڈر تھا کہیں لڑکی ڈر کر فون بند نہ کر دے، طارق اُن کو تفصیل بتا چکا تھا کہ جس کے پاس نگینہ ہے وہ اس وقت اپنے گروہ کے کارندوں سے چھپتی پھر رہی ہے اور بے حد خوف زدہ بھی ہے۔

''جی، انکل! آپ نگینہ کو لے جائیں یہاں سے۔'' ترنم نے عجلت سے کہا۔

''میں نہیں چاہتی کہ اگر میں پکڑی جاؤں تو ساتھ میں دوبارہ نگینہ اُن کے ہاتھ لگ جائے اور ہماری ساری محنت بے کار چلی جائے۔'' ترنم نے جلدی جلدی کہا۔

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' احمد شاہ نے سوال کیا۔

''شہر سے دور ہائی وے کے قریب ایک کچی بستی ہے، فی الحال میں نے یہاں پناہ لی ہے کیوں کہ شہر جانے کے ہر رستے پر مارک کے آدمی گھوم رہے ہیں۔ وہ تو اللہ نے بال بال بچایا اور میں بہ مشکل گاڑی وہاں سے موڑ کر لائی ہوں۔'' ترنم نے لمبی بات کے اختتام پر طویل گہرا سانس بھرا۔

''نگی کیسی ہے، میری اُس سے بات کروا سکتی ہیں؟'' احمد شاہ نے ایڈریس سمجھ کر بیقراری سے کہا۔

''وہ بُری طرح زخمی ہے، مارک نے اُس کے بازوؤں اور پیروں کو سگریٹ سے جلایا تھا۔ زخموں کی وجہ سے اُسے بخار ہے اور وہ بے سُدھ سی ہے آپ سے کیا بات کرے گی، آپ بس جلدی آئیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُسے لے جائیں تا کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا سکیں۔'' احمد شاہ کے آنسو بے اختیار نکل آئے۔

''وہ تو نازک سی گڑیا تھی، جس کو انہوں نے سنبھال سنبھال کر، سینت سینت کر رکھا تھا۔ اُس کی معمولی تکلیف پر انہیں خود کتنی تکلیف ہوتی تھی، وہ کیسے سہہ سکتی تھی یہ درد اور تکلیف۔ میری گڑیا جانے کس حال میں ہوگی۔'' انہوں نے بے حد فکر مندی اور تکلیف سے سوچا۔ فون بند کر کے انہوں نے الماری سے ریوالور اور رقم نکالی اور اپنے دفتر کا گن مین بلایا۔ ساتھ میڈیکل ایڈ گاڑی میں رکھوایا۔

گن مین کو انہوں نے گاڑی کے پیچھے بیٹھنے کو کہا اور خود گاڑی چلانے کا فیصلہ کیا۔ یہ سب کچھ انہوں نے بے حد راز داری اور خاموشی سے کیا تھا کہ اُن کے گھر میں موجود نگرانی کرتے پولیس اہلکار بھی محسوس کر سکے کہ کچھ غیر معمولی تھا۔ یہ ہدایت طارق کی تھی کیوں کہ وہ نگی کے ملنے کی خبر کسی طور لیک آؤٹ نہیں کروانا چاہتا تھا تا کہ آسانی اور حفاظت سے نگی تک پہنچا جا سکے۔ احمد شاہ جیسے صابر اور مضبوط اعصاب کے مالک کا سارا وجود اِس وقت بے حد بے چین تھا۔ واقعی انسان اولاد کی آزمائش پر کم زور پڑ جاتا ہے انہوں نے چلنے سے پہلے ایک بار پھر ولی کو فون ملایا تا کہ وہ فوری طور پر اس کو سید سرفراز علی کی چال میں پھنسنے سے روک سکیں لیکن ولی کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔

احمد شاہ کو زندگی میں پہلی بار اِس قدر بے بسی کا سامنا ہوا تھا انہوں نے ماتھا مسلتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ نگینہ کی زندگی ہر بات سے اہم تھی۔

''یا اللہ! سید سرفراز کو ولی سے ملنے کے بعد کسی قسم کا شک نہ ہو، ورنہ میرے بچے کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اے اللہ تو سید سرفراز علی کی عقل اور آنکھوں پر پردہ ڈالے رکھنا تا کہ وہ ولی کی شکل میں اُس کی پہچان کو نہ ڈھونڈ لیں۔'' احمد شاہ نے صدقِ دل سے دُعا کی۔

❖❖○❖❖

میری نگاہوں کے سامنے
آگ کا اک الاؤ بھڑک رہا ہے
یہ آگ میری وصیت ہے
یہ شعلے میرا گناہ
یہ سیاہی میری نافرمانی
یہ سب میری سزا ہے
اور میری سزا یہی ہونا چاہیے تھی
میری سرکشی اور وعدہ خلافی مجھے لے ڈوبی
میں نے تو وہ مہلت بھی گنوا دی
جو ڈوبتے لمحوں میں اپنے معبود سے مانگی تھی
نیکی، معافی، دہائی کے
ایثار، عظمت، عبادت کے
سارے عزم بھول کر

اپنے دل کی معبد خانے میں
پھر سے بت سجا بیٹھی تھی!!

ترنم، نگی کے بال سہلاتے ہوئے مسلسل اِسی فکر میں تھی کہ اگر نگی کو عبدالولی لینے آیا تو وہ کبھی اِس دُکھ سے نہ نکل پائے گی کہ عبدالولی اُس کی سچائی جان گیا ہے کہ وہ ایک بُری لڑکی ہے۔ یا اللہ صرف ایک شخص! صرف ایک شخص کے سامنے میں چاہتی ہوں کہ کبھی میرا بھرم نہ ٹوٹے۔'' ترنم نے بے چینی سے سوچا۔

''باجی!'' اُسی پل پیچھے آ کر کسی نے آواز دی۔

''آؤ رانی آ جاؤ!'' ترنم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''باجی! میں اتنی خوش ہوں آپ کے آنے سے کہ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آ رہی میں کیا کروں؟'' رانی نے چمکتے چہرے کے ساتھ کہا۔

''رانی! تم بہت اچھی ہو!'' ترنم کہے بنا نہ رہ سکی۔ اُسے واقعی رانی بہت اچھی لگی تھی تب ہی تو جب وہ اِس علاقے میں آئی تو وہ خود بہ خود رانی کے گھر آ گئی تھی اُسے اپنا گھر ابھی تک یاد تھا۔

اُسے اُس کے گھر گزاری وہ رات اور پڑھی نماز اب تک یاد تھی۔ اُسے رانی کا معصوم اور پاکیزہ چہرہ بھی یاد تھا۔

جب وہ رانی کے پاس آئی تو اس کو ایک بار پھر یقین نہ آیا کہ وہ حسین پری جس کے حسن کو وہ اب تک نہ بھلا پائی تھی ایک بار پھر اُس کے گھر آئی ہے خوشی اور حیرت نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا اس بار اس کے ساتھ ایک پیاری لڑکی بھی تھی، وہ بھی رج کر سوہنی تھی۔ رانی، ترنم کو دوبارہ دیکھ کر بے حد خوش تھی۔

''جاوید کب تک آ جاتا ہے؟'' ترنم نے احتیاط کے طور پر پوچھا۔ کچھ بھی تھا جاوید، میڈم راگنی کا بندہ تھا ایسے میں جب سب اُسے تلاش کر رہے تھے جاوید کے گھر رکنا خطرے سے خالی نہ تھا وہ کسی بھی پل یہاں اُن کی موجودگی جان کر مخبری کر کے اُن کو پھنسا سکتا تھا۔ بے شک جاوید باقی سب سے مختلف تھا لیکن پھر بھی ترنم اُس پر اعتبار نہ کر سکتی تھی۔ جو شخص مذہب اور روایات کے اتنے قریب رہ کر بھی گناہ کا ساتھ دیتا تھا، وہاں کی روزی کھاتا تھا اُس کا اعتبار کرنا ترنم کے لیے مشکل تھا۔ لیکن اُسے رانی پر اعتبار تھا وہ سادہ دِل اور بہت اچھی لڑکی تھی پھر اتفاق سے وہ اُن کے علاقے میں تھی رانی کے علاوہ وہ یہاں کسی اور کا گھر بھی نہ جانتی تھی، اس لیے اُس نے مجبوراً سہی لیکن فیصلہ لیا تھا کہ وہ چند گھنٹوں کے لیے رانی کے ہاں پناہ لے گی۔

''باجی! جیدا تو رات گزار کر صبح سرگی ویلے آتا ہے جانے کیسا کام ہے، جو ساری رات ہوتا ہے اور سرگی ویلے جا کر ختم ہوتا ہے۔'' رانی کی بات پر ترنم نے بے اختیار نگاہیں چُرائیں۔ وہ کیا بتاتی کہ ساری رات لڑکیوں کو گناہ کے بعد وہ اِن پوٹلیوں کو اٹھا کر اُن کے ٹھکانے پہنچا کر واپس گھر آتا ہے۔

''لیکن وہ تم سے محبت کرتا ہے تمہاری خاطر ہی تو محنت کر رہا ہے۔'' ترنم نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو باجی تُسی! خالہ کہتی ہے کہ ہم ساری عورتیں نا بڑی ناشکری ہوتی ہیں، اپنے مردوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساری اچھائی بھول جاتی ہیں اگر وہ کوئی ایک شے بھی بھول جائیں، جس پر اللہ سوہنا بہت ناراض ہوتا ہے۔ اللہ سوہنا کہتا ہے کہ شوہر کی ناشکری نہ کرو۔'' رانی نے یہ بات جھوم جھوم کر بتائی۔

وہ ترنم رانی کو بہت دِل چسپی سے دیکھ رہی تھی اُسے اُس کی باتوں میں کسی بہت اپنے کی گونج سنائی دی تھی۔

''ارے واہ! تم تو بہت اچھی باتیں کرتی ہو، کہاں سے سیکھی ہیں؟'' ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''بتایا تو ہے باجی اپنی خالہ جی سے سیکھی ہیں۔'' رانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہاری خالہ کہاں ہیں، پچھلی بار اُن کا پکایا کھانا بھی تم نے کھلایا تھا بہت مزے کا تھا۔'' ترنم کی بات پر رانی ایک دم کھل اُٹھی۔

''آپ کو! آپ کو ابھی تک یاد ہے!'' رانی کو خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی۔

''ہاں! میں اُس کھانے کی لذت کو کیسے بھول سکتی ہوں! ایسا کھانا میری اماں پکایا کرتی تھیں، میں نے اُس روز برسوں بعد بالکل اپنی ماں جیسا کھانا کھایا تھا رانی۔ میں اُسے کیسے بھول سکتی تھی۔'' ترنم کسی اور ہی ٹرانس میں تھی۔ رانی نے بے اختیار ترنم کو چونک کر دیکھا۔

''وہ، میری خالہ نے آپ کی ایک جھلک دیکھی تھی۔'' رانی نے بہ غور ترنم کو دیکھا۔ وہ اِس سوچ میں تھی کہ اتنی بڑی میڈم کو اُسے اپنی خالہ کی کہانی سنانی چاہیے بھی یا نہیں۔

''تو پھر؟'' ترنم کے چہرے پر بہت نرم تاثرات دیکھ کر رانی کو کچھ ہمت ہوئی تھی۔

''میری خالہ کچھ جھلی سی ہے کبھی کبھی تو بالکل جھلی ہو جاتی ہے اُسے ارد گرد کی سدھ بدھ نہیں رہتی، لیکن کبھی کبھی وہ بالکل ہوش میں رہتی ہے اور بڑی اچھی باتیں کرتی ہے لگتا ہی نہیں کہ وہی جھلی خالہ ہے، وہ گھنٹوں ایک ہی نقطے پر ٹکٹکی باندھے چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے جب آپ آخری بار آئی تھیں تو اُس نے آپ کو دیکھا اور اپنی کھوئی بیٹی سمجھنے لگی، میں نے لاکھ سمجھایا پر وہ نہ مانی، کہتی تھی کہ یہی میری ایمان فاطمہ ہے!''

''یہی میری ایمان فاطمہ ہے!'' ترنم یوں جھٹکے سے اُٹھی، جیسے اُسے کرنٹ لگا ہو۔

''کیا! کیا کہا تم نے؟'' ترنم کی آنکھوں سے زار زار آنسو بہہ رہے تھے۔

''خالہ آپ کو اپنی کھوئی بیٹی سمجھی تھی۔'' رانی، ترنم کے آنسوؤں سے سہم گئی اس لیے اُس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

''تم نے ابھی کیا نام لیا تھا؟'' ترنم نے اُس کے ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''جی۔ باجی! وہ ایمان فاطمہ!'' رانی نے کچھ گھبرا کر ترنم کو دیکھا۔

ترنم اب رانی کے پیروں میں بیٹھی رو رہی تھی۔

''آپ کیوں رو رہی ہو باجی! وہ خالہ تو جھلی ہے، کراچی سے یہاں تک آ گئی اپنی کھوئی بیٹی کو ڈھونڈنے، لیکن جب وہ سدھ بدھ کھوتی ہے تو اُسے ہر خوب صورت کڑی میں اپنی ایمان فاطمہ نظر آتی ہے۔'' رانی نے ترنم کے رونے سے ڈر کر وضاحت کی۔

''آہ! میری ماں ہے وہ۔ میری ماں ہے وہ رانی!'' ترنم نے ہچکیوں میں کہا۔

''آپ کی ماں؟'' اس بار رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! میں ہی وہ گناہ گار ہوں جس کا اتنا پاکیزہ نام تھا، میں ہی وہ سیاہ کار ہوں جس کا اتنا اُجلا نام تھا ایمان فاطمہ! میں ایمان فاطمہ ہوں!'' ترنم نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، جیسے وہ خود سے ہی بہت برسوں بعد ملی ہو۔

''پر خالہ کی بیٹی تو کھو گئی تھی باجی!'' رانی نے اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں اس دنیا کی بھیڑ میں کھو گئی تھی ایک ایسی دلدل میں پھنس گئی تھی، جہاں موت کے سوا نکلنا ممکن نہیں تھا۔'' ترنم نے زیرِ لب کہا۔

''تم مجھے میری ماں سے ملوا دو رانی!'' ترنم نے اُس کے ہاتھ تھام کر منت سے کہا۔

''وہ یہاں نہیں ہے باجی! ہسپتال میں ہے، سرکاری ہسپتال میں، اُسے سونے کے انجکشن لگانے پڑتے تھے نا اِس لیے اُسے داخل کروانا پڑا۔ اِس خالی گھر میں مجھے خالہ کا آسرا بہت ہوتا ہے۔ بے شک مہینوں نہ بولے پر گھر میں جی تو ہوتا ہے نا! ورنہ اِس اکیلے پن میں تو میں بھی کملی ہو جاتی جی۔'' رانی کو لمبی چوڑی بات کرنے کی عادت تھی۔ ترنم تو ویسے بھی کان بنی بیٹھی تھی یہ ذکر تو اُس کی ماں کا تھا۔

میری ماں زندہ ہے!

میں اُس سے مل سکوں گی!

''آہ میرے خدایا! اے میرے مہربان رب۔''

''اے اللہ! میں کچھ عرصہ زندہ رہنا چاہتی ہوں تاکہ اپنی ماں سے مل سکوں۔'' ترنم نے لب کاٹتے ہوئے باآواز بلند دُعا کی۔

اُسی پل باہر رانی کو گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''رانی! یہ کس کی گاڑی ہو سکتی ہے؟'' ترنم نے اپنا چہرہ چادر سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں جاوید نہ آ جائے۔

ترنم نے بے ہوش نگی کو دیکھا، جو ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھی، اُسے اٹھا کر لے جانا خاصا مشکل کام تھا۔

''یہ گاڑی! شاید جیدا نہ آ گیا ہو!'' رانی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں! جیدا ہی ہے، ایسے ریس دے کر تو وہی گاڑی بند کرتا ہے۔'' رانی کے انکشاف پر ترنم کی روح فرساں ہو گئی۔

''با۔ باہر تو میری گاڑی بھی کھڑی ہے، وہ جان جائے گا کہ میں اندر ہوں، میں نے گاڑی گلی کے پیچھے کھڑی کی تھی اللہ کرے اُس کی نظر نہ پڑے لیکن اگر اُس کی نظر پڑ گئی تو؟''

''اے اللہ! اب کیا کروں؟'' ترنم نے نگی کو اچھی طرح چادر میں لپیٹا اور کھڑا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ لڑھک گئی۔ نگی بالکل بے سدھ تھی۔

یا اللہ میں نگی کو کیسے باہر نکالوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر اب دروازہ کھٹک رہا تھا۔

"باجی! تم کہاں جارہی ہو؟" رانی نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے، مجھے باہر جانا ہے کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟" ترنم نے نگی کو بہ مشکل اٹھایا جو گرگر جارہی تھی۔

"ان کو کدھر لے جارہی ہو باجی؟ یہ بیمار ہے، جیدا آیا ہے وہ آپ کو ہسپتال لے جائے گا۔" رانی کو ترنم کی عجلت سمجھ نہ آرہی تھی۔

"دیکھو رانی! میری بات غور سے سنو! مجھے جیدے سے نہیں ملنا مجھے اس سے جان کا خطرہ ہے ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے مدد کرو۔ اللہ کے واسطے مدد کرو۔" ترنم نے مختصراً کہا۔

"لیکن جیدا کیوں آپ کا دشمن بنے گا؟" رانی کی حیرت تھی کہ ختم ہی نہیں ہورہی تھی۔

"رانی! بعد میں سوال کرنا پہلے میری مدد کرو یہاں سے نکلنے کے لیے۔" ترنم چلائی۔

باہر دروازہ اب بُری طرح بجایا جارہا تھا۔

"اچھا! میرے ساتھ چلو!" رانی نے ترنم کے ساتھ نگی کو سنبھالا اور گھر کے پیچھے کی جانب لے آئی۔ یہاں ایک کھڑکی تھی، رانی نے کھڑکی کھولی تو اُس میں کوئی سلاخ یا جالی نہ تھی اس نے نگی کو ترنم کی مدد سے باہر نکالا اور کھڑکی بند کرنے سے پہلے تاکید کی کہ وہ یہاں بیٹھ کر اُس کا انتظار کریں، وہ کچھ کرتی ہے کہ آ کر نگی کو اٹھوا کر گاڑی تک لے جائے گی۔ پھر وہ جلدی سے کھڑکی بند کر کے اندر کو پلٹی۔

باہر شدید سردی میں ترنم کے دانت بج رہے تھے گلی میں گھپ اندھیرا تھا، کتوں کے بھونکنے کی آواز بالکل قریب سے آرہی تھی۔

"اگر میں رانی کا انتظار کرتی ہوں کہ وہ مجھے گاڑی تک لے جائے تو کہیں ہم پکڑے نہ جائیں۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا!" ترنم نے فیصلہ کیا اور نگی کو گھسیٹتے ہوئے لے کر چلنے لگی، گلی کے موڑ پر اُسے اپنی گاڑی نظر آئی۔ چند فٹ پر موجود گاڑی ترنم کو بہت دور لگ رہی تھی اس کا سانس پھول گیا تھا۔ نگی زمین پر گھسٹ گھسٹ کر کراہ رہی تھی۔

"میری بہن! پلیز تھوڑی ہمت کرو!" ترنم نے نگی کے سر پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

اُسی پل دور بہت ساری روشنیاں ترنم کو نظر آئیں۔

"اتنی ساری گاڑیاں کس کی ہیں اور اِس کچی بستی میں کیا کرنے آرہی ہیں۔" ترنم نے ایک پل کو اپنے آپ سے سوال کیا اور اگلے ہی پل اُسے کسی بہت بڑے خطرے کی بو آئی، سامنے جاوید کے آجانے کا خطرہ اتنا زیادہ نہ تھا جتنا کہ اِن گاڑیوں کے قریب آنے کا۔ ترنم نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے نگی کو گاڑی تک گھسیٹا اور کانپتے ہاتھوں سے اُسے گاڑی میں ڈالا۔ گاڑی اسٹارٹ کی لیکن گھبراہٹ میں اُس سے گاڑی اسٹارٹ نہ ہورہی تھی۔

ترنم نے چیخ چیخ کر روتے ہوئے ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔

گاڑیاں کچھ قریب آتی محسوس ہوئی تھیں یہ گاڑیاں مارک کے بندوں کی ہوسکتی تھیں اس کا چانس اسّی فیصد اِس لیے تھا کیوں کہ اُن کا ٹھکانہ یہاں سے دور نہ تھا۔ وہ لوگ ڈھونڈتے ہوئے یہاں آسکتے تھے۔

ر جاتے جاتے واپس پلٹ آئی تھی یہ بستی نما گاؤں ہائی وے سے نیچے اُتر کر تھا ترنم کوئی رسک نہیں ...تی تھی کہ وہ گاڑیاں قریب آجائیں۔

...ں نے اللہ کا نام لیتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور نہیں جانتی تھی کہ اندھیرے میں رینگتی ہوئی اُس ...الی اُسے کس انجام سے دوچار کرنے والی ہے اُس نے گاڑی کی لائٹیں بند کر رکھی تھیں تاکہ دور ...اں کی گاڑی نظر نہ آئے لیکن اس وجہ سے اُسے راستہ دیکھنا دشوار ہورہا تھا۔

...طرے کے قریب آنے کا احساس پل پل اُس کی سانس اور اعصاب بے ترتیب کررہا تھا۔

❖❖○❖❖

"کیا بات ہے نفیسہ؟" کیوں اتنی جلدی بلایا ہے تم کو ہر وقت کیا افراتفری پڑی رہتی ہے۔ مسکان ...ں ہے نا؟ نکاح خواں اندر آتے ہی ہوں گے۔" سید سرفراز علی نے آتے ہی غصے کے ساتھ کہا۔

"اگر تمہاری خود ساختہ تقریر ختم ہوچکی ہو تو میں تم کو کچھ بتاؤں؟" آیا اماں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر

...تا مشکل ہوتا ہے، جب دو اشخاص اکٹھے رہتے ہوں اور کچھ فیصلے بھی اکٹھے لینے پڑتے ہوں لیکن وہ ...دوسرے کو ناپسند کرتے ہوں۔

"ہاں بولو؟" سید سرفراز علی نے بے نیازی سے پوچھا۔

"تم نے جو لڑکی اٹھوائی ہے وہ عبدالولی کی بہن نہیں ہے!" آیا اماں نے کوئی بھی تمہید باندھے بغیر ...لہ کیا۔

"کیا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟" سید سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

"تمہارے آدمی کسی اور لڑکی کو اٹھا لائے ہیں میں ابھی ابھی اُسی لڑکی سے مل کر آرہی ہوں۔ یہ وہ ...ہیں ہے جو عبدالولی کی بہن ہے کیوں کہ عبدالولی کی بہن کو میں دیکھ چکی ہوں۔" آیا اماں نے ...مل سے جواب دیا۔

"تم۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟" سید سرفراز علی کا چہرہ بے شک سپاٹ تھا لیکن اُن کی آنکھوں میں بے ...ی بے حد نمایاں تھی۔

"ہاں!" آیا اماں نے تھکے تھکے انداز میں اقرار کیا۔

"تم ہار گئے ہو سید سرفراز علی! تم اُس قسمت بنانے والے سے ہار گئے! تم مسکان کو اُس کی خوشی دینے ...ناکام ہو چکے ہو مان لو کہ تمہاری ہار کا وقت شروع ہو چکا ہے! اب تمہارا مکافاتِ عمل شروع ہو گیا، ...اں اس چیز کا ہے کہ اس سارے سفر میں میری مسکان کے حصے میں درد آرہا ہے اور یہ درد صرف اس ...ے ہے کیوں کہ تم اُس کے باپ ہو!" آیا اماں مسلسل بول بول کر ہانپنے لگی تھیں۔

"نہ اتنا کوسا کرو مجھے، اب تم میں جوانی جیسی ہمت کہاں رہ گئی، بوڑھی ہوگئی ہو مجھے کوسنے کے چکر ...تیری اپنی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ تم نے سید سرفراز علی کو کم زور سمجھا ہے کیا؟ اگر جو چال ہماری ...م زور پڑگئی ہے اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ہم ہار جائیں گے۔ سید سرفراز علی نے ہارنا سیکھا ہی ...ں ہے۔"

سید سرفراز علی کے ایسا کہنے پر آپا لمّاں طنزیہ ہنسیں۔

"جب تک نکاح نہیں ہو جاتا، عبدالولی اپنی بہن سے نہیں ملے گا۔" سید سرفراز علی نے کہا۔

"اور نکاح کے بعد؟" آپا لمّاں نے سوال اٹھایا۔

"پہلے تمہاری زبردستی اور پھر تمہارا دھوکہ، یہ بنیاد رکھو گے اپنی بیٹی کی خوشیوں بھری زندگی کی؟" آ
لمّاں کا سوال سید سرفراز علی جیسے مہر لگے دل پر کیا اثر کرتا۔

"تم بے فکر رہو! اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اُس کا نکاح آج ہی ہوگا اُسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا وہ میری بی
ہے!" سید سرفراز علی نے فخریہ انداز میں کہا اور باہر نکل گئے۔

"یہی تو دکھ ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے!" آپا لمّاں نے بے بسی سے سر تھاما۔

❖❖○❖❖

"ہیلو! گڑیا تم کیسی ہو؟" عبدالولی نے بے قراری سے فون تھام کر نگی سے بات کی، وہ نہیں جانتا تھا
کہ دوسری جانب نگی نہیں بلکہ اُس کی دوست کاشفہ ہے جو ایک دوپٹے کی غلطی کی وجہ سے بے قصور ہوتے
ہوئے بھی قید میں تھی۔

کاشفہ کو بتایا گیا تھا کہ اُس کا بھائی بات کرے گا۔ اس کو بے حد حیرت نے گھیرا تھا کہ اُس کا بھائی (
بے حد سخت انسان تھا کیا وہ واقعی اُسے بچانے آ گیا۔

واقعی خون تو خون ہوتا ہے! وہ اپنی بہن کی خاطر آیا ہوگا میرا بھائی آیا ہوگا۔ کاشفہ کو خوش گمانی نے گھیرا
تھا۔

"بھائی۔ بھائی! مجھے لے جاؤ یہاں سے!" کاشفہ نے سسکیوں میں کہا تھا۔

"میں۔ مجھے گھر جانا ہے!" کاشفہ کی آواز آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی اس لیے عبدالولی نگی اور کاشفہ
کی آواز میں تفریق نہ کر سکا۔

"میری گڑیا! میں بہت جلد تم کو یہاں سے لے جاؤں گا تم فکر نہ کرو، بس میں ابھی آتا ہوں۔"
عبدالولی نے بہن کو دلاسہ دیا۔

ساتھ ہی فون کاٹ دیا گیا۔ عبدالولی کو نہایت بے بسی کا احساس ہوا۔ اُسے لگا جیسے وہ اور اُس کی بہن
قید خانے میں ہوں اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہو۔

ولی کا دل کراہ رہا تھا اس کا دل چاہا اس اونچی شان دار حویلی اور اس کے مکینوں کو تباہ و برباد کر دے۔

اُسی پل نکاح خواں اور سید سرفراز علی کے کچھ بندے ولی کے پاس آئے۔

"سائیں! اندر چلیں اور یہ سہرا باندھ لیں ہمارے ہاں دولہے کا چہرہ نکاح کے بعد دیکھا جاتا ہے۔"
سید سرفراز علی کے خادمِ خاص نے آگے بڑھ کر کہا۔

عبدالولی کا روم روم تھکن سے چُور ہونے لگا جن کاموں میں دل مندا ہو وہاں ایسے ہی سفر اور وقت
سے پہلے تھکن اُتر آتی ہے۔

عبدالولی نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جس وقت عبدالولی کے سر پر سہرا سجا کر اُسے اندر لے کر جایا
جارہا تھا اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ شاید پھانسی والے قیدی کے پاؤں بھی ہر ہر قدم پر ایسے ہی منوں

اری ہوتے ہوں گے۔ اَن مانے جی سے جو رشتہ وہ بنانے جارہا تھا، جانے وہ اُسے کیسے نبھائے گا
کیوں نبھائے گا!

بہن کی زندگی و آبرو داؤ پر نہ لگی ہوتی تو وہ اِس Crule گیم کا کبھی حصہ نہ بنتا۔ جس میں مکان اور
دونوں کی زندگی کا اناڑیوں کی طرح تہس نہس کیا جارہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرے لہو کی روانیوں میں
نہاں ہے تُو ہی
مری نظر میں
اِک عالمِ بیکراں ہے تُو ہی
کلام میں سانس لے رہا ہے
بصولتِ اشک
رات، دن مجھ سے کہہ رہا ہے
دُعائیں تو ہی سُنے گا آخر!
کہ تُو ہی تو آسرا ہے
اس کربِ جاوداں میں
تو ہی علاج ہوگا

ترنم نے گاڑی کو تیزی سے ریورس کر کے کچھ گھروں کی آڑ لی، اگر وہ سڑک پر جاتی تو فوراً پکڑی جاتی۔

"یا اللہ! تیرا ہی آسرا ہے، اِس وقت یہ اندھیرا ہی ہمارا پردہ ہے، ورنہ یہ گھر بھی ہمیں نہیں چھپا سکتے۔" ترنم نے گاڑی کا انجن بند کر کے دھڑکتے دل سے دُعا کی۔

"تو مدد فرما اے اللہ!" گاڑیوں کے رُکنے اور دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز کی گونج رات کے سناٹے کی وجہ سے بہت زیادہ واضح تھی۔

"یا اللہ!" ترنم کو اتنی شدید سردی میں ٹھنڈے پسینے آتے محسوس ہوئے، اُس نے بے اختیار اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نگی کو دیکھا، لیکن وہ بے سُدھ پڑی تھی۔

"جاوید کا گھر اگلی گلی میں ہے سر! یہ گلی نہیں ہے!" کسی نے زور سے اونچی آواز میں کہا۔

یہ گھر خاصی نیچی جگہ پر تھے، ہائی وے تو بہت اونچی تھی۔ ترنم کو اندازہ ہوگیا کہ گاڑیاں سڑک کی اونچائی پر ہیں اور اگر یہاں اس بستی میں اتنا گھپ اندھیرا نہ ہوتا تو ترنم کے چھپنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ابھی بھی وہ بُری طرح لرز رہی تھی۔

"اگر جو گاڑیوں کی روشنی اُس کی گاڑی پر پڑگئی تو؟" ترنم سے مزید کچھ سوچنا دُشوار ہو رہا تھا بے شک

گھروں کی آڑ میں تھی لیکن اونچائی سے اُس کی گاڑی کو دیکھنا بہت مشکل نہ تھا۔
ات کا یہ اندھیرا اور اِس کچی بستی میں بجلی کی سہولت کا فقدان اللہ نے اُس کے لیے رحمت بنادیا تھا۔
سر! جاوید کو فون کیا ہے وہ آرہا ہے۔" ایک بار پھر کسی نے چیخ کر کہا۔ غالباً وہ سڑک پر کھڑے افراد
اطب تھا اس لیے اِس قدر اونچا بول رہا تھا۔
رنم نے دھڑکتے دِل سے اُن گاڑیوں کی جانب دیکھا۔ گاڑیوں کی تیز روشنی جو سڑک پر موجود تھی وہ
دہلا رہی تھی۔
"کسی پل جو روشنی نے حرکت کر ڈالی تو؟" یوں لگ رہا تھا، جیسے کوئی ایٹم بم ہے جو کسی بھی پل پھٹنے
ا۔
رنم کے ماتھے پر ننھے منے پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا اپنی زندگی کی
لکل فکر نہ تھی اُسے تو صرف نگینہ کی فکر تھی کہ اُس کی عزت اور جان اِن درندوں سے بچ جائے۔ جس
لیہ پاکیزہ تھی اور نیک اور شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی ترنم نہیں چاہتی تھی کہ نگینہ اور اُس کے
ان کو یہ جان لیوا ظلم سہنا پڑے، کیوں کہ اگر وہ مارک کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ جاتی تو ترنم کے
ساتھ نگینہ کا انجام بھی عبرت ناک ہونا تھا۔
"اللہ جی مدد! اے اللہ اِن کی آنکھوں اور دِل و دماغ پر پردہ ڈال دے۔" ترنم نے روتے ہوئے
ال۔
ابھی وہ پوری طرح دُعا بھی مکمل نہ کر پائی تھی کہ گاڑیوں کے دروازے بند ہونے کی واضح آواز سنائی
ر دھیرے دھیرے روشنیاں دُور ہوتی چلی گئیں۔
رنم نے دُعا کرتے کرتے ایک دم آنکھیں کھولیں، اللہ نے ایک بار پھر معجزانہ طور پر اُن کو بچالیا تھا۔
"آہ! مجھ گناہ گار کی کیا دُعا قبول ہونی ہے، نگینہ تم بہت لکی ہو، تمہارے والدین کی دُعائیں ہیں کہ تم
انہ طور پر ایک ایسے جہنم سے نکلیں، جہاں سے ایک لڑکی کا نکلنا ناممکن تھا پھر تمہاری عزت محفوظ ہے
ے بڑھ کر اور کیا چاہیے!" ترنم کا حلق نمکین پانی سے کڑوا ہوگیا تھا زندگی میں کچھ Losser ناسور
رح بن جاتے ہیں، جو ہر وقت اپنے ہونے اور اپنی تکلیف کے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ شہر
ہوئے مارک کے آدمیوں سے بچنا، جاوید کے گھر میں جاوید سے بچنا اور اب عین سر پر کھڑے اِن
ں سے بچنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ واقعی جب کسی کی دعائیں اِنسان کو تھامتی ہیں تو تکلیف کی ہر
پار ہوجاتی ہے اور دشمن کی آنکھ اور دِل و دماغ پر پردہ پڑ جاتا ہے۔
"نگینہ! تم کس قدر لکی ہو نا۔" ترنم نے پیچھے مڑ کر بے سُدھ نگی کو مخاطب کیا۔
نم نے بے اختیار گہری سانس بھری اور موبائل پرس سے نکال کر احمد شاہ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔
نا تو ترنم کو بھی محسوس ہوگیا تھا کہ اللہ نے یہ کام پار لگوانا تھا تو یہ سب ناممکن باتیں ممکن ہوتی جا رہی
۔ کسی کام کے ہونے میں اُس کی راہ کی کٹھنائیاں جس قدر دُور ہوتی ہیں، اُسی قدر وہ کام تکمیل کے
پہنچ جاتا ہے۔
"السلام علیکم انکل!" ترنم نے بیٹھی بیٹھی آواز میں کہا۔ مسلسل خوف و دہشت سے اُ[illegible] آواز خراب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگئی تھی۔

''بس آپ جس قدر جلد ممکن ہو آجائیں۔'' ترنم نے گھور اندھیرے میں دائیں بائیں یوں دیکھا، جیسے کوئی اُسے سُن یا دیکھ رہا ہو۔

''مجھے نہیں معلوم کہ آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نگی کو کیسے بچا پاؤں گی ہر جانب خطرہ ہے وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح ہماری بُو سونگھتے ہوئے تلاش کر رہے ہیں۔'' ترنم نے بیٹھی بیٹھی آواز میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو، ہم راستے میں ہیں جس قدر ممکن ہوا ہم آپ کے پاس ہوں گے بیٹا جی!'' احمد شاہ نے اُسے تسلی دی۔

''جی انکل! میں آپ سے رابطے میں رہوں گی، ان کیس مجھے یہاں سے مود بھی کرنا پڑا تو میں آپ کو انفارم کروں گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' احمد شاہ نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اللہ تم کو اس کا اجر دے۔'' احمد شاہ نے ترنم کو دُعا دی۔

''اچھا انکل! فون رکھتی ہوں!'' ترنم کا دِل بھر آیا۔

باپ، ماں کیسے اَن مول رشتے تھے کتنی بے لوث محبت اور دُعائیں تھیں ان کی۔ آہ! میں نے ہی اُن کی قدر نہ کی! جب تک نعمتیں انسان کے پاس رہتی ہیں، وہ اُن کی قدر سے اَن جان رہتا ہے۔

''آہ! ایمان فاطمہ! یہ تم نے کیا کیا تھا!''

تیرا باپ جو ہر سانس کے ساتھ تیرے لیے دُعا گو رہتا تھا تم کو اُس کی قدر کبھی نہ ہوئی۔ اور آج اِس آج ایک غیر آدمی کی دعا اُسے اتنی قیمتی لگی تھی کیوں کہ وہ بہت سال پہلے اپنی زندگی کو دُعاؤں کے سہارے سے محروم کر چکی تھی ایسے میں ایک بالکل اجنبی شخص کی دُعا کیسے اُسے اہم لگی تھی جب کہ وہ جانتی تھی کہ اجنبی لوگوں کی دعاؤں کے Concern کا پیمانہ کس قدر زیادہ ہوسکتا ہے۔

جب ہم Concerns کھوتے ہیں تو رشتوں کی جان کو کھوجتے ہیں کیوں کہ ہر رشتے کی روح اُس کا Concern ہوتا ہے۔ آہ! مجھے کہاں پناہ ملے گی! کیا تھوڑا سا آسمان اور تھوڑی سی زمین جہاں دونوں قدم رکھ سکوں۔'' ترنم نے سسکتے ہوئے سوچا۔

مٹھی بھر
اِس زیست کی
بس اِک خواہش ہے
کہ ہاتھ بھر آسماں
اور دو قدم کی زمین
میسر ہو جائے
کہ مجھے خود کے ہونے کا احساس مل جائے

ترنم نے روتے روتے چادر سے آنسو صاف کیے اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نگی کے پاس بیٹھ گئی اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اُس کے ماتھے کو بوسہ دیا۔

وہ اپنی معصومیت، پاکیزگی اور اپنے اچھے دِل کی وجہ سے مجھے ہمیشہ اچھی لگی لیکن میرے دِل میں اس قدر جگہ کا حوالہ کوئی اور بھی ہے۔ پلیز اُسے میری اصلیت نہ بتانا!'' ترنم بے ہوش نگی سے ایسے بات کر رہی تھی، جیسے کسی ہوش مند سے کرتے ہیں۔

''میں بھی کتنی پاگل ہوں نا کہ اتنے مشکل حالات میں بھی مجھ کو اپنے دل کے بھرم یاد آ رہے ہیں۔ اے اللہ جیسی تیری مرضی!'' ترنم نے تھک کے سیٹ سے سر ٹکا دیا۔

بالکل ایسی کشتی کی طرح جس کے چپّو تو سمندر میں کھو گئے ہوں لیکن جب انسان کی تقدیر تیرنا سیکھ لے تو پار لگنے کے لیے کسی چپّو کی ہرگز ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

❖❖○❖❖

مجھے یرغمال بنا کے
میری آزادی کے بدلے
اور مجھے شرائط پیش کی گئیں
تو میں بے چارگی سے ہنس دیا
میری ہنسی میں
کسی بجھے ہوئے چراغ کی آخری کراہ
اور موت کی سرد کڑکڑاہٹ تھی
ہر طرف گہرا اور پُر ہول سکوت پھیلتا چلا گیا

زندگی کو ہمیشہ جیتنے والے عبدالولی نے جب پہلی بار ہار کا سامنا کیا تو وہ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی ہار تھی۔

''میں نے آج تک بہت ساری لڑکیوں کے دِل دُکھائے، میں سب کے لیے آئرن مین تھا، ایسا تھا جو کسی سے فتح نہ ہوسکتا تھا۔ ناقابل شکست شخصیت کو پروان چڑھانے کے لیے میں نے بے لی کو منتخب ضرور کیا لیکن اِن سب لڑکیوں کی جو میری طرف کسی مقناطیس کی طرح کھنچی چلی آتی تھیں عزت کی، میں نے اگر اُن کو کبھی Positive رسپانس نہیں دیا تھا تو بھی ہمیشہ احترام تو دیا تھا۔ لیکن اللہ! کیا مجھے اس گناہ کی سزا ملی ہے کہ مجھے میری محبت نہیں ملی۔'' عبدالولی نے نکاح نامے کے ساتھ ایک قانونی دستاویز پر بھی سائن کیے تھے اُس وقت اِس جال میں باخوشی خود کو پھنستے دیکھ کر اُس نے اختیار سوچا۔ اُس کی آنکھوں میں مرچیں بھر آئی تھیں۔

کتنی بڑی بے بسی تھی کہ وہ مرد تھا اِس لیے رونے کی منادی تھی، دِل ہلکا کرنے کا حق اُس کے پاس

''کیا اب میں یہ Stupid سا پردہ سر سے اُتار سکتا ہوں؟'' عبدالولی نے جل کر سید سرفراز علی سے

ہوا! سید سرفراز علی ہنس پڑا، خوشی اور فتح کا نشہ آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

غصہ تھوک دو یار! دیکھو یہ تو پہلے سے طے تھا کہ تم میرے ہی داماد بنو گے پھر غصے میں رہنے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فائدہ؟'' سید سرفراز علی نے چہکتے ہوئے کہا۔
''آپ اپنی زبردستی کو اللہ کے فیصلوں کی آڑ نہ دکھائیں۔'' عبدالولی نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر
''لڑکا زوردار ہے، کیا بولتا ہے، مزہ آئے گا! سید سرفراز علی کو عبدالولی پر پیار آ رہا تھا سب کچھ اُ
منشا کے مطابق ہو گیا تھا اُن کو سب کچھ اچھا لگ رہا تھا حتیٰ کہ ولی کا چیخنا اور غصہ کرنا بھی اچھا لگ
تھا۔
''اچھا پہلے گلے تو ملو، پھر میں خود اپنے داماد کا سہرا اٹھاؤں گا، آخر اب تم میری بیٹی کے شوہ
تمہاری عزت افزائی ہمارا فرض ہے۔'' سید سرفراز علی نے خوش اخلاقی سے کہا۔
''ہونہہ! عزت افزائی!'' ولی دِل ہی دِل میں تلملایا۔
اس سے پہلے کہ سید سرفراز علی، ولی کا سہرا اٹھاتا، وہ آگے ہی بڑھے تھے کہ ولی نے فوراً خود پرد
دیا۔
''کیا مصیبت ہے گزشتہ گھنٹے سے یہ میرے سر پر ٹکا رکھا ہے۔'' ولی منہ ہی منہ میں بڑبڑایا جب
سید سرفراز علی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔
''عبداللہ؟'' وہ منہ ہی منہ میں بدبدائے۔
''تم کون ہو؟'' سید سرفراز علی کے لہجے میں موجود جوش ختم ہو چکا تھا وہ زندگی میں پہلی بار ایک
بہت ساری گھٹن محسوس کر رہے تھے۔
''میں؟'' عبدالولی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تعجب سے پوچھا۔
''میں عبدالولی ہوں۔'' غالباً وہ سید سرفراز علی کے سوال پر حیران تھا۔
''کون عبدالولی؟'' سید سرفراز علی نے اس کے مقابل کھڑے ہو کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہ
پوچھا۔ سید سرفراز علی کی سانولی رنگت ایک دم سیاہ پڑ گئی تھی۔
''تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، تم عبداللہ نہیں ہو سکتے؟'' سید سرفراز علی تو یوں ہراساں تھا، جیسے
بھوت دیکھ لیا ہو۔
''تم! تم عبداللہ!''
''نہیں! اُسے تو میں نے جلا کر مار ڈالا تھا۔'' سید سرفراز علی ایک دم ہذیانی انداز میں بولا۔
سید سرفراز علی کے خادم خاص بھی الرٹ ہو گئے وہ حیران تھے کہ اُن کا مالک جو کچھ دیر پہلے اِس
خوش باش تھا ایک دم کیا ہو گیا۔
''عبداللہ! عبداللہ! یہ نام میں بہت سارے لوگوں سے سُن چکا ہوں، کون ہے یہ عبداللہ؟'' عبدا
ایک بار پھر عبداللہ نام سُن کر چونکا تھا۔
وہ نہ جانتا تھا کہ جس کا چہرہ اوڑھے وہ گھومتا پھرتا ہے وہ اُس کا باپ ہے، اِس قدر ہم شکل ہونا
ایسی حیرت کی بات نہ تھی۔ سید عبداللہ اُس کا باپ تھا لیکن صرف وہی یہ نہ جانتا تھا یہ نام اُس کی زند
معمہ بن کر رہ گیا، اس نام سے اُسے پکارتے لوگ بہت مختلف رویے رکھتے تھے اُسے ہمیشہ بہت عج
رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔

رئم

''کون عبداللہ؟'' اس بار عبدالولی نے سوال کیا۔
''سید عبداللہ! میرا سوتیلا بھائی تھا۔'' سید سرفراز علی کسی اور ہی ٹرانس میں تھے عجیب سی ہیبت اور
شت کا شکار۔
یوں لگتا تھا کہ سید عبداللہ زندہ سلامت اُن کے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔
سید سرفراز علی نے عبدالولی کو اُس کے کندھوں سے یوں پکڑا جیسے وہ اُسے چھو کر کسی حقیقت کی جانچ
رنا چاہتے ہوں۔
''تم کیسے زندہ ہو سکتے ہو؟'' سید سرفراز علی کی آواز سرسرائی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے بہت بُری طرح
ھینچ کر عبدالولی کے گلے میں موجود ہار توڑ ڈالا۔
''بولو تم کس کی سازش ہو؟'' سید سرفراز علی نے خون خوار نظروں سے عبدالولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''سازش تو آپ نے میرے خلاف کی تھی میری بہن کو اغوا کر کے زبردستی میرا نکاح اپنی بیٹی سے
ھایا، اب آپ پوچھ رہے ہو کہ میں کس کی سازش ہوں!'' عبدالولی نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔
''میں جو سوال کر رہا ہوں اُس کا جواب دو لڑکے!''
''یہ، یہ چہرہ! یہ چہرہ کسی سازش کے بغیر تھوڑی میرے سامنے ہے۔'' سید سرفراز علی پاگلوں کی طرح
یا تھا۔
''اور تم! تم نے مجھے اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے کہ میں اِس سازش کا شکار ہو جاؤں گا۔''
''کہاں سے آئے ہو کس کے آدمی ہو۔ اور یہ چہرہ! کس سے تمہارا تعلق ہے؟'' سید سرفراز علی کی
ھاڑ دُور تک پھیل رہی تھی۔
''مسٹر سرفراز! میں عبدالولی ہوں، بدقسمتی سے آپ کی بیٹی کی نگاہ کا ہیرو! جس کا دِل اور دماغ کسی اور
رکی کا گرویدہ تھا لیکن اب میں ساری کشتیاں جلا کر آپ کی بیٹی سے نکاح کر چکا ہوں۔ اب آپ یہ
ڈرامہ بند کریں اور مجھے میری بہن سے ملوئیں۔'' عبدالولی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔
''تم!'' سید سرفراز علی نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اُس کو اشارہ کیا۔
''تم!'' وہ ایک دم سر تھام کر گھوما، وہ جس کیفیت سے گزر رہا تھا اُس کی کیفیت کا اندازہ عبدالولی ہرگز
نہیں کر سکتا تھا۔
''مسٹر سرفراز! میری بہن!'' عبدالولی نے سید سرفراز کو ہذیانی انداز میں دروازے سے باہر نکلتے دیکھ
کر پیچھے سے تڑپ کر آواز دی۔
لیکن سرفراز علی شاید خود میں نہ تھا وہ تو ایسے بھاگا، جیسے کمرے میں بم رکھا ہو اور اگر وہ یہاں سے نہ
نکلا تو بم پھٹ جائے گا۔
''نفیسہ!'' وہ سیدھا آیا امّاں کے کمرے میں آیا۔
''وہ! وہ عبدالولی کون ہے؟'' سید سرفراز علی نے لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔
''کون ہے؟ کیا مطلب، وہ عبدالولی ہے!'' آیا امّاں نے سید سرفراز علی کی حالت سے لطف اندوز
ہونے کا سوچا تھا لیکن اِس وقت وہ الگ پریشانی میں تھیں، نگینہ کی جگہ سید سرفراز علی کے بندے کسی غلط

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکی کو اٹھالائے تھے عبدالولی کو اس سچائی سے آگاہ کرنا اُن کو ایک بڑا مرحلہ لگ رہا تھا۔
''وہ! اُس کی شکل! وہ تو بالکل سید عبداللہ جیسا ہے!'' سید سرفراز علی نے چیخ کر کہا۔
''ہاں میں جانتی ہوں!'' نفیسہ بیگم نے بے حد سکون سے کہا۔
''کیا! کیا تم جانتی تھیں؟ پھر مجھے کیوں نہ بتایا؟'' سید سرفراز علی نے چونک کر پوچھا۔
''تو کیا ہوا اگر اُس کی شکل سید عبداللہ سے ملتی ہے صرف شکل ملنے سے وہ سید عبداللہ تھوڑی بن جا۔ گا۔ اس کو تو تم بُری طرح جلا کر مار چکے نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو مار چکے ہو، تم نے تو کوئی بچہ تک زندہ نہ چھوڑا تھا۔'' نفیسہ بیگم نے جان بوجھ کر بچوں کا ذکر کیا لیکن سید سرفراز کا خوف زدہ ذہن نفیسہ بیگم کی اس گہری بات کو نہ پکڑ سکا۔
''ہاں! میں نے اس کے سارے خاندان کو ختم کر دیا تھا پھر! پھر میرا دل خوف زدہ کیوں ہے؟ عبداللہ زندہ ہے یا پھر یہیں کہیں اُس کی روح بھی موجود ہے۔'' وہ دل ہی دل میں بولے۔
سید سرفراز نے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔
''عبدالولی! اور اُس کی بہن؟'' سید سرفراز علی جیسے کسی گہری سوچ میں تھا۔
''نفیسہ! سید عبداللہ کے دو بچے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی، لڑکے کا نام عبدالولی تھا اور لڑکی کا نام کیا تھا؟'' سید سرفراز علی نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔
''مجھے نہیں یاد!'' نفیسہ بیگم صاف مُکر گئیں۔
''اِس لڑکے کا نام بھی تو عبدالولی ہے اور اِس کی شکل ہو بہو سید عبداللہ جیسی ہے۔'' سید سرفراز علی بے حد گھاگ انسان تھا وہ کڑی سے کڑی ملا رہا تھا لیکن اُسے خود پر بہت زیادہ یقین تھا کہ وہ جو کام کرتا ہے وہ اِس قدر مکمل ہوتا ہے پھر کیسے ممکن تھا کہ سید عبداللہ کا بیٹا زندہ سلامت بچ جاتا۔
''نہیں، نہیں! سید عبداللہ اور اُس کے خاندان کو تو میں نے مار ڈالا تھا پھر اُس کا لڑکا کیسے بچ سکتا ہے ایک چھوٹے سے لڑکے کو کون بچا سکتا تھا، جہاں سارے بڑے جل کر مر گئے تھے، حویلی کا تو بہت کڑا پہرہ تھا پھر ایک چھوٹے سے لڑکے کو کون بچا سکتا تھا؟''
''سید سرفراز علی! تم اللہ کو بھول رہے ہو! وہ زندوں کو مردوں اور مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، وہ جو ایک پانی کے قطرے سے ایک مکمل انسان کو تخلیق کرتا ہے اُس کے لیے جلتی آگ سے سید عبداللہ کے بچے کو بچانا کہاں مشکل تھا۔'' نفیسہ بیگم نے دل میں کہا۔
''نہیں، نہیں! یہ کوئی اور عبدالولی ہے اِس کی شکل ملنا ایک اتفاق ہے انسان کتنا ہی ہوشیار چالاک کیوں نہ ہو اگر اللہ نہ چاہے تو سامنے کھڑا پہاڑ بھی انسان نہیں دیکھ سکتا۔''
سید سرفراز علی کی آنکھوں اور دِل پر اتنا موٹا پردہ پڑ چکا تھا کہ وہ بھی سامنے کھڑے پہاڑ کو نہ دیکھ سکا۔
اس لڑکے کے والدین کوئی اور ہیں۔ ہاں!
''ہاں میں جانتا ہوں!''
اس عبدالولی کے باپ کا نام عبداللہ نہیں ہے بلکہ احمد شاہ ہے! جو ایک کامیاب بزنس مین اور جاگیردار ہے! اُس کی لائف ہسٹری ہے وہ کوئی بے جڑ کا پودا نہیں ہے، جس کو لوگ جانتے نہ ہوں، وہ اتنے برسوں

اِس سوسائٹی میں ہے ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ والا ولی، احمد شاہ کا ہی بیٹا ہے!'' سید سرفراز علی مسلسل جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا۔
ہاں نفیسہ بیگم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ضرور تھی وہ سید سرفراز علی کے چہرے پر وہ خوف بھی دیکھ رہی تھیں جو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا یہ خوف ان کو سکون مہیا کر رہا تھا۔
''دو چہرے ایک جیسے ہو سکتے ہیں نفیسہ بیگم!'' سید سرفراز علی جیسے خود کو لوجک کے ذریعے مائل کر رہا تھا۔
''بعض اوقات ہم صرف وہی دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں اور دو نام جب ایک جیسے ہوں تو؟'' نفیسہ بیگم نے مسکراتے اور مزہ لیتے ہوئے سید سرفراز علی سے پوچھا۔
''مطلب کیا ہے تمہارا؟''
''دنیا میں اتفاق نہیں ہوتے، کیا ایک نام صرف ایک شخص کا ہی ہو سکتا ہے؟ میرے نام کے بہت سے لوگ ہوں گے!'' سید سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔
''دو چہرے اور دو نام ایک جیسے، واقعی اتفاق تو ہے!'' نفیسہ بیگم نے بے نیازی سے کہا۔
''لیکن یہ اتفاق تم کو کچھ یاد کروانے کے لیے تو اللہ نے کہیں بنا کر نہیں رکھا؟''
''کیا یاد کروانے کے لیے؟'' سید سرفراز علی نے پوچھا۔
''یہی کہ تم قاتل ہو! اور قاتل کو سزا یہاں اِس دنیا میں نہ ملے تو دوسری دنیا میں تو مل ہی جانی ہے، اور پھر یہ یاد دلانے کے لیے کہ معصوموں کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔'' نفیسہ بیگم نے کہا۔
''تم بھول رہی ہو کہ آج تک میرا کوئی پلان فیل نہیں ہوا، کبھی میرے کسی پلان میں غلطی نہیں ہوئی۔'' سید سرفراز علی نے ہنستے ہوئے کہا۔
''غلطی سے مبرّا صرف اللہ کی ذات ہے، انسان تو ہے ہی غلطیوں کا پتلا اور تم جیسا شیطان صفت انسان غلط راستے کا راہی ہے، وہ تو کرے گا ہی غلطیاں۔'' آیا امّاں نے حسب عادت سید سرفراز کے خلاف دل کی بھڑاس نکالی۔
''تم دو ٹکے کی عورت! ہر وقت میرے سامنے زبان چلاتی ہو، کسی دن میں نے تیرا قصہ ہی پاک کر دینا ہے۔'' سید سرفراز علی نے غصّے سے آیا امّاں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔
''ہونہہ! میں دو ٹکے کی عورت تھی تو پھر کیوں اپنے سر پر لا کر بٹھایا، کیوں پورے گاؤں کے سامنے نکاح پڑھوایا۔'' آیا امّاں نے برسوں پرانی سُلگن باہر نکالی۔
''اُس منحوس عبداللہ کی وجہ سے مجھے یہ سب کرنا پڑا تھا اگر وہ میرے گرد اتنا گھیرا تنگ نہ کرتا تو میں تو تم پر تھوکنا بھی نہ تھا لیکن پھر تم نے دیکھا نا اُس کا انجام! اگر اُس نے مجھے ذلیل کر کے سارے گاؤں کے سامنے تیرے جیسی دو ٹکے کی عورت سے نکاح پڑھنے پر مجبور کیا تھا تو میں نے بھی اُس کا اور اُس کے سارے خاندان کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا۔'' سید سرفراز علی نے زہریلے لہجے میں کہا۔
''جو تم نے ظلم کیے ہیں اُن کے حساب کا کھاتہ کھل چکا ہے سید سرفراز علی! ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو، ظلم کی یہ جنگ جیتنے والے کی عبرت ناک شکست کا دور شروع ہو چکا ہے تم اگر بھول رہے ہو تو میں یاد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرواتی ہوں۔ بلال کی موت تمہاری پہلی بڑی شکست تھی پھر مسکان کی بربادی! زبیدہ کی تم سے رخی! کہتے ہیں اولاد کی تکلیف سے انسان کی آزمائش کا اندازہ لگایا جاتا ہے لیکن سید سرفراز علی اولاد تکلیف سے تمہاری شکست کا اندازہ ہوگا۔'' آیا امّاں مسلسل بولتے بولتے ہانپ گئیں۔

''نفیسہ!'' سید سرفراز علی نے ایک زوردار چانٹا آیا امّاں کو رسید کیا۔

''بکواس بند کرو، میں نہیں ہارا۔ میں کبھی نہیں ہار سکتا! جو مجھے ہرانے کی کوشش کرتا ہے اُس کا حال عبداللہ جیسا ہوتا ہے، اُس کا حال سید اظہر علی جیسا ہوتا ہے۔'' سید سرفراز علی نے آیا امّاں پر پھنکار ہوئے کہا۔

''اور یہ مت بھولو کہ اُس کا حال تمہارے بھائی قیصر اور ڈاکٹر فیصل جیسا ہوتا ہے، جس جس نے کو کی وہ صفحہ ہستی سے مٹتا چلا گیا۔'' نفیسہ بیگم نے اپنے بھائیوں کا نام سن کر بے اختیار سسکی لی، کوئی بھالا میں اُترا تھا۔

''میں کبھی نہیں ہارتا سمجھی تم، میں نہیں ہار سکتا!'' سید سرفراز علی اِس قدر اونچا بولا کہ کمرے کے دیوار لرز گئے۔

''اگر غلطی سے کوئی اور لڑکی آ بھی گئی ہے تو کس کو پروا ہے! ہمارا کام تو ہوگیا، ہمارا مقصد تو ہمیں گیا ہے! اِس کا مطلب ہے کہ ہم کامیاب ہوگئے۔'' سید سرفراز علی، آیا امّاں کو اپنی حیثیت باور کر چاہتا تھا۔

وہ غصّے سے دروازے کی جانب ابھی بڑھا ہی تھا کہ آیا امّاں کی پکار نے اُس کے قدم روک لیے۔

''سید سرفراز علی! کیا تم واقعی جیت چکے؟ ولی بہن کا سوال کرے گا تو تم اُس کا سوال کیسے حل کر گے؟ اُس کے ساتھ تمہاری بیٹی کی خوشیاں جڑی ہوئی ہیں، کیا تمہارا دھوکا تمہاری بیٹی کے نصیب م خوشیاں بھر سکے گا؟ میرا سوال تو اب بھی باقی ہے کیا تم واقعی جیت گئے ہو؟'' آیا امّاں نے بیڈ کا سہا لے کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

سید سرفراز نے عجیب نظروں سے آیا امّاں کو دیکھا۔ اُس کی حریف نے ایک ایسا پزل اُس کے سا لا رکھا تھا، جس کا جواب اور حل اُس کو فوری طور پر بالکل نہ سوجھ رہا تھا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اُس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔

آیا امّاں ہونہہ کہہ کر استہزائیہ ہلکی ہنسیں۔

''تمہاری ہار کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، تم کو آج نہیں تو کل ماننا ہی پڑے گا۔'' آیا امّاں نے باآو بلند کہا۔

❖❖○❖❖

''رانی! یہاں کون آیا تھا؟'' جیدے نے رانی کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کو، کوئی نہیں! رانی نے بے اختیار نگاہ چُرا کر مکرتے ہوئے کہا۔

''بکواس نہ کرو، جھوٹ نہ بولو!''

''یہ جوتے کس کے ہیں اور یہ کان کی بالی سونے کی ہے، جو بستر پر پڑی تھی، تیری میری اوقات

اندی کے زیور کی نہیں، یہ سونے کی بالی کہاں سے آئی؟'' جیدے نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''تو مجھ پر شک کر رہا ہے؟'' رانی نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''دیکھ رانی تو بہت کم عمر ہے اور بہت سیدھی سادھی بھی، دنیا بڑی تیز ہے میں تجھ پر شک نہیں کر رہا، تو مجھے سچ کیوں نہیں بتاتی؟'' جیدے نے رانی کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر بے حد نرمی سے کہا۔ ب سے رانی ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھی جیدے نے اُس کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ اچھا سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ رانی سے اُسے بہت پیار تھا اِس لیے وہ اُس کے لیے محتاط بھی بہت تھا۔

''بول رانی! دیکھ تیری خاموشی مجھے پریشان کر رہی ہے۔'' جیدے نے رسان سے پوچھا۔

''جیدے! پہلے آج تو بتا کہ تو کیا کام کرتا ہے!'' رانی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

''تو میری بات کے جواب میں سوال کرنے کیوں بیٹھ گئی، سیدھی طرح بتا یہ چیزیں کس کی ہیں۔'' یدے نے رانی کے سوال سے بچتے ہوئے کہا۔

''جیدے! تو کوئی غلط کام تو نہیں کر رہا؟'' رانی نے پھر سوال کیا۔

''نہیں!'' جیدا صاف مکر گیا۔

''کھا میری قسم!'' رانی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بکواس ہے! اور تو یوں کیوں بول رہی ہے پہلے تو تُو نے کبھی ایسی بات نہیں کی۔'' جیدے نے اُس کے سر سے ایسے ہاتھ ہٹایا، جیسے اُس کے ہاتھ پر کسی نے جلتا ہوا کوئلہ رکھ دیا ہو۔

''تو جھوٹ بول رہا ہے نا!'' رانی نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ پری باجی ٹھیک کہتی تھی کہ اُسے تجھ سے جان کا خطرہ ہے، تو یقیناً بُرے کام کرتا ہے تبھی تو وہ تجھ سے بھاگ گئی۔'' رانی نے روتے ہوئے کہا۔

''ک۔ کون پری باجی؟'' جیدے نے سہم کر سارے گھر پر نگاہ ڈال کر پوچھا، جیسے وہ کسی خطرے کی آہٹ کو محسوس کر رہا ہو۔

''وہی پری باجی جس کو تم ایک بار یہاں نماز پڑھنے کے لیے لائے تھے۔'' رانی نے دھماکہ کیا۔ جیدا تو اپنی جگہ سے یوں اُچھلا جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

''ت........ترنم کی بات کر رہی ہو؟'' جیدے نے خشک ہوتے حلق کے ساتھ پوچھا۔

اگر میڈم راگنی کو ذرا سی بھنک بھی مل گئی کہ جیدے نے ترنم کو اپنے گھر پناہ دی تھی تو وہ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دے گی۔

''کہاں ہے وہ؟'' جیدے نے عجلت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''دو کنال کا گھر ہے نا جو ایسے ڈھونڈ رہا ہے، دو کمرے کے گھر میں اُس نے مکھی بن کر چھپ جانا تھا۔ چلی گئی ہے بے چاری!'' رانی نے دُکھ سے کہا۔

''تو نے اُسے اندر کیوں آنے دیا میری اجازت کے بغیر یہاں کیوں رہنے دیا؟'' جیدے نے ناراض ہو کر کہا۔

''شاباش ہے تیری!'' میں اُسے بھلا کیوں روکتی، پہلے جب تو اُسے لایا تھا تو کہا تھا کہ یہ تیری میڈم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے اِس کی رج کے سیوا کرو اور اُس کو بہت عزت سے رکھو۔ تب تو نے اُسے اتنا اہم بتایا تھا تو اب غیر ہوگئی۔ میں نے تو آج بھی تیری وجہ سے اُس پری باجی کو اندر آنے دیا تھا وہ تو جب تو آیا تو وہ ڈر کر بھاگ گئی، تب مجھے پتا چلا کہ میرا بندہ کتنا بُرا ہے کہ کسی کو اُس سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔'' رانی نے روتے ہوئے کہا۔

''اوہو! لیکن وہ گئی کہاں، کیا وہ اکیلی تھی؟'' جیدے نے عجلت سے پوچھا۔

''کیوں بتاؤں تجھے؟'' رانی نے بدک کر کہا۔

''اِس لیے کملی کہ اُس کی وجہ سے ہم مصیبت میں پھنس سکتے ہیں، وہ ہماری بڑی میڈم سے بغاوت کرکے بھاگی ہے، اُس کے سارے کارندے شکاری کتوں کی طرح اُس کی بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔'' جیدے نے زچ ہوکر بوکھلا کر ایک دم سچائی اُگل دی۔

''تم اور تمہاری وڈی میڈم بندے مارتے ہیں؟'' رانی کے آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی تھی۔

''نہیں لیکن! چل چھوڑ تجھے کیا بتاؤں!'' جیدے نے اپنا سر پکڑلیا۔

''بول نا جیدے! میرا دل نہیں مانتا کہ جس جیدے سے میں نے اتنا پیار کیا وہ ایک لڑکی کو مار سکتا ہے، تو اتنا بُرا نہیں ہوسکتا۔'' رانی تو بس رو رو کر گرنے والی تھی۔

''کملی! میں بالکل ایسا نہیں، نہ میں نے کوئی ایسا کام کیا ہے میں تو ایک معمولی ڈرائیور ہوں۔ لیکن میری غلطی یہ ہے کہ چار پیسے زیادہ کمانے کے چکر میں، میں نے غلط لوگوں کے ہاں نوکری کر ڈالی۔ اب میں خود پچھتاتا ہوں، وہاں سے کیسے جان چھڑاؤں۔'' جیدے کے لہجے سے سچائی ٹپک رہی تھی۔

رانی کو تو اُس کے جھوٹ پر بھی اعتبار ہوتا تھا اب تو وہ سچ بول رہا تھا۔

''پھر وہ باجی کیوں تم سے ڈر رہی تھی۔'' رانی نے سوال کیا۔

''اِس لیے کہ وہ مجھے بھی میڈم کے وفاداروں میں سمجھتی ہوگی!'' جیدے نے سچائی سے کہا۔

''تمہاری وڈی میم کیا کام کرتی ہے؟'' رانی کا سوال جیدے کے لیے بہت کڑا تھا لیکن وہ جان گیا تھا کہ آج رانی سچ جانے بغیر کہاں مانے گی۔

''وہ لڑکیوں کو اغوا کراتی ہے ان کو زبردستی دھندے پر مجبور کرتی ہے اور اگر کوئی اُس کی بات نہ مانے تو اُسے جان سے ماردیتی ہے۔ بہت ظالم ہے وہ، میں اُس کی نوکری چھوڑنا چاہتا تھا لیکن اُس ڈر سے کہ وہ کسی کو اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دیتی بلکہ جو بغاوت کرے ماردیتی ہے، آج تک نوکری نہ چھوڑ سکا۔'' جیدے نے پسپا آواز میں کہا۔

''میرے ربا!'' رانی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

''اور وہ پری باجی تمہاری میڈم کی قید سے بھاگی ہے نا؟'' رانی نے پوچھا۔

''ہاں! اور ساتھ میں ایک سوچی (باکرہ) لڑکی بھی لے کر بھاگی ہے، میڈم تو اُسے ڈھونڈنے میں باؤلی ہورہی ہے۔'' جیدے نے کہا۔

''ہائے، ہائے! کتنا ظلم ہے!'' رانی نے بے حد تکلیف سے کہا۔

''ہاں ہے تو!'' جیدے نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ وہ دل سے اِس دھندے سے تنگ تھا۔

''دیکھ جیدے! تجھے تیرے ہونے والے بچے کی قسم، تو میری ایک بات مانے گا؟'' رانی نے اُس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''یہ قسمیں نہ دے، پہلے کیا کبھی تیری کوئی بات ٹالی ہے؟ اور یہ بار بار میرے بچے کو قسموں میں لے کر منہ میں نہ لے۔'' جیدے نے ایک دم غصے سے کہا۔ اُسے اپنے ہونے والے بچے سے بے حد پیار تھا اور اُس کو بے حد انتظار تھا اِس لیے اس کی باتیں قسمیں جیدے کو بُری طرح تپا گئیں۔

''دیکھ جیدے! اگر تیرے ہاں کوئی آ گئی تو کیا تو اپنی بٹیا رانی کو ایسے لوگوں سے نہیں بچائے گا؟'' رانی نے جیدے کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''سیدھی سیدھی بات کرنا، مجھے کنڈوں (کانٹوں) میں نہ اُلجھا۔'' جیدے نے زچ ہوکر کہا۔

''جیدے! رب سوہنا جانے کس بات پہ راضی ہو، تو پری باجی کی مدد کر، ربّ سوہنا تیرے سارے گناہ دھو دے گا، وہ بے چاری جانے کہاں کہاں ماری پھرے گی۔'' رانی نے بے حد لگاوٹ سے جیدے کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''میڈم راگنی بڑی خطرناک عورت ہے رانی! اُس کو بھنک بھی پڑ گئی تو ہم مارے جائیں گے۔'' جیدے نے ڈر کر کہا۔

''دیکھ جیدے! اگر بُرے کام کی پردہ داری ہوجاتی ہے تو اچھے کام کی مدد تو خود اللہ کر دیتا ہے۔ یہ مجھے خالہ نے کہا تھا خالہ کی باتیں سچائی سے بھری ہوتی ہیں، ہم اَن پڑھ جاہل سہی لیکن اچھی سچی بات کی پہچان تو دِل کر سکتا ہے نا!''

''وہ بھلا مجھے کہاں ملے گی میں اُسے کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔'' جیدا اندر سے ترنم کی مدد کرنے کے لیے راضی ہوگیا تھا۔

''تو پچھلی گلی میں جا، وہاں شاید ہو ورنہ اِس بستی سے اتنی جلدی کیسے جائے گی، اتنی تو چکری گلیاں ہیں اِس کی، پر تیرے لیے اُن کو ڈھونڈنا آسان ہوگا۔ فرض کرو وہ جا بھی چکی ہوگی تو ہمارا دِل تو سوکھا ہوگا، ہم تو رب سوہنے کے ہاں سچے ہوں گے کہ ہم نے اُن کی مدد کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔''

رانی کی باتیں جیدے کے دِل پر اثر کر رہی تھیں اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کی چابی لی اور باہر تیزی کی جانب بڑھا۔ جس قدر تیزی سے وہ گلیوں میں گھومتا جا رہا تھا وہ خود حیران تھا کہ ایسی توانائی اُس کے جسم میں کیسے آ گئی۔

جب جب انسان کی نیت سچی ہو وہ ہمیشہ اللہ کی جانب سے خاص مدد اور طاقت حاصل کر لیتا ہے پھر اُس کی یہ پھرتی اور تیزی اِس لیے بھی تھی کہ کوئی ہاتھ اٹھائے زار زار روتے ہوئے اللہ سے مدد مانگ رہا تھا اور اللہ جی اپنے سے سوال کرنے والے کو کبھی نہیں لوٹاتے۔

❖❖○❖❖

''کم آن ولی! فون اٹھاؤ!'' طارق نے مسلسل ولی کا نمبر ری ڈائل پر رکھا ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد ولی کو سید سرفراز کے دھوکے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ اُس نے نگینہ کو اغوا نہیں کیا بلکہ وہ صرف ڈرامے بازی کر رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب طارق بالکل ولی کی جانب سے مایوس ہونے لگا تو دوسری جانب سے ایک دم فون اٹھالیا گیا۔

''ہیلو ولی! پلیز یار میری بات سُنو!'' طارق نے بے چینی سے کہا۔

''یار کہو، میں سُن رہا ہوں!'' ولی کی مرجھائی آواز کو طارق میلوں دُور ہوتے ہوئے بھی شدت سے محسوس کرسکتا تھا۔ جو لوگ دِلوں میں رہتے ہیں، وہ چاہے سات سمندر پار بیٹھے ہوں اُن کے من کی خوشی اور دُکھ کے سگنل فوراً محسوس ہوجاتے ہیں۔ جواباً طارق نے جو کچھ بتایا وہ ولی کے لیے زمین آسمان برابر کردینے کے برابر تھا۔ ولی کو لگ رہا تھا جیسے اُس کا دِل پھٹ جائے گا۔

''ہیلو ولی! آر یو اوکے؟'' طارق نے اُس کی خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔

جواباً ولی فوراً کچھ بول بھی نہ پایا۔

''سنو! تم اُس کی بیٹی سے نکاح ہرگز نہ کرنا!'' طارق نے کہا۔

''طارق! جب انسان اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور بازی ہی ہار جائے تو چھوٹی چھوٹی بازیاں کیسے اُسے خوش کرسکتی ہیں، میں نے علیزے کو کھودیا! طارق میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ چھڑا کر کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا اور اب! اب اتنے بڑے Loss کے بعد میں چھوٹے Loss سے بچ بھی جاؤں تو کیا فرق پڑتا ہے! تمہارے لیے بس اتنی سی اطلاع ہے کہ میں Trap ہوچکا ہوں میرے نام کے ساتھ کسی اور کا نام جڑ چکا ہے۔'' ولی نے ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔ طارق کو ایک بار پھر گاڑی روکنی پڑی۔

''کیا؟ اوہ نو!'' طارق کو شدت سے دُکھ نے آن گھیرا۔

''مائی گاڈ!'' طارق کو فوری طور پر سمجھ نہ آرہا تھا کہ وہ ولی کو کوئی تسلی دے یا پھر کوئی نصیحت کرے، وہ شدت سے بے بسی محسوس کررہا تھا۔

''تم اب کیا کرو گے؟ کیا تم اتنے بڑے دھوکے کے بعد اُس لڑکی کے ساتھ زندگی گزار لو گے؟'' طارق نے سوال کیا۔

''یار طارق! کبھی کبھی تو کچھ سوالوں کے جواب فوراً انسان خود بھی حاصل نہیں کرپاتا، مجھے نہیں معلوم کہ اب اِس رشتے کو لے کر مجھے کیا کرنا ہے۔ شاید اِسے ہی قسمت کہتے ہیں جب آپ کی عقل، تدبیریں اور مناجاتیں سب دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔'' ولی نے بے حد اُداسی سے کہا۔ طارق کو یہ اُداسی اپنے اندر تک اُترتی محسوس ہوئی۔

''تم مجھے نگی کا فوراً بتانا۔ میری بہن ابھی تک لاپتہ ہے یہ بات مجھے ایک بار پھر کانٹوں میں گھسیٹ چکی ہے۔'' ولی نے تڑپ کر کہا۔

''یار نکلو وہاں سے، میں بھی تم سے رابطے میں رہوں گا جیسے ہی کوئی اطلاع ملے گی، میں تم سے رابطہ کر کے بتادوں گا۔'' طارق نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

طارق کو اپنا آپ بے حد ٹوٹا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

''اے اللہ! اچھے لوگوں کے ساتھ تو اچھا ہونا چاہیے نا! پھر میرے بھائی جیسے دوست کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟'' طارق نے بے اختیار اپنے رب سے سوال کیا۔

اچھے لوگوں کی اچھائی کبھی کبھی آزمائی بھی تو جاتی ہے۔

❖❖○❖❖

مجھے اس تیرگی کے دشت سے
اب جنگ لڑنا ہے
رے چاروں طرف وحشی درندے ہیں
مرا زادِ سفر بھی کھوچکا ہے
اور میرا دیپ بھی آندھی کی زد میں ہے
راخیمہ مرا مسکن
ھی مجھ سے چھن چکا ہے
اور اس یلغار میں
تنہائیوں کی آخری حد پر
مجسم بے بسی ہوں
مگر بھی میرا عزم کہتا ہے
مجھے اس تیرگی کے دشت سے
بر سرِ پیکار ہونا ہے
رے اندر یقیں کی روشنی ہی میری قوت ہے
ں اِس ایمان کی قوت سے
ں تاریک شب سے
ینا جیت جاؤں گی

رنم نے نگی کو پانی پلا کر احتیاط سے لٹا دیا تھا اس کو شدید بخار تھا۔ پہلے وہ بے سُدھ تھی لیکن اب مسلسل ے کراہ رہی تھی ترنم کا بس نہ چل رہا تھا کیسے اُس کی تکلیف کو اپنی پوروں میں چن لے۔

''بس میری بہن! تھوڑا سا صبر اور، بہت جلد تو اپنوں میں ہوگی اپنے گھر میں ہوگی۔'' ترنم نے نگی کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''پانی، پانی!'' نگی کو بے حد پیاس لگی ہوئی تھی چھوٹی سی بوتل جو گاڑی میں تھی وہ کب کی ختم ہوچکی

نم یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی، قریب ہی تو راگنی کا ٹھکانہ تھا اگر پکڑی جاتی تو۔ راگنی کے ے بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

''پانی کہاں سے لاؤں؟ کیا کہیں پیدل جا کر لاؤں؟ نہیں نہیں، میں نگینہ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی ہر جانب ت کے اندھیرے میں خطرہ ہے۔'' ترنم کافی دیر سے پلس مائنس میں لگی ہوئی تھی۔

ا بل ہلکی سی روشنی اُن کی گاڑی پر پڑی۔ ترنم کی ٹانگوں سے جان نکل گئی، بے اختیار اُس نے بیگ ما ریوالور نکال لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر نگینہ! مجھے تم کو بچانے کے لیے لڑنا بھی پڑا تو میں لڑوں گی، تم تو میری بقا ہو تم کو بچانا مطلب ہے کہ میں نے خود کو بچالیا۔" ترنم نے اُس ہلکی سی روشنی کو گھورتے ہوئے مصمم ارادے سے سوچا۔ روشنی دھیرے دھیرے قریب آ رہی تھی۔ ترنم پستول تان کر باہر نکل آئی۔

"باجی! یہ میں ہوں!" جیدا سامنے کھڑا تھا۔ ترنم کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اُس کی آواز خوف زدہ ہوگئی۔

"تم! تم بھی تو میڈم کے ملازم ہو، تم نے یقیناً ہماری مخبری کی ہے میں رانی کو کتنا اچھا سمجھتی تھی لیکن اُس نے ہمارے راز کو کھول کر بہت بُرا کیا۔" ترنم نے خشک ہوتے گلے کے ساتھ کہا۔

"نہ باجی! اُس کو بُرا نہ کہیں، مجھے اُس نے ہی آپ کی مدد کو بھیجا ہے۔" جیدے کے لہجے میں سچائی تھی لیکن ترنم کو تو چلتی ہواؤں پر اعتبار نہ تھا۔

"میں کیسے تمہارا اعتبار کرلوں؟" ترنم ابھی بھی پستول تانے کھڑی تھی۔

"میں اپنے ہونے والے بچے کی قسم کھاتا ہوں کہ مجھے رانی نے آپ کی مدد کے لیے بھیجا ہے" جیدے نے کہا۔

ترنم کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے اس نے بے حد تھکا ہوا سانس خارج کیا۔

"تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟" ترنم نے پوچھا۔

"میں آپ کو شہر لے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ میرا علاقہ ہے اس کا ہر شارٹ کٹ میں جانتا ہوں۔" جیدے نے کہا۔

"تم اگر شارٹ کٹ اور چھپے ہوئے رستوں کو جانتے ہو تو میڈم کے بندے بھی تو جانتے ہوں گے مجھے لگتا ہے کہ میں جیسے مکڑی کے جال میں پھنس گئی ہوں، مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں، اِس معصوم روح کو اُس کے گھر پہنچانا اس وقت میرا زندگی کا مقصد ہے۔" ترنم نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر جیدے کو دکھایا جہاں نگینہ شدت سے کراہ رہی تھی۔

"باجی! آپ پیچھے بیٹھو اِس باجی کے ساتھ، گاڑی کی چابی دو، بس اللہ مدد کرنے والا ہے میں آپ کو لے کر چلتا ہوں، یہاں تو بہت خطرہ ہے اتنی قریب تو آپ بہت جلد پکڑی جاؤ گی، پھر دن کی روشنی چند گھنٹوں میں پھیل جائے گی، سوئے ہوئے لوگ جاگ جائیں گے اس طرح گلی میں کیسے کھڑی رہ سکتی ہو۔" جیدے کی باتیں حقائق پر مبنی تھیں۔ ترنم مزید الجھ گئی۔

"باجی! وقت نہ ضائع کرو، اللہ کا نام لے کر نکلتے ہیں۔" جیدے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، جبکہ ترنم نے نگی کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔

"ٹھیک ہے جاوید! چلو۔" ترنم خود بہت زیادہ تھک چکی تھی اِن اَن جان راستوں پر گول گول گاڑی گھما گھما کر۔ اِس طرح وہ کیسے احمد شاہ تک پہنچ سکتی تھی یہاں سے نکلنے کا رسک تو لینا ہی تھا۔

"اتنی دیر سے ترنم کو کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تھا اب اللہ نے خود اُس کے پاس مدد بھیج دی تھی۔ گاڑی چل پڑی تھی ترنم نے خود کو کافی حد تک پُرسکون محسوس کیا۔

جاوید بہت احتیاط سے بے حد سنسان راستے پر گاڑی چلا رہا تھا۔ ان راستوں میں ڈاکوؤں کا خطرہ

ہوتا تھا اِس لیے عام طور پر رات کو کیا دِن میں بھی اِس رستے پہ سفر نہ کرتے تھے لیکن جاوید نے جان بوجھ کر یہ راستہ اختیار کیا تھا۔

اُسے سانپ سے بچنے کے لیے بچھو کا سامنا کرنا آسان لگ رہا تھا کیوں کہ یہاں تو بچنے کے چانس تھے کہ شاید کوئی انہونی اُن کے انتظار میں ہو۔ باقی رستوں پر یقیناً پہرہ تھا۔

ترنم نے احمد شاہ کو فون کر کے اپنی درست لوکیشن بتائی، مسلسل آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ اُس پیٹرول پمپ پر پہنچ چکے تھے، جہاں کا احمد شاہ نے اُن کو بتایا تھا کہ وہ وہاں اُن کا انتظار کریں گے۔

"باجی! پمپ تو آ گیا لیکن آپ اِس باجی کے ابو کو کیسے پہچان پاؤ گی؟ کیا آپ اُن سے ملی ہو؟" جاوید نے سوال کیا۔

"ہاں!" ترنم نے بے حد یقین سے کہا۔ میں دل سے تو ملی ہوں نا، اُس کی آنکھوں کی وہ پاکیزگی اور ماتھے کی روشنی جو اُس قبیل کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ اِس دنیا میں ہر مرد صرف مرد نہیں ہوتا باپ، بھائی، بیٹا اور شوہر ہونے کے علاوہ پاکیزہ دِل و نگاہ رکھنے والا مرد مومن بھی ہوتا ہے۔" ترنم نے دل میں کہا۔ اس نے ہر جانب نگاہ دوڑائی صبح کی پو پھوٹنے میں وقت تو باقی تھا لیکن رات کی گہرائی میں کمی آچکی تھی اِکا دُکا ٹرک پمپ پر موجود تھے البتہ پمپ کے ساتھ موجود ڈھابے پر کچھ رونق تھی، مسافر چائے پینے کی غرض سے وہاں موجود تھے۔ ترنم نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اُسے کہیں بھی احمد شاہ نہ نظر آئے۔

"السلام علیکم بیٹا!" ترنم کو اپنے پیچھے بے حد نرم آواز سنائی دی۔

"احمد شاہ؟" ترنم نے بے ساختہ پوچھا۔

"جی بیٹا! آپ ترنم بیٹا ہو نا؟" احمد شاہ کے لہجے کی نرمی ترنم کو اندر تک محسوس ہوئی۔

"جی!" ترنم پیاسی نظروں سے اُن کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہر باپ کی شکل ایسی ہی ہوتی ہے؟ آہ میں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے باپ کو منوں مٹی تلے رہنے پر مجبور کردیا!" ترنم کے دِل میں ہوک سی اُٹھی۔

"نگینہ؟" احمد شاہ کی نگاہ اور زبان سوال کررہی تھی۔

"وہ اندر ہے!" ترنم نے گاڑی کی پچھلی سیٹ کی جانب اشارہ کیا، جہاں چادر دے کر نگینہ کو چھپا دیا گیا تھا۔ بظاہر بالکل محسوس نہ ہو رہا تھا کہ گاڑی میں کوئی لیٹا ہے۔

احمد شاہ دیوانہ وار نگینہ کی جانب بڑھے۔

"میری گڑیا!" وہ نگینہ کو سینے سے لگائے بے آواز روئے، پھر انہوں نے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح اُس کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالا، گارڈ جو اُن کے آفس سے آیا تھا اُس نے اگلی سیٹ پر جا کر ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔

احمد شاہ جو بیگ لائے تھے وہ لے کر ترنم اور جاوید کی طرف آئے۔

"بیٹا! احسان اُتارنے والی ذات صرف اور صرف اللہ رحمان کی ہے انسان کسی کا نہ احسان اُتار سکتا ہے اور نہ ہی ذمّے داری اٹھا سکتا ہے یہ سب اللہ کی مدد سے ممکن ہوتا ہے۔ آپ نے جو ذمے داری اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی سے کھیل کر میری بیٹی کی اٹھائی، میں یہ احسان زندگی بھر نہیں اُتار سکتا۔ لیکن میں اپنی بیٹی کو دُعا دے سکتا ہوں کہ اللہ رحمان آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راضی ہو جائے، آپ کو دین و دنیا کی خوشیاں اور آسانیاں حاصل ہوں۔'' احمد شاہ کے الفاظ تھے کہ کوئی دوا! ترنم کو لگا سوئیوں سے بھرے اُس کے وجود سے ایک دم سے بہت ساری سوئیاں نکل گئی ہوں۔

ترنم کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئیں۔ جواباً کوئی بات کہنا اُس سے مشکل ہو گیا، گلا آنسوؤں سے بھرا پڑا تھا۔

''آپ ہمارے ساتھ چلیں!'' احمد شاہ نے آفر کی۔

''نہیں! یہ ٹھیک نہیں ہوگا!'' ترنم نے دھیمی آواز میں انکار کر دیا۔

''بیٹا! آپ میرے ساتھ میری بیٹیوں کی طرح رہو!'' احمد شاہ نے اصرار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اُس خطرناک گروہ سے بھاگ کر ترنم کے پاس کوئی پناہ نہ ہوگی۔

''انکل! ابھی میرا جانا ٹھیک ہے آپ خیریت سے گھر پہنچ جائیں اور نگینہ کو فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھائیں، میں نکلتی ہوں۔'' ترنم نے رُک رُک کر کہا۔

''بیٹا! میں آپ کو کسی احسان کے زمرے میں نہیں، تحفتاً کچھ رقم دینا چاہتا ہوں آپ کے کام آئے گی۔'' احمد شاہ نے بے حد پیار بھرا اصرار کیا۔

ترنم کو اُن کا اتنی فکر کرنا بے حد اچھا لگا تھا۔

''انکل! پیسہ میرا پرابلم نہیں ہے، میری دوست نے بہت ساری رقم میرے حوالے کی ہے اگر مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو استعمال کرلوں گی۔'' ترنم نے رسانیت سے انکار کیا۔

''پھر بھی بیٹا! مجھے خوشی ہوگی اگر آپ یہ رقم رکھ لیں ایک باپ کا تحفہ سمجھ کر!'' احمد شاہ اپنے اصرار پر ڈٹے رہے۔

''انکل! میرے ساتھ جو لڑکا ہے، وہ بھی اپنی جان پر کھیل کر آیا ہے غربت اور لمبی چوڑی عیال داری کی وجہ سے وہ میڈم راگنی جیسے بُرے لوگوں میں پھنس کر رہ گیا ہے اگر یہ رقم آپ اُسے دے دیں تو اُس کو اُن لوگوں سے جان چھڑانے میں مدد مل جائے گی۔ ویسے بھی آج یہاں میرا پہنچنا صرف اِس لڑکے کی وجہ سے ممکن ہو پایا ہے۔'' ترنم نے سچائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! آپ یہ رقم اُس کو دے دو۔'' احمد شاہ نے فیصلہ کرنے میں سیکنڈ لگایا تھا۔ نیکیوں کو جو لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپناتے ہوں، وہ نیکی کرنے میں اِسی طرح جلدی کرتے ہیں۔

''چلیے اپنے ہاتھ سے ہی دے دیں۔'' ترنم اُن کو لیے گاڑی کی جانب بڑھی، جہاں جاوید مسلسل ادھر اُدھر نگاہ گھما رہا تھا بے شک یہاں میڈم کے بندے نہ آسکتے تھے لیکن جاوید بے خبری میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

''السلام علیکم!'' احمد شاہ نے جاوید سے مصافحہ کیا۔ جاوید نے گھبرائے ہوئے انداز میں احمد شاہ سے ہاتھ ملایا۔

''بیٹا! آپ نے آج جو کیا، اللہ نے آپ کو بہت بلند درجات عطا کرنے ہیں، یہ میری جانب سے

قبول کرلیں۔'' احمد شاہ نے عاجزی سے کہا۔

''میں! نہیں، نہیں جی! ایسی کوئی بات نہیں، میں نے یہ کام اللہ کی رضا کی لالچ میں کیا ہے۔'' جاوید ان پڑھ ہو کر بھی بہت بڑی بات کی تھی۔

''جاوید! رکھ لو، اپنی باجی کی بات تو مانو گے نا!'' ترنم نے اُسے بے احد اصرار سے رقم کا بیگ دیا۔

''یہ کتنے ہیں؟'' جاوید نے تھوڑی سی اِس بیگ کی زِپ کھول کر اتنی زیادہ رقم دیکھ کر گھبرا کر پوچھا۔

''بیس لاکھ!'' احمد شاہ نے آہستہ سے یوں کہا جیسے وہ کم رقم لائے ہوں، اُن کو واقعی شرمندگی تھی۔ جس احسان اُن لوگوں نے اُن کی ذات پر کیا تھا یہ تحفہ تو واقعی اُن کو حقیر لگ رہا تھا۔

''بیس لاکھ!'' جاوید نے بے اختیار لبوں پر زبان پھیری۔

''سر! میں اتنی رقم نہیں رکھ سکتا۔'' جاوید نے گھبرا کر کہا۔

''بیٹا پلیز!'' احمد شاہ نے عاجزانہ کہا۔

''رکھو جاوید! یہ میری بہن رانی اور تمہارے بچے کا حق ہے۔'' ترنم نے جاوید کو زبردستی بیگ تھمایا۔

''اچھا انکل! اب ہم چلتے ہیں آپ بھی فوراً نکلیں۔'' ترنم نے اُن کے آگے سر کرتے ہوئے کہا۔ بابا اُس نے بے اختیار کیا تھا۔ ایسا وہ ہمیشہ تب کرتی تھی، جب وہ کہیں جانے سے پہلے اپنے بابا سے ملتی۔

احمد شاہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا اور پیار دیا۔ ترنم اس قدر بے خود ہوئی کہ اُس نے اُن کے ہاتھ پکڑ کر بوسہ دیا۔ اُس کی یہ حرکت غیر ارادی تھی احمد شاہ کو سنبھلنے میں بس ایک پل لگا، وہ اتنی عمر میں لوگوں کو بہت اچھی طرح پڑھنا جان چکے تھے۔

ترنم کی آنکھوں میں جو حسرت تھی، وہ باپ کی محرومی کی تھی۔

''انکل! آپ نے بُرا تو نہیں مانا۔'' ترنم کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ ایک بہت جذباتی حرکت کر بیٹھی

''بیٹیوں کا پیار قسمت والوں کو ملتا ہے۔'' احمد شاہ نے ایک بار پھر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے دعا عطا کی۔

''انکل! جس طرح حجرِ اسود کو بوسہ دے کر ہر مسلمان خود کو گناہوں سے پاک سمجھتا ہے، میں نے بھی اپنے اندر کی آلودگی کو کم ہوتے محسوس کیا ہے۔'' ترنم نے دل میں کہا اور اُن کو بے حد عقیدت سے

''میں چلتی ہوں انکل!'' ترنم نے ایک بار پھر ان کو جی بھر کر دیکھا۔ اس کو اپنے باپ کا چہرہ احمد شاہ کے چہرے میں ضم ہوتا محسوس ہوا۔

''بابا!'' ترنم کے دل سے سسکی اُبھری۔

اور وہ تیزی سے تقریباً دوڑتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھی۔

احمد شاہ نے واضح طور پر ترنم کے منہ سے لفظ بابا سنا تھا اُن کے دل سے اِس بچی کے لیے ڈھیر ساری دعائیں نکلیں۔ وہ کچھ لمحے تو اُن لوگوں کی دھول اڑاتی گاڑی کو دیکھتے رہے پھر اپنی گاڑی میں آ بیٹھے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاڑی چل پڑی تھی انہوں نے نگینہ کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور اُس کے جلتے ماتھے پر بوسہ دیا۔
نازوں پلی اُن کی گڑیاں کیسے کملا کر مرجھا گئی تھی، اُن کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر مسلا۔
''یا اللہ! اگر یہ تیری آزمائش ہے تو مجھ پر یہ آزمائش آسان کر دے، اولاد کی آزمائش جھیلی نہیں جا...'' احمد شاہ نے اللہ سے یوں فریاد کی جیسے دو دوست بیٹھے گفتگو کرتے ہیں۔
''اللہ رحمان! میرے بچے ولی کو بھی بحفاظت گھر پہنچا دے۔'' احمد شاہ نے صدق دل سے دعا کی

❖❖○❖❖

اسی بے بسی کی شال اوڑھے
اگرچہ تیرگی کے جنگلوں میں
راستہ تک کھو چکی ہے
پھر بھی یہ امید رکھتی ہے
جسے مچھلی نگل لے
اور مچھلی بحر کی تاریکیوں میں
راستے کے نور سے محروم ہو جائے
اسے جس نے دیا تھا روشنی کا استعارہ
وہ مجھے بھی ایک جگنو ایک تارہ
راستے کا اِک سہارا
جنگلوں کے بیچ بخشے گا

''باجی! آپ کو کہاں پہنچاؤں؟'' جاوید نے گم سم بیٹھی ترنم سے سوال کیا۔
ترنم اِس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ جاوید کی بات سُن نہ پائی، اِس لیے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ... لگی۔
''وہ دراصل باجی! میں ڈیوٹی پر ٹائم پر پہنچنا چاہتا ہوں تاکہ میڈم کے لوگ مجھ پر شک نہ کریں، ... شک میں اُن کے گروہ میں عملی طور پر کوئی کام نہیں کرتا لیکن ڈرائیور ہوں، وقت کی پابندی نہ کی تو وہ ... پر بھی شک کر سکتے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں نا؟'' جاوید کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیسے ترنم کو بتائے کہ ... میڈم راگنی کی نظر میں آ سکتا ہے
''تم ٹھیک کہتے ہو جاوید! تم کو فوراً نکلنا چاہیے تم جاؤ۔'' ترنم نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔
''باجی! آپ بُرا مان گئیں؟
''نہیں جاوید! میں تم سے حقیقت میں کہہ رہی ہوں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہ ظالم عورت کسی کو معاف نہیں کرتی۔'' ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔
نگینہ کو اُس کے گھر پہنچانا تھا، محفوظ ہاتھوں میں دینا تھا، وہ دے دیا، اب مجھے کوئی فکر نہیں اگر میڈ... کے بندے مجھے پکڑ بھی لیتے ہیں تو!'' ترنم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
''نہیں باجی! ایسے نہ کہو، جان بچانا فرض ہے بے شک موت کا ایک وقت مقرر ہے لیکن یوں مو...

...نہ جانا تو خودکشی ہے اور خودکشی حرام ہوتی ہے۔'' جاوید نے مولانا کے انداز میں کہا۔
''اچھا!'' ترنم عجیب سی ہنسی ہنسی۔
''ساری عمر حرام زندگی گزاری ہے، اب مزید حرام ہونا کیا بچا ہے؟'' ترنم نے آنکھیں صاف کرتے ... کہا۔
''باجی! حرام زندگی تو گزر گئی، حرام موت سے تو بچنا چاہیے نا؟'' جاوید کی بات پہ ترنم نے ایک دم چونک کر دیکھا۔
''تم ٹھیک کہتے ہو! میں اور ماہی حلال موت کی خاطر تو وہاں سے بھاگی تھیں، میں کیسے اپنا مقصد ...سکتی ہوں؟ ترنم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔
''جاوید! تم مجھے کسی ٹرین میں بٹھا دو میں اِس شہر سے نکل جانا چاہتی ہوں، اِن لوگوں سے دُور بہت ...'' ترنم نے آنکھیں میچ کر کہا۔
''لیکن باجی وہ لوگ ہر بس اسٹینڈ اور اڈے پر کھڑے ہوں گے، یہ خطرناک ہوگا۔'' جاوید نے حقائق ...ڈالی۔
''پھر! کیا کروں؟'' ترنم خود اِس وقت بہت سُست رفتار سے کچھ سوچ پا رہی تھی، ڈرگز کے مسلسل ...ل سے اُس کا دماغ اب ہر وقت سویا سویا رہتا تھا وہ جسمانی طور پر بھی بے حد کم زور ہو چکی تھی۔ ...لک اب اُس نے ڈرگز کا استعمال چھوڑ دیا تھا لیکن پھر بھی اتنے عرصے کا نشہ کرنے کی عادت نے ...کے جسم و دماغ پر بہت زیادہ اثرات مرتب کیے تھے۔
''آپ یوں کریں کہ نان اے سی والی گاڑی میں بیٹھیں اور نقاب کر کے بیٹھیں۔ نان اے سی غریبوں ...یاں بنا کسی سہولت کے ہوتی ہیں اُن لوگوں کے دماغ میں آئے گا کہ نازک پریاں مہنگی گاڑی سے ...گی۔ بس یہاں سے وہ دھوکا کھائیں گے اور آپ کا نکلنا آسان ہو جائے گا۔'' جاوید کے پاس عملی ...بھی بہت تھا اُس کی ترکیب میں خطرہ کم تھا۔
''ٹھیک ہے تم مجھے ایسی ہی گاڑی میں بٹھا دو۔'' ترنم نے فوراً حامی بھرتے ہوئے کہا۔
''لیکن آپ جائیں گی کہاں؟'' جاوید نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔
''ملتان!'' ترنم نے بے اختیار کہا۔ پھر وہ خود بھی چونکی کہ اُس نے ایسا کیوں کہا۔
''میں نے ایسے ہی اِس شہر کا نام لیا ہے یقیناً وہاں میرے لیے کوئی کام ہے ورنہ میں اِس سے پہلے ...ایک وڈیرے سے ملنے گئی تھی۔'' ترنم کے ذہن میں بدمست گورمانی کی شکل گھومی۔
''ٹھیک ہے باجی! میں آپ کو اڈے پر اتار کر آتا ہوں۔'' جاوید نے فوراً حامی بھری اور تیزی سے ... دوڑا دی۔
''تم جاؤ جاوید۔'' ترنم نے گاڑی کی کھڑکی سے لگے جاوید سے کہا۔
''باجی! تم بہت اچھی ہو، کیسے اِن بھیڑیوں کے گروہ میں آ گئیں؟'' جاوید نے افسوس سے کہا۔ ابھی ...نے میں وقت تھا وہ مسلسل کھڑکی کے پاس کھڑا تھا، ایک شاپر میں وہ کچھ سیب مالٹے اور جوس وغیرہ ...ترنم کو زبردستی تھما چکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بس بعض اوقات!'' ترنم کچھ بتاتے بتاتے رک گئی۔ خود کی رسوائی خود سے کرنا بے حد دُشوار ہوتا ہے، ترنم کو بھی یہ مشکل درپیش تھی۔ پھر اُس نے گہرا سانس بھرا۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان بعض اوقات شر بھی ایسے مانگتا ہے جیسے خیر مانگتا ہے، بس م زندگی کی تباہی بھی ایسی ہی ایک دُعا اور حرکت کی وجہ سے ہے۔'' ترنم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''دراصل انسان کو صبر نہیں آتا، وہ جلد بازی کرتا ہے اور اللہ سے وہ مانگتا ہے جو اُس کے لیے ا نہیں ہوتا۔'' ترنم کی نگاہوں میں ''ڈاکٹر جی'' کا چہرہ گھوم گیا۔

''ہم کو اللہ کے دیے پر مطمئن ہونا چاہیے جاوید! کیوں کہ وہی ہمارے لیے بہترین ہے، یہ بات نے اپنے وجود اور روح کو تار تار کرکے پائی ہے کاش! کاش اس بات کو میں تب محسوس کر لیتی جب تحفظ میں تھی۔'' ترنم کے لہجے میں بہت سارے دُکھ اکٹھے بول رہے تھے۔ جاوید نے بے حد دُکھ سے کو دیکھا۔

''جاوید! میرا بس چلے نا تو میں ہر غریب لڑکی کو پکڑ پکڑ کر بتاؤں کہ اللہ کا دیا بہترین ہے کیوں کہ ہمیشہ اپنے بندوں کو ''دی بیسٹ'' دیتا ہے، چاہے وہ غربت ہی کیوں نہ ہو! چاہے وہ کم علمی ہی کیوں ہو! دِل! یہ دِل ہے نا انسان کا، اگر اس بات کو محسوس کر لے تو کبھی کوئی لڑکی ترنم نہیں بنے گی، غربت علمی! بہ ظاہر بہت تکلیف دہ چیزیں ہیں لیکن اِس میں چھپی **Hidden Blessing** کو میں نہ جان تھی، میں نے اللہ کے دیے کو بہترین نہ جانا اور اپنے لیے بہترین ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی تو دیکھو! نہ میرے سر پر آسمان ہے نہ پیروں تلے زمین، نہ عزت ہے نہ آبرو! ایک خالی ڈبے جیسا وجود ہے لڑھکتا ہوا جانے کہاں چلا جائے۔'' ترنم بولتے بولتے ہانپنے لگی۔

''باجی! آپ بہت اچھے ہو، اللہ بھی بہت اچھا ہے وہ معاف کر دے گا، آپ توبہ کرلو، بس اللہ اتنا چاہتا ہے وہ توبہ کرنے والوں کا روز انتظار کرتا ہے۔'' جاوید نے کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود گہری بات کی تھی۔

''جاوید! تم کو یہ سب باتیں کس نے بتائیں؟'' ترنم چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہماری خالہ نے، بہت نیک اور اچھی عورت ہے برسوں پہلے اُس نے میری جان بچائی تھی، ا کبھار دوروں کی وجہ سے مہینوں کملی ہو جاتی ہے لیکن جب ہوش میں ہوتی ہے تو بہت اچھی باتیں ہے۔ جب اُس نے میری جان بچائی تھی تو میں اُسے اپنے گھر لے آیا تھا بعد میں رانی کا اُس سے دل لگا کہ اُس نے اُسے کبھی جانے ہی نہیں دیا۔'' جاوید کو لمبی چوڑی باتیں کرنے کی عادت تھی۔

ترنم سسکیوں سے رو رہی تھی۔ جاوید کا فون نمبر تو لے چکی تھی کہ وہ کہیں پہنچ کر اپنی ماں کے پوچھے گی لیکن اُس نے جاوید کو یہ نہ بتایا تھا کہ وہی اُس نیک عورت کی بدبخت بیٹی ہے۔

ترنم نے باتوں باتوں میں جاوید سے اُس ہسپتال کا ایڈریس بھی لے لیا تھا، جہاں وہ آج کل تھیں۔

''جاوید! تم اُن کا بہت خیال رکھنا۔'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ جاوید نے ترنم کے اِس جملے کو بھی اُ اچھائی پر مامور کیا، وہ جان نہ پایا کہ ترنم اتنی دیر سے آخر اُس کی خالہ کا ٹاپک چھیڑے کیوں بیٹھی ہ

''بالکل باجی! میں تو اُس کا خیال بالکل اپنی سگی ماں جیسا کرتا ہوں، میری خود کی ماں سوتیلی ہے میری گی چار بہنوں اور میرے لیے وہ بہت سخت ہے ایسے میں خالہ کا وجود نعمت کی طرح لگتا ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''چلو بھئی چلو! بس چلنے لگی ہے۔'' کنڈیکٹر نے اونچی آواز میں ہانک لگائی۔

''اچھا باجی! خیریت سے پہنچ کر اطلاع کرنا۔'' جاوید نے رینگتی بس کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔

''تم بھی رانی کو میرا پیار دینا۔'' ترنم نے کہا۔

''اچھا باجی پھر ملیں گے۔'' جاوید نے اونچی آواز میں کہا اور ساتھ ہی ہاتھ ہلایا۔

''بشرط زندگی۔'' ترنم نے ڈبڈبائی نگاہوں سے اِس شہر پر آخری نگاہ ڈال کر زیرِ لب کہا۔

❖❖○❖❖

کچھ لوگ اتنے خاص کیوں ہوتے ہیں؟
جسم میں جاں کی طرح کیوں ہوتے ہیں
کچھ لوگ اتنے خاص کیوں ہوتے ہیں؟
جسم میں دِل کی طرح ہوتے ہیں
کہ دل نہ ہو تو پھر ہم بھی نہیں ہوتے ہیں

طارق نے اپنے ماتحتوں کو مختلف ہدایات دے کر آفس بھیجا اور خود اِس پرائیویٹ کلینک چلا آیا، جہاں ں کی دشمنِ جاں تھی۔

تقریباً دوڑتے ہوئے اُس نے ریسپشن سے نگینہ کے کمرے کا راستہ پار کیا، جس بے چینی سے اُس نے دروازہ کھولا تھا سامنے احمد شاہ کو جو جانماز بچھائے شاید نوافل ادا کر رہے تھے اُسے اپنی بے چینی کو یں روکنا پڑا۔ عجیب سی بے بسی تھی۔ دِل تو کرتا تھا کہ سامنے لیٹی بے ہوش لڑکی کو اپنے سینے میں یوں پالے کہ پھر کوئی اُس کو اُس سے جدا نہ کر سکے۔

وہ نگینہ کو تب سے چاہتا آ رہا تھا، جب اُسے محبت کا مطلب بھی معلوم نہ تھا اِس لیے وہ اُس کے اندر ن کی طرح دوڑتی تھی۔ وہ بے آواز وہ نگینہ کے قریب آ کھڑا ہوا تھا اُس کے بازوؤں اور پیروں پر ریٹوں کے داغ کے نشان تھے طارق کا فشارِ خون بڑھ گیا تھا۔

نگینہ کے سنہری بالوں کی لمبی چوٹی کو کاٹ دیا گیا تھا چہرہ اور جسم نیلوں نیل تھا۔ ایک بازو پر پلاسٹر ھایا گیا تھا۔

''نگینہ کی آبرو کا موتی محفوظ ہے طارق صاحب! لیکن اُن ظالموں نے اُسے جسمانی طور پر بہت مارا ہے۔'' طارق کے کانوں میں ترنم کی آواز گونجی۔

طارق نے بے اختیار نگینہ کے ہاتھ کو تھاما۔

''تمہارے ایک ایک زخم کا حساب لوں گا، وہ سسکی جو تم نے اِن زخموں پر بھری ہوگی اُس سسکی بھرے لس کی قسم میں اُن لوگوں کی سانسیں اُن کے وجود میں دو بھر کر دوں گا۔'' طارق دھیمی آواز میں بولا۔ شک اُس نے سرگوشی کی تھی لیکن احمد شاہ جو دُعا مانگ رہے تھے انہوں نے بہ خوبی سُن لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے چونک کر طارق کو دیکھا لیکن طارق خود میں نہ تھا، وہ جن نگاہوں سے نگینہ کو دیکھ رہا تھا اُس کے حال دِل کا ماجرا اُس کے چہرے پر لکھا تھا۔

احمد شاہ طارق کا راز جان گئے تھے۔

''حیرت ہے آج سے پہلے طارق نے کبھی بھی واضح نہیں ہونے دیا۔'' احمد شاہ کے اندر سوال اُٹھا تھا

''نگینہ!'' طارق نے اُس کے ماتھے سے بال پیچھے کرتے ہوئے پکارا۔

لیکن وہ بے ہوش تھی، دواؤں کے زیرِ اثر تھی۔ طارق کو کیسے سُن سکتی تھی۔

''بیٹا! نگینہ کو نیند کا انجکشن دیا گیا ہے وہ سو رہی ہے۔'' احمد شاہ نے پیچھے سے آواز دی۔

طارق ایک دم پیچھے پلٹا اور کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ احمد شاہ کو نوافل میں مصروف جان کر نگینہ کے بے حد قریب کھڑا تھا، ان کی آواز سنتے ہی طارق نے خود کے جذبات کو ایک گہری سانس لے کر کم کیا۔

''ترنم نے کچھ کہا تھا؟'' طارق نے سوال کیا۔

''نہیں! لیکن اُس نے ہمارے اُوپر بہت بڑا احسان کیا ہے وہ بہت اچھی بچی ہے، اللہ اُس کی آسانیاں اُتارے۔'' احمد شاہ نے سچے دِل سے ترنم کو دُعا دی۔

''آمین!'' طارق نے با آواز بلند کہا۔

''ڈاکٹر! ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟'' طارق نے اپنے لب کچلنے کے عمل کو روکا، وہ اپنے جذبات کسی پر عیاں نہ کرنا چاہتا تھا لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ اُس کی چوری احمد شاہ نے پکڑ لی ہے۔

''بہت سارے زخم ہیں، لیکن نگینہ کی ذہنی حالت بہت خراب ہے ایک بار ہوش میں آئی تھی تو ڈر اور خوف سے بہت بُری حالت تھی اُس کی۔'' احمد شاہ کا لہجہ بے حد غمگین تھا۔

''جانے روشن کیسے نگینہ کی یہ حالت سہہ پائے گی!''

''انکل! میں اُن جانوروں کو جنھوں نے میری نگی میرا مطلب ہماری نگینہ کو اِس حال میں پہنچایا۔ بہت بُری سزا دلواؤں گا تا کہ آئندہ وہ کسی کی بہو بیٹی پر ہاتھ نہ ڈال سکیں۔'' طارق نے اپنے آپ اپنے جملے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''خدا کرے ظالم اپنے انجام کو پہنچیں۔'' احمد شاہ نے تھکن سے کہا۔

''صد شکر ہے کہ ہمارا بڑا نقصان نہیں ہوا، اگر اللہ ہمیں اِس آزمائش میں ڈال دیتا تو۔'' احمد شاہ نے لرز کر کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں اللہ نے بہت زیادہ کرم کیا ہے ورنہ تو میں نے اس گروہ کے ہاتھوں لڑکیوں کی جو درگت بنتے دیکھی ہے وہ ناقابلِ بیان اور ناقابلِ برداشت ہے۔'' طارق کی نگاہوں میں سحرش کا چہرہ گھوم گیا۔

''بے شک میں اپنے اللہ کا بہت احسان مند ہوں۔'' احمد شاہ نے سچے دل سے کہا۔

جب کہ طارق نے ایک بار پھر نگینہ کو بھرپور نظر سے دیکھا۔ کاش وہ جاگتی ہوتی تو وہ اُس سے بات کر سکتا۔ اُسے فوراً کام سے نکلنا تھا اِس لیے اُسے نگینہ سے بات کرنے کی بے چینی تھی۔

''ابھی سائرہ آجائے گی تو آپ انٹی کے پاس چلے جائیے گا، آنٹی اگر بہتر ہوں تو اُن کو ڈسچارج روا کر ادھر نگینہ سے ملوا دیجیے گا، اُن کے دِل کو تسلی ملے گی۔'' طارق نے مصروف سے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا!'' احمد شاہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''طارق بیٹا! ولی سے کوئی رابطہ ہے؟'' احمد شاہ نے طارق سے سوال کیا۔

''جی ہو گیا تھا۔'' اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اُسے روکنا تھا کہ وہ شخص اُسے Trape کر رہا تھا۔'' احمد شاہ نے جلدی سے کہا۔

''سر! زندگی بہت مختلف ہے نا؟'' طارق نے ایک دم بے حد مختلف سوال کیا۔

''کیوں ایسا کہہ رہے ہو؟'' احمد شاہ نے سوال کیا۔

''اِس لیے کہ یہ سوال بارہا میرے سامنے آتا ہے کہ جن سے انسان کے دِل ملتے ہیں، اُن سے ڈوریں کیوں نہیں ملتیں اور جن سے ہمارے دِل نہیں ملتے اُن کو ہماری زندگیوں کا ایک بڑا حصہ کیسے مل جاتا ہے۔'' طارق کے دماغ میں خود کی کیفیت گھومی تھی کہ کیسے سحرش کو اُسے اپنی زندگی میں شامل کرنا پڑا تھا اور اب ولی کو مسکان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا پڑا۔

''اس لیے کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے اور انسان فوری طور پر اُس مصلحت کو جان نہیں پاتا لکوہ کناں سوالوں کی ڈور میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔'' احمد شاہ نے بے حد سوچ کر جواب دیا۔

''انکل! ولی مسکان سے نکاح کر چکا ہے۔'' طارق کو احمد شاہ کی بات سے حوصلہ ملا تھا اِس لیے اُس نے سچ کہہ دیا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون!'' احمد شاہ نے بے اختیار کہا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ بوجھ اور غم، جو انسان خود نہیں سنبھال سکتا اُسے اللہ کی جانب واپس لوٹا دینا چاہیے۔

بے اختیار ہو کر انسان اگر اللہ کے اختیار کو سمجھ سکے تو وہ کوئی سمجھ نہیں ہوتی، اللہ کو نعمتوں اور اختیارات کے زمانے میں سب سے بڑا اختیار والا، ماننے والا ہمیشہ احمد شاہ کی طرح پھل پاتے ہیں اللہ کے ہاں اور دُنیا میں کامیاب ہوتے ہیں اِسی لیے تو اللہ ایسے لوگوں کے دُکھوں کو بھی خوشیوں میں بدل دیتا ہے۔ نگینہ جس طرح معجزانہ طور پر بچ کر آئی تھی اُسے احمد شاہ کی دعائیں محافظ بن کر جہنم سے نکال لائی تھیں، ان کا ایمان تھا کہ اُن کا بیٹا بھی بہت جلد اُن کے پاس ہوگا۔

''انکل! آپ پریشان نہیں ہیں؟ طارق نے سوال کیا۔

''میری پریشانیوں کو دیکھنے والا اللہ ہے نا!'' احمد شاہ نے اطمینان سے کہا۔

''انسان کو جب جب پریشانی کے طاقت ور ریلے کو Face کرنا ہو تو ہمیشہ اُسے ایک کشتی کی ضرورت ہوتی ہے جو اُسے محفوظ رکھتی ہے اور یہ کشتی صرف مانگنے والوں کو اللہ دیتا ہے، مدد کے لیے غیر کو پکارنے والے ہمیشہ ڈوب جاتے ہیں، غرق ہو جاتے ہیں۔'' احمد شاہ دھیرے دھیرے بول رہے تھے اور طارق تو جیسے کسی اور ہی ٹرانس میں تھا۔

''سر! مجھے کہنے دیں کہ میں نے اپنی زندگی میں آپ جیسا بہتر اور صابر انسان نہیں دیکھا۔ آپ نے اتنا صبر کرنا کیسے سیکھا۔'' طارق نے بے حد عقیدت سے سوال کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواباً احمد شاہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔
''بیٹا! کوئی بھی چیز انسان خود سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ ہی حاصل کرسکتا ہے۔ جیسے نیکی کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت اللہ نوازتا ہے اُسی طرح ہر ہر مشکل معاملے میں استقامت اُسی اللہ کی جانب سے ملتی ہے، صبر ہو یا رزق! دونوں سے اللہ ہی نوازتا ہے بس یہ مانگنے اور خواہش کرنے والے کی شدت پر منحصر ہے، میں نے زندگی کی ہر فریاد اللہ سے کی ہے شاید اِسی لیے میں ہمیشہ عطا کیا گیا ہوں، ورنہ میں کیا اور کیا میری ہستی! اُس اللہ نے مجھے ہر ہر نعمت سے نوازا، اولاد جیسی دولت سے بھی جو میری زندگی میں ناممکن تھی۔'' احمد شاہ کھوئے کھوئے سے تھے وہ نگینہ کے سرہانے بیٹھ کر اُس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولے۔

طارق کے تڑپتے پھڑکتے دِل کو قرار آ گیا تھا وہ گزشتہ کچھ گھنٹوں سے اعصابی جنگ سے نبرد آزما تھا ایسے میں اُس نے ایک ایسے شخص کے منہ سے اتنے اچھے خیالات سنے، جو آزمائش کی رسی پر کھڑا تھا لیکن اُس کے منہ سے شکوے کے، آگ کے گولے نہ نکل رہے تھے بلکہ شکر کی ٹھنڈی پھوار برس رہی تھی۔

ایسے شخص کو بھلا کیوں اللہ نہ نوازتا۔

''سر! میں آپ کے گلے مل سکتا ہوں۔'' طارق نے عجیب سی فرمائش کی، پھر اُن کی بات سنے بغیر ہی اُن کے سینے سے جالگا۔

''تھینک یو سر۔'' طارق نے بے اختیار کہا۔

''یہ کس بات پر تھینک یو ہورہا ہے؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''بس آپ کے ہونے کا سر!'' طارق نے اُن کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''سر! مجھے بہت ضروری کام ہے ابھی نکلنا ہے میں شام میں چکر لگاتا ہوں۔'' طارق اُن سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

اُس کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا، اُس نے مسلسل ترنم کو فون ملایا، لیکن اُس کا فون بند پڑا تھا۔

''یہ لڑکی کدھر نکل گئی، یہ تو بہت کام کی تھی۔ کم آن، پک اپ دا فون!'' طارق نے مسلسل ترنم کا نمبر ملایا لیکن فون بند تھا۔

طارق چاہ رہا تھا کہ وہ ایسی حکمت عملی بنائے، جس میں کم سے کم غلطیوں کا امکان ہو۔

''مارک! تم تیار ہو جاؤ عبرت ناک انجام کے لیے۔'' طارق نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

طارق نے جیسے ہی ترنم کا نمبر ٹرائی کرنا بند کیا تو سحرش کا نمبر اسکرین پر جگمگایا گیا۔ اس نے ابھی اوکے آن ہی کیا تھا کہ سحرش بنا سلام دُعا کے بولی۔

جب وہ کہتے ہیں۔
تنہائی سے سمجھوتا نہیں ہوتا
تب میں ہنستی ہوں
کیسے نہیں ہوتا!
یہ تنہائی ہی تو ہے

وہ ہمیشہ ساتھ رہتی ہے
اِس کے علاوہ ساتھی کون ہے
جو ساتھ دے
اکیلی ہے
تنہائی کا ساتھ بھی چھوٹ گیا
تو کیا ہوگا؟
یہ اِس کو کون بتائے
جس کے بعد اِک سناٹا ہے

سحرش کی بے حد اُداس آواز موبائل سے اُبھر رہی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو شاید طارق زِچ ہوکر سحرش کو کچھ سخت کہہ ڈالتا۔ لیکن ابھی ابھی وہ احمد شاہ کی باتیں سُن کر سکون کا ایک عجیب سا فلیور چکھ کر آیا تھا وہ بہت شانت تھا۔ طارق کے کانوں میں ابھی تک احمد شاہ کے الفاظ گونج رہے تھے کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے اس مصلحت میں اچھائی ہوتی ہے اور انسان فطرتاً بے صبرا ہے اور فوری طور پر اُس مصلحت کو جان نہیں پاتا تو شکوہ کناں سوالوں کی ڈور میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے، جو لوگ نصیب میں لکھ دیے گئے ہیں ہم اُن کو اپنے رویوں سے بھی کبھی دُور نہیں کرسکتے۔ طارق نے بے اختیار طویل سانس بھری۔

''السلام علیکم۔'' طارق نے اُسے شرمندہ کرنے کے لیے جواباً سلام کیا۔

''گندی بچی! کیوں ایسی چیزیں پڑھتی ہو اور خود ساختہ اُداسی اور پریشانی کو دعوت دیتی ہو، کچھ اچھا پڑھا کرو اور مجھے بھی سُنایا کرو، میں دن بھر، رات بھر تھکا رہتا ہوں یار! تم تو اچھی دوست رہو۔'' طارق نے بے اختیار کہا۔

یہ احمد شاہ کے الفاظوں کا اثر تھا کہ وہ سحرش سے عام دنوں سے ہٹ کر بے حد نرمی سے بات کررہا تھا سحرش کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آرہا تھا کہ یہ طارق ہے اِس قدر اپنائیت! اس قدر اپنائیت نے اُس کی ساری تنہائی، اُداسی اور منہ میں بھرے سب شکوؤں کو چوس لیا تھا۔

''آپ اتنے اتنے دِن شکل نہیں دکھاتے، رابطے میں نہیں رہتے تو میرے دِل میں بھانبڑ جلنے لگتے ہیں۔'' سحرش نے بے بسی سے کہا۔

''دِل میں کوئی چنگاری اگر پھوٹ بھی پڑے تو اُسے فوراً بجھاتے ہیں نہ کہ اُسے آگ بناتے ہیں یہ نہ صرف خود کو جلاتی ہے بلکہ آپ کے پیاروں کو بھی جلاتی ہے اور میرا خیال ہے تم مجھے آگ میں جلانا پسند نہیں کروگی۔'' سحرش کو اُس کا اپنے آپ کو سحرش کا پیارا کہنا بے حد بھایا تھا۔

''کیا میری دعائیں قبول ہورہی ہیں؟'' سحرش نے بے اختیار سوچا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں میں آئندہ خیال کروں گی۔'' سحرش نے تابعدار بچوں کی طرح کہا۔

''لیکن اگر!'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

''لیکن اگر کیا؟'' طارق نے پوچھا۔

''اگر آپ کو دیکھنے اور ملنے کو دِل چاہے اور آپ دستیاب نہ ہوں تو کیا کرنا چاہیے؟'' سحرش نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے بسی سے کہا۔

''تو پھر گیٹ پر جانا چاہیے اور گیٹ کھلوانا چاہیے۔'' طارق نے شرارت سے کہا۔

''سچی! سحرش فون تھامے تھامے باہر پورچ کی طرف بھاگی۔

''مچی!'' طارق نے نرمی سے جواب دیا۔

چوکیدار نے دروازہ کھولا تو طارق کی گاڑی اندر داخل ہوگئی، سحرش دوڑتی ہوئی طارق کے ساتھ جا لگی

''میں نے آپ کو بہت مِس کیا۔'' سحرش کے لہجے میں بہت سی شدتیں بول رہی تھیں۔ جواباً طارق نے گرم جوشی سے اُس کا ہاتھ دبایا۔ سحرش کو خود پر یقین نہ ہو رہا تھا۔

''یا اللہ! یہ طارق کا کیسا روپ ہے، یہ تو میرے خوابوں جیسا ہے۔'' اُس نے دِل میں کہا۔

''آپ کے لیے چائے لاؤں یا کھانا؟'' سحرش نے حسبِ عادت طارق سے پوچھا۔

اُس کی کوشش ہوتی تھی کہ طارق کا ہر کام خود کرے۔

''جو کچھ کھلانا ہے کھلا دو، میرے پاس کھانے کے لیے آدھا گھنٹہ اور تم سے ایک اہم بات کرنے کے لیے ایک گھنٹہ ہے۔'' طارق نے بستر پر جوتوں سمیت لیٹتے ہوئے کہا۔

سحرش نے بہت پیار سے اُس کے جوتے اتارے وہ اُسے ایسے تک رہی تھی، جیسے کوئی داسی کسی دیوتا کو دیکھتی ہے۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' طارق نے شرٹ کے اوپر کے بٹن کھول کر کروٹ لی اور سر تکیے پر ڈال دیا۔

''کچھ نہیں!'' سحرش نے نگاہیں جھکا کر کہا۔

سحرش سرہانے بیٹھ کر دھیرے دھیرے طارق کا سر دبانے لگی، طارق کو غنودگی آ گئی تھی۔

کچھ غیر معمولی سا لمس تھا جو طارق نے نیند میں محسوس کیا۔ اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

کچی نیند کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے، طارق کا ذہن سویا ہوا تھا وہ فوری طور پر جان نہ سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اُس کے بے حد قریب کوئی لیٹا ہوا تھا۔

انسان جس کو چوبیس گھنٹے سوچے وہی تصور اور وہی چہرہ حقیقت بن کر سامنے گھومتا ہے۔ طارق کو بھی وہ نگینہ کا چہرہ لگا۔ نگینہ مسکراتی تو وہ بھی مسکراتا تھا۔ بس ایک پل تھا کہ وہ شاید آگے بڑھتا، تصور کسی پانی کی تصویر کی طرح ایک دم ٹوٹ گیا۔

سامنے سحرش تھی۔ طارق ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے گھنے بال ماتھے پر آن گرے۔ اس نے اپنے بالوں اور شرٹ کو درست کیا اور بیڈ سے نیچے اُتر آیا، اُسے یہ سب کچھ اچھا نہ لگا تھا۔

''کیا ہوا؟'' سحرش دوسری جانب سے اُتر آئی۔

''کچھ نہیں!'' طارق نے گلا کھنکھار کر کہا۔

''مرد کو اتنا نہیں آزمانا چاہیے سحرش!'' طارق نے ایک دم مڑ کر کہا۔

''آپ میرے شوہر ہیں، میں آپ کو کیوں آزماؤں گی آپ پر میرا پورا حق ہے، کوئی نامحرم تھوڑی ہیں میرے لیے۔'' سحرش نے استحقاق بھرے لہجے میں کہا۔

طارق نے بے اختیار سر پر ہاتھ پھیرا۔

''سحرش تم!'' طارق اُسے کہتے کہتے رُکا کہ وہ حد سے بڑھ رہی ہے۔

''سحرش ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' طارق نے اُسے اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

''آپ کے پاس آ کر بیٹھتی ہوں تو آپ مجھ سے دوڑتے ہیں!'' سحرش نے نروٹھے پن سے کہا۔

''سحرش پلیز! تم اب بڑی ہو چکی ہو Kindly باتوں کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو نہ کہ اُن کو مزید الجھاؤ۔'' طارق کی اس قدر سنجیدگی دیکھ کر سحرش کو خاموشی سے اُس کے پاس آنا ہی پڑا۔

''جی کہیے!'' وہ قریب بیٹھ کر نگاہ جھکا کر اپنے ناخنوں سے کیوٹکس کھرچنے لگی۔ ایسا وہ اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش میں کر رہی تھی، طارق کے وجود سے آتی خوشبو اُسے پاگل کر دیتی تھی وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگتی تھی۔

''سحرش! تم میری بہت اچھی دوست ہو اور مجھے بہت عزیز بھی ہو، مجھے یہاں آ کر عادت ہوگئی ہے کہ ایک لڑکی مجھ پر واری صدقے جاتی ہر وقت میرے گرد منڈلاتی ہے، یقین مانو میں تمہاری محبت کا دِل سے قدر دان ہوں۔ لیکن!'' طارق کہتے کہتے رُکا۔

سحرش کا سانس بے ترتیب ہونے لگا۔

آج طارق کچھ اپنے معمول اور عادت سے ہٹ کر کر رہا تھا۔ وہ ایسا کیا کہنا چاہ رہا ہے، جس کے لیے اُسے اتنی بڑی تمہید باندھنی پڑ رہی تھی۔

''زندگی میں ہم کو وہ حاصل ہونا ضروری نہیں ہے جو ہم چاہتے ہیں۔'' طارق نے ٹھہر ٹھہر کر سنبھل سنبھل کر لفظ ادا کیے۔ سحرش یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔

''طارق ٹھیک ٹھیک بات کریں، میں آپ کی دوست نہیں، بیوی ہوں آپ صرف یہ بات یاد رکھا کریں۔ ثانیہ آنٹی کہتی ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اُن کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ دوستوں میں تو لاکھ پردے اور بھرم چلتے ہیں، مجھے آپ صرف دوستوں کی کیٹگری میں نہ رکھا کریں۔'' سحرش کا لہجہ صاف تھا۔

طارق کو ایک دم محسوس ہوا کہ سحرش ضرورت سے زیادہ باخبر اور پوزیسو ہو چکی ہے۔

لیکن آج وہ ارادہ باندھ کر آیا تھا کہ ایک پل صراط تو ضرور آج طے کر لینا ہے، چیزوں کو چھپانا بھی کھوٹ ہوتا ہے اور وہ اب جھوٹ سے نکلنا چاہتا تھا، اِس لیے اُس نے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''سحرش! میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں!'' طارق نے اپنی جانب سے دھماکہ کیا جب کہ سحرش کا چہرہ سپاٹ تھا ایسے جیسے اُس کے لیے یہ خبر کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔

''تم کو حیرت نہیں ہوئی؟'' طارق کو اُس کے حیرت نہ کرنے پر حیرت ہوئی تھی۔

''نہیں!'' سحرش نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں؟'' طارق نے سوال کیا۔

''اِس لیے کیوں کہ میں آپ دونوں کو ہسپتال میں اظہارِ محبت کرتے دیکھ چکی ہوں، میں سمجھتی تھی کہ آپ میرے ساتھ دھوکہ نہیں کریں گے لیکن آپ تو عام مردوں کی طرح نکلے۔'' سحرش نے سپاٹ لہجے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کہا۔

"تم اگر بدگمانی کے فلاسک میں خود کو بند کر کے میری بات سنو گی تو اصل بات کبھی نہ سمجھ پاؤ گی" طارق نے خائف ہو کر کہا۔

"نگینہ میری بچپن کی محبت ہے اور رہے گی، اگر میں اُس سے محبت کرنا چھوڑ دوں گا تو میں تمام طرح کی محبت سے محروم ہو جاؤں گا۔ وہ میرا محبت کا جنکشن ہے، جہاں سے میری روح چارج ہوتی ہے سمجھو اگر تم چاہتی ہو کہ تم کو مجھ سے محبت ملے تو میرے پاس نگینہ کی محبت ضروری ہے ورنہ میرا دل خالی ڈبے کی طرح ہو جائے گا اور میں کسی کے ساتھ انصاف نہ کر پاؤں گا۔" طارق نے سچائی سے کہا۔

سحرش کو اپنا دِل پھٹنے کے قریب محسوس ہو رہا تھا۔

"آپ نے آج سے پہلے مجھے یہ کچھ نہیں بتایا تھا اب کیوں بتا رہے ہیں؟" سحرش نے ڈوبتے لہجے سے پوچھا۔

طارق نے بہ غور اُسے دیکھا۔

"اس لیے کہ میں نگینہ سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔" طارق نے دھما کہ کر دیا تھا۔

"نہیں طارق! نہیں!" سحرش ایک دم سر ہلاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ میرے ہو، صرف میرے، میں کسی کے ساتھ آپ کو شیئر نہیں کروں گی۔" سحرش نے خود غرض انداز میں کہا۔

"میں تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ میری زندگی میں محبت کا جنکشن ہے۔ اگر وہ نہ رہی تو میں کسی سے پیار نہ کر پاؤں گا تم سے بھی نہیں۔" طارق نے سچائی سے کہا۔

"سو واٹ! مجھے پروا نہیں ہے مجھے تو بس آپ کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا۔" سحرش نے ضدی انداز میں کہا۔

"سحرش! میں تمہارے ساتھ انصاف کروں گا ایک دن اگر اُس کو دوں گا تو ایک دن تم کو دوں گا" طارق نے اُسے نرمی سے تھام لیا۔

"آگ لگیں یہ دن اور راتیں! مجھے آپ پورے کے پورے چاہئیں۔" سحرش نے غصے سے کہا۔

"سحرش! تم نا انصافی کر رہی ہو، میری نرمی اور تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔" طارق نے اِس بار سخت لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی بیوی ہوں اور مجھے حق ہے کہ آپ سے اِس بابت سوال کروں۔" سحرش نے چلا کر کہا۔

"سحرش! میں تم کو پورا کیا آدھا بھی نہیں مل سکتا اگر تم یوں کرو گی، تم مجھے اور میرے احساسات کو سمجھو۔" طارق نے نرمی سے کہا۔

"مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں تم کو خفا کر کے کوئی قدم بھی نہ اٹھانا چاہتا، بلکہ میں تمہارے احساسات کا خیال کر سکتا ہوں تو تم کو بھی کرنا چاہیے۔"

"میں کیا سمجھوں طارق! یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہے۔" سحرش رو دینے کو تھی۔

"سحرش! میں تم کو تمہارے پورے حقوق دوں گا۔" طارق نے اُس کو کندھوں سے تھام کر کہا۔

"وہ تو آج تک مجھے نہ ملے، لیکن میں بولی نہیں تھی لیکن اب بھیک میں مجھے میرا حق بھی نہیں چاہیے۔" سحرش نے اِس قدر ضد سے کہا کہ طارق ایک دم اُٹھ کر جوتے پہننے لگا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"جہنم میں!" طارق نے جل کر کہا۔

"آپ اُس حرافہ کے پاس جا رہے ہیں نا؟" سحرش نے چیخ چیخ کر کہا۔

"شٹ اپ سحرش! شٹ اپ! تم اُس پاکیزہ لڑکی کے متعلق ایسا اِس لیے کہہ رہی ہو کہ وہ میرے دل میں بستی ہے، تم کو شرم آنی چاہیے اپنی زبان اور خیالات پر، وہ تمہاری طرح بے آبرو نہیں ہوئی، باعصمت ہے وہ تمہاری طرح گھر سے نہیں بھاگی تھی اُس کی وجہ سے اُس کے ماں باپ اور خاندان کو کبھی سر نہیں جھکانا پڑا۔ وہ نہایت معصوم اور سادہ دِل ہے اور تم! تم اُسے حرافہ کہہ رہی ہو۔" طارق شاید اپنے آپ میں نہ تھا۔

سحرش پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی، اُس نے طارق کو اِس قدر بے بس کر دیا تھا کہ وہ اتنا کچھ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا ورنہ تو وہ آج تک اُس کا بھرم رکھتا آیا تھا کبھی اُس کو اُس کا ماضی نہ یاد دلایا تھا۔

کسی کو اتنا نہیں ستانا چاہیے کہ وہ اپنی عادت اور مزاج سے ہٹ کر React کرے۔

لیکن سحرش یہ غلطی کر چکی تھی۔

طارق اپنی بات کہہ کر رُکا نہیں بلکہ غصے سے جیکٹ اٹھا کر باہر نکل گیا جب کہ سحرش ابھی تک طارق کے جلتے ہوئے الفاظ میں گھری ہوئی تھی، اُسے ہوش تو تب آیا جب گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

وہ ایک دم نیند سے جاگی اور باہر کو دوڑی، لیکن تب تک طارق گاڑی لے کر باہر جا چکا تھا۔

اور وہ گیٹ کے پاس ایسے کھڑی اُسے جاتا دیکھ رہی تھی، جیسے اُسے آخری بار دیکھ رہی ہو!

❖❖○❖❖

سید سرفراز جب کمرے میں داخل ہوا تو ولی نے بے حد سپاٹ نظروں سے اُس کو دیکھا۔

اس نے بات کی تمہید کے لیے گلا کھنکھارا۔

"آپ غالباً مجھے میری بہن سے ملوانے جا رہے تھے؟" ولی نے چبھتی ہوئی نظروں سے سید سرفراز علی کو دیکھا۔

"ہاں! وہ بس ابھی تم مل لینا!" سید سرفراز علی نے کہا۔

جواباً ولی عجیب سی ہنسی ہنسا اور اُس سے زیادہ عجیب نظروں سے دیکھا۔

"بیٹا! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" سید سرفراز علی پہلی بار کسی کی نظروں سے گھبرائے تھے، شاید اِس لیے بھی کہ اُس کے دیکھنے کا انداز اور شکل کسی سے بہت ملتی تھی۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ جھوٹے لوگوں کے کتنے چہرے اور زبانیں ہوتی ہیں۔" ولی نے ٹھہر ٹھہر اور چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مطلب؟''

''مطلب میں جان چکا ہوں کہ آپ نے میری بہن کے اغوا کا ڈرامہ رچا کر مجھے trapped کر کے دھوکے سے اپنی بیٹی سے میرا رشتہ جوڑا ہے۔'' ولی نے سید سرفراز علی کو اپنی باخبری کا بتا کر ایک دھماکہ کیا۔ ولی اُن کی جانب جن نظروں سے دیکھ رہا تھا، سید سرفراز علی کے ذہن سے ایک دم سارے الفاظ اُڑ گئے۔

''آپ اب کیوں چُپ ہیں، میں سُننا چاہتا ہوں آپ کے نادر خیالات کہ ایک جھوٹا شخص آخر کتنی زبانیں بدلتا ہے۔'' ولی نے انگارے چبائے۔

Man to man fight شاید اسے ہی کہتے ہیں!

سید سرفراز علی کو بے حد شدت سے محسوس ہوا کہ وہ پہلی بار **Man to man finght** میں بُری طرح شکست کا سامنا کرنے والا تھا۔

ہنگامۂ روز و شب سے ہٹ کر
کچھ دیر کو ذات سے نکل کر
احساس ملے جو ماورائی
بے ساختہ دِل یہ چاہتا ہے
وہ ہاتھ جو لکھ رہا ہے سب کچھ
تقدیر کا کھول کر نوشتہ
جب اپنے ہی دھیان میں مگن ہو
چپکے سے اٹھا کے ایڑیوں کو
ہولے سے ورق الٹ کے دیکھوں
اس وقت میں جو ہے آنے والا
جان لیوا مسافتوں کے رستوں پر
کون کہاں تلک چلا ہے

ولی نے تیزی سے چلتی گاڑی کو ایک دم روکا، ٹائروں کی چرچراہٹ دور تک سنائی دی۔ ولی کی اندر ـ حبس اُترا ہوا تھا، اُسے زندگی میں پہلی بار سانس لینے میں اتنی دُشواری محسوس ہو رہی تھی۔ ولی نے راُدھر سر گھما کر جگہ کا جائزہ لیا کہ وہ کہاں ہے گاڑی بیچ راستے میں کھڑی کر کے بنا لاک کیے وہ قریب ر آتی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ آیا، جیب سے اس نے فون سیل نکالا، طارق کا میسج سامنے تھا نگینہ فاظت گھر پہنچ چکی ہے، میں تمہارے پہنچنے کا منتظر ہوں، اپنی خیریت کی اطلاع دو!

لمحہ لمحہ ارمانوں کی قربانی تھی
لمحہ لمحہ جرأت کی آزمائش تھی

وہ سودا کرنے گیا تھا اور سارے خسارے باندھ کر لے آیا تھا۔ یہ احساس بے بسی اُس کے اندر گھور یرے جیسی گھٹن اور حبس کو بڑھا رہا تھا۔

''کیوں؟ کیوں اے اللہ میں نے سب کچھ کیوں کھویا؟'' **Why Im The Loser**

Why——Why I Am——!

میں ایسے جال میں پھنسا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا کسی گناہ کی سزا تھی؟''
''یا کسی غلطی کی آزمائش تھی؟''
''اے اللہ! کیا میں بُرا ہوں۔''

''میں اِس احساس سے مر رہا ہوں کہ میں نے تو زندگی میں ہمیشہ Fair Dealing کی، پر مِس چوک گیا اور یہ رزلٹ میری تقدیر کی شیٹ پر درج ہو گیا۔'' ولی با آواز بلند آسمان کی طرف منہ کر کے بولا۔

''پلیز اللہ! ٹیل می! پلیز اللہ!'' ولی ہانپنے لگا وہ آنکھیں موندھے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ولی کے سوال اِس قدر شور مچا رہے تھے کہ اس نے بے اختیار کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''زندگی وہ نہیں، جو ہم سوچتے ہیں، زندگی وہ ہے، جو ہم جیتے ہیں بے شک اس کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں ہے تو مین ڈور اُوپر ہوئی اتھارٹی کے پاس ہے اور جب جب وہ اتھارٹی اپنا ووٹ یوز کرتی ہے، فیصلہ اُس کا ہی چلتا ہے۔'' ولی کے کانوں میں اپنے ٹیچر سر بٹ کی بات گونجی۔

''میں بیٹی کا باپ ہوں، میری بیٹی لحہ لحہ زندگی سے دور ہو رہی تھی تم اُس کے جینے کی آخری اور پہلی کشش ہو، میں نے خودغرضی کی لیکن! لیکن میں بحیثیت باپ مجبور تھا۔'' یہ آواز سید سرفراز علی کی تھی۔

''ایک اور جھوٹ!'' ولی نے بے اعتباری سے کہا۔

''میرے پاس یہ آخری راستہ تھا، یہی آخری چوائس تھی میں مجبور تھا۔'' سید سرفراز کے لہجے میں نہ کہ لفظوں میں التجا تھی۔

''برائی اور دھوکہ اگر آخری راہ ہوں تو کیا اُسے اپنا لینا چاہیے؟'' ولی نے بے حد چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

سید سرفراز علی کے لیے اچھائی بُرائی کبھی کوئی معنی نہ رکھتی تھی لیکن وہ اس وقت ولی کو اپنے دام میں رکھنا چاہتا تھا اس لیے کھل کر اپنے دِلی جذبات اور سوچ کی عکاسی نہ کر سکتا تھا کہ اُسے کسی سے کوئی مطلب تھا اپنے فائدے کے لیے وہ ہر طرح کا بہروپ بھرتا تھا۔ اب جس قدر مکاری سے ولی کے سامنے موجود تھا کوئی بھی یقین کر لیتا کہ وہ ایک بے حد سچا اور Devoted باپ ہے، جس نے کوئی بھی حد سے بڑا قدم اٹھانے میں اِس لیے گریز نہ کیا کیوں کہ وہ خود کو بیٹی کی محبت میں مجبور پاتا تھا۔

اپنی مجبوری سے مجبور ہو کر جو لوگ کسی پر ظلم کرتے ہیں وہ تو صرف ظلم کرنے پر ہی مجبور ہو سکتے ہیں۔

''مسٹر سید سرفراز علی صاحب!'' ولی کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی بھی Compromise کرنے کو آمادہ نہیں۔

''تم جو بھی کہو بیٹا! لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ ایک باپ نے اپنی بیٹی کی محبت سے مجبور ہو کر اُس کے پَل پَل گھلتے وجود کو دیکھ کر یہ انتہائی قدم اٹھایا۔'' سید سرفراز علی نے بے حد نرمی سے کہا۔

سید سرفراز علی جان گیا تھا کہ یہ لڑکا غصے یا دولت کی طاقت سے ہرگز قابو آنے والا نہیں، پھر اگر اس کے پاس نگینہ ہوتی تو سید سرفراز علی کی چال اور حکمت عملی مختلف ہوتی تھی، قسمت سے خوش نصیبی سے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ اُن پر الزام ہوتے ہوئے بھی ختم ہو گیا تھا۔

عبدالولی کی بہن کو انہوں نے اغوا نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو اپنی بیٹی کی خوشیوں کی خاطر ڈرامہ رچا رہے تھے۔

عبدالولی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے لاوے جیسے غصے کو کس طور نکالے، ساری عمر ویلیوز پر لیکچر سننے والا، انسانیت کے درس لیتا اور عمل کرتا انسان اپنی شیپ کو کتنا ڈی شیپ کر سکتا ہے، وہ بُرے سے بُرے حالات میں بھی آخر کتنا بُرا بن سکتا ہے۔ سید سرفراز علی کی باتیں عبدالولی کو کوئی بھی حتمی بات کہنے سے روک رہی تھیں کیوں کہ اُس نے ساری عمر احمد شاہ سے اچھائی کرنا سیکھا تھا پھر وہ بُرا کیسے بن جاتا؟ لیکن وہ تو اچھا بھی نہ بن پا رہا تھا اندر ہی اندر گھٹن تھی کہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

''تم جانتے ہو بیٹا! میں نے تمہاری بہن کو بھی نہیں اغوا کروایا، میں نے تم سے غلط بیانی کی، جھوٹ بولا اور! تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے دھوکہ کیا لیکن میں نے یہ سب کچھ اپنی بیٹی کے لیے کیا اب وہ تمہاری ہوئی ہے اور اس سارے معاملے سے بالکل بے خبر، معصوم ہے، تم اُسے کوئی ایسی سزا نہ دینا کہ وہ جیتے جی مر جائے۔'' سید سرفراز علی نے کمال کامیابی سے پینترا بدلا۔ وہ تو ایسا خودغرض کیڑا تھا، جو وقت اور ماحول کے ساتھ ساتھ رنگ ڈھنگ اور شکل و صورت سب کچھ بدل لینے کا کمال رکھتا تھا۔

عبدالولی نے شدت سے محسوس کیا کہ کوئی اُسے باقاعدہ زنجیروں میں باندھ کر مار رہا ہے۔

''مجھے ابھی فوراً واپس جانا ہے، آپ کی اس حرکت کی وجہ سے میرا سارا خاندان ڈسٹرب ہو گیا ہے بہت سارے لوگوں کے ارمان تو داؤ پر لگ کر تباہ ہوئے ہی ہیں، بہت ساروں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہیں۔'' عبدالولی نے سید سرفراز علی کو صاف جتا دیا۔

''اور مسکان؟'' سید سرفراز علی کو سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیسے مسکان کے مستقبل کی سیکورٹی کو شیور کریں۔

''آپ جانتے ہیں آپ کی حرکت نے کیسے حالات پیدا کیے، مجھے آپ فوراً جانے دیں، میں اپنے والدین سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں، اُن کو تسلی دینا چاہتا ہوں اور اُن کے ٹوٹے ہوئے اعتبار کو بحال کر کے ہی کوئی حتمی قدم اٹھا سکتا ہوں۔'' عبدالولی نے بغیر کوئی بات رکھے صاف جتا دیا۔

''تم بھول رہے ہو کہ تم حتمی قدم تو اٹھا چکے ہو تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔'' سید سرفراز علی کے لہجے میں نا چاہتے ہوئے بھی سختی تھی۔

''لیٹ می گو مسٹر سرفراز علی!''

''مجھے کچھ اچھا کرنے کے لیے آپ مجبور نہیں کر سکتے لیکن میں آپ جیسا بھی نہیں ہوں، لیکن یہ سب آفٹر سم ٹائم والی باتیں ہیں، جو ابھی کی بات ہے مجھے آپ یہاں سے جانے دیں، میری فیملی کو میری بے حد ضرورت ہے۔'' عبدالولی نے نہ چاہتے ہوئے بھی سید سرفراز علی سے درخواست کی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ وہ مکمل طور پر اُن کے رحم و کرم اور حراست میں ہے۔

سید سرفراز علی نے بہ غور عبدالولی کا جائزہ لیا۔

یہ لڑکا کسی طوفان کی طرح اُن کے اندر تک کی بنیادوں کو ہلا گیا تھا، اس کا چہرہ اُن کے دِل میں عجیب سی وحشت پیدا کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو!'' سید سرفراز علی نے ایک اور جواء کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبوتر کو تب اڑنے دینا چاہیے جب وہ اُڑنا چاہتا ہو اگر اُس سے اُس کی آزادی چھیننے کی کوشش کی جائے تو اُس کی واپسی ناممکن ہوتی ہے، جو رسک اٹھاتے ہیں اُن کے کبوتر واپس بھی آتے ہیں، سرفراز علی کے پاس رسک اٹھانے کے سوا کوئی چوائس نہ تھی۔

حیرت کی بات تھی کہ عبدالولی جب وہاں سے نکلا تو اُس کے اندر ایک فیصد بھی آزادی کا احساس نہ تھا بلکہ وہ خود کو ان دیکھی زنجیر میں جکڑا محسوس کر رہا تھا۔ جوں جوں وہ وہاں سے جا رہا تھا گھٹن، سکون نے اُس کے اندر دھواں سا بھر دیا تھا اُس نے گھبرا کر گاڑی روکی اور گاڑی چھوڑ کر وہ اِس پہاڑی پر آ بیٹھا۔ وہ اپنے اندر کی گھٹن اور ان سوالوں سے گھبرا کر اللہ سے سوال کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''پلیز اللہ!''

''پلیز ٹیل می!'' عبدالولی وہیں مٹی میں سر نہوڑائے رو رہا تھا۔

''کون ہے وہاں؟'' نرم اور مہربان آواز ولی کو اپنے پیچھے سنائی دی، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

بہت برس پہلے ایک ایسی ہی چمک دار صبح اُس نے اسی طرح کسی کی نرم مہربان آواز پر مڑ کر دیکھا تھا تب بھی اُس کی زندگی بدل گئی تھی، اُسے یہ سب کچھ یاد نہ تھا لیکن آج بھی اُس کی زندگی بدلنے والی تھی اور یہ بات اب وہ دوبارہ بھول نہ سکتا تھا کیوں کہ وہ اب چھوٹا سا بچہ نہ تھا بلکہ ایک خوب رو ذہین نوجوان تھا۔

''کون ہے؟'' سوال دوبارہ ہوا۔

''میں! میں عبدالولی ہوں!'' اس نے بہت برس پہلے بھی یہی جواب دیا تھا۔

''تُو اگر ولی نہ ہوتا تو اور کون ہوتا! تیرے چہرے کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ تو اللہ کا دوست ہے! تو اللہ کا ولی ہے!'' عبدالولی کے ذہن پر جھماکہ سا ہوا۔

''یہ بات کس نے کہی تھی؟'' ایک جھماکے بعد دوسرا جھماکا ہو رہا تھا، یوں جیسے وہ بچپن سے ایک خواب دیکھتا آ رہا تھا جو بہت دُھندلا تھا وہ واضح ہو رہا تھا۔

''عبدالولی بیٹا! تم اس ویرانے میں یہاں کہاں؟'' بابا جی اپنی لاٹھی ٹیکتے آگے بڑھے۔

عبدالولی کے ذہن پر ایک اور جھماکہ ہوا۔

''اے پاکیزہ روح! اے بخت والے تُو ایسے ویرانے میں یہاں کیسے؟'' کوئی چھوٹے سے بچے سے سوال کر رہا تھا۔

''میرا نام عبدالولی ہے، یہ میری بہن نگینہ گڑیا بیمار ہے۔'' بچے نے اپنی گود میں اٹھائی بچی اُس مہربان بزرگ کے حوالے کرتے ہوئے بتایا تھا۔

''بابا جی! نگینہ گڑیا ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟''

''میری کیا مجال جو کہہ دوں کہ ''کام ہو جائے گا۔''

''بات بن جائے گی، ہونے کی بات تو صرف اور صرف ''اُس'' کے بس میں ہے ''وہ'' ہی کہہ سکتا ہے کہ ''ہو جا''۔ عبدالولی کو دھیرے دھیرے سارا دھندلا خواب واضح یاد آیا، وہ کسی اور ہی ٹرانس میں تھا۔

''عبدالولی؟'' بابا جی نے قریب آ کر اُس کا کندھا تھاما۔

''بیٹا! تو اِدھر کدھر ہے؟'' عبدالولی نے سر اٹھا کر غائب دماغی سے اُن کو دیکھا۔ یاد داشت کے پردے پر ایک خواب اپنی پوری جزئیات سے اُبھرا، وہ خواب، جسے دیکھ کر وہ بچپن میں روشن آرا کی گود میں گھس جاتا تھا اور وہ اُسے دعائیں اور سورتیں پڑھ کر پھونکتی تھیں، پھر دھیرے دھیرے یہ خواب دھندلانے لگا اور روشن آرا کی محبت ہر جگہ حاوی اور نمایاں تھی۔

روشن آرا بیگم اور احمد شاہ نے اپنی محبت کے بل بوتے پر اُس کی زندگی میں نئے رنگ بھرے تھے کبھی کبھی یہ خواب اُسے اتنا ستاتا کہ وہ اس کو اگنور نہ کر پاتا، لیکن آج جیسے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل رہی تھیں۔

''ولی!'' بابا جی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا کہ آخر اُسے کیا مسئلہ تھا۔ وہ حیران تھے کہ ولی یہاں کیوں ہے اور کیوں اُن کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

''عبدالولی!'' انہوں نے لاٹھی کا سہارا لے کر اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے اُسے پکارا۔ ولی نے اس بار انہیں ایسے چونک کر دیکھا، جیسے وہ ایک دم ہوش میں آیا ہو۔

''بابا جی؟'' اُس کے لبوں پر سوال پھڑ پھڑایا۔

''بیٹا جی! آپ یہاں ایسے کیوں بیٹھے ہو، اللہ آپ پر اپنی ساری اچھی رحمتوں کا سایہ رکھیں۔'' بابا جی نے حسب عادت اپنی بات کے ساتھ دُعا شامل کی۔

وہ ایسے انسان تھے، جن کے اندر خیر ہی خیر بھری ہوئی تھی وہ ہر چیز، ہر انسان، ہر جاندار کے لیے دُعا گو رہتے تھے۔

''میں! میں گھر جا رہا تھا!'' ولی نے لبوں پر زبان پھیر کر کہا، یوں جیسے وہ خود بھی یہاں موجود ہونے پر حیران ہو۔

''اٹھو بیٹا! میرے ساتھ آؤ!'' انہوں نے ولی کو اٹھایا۔

''میں تم کو اتنا یاد کرتا تھا اللہ نے شاید میرے دل کی تڑپ کی لاج رکھ لی کہ تم خود چل کر یہاں آ گئے۔'' بابا جی نے دل میں کہا۔

ولی لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھ کھڑا ہوا، وہ ابھی تک خود میں نہ تھا۔

''وہ گاڑی آپ کی ہے پیارے بیٹے؟'' بابا جی نے بیچ راستے میں کھڑی گاڑی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آں۔ جی! جی یہ میری گاڑی ہے!'' ولی کچھ ایسی کیفیت میں تھا کہ اُسے سامنے موجود ہر چیز سمجھنے میں کچھ دقت کا سامنا تھا۔ جب آپ کا دل اور دماغ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہو تو باقی جانب توجہ برائے نام رہ جاتی ہے۔

''بیٹا! اسے ایک طرف کر دو تا کہ کسی اور کو گزرنے میں دُشواری نہ ہو۔'' بابا جی اُسے ہاتھ تھام کر گاڑی کے قریب لے آئے۔ ولی نے میکانیکی انداز میں ان کا کہنا مانا۔

بابا جی اُسے ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے چلتے اپنے گھر لے آئے، یہ گھر آج بھی اتنا ہی خستہ حال تھا اتنا ہی سادہ جتنا کہ سالوں پہلے تھا۔

''آپ تو بیرون ملک تھے نا بیٹے؟'' بابا جی نے سوال کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ولی چارپائی پر بیٹھا گم صم اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔
آج سے پہلے وہ کتنی بار احمد شاہ کے ساتھ آچکا تھا لیکن وہ یہاں موجود کشش کو کبھی Digonese کرسکا تھا کہ آخر یہاں کی ہوائیں اُسے خود سے بات کرتے کیوں محسوس ہوتی ہیں لیکن آج تو یہ احساس بہت سوا ہوکر اُسے بہت کچھ کہہ رہا تھا۔
''جی میں آسٹریلیا میں تھا مجھے آئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔'' ولی نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔
بابا جی نے شدت سے ولی کی اس کیفیت کو محسوس کیا۔
''یہاں کیسے آنا ہوا؟'' بابا جی اتنا تو جان گئے تھے کہ وہ یہاں اُن سے ملنے نہیں بلکہ کسی اور مقصد سے آیا ہے وہ بہ غور اُسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی سچائی کھوجنا چاہتے ہوں۔
''میں! میں یہاں خود کو تباہ کرنے آیا تھا؟'' ولی ایک بار پھر خود میں نہ تھا۔
''کیا ولی اپنی حقیقت، اپنی پہچان جان چکا ہے؟'' بابا جی نے کچھ سوچتے ہوئے اُسے آرام کا کہا۔
انہوں نے زبردستی ولی کو گرم دودھ پلایا اور اُسے لٹا کر آرام کرنے کا کہا۔ اُن کے لمس کا اثر تھا جو ولی چند ہی پَل میں ہوش سے بیگانہ ہوگیا تھا۔
اِس قدر اعصابی جنگ سے گزر کر وہ اندر تک تھک گیا تھا لیکن اتنی تھکن کے باوجود وہ خود کو ریلیکس کرپارہا تھا اگرچہ باباجی کے ہاتھوں میں جادو تھا، اُس کی آنکھیں بھاری ہوکر بند ہوگئی تھیں وہ گہری نیند میں چلا گیا تھا۔
''اے پیارے بیٹے! تم پر اللہ کی ساری رحمتیں اور نعمتوں کی برسات رہے، نیند بھی ان نعمتوں میں سے ایک ہے، نیند میں اللہ رحمان نے شفا رکھی ہے، وہ جسم کی ساری تھکن اور غصّے کو چوس لیتی ہے اللہ تمہیں کو بھی شفا عطا کرے، سوجاؤ، سوجاؤ پیارے بیٹے!'' سونے سے پہلے اُس کے کانوں میں بابا جی کے کہے الفاظ دُعا کی طرح اُس کے دل پر اثر کررہے تھے۔
ولی کے گہرے سانس اُس کی گہری نیند کی نشان دہی کررہے تھے۔
بابا جی بہت آرام سے اُس کے پاس سے اٹھے اور اپنی جانماز پر بیٹھ کر تسبیح کرنے میں مشغول ہوگئے لیکن اُن کی توجہ ابھی تک ولی کے سوئے ہوئے چہرے کی جانب تھی۔
''بچہ بخار سے تپ رہا ہے کیوں کہ اُس کا دِل و دماغ تپ رہا ہے!'' وہ کڑی سے کڑی ملا کر اصل بات تک جارہے تھے۔
''اللہ تم کو مضبوطی عطا کرے کہ تم اپنی پہچان کے سفر کو خیر و عافیت سے طے کرو، ورنہ یہ تمہارا معصوم دِل کو تباہ کرسکتا ہے۔'' بابا جی، عبدالولی کے لیے بے حد فکرمند تھے۔

❖❖○❖❖

جس وقت روشن آرا بیگم نے ہسپتال کے کمرے میں پاؤں رکھا نگینہ بُری طرح چلاّ رہی تھی، اُسے نرسوں سے بھی قابو نہ آرہی تھی۔
''مجھے چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے!''
''مجھے گھر جانا ہے، مجھے گھر جانے دو۔ امّاں جان، بھیا، بابا۔ مجھے لے جاؤ!'' پہلے وہ چیخ چیخ کر...

پھر سسکنے لگی۔
روشن آرا بیگم لپک کر اُس کی جانب گئیں۔
''یہ۔ یہ کیا کیا؟''
''کس نے کیا ہے شاہ صاحب؟'' انہوں نے روتے ہوئے نگی کے سر پر ہاتھ پھیرا، ظالموں نے اُس کی دونوں چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں۔
نگینہ کے بہت خوب صورت بال تھے مارک نے اس کو طرح طرح سے اذیتیں دی تھیں اور اُن میں سب سے زیادہ اذیت ناک حرکت اُس نے نگی کے بال کاٹ کر کی تھی۔ مارک نگینہ کو طارق کی بہن سمجھتا تھا اس لیے وہ اُسے عبرت کا نشان بنانا چاہتا تھا۔
''روشن! دھیرج، حوصلے سے کام لو!''
''اُس پاک پروردگار نے بیٹی کی آبرو کا نگینہ بچالیا اس سے بڑھ کر اور کیا ہے ہمارے لیے، یہ دُکھ وقتی ہے مولا جلد ہر بات کے لیے کرم کریں گے۔'' احمد شاہ نے اس مشکل گھڑی میں بھی ضبط کا دامن نہ چھوڑا تھا اُن کا دل بیٹی کے ہر ہر زخم پر رو رہا تھا۔
''شاہ صاحب! میری پھول سی بچی کے ساتھ ظالموں نے بہت ظلم کیا ہے!'' روشن آرا بیگم نے نگی کے بے ہوش وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ نرس نے اُسے ایک بار پھر نیند کا انجکشن دے دیا تھا۔
''ہر ظالم اپنے کیے کا ضرور بھگتے گا!'' احمد شاہ کا لہجہ کھویا کھویا تھا۔ روشن آرا بیگم نے بے اختیار سسکی لی، نگینہ کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے اُن کو لگ رہا تھا کہ انہوں نے اُسے اپنے پیٹ سے جنا ہے اس کے ہر زخم پر ان کی اپنی رگیں کھنچتی تھیں۔
''روشن! ادھر آکر بیٹھو میرے پاس!'' احمد شاہ نے انہیں اپنے قریب صوفے پر بلایا۔
روشن آرا بیگم نے نگینہ کے گرد چادر درست کی اور اُن کے پاس آکر بیٹھ گئیں دِل تھا کہ دُکھ سے پھٹا جارہا تھا۔
''مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔'' احمد شاہ نے گلا کھنکھار کر تمہید باندھی۔ روشن آرا بیگم نے سہم کر انہیں دیکھا۔
احمد شاہ نے فوراً اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ کا یقین دلایا، روشن آرا بیگم کا سہما ہوا دِل جو ڈوبا سمٹا جارہا تھا اپنے رفیق زندگی کی تسلی پر دوبارہ نارمل انداز میں دھڑکا۔
''زندگی ہمیشہ وہ کچھ نہیں دیتی جس کی عموماً ہم تمنا کرتے ہیں کیوں کہ کچھ باتیں تدبیر سے نہیں تقدیر سے تعلق رکھتی ہیں۔'' احمد شاہ نے باقاعدہ تمہید شروع کی۔
روشن آرا نے اُن کو بہ غور دیکھا، آخر وہ کیا کہنے جارہے تھے۔
''خیر تو ہے نا؟ ولی کدھر ہے مجھے دو دن سے نظر نہیں آیا۔'' روشن آرا بیگم نے پریشانی سے دریافت کیا۔
''بیگم! مجھے آپ کو کچھ اور بھی بتانا ہے۔'' احمد شاہ نے گہری سانس بھر کر کہا۔
''کیا؟'' روشن آرا بیگم نے ایسے سانس بھرا جیسے اُن کے سر پر کوئی بم دھماکہ ہونے والا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”حُسن آرا بیگم کا فون آیا تھا!“ احمد شاہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

”ہاں نا! اُن کو اطلاع کرنی تھی نگینہ مل گئی ہے اب اللہ خیر کرے، جیسے ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہو ... ہے ہم نکاح کی تاریخ بھی کوئی سی رکھ لیں گے۔“ روشن آرا بیگم نے اپنے شوہر کے جملے کو اپنی سوچ ... مطابق پورا کیا۔

”علیزے کا نکاح ہو چکا ہے!“ احمد شاہ نے دھیمی سی آواز میں انکشاف کیا۔

”ہیں؟“ روشن آرا بیگم کو یوں لگا جیسے انہوں نے سننے میں شاید غلطی کی تھی۔

”انور بھائی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس لیے حسن آرا بیگم کو علیزے کے نکاح کا قدم اٹھا... پڑا۔“ روشن آرا بیگم کے اندر تک حیرانی تھی۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟“ روشن آرا بیگم کو یقین نہیں آیا۔

”ولی! ولی کہاں ہے اور علیزے کا نکاح کس سے ہو گیا؟“ روشن آرا بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

”بیگم! علیزے کا نکاح ولی کے ہی کہنے پر اُس کے دوست عبداللہ سے ہوا ہے۔“ روشن آرا بیگم ... پریشانی سے احمد شاہ کو دیکھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ تو ہماری بہو تھی پھر وہ تو ولی کی محبت تھی، ولی کیسے اُس کو کسی اور ... سپرد کر سکتا ہے؟ وہ میرے بیٹے کے دِل کی خوشی، آنکھوں کی جوت تھی، وہ کیسے ایسا کر سکتا ہے؟“ روشن آرا بیگم نے تڑپ کر پوچھا۔

”ہم سب تقدیر کے آگے ہار جاتے ہیں!“ احمد شاہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”پھر حسن آرا! وہ میرے بچے کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی!“ روشن آرا بیگم کو ابھی تک یقین نہ آ رہا تھا۔

”انور صاحب اب بھی آئی سی یو میں ہیں، وہ بے یقینی کی اِس حد تک پہنچ گئے تھے کہ ان کی حالت ... وجہ سے اُن کی زندگی کا یقین ختم ہو گیا تھا ایک بیٹی کی اِس قدر دُکھ بھری موت کے بعد وہ اپنی اولاد ... معاملے میں بہت بے صبرے اور بچّی ہو گئے ہیں، علیزے کی شادی کو زندگی موت کا مسئلہ بنا کر وہ ... موت کی دہلیز کو چھو آئے ہیں، حسن آرا بیگم اُن کی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہوئی تھیں۔ میں بھی ... ہوں، اُن کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں کسی بھی نارمل انسان کے لیے اُن کا یہ قدم ابنارمل ہو سکتا ہے لیکن ... باپ ہی سمجھ سکتا ہے کہ اُن کا اس قدر شدّت پسند ہونا نیچرل اور انتہائی نارمل تھا۔

”لیکن! اتنی بے اعتباری کیوں کی انہوں نے؟ آپ نے نہیں بتایا اُن کو کہ ہم پر کس دُکھ کا پہاڑ ... ہے۔“ روشن آرا بیگم نے زندگی میں پہلی بار غصّے سے کہا۔

”بس! قسمت کو منظور نہ تھا اِسی لیے یہ سب ہو گیا۔ ہم سب نگی کی گمشدگی اور تمہاری حالت کی وجہ ... اِس قدر پریشان تھے کہ فوری اطلاع نہ دے سکے، پھر میں نے یہ کام ولی کو سونپا تھا وہ بہن کی خاطر قر... دینے کے چکر میں ہر معاملے کو سلجھاتے سلجھاتے بگاڑ بیٹھا۔“ احمد شاہ نے سانس لینے کے لیے توقف ...

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم سب کا خیال تھا کہ نگینہ کو سید سرفراز علی نے اٹھوایا ہے کیوں کہ وہ اس قسم کی دھمکیا... دے رہا تھا، عبدالولی نے اپنی بہن کو اُس کی حراست میں جان کو خود کو اُس کے سامنے پیش کیا، اس ...

...ے علیزے سے اپنی Commetment توڑنی پڑی، ایسے میں انور صاحب کو سارے حالات ...ائے نہ جا سکتے تھے وہ بے حد بدگمان ہو گئے تھے، اِس وجہ سے سب کچھ جو کوئی بھی نہ چاہتا تھا ہوتا چلا ...یا۔“ احمد شاہ روشن آرا بیگم کو بتا رہے تھے جب کہ وہ زار زار رو رہی تھیں۔

”بہت ساری انہونیوں کو چوں کہ ہونا تھا اس لیے سارے دھاگے الجھتے گئے اور دِلوں میں اتنی گرہیں ...لگیں۔“ احمد شاہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”میرے بیٹے کے دل پر کیا بیتی ہوگی! وہ کہاں ہے کیا وہ نہیں جانتا کہ اُس کی بہن گھر واپس آ چکی ...ہے۔“ روشن آرا بیگم نے آنسوؤں سے منہ صاف کر کے کہا۔

”وہ۔!“ احمد شاہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

”وہ کہاں ہے شاہ صاحب؟“ روشن آرا بیگم نے گھبرا کر پوچھا۔

”وہ تو خیریت سے ہے نا۔“

”میرا تو اُس نے ایک بار بھی فون نہیں اٹھایا، البتہ طارق سے اُس کی بات ہوئی تھی وہ خیریت سے ...ہے۔“ احمد شاہ، روشن آرا بیگم کو ایک ساتھ اتنے سارے ذہنی شاک نہ دینا چاہتے تھے لیکن اُن کے بچوں ...کے متعلق وہ اُن کو بے خبر بھی نہ رکھ سکتے تھے۔

”اللہ پر بھروسہ رکھو، جس اللہ نے ہم کو اس آزمائش میں ڈالا ہے، وہی مولا ہم کو اس سے بھی باہر ...الے گا۔“ احمد شاہ نے بے حد یقین سے کہا۔

”آمین!“ جواباً روشن آرا بیگم نے اپنی چادر میں آنسو جذب کر کے کہا۔ وہ گہری سوچ میں کھو گئی تھیں ...ن کا دِل کچھ مختلف قسم کی آہٹوں کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ بار بار اِن آہٹوں کو رد کر رہی تھیں لیکن یہ آہٹیں اس قدر واضح تھیں، جیسے زندگی واقعی کچھ بہت ...لف روپ میں اُن کے سامنے آنے والی ہو۔

”اے اللہ! میں اپنے وسوسے بھرے دِل کو تیرے یقین کی پناہوں میں دیتی ہوں۔“ روشن آرا بیگم ...نے من ہی من میں شدت سے دعا کی۔

❖❖○❖❖

”بابا، امّاں!“ ولی نے وہ خواب پھر اپنی پوری شدت کے ساتھ دیکھا۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا، ...ن کے موزے اور جوتے اُتار کر بابا جی نے نیچے رکھ دیے تھے اور کمبل اوڑھا دیا تھا۔ ولی کو کچھ دیر لگی یہ ...سمجھنے میں کہ وہ کہاں تھا۔ یاد آنے کے باوجود وہ موجود اور ناموجود کے بیچ والی کیفیت میں تھا۔

”پیارے بیٹے! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ بابا جی ہاتھ میں کچھ پکڑے اُس کے قریب آئے۔

”یہ کھا لو، تمہیں تقویت دے گا۔ مجھ بوڑھے کے ہاں تم کو لذتوں والا کھانا تو نہیں ملے گا یہ جو کا دلیہ ...ہے ذائقے میں ذرا مختلف لیکن تاثیر میں اچھا ہے۔ کھا لو بیٹا اللہ رحمٰن اِس کے قطرے قطرے میں تمہارے ...لیے شفا بھر دیں اور تم اِس دنیا میں لوگوں کے لیے آسانی اور رحمت بن کر رہو۔“ بابا جی کی گفتگو تو ساری ...کی ساری دعاؤں پر مشتمل ہوتی تھی، ولی نے اُن کے ہاتھ سے پیالہ تھام کر دلیہ کھانا شروع کر دیا۔ گڑ ...اور دودھ میں بنا ہوا یہ دلیہ بے حد لذیذ تھا، ولی کو دلیہ کھاتے ہوئے محسوس ہوا کہ وہ تو گذشتہ کتنے گھنٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بھوکا ہے۔

پیٹ میں کچھ گیا تو ولی کو اپنے حواس بھی اپنی جگہ آتے محسوس ہوئے۔

’’میں گھر جا رہا تھا!‘‘ ولی نے گلا کھنکھار کر کہا۔

’’گھر میں سب خیریت ہے نا؟ احمد شاہ اور بیٹی روشن، گڑیا نگینہ سب ٹھیک تو ہیں نا؟‘‘ بابا جی نے ا. کو بہ غور دیکھ کر پوچھا۔ بابا جی ایسی شخصیت تھے کہ ولی اُن کے سامنے کسی قسم کا جھوٹ بولنے کا تصور ! نہ کرسکتا تھا۔

’’نگینہ کو کوئی اغوا کر کے لے گیا تھا۔‘‘ ولی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

بابا جی کے چہرے پر بے چینی بے حد نمایاں تھی۔

’’میں نے احمد شاہ سے بارہا کہا تھا کہ نگینہ کا خاص خیال رکھیں، آزمائش حویلی کی بیٹیوں کی قسمت میں مسلسل چلی آرہی ہے جو کچھ وہاں کے مردوں نے عورت ذات کے ساتھ کیا، اُس کا خمیازہ اُن کی اولاد بھگتتی آرہی ہے۔‘‘ بابا جی منہ ہی منہ میں بڑبڑائے، لیکن ولی اُن کی گفتگو کا کچھ حصہ سن چکا تھا۔

’’بابا جی! آپ حویلی والوں کو پرسنلی جانتے ہیں؟‘‘ ولی کا سوال ایک دم تھا۔

بابا جی کچھ پل کو ایک دم چپ رہ گئے۔

’’بیٹا! انسان ایک ہی گاؤں، شہر کا ہو تو ایک دوسرے کو جاننا عام سی بات ہوتی ہے۔‘‘ بابا جی نے بے حد نرمی سے جواب دیا، وہ مقابل کا جواب یوں ہی اتنی نرمی سے دیتے تھے کہ اُس شدت پر ٹھنڈے پانی کی بوندیں پڑ کر اُس کی شدت کو مدھم کر دیتی تھیں۔

’’تم بتاؤ بیٹا! نگینہ کی خیریت معلوم ہوئی؟‘‘

’’بابا جی!‘‘ ولی نے ٹھنڈی آہ بھری اور پھر اُن کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر ڈالا۔

’’یہاں کے لینڈ لارڈ کی بیٹی مسکان میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی وہ مجھ میں شدت سے دِل چسپی رکھتی تھی لیکن میں اُس میں Interested نہ تھا۔ اُس کے فادر نے عین میرے نکاح والے دن نگینہ کو اغوا کروایا اور مجھے یہاں بلا کر اپنی بیٹی کے پلے باندھ دیا تاکہ میں۔‘‘ بابا جی نے بے حد فکر سے ولی کا چہرہ دیکھا جو شدت جذبات سے تنا ہوا تھا۔

’’لیکن میرے ساتھ دھوکہ یہ ہوا کہ نگینہ کو سید سرفراز علی نے کڈنیپ نہیں کیا تھا اُس نے تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یہ نکاح کروایا ہے۔‘‘ ولی نے ہاتھ کی ہتھیلی پر زور سے مُکا مار کر کہا۔

’’اگر سید سرفراز علی نے نگینہ کو اغوا نہیں کیا تو پھر کس نے کیا تھا؟‘‘ بابا جی نے سوال کیا۔

’’اور ایسا اتفاق کیوں ہوا کہ سید سرفراز علی نے آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا۔‘‘ بابا جی کا سوال اس قدر اہم تھا کہ ولی کے دماغ میں بھی نہ آیا تھا۔

’’ایکچوئلی وہ بابا سائیں کو بہت دنوں سے ایسی دھمکیاں دے رہا تھا، ایسے میں نگینہ کے ساتھ یہ حادثہ ہوا تو ہم سب کا شک سید سرفراز پر ہوا کیوں کہ وہ دھمکیاں دے رہا تھا۔ میرے رابطہ کرنے پر اُس نے ایسا ہی محسوس کروایا، جیسے نگینہ اُس کی حراست میں ہو۔‘‘ ولی نے ایک ایک بات سوچ کر بتائی۔

’’ہوں! یقیناً اُس نے کچھ کیا تھا جس کی بنیاد پر وہ اتنا بڑا کھیل کھیل رہا تھا۔‘‘ بابا جی نے کہا۔

’’اب نگینہ بیٹی کیسی ہے اور کہاں ہے؟‘‘ بابا جی نے فکرمندی سے سوال کیا۔

’’وہ ٹھیک ہے، اُسے ایک ایسے گروہ نے اغوا کیا تھا، جو کالج میں پڑھتی لڑکیوں کو موقع ملنے پر اٹھا لیتے ہیں کچھ کنگ ٹائپ لوگ تھے۔ اللہ نے ساتھ دیا اور نگینہ بروقت مل گئی مجھے میرے دوست جو آئی ایس آئی میں ہے اُس نے بتایا ہے، زیادہ تفصیل تو معلوم نہیں لیکن نگینہ باحفاظت گھر آگئی۔‘‘ ولی نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

’’شکر الحمدللہ!‘‘ بابا جی نے ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کیا۔

’’بابا جی! میں نے آپ سے سوال کیا تھا آپ حویلی والوں کو جانتے ہیں، آئی مین پرسنلی!‘‘ ولی نے بے تابی سے پوچھا۔

’’براہ راست نہیں، لیکن میرے کچھ پیاروں کا وہاں سے تعلق تھا، اس لیے اُن کو جانتا ہوں۔‘‘ بابا جی نے سچائی سے جواب دیا۔

’’بابا جی! میں بچپن سے خواب دیکھتا تھا مختلف مناظر تھے، یہی گاؤں تھا یہاں پر جو کھنڈر حویلی ہے اس میں آگ لگے دیکھتا تھا، پھر کچھ چہرے تھے سب کچھ الم غلم ہو جاتا تھا لیکن ابھی یوں لگتا ہے، جیسے یہ سب کچھ خواب نہ تھا حقیقت تھا اس جگہ سے میرا کوئی رشتہ ہے!‘‘ ولی نے کھوئے کھوئے انداز میں اِدھر اُدھر سر گھماتے ہوئے کہا۔

’’میرا کوئی رشتہ ہے نا؟‘‘ اُس نے ایک دم بابا جی سے پوچھا۔

’’بے شک ہر چیز اپنے اصل کی جانب واپس آجاتی ہے یہی قانون قدرت ہے۔‘‘ بابا جی نے بے ساختہ اظہار کہا۔

’’ہاں تمہارا اِس جگہ سے بہت گہرا رشتہ ہے۔‘‘ بابا جی نے اقرار کیا۔

’’اور اُس کھنڈر حویلی سے؟‘‘ ولی نے بے قراری سے پوچھا۔

’’ہاں اُس سے بھی!‘‘ بابا جی نے اثبات میں سر ہلایا۔

ولی کی سانس ایک دم اُتھل پتھل ہوگئی۔

’’اور اُس حویلی میں آگ بھی لگی تھی نا؟‘‘ ولی نے ایک بار پھر سوال کیا۔

’’ہاں! تم درست کہہ رہے ہو۔‘‘ بابا جی نے سچائی سے جواب دیا۔

’’اور اُس میں بہت سے لوگ جل گئے تھے نا؟‘‘ ولی نے پھر پوچھا جیسے سب کچھ اُس کی آنکھوں کے سامنے اب بھی چل رہا ہو۔

’’ہاں!‘‘ بابا جی نے گہری سانس بھری۔ اُن کے کچھ بھی بتانے سے پہلے ہی ولی سب کچھ بتا رہا تھا۔

’’وہ! وہ کون لوگ تھے بابا جی! اور میرا اُن سے کیا رشتہ تھا؟‘‘ ولی نے سر تھام کر پوچھا۔

’’اُن کو کس نے جلایا تھا؟‘‘ ولی سوال پر سوال کر رہا تھا۔ بابا جی نے بہ غور اُسے دیکھا۔

’’میرے پاس تمہارے ہر سوال کا جواب ہے سب ضروری اور غیر ضروری جزیات کے ساتھ! لیکن میں ان سوالوں کا جواب آپ کے والد کے سامنے دے سکتا ہوں کیوں کہ جتنے یہ جواب آپ کی امانت ہیں اُسی طرح آپ کے والد کی بھی امانت ہیں۔ اِس لیے پیارے بیٹے تم احمد شاہ کے ساتھ آنا، تمہاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امانت میں خود لوٹا دینا چاہتا ہوں میری زندگی کا چراغ تو بس اب بجھا جاتا ہے اور میں ایک اچھے مسلماں کی طرح مرنے سے پہلے ہر امانت لوٹا دینا چاہتا ہوں۔"

"بیٹا! آپ کو جس قدر جاننے کی جلدی ہوگی، مجھے اُس سے زیادہ آپ کو بتانے کی جلدی ہے۔" باباجی نے بے حد سچائی سے کہا۔ وہ ولی سے زیادہ خود کو عجلت میں پاتے تھے۔

"میری زندگی کا حال تو الجھا ہی ہوا تھا اور اب ماضی بھی الجھ گیا تھا۔" ولی ایک بار پھر سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟" اب ولی شکووں میں الجھ رہا تھا۔

"بیٹا! اللہ رحمان کسی کو اُس کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا، میں تمہارے ہر جواب کے لیے حاضر ہوں اور خود کو اس کا ذمہ دار پاتا ہوں مجھے احمد شاہ کا انتظار ہے، وہ بھلا آدمی برسوں سے ایک عبادت جیسے عمل میں مشغول ہے، میں کیسے عجلت دکھا کر اُس کی عبادت کو زائل کرسکتا ہوں، یہ اُس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔" باباجی نے کچھ ایسے ٹھوس اور پیارے انداز میں کہا کہ ولی کے پھڑکتے دل کو کچھ دیر کے لیے قرار آ گیا۔

"میں کیسے آپ کو ٹال سکتا ہوں، آپ کی بات تو کبھی میرے باپ نے نہیں ٹالی، جیسا آپ مناسب جانو۔"

"اجازت دیں باباجی! مجھے ابھی نکلنا ہوگا راستہ طویل ہے اور بہت ساری باتوں کو لے کر میرا صبر مختصر ہوگیا ہے۔" ولی نے بوٹ جرابیں پہن کر باباجی کے ہاتھ پر بوسہ لیتے ہوئے اجازت مانگی۔

"کچھ دیر اور آرام کر لیتے۔" باباجی نے پیار سے ولی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، حالاں کہ ا پہلے ہی تین چار گھنٹے مسلسل نیند لے کر آرام کر چکا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو اس کا ہارٹ ٹمپریچر بہ زیادہ تھا اس کی پور پور جل رہی تھی لیکن باباجی کی رہائش گاہ جانے کیسی تاثیر رکھتی تھی، یہاں آ کر اُ کے اندر سکون اُتر آیا تھا۔

باباجی! جن کا ہر ہر لمحہ یادِ الٰہی میں گزرتا تھا اُن کی رہائش گاہ اور وہاں پر موجود ہر چیز پر اللہ رحمان کے نام کا اثر موجود تھا۔

جب انسان کی روح اور جسم ایک ہی تال میں عشق کی لذت کو محسوس کرتے ہیں تو اُن کے اردگرد موجود ہر شے بھی اِس عشق کی حصے دار بن جاتی ہے۔

"نہیں باباجی! اور نہیں رک سکتا، بابا اور امّاں جان بے حد پریشان ہوں گے میں چلتا ہوں، انشاءاللہ بہت جلد حاضر ہوں گا۔" ولی چلتے چلتے دروازے تک آیا۔

"جلدی آنا بیٹا! میری زندگی عمر کے اُس بے یقین حصے سے گزر رہی ہے، جہاں ہر پل واپسی کی طرف تیزی سے سفر ہو رہا ہوتا ہے، میں اپنی زندگی میں تم کو ہر الجھن، ہر آزمائش سے کامیاب نکلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ایسا کیوں کہتے ہیں؟ کیا ہم جوان کوئی لائف وارنٹی کارڈ اللہ سے حاصل کر کے گھومتے ہیں، موت ہر ذی روح کو آسکتی ہے نا، بچے، جوان اور بوڑھے! اللہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے، آپ جیسے بزرگ

ہماری زندگیوں میں نہ ہوں تو ہم دعاؤں جیسے لائف سکیورٹیز اور پیراشوٹ کیسے حاصل کریں، آپ تو ہماری زندگی میں رحمت ہیں آپ کی دعائیں ہم گرتے ہوؤں کے لیے پیراشوٹ، ہیں جو ہم کو محفوظ رکھتی ہیں۔" ولی نے بے حد سچائی سے اقرار کیا۔

"اللہ تعالیٰ کی ذات تم کو ہمیشہ آسانیاں اور رحمتیں عطا فرمائے۔" باباجی نے بے حد پیار سے اُسے دعا دے کر رخصت کیا۔

ولی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اُن کو ہاتھ ہلاتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ آیا۔ اس نے بیک ویو مرر سے نظر کیا تو پیچھے دور موجود گاؤں چھوٹی سی تصویر کی طرح دکھائی دیا۔

"یہاں سے میرا بھی تعلق ہے باباجی نے کنفرم کر دیا ہے۔" ولی نے باآواز بلند کہا۔

"لیکن کیا تعلق ہے؟" ولی نے پھر باآواز بلند خود سے سوال کیا۔

"ولی! ہونہ ہو یہ جگہ تیری جنم بھومی ہے!" کوئی اُس کے اندر سے الہامی طور پر بولا۔

"ہاں یہ بات درست ہے!" ولی کو جیسے اِس سوچ پر شانتی محسوس ہوئی۔

"بابا جان میرے بچپن سے یہاں باباجی سے ملنے آتے رہے ہیں، یہاں صرف باباجی سے تھوڑی تعلق ہوگا اُن کا، یقیناً اس جگہ سے بھی تعلق ہوگا۔" ولی خود ہی جوڑ توڑ کرنے میں مصروف تھا۔

"مجھے اِسی لیے یہاں آ کر ہمیشہ عجیب طرح کی کشش محسوس ہوتی تھی۔" ولی نے دِل ہی دِل میں کہا۔

"باباجی سے اِس بار ضرور اِس جگہ کی اصلیت کا پوچھنا ہے کیوں کہ وہ آگ والا واقعہ اور جلتے ہوئے ڈھال میرے دماغ کے پردے پر یوں جم کر رہ گئے ہیں، جیسے مجھ پر اُن کا کوئی قرض باقی ہو۔" ولی نے تیز رفتاری سے گاڑی بھگاتے ہوئے سوچا۔

جوں جوں وہ اپنے شہر سے قریب ہو رہا تھا، اپنوں سے ملنے کی جلدی اُس کے دِل کو بے چین کر رہی تھی اُس کا دِل چاہ رہا تھا کہ ماں کی گود میں سر رکھ کر بہت سارا روئے اور سوئے تاکہ اُس کے دِل کا بوجھ اُتر جائے کیوں کہ یہ بوجھ اب اُس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

پرت در پرت
قبا در قبا
یہ پھیلا فسوں یہ خمار جنوں
جب پھنس رہا کسی گرداب میں
کسی دام میں، کسی زعم میں، کسی خواب میں
من کے اندھیرے اُسے لے اڑے
کبھی بھول بھلیاں کبھی دشت میں بھٹکیں
کبھی سراب کے پیچھے گھڑی کے کانٹے
گھومتے رہے سرکتے رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی اک کھیل ہے
یہ انتہا سا انتہا
کہیں دیپ جلے کہیں سلگے جاں
زندگی لمبی سڑک تارکول پہ لپٹی ہوئی
سیاہی سے اَٹی ہوئی
جو کاجل گھر میں بھڑک اٹھے اس کی لو تڑپ اٹھے
من کے اندھیرے میں چنگاری چمکے
کاسے میں پڑے سکے چھنکے
جب نقش سارے مٹ گئے
لفظ سبھی کھو گئے وہ مقام درد
جہاں اشک بولیں، اشک ہی تولیں
جو عیاں ہوئے، تو بیاں ہوئے
صفحہ عشق پہ لکھے راز
جس کی ''واپسی'' ہوئی
اسے ''آ گہی'' ملی
اُس نے پالی آدرش
باقی سب ڈھونڈتے رہے
کالے سیاہ پاتال میں
رنگ نور کی آمیزش
جو نظر عتاب وہ نظر سیلاب
جو ''وہ'' منظور من ہو ساقی
تو اس کی پور پور بھگو دے بارش
جب کڑک چمک مدھم پڑی
ایک ہی گونج رہ گئی باقی
آمرزش، آمرزش، آمرزش

''باجی! یہ آخری اسٹاپ ہے ہماری بس کا، آپ کو کہاں اُترنا ہے؟'' کنڈیکٹر لڑکا ترنم سے مخاطب تھا۔

''مجھے یہیں اُترنا ہے۔'' ترنم چادر اور بیگ سنبھالتی ہوئی اُتر آئی۔

یہ اسٹیشن زیادہ گنجان نہ تھا، اِکا دُکا مسافر اور ایک آدھ چائے پکوڑوں کا ٹھیلا تھا۔ ترنم نے ادھر اُدھر نظر گھمائی۔

''کہاں جاؤں؟ مجھے کہاں جانا ہے؟'' ترنم نے خود سے سوال کیا، پھر خود ہی فیصلہ کر کے پیدل چل

الم
د
ال۔

ہانے کتنے گھنٹے وہ پیدل چلی تھی، کتنی ہی سڑکیں وہ دائیں بائیں بلاوجہ اور بغیر جانے مڑی اور بہت
ڈف اور کچھ ویران جگہ پر پہنچ کر پریشان ہوگئی، اندھیرا پھیل رہا تھا دِن ڈھل گیا تھا لیکن اَن جان
ہوں کی مسافر سے ابھی تک اپنی منزل اور ٹھکانے کا فیصلہ تک نہ ہو پا رہا تھا۔

''یہ میں کہاں آ نکلی، یہاں سے تو کوئی سواری تک نہیں گزر رہی، کدھر رُخ کروں؟'' اردگرد مختلف
ملانوں، کھائیوں کو دیکھتے ہوئے ترنم نے سوچا۔

ھوک سے آنتیں لاسٹک کی طرح کھنچ کر رہ گئی تھیں قریب تھا کہ وہ بھوک و پیاس سے نڈھال ہو کر گر
ل، اُسے کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑا نما گھر نظر آیا۔

''اللہ تیرا شکر! اس ویرانے میں تو نے اِنسان دکھا دیے، کیا عجیب بات ہے ہم انسانوں سے ڈر کر
اگتے ہیں اور پھر ساتھ کے لیے انسان ہی ڈھونڈتے ہیں۔'' ترنم کے دل کو کچھ آسرا ہوا اور وہ خود کو کچھ
چلنے کے لیے بامشکل آمادہ کر پائی۔

اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' آواز بہت نرم تھی۔

''کیا گھر میں کوئی عورت ہے۔'' ترنم نے کچھ ہچکچاہٹ سے پوچھا۔

''پیاری بیٹی! یہاں کوئی عورت نہیں رہتی۔'' اندر سے ایک ضعیف سے بزرگ نے نکل کر جواب دیا۔

زنم کو تو رونا آ رہا تھا بھوک پیاس تھکن! بڑھتا ہوا شام کا سایہ اَن جان جگہ، اُسے کسی بھوت کی طرح
ل زدہ کیے ہوئے تھے۔'' ترنم کے چہرے کی پریشانی بزرگ سے بالکل چھپی نہ رہ سکی۔

''پیاری بیٹی! یہاں بے شک کوئی عورت نہیں رہتی لیکن اللہ کی ذات جیسی بڑی ذات ضرور رہتی ہے،
اللہ پر اعتبار ہے تو اپنے دادا کی عمر کے شخص کو مہمان نوازی کا شرف بخش دو۔'' بزرگ نے نہایت میٹھے
میں کہا۔

زنم نے حیرت سے بزرگ کو دیکھا۔ اس ویرانے میں یہ شخص ولی ہے، صوفی ہے، فلاسفر ہے یا پھر کوئی
ل طرح راندہ درگاہ!'' ترنم نے بے اختیار سوچا۔

''بیٹا! انسان کا پہلا خیال اللہ کی جانب سے الہامی اور سچا ہوتا ہے، دوسرا انسان کے اندر سے اُس
پرکھنے کا نظام بتاتا ہے اور تیسرا چوتھا خیال شیطان کی جانب سے ہوتا ہے۔'' بزرگ نے چارپائی کا
درست کر کے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، ترنم نے چونک کر اُن کو دیکھا۔ وہ کیسے اُس کے من کی بات
اگئے تھے۔

شکریہ!'' ترنم نے خود کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

'بیٹا! آپ آرام سے بیٹھو، جوتے اتار لو۔'' بزرگ نے نرمی سے کہا۔

'یہ! یہ جگہ بہت ویران ہے نا!'' ترنم نے کچھ بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

نہیں بیٹا! یہ اتنی ویران جگہ نہیں! یہ گاؤں کا کم آباد علاقہ ضرور ہے لیکن یہاں پر بھی سب رہتے ہیں
، جاتے ہیں، تھوڑے سے فاصلے پر گاؤں کا مدرسہ ہے، جہاں بچے اور بچیاں دینی تعلیم حاصل کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں، ہاں یہاں دیکھنے والی آنکھ کو رونق نظر آ سکتی ہے کیوں کہ اس رونق میں ذرہ ذرہ اللہ کی ثنا میں مشغول نظر آتا ہے یہ تھوڑی سی خاموشی خود کو اور ''اُس کو'' محسوس کرنے میں نعمت لگتی ہے۔'' بزرگ کہتے کہتے تھک گئے تھے اِس لیے تھوڑی دیر کو چپ ہو گئے۔

''یہ لو پیاری بیٹی! یہ آپ کے حصے کی نعمت رکھی تھی۔'' بزرگ نے دودھ کے اندر کچھ روٹی کے ٹکڑے بھگو کر اُسے دیے، گرم دودھ میں ڈوبی یہ روٹی مٹھاس میں گڑ شامل تھا ترنم کے اندر تک توانائی اور سکون اُتر گیا۔

''سبحان اللہ!'' دودھ کی اتنی لذت پر ترنم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا دودھ کا ذائقہ اس قدر اچھا اور اتنا لذیذ ہوسکتا ہے۔'' ترنم نے بے اختیار خود سے سوال کیا۔

''اللہ کی نعمتیں ہیں ان کا ذائقہ بھی اُس نے بے مثال رکھا ہے۔'' بزرگ نے ایک بار پھر اُس کے دل کا حال جان لیا تھا۔

''آپ کو تازہ دم ہونا ہو یا پھر منہ ہاتھ دھونا ہو تو ادھر باہر غسل خانہ ہے بیٹا۔'' باباجی نے لالٹین جلا کر اُسے پکڑائی اور خود آگے آگے چلنے لگے۔ باباجی کا یہ جھونپڑا نما گھر ایک کمرے پر مشتمل تھا، چھوٹا سا احاطہ تھا جس کے اردگرد باڑ لگی ہوئی تھی باڑ کے اندر یہ گھر اور ذرا سے فاصلے پر غسل خانہ تھا پاس ہی مرغیوں کا چھوٹا سا چھپر تھا اور وہیں پر دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں دودھ غالباً اُن بکریوں کا ہی بزرگ استعمال کرتے تھے۔

''آپ کو میرے آنے پر پریشانی ہوئی ہوگی میں تو بن بلائی مہمان بن گئی ہوں۔'' ترنم فارغ ہو کر جب منہ ہاتھ دھو کر آئی تو مزید پرسکون ہو گئی تھی۔ اُسے یہ بزرگ بہت انوکھے اور اچھے لگے تھے شاید اِسی لیے وہ اتنی پرسکون تھی۔

''پریشانی نہیں بیٹا! خوشی ہوئی ہے حضرت موسیٰ نے ایک بار ربِ رحمٰن سے پوچھا، تُو جب خوش ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے۔''

''اللہ رحمان نے کہا کہ میں بارش برساتا ہوں۔''

''اور جب تُو اور زیادہ خوش ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے؟'' تو اللہ رحمان نے فرمایا ''میں بیٹیاں پیدا کرتا ہوں۔''

حضرت موسیٰ نے پھر سوال کیا اور سب سے زیادہ خوش ہو تو کیا کرتا ہے۔

اللہ کریم نے فرمایا کہ ''میں مہمان بھیجتا ہوں!''

''اور تُو مہمان ہے بٹیا! تیرے آنے سے اللہ جب خوش ہے تو میں تو ہمیشہ اپنے مولا کی خوشی پر خوش ہوتا ہوں! پھر پریشانی کیسی؟'' ترنم آنکھیں پھاڑے اُن کو دیکھ رہی تھی۔ اُن بزرگ کے من کی آنکھ کھلی تھی وہ ہر چیز میں اللہ کی رضا کو دیکھتے تھے۔

''آرام کرلو بیٹا!'' بزرگ نے ترنم سے پھر اصرار کیا۔

اس بار ترنم بنا کسی ہچکچاہٹ کے بستر پر لیٹ گئی، پھر ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں اور یہاں کیا کر رہی ہوں'' [ترنم] نے بزرگ سے پوچھا۔

''بیٹا! مہمان تو مہمان ہوتا ہے چاہے وہ دو قدم سے چل کر آئے یا دو شہر چھوڑ کر! آپ تھکی ہوئی ہو [آر]ام کرلو۔'' بزرگ نے بے حد سکون سے جواب دیا۔

''کیسی عجیب دنیا ہے مولا تیری، ویرانوں میں بھی تو نے فرشتے بٹھا کر رکھے ہیں، جن کو صرف تیری [رض]ا کے علاوہ کوئی فکر نہیں۔'' ترنم جانے سوچتے سوچتے سوگئی تھی جب کہ بزرگ جانماز پر بیٹھے عبادت [می]ں مصروف ہو گئے تھے۔

تو کٹھن اور دُشوار رستوں کی مسافر ہے۔
تھک گئی ہوگی!
کچھ گھڑی آرام کرلو۔
پھر لمبا سفر ہے۔
خدا کرے تیرا یہ سفر کامیاب ہو جائے۔
تیری لگن کامران ہو جائے
تیری مسافت کی کٹھنائیاں ''وہاں'' مقبول ہو جائیں
تو کٹھن اور دُشوار رستوں کی مسافر ہے
تھک گئی ہوگی
کچھ دیر آرام کرلو!

بزرگ نے ترنم کے سوئے ہوئے پاکیزہ چہرے کو دیکھ کر بے اختیار ڈھیروں ڈھیر دعائیں اُسے دے [ڈ]الیں۔

❖❖○❖❖

['']مرینہ آنٹی! وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ مجھ سے ایسے اجازت مانگ رہا تھا، جیسے میں اُس کی بیوی نہیں ماں بہن ہوں، جس کو اس کی [ش]راکت داری کی پروا نہ ہو۔'' سحرش نے سلگتے ہوئے کہا۔

''مرد کو اللہ نے جب چار شادیوں کی اجازت دی ہے تو ہم عورتوں کو اللہ کے حکم کی سرتابی نہیں کرنی چاہیے۔''

''آنٹی!'' سحرش بھڑک اٹھی۔

''یہ آپ کہہ رہی ہیں، میرے شوہر کے ساتھ یہ مذہبی قانون نہیں چلے گا۔'' سحرش نے روڈ ہوتے ہوئے کہا۔

''سحرش! اب بڑی ہو جاؤ، ہر وقت کی ضد، من مانی اور خود غرضی تم کو تنہا کر دے گی تمہارے ساتھ [ط]ارق کا رشتہ خوف خدا کا ہے، تمہاری ماں نے اُس میں کچھ دیکھا تھا تو ہی تمہارے لیے اُسے چنا تھا نا، تم [ا]سے مجبور نہ کرو کہ وہ تم سے لاتعلق ہو جائے، مردوں کو کسی زنجیر سے باندھ کر نہیں رکھا جاسکتا، ماسوائے [مح]بت، وفاداری اور تابعداری کی زنجیروں کے۔ اور۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اورتم نے کبھی اُس کو ان زنجیروں سے باندھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' مرینہ آنٹی تو لگتا تھا
سارے سچ بولنے پر آمادہ ہیں، وہ سحرش کا دِل رکھنے کے چکر میں کوئی بات بھی لپیٹ کر نہ رکھ رہی تھیں
اور ایسا وہ جان بوجھ کر کر رہی تھیں کیوں کہ جوں جوں سحرش کو زیادہ توجہ اور پروٹوکول ملا وہ نہ صرف ضدی
بلکہ بے حد سیلفش بھی ہوتی جا رہی تھی، اُسے خود کے علاوہ کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

''آنٹی! آپ ایسا کیوں بول رہی ہیں؟'' سحرش کو یقین نہ آ رہا تھا کہ مرینہ آنٹی ایسے بھی بول رہی
تھیں۔

''آنٹی جان! آپ تو طارق کی پارٹی بنتی جا رہی ہیں۔'' سحرش نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں! میں صرف سچائی کا ساتھ دے رہی ہوں تم میری بیٹی جیسی ہو اور ماں کبھی بیٹی کا بُرا نہیں
چاہتی، لیکن میں تمہاری اگر ہر غلط بات کا ساتھ دوں گی تو یہ اچھا نہیں ہے پھر میں کب تک تمہارے سر
بیٹھی رہوں گی۔'' مرینہ آنٹی نے اُسے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک اچھا انسان ہے، سب سے بڑھ کر بے حد تابعدار اور قدر دان ہے، اُسے اُس کی حد سے
زیادہ نہ آزماؤ۔'' مرینہ آنٹی سحرش کو سوچ میں چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں جب کہ سحرش کا تو دِل دماغ
لاوے کی طرح مسلسل کھول رہا تھا۔ ایسے میں مرینہ آنٹی کی ساری باتیں بے سود ثابت ہوتی نظر آ رہی
تھیں۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم ڈیئر فادر!'' سمعان علوی نے باپ کے کندھے سے لگتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام پاپا کی جان! اب تم کیسے ہو؟ قاسم علوی نے پیار سے سمعان علوی کا چہرہ تھام کر پوچھا

''آپ کو کیسا لگ رہا ہوں؟'' سمعان نے ایک دم قاسم علوی کے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔

''بہت پیارے، ہمیشہ کی طرح بہت اچھے، اللہ تم کو بہت ساری خوشیاں عطا فرمائے۔'' قاسم علوی نے
سمعان کو سینے سے لگا کر کہا۔

کتنے ڈھیر سارے دن سمعان نے تنہا گزارے تھے خاموش اور اکیلے، اب اتنے دنوں بعد وہ کسی چاند
کی طرح طلوع ہوا تھا تو بظاہر خوش رہنے کی اداکاری کر رہا تھا۔

''امی کدھر ہیں؟'' سمعان نے ادھر اُدھر سر گھما کر پوچھا۔

''وہ باہر لان میں ہیں مالی کے ساتھ کچھ نئے پودے لگوا رہی ہیں۔'' قاسم علی نے بیٹے کو بہ غور دیکھتے
ہوئے جواب دیا۔

''سمعان!'' انہوں نے کرسٹل پیس پر نگاہیں جمائے ہوئے اسے پکارا۔

''جی پاپا!''

''سمعان! میرا دل کرتا ہے کہ میرا بیٹا ہمیشہ خوش رہے کیا اب بھی ایسا ممکن ہے؟'' انہوں نے سمعان
کی آنکھوں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آف کورس پاپا! میں خوش ہوں۔'' سمعان نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنے بیٹے کی اوریجنل مسکراہٹ چاہیے اس کی آنکھیں اُداس ہوں اور لبوں پر مسکراہٹ! یار یہ تو

Cheat ہے۔'' قاسم علوی نے کہا۔

ں آپ کا Original بیٹا نہیں ہوں پھر بھی آپ کو میری Original مسکراہٹ کی فکر ہے! آ
کس دنیا کے انسان ہیں کس صبر کی مٹی سے بنے ہیں۔'' سمعان نے کچھ چڑ کر پوچھا۔

''تم ایسا کہہ کر مجھے ڈس آن کر رہے ہو۔'' قاسم علوی نے کچھ دکھ سے کہا۔

''کہاں پاپا! آپ تو ہمیشہ اونچے درجے پر رہیں گے آپ نے اپنے حصّے کا کردار اپنے دیے ہوئے
ظرف سے زیادہ نباہ لیا ہے، آپ تو اِس سارے کھیل میں سب سے عمدہ کردار ہو سچائی بھلائی اور قربانی
کا!'' سمعان ایک بار پھر اُکھڑ رہا تھا۔

''پاپا! میں تو مر کر بھی آپ کو کبھی ڈس آن نہیں کر سکتا۔ میں تو خود ڈس آن کیا ہوا انسان ہوں، جس کو
کے باپ نے آن ہی نہیں کیا تھا۔ پاپا خود کو ڈی گریڈ دیکھنا، ڈس آن محسوس کرنا بہت تکلیف دہ ہے،
ایک ناجائز بچہ ہوں کس قدر کراہت آمیز احساس ہے یہ۔'' سمعان ایک دم پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی
طرح رو دیا۔

قاسم علوی ایک دم حیرت زدہ رہ گئے اتنے دن خاموشی سے سمعان کے اندر کیا کچھ نہیں پل رہا تھا۔
انہوں نے اُسے کھل کر رونے دیا تا کہ اُس کے اندر کا غبار نکل جائے۔

''میں ناجائز ہوں! یہ احساس اگر مجھے مار رہا ہے تو اِس سے بڑا احساس مجھے جینے نہیں دے رہا کہ
آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔''

''پاپا! آپ میرے پاپا نہیں ہیں یہ بات مجھے جینے نہیں دے رہی!'' سمعان نے اُن کے ہاتھوں کو
2 ہوئے کہا۔

''کون کہتا ہے کہ میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔ آئی ایم یور فادر! اگر صرف ہارمونز، بلڈ ریلیشنز ہی باپ
نے کی Base ہیں تو میں اِن سارے Rules کو نہیں مانتا، تم میرے بیٹے ہو صرف میرے۔'' قاسم
علوی نے سمعان کو اپنے سینے سے لگا لیا بالکل اُسی طرح جب انہوں نے اُسے پہلی بار سینے سے لگایا
جب وہ صرف چند گھنٹے کا تھا۔

''تم پہلی بار میری گود میں آئے تو میرے اندر کی وحشت اور نفرت کو پی گئے، تم نے ہی مجھے وہ انرجی
دی جس کی وجہ سے میں زبیدہ سے اس قدر پیار کر سکا، اتنا اُس کا خیال رکھ سکا۔ اللہ نے تمہارے وجود
کے اس لمس میں میرے لیے بہت راحت، پیار اور خوشی بھر دی تھی تم میرے بیٹے ہو میں نے ماں کی طرح
تمہارے لیے راتیں جاگی ہیں اور دِن کو ایک باپ کی طرح تم کو ہر سرد گرم سے بچایا ہے، ایک قابل
بات بچے کو کوئی اپنے سینے سے لگا کر نہیں بڑا کرتا، تم میرے بیٹے تھے اور رہو گے۔ قاسم علوی نے اپنے
ہاتھوں سے سمعان کا چہرہ صاف کیا۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ہم قیامت کے روز اُن ہی لوگوں کے ساتھ اُٹھیں گے، جن سے ہم پیار
کرتے ہیں اور اگر تم کو قیامت کے روز تمہاری ماں کے نام سے پکارا جائے گا تو تم کو میرے ساتھ اٹھایا
جائے گا کیوں کہ تم میرے پیارے ہو، اِن سارے بیچ میں سید سرفراز علی کہیں بھی نہیں ہے نہ ہوگا۔''
قاسم علوی نے سنجیدگی سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

He was nothing! He is nothing!

''خبردار تم نے اُس کو اون کیا؟ اگر تم اُس کو اپنا باپ کہو گے تو اِس کا مطلب ہے کہ تم اُس کو اون کر رہے ہو۔''

''نہیں پاپا! میں اُس شخص سے نفرت تو کرسکتا ہوں لیکن اُسے کوئی درجہ نہیں دے سکتا۔'' سمعان نے کھلے اور واضح لفظوں میں جواب دیا۔

''تو پھر میری جان! اپنی جان کیوں گھلاتے ہو، بھول جاؤ اس سارے قصّے کو۔''

''بھول جاؤں گا لیکن پاپا کیا ایسے شخص کو کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے، جس نے ایک بچے کو اِس دنیا میں لاکر پھینک دیا اُسے اون نہیں کیا۔ اُس نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کی پھر اُس نے ایک ایسے شخص کی زندگی بھی تباہ کی جس کی بیوی نے برسوں دیوانگی کی نذر گزار دیے ہوں اور وہ شخص مسلسل آزمائش اور دُکھ میں رہا ہو۔ اور جو کچھ یہ ہوا اُس کا ذمہ دار ایک ہی شخص ہے اُسے کم از کم کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔'' سمعان نے بے حد طیش سے کہا۔

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' قاسم علوی نے گھبرا کر عمر بھر کی نقدی کو دیکھا۔ وہ اُسے کسی بدلے کی آگ میں کودتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''کم از کم میں ایک بار اپنی نفرت اُس شخص تک پہنچا کر آنا چاہتا ہوں میں اُسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں اُس سے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرنے والا انسان ہوں!'' سمعان نے غصّے سے مٹھیاں بند کرتے ہوئے کہا۔

''میں تم کو کسی غصّے اور بدلے کی بھینٹ چڑھنے نہیں دے سکتا۔'' قاسم علوی نے صاف انکار کردیا۔

''پلیز پاپا! میں ایک بار، پہلی اور آخری بار اُس سے ملنا چاہتا ہوں ورنہ میں ساری عمر سلگتا رہوں امی کی طرح!'' سمعان علوی کا آخری جملہ کارگر ثابت ہوا تھا۔

کچھ بھی تھا قاسم علوی، سمعان کو زبیدہ کی طرح سلگتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے لیکن میں بھی ساتھ جاؤں گا!'' قاسم علوی نے شرط باندھی۔

''پلیز پاپا! آپ ساتھ نہیں جاؤ گے۔'' سمعان نے منت کی۔

''کیوں؟'' قاسم علوی نے سوال کیا۔

''اس لیے کہ میں آپ کے سامنے تو اونچی آواز میں بات نہیں کرسکتا، کہاں میں کسی کو اپنی ساری نفرت پہنچانا چاہتا ہوں۔'' سمعان علوی نے دِل میں کہا۔

''بس پلیز!'' سمعان نے حتمی انداز میں کہا۔

''لیکن میں تو جاسکتی ہوں نا!'' زبیدہ بیگم نے سامنے آ کر کہا۔

گزرے دنوں میں وہ بہت نارمل ہوگئی تھی، جیسے ہی Illusion کا گلاس ٹوٹا تھا وہ واپس ہوگئی تھی۔

''تم! تم وہاں نہیں جاؤ گی۔'' قاسم علوی نے سختی سے منع کیا۔

''پلیز چاند! تمہارے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ میں مر کر بھی نہیں اُتار سکتی، ایک اور احسان کردو مجھے بھی سمعان کی طرح موقع ملنا چاہیے کہ میں بھی اپنی نفرت کا اظہار اُس مکروہ آدمی سے کروں۔''

''یہ آخر اس گھر میں کیا ہورہا ہے، کیا ہم اُس شخص کو بھولنے کی بات نہیں کرسکتے۔'' قاسم علوی نے [illegible] ہو کر پوچھا۔

''نہیں قاسم! اُسے بھولنے کا مطلب ہے کہ میں نے اُسے معاف کردیا جب کہ میں اُسے کبھی معاف نہیں کرسکتی۔'' زبیدہ بیگم نے سرد لہجے میں کہا۔

''او کے! جیسی تم لوگوں کی مرضی، لیکن اگر تم دونوں کو اُس نے کوئی نقصان پہنچایا تو؟'' قاسم علوی نے [illegible] مندی سے پوچھا۔

''پاپا! اس کی فکر نہ کریں، اُس کی جرأت نہ ہوگی آج وقت بدل چکا ہے۔'' سمعان نے بے حد خود اعتمادی سے جواب دیا۔

سمعان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک تھی، قاسم علوی کو گرین سگنل دینا ہی پڑا۔

❖❖○❖❖

''بابا سائیں! میری ساری محنت کارت ہوگئی، میری ساری قربانی اکارت گئی۔'' عبدالولی باپ کے سینے سے لگا تو سسک ہی پڑا۔

''سب کچھ ضائع ہوگیا، میں نے سب کچھ کھودیا اپنے ہی ہاتھوں سے سب کچھ کھودیا۔'' ولی کے دل کے [illegible] ایک بار پھر بھانبڑ جلنے لگے تھے۔

احمد شاہ نے عبدالولی کے سر کو پیار سے سہلایا۔

''نہیں بیٹا! اللہ کسی کی قربانی کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔'' احمد شاہ نے بے حد مضبوط اور ٹھوس لہجے [illegible] اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ وہ عبدالولی کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب پڑے صوفے پر لے آئے۔

ابو حفص و عمر بن سالم النیشا الحدادی رحمتہ اللہ علیہ کسی لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوگئے اور اپنے دوستوں کے مشورے کے مطابق نیشا پور کے ایک یہودی سے مدد کے طالب ہوئے، یہودی نے کہا چالیس دن [illegible] نماز اور دعا کو ترک کرو، کوئی نیکی کا کام نہ کرو، کوئی نیکی کی نیت نہ کرو، پھر میرے پاس آؤ میں کچھ [illegible] انتظام کروں گا کہ محبوب تمہارے قدموں میں ہو۔ ابو حفص نے یہودی کی ہدایات پر عمل کیا اور [illegible] لیس دن کے بعد پھر اِس کے پاس پہنچے، اس نے حسب وعدہ ایک نقش بنادیا مگر یہ بالکل بے اثر [illegible] بت ہوا۔ یہودی نے کہا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان چالیس دنوں میں تم نے ضرور کوئی نیک کام کیا ہے۔

ابو حفص نے جواب دیا کوئی ایسا کام نہیں کیا سوائے اس کے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا [illegible] وہ پرے ہٹایا تھا تا کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔

یہودی نے کہا۔

''اس خدا کی خلاف ورزی نہ کرو جس نے تمہاری اتنی سی نیکی کو ضائع نہیں ہونے دیا حالاں کہ متواتر [illegible] لیس روز تک اس کے احکام سے روگرداں رہے ہو۔''

ابو حفص نے توبہ کی اور یہودی مسلمان ہوگیا۔

''عبدالولی! تم آج جو کر کے آئے ہو، وہ قیامت ہی ہے۔ میں تم کو اِس قیامت کی اصلیت بعد میں [illegible] دُوں گا لیکن دوسری قیامت تو تمہارے دِل پر گزر ہی چکی ہے۔ ساتھ ہی علیزے کی دنیا میں بھی برباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی لیکن پھر وہی بات کہ اللہ ہمارے کسی عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا بس کچھ انتظار۔'' احمد شاہ نے بالا
الگ طرح سے عبدالولی کے زخموں پر پھایا رکھا۔

اِس سارے دورانیے میں روشن آرا بیگم نفل نماز میں مصروف تھیں۔ جیسے ہی وہ دُعا سے فارغ ہوئیں
بے تابی سے بیٹے کی جانب بڑھیں۔

وہ اپنے بیٹے کے دِل کے راز سے واقف تھیں، اُس کی محبت اُن سے ڈھکی چھپی نہ تھی بیٹا کیا کچھ
ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے وہ اچھی طرح جانتی تھیں، انہوں نے ولی کو سینے سے لگالیا۔

''میرا پیارا بیٹا! تو بہت خاص ہے، تو نے اپنی قربانی کے ذریعے ایک مرتے ہوئے باپ کو بچایا۔ اُ
وقت جب حالات گنجلک تھے تم خودغرض ہوکر اگر نور بھائی کا خیال نہ کرتے تو آج وہ لوگ تم سے سخ
نفرت کرتے، انور بھائی اور حسن آرا دونوں حقیقت جان کر تمہارے گرویدہ اور احسان مند ہیں بیٹا
نے اُن کی لاج رکھ لی۔

اس وقت انور بھائی کچھ سمجھنے کو تیار نہ تھے اور موت کی دہلیز پر جا کھڑے ہوئے تھے تم نے بالکل اپ
بیٹے کا کردار نبھایا۔ اللہ نے تمہارے اِس عمل کی وجہ سے تمہاری بہن کو ایسی آگ سے معجزانہ بچایا، جہا
سے اس کا صحیح سلامت آنا ناممکن تھا۔'' روشن آرا بیگم نے مختصراً سارا قصہ بتایا۔ عبدالولی نے بے اختی
گہرا سانس لیا۔

''یہ اللہ کی طرف سے آزمائش تھی اور اللہ ہی نے آسان کی ہے، ہم اُس کے تابعدار بندے ہیں،
کو اِس کی آسانیوں کا شکر ادا کرنا نہیں بھولنا۔'' انہوں نے بے حد بڑی بات کہی تھی اور ثابت کردیا تھا
وہ احمد شاہ کی بیوی ہیں۔

''تم میری بات سے متفق ہو بیٹا؟'' روشن آرا بیگم نے بیٹے کی خاموشی دیکھ کر بے اختیار سوال کیا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے میری ماں جو کہے اور وہ غلط ہو!'' ولی نے اپنے آنسو اندر پی کر ان کا مان رکھا
اُس عمر میں دِل کہاں مانتا ہے مصلحتوں کو، لیکن وہ ساری عمر والدین کا تابعدار رہا تھا اس لیے اُس
ہمیشہ کی طرح ماں کا مان رکھا۔

''بیٹا! جیتے رہو، تم کو دین و دنیا کی ہر ہر نعمت ملے، اللہ راضی رہے تم سے، ہمیشہ خوش رہیں۔'' روش
آرا بیگم نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر اُسے دعا دی، اُس نے ماں کو روح تک خوش کردیا تھا۔

''ولی! میرے چاند، میں ایک ماں ہوں اور میں ایک بیٹی کی بھی ماں ہوں، ایک بیٹی کا معاملہ کس قد
نازک ہوسکتا ہے میں جانتی ہوں، میری بچی کو نیا جیون ملا ہے اللہ نے اُس کی آبرو بچائی، تم اپنی بہن کے
صدقے مسکان کو دل سے قبول کرلو، اُس کو اب کسی بدلے یا غصّے کی آگ میں نہ جھونکنا، وہ بچی تمہا
نصیب تھی، اُس کا تیز نصیب تمہاری ساری تدبیروں اور تمہاری تقدیر سے لڑا ہے وہ اللہ کی رضا ہے اُ
قبول کرلو دِل سے، بے شک زبردستی سہی لیکن تم نے اُسے اللہ اور رسول کو گواہ بنا کر قبول کیا ہے تم اُ
گھر رخصت کروالاتا اپنی بہن کی لاج کے صدقے میں۔'' روشن آرا نے اُسے اس ٹاپک پر سمجھانے کے
لیے دیر نہ کی تھی ابھی وہ اپنی بہن کے درد کو محسوس کررہا تھا بعد میں وہ باغی ہوسکتا تھا۔ بہر حال سید سرفر
علی نے بہت بُرا کیا تھا۔ احمد شاہ نے گھبرا کر بیگم کو دیکھا۔

''وہ یہ کیا کررہی ہے، انہوں نے روشن آرا کو نہ بتایا تھا کہ ولی اپنے سوتیلے چچا سے مل کر آرہا ہے
،وہ اِس رشتے کی مضبوطی پر زور نہ دیتیں۔ وہ روشن آرا کو بے خبر رکھنا چاہتے تھے کہ کہیں وہ ولی اور
ن کے لیے کوئی وسوسہ نہ پال لیں، آج تک ولی اور نگینہ کو سچائی نہ بتانے کی اور دیر کرنے کی وجہ روشن
بیگم ہی تھیں۔ ڈوریں ایک بار پھر گنجلک ہورہی تھیں احمد شاہ نے ولی کا چہرہ دیکھا جہاں عجیب سی بے
ی۔

''روشن! اولاد کی تابعداری کو اتنا نہیں آزمانا چاہیے۔'' احمد شاہ ایک دم بیچ میں کود پڑے۔

روشن آرا بیگم کا چہرہ ایک دم تاریک پڑ گیا۔

''مسکان بھی بیٹی ہے، لڑکی ذات ہے شاہ صاحب۔'' وہ مدھم آواز میں گویا ہوئیں۔

''اللہ کا خوف کرنا چاہیے، ہم کو ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' ولی نے ماں کا چہرہ
ا۔

یک اور فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ پاکستان میں قدم رکھتے ہی وہ مسلسل ذہنی اور اعصابی مشقت
تھا۔

یک اور فیصلہ!

یک اور قربانی! ولی کو دم گھٹتا محسوس ہوا۔

''ٹھیک ہے امّاں جان! جیسا آپ کہیں گی وہی ہوگا۔'' ولی نے سر جھٹک کر خود کو پُرسکون کرنے کی
کوشش کی۔

''ولی! ابھی جلد بازی نہ کرو۔'' احمد شاہ نے سے کہا۔

''نہیں بابا سائیں! امّاں جان ٹھیک کہہ رہی ہیں پھر آپ نے ابھی تو بتایا ہے کہ اللہ ہمارا کوئی عمل
ع نہیں جانے دیتے، امّاں جان نے خوف خدا کا واسطہ دیا ہے، بیچ میں میری بہن کا صدقہ مانگا ہے تو
اللہ اور اپنی بہن کے لیے ہر چیز کرنے کو تیار ہوں۔'' ولی نے مضبوطی سے کہا۔ روشن آرا خوش ہوگئیں
شاہ نے بے اختیار گہرا سانس بھرا۔ لگتا تھا کہ وہ اِس ہونی کو کبھی نہیں ٹال سکتے۔

''واقعی مسکان تو اللہ کی ہی رضا ثابت ہورہی تھی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بابا! وہ۔ وہ!'' نگینہ جانے رات کے کس پہر اٹھی اور بھاگتی ہوئی ماں باپ کے کمرے میں آ گئی۔

''کیا ہوا؟'' روشن آرا بیگم نے لپک کر اُسے سینے لگالیا۔

''ہمارے گھر میں کوئی ہے!'' نگی نے سہمی سہمی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی... کوئی مجھے مارنے آیا ہے!'' خوف سے نگی کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

''کوئی نہیں ہے بیٹا! دیکھو اِدھر!'' احمد شاہ نے نگی کا چہرہ اپنی جانب کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بابا! وہاں کوئی تھا، وہ مجھے مار ڈالے گا۔'' نگی پہلے روہانسی ہوئی پھر ایک دم پھُوٹ پھُوٹ رودی۔

روشن آرا بیگم نے اُسے سینے سے لگالیا، اُس پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی اور ساتھ لے کر بستر تک گئیں۔

''بیٹا! آپ کے بابا اور بھائی کے ہوتے کسی کی مجال نہیں کہ کوئی آپ تک آئے۔'' روشن آرا بیگم اُسے تسلی دی۔

''تو پھر میں آپ کے پاس سوجاؤں۔'' نگی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''سوجاؤ بیٹا! ادھر آؤ۔'' احمد شاہ نے اپنی جگہ خالی کردی اور خود صوفہ کم بیڈ پر ہوگئے، یہ صوفہ کم بیڈ کے پڑھنے وغیرہ کے کام آتا تھا۔ اس کے پیچھے بک ریک تھا اور سر پر موبائل لیمپ تھا، جو اپنی مرضی ہر ڈائریکشن میں لائٹ دیتا تھا۔

نگی نے ایک پل بھی نہ لگایا اور دوڑ کر بستر میں چھپ گئی روشن آرا بیگم دھیرے دھیرے اُس کا سہلاتی رہیں، اُس پر آیات پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ نگی گہری نیند میں چلی گئی، بیس پاور کی بلیور میں نگی کا چہرہ بالکل پھیکا نظر آرہا تھا۔

''شاہ صاحب!'' روشن آرا بیگم نے کچھ دیر بعد اُن کو آواز دی۔

''سو گئے کیا؟'' انہوں نے پھر سوال کیا۔

''نہیں بیگم! میں سویا نہیں، اپنی بیٹی کو تکلیف میں دیکھ کر باپ کو کیسے نیند آسکتی ہے۔'' احمد شاہ بے اختیار طویل سانس بھرا۔

''سنیے! ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ نگینہ کو اعتبار کی ضرورت ہے، اعتماد کی ضرورت ہے اس کا اعتبار ٹو چکا ہے اس کو کسی رفیق... رفیق زندگی کی ضرورت ہے۔'' روشن آرا بیگم اٹھ کر اُن کے پاس آ بیٹھیں۔

''ہم کو نگی کی شادی کردینی چاہیے۔'' روشن آرا بیگم جن کا دل نگی کی رخصتی کا سوچ کر ڈوبنے لگتا تھا اج اپنے منہ سے اُس کی شادی کے متعلق کہہ رہی تھیں۔

وہ ماں تھیں اور بیٹی کی ہر مشکل کو آسانی میں بدلنے کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھیں۔

''ایسے کیسے کسی کے حوالے کردیں، اُسے کچھ نارمل ہونے دو، وہ گھر اور عملی زندگی کی ذمّے داریاں یسے سنبھال سکتی ہے؟'' احمد شاہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''شاہ صاحب! میں ذمّے داریوں کے لیے نہیں بلکہ!''

وہ آج بھی اتنی عمر میں اپنے شوہر سے کھل کر کوئی بولڈ بات نہ کرسکتی تھیں، اُن کی اس فطری شرم نے ان کو بہت حُسن عطا کررکھا تھا اور شاہ صاحب تو اُن کے ایک نقطے سے ہی سار لفظ جان جاتے تھے۔

وہ ان کی سانسوں میں اُن کے خون میں شامل تھیں پھر کیسے اُن کی آدھی ادھوری باتیں ان کو پوری لرح سمجھ نہ آتیں۔ Physical اذیت سہنے کے بعد نگی کو Physical محبت کی ضرورت تھی۔ ذہنی اذیت سہنے کے بعد نگی کو ذہنی ودلی محبت اور اعتبار کی ضرورت تھی اُسے ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو اُس ی ساری تلخیوں کو بھلانے میں اُس کی مدد کرتا، اُس کا حقیقی ساتھی اور دوست بن کر رہتا۔ یہ نگی کے سائیکاٹرسٹ نے اُن سے کہا تھا۔

''بیگم تم ٹھیک کہتی ہو! نگی کو واقعی کسی محبت اور پیار کرنے والے شخص کی ضرورت ہے جو اُس کی ساری Insecurities کو اپنی Purity of love سے Secirity میں بدل دے۔'' شاہ صاحب نے بے مدمدھم لہجے میں کہا جیسے وہ خود سے بات کررہے ہوں، ساتھ ہی کسی سوچ میں گم تھے کہ اُن کی نگاہوں میں طارق کا خوب صورت چہرہ گھوما۔ اُن کے دِل سے ایک دم بہت سارے بوجھ اُتر گئے۔

''بیگم!'' انہوں نے روشن آرا کو مخاطب کیا۔

''جی!''

''میری نظر میں ایک بہت اچھا لڑکا ہے، جو ہماری نگی کو دِل و جان سے پھولوں کی طرح رکھے گا۔''

احمد شاہ کی نظروں میں طارق کا چہرہ مسلسل گھوم رہا تھا، کیسے اُس کے چہرے پر نگی کے لیے رنگ تھے۔

''کون ہے وہ؟'' روشن آرا بیگم نے بے تابی سے پوچھا۔

احمد شاہ کے چہرے پر وسوسے بھی تھے، جاننے والا لڑکا یقیناً نگی کے ساتھ ہونے واقعے کو بھی جانتا ہوگا وہ کیوں کر ایسی لڑکی کو اپنائے گا۔ آج کل کے لڑکوں کے دل کہاں اتنے بڑے ہوتے ہیں۔

''وہ! طارق ہے!'' احمد شاہ کا انکشاف بہت خوش گوار تھا۔

''لیکن اگر وہ نہ مانا تو؟'' روشن آرا بیگم نے فکرمندی سے پوچھا۔

''نہیں! ایسا کچھ نہیں ہوگا، وہ مان جائے گا۔''

احمد شاہ نے مطمئن چہرے کے ساتھ اُن کو یقین دلایا۔ اُن کے چہرے پر ہلکی سی نرم لیکن پر یقین مسکراہٹ تھی۔

روشن آرا بیگم نے بے اختیار سوئی ہوئی نگی کو دیکھا۔ رات کا اندھیرا اُس کے اردگرد ضرور تھا لیکن اندھیرا چھٹنے والا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک ہے میں شہباز صاحب سے کھل کر بات کرتا ہوں، دیکھنا وہ بھی خوش ہوگا۔'' احمد شاہ نے ہ
کو یقین دلایا۔

❖❖○❖❖

ہمیشہ ایسا ہوتا تھا
نگاہوں سے پرے ہوکر
ہمارے دل میں رہتے تھے
مگر اب کے ہوا ہے یوں
نگاہوں سے پرے ہو تم
ہمارا دل بھی خالی ہے

علیزے چولہے کے آگے کھوئی بیٹھی تھی دودھ اُبل اُبل کر کھویا بن گیا تھا لیکن اُسے ہوش نہ تھا۔

''باجی!'' غزالہ کچن میں آئی تو اُسے کچھ جلنے کی بو آئی، دودھ اُبل اُبل کر اب لگنے لگا تھا لیکن ! لگتا تھا کہ اُس کے حواسِ خمسہ اُس کے ساتھ تھے نہ وہ دیکھ پا رہی تھی نہ ہی سونگھ پا رہی تھی۔

''باجی! کدھر ہیں آپ؟'' غزالہ نے آگے بڑھ کر برنر بند کیا۔

''آں، ہاں! وہ میں ابو جی کے لیے دودھ گرم کرنے آئی تھی۔'' علیزے کو ایک دم ہوش آیا۔

''ابو بلا رہے ہیں!'' غزالہ نے تاسف سے اپنی بہن کی آنکھوں میں موجود دکھ کو ہلکورے لیتے دیکھ وہ بے اختیار ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

''میں آتی ہوں تم چلو! امی کیا کر رہی ہیں؟'' ساتھ ہی علیزے نے سوال کیا۔

''امی گڈو کے پاس سوئی ہوئی ہیں اُس کا بخار بھی کم ہے میں بھی اُدھر ہی ہوں، تم ابو کے پاس جاؤ، وہ بار بار تمہارا پوچھ رہے ہیں۔'' غزالہ تفصیلاً جواب دیتی باہر نکل گئی۔

''ابو جان دودھ لے لیں!'' علیزے اُن کے کمرے میں داخل ہوئی، اُن کے ہاتھ البم تھا، یہ ا علیزے کے نکاح کا تھا۔

''علیزے! اِدھر میرے پاس بیٹھو۔'' انور صاحب نے اس کو ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے!'' انور صاحب نے اسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ابو جان!'' علیزے نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم کوئی شکوہ کیوں نہیں کرتیں؟ میری وجہ سے تمہاری ماں نے ایک انتہائی قدم اٹھایا، جس کی و سے تمہاری دنیا تہس نہس ہو کر رہ گئی، میں تمہارا گناہ گار ہوں بیٹا۔'' انور صاحب نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''نہیں ابو! ایسا نہ کہیں، آپ تو میری وجہ سے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوئے، تکلیف ا باعث تو میں بنی تھی سب کے لیے۔'' علیزے روہانسی ہو رہی تھی۔

''میرا بیٹا باپ کے سینے سے لگ کر روئے گا نہیں؟'' انور صاحب نے اپنی بانہیں پھیلا کر کہا۔

علیزے اُن کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، انور صاحب نے اسے کافی دیر رونے دیا ر اُس کا سر سہلانے لگے۔

''میں جب تم کو دیکھتا تھا تو مجھے یہ احساس شدت سے ستاتا تھا کہ میری بیٹی نے پہاڑ جیسا دُکھ اپنے ں میں پال رکھا ہے، آج تمہارے آنسو مجھے مل گئے، دیکھنا یہ پہاڑ ذرا بھی نہیں رہے گا میں شرمندہ ہوں بیٹا اپنی وجہ سے، لیکن اس کے ساتھ میں فخر کرتا ہوں تمہاری وجہ سے، میری بیٹی نے وہ کیا جس نے ہرا سر ہمیشہ کے لیے بلند کردیا، اُس نے اپنے باپ کی عزت رکھی، اچھی بیٹیاں تو والدین کے لیے نعمت ے کم نہیں ہوتیں۔'' انور صاحب اُس کا سر سہلاتے ہوئے مسلسل اپنے دل کی کہہ رہے تھے اُن کے لندھے سے لگی علیزے کو بھی لگ رہا تھا کہ اُس کے ویران دل کی وحشت ختم ہوگئی، جو گھٹن کی طرح اُس کو جینے دیتی تھی نہ مرنے دیتی تھی۔

''علیزے! میں ولی کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا وہ اگر داماد بنتا تو بھی اتنی جگہ میرے دِل میں نہ بنا پاتا جتنی آج ہے۔ اپنی اپنی کشتی اور دنیا تو سب ہی بچاتے ہیں لیکن دوسروں کی کشتیاں اور زندگیاں بچانے کا وصف پیغمبروں اور اولیا کو ملتا ہے وہ اللہ کی بھیجی ہوئی نیک روح ہے، اُس نے اِس گھر کو ایک بار پھر تباہی کے کنویں میں گرنے سے بچایا۔ عبداللہ کو بھی اُس نے بھیجا تھا وہ جانتا تھا کہ تم اور تمہاری ماں اُس کے دِل کے لیے کس قدر اہم ہو، اِس لیے اُس نے اُس شخص کو تمہاری زندگی میں بھیجا، جو اُس جیسی نہ سہی لیکن اُس سے کم اہمیت تم کو ضرور دے گا، مجھے اُس کے کہنے پر یقین ہے اس نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے بات کی تھی۔'' انور صاحب نے ایک دم سے انکشاف کیا۔

''بیٹا! تم سارے ملال مجھے دے دو، سارے آنسو مجھے دے دو اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرو، ہم سب کی بہترین دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' انور صاحب نے علیزے کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا وہ مسلسل بول بول کر تھک گئے تھے لیکن وہ آج اُس کے دل سے ہر طرح کی پھانس نکال لینا چاہتے تھے۔

''عبداللہ کو میں نے دیکھا ہے، اُس سے ملا ہوں وہ بہت اچھا لڑکا ہے، دیکھنا وہ تم کو اتنا خوش رکھے گا کہ تمہارے سارے ملال ڈھل جائیں گے یہ میرا یقین ہی نہیں میری دعا بھی ہے۔'' انور صاحب نے علیزے کو خود سے لگاتے ہوئے کہا۔

''جی ابو!'' علیزے نے دوپٹے سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

باپ کے کندھے سے لگ کر رو کر اس کا دل بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ بابل کی دہلیز ہو یا پھر بابل کا کندھا ہر لڑکی کے لیے وہ ہمیشہ طاقت کا باعث ہوتا ہے۔

زندگی جب جب اُسے کمزور کرتی ہے تو یہ دونوں آگے بڑھ کر اُسے ایک بار لڑنے اور خود کو بچانے کی طاقت دیتے ہیں، ہمت دیتے ہیں، علیزے کو بھی جینے، اپنے دل کو سمجھانے کی طاقت ملی تھی۔

دل کتنا بھی نادان کیوں نہ ہو لیکن وہ جن سے پیار کرتا ہے اُن کو کبھی دُکھ نہیں دیتا اور علیزے ایک اچھی بیٹی تھی وہ تو اپنے باپ کو کبھی دُکھ دینے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی، جو بچے اپنے والدین کا دل رکھتے ہیں اللہ اُن کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں والدین کے لیے دی ہوئی کوئی چھوٹی سی بھی قربانی جہاد کا اجر دلا دیتی ہے، انعام سے نوازتی ہے اور علیزے کو آئندہ زندگی میں اندازہ ہونے والا تھا کہ عبداللہ واقعی اُس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے انعام تھا۔

❖❖○❖❖

”آپ تو ہمیں پاکستان جا کر بھول گئیں۔“ ڈاکٹر فیصل نے فون پر مریم بی بی سے شکوہ کیا۔

”اللہ نہ کرے! کیسی باتیں کرتے ہیں، میں سانس لینا تو بھول سکتی ہوں، آپ کو کبھی بھول نہیں سکتی۔“ مریم نے دھیمی، شرمیلی مسکراہٹ سے سچائی سے کہا۔ ہزاروں میل دور بیٹھے ڈاکٹر فیصل مریم کے چہرے پر دوڑنے والے رنگ یہاں تک محسوس کر سکتے تھے۔

”میں نے آپ کو بہت مس کیا! آپ آ جائیں۔“ ڈاکٹر فیصل کا اظہار مریم کی روح تک کو سرشار کر گیا تھا دل پسندیدہ شوہر کے منہ سے اس طرح کی بات سن کر عورت ویسا ہی محسوس کرتی ہے، جیسے سوکھے پودے کی جڑوں کو پانی ملنے پر زندگی محسوس ہوتی ہے۔

”فیصل! بہو دیکھنے پاکستان نہیں آئیں گے کیا؟“ مریم نے بے حد آس سے کہا۔

”اُسی کے لیے فون کیا ہے، عبداللہ سے کہو اُس کے ڈاکومینٹس پورے کر کے جلد از جلد بھجوائے تا کہ اُس کا ویزا لگ سکے، اس سے کہنا ٹائم نہ ضائع کرے، پاکستان میں اس طرح کے کام خاصا وقت لے لیتے ہیں۔“ ڈاکٹر فیصل نے مریم کی بات ٹالتے ہوئے کہا۔

”فیصل! پلیز ایک بار! ایک بار پاکستان آ جائیں، کئی لوگوں کی قبریں منتظر ہوں گی کہ آپ اُن کی قبروں پر آ کر فاتحہ خوانی کریں۔“ مریم نے اُن کے زخم پھر چھیڑ دیے۔

”مریم! وہ لوگ جن سے دِل اور نیت کے رشتے ہوتے ہیں، اُن تک ہماری دعائیں، پیار، تڑپ اور پڑھائی سب کچھ پہنچ جاتا ہے، چاہے ہم کہیں بھی ہوں۔“ فیصل کی آواز میں حلول دُکھ کو مریم نے بہت شدت سے محسوس کیا۔

”وہ فاصلے اور قربتوں کی حدود سے نکل چکے ہیں مریم! یہ فاصلے اور قربتیں زندوں کے لیے میٹر کرتے ہیں نا کہ مردوں کے لیے!“ ڈاکٹر فیصل ایک لمحے کو رُکے، وہ مریم کی آنکھوں میں بول رہے تھے۔

”کیا ولی اور نگینہ کے لیے بھی نہیں آئیں گے؟ وہ بھی تو آپ کے جگری دوست کی نشانیاں ہیں۔“ مریم کسی نہ کسی طرح اُن کو ایموشنلی بلیک میل کر کے پاکستان بلانا چاہ رہی تھیں جب تک وہ یہاں سے دور تھیں رہ رہی تھیں لیکن یہاں آ کر اُن سے واپس جانا پردیس میں مشکل تھا جہاں کی نہ زمین، نہ آسمان، نہ انسان، نہ ہی ہوائیں اپنی لگتی تھیں سارے دن رات اجنبی لگتے تھے یوں لگتا تھا کہ اُن کو ابھی کہیں جانا ہے اور واپس جانا ہے، ہر وقت خود کا سفر میں محسوس ہوتا۔ اُن کو کوئی گھر، کوئی ملک اپنا لگا ہی نہ تھا اب پاکستان آ کر وہ ایک دم سے ایک بار پھر لالچی ہو رہی تھیں، بے شک سگے رشتے نہ سہی لیکن ایک اٹوٹ رشتہ مٹی کا رشتہ تو باقی تھا، جو اُن کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا اس مٹی نے ایک بار پھر اُن کے پاؤں جکڑنے شروع کر دیے تھے۔

”تم ہونا میرا نائب! اُن دونوں کی خاطر میں نے تم کو پاکستان آنے دیا ورنہ تم جانتی ہو میں تم لوگوں میں سے کسی کو پاکستان نہ آنے دیتا۔“ ڈاکٹر فیصل نے حتمی لہجے میں کہہ کر بات ختم کر دی۔

پاکستان سے وہ جو زخم لے کر روانہ ہوئے تھے، اب وہ ناسور بن گیا تھا اس لیے مریم کا اصرار بے کار تھا۔

”آپ کو بہو کیسی لگی؟“ مریم نے ٹھنڈی آہ بھر کر ٹاپک بدلا۔ لاکھ اُن کی خواہش رہی ہو کہ فیصل ستان آئیں لیکن اُن کو دُکھ اور اذیت میں مبتلا کر کے وہ خوش نہیں رہ سکتی تھیں پھر اتنی دور بیٹھے وہ فوراً ن کا موڈ بھی ٹھیک نہیں کر سکتی تھیں اپنی بات کا ازالہ کرنے کے لیے انہوں نے ٹاپک بدل دیا۔

”جی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے، مجھے بے حد پسند آئی، عبداللہ کو پسند ہے یا پھر دوست کی بات ہی مانی ہے۔“ ڈاکٹر فیصل کا دِل ڈرا ہوا تھا کہ اُن کا اکلوتا بیٹا اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کسی قربانی کی نذر نہ کر لے۔

وہ اپنے بیٹے کی زندگی کو Compromise کے تنے ہوئے رستے پر چلتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے وہ پنے بیٹے کے لیے Original خوشیاں چاہتے تھے۔

”ایسا ویسا خوش ہے! وہ کہتا ہے علیزے تو بالکل اُس کے آئیڈیل جیسی ہے۔“ مریم نے ہنستے ہوئے اللہ کی بے چینیاں بتائیں۔

ڈاکٹر فیصل یہ سن کر اندر تک پُرسکون ہو گئے۔

”اچھا میں فون رکھتا ہوں، تم عبداللہ کو علیزے کے کاغذات کے لیے لگاؤ۔“ ڈاکٹر فیصل نے فون رکھتے رکھتے ایک بار پھر یاد دہانی کرائی۔

”جی اچھا! اللہ حافظ۔“ مریم نے تابع داری سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

”کاش! کاش یہ بچی ہمارے لیے اتنی خوش قسمت ثابت ہو کہ بجائے اس کے کاغذات بنیں یہ ہم ب کو پاکستان ہی کھینچ لائے، اس کے رشتے اور مقدر کے صدقے ہم بھی پاکستان آ جائیں۔“ مریم نے دق دل سے دعا کی۔

”جب ہم اپنی دعاؤں کے یقین کو خود پر پلس مائنس کر کے اپلائی کرتے ہیں تو پھر ہمیں اپنی دعاؤں کے مقبول ہونے کا خدشہ لاحق ہو جاتا ہے، ایسے میں ہم وسیلوں کو ڈھونڈتے ہیں کہ کسی اور کے ذریعے ہماری خواہش، ہماری دعا قبول ہو جائے۔“ مریم نے خود سے مایوس ہو کر علیزے کے مقدر کی دعا کی کہ اُس کا مقدر اس قدر روشن ہو کہ وہ اُن سب کی زندگیوں کے لیے بھی روشنی کا باعث بن سکے۔

❖❖○❖❖

ولی کا کام کسی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں تھا، جو دوسروں کے لیے ہمیشہ نئی سوچ پیدا کرتا تھا اس لیے ٹی ٹو نے اُس کے کام کی کاپی کی فرمائش کی تھی۔ ولی آرٹ کالج سے دو آؤٹ پے چھٹیاں لے کر گیا تھا لیکن آج اُس کے کالج میں قدم رکھتے ہی اُس کے بہت سے دوست، طالب علم اور پروفیسرز نے گھیر لیا تھا۔

سارا دن وہ لوگوں میں رہا، لیکن ٹی ٹو پھر بھی جان گیا کہ یہ وہ والا ولی نہیں، جس کو وہ جانتا تھا جس کی مسکراہٹ میں اُس کی آنکھیں بولتی تھیں لیکن آج تو یوں بجھا ہوا تھا، جیسے لائٹ ہاؤس سے پاور ختم ہو جاتی ہے پھر جب وہ تنہائی میں ملے تو ٹی ٹو نے فوراً اُسے گھیر لیا، جواباً ولی کی زندگی میں آنے والے اتنے بڑے طوفان کا سُن کر وہ کتنی ہی دیر دُکھ سے سکتے میں بیٹھا رہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم نے ایسے شخص سے، آئی مین اب کیسے تم مسکان بھابی کے ساتھ زندگی گزارو گے۔ سب جانے بوجھتے۔" ٹی ٹو نے سوال کیا۔

"ایسے ہی جس طرح تمہارے جملے میں مسکان کے نام کے ساتھ بھابی لگ گیا۔"

"ایسا کیوں ہوا یار؟" ٹی ٹو نے نڈھال، بے حال سے ولی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"میں خود نہیں جانتا!" ولی نے فائل ٹی ٹو کو تھمادی۔ وہ آج کالج آئے ہوئے تھے ولی کو ریکارڈ سے کچھ ٹرانسپرنسی ملی تھیں یہ اُس کے مختلف تھیسز کے ڈسپلے کی تھیں ٹی ٹو یہ فائل کاپی کر کے رکھنا چاہتا تھا تاکہ اُسے آئندہ مدد مل سکے۔

"یہ Change اتنے نیچرل ہوتے ہیں کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، ضرور ہماری زندگی میں داخل ہوجاتے ہیں میں مانوں یا نہ مانو اب وہ میری بیوی ہے تم کو اُس سارے قصے کا دکھ ہے لیکن تم لفظ بھابی پھر بھی استعمال کر گئے۔ تو اے پیارے دوست! میں تو یہ سب کچھ اب اپنی ماں کے لیے کر رہا ہوں، جس نے اللہ اور میری بہن کا واسطہ دیا ہے۔

اور میرے لیے یہ واسطے بہت بہت بڑے ہیں۔

"یار! میرا دل خالی سہی لیکن مطمئن ضرور ہوگا کہ میں نے خودغرضی کے بجائے Sacrifice کا راستہ چنا!" ولی کہہ رہا تھا اور ٹی ٹو یک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ ولی کے چہرے، آنکھوں اور ماتھے سے اُسے روشنی پھوٹتی محسوس ہوئی، وہ اُسے اِس دنیا کا انسان نہ لگا بلکہ وہ بہت اعلیٰ مقام اور کسی اور ہی دنیا کا انسان لگا۔

ٹی ٹو کی نگاہوں میں اُس کے لیے بے حد عزت اور عقیدت تھی۔ جب وہ واپس جانے لگے تو ٹی ٹو نے بے اختیار اُسے گلے لگالیا۔

"تم خاص تھے اِس لیے اللہ نے تم سے خاص کام لیا ہے، پہلے یہ سب سن کر مجھے بے حد دُکھ ہوا تھا لیکن اب میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم کو مبارک باد دوں Selected People Are Gifted this type of special courage اور اللہ نے تم کو مقام دلانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ مبارک ہو یار۔"

ٹی ٹو جو کہہ رہا تھا وہ ولی کے لیے انوکھا تھا، جانے اُسے کیوں لگا کہ اُس کے اندر کا ملال کافی کم ہوگیا ہو۔ اللہ نے ٹی ٹو کے منہ سے وہ کہلوایا جو یقیناً اُس کی رضا ٹھہری ہوگی اسی لیے تو ولی نے اپنے اندر کے غبار کو کافی حد تک چھٹتے ہوئے محسوس کیا۔

"دراصل ہم جان نہیں رہے ہوتے کہ ہر کام کی مصلحت کیا ہے۔" ٹی ٹو نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا۔

میں تمہارے معاملے کو سن کر یقین کر رہا ہوں اس بات کے لیے اور شدت سے منتظر رہوں گا کہ رب جی نے اس میں کیا مصلحت رکھی ہے، یقیناً کسی کا بھلا ہی ہے اس میں۔ میرے دادا کہتے ہیں جو بھلا ہے وہ رب جی کی طرف سے ہے اور جو برائی ہے، وہ شیطان کی طرف سے ہے۔" ٹی ٹو جو عام سا طالب علم رہا تھا آج بہت ساری خاص باتیں کہہ کر اپنے دوست کا بوجھ کافی حد تک بٹا گیا تھا۔

"اللہ نے بہت سارے رشتے پیدا کیے، ان رشتوں میں دوست کا رشتہ یقیناً بہت بڑی نعمت ہے اور

اُلو ہمیشہ یہ نعمت بہت اچھی ملی تھی واقعی وہ خاص تھا اور خاص ہی کے لیے چنا گیا تھا۔

❖❖○❖❖

شام سے کچھ سے پہلے وہ وہاں پہنچی تھی، کہتے ہیں کہ اس سمے میں ملن اور جدائی دونوں پل اکٹھے تے ہیں۔

وقت اکٹھے مل رہے ہوں تو مائیں اپنے بچوں کو اندر بلالیتی ہیں وہ کسی بھی آزمائش سے ڈرتی ہیں۔ سائرہ نے سر جھکائے سمعان علوی کو دور سے ہی بیٹھے دیکھ لیا تھا وہ لیمن اور کوس موس کلر میں ملبوس ا۔ اُس کی گندمی رنگت سونے کی طرح چمک رہی تھی پہلی بار سمعان نے اُسے خود سے کہیں اکیلے میں ا تھا بے حد خود اعتمادی کے باوجود اُس کے اندر کی لڑکی کچھ گھبرا رہی تھی Certain اور uncertain جو راستہ ہوتا ہے، وہ دنیا کا سب سے اذیت ناک راستہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ بنا کسی منزل کے طے ا ہے اس رستے کی خاک کھانے اور تکلیف جھیلنے کے بعد بھی منزل نہیں ملتی۔ سائرہ نے بہت عرصے صبر سے یہ راستہ طے کیا تھا لیکن اب اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا وہ آر یا پار ہوکر ایک نئے ے سے جینا چاہتی تھی، وہ شاید ہمیشہ اپنے دل کی سن کر یاد ماضی میں رہتی لیکن اُس نے اپنی آنی اور ابری طرح اذیت جھیلتے دیکھا تھا۔

"برباد دِل کے مالک کبھی زندگی سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے اور نہ کسی کو دے سکتے ہیں اِس لیے وہ کے ہاں کوئی Status نہیں پاتے۔ تم دِل برباد سے بچنا۔" آنی کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔ ں نے خود کو اس لاحاصل راستے پر چلنے سے روک لیا تھا لیکن آج سمعان کی صرف ایک کال پر وہ کسی مقناطیس کی طرح کھنچی چلی آئی تھی تو اُسے ٹھیک سے اندازہ ہوگیا تھا کہ دِل کا ریموٹ کنٹرول کوئی نہیں ہوتا، اللہ مدد نہ کرے تو خواری ہر صورت جھیلنی پڑتی ہے۔

"السلام علیکم سمعان!" اُس نے اپنی اتھل پتھل ہوتی سانسوں پر کنٹرول کر کے قریب آتے ہوئے ا۔

سمعان اُسے دیکھ کر بہت پیاری مسکراہٹ کے ساتھ اُٹھ کر اُس کے قریب آیا۔

"کیسی ہو؟"

"میں! میں بہت اچھی ہوں! تم کو کوئی شک؟" سائرہ نے خود کو کمپوز کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز ں کہا۔

"تمہارے اچھے ہونے پر کوئی شک میں کیسے کرسکتا ہوں تمہاری اچھائی کو میں نے ہمیشہ دل سے وس کیا ہے اِس کا مزہ لیا ہے!" سمعان نے بے حد کھل کر اظہار کیا۔

"اوہ ریئلی؟" سائرہ نے کچھ شرارت سے پوچھا۔ بے شک یہ مسکراہٹ اور شرارت کسی بھرم کی طرح ا اُس کے لیے۔

"تم جانتی ہو میں جھوٹ نہیں بولتا اور جھوٹ سے مجھے کس قدر نفرت ہے۔" سمعان نے اُس کے بے ریب کھڑے ہوکر کہا۔ سائرہ نے اُس کی آنکھوں کو دیکھا، جو بہت ساری باتیں بنا کہہ گئی تھیں۔

"اور آج میں نے تمہارے ساتھ کچھ پچ شیئر کرنے کے لیے تم کو بلایا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا تم سننا چاہو گی!'' سمعان نے اُس سے بے حد گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ اُس کی آنکھوں کی تپش سائرہ کے من پر جمی برف پگھلا رہی تھی۔

''ہاں! میں سننا چاہتی ہوں!'' سائرہ نے اپنی انا کے خود ساختہ سارے ہتھیار ڈال کر سرنڈر کرتے ہوئے ہاں میں جواب دیا۔

''سائرہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں!'' سمعان نے وہ کہا، جو وہ برسوں سے سننا چاہتی تھی سمعان اُس کی بچپن کی محبت تھا۔

''یہ تمہاری خواہش ہے یا پھر تم مجھے پرپوز کر رہے ہو؟'' سائرہ نے مصنوعی خفگی سے پوچھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' سمعان نے اُس کے چہرے کو شہادت کی انگلی سے چھو کر پوچھا۔

''دیکھو ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اُسے یادگار طریقے سے پرپوز کیا جائے تاکہ وہ اپنے گرینڈ سن اور گرینڈ ڈاٹرز کو اپنی لو اسٹوری گلیمر اور فخر سے سنا سکے۔''

''لیکن اس سب کے پیچھے سب سے اہم بات ہے کہ اسٹوری کے اندر **Love** ضرور ہو۔'' سائرہ کہتے کہتے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''جب کہ میں جانتی ہوں تم کسی اور سے پیار کرتے تھے۔'' سائرہ کے لہجے میں دُکھ آپوں آپ اُتر آیا۔

''سائرہ! میں تم پر ایک بات کلیئر کر دینا چاہتا ہوں کہ محبت اور پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے میں زمین آسمان کا فرق ہے وہ محبت نہ تھی، میں تو پرچھائی کے پیچھے بھاگ رہا تھا یہ بھی تو تم جانتی ہو!'' سمعان نے بے حد خود اعتمادی سے کہا۔

سائرہ یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔ سمعان کی آنکھوں کا رنگ اِس سے پہلے وہ نہ جانتی تھی کہ وہاں اُس کے لیے بھی اتنے رنگ اکٹھے ہو جائیں گے۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں!'' سمعان نے سائرہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

سائرہ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا اس لیے اُسے سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔

''سائرہ! میرے اردگرد بہت دھند تھی اور جب یہ دھند چھٹی تو جو چہرہ سب سے پہلے دکھائی دیا وہ تمہارا تھا۔'' سمعان نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے یقین کی ایک اور سیڑھی پر قدم رکھوایا۔ سمعان کے لہجے کی سچائیاں سائرہ کے اندر ست رنگی روشنیاں بھر رہی تھیں۔

''اور مسکان؟'' سائرہ کو ایک دم خیال آیا۔

''وہ؟'' سمعان کے ماتھے پر بل پڑ گیا۔

''That was not love that was just infectuation'' سمعان نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ سائرہ بہ مشکل سن پائی۔ آج سمعان بہت سارے انکشاف کر رہا تھا۔

''بولو سائرہ! میں اس وقت اتنی مینٹل ڈسٹربنس میں ہوں کہ تمہاری ایک ''نہ'' میری جان نکالنے کو کافی ہے اور ایک ''ہاں'' میری مردہ زندگی کی سسکتی ہوئی خوشیوں کو زندہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔'' سمعان نے شدت جذبات سے کہا۔ سائرہ کا چہرہ شرم و خوشی سے گلنار ہو گیا۔

''کیا کہے بغیر کام نہیں چل سکتا!'' سائرہ نے اُس کے اصرار پر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''پلیز سائرہ! میں اندر سے ترس رہا ہوں، مجھے تمہارا اقرار سننا ہے!'' اُسے سمعان کی شدتیں پاگل کو چھوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''ہاں!'' سائرہ نے بس ایک پل کو سر اور نگاہ اٹھا کر کہا۔

''تھینکس سائرہ! تم میری نہ صرف محبت ہو بلکہ میری رئیل دوست بھی ہو۔'' سمعان نے چہکتے ہوئے کہا۔

''میں کس قدر خوش قسمت ہوں گا کہ میرا رفیق اب صرف رفیق نہیں بلکہ رفیقِ زندگی ہو جائے گا۔'' سمعان نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

''کیا دعائیں اس طرح بھی قبول ہوتی ہیں؟'' سائرہ نے سمعان کے دمکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بے اختیار سوچا۔

''یار! میں تم سے اپنی زندگی کا ایک اور بڑا سچ کہنا چاہتا ہوں، میری پہلے خواہش تھی کہ تم میرے پہلے سچ کو سن کر صرف ہاں میں جواب دو لیکن اس دوسرے سچ کو سننے کے بعد تم کو مکمل آزادی ہوگی کہ تم کوئی بھی فیصلہ کر کے جا سکتی ہو، یقین مانو میں دِل و جان سے تمہارے فیصلے کو قبول کروں گا۔'' سمعان نے سچائی سے کہا۔

''ایسا دوسرا سچ کون سا ہے، جس سے وہ اب تک بے خبر ہے۔'' سائرہ الجھ گئی۔

''سائرہ! میں قاسم علوی صاحب کا حقیقی بیٹا نہیں ہوں، بے شک میرے دِل میں باپ کے مقام پر صرف اور صرف وہ رہیں گے لیکن بہر حال میری زندگی کا واحد اور سب سے بُرا پہلو یہ بھی ہے کہ میں سید سرفراز علی کا ناجائز بیٹا ہوں!'' سمعان کے انکشاف پر سائرہ نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ وہ یہ کیا کہہ رہا تھا اُسے بالکل یقین نہ آ رہا تھا۔

''مسکان کی جانب میری کشش شاید اِس لیے بھی ہو کہ وہ! کہ اُس سے میرا بلڈ ریلیشن بھی تھا۔'' سمعان کو کہنا بے حد مشکل لگ رہا تھا۔

''لیکن اگر تم مجھ پر اعتبار کرو تو میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے تمہارے لیے فیصلہ اِس سچائی کو جاننے سے پہلے کر لیا تھا۔''

''میں مسکان سے مایوس ہو کر ہرگز تمہارے پاس نہیں آیا۔'' سمعان نے فکرمندی سے خاموش سائرہ کو دیکھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اُس کے اندر کیا چل رہا ہے۔

''ایک ناجائز لڑکے سے تم عمر بھر کا رشتہ جوڑنا چاہتی ہو تو یہ پہن لینا، اگر نہیں تو تم یہاں سے چلی جانا، میں تم سے کبھی شکوہ نہیں کروں گا، تم ہر طرح کے فیصلے کے لیے آزاد ہو۔'' سمعان نے سچائی سے کہا اور ایک بریسلیٹ سائرہ کی جانب بڑھا دیا۔

کتنے ہی خاموش پل اُن دونوں کے بیچ آ کر گزر گئے سمعان کی دھڑکن پہلے بہت شدت سے تیز ہوئی۔

''اسے اپنے ہاتھ سے نہیں پہناؤ گے کیا؟'' سمعان نے بے یقینی سے اُسے دیکھا اور اُس نے بے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اختیار اپنی رُکی سانس بحال کی اور فوراً بریسلیٹ جس کے سینٹر پر چھوٹا سا پھول بنا ہوا تھا، جس کے اندر ہیرے لگنے کی وجہ سے خوب چمک پھوٹ رہی تھی اُس کی نازک کلائی میں پہنا ڈالا۔

''پاپا بہت جلد تمہارے گھر آئیں گے اور تمہارے ابو سے ہمیشہ کے لیے تمہیں میرے لیے مانگ لیں گے، تم میری زندگی میں بہار بن کر آؤ گی نا؟'' سمعان نے پھر پوچھا۔ جواباً سائرہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

سمعان کو لگا گویا وہ ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہو۔

❖❖○❖❖

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، جب احمد شاہ باباجی کے ہاں پہنچے، وہ بہت ارجنٹ وزٹ پر آئے تھے۔

''تم چائے وغیرہ پیو میں باباجی سے مل کر آتا ہوں۔'' احمد شاہ نے تھرماس ڈرائیور کو تھماتے ہوئے کہا اور خود باباجی کے چھوٹے سے گھر کی جانب بڑھ گئے۔

حسبِ معمول دروازہ بند ضرور تھا لیکن لاک نہیں تھا۔ احمد شاہ نے ہلکی سی دستک دی۔

''اندر آ جاؤ بیٹا!'' باباجی نے آواز دی۔

''السلام علیکم باباجی۔'' احمد شاہ فوراً اندر چلے گئے، انہوں نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

''خوش رہو، جیتے رہو، اللہ ہمیشہ تمہیں بلند مقام عطا فرمائیں۔'' باباجی نے محبت سے اُن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' احمد شاہ نے اُن کی طرف فکرمندی سے دیکھتے ہوئے پوچھا، وہ بہت ضعیف ہوتے جا رہے تھے۔

''الحمدللہ! اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ اُس نے کسی بھی قسم کی محتاجی سے بچائے رکھا ہے۔'' باباجی نے کہا۔

احمد شاہ نے اُس بوڑھے آدمی کو دیکھا، جو بڑی سے بڑی تکلیف پر شکر کا دامن کبھی نہ چھوڑتا تھا۔ جو اُن سب کے لیے مشعلِ راہ تھا۔

''وہ میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔'' احمد شاہ نے رات کا کھانا باباجی کے ہاں ہی کھایا، کھانے کے بعد وہ اُن کے قریب آ بیٹھے۔

گاؤں سے باباجی کی کسی شاگرد نے دیسی مرغی کا شوربہ بنا کر بھیجا تھا۔ احمد شاہ جو ملک ملک گھومے تھے اُن کو اِس سالن میں بے حد مزہ آیا، انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

''یہ تمہارے نام کی نعمت ہے گاؤں کے لوگ جانتے ہیں کہ میں اِس عمر میں ثقیل غذا نہیں کھا سکتا، زیادہ تر دودھ کا استعمال کرتا ہوں لیکن بچی اتنی خوشی سے بنا کر لائی تو تب ہی میرے خیال میں آیا کہ یہ کھانا آیا ہے تو اِس کے کھانے والے بھی آئیں گے۔'' باباجی نے بہت پیار سے اُن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی محبتوں کا میں اسیر ہوں!'' احمد شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ کی ذات تم کو خوش رکھے۔'' باباجی نے حسبِ عادت دعا دی۔

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔'' احمد شاہ نے ایک بار پھر ٹاپک پر آتے ہوئے کہا۔

''جی پیارے بیٹے! کہیے!'' باباجی نے مکمل متوجہ ہو کر پوچھا۔

جواباً احمد شاہ نے اب تک ہونے والی ہر بات اُن کے گوش گزار کر دی۔

''ہوں!'' باباجی نے ہنکارا بھرا۔

''تمہارا دِل کیا کہتا ہے؟'' باباجی نے سوال کیا۔

''جی! میں دو طرح کی مشکل میں خود کو محسوس کرتا ہوں، خوفِ خدا کہتا ہے کہ ایک لڑکی کے ساتھ کسی ...م کی زیادتی نہ ہو اور دوسری جانب دل ڈرتا ہے کہ وہ بھیڑیا جس نے ولی کے ماں باپ کو زندہ جلا دیا تھا ...ولی کی اصلیت جان کر اُس کی جان کا بھی نہ دشمن بن جائے۔''

''یہ شادی! میں کیسے روکوں؟'' احمد شاہ نے پریشانی سے کہا۔

''تو نہ روکو!'' باباجی نے بے حد آسانی سے جواب دیا۔

''آپ سب جانتے ہوئے بھی کیسے یہ کہہ رہے ہیں؟'' احمد شاہ نے سوال کیا۔

''ہونی کو ہونے دینا چاہیے کیوں کہ اِس کی لگام انسانوں کے پاس نہیں ہوتیں۔''

''کہاں تم ہزاروں میل دور ولی اور نگینہ کو لے گئے تھے، باہر کے ممالک میں اُن کی پرورش ہوئی ...ستان آ کر بھی تم نے اُن کو اتنی دور رکھا، لیکن ولی کا رشتہ اور پہچان جو مٹی تھی اُس نے بالآخر اُسے اپنی ...ب کھینچ ہی لیا۔ اب تم اللہ کی امان میں اِس سارے معاملے کو دے کر ہونے دو اِس شادی کو، جب ہم ...کے سپرد خود کو اور خود کے معاملات کو کر کے انتظار کرتے ہیں تو اللہ جی اُس میں خیر کرتے ہیں۔'' احمد ...ہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''لیکن یہ بہت رسکی ہے، میرے بچوں کی زندگی کے لیے اُن کی ذہنی توڑ پھوڑ الگ ہو گی۔'' احمد شاہ ...ی بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔

''احمد! تم ولی کو اُس کی پہچان بتا دو، وہ اتنا ذہین ہے کہ وہ کب کا جان جاتا کہ اُس کا یہاں سے کوئی ...ہ ہے اگر وہ اپنی ذہانت سے زیادہ تابعدار نہ ہوتا، اُس کی تابعداری اُس کے آگے بند باندھ دیتی ہے ...ن تم کب تک چھپاؤ گے۔''

''احمد شاہ تم اِس چیز کے امانت دار ہو کہ تم اُن کی پہچان اُن تک ضرور پہنچاؤ۔'' باباجی بہت لمبی بات ...ر کے تھک سے گئے تھے۔ احمد شاہ کافی دیر نگاہیں جھکائے بیٹھے رہے بالآخر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

''ٹھیک ہے بابا صاحب! میں جان گیا ہوں کہ اب پل صراط طے کرنے کا وقت آ گیا ہے، آپ پلیز ...رے لیے دعا کیجیے گا کہ کوئی ناقابلِ تلافی نقصان سامنے نہ آئے۔'' احمد شاہ فیصلے تک پہنچ گئے۔

کبھی کبھی ہمارے فیصلے کی کشتی کو کسی دوسرے کے مشورے اور سہارے کا پتوار درکار ہوتا ہے، ایسے میں ...ے اپنی طاقت دوہری لگتی ہے اور زیادہ طاقت اور توانائی سے کشتی کو بہتر رخ اور منزلیں ملتی ہیں۔

❖❖○❖❖

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' شہباز صاحب نے کھلے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر پوچھا۔

...لوفر جانماز پر بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔

''آ جائیے!'' نیلوفر نے قرآن پاک بند کر کے کہا اور اُٹھ کر صوفے پر آ بیٹھیں، اُن کا چہرہ بہت ز...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو رہا تھا وہ بے حد حسین تھی اور لاکھوں اُن کے چاہنے والے تھے لیکن انہوں نے صرف ایک ہی شخص ا
چاہا تھا اور وہ اُن کی بہن کا نصیب بن گیا ایسے میں اپنی توہین کا بدلا انہوں نے سب کو الگ کر کے لیا۔

لیکن آج کی نیلوفر کل کی نیلوفر سے بالکل مختلف تھیں، اُن کا دِل اللہ سے معافی مانگتے مانگتے ایسا ہ
کہ باقی سب غیر بن گئے اور ملا صرف اللہ کا رشتہ، ایسے میں وہ بے حد شانت ہوگئی تھیں، اب اُن۔
دل میں انگارے نہیں دہکتے تھے، جہاں ربّ جی کا نام ہو وہاں تو بس ٹھنڈ ہوتی ہے۔

''میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا تھا۔'' شہباز صاحب نے کچھ ہچکچا کر کہا۔ لگتا تھا کہ ا
کے اندر بہت ساری باتیں اکٹھی چل رہی ہیں۔

''جی کہیے!'' نیلوفر نے کہا۔ اب وہ نہ اُن کی طرف دیکھتی تھیں نہ اُن کے لہجے میں تڑپ باقی تھی۔

سائرہ کے لیے سمعان علوی کا رشتہ آیا ہے، میری قاسم علوی کی فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ باقاع
اجازت لے کر رشتہ لے کر آنا چاہ رہے ہیں۔'' شہباز صاحب نے کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے، سمعان بہت پیارا لڑکا ہے اور سائرہ کا بچپن کا دوست بھی ہے ہم جہاں پہلے ا
کرتے تھے سمعان کی فیملی ہماری ہمسایہ تھی پھر یہ دوستی قربت میں بدلی، مجھے لگتا تھا کہ وہ بھی میر
بچوں جیسا ہے۔ دراصل اُس کی ماں ذہنی مریضہ تھی اور وہ جب جب سارہ سے ملتا تو اُسے ماں کا احسا
ملتا تھا۔ سارہ کے بعد بھی وہ آتا رہا، پھر کوئی تین سال پہلے وہ باہر پڑھنے چلا گیا تھا۔ تعلیم کے بعد
اپنے والد کی ہی ایڈ ایجنسی میں کام کر رہا ہے برائٹ فیوچر اور اُس کی اچھی عادات خود اُس کی سفا
ہیں۔'' نیلوفر نے تفصیلاً جواب دیا۔

''لیکن میں آپ کی مرضی جاننا چاہتا ہوں۔'' شہباز صاحب نے نیلوفر کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔
سے وہ بدلی تھیں اُن کو بہت معصوم اور پاکیزہ لگنے لگی تھیں، اُن کا دِل خود بہ خود اُن کی جانب مائل ہوگ

''میری مرضی؟'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنسیں۔

لالچ اور خود غرضی کی سزا میں نے پالی، کسی اور کی اولاد پر میرا حق اور مرضی نہیں چلنا چاہیے آپ
ہیں خود فیصلہ کریں۔'' انہوں نے شرمندگی سے کہا۔

اپنی غلطیوں کو ماننے والا جب اللہ کو اتنا زیادہ پیارا ہو جاتا ہے کہ وہ اُس کے سارے گناہ معاف
ہے تو وہ انسانوں میں بھی درجے پالیتا ہے نیلوفر بھی ان درجوں کی بلندی کو تیزی سے طے کر چکی تھیں

''جی! ہر چیز کو دور رکھ کر سوچا جائے تو یہ ٹھیک نہیں ہے آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ نے ما
کر ان دونوں بچوں کو پالا ہے آپ کا بھی حق ہے!'' شہباز صاحب نے جب سے نیلوفر کو معاف
اُن کے سامنے اُن کی بہت ساری اچھائیاں بھی آگئی تھیں۔

''اسی لیے تو اللہ نے معافی کو بہت درجہ دیا ہے یہ تو ایسی دعا ہے، جو دینے اور لینے والے کو
اجرت بن کر نئی زندگی دے دیتی ہے۔ ناراضی کی دھند چھٹنے کے بعد ہمیشہ منظر صاف اور اُجلا دکھا
ہے سامنے والے کی اچھائیاں بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔'' نیلوفر کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت تھی

''آپ کا بہت شکریہ شہباز! آپ نے میری اتنی غلطیوں کے بعد بھی حق مجھ سے نہیں چھینا، آپ
اچھے ہیں۔'' نیلوفر نے تشکر سے کہا۔

کل کی نیلوفر غرور اور تنفر سے بھری رہتی تھی، جو کسی کو مانتی ہی نہ تھی اور آج جب وہ اللہ کو ماننے لگی تھی
ہر درجہ پا گئی تھی۔ آج اُسے ماں کا درجہ اعلانیہ مل گیا تھا۔

''سمعان بہت اچھا لڑکا ہے اور دونوں بچے ذہنی طور پر اٹیچڈ بھی ہیں اس لیے یہ رشتہ بہت اچھا رہے
آپ سائرہ اور طارق کی رضا بھی ڈال کر اِس کو او کے کر دیں۔'' نیلوفر نے خوشی سے کہا۔

''سائرہ اور طارق سے آپ پوچھیں اور مجھے بتا دیجیے۔'' شہباز صاحب نے ایک بار پھر اُن کا حق
ا۔

''جی اچھا!'' نیلوفر نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ شہباز صاحب بات ختم کر کے چپ بیٹھے تھے
ے کچھ اور کہنا چاہتے ہوں۔

''میں سوچتا ہوں کہ سائرہ کی شادی کے بعد طارق کی شادی کر دینی چاہیے۔'' شہباز صاحب نے کہا۔

''جی بالکل! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' نیلوفر نے بے حد خوشی سے کہا۔

''آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے یا پھر طارق کی کوئی پسند، آپ تو بہتر جانتی ہوں گی۔'' طارق اپنی
ش کا اظہار اُن سے کر چکا تھا۔ وہ اُس کی پسند بھی اچھے سے جانتے تھے لیکن پھر بھی وہ نیلوفر سے
دیق کرنا چاہ رہے تھے۔

''جی وہ نگینہ کو پسند کرتا ہے اور میرے خیال میں نگینہ بہت پیاری بچی ہے۔'' نیلوفر اُن کی دی اِس
ت افزائی پر بہت زیادہ خوش ہوگئی تھیں۔

''اُس بچی کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے اُس سے وہ کچھ ڈسٹرب ہے کیا ابھی رشتہ لے جانا اچھا ہوگا؟''
ہاز صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''شادی خوشی کا نام ہے جب اُسے خوشیاں ملیں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، آپ اللہ کا نام لے کر یہ
ال دیں۔'' نیلوفر نے انہیں بالکل بیویوں کی طرح تسلی دی۔

''ہوں!'' انہوں نے ہنکارا بھرا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں اگر طارق کو وہ پسند ہے تو ہمیں اپنے بچے کی خوشی ضروری پوری کرنی
ہے، ویسے بھی احمد شاہ تو میری جان کی طرح ہے اُس کے ساتھ رشتے داری میری خوش نصیبی ہے میں تو
سائرہ کے لیے ولی کا سوچتا تھا لیکن ولی کی منگنی علیزے سے ہونے کے بعد میں نے صبر کر لیا تھا۔
ا بیٹی دے کر نہ سہی لے کر تو میں یہ رشتہ قائم و دائم رکھ سکتا ہوں۔'' شہباز صاحب نے پُر جوش ہوتے
ے کہا۔

''جی بالکل!'' نیلوفر نے بھی حامی بھری۔ شہباز صاحب ہر طرح کی بات کر کے پھر بیٹھے تھے نیلوفر کو
ا ہونے لگی کہ اب وہ مزید کیا کہنا چاہتے ہیں۔

''میں حج پر جانا چاہتا ہوں!''

''میری بہت بڑی خواہش ہے!'' شہباز نے کہا۔

''ضرور جائیں، اللہ یہ خوش قسمتی ہر شخص کو نصیب کرے۔'' نیلوفر نے آہ بھر کہا۔

خود دیارِ حبیب اور اللہ کے گھر جانا چاہتی تھیں لیکن کیا کرتیں محرم کے بغیر وہ کیسے جاتیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طارق نے حامی تو بھری تھی لیکن Special Service میں ہونے کی وجہ سے اُسے فوری اجازت نہیں مل رہی تھی، بات اگلے سال یا اُس سے اگلے سال پر جا پڑی تھی اور نیلوفر کے اندر تو آگ لگی ہوئی تھی کہ وہ کسی طرح اللہ کے گھر کو اپنی نگاہوں سے دیکھ اور محسوس کرلیں۔

"آپ بھی ساتھ چلیں، کاغذ جمع ہو رہے ہیں آج کل۔" شہباز صاحب نے اُن سے کہا۔

"میں؟ میں بھلا آپ کے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں؟" بات وہی محرم اور نامحرم کی تھی۔

"کیوں! آپ جانا نہیں چاہتیں، طارق نے تو کہا تھا کہ وہ بہت شرمندہ ہے کہ آنٹی کی اِس خواہش کو اِس سال پورا نہیں کرسکتا۔ لیکن آپ شاید جانا نہیں چاہتیں۔" شہباز نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں! ایسی بات نہیں ہے میں تو ہر پل بہت تڑپ کے ساتھ گزار رہی ہوں، لیکن آپ کے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں آپ تو نامحرم ہیں اور حج تو محرم کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔" نیلوفر کو مجبوراً کھل کر کہنا پڑا۔

"ہاں تو آپ اپنے محرم کے ساتھ ہی جائیے گا۔" شہباز صاحب نے بالآخر وہ کہہ ہی دیا، جس کے لیے وہ ایک گھنٹے سے بیٹھے تھے۔

"مطلب؟" نیلوفر نے حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ساری زندگی خسارے میں گزر گئی اب چند دن جو باقی ہیں وہ کم از کم خسارے میں نہ گزریں۔" شہباز صاحب نے گہری سانس بھری۔

نیلوفر سوچ میں مبتلا ہوگئیں۔

"اب جب مجھے کسی چیز اور رشتے کی طلب نہیں رہی تو پھر یہ کیوں؟" نیلوفر نے بے اختیار کہا۔

"اس لیے کہ مجھے اور تمہیں اب ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔" شہباز صاحب نے کہا۔

"نہیں شہباز صاحب! اب میرے لیے اللہ ہی کافی ہے۔"

"جب دو مسافروں کی منزل ایک ہی ہو تو ہاتھ تھام کر چلنے میں اللہ کی جانب سے آسانیاں اور رحمتیں زیادہ ملتی ہیں۔ نیلوفر عمر کا سنہری دور گزر چکا، شام سمے کے اس مسافر کو نراش نہ کرو، میں کہیں نہ کہیں خود بھی تمہارا قصوروار مانتا ہوں، مجھے تمہاری انا، نسوانیت کو یوں پیروں تلے نہیں روندنا چاہیے تھا، میں سے اچھے دوستوں کی طرح بھی تو معاملے کو بگڑنے سے بچا سکتا تھا۔ مگر اب ختم ہونی چاہیے یہ تپتی ہوئی راہ پر چلنے کی آزمائش! لیکن اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو میں مجبور نہیں کروں گا۔" شہباز اُٹھ کر کھڑے ہوئے باہر نکلنے لگے کہ نیلوفر ایک دم اٹھیں۔

"سنیں! وہ والی تو بات ادھوری رہ گئی!" نیلوفر نے انہیں بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سی؟" شہباز صاحب نے پوچھا۔

"یہی کہ میرے کاغذات کب جمع کروائیں گے، میں تو اِسی سال حج پر جانا چاہتی ہوں اور وہ بھی اپنے محرم کے ساتھ۔" نیلوفر نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

شہباز جن کا چہرہ ایک دم تاریک پڑ گیا تھا نیلوفر کی بات سن کر ایک دم چمک اٹھا اور وہ بھی خوشی سے مسکرادیے۔

"جب روشنی کی لو کم ہو جائے تو ساتھی کے دیے کا تیل لو کو بڑھا دیتا ہے نا۔"

❖❖ ☾ ❖❖

"گڑیا! تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہارے پیپر اتنے شان دار ہوئے۔" ولی نگینہ کا سر گود میں رکھے بیٹھا تھا۔

"پیپر؟" نگینہ نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"تمہارے فائنل پیپر؟" ولی نے یاد دلایا۔

"ہاں!" نگینہ کو یاد آیا۔

"لیکن آپ کو کیسے پتا چلا بھیا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ اس طرح کہ نگینہ نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا ہے۔" طارق نے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

طارق کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ اور پھول تھے اُسی نے کچھ دیر پہلے ولی کو فون کر کے بتایا تھا کہ نگی کا بہت شان دار رزلٹ آیا ہے۔

"سچ!" نگینہ اتنے دنوں میں پہلی بار مسکرائی تھی اپنوں کی محبتیں اُسے ہاتھ تھام کر واپسی کے رستے پر لے آئی تھیں۔

سفر سست سہی لیکن بہرحال جاری تھا اور نگینہ کے پیاروں کو یقین تھا کہ اُن کا پیار اور دعائیں اُسے جلد نارمل کردیں گی۔

"سچی یار!" ولی نے بہن کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

وہ چھوٹی سی گڑیا ہی تو تھی اس کے لیے، ہر چیز سے ڈرتی ہوئی معصوم چڑیا، جو اچانک بھیڑیوں میں پھنسی تھی۔ ولی کا بس چلتا تو اُس کا ہر غم اپنے اوپر اوڑھ لیتا اور ساری خوشیوں کی ردا اُسے اوڑھا دیتا۔

"بھائی! میں پاس ہوگئی؟" نگینہ پھر پوچھ رہی تھی۔

"صرف پاس! یار تم نے کالج میں ٹاپ کیا ہے!" ولی نے بہن کو کندھے سے لگایا، اس دوران طارق بتاتے ہوئے مٹھائی کھول چکا تھا۔

"ابھی تو آپ مٹھائی ہماری طرف سے کھائیں لیکن ہمیں تو آپ کے کھاتے میں سے باہر ٹریٹ لینی ہے۔" طارق نے مطالبہ کیا۔

"کیوں نہیں یار! جہاں کہو گے، وہیں ڈنر کر لیتے ہیں، نگینہ تم بھی اپنی کسی دوست کو انوائٹ کرلینا۔" ولی نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"باہر کھانا؟ دوستوں کو انوائٹ۔" نگی کی آنکھیں کسی خوف سے پھیل گئیں۔ ولی اور طارق دونوں نے ہی اس خوف کو شدت سے محسوس کیا۔

"باہر کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" ولی جانتا تھا کہ وہ گئے دنوں میں باہر جانے پر خوف زدہ رہی ہے، ایک آدھ بار ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا تو وہ سارے راستے روشن آرا کی گود میں گھسی رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں باہر نہیں جاؤں گی۔ وہ مارک، وہ مجھے پکڑ لے گا!'' نگی نے ناخن چباتے ہوئے کہا۔

''کسی کی مجال نہیں ہے کہ تمہیں نگاہ اٹھا کر دیکھے، ہم دونوں تمہارے ساتھ ہوں گے پھر یہ تو پولیس ہے اس کے پاس پستول ہوتی ہے یہ غلط لوگوں کو مار دیتا ہے۔'' ولی نے طارق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان کے پاس پستول ہے؟'' نگی نے دھیرے سے پوچھا۔

''ہاں! یہ دیکھو۔'' طارق نے اپنی پاکٹ سے ریوالور نکال کر سامنے کیا۔

''اس سے کوئی بھی مر سکتا ہے؟'' نگی نے پوچھا۔

''ہاں!'' جواب ولی نے دیا، لیکن طارق نے بہت چونک کر اُسے دیکھا، وہ خاموشی سے نگی کا جائزہ لے رہا تھا۔

''تو پھر میں اِس سے اُس کو ماردوں گی!'' نگی نے اچانک طارق کے ہاتھ سے پستول جھپٹ کر لیا۔

''نگی! یہ کیا حرکت ہے؟'' طارق اور ولی دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''پستول واپس کرو!'' ولی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں!'' نگی نے ضدی بچوں کی طرح انکار کیا۔

احمد شاہ اور روشن آرا دونوں حسن آرا بیگم کے ہاں گئے ہوئے تھے گھر میں کوئی اور نہ تھا، ولی بے حد پریشان ہوگیا۔ اچھی بھلی نگی اچانک عجیب سی حرکتیں کرنے لگتی تھی۔

''تم اس سے کس کو مارنا چاہتی ہو؟'' طارق باتیں کرتا کرتا اُس کے قریب آیا۔

''مارک کو، اُس کے ساتھیوں کو، اس گندی عورت راگنی کو، سب کو!'' وہ چند دن وہاں رہ کر سب بھیڑیوں کے نام جان گئی تھی۔ اُس نے اُن کے شدید قسم کے مظالم بھی دیکھے تھے، دوسری لڑکیوں پر ہوتے بھی اور خود پر بھی۔

''ٹھیک ہے اُن سب کا ختم ہونا اچھا ہے۔'' طارق نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اُس نے نظروں سے ولی کو اشارہ کیا کہ وہ آگے نہ بڑھے، سحرش جیسی جنونی لڑکی کے ساتھ رہتے رہتے طارق کو اچھی خاصی پریکٹس ہوگئی تھی کہ ایسے حالات سے کیسے نپٹا جاتا ہے۔

اُس نے نگی کو باتوں میں لگا کر اُس کے ہاتھ سے پستول ایک دم اُچک لی۔

''مجھے دے دو، میں اس سے اُن کو ماروں گی!'' وہ چلائی اور پھر چلاتی ہی چلی گئی۔ ولی نے اُسے ا... کر لاکھ سمجھایا لیکن وہ چپ نہ ہوئی۔ طارق نے آگے بڑھ کر نگینہ کے منہ پر تھپڑ مارا۔ نگی ایک دم چپ ہوگئی۔

''چپ!''

''چپ!''

''خبردار، جواب پاگلوں کی طرح چیخی۔ ''تم نارمل ہو، نارمل رہو! خبردار جو تم نے ابنارمل behave کیا!'' طارق ولی کا لحاظ کیے بغیر بولا، آج وہ ولی پر بھی ایک دم کھل گیا تھا۔

''تم ایک مسلمان لڑکی ہو! اگر تم کو اللہ پر یقین ہے تو یقین رکھو کہ اللہ ہی نے تمہاری حفاظت وہاں کی ...کوئی لڑکی کبھی بچ کر نکل نہ سکی تھی، لیکن تم بچ کر آئی ہو، اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ ...اور جن کے ساتھ اللہ رہتا ہے وہ کبھی نہیں ڈرتے، اگر انکار نہیں ہے تو تم ثابت کرو کہ تم اس کو اور ...کی رحمتوں کو مانتی ہو اور شکرگزار بھی ہو۔'' طارق نے بات کرتے کرتے پانی کا گلاس بھرا اور اُسے ...ا۔

...ی چہرے پر یک ٹک ہاتھ رکھے اُسے دیکھ رہی تھی، اُس کے پانی پکڑانے پر چپ چاپ پانی پی گئی۔ ...نے حیرت سے نگی کو دیکھا۔ اتنے دنوں کی وحشت جو اُس کی آنکھوں اور چہرے پر تھی وہ اِس وقت ...تھی ولی کو ایک دم ایک واضح منظر نظر آ رہا تھا۔

''صرف طارق ہی ہے، جو نگی کے لیے بہترین پارٹنر ثابت ہوسکتا ہے، کیا ایسا ہوسکتا ہے؟'' ولی نے ...ا۔

''میں بابا اماں سے ضرور اس ایشو پر بات کروں گا۔''

''جناب! آپ بھی مراقبے سے واپس آ جائیں!'' طارق نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا ولی کو تھماتے ہوئے ...ا۔

''نارمل رہو یار تم سب اور نارمل رہنے دو سب کو!'' طارق تھک کر صوفے پر ڈھے گیا۔

...گی ہلکے ہلکے سُڑک سُڑک کر رہی تھی ولی کو ایک دم ہنسی آ گئی، کچھ دیر پہلے اُس کی بہن بھوکی شیرنی بنی ...ی تھی اور اب کیسے بھیگی بلی بنی ہوئی تھی۔

''تم کو کیا ہوا ہے؟'' ولی نے طارق سے پوچھا۔

''کچھ نہیں یار! زندگی نہ ہوئی آزمائش مسلسل ہوگئی ہے، میرے لیے خاص دعا کرو یار، میں اس ...ائش سے نکل جاؤں۔'' ایسا کہتے ہوئے طارق کی نگاہوں کے سامنے سحرش کا چہرہ گھوم گیا۔

...عجیب بے بسی تھی پہلے سحرش کا پاگل پن وہ جھیلتا رہا اب نگینہ بھی ہوش گم کر لیتی تھی۔

وہ زندگی کو نارمل اور خوش ہو کر جینے کا شدت سے خواہاں تھا۔

''مجھ سے زیادہ Critical ہے تمہاری Situation؟'' ولی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''تم تو دو کشتیوں کے سوار نہیں ہو میری طرح! میری تو مجبوری ہے کہ مجھے دونوں کشتیوں پر ہر صورت ...وار ہو کر زندگی گزارنی ہے، میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چوائس ہے بھی نہیں!'' طارق نے دل میں ...لے کر ٹھنڈی آہ بھری۔

''یار کہاں ہیں تمہارے سارے ملازم! کوئی جوس پانی چائے نہیں پلائی، پلیز نگینہ اگر آپ ہی بنا دو کچھ ...میں زیادہ مشکور ہوں گا۔'' طارق نے جان بوجھ کر نگینہ کو کہا۔

گذشتہ کچھ عرصے سے نگینہ نے روزمرہ زندگی میں حصہ لینا بند کیا ہوا تھا۔ لاکھ کہنے پر بھی وہ گم رہتی ...ی لیکن آج طارق کے کہنے پر وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''معجزہ ہوگیا!'' ولی نے خوش ہو کر کہا۔

''یار! معجزے بھی تو دنیا میں ہی ہوتے ہیں!'' طارق نے ہنستے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیکن سوری! میں نے نگی کو مارا!" طارق نے ولی سے معافی مانگی۔

"اللہ کرے نگی اتنے حواسوں میں آئے کہ وہ خود لڑے کہ تم نے اُسے مارا، پھر تم اُسی سے معافی مانگنا۔" ولی نے خوش دِلی سے کہا۔

نگینہ کے نارمل **Behave** کی قیمت اگر ایک تھپڑ تھا تو وہ باخوشی قبول کرسکتا تھا۔

"اور کوئی نئی تازی!" ولی نے طارق سے پوچھا۔

"میرے ہاں بیٹا ہوا ہے۔" طارق نے جل کر کہا۔

وہ سحرش کے روّیے سے بہت اپ سیٹ تھا۔

"مبارک ہو!" ولی نے مسکرا کر کہا۔

کافی عرصے بعد اُن کے درمیان نوک جھوک ہوئی تھی۔

"ویسے تمہیں یاد دلانا تھا کہ ترتیب سے کام کیا کرو، پہلے شادی کرنی تھی پھر بیٹا پیدا کرنا تھا۔" ولی نے اُسے چھیڑا۔

"میں تو شادی کرہی لوں گا، تم بتاؤ یہ کیا تماشا ہے؟" طارق نے اپنی جیکٹ سے ایک کارڈ سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"کارڈ ہے!" ولی نے بے نیازی سے کہا۔

"جانتا ہوں، لیکن یہ شادی کا کارڈ ہے!" طارق نے غصّے سے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" ولی نے بے حد پرسکون ہو کر کہا۔

"کیا ہوا؟"

"تم نہیں جانتے؟"

"تم جان بوجھ کر خودکشی کررہے ہو، تم اُس فراڈ انسان کی بیٹی سے شادی کررہے ہو!" طارق نے [illegible] سے کہا۔

"اس میں اُس لڑکی کا کیا قصور ہے! پھر یہ امّاں جان کی خواہش ہے کہ اُسے رخصت کروا کر لے آیا جائے، میں اپنی ماں کی خواہش کو حکم مانتا ہوں۔" ولی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"اور علیزے؟" طارق نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اب نامحرم ہے میرے لیے، کسی اور کی عزت ہے میرے لیے اگر وہ میری محبت تھی تو آج ا... میرے دِل میں محرم ہے یہی اصولِ زندگی ہے، جو اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔" ولی کی بات پر طارق کا بے اختیار دِل چاہا کہ ایسے مضبوط انسان کو سلام کرے۔

"تم بھی نا!" طارق کچھ کہہ نہ پایا اور اُٹھ کر اُسے گلے لگالیا۔

"سدا خوش رہو یار! تیرے جیسے انسان ہی انسانیت کا سمبل ہوتے ہیں، ہم جیسے لوگوں کے لیے سبق آموز ہوتے ہیں۔" طارق کہے بنا نہ رہ سکا۔

"یار! میں کیا ہوں، میں خود نہیں جانتا لیکن بس اپنی سی کوشش کی ہے، تم میرے لیے دعا کرنا کہ میں اس آزمائش پر پورا اتروں۔" ولی نے دھیرے سے کہا۔

"صاحب باہر مہمان آئے ہیں۔" اُسی پل ملازمہ نے آ کر کہا۔

"کون ہیں؟" ولی نے پوچھا۔

"عبداللہ صاحب اور اُن کی والدہ ہیں۔" ملازمہ نے جواب دیا۔

"بھیج دو!" ولی نے ملازمہ کو جواب دیا۔

"السلام علیکم! چشم ماہ روشن دِل ناشاد!" ولی نے بہت خوش دلی سے عبداللہ کو ویلکم کیا۔

"السلام علیکم آنٹی!" ولی نے مریم بی بی کو سلام کیا۔

مریم بی بی یک ٹک ولی کو دیکھ رہی تھیں اُن کی تو نظروں کی پیاس ہی نہ ختم ہو رہی تھی آج وہ زبردستی عبداللہ کو لے کر یہاں آئی تھیں، وہ ولی کے ماں باپ سے ملنا چاہتی تھیں تاکہ سچائی تک جائیں، وہ سچائی جو اُن کا دِل انہیں بتاتا تھا۔

"وعلیکم السلام! جیتے رہو، شاد رہو، آباد رہو!" مریم بی بی نے آگے بڑھ کر ولی کو سینے سے لگالیا۔ ولی کو اُن سے بہت مانوس خوشبو آئی۔

"آپ بیٹھیں پلیز!" ولی نے انہیں بٹھایا اور ملازمہ کو چائے لانے کا کہا۔

"یہ میرے بہت پیارے دوست طارق ہیں!" ولی نے طارق کا تعارف کرایا۔ کچھ دیر وہ ہلکی پھلکی گپ شپ کرتے رہے نگینہ بھی اُن کے پاس آ بیٹھی تھی۔

"اچھا یار! میں چلتا ہوں۔" طارق نے نگینہ کو ایک نظر دیکھ کر کہا اور اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

"آپ کی امی کب تک آجائیں گی بیٹا؟" مریم بی بی نے بے صبری سے سوال کیا۔

"ابھی کچھ دیر میں آجائیں گی۔" نگینہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا، جس طرح پیار سے یہ خاتون اُس کو بار بار لپٹا کر پیار کررہی تھی۔ نگینہ کو نا جانے کیوں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"صاحب باہر اور مہمان آئے ہیں۔" ملازمہ نے ایک بار پھر آ کر کہا۔

"بڑے بھائی! ہم آئے بہار آئی، ساتھ رحمت کی لہر بھی آئے مزید مہمان آگئے ہیں، آپ کیا کہیں گے مہمان در مہمان!" عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یار! نہ اُردو کی ٹانگ توڑا کرو۔" ولی نے خوش دِلی سے کہا اور ملازمہ کو مہمانوں کو اندر ہی لانے کا کہا۔

"سامنے سے نفیسہ بیگم ملازماؤں کے ساتھ بڑے بڑے تھالوں میں کچھ لیے اندر آئی تھیں غالباً وہ کوئی شگن قسم کی رسم کی غرض سے آئی تھیں۔ سید سرفراز علی نے مسکان کے معاملے میں اُن کو آگے آگے کیا تھا۔ اب تک وہی اُن کے ہاں آئی تھیں، دولہا کے کپڑوں کا ناپ اور بیڈروم ڈیزائنز وغیرہ کے ساتھ سید سرفراز علی نے ایک **Designer** ہائر کیا تھا کہ وہ سارے **Event** کو ڈیزائن کرے آج وہ کچھ شگن لے کر آئی تھیں یہ اُن کے ہاں کی رسم تھی کہ سات پھل سات قسم کی مٹھائیاں اور دولہا کے کپڑوں کے ساتھ سارے افرادِ خانہ کے کپڑے اور چاندی یا سونے کی تھالی پر دولہا دولہن کے نام کے ساتھ نیوتا دیا جاتا تھا دولہا کے گھر والوں کو۔

جیسے ہی نفیسہ بیگم مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں، سامنے بیٹھی مریم بی بی کو دیکھ کر ایک دم سے چکرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئیں۔

وقت بدلا ضرور تھا لیکن اتنا نہیں کہ وہ مریم بی بی کو نہ پہچانتیں!

''مریم بی بی!'' نفیسہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''نہ۔ نفیسہ؟ تم زندہ ہو؟'' مریم بی بی نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُن کو دیکھا۔

اُن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامنے ڈاکٹر فیصل کی سگی بہن نفیسہ کھڑی ہے، جس کو برسوں پہلے ڈاکٹر فیصل نے مرا جان کر سالوں اُن کے لیے آنسو بہائے۔ آج وہ زندہ اُن کے سامنے تھیں۔

برسوں کا سفر دونوں نے لمحوں میں طے کیا تھا کیا کچھ نہ تھا دونوں کی آنکھوں میں! بے بسی، دُکھ، وقت اور رشتوں کو کھو دینے کا دُکھ! لیکن اس کے ساتھ اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی جھلملا رہے تھے۔

''نفیسہ! تم زندہ ہو! یا میرے اللہ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔'' مریم بی بی نے نفیسہ بیگم کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

''اگر سانسیں لینے کو زندہ کہتے ہیں تو پھر میں زندہ ہوں۔'' نفیسہ بیگم نے بھی زار زار آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''میں! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہیں زندہ سلامت دیکھ رہی ہوں۔'' مریم بی بی نے نفیسہ کے چہرے کے ایک ایک نقش کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا جیسے وہ یقین کرنا چاہتی ہوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کوئی خواب نہیں۔

''وہ جو اُوپر اللہ بیٹھا ہے نا، جو بار بار یہ کہتا ہے کہ اُس کے لیے مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں، وہی زندوں کو بچانے والا ہے، کوئی کیسے کسی کو موت دے سکتا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے مریم بی بی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہاں موجود ہر شخص کو بھولے وہ بس آپس میں مگن کھڑی تھیں۔

''امی یہ سب کیا ہے؟'' عبداللہ سے آخر رہا نہ گیا تو وہ آگے بڑھا۔

مریم بی بی نے آگے بڑھ کر بیٹے کو دیکھا پھر وہ نفیسہ بیگم کی جانب دوبارہ مڑیں۔

''نفیسہ یہ، اِس کو دیکھو! کیا تم اِس میں کسی اور کو دیکھ سکتی ہو؟'' مریم بی بی نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے نفیسہ بیگم کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔ نفیسہ بیگم کو بس ایک پل لگا تھا۔ وہ عبداللہ کو یک ٹک دیکھتی رہ گئیں۔

''فیصل!!''

''فیصل بھائی؟'' نفیسہ بیگم کا رُکا ہوا سانس ایک دم غیر متوازن تنفس میں تبدیل ہوا۔

''میں۔ میرا بھائی فیصل؟''

''مریم وہ۔ وہ زندہ ہے؟'' نفیسہ بیگم دیوانوں کی طرح مریم بی بی سے پوچھ رہی تھیں۔

جواباً مریم بی بی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ عبداللہ ہے میرا اور فیصل کا بیٹا!'' مریم بی بی کا انکشاف نفیسہ بیگم کے لیے شادیٔ مرگ کی کیفیت کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکٹھا کر گیا۔ وہ ایک دم ہی کھڑے سے بیٹھ گئیں۔

''بھائی! یہ سب کیا ہے؟'' نگینہ نے عبدالولی کا ہاتھ ہلا کر پوچھا۔

خود عبدالولی کچھ عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا اُسے صاف محسوس ہو رہا تھا، جیسے کوئی پنڈورا باکس کھلنے والا ہو۔

''نفیسہ! یہ عبداللہ بھائی کا بیٹا ولی اور نگینہ ہے نا؟'' مریم بی بی نے نفیسہ بیگم کے قریب بیٹھتے ہوئے بے صبری سے پوچھا۔

نفیسہ بیگم نے ایک نظر سامنے دیکھا تو ولی اور نگینہ کے علاوہ وہاں سب افراد تجسس سے کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ نفیسہ بیگم کی نظروں کے سامنے احمد شاہ اور روشن آرا بیگم کے نرم اور عاجزی سے بھرے چہرے گھومے۔

''مریم! احمد شاہ بھائی اور روشن آرا بیگم، ولی اور نگینہ کے والدین ہیں۔'' نفیسہ بیگم نے بے حد ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''نفیسہ! تم جانتی ہو کہ یہ سچ نہیں ہے شکلوں کا ملنا، ناموں کا ملنا کوئی اتفاق تو ہو سکتا ہے لیکن ان کے وجود سے اٹھتی خوشبو بتاتی ہے کہ یہی میرے عبداللہ بھائی کی نشانیاں ہیں۔'' مریم بی بی نے ضدی لہجے میں کہا، وہ زار زار رونے لگیں۔

''امی پلیز! آپ اِس بات کو لے کر نہ صرف خود ڈسٹرب ہوئی ہیں بلکہ سب کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔'' عبداللہ نے آگے بڑھ کر ولی سے سوری کیا۔

''اِدھر آؤ عبداللہ۔'' نفیسہ بیگم نے اس کو گلے لگاتے ہوئے ڈھیروں ڈھیر پیار کیا۔

''یہ تمہاری پھوپو ہیں عبداللہ!'' مریم بی بی نے ایک بہت بڑا انکشاف کیا۔ عبداللہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''لیکن! پاپا تو بتاتے تھے کہ اُن کا دنیا میں کوئی بہن بھائی زندہ نہیں رہا۔'' عبداللہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہ خوش خبری تو وہ خود بھی نہیں جانتے۔'' مریم بی بی نے آنسوؤں میں کہا۔

''مبارک ہو عبداللہ! تم کو اپنی پھوپو سے ملنا مبارک ہو۔'' ولی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

نگینہ بھی سارا منظر بے حد دِل چسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''شکریہ۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آنٹی! پھر چائے پیتے ہیں اِس خوشی میں۔'' نگینہ نے سب کو چائے سرو کی۔

مریم بی بی اب بھی ولی اور نگینہ کو بے صبروں کی طرح دیکھے جا رہی تھیں۔

''نفیسہ! مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ ولی اور نگینہ میرے عبداللہ بھائی کے بچے نہیں ہیں۔'' مریم بی بی نے نفیسہ بیگم کی طرف مڑ کر کہا۔

''میں نے یہ کب کہا کہ وہ عبداللہ بھائی کے بچے نہیں ہیں، میں نے تو یہ کہا ہے کہ احمد شاہ صاحب بھائی اور روشن بہن اِن کے والدین ہیں۔'' نفیسہ بیگم کا لہجہ مریم بی بی کے اندر تک زندگی اُتار گیا۔

''تو پھر تم نے یہ کیوں کہا بچوں کے سامنے کہ وہ؟'' مریم بی بی کہتے کہتے رُک گئیں۔ ولی اور عبداللہ اُن میں مشغول تھے، جب کہ نگینہ ملازمہ کے ساتھ کچن میں تھی لیکن ولی کے چہرے کا رنگ بتا رہا تھا کہ اندر تک ڈسٹرب ہے وہ باتیں کر رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر موجود پریشانی بہت واضح تھی۔

''مریم! اِس لیے کہ ولی اور نگینہ کو احمد شاہ بھائی اور روشن بہن نے اپنے جگر گوشوں کی طرح پالا ہے یہ کیسے اور کس معجزے کے تحت اُن تک پہنچے، میں نہیں جانتی لیکن اب ہم کو بھی ان پر کوئی حق نہیں ہے کہ اُن کو اپنے والدین سے پل میں اجنبی کروا دیں۔'' نفیسہ بیگم نے کچھ دھیمی سرگوشیوں میں مریم بی بی سے بات کی۔

''میں جانتی تھی، میرا دل کہتا تھا کہ یہ ہمارے نگینہ اور ولی ہیں۔'' مریم بی بی نے پیاسی نگاہوں سے ولی کو ایک بار پھر دیکھا۔

''میں ابھی آتا ہوں عبداللہ۔'' ولی مہمانوں کو کچھ دیر کے لیے چھوڑ کر اندر چلا گیا، وہ روشن آرا بیگم اور احمد شاہ کو تنہائی میں فون کرنا چاہتا تھا اُن کو فوراً یہاں بلانا چاہتا تھا، وہ اُن کو عبداللہ اور اُس کی امی سے ملوانا چاہتا تھا۔

دوسری طرف مریم بی بی عبداللہ کے سامنے بہت سارے راز افشا کر رہی تھیں عبداللہ حیرت اور دُکھ سے ماں اور پھوپو کی باتیں سُن رہا تھا۔

''میرا نکاح تمہارے پاپا سے بھائی عبداللہ نے رات کے اندھیرے میں کروا کر ہمیں راتوں رات گاؤں سے باہر بھیج دیا تھا، ہم کچھ روز شہر میں رہے۔ بھائی عبداللہ اور عائشہ بھابی ہم سے شہر ملنے صرف ایک بار آئے تھے، بھائی عبداللہ نے اپنی روایات کے خلاف جاتے ہوئے میرے نام کی زمین میرے حوالے کر دی تھی۔ انہوں نے ہم دونوں کا باہر جانے کا پورا پورا بندوبست کروایا تاکہ کچھ عرصے تک ہم سید سرفراز جیسے وحشی اور ظالم انسان سے دُور رہ سکیں۔ فیصل کی ذہنی حالت بہت زیادہ خراب تھی لیکن انہوں نے سدرہ آپی سے کیا وعدہ پورا کیا اور مجھ سے نکاح کیا اور ہم باہر چلے گئے کچھ عرصے بعد بھائی عبداللہ کے دوست کے ذریعے معلوم ہوا کہ سارے خاندان کو سید سرفراز علی نے زندہ جلا کر مار ڈالا، وہ بھائی، جو اِس ملک میں میرا میکہ تھا، میری جڑیں تھا، میرا تعلق تھا جب وہی نہ رہا تو میرے لیے پاکستان میں اپنا علاقہ سوائے ایک ناسور کے کچھ نہ رہا تھا۔ پھر فیصل تھے، جن کا خاندان مارا جا چکا تھا جب کچھ نہ رہا تو ہم نے مُڑ کر نہ دیکھا کہ پاکستان جانا بھی ہے۔ لیکن اللہ نے سالوں سے چلتے اِس پھٹے زخم کو شاید بھرنا تھا اِس لیے عبدالولی سے میری ملاقات کروائی۔ وہ کہاں سے مجھ سے آ کر ملا یہ سوائے اللہ کی Planning کے کچھ نہ تھا میں اُس کی کشش کو لیے یہاں آئی اور بہو حاصل کی، ایک اور رشتہ یہاں سے ملا۔ آج جب میں فیصل کو بتاؤں گی کہ اُن کی بہن زندہ ہے تو اُن کے دِل کا وہ کونا جو مر چکا ہے وہ پھر زندہ ہو جائے گا وہ اب ضرور پاکستان آئیں گے۔'' مریم بی بی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''جس رات سید سرفراز علی نے ہمارے گھر اپنے بندوں کے ذریعے حملہ کروایا تھا، اُس رات وہ سب لوگ مارے گئے تھے سوائے میرے، مجھے وہ اٹھا کر لے گئے تھے فیصل بھائی کو اس لیے پتا نہ چلا کیوں کہ وہاں گھر جلا دیا گیا تھا، سب گاؤں والوں کا خیال تھا کہ پولیس نے ڈاکوؤں کو پکڑنے کے لیے فائرنگ کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے، جس کی زد میں میرے گھر والے آ گئے اور ڈاکوؤں ہی میں سے کوئی جاتے جاتے ہمارے گھر آ
لگا گیا، لیکن جس کو اللہ بچانا چاہتا ہے اُسے کوئی نہیں مار سکتا، سید سرفراز علی نے مہینوں تہہ خانے میں
رکھ کر مجھے جسمانی ذہنی اذیت دی، پھر جانے کیسے سید عبداللہ تک میری خبر پہنچ گئی، انہوں نے ہی
آزاد کروایا اور پنچایت کے سامنے لا کھڑا کیا۔

میری حالت اِس قدر غیر تھی کہ شاید میں زندہ نہ بچ پاتی اور اگر بچ بھی جاتی تو میرا ٹھکانا کہاں ہوتا
سید سرفراز علی نے اس مکاری سے اپنا کیس لڑا کہ میرے حق میں کوئی گواہ نہ مل سکا، لیکن میری حالت
بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا پنچایت نے سید سرفراز علی کے خلاف ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اُسے
کیا اور میری حالت کی خرابی کی وجہ سے اور میرے مستقبل کو بچانے کے لیے مجھے اُس ظالم کے
حوالے کر دیا اور میرا نکاح سید سرفراز علی سے کر ڈالا۔ اس نکاح کے حق میں پیش پیش عبداللہ بھائی
انہوں نے بہت پیار سے مجھے بتایا تھا کہ میری بدنامی کا سانپ اتنا زہریلا ہے کہ میں کبھی بھی باہر نکل
اس سے بچ نہ پاؤں گی لیکن سید سرفراز علی نے پنچایت کے پریشر میں آ کر یہ فیصلہ لیا ہے وہ مجھے
نقصان پہنچائے گا، پھر انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ حالات بہتر ہوتے ہی وہ مجھے فیصل بھائی تک پہنچا
گے لیکن وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے کیوں کہ سید سرفراز علی نے انہیں مار ڈالا تھا لیکن وہ جاتے جاتے
سرفراز علی کو بہت ساری سے کر گئے تھے۔" نفیسہ بیگم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

عبداللہ شاک کی کیفیت میں تھا ابھی تو اُس نے اِن سب باتوں کا پس منظر نہ جانا تھا تو وہ اِس قدر
دُکھی تھا اگر وہ سب جان جاتا تو یقیناً اُسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہتا۔

"اور بڑے بھائی۔؟"

"میرا مطلب ہے عبدالولی بھائی کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق ہے کیا، کوئی بلڈ ریلیشن! جیسا کہ امی بتا
ہیں کہ وہ؟" عبداللہ دروازے میں کھڑے عبدالولی کو دیکھ کر چپ ہو گیا، سب کی نظریں سامنے کھڑے
ولی پر تھیں، جو بہت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کمرے کے عین وسط میں آ کھڑا ہوا تھا، اُس نے بے
اختیار لب کچلے تھے۔

"آنٹی مریم! میں اور نگینہ صرف احمد شاہ کے بچے ہیں ہمارے والدین ہماری زندگیوں کا بہت
سرمایہ ہیں، گواہیاں تو دِل دیتا ہے نا! میرے دِل نے کبھی یہ گواہی نہیں دی کہ وہ ہمارے والدین نہیں
ہیں۔" عبدالولی نے تابع داری اور محبت کی ساری سرحدیں پھلانگ دی تھیں سارے Facts سارے
احساسات، ساری سکس سینس ہر چیز کو اُس نے اِس بھرم پر قربان کر دیا تھا۔ اندر آنے کے لیے کھڑے
احمد شاہ نے بہت واضح انداز میں یہ ساری باتیں سنی تھیں۔

ولی کی اس قدر محبت نے اُن کو Speechless کر دیا تھا۔ وہ بہت اعتماد سے اندر داخل ہوئے
سب کو با آواز بلند سلام کیا۔

"معافی چاہتا ہوں، آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی، میری بیگم تو اپنی بہن کے ہاں موجود ہیں، ا
نے مجھے بہت ارجنٹ آنے کی درخواست کی تھی۔" احمد شاہ نے صوفے پر عبدالولی کے ساتھ بیٹھتے ہو
کہا۔ اُن کی مخاطب نفیسہ بیگم تھیں۔

احمد شاہ اور عبدالولی کے چہروں میں ایک ایسے نقش کی مماثلت تھی کہ وہ کسی اندھے کو بھی کافی تھی، جاننے کے لیے کہ وہ دونوں باپ بیٹا بے چین تھے، دونوں کے چہرے بے حد روشن اور آنکھوں میں بے حد پاکیزگی تھی۔

"بابا جان! یہ عبداللہ ہے یہ اُن کی ماما ہیں۔" عبدالولی نے اُن کا تعارف کروایا۔ عبداللہ نے باقاعدہ قریب آ کر احمد شاہ سے ہاتھ ملایا۔

احمد شاہ نے بے حد کھلے دل سے عبداللہ سے ہاتھ ملا کر سلام دُعا کی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ عبداللہ اب علیزے کا شوہر ہے، وہ علیزے جس کے متعلق آج اُن کی بیوی نے راستے میں بتایا تھا کہ وہ ولی کی محبت تھی لیکن وہ اللہ کے ہر فیصلے کو ماننے والوں میں سے تھے، دل کی ساری رضا کے ساتھ پھر وہ کیوں اپنے دِل میں بال برابر بھی ملال لاتے۔

"میں کچھ شگن لے کر آئی تھی لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ یہاں سے جاتے ہوئے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی بھی حاصل کر کے جاؤں گی۔" نفیسہ بیگم نے نم آنکھوں کو صاف کر کے مسکرا کر کہا۔

"مریم بی بی میری بھابی ہیں، میرا بھائی ڈاکٹر فیصل جو برسوں پہلے مجھ سے بچھڑ گیا تھا آج اُس کا پتا چل گیا ہے۔ احمد بھائی آپ کا گھر اور آپ لوگ اتنے بابرکت ہیں کہ میرے دِل میں جلتی برسوں کی آگ آپ کے یہاں آنے سے بجھ گئی ہے۔" نفیسہ بیگم نے بہت پیار سے مریم بی بی اور عبداللہ کو دیکھا۔

"آپ کو بے حد مبارک ہو! اللہ تعالیٰ کی ذات کا لاکھ لاکھ شکر ادا کریں کہ اُس مولا نے آپ کو ایسی خوشی دی، جس کی اُمید بھی آپ کو نہ تھی۔" احمد شاہ نے نفیسہ بیگم کو مبارک باد دی۔

نفیسہ بیگم نے احمد شاہ سے شگن کی رسم کی اور چلنے کو اُٹھ کھڑی ہوئیں، اس ساری رسم کو عبداللہ نے اپنے موبائل فون کے کیمرے سے کوّر کیا۔

"پاپا! آج رات ایک گڈ سرپرائز کے لیے تیار رہیے گا۔" عبداللہ نے تصویریں اور ویڈیو بناتے ہوئے دِل میں کہا۔

دوران تقریب احمد شاہ نے بہت پیار سے ولی کو دیکھا۔

"میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے بیٹا!" احمد شاہ نے ولی کو گلے لگا کر کہا۔ ولی کے جلتے دِل پر کسی نے ٹھنڈی پھوار ڈالی۔

"تھینکس بابا!" ولی نے بے اختیار کہا۔

"اچھا بھابی میں چلتی ہوں۔" نفیسہ بیگم کا دِل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ مریم بی بی سے الگ ہوں، اُن کو مریم بی بی اور عبداللہ کے وجود سے اپنے بھائی کی خوشبو آ رہی تھی۔

"نہ جاؤ اُس جہنم میں واپس نفیسہ! ہمارے ساتھ چلو!" مریم بی بی نے بے حد پیار سے نفیسہ بیگم کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"بھابی! میری ذات کے جتنے نقصان ہونے تھے اور میری زندگی کا جتنا حصہ برباد ہونا تھا، وہ تو ہو چکا اب ڈر کیسا؟ لیکن اب مجھے اپنی ذات کے علاوہ کسی اور کی زندگی بھی پیاری ہے۔" نفیسہ بیگم کے دماغ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے پردے پر مسکان کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔

''کون ہے وہ؟'' مریم بی بی پوچھے بنا رہ نہ سکیں۔

''مسکان! سید سرفراز اور صائمہ بی بی کی اکلوتی بیٹی۔'' نفیسہ بیگم نے کہا۔

''تم! تم اُس ظالم شخص کی بیٹی کے لیے فکر مند ہو، جس نے تمہاری ساری زندگی تباہ کر ڈالی۔'' مریم بی بی نے غصّے سے کہا۔

''مریم! وہ سید سرفراز کی بیٹی نہیں ہے وہ صرف اور صرف حویلی کی بیٹی ہے!'' نفیسہ بیگم نے بے اختیار ٹھنڈی سانس بھری۔

مریم بی بی دُکھ سے نفیسہ بیگم کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''مسکان، سید سرفراز کی بیٹی نہیں ہے وہ تو حویلی کی بیٹی ہے اُس منحوس اور خونی حویلی کی بیٹی، جہاں پر پیدا ہونے والی ہر بیٹی کی قسمت ایک جیسی ہوتی ہے، اُن کے دُکھ بھی ایک جیسے ہوتے ہیں اور اُن کے آنسو بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میری مسکان نے بھی ہر جہنم کو جھیلا ہے کیوں کہ وہ بھی تو حویلی کی بیٹی تھی نا!'' نفیسہ بیگم نے نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بھیگی بھیگی آواز میں کہا۔

کچھ فاصلے پر کھڑے عبدالولی، عبداللہ اور احمد شاہ باتیں کر رہے تھے نفیسہ بیگم اور مریم بی بی دروازے کے پاس کھڑی مدھم لہجے میں باتیں کر رہی تھیں، نفیسہ بیگم نے بے حد پیار سے عبدالولی کو دیکھا۔

''وہ۔ وہ عبدالولی ہے! تم جانتی ہو نا کہ اُس کی رگوں میں کس پیارے انسان کا خون دوڑ رہا ہے وہ اپنے باپ کا ادھورا چھوڑا ہوا کام کرنے جا رہا ہے قدرت نے اُسے خود منتخب کیا ہے، یہ بچہ اُس حویلی کا نجات دہندہ بنے گا مریم۔'' نفیسہ بیگم نے کچھ پُر جوش انداز میں کہا۔

''سید سرفراز علی کے ظلم کا اتنا لمبا دور دیکھ کر لگتا تھا کہ اُمید کا سورج شاید اب کبھی اُگے گا ہی نہیں کہ جس دن روزِ حساب روشن ہوگا۔ لیکن دیکھو آج تم اور میں بھی مل رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اوپر والا ''بے نیاز'' سہی لیکن وہ اپنے بندے کو ستر ماؤں کے پیار سے زیادہ پیار بھی کرتا ہے وہ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دیتا۔'' نفیسہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''مسکان تب میری گود میں آئی، جب یہ چند دن کی تھی میں اپنے بچے کو کھو چکی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ دُنیا میں نہ رہا ورنہ اُس کا وجود مجھے ایک کالی رات اور اپنے کالے ماضی کی یاد دلاتا رہتا۔'' نفیسہ بیگم نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''لیکن میں نے اِس بچی کو سینے سے ہمیشہ لگا کر رکھا مگر میں اُس کی قسمت نہ بدل سکی، جانے اب کیوں لگتا ہے کہ وقت بدل جائے گا!''

''وہ بچہ بدلے گا سب کچھ!'' نفیسہ بیگم نے ایک بار پھر عبدالولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں اُن کی جانب ہی آ رہے تھے۔

نفیسہ بیگم ایک بار پھر عبداللہ کو گلے لگا کر ملیں، دوسری جانب مریم بی بی بھی اپنی تڑپ پر قابو نہ رکھ سکیں انہوں نے بھی عبدالولی کو خوب لپٹا لپٹا کر پیار کیا۔

''ہم چلتے ہیں بڑے بھائی!'' عبداللہ نے ماں کو کندھوں سے تھام کر الگ کیا۔

''آپ لوگ ہوٹل سے یہاں کیوں نہیں شفٹ ہو جاتے۔'' احمد شاہ نے کھلے دل سے اُن کو آفر دی۔

''نہیں بھائی صاحب! آپ اِس تکلف میں نہ پڑیں ہم وہاں آرام سے ہیں۔'' مریم بی بی نے گاڑی ں بیٹھتے بیٹھتے کہا۔ یہ گاڑی عبداللہ نے پاکستان آتے ہی رینٹ پر لے لی تھی لیکن وہ پاکستان میں رائیونگ کرتے ہوئے ہمیشہ گھبرا جاتا تھا، جہاں کوئی بھی رولز اینڈ ریگولیشن ماننے کو تیار نہ تھا۔

''تکلف تو آپ کر رہی ہیں! بھائی بھی کہہ رہی ہیں لیکن بھائی ہونے کا مان بھی نہیں دے رہیں، ائیوں کے گھر ہوتے ہوئے بھلا بہنیں ہوٹلوں میں ٹھہرا کرتی ہیں؟'' احمد شاہ کا اصرار اس قدر پیارا تھا لہ مریم بی بی کو حامی بھرنا ہی پڑی کہ وہ یہاں شفٹ ہو کر عبدالولی کی شادی کی تقریبات کو انجوائے رسکیں گی۔

جب عبدالولی اور احمد شاہ سب کو رخصت کر کے اندر آئے تو نگینہ کو شگن کی لائی ہوئی چیزوں کو دِل سی سے دیکھتے دیکھا تو احمد شاہ نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُن کی بیٹی اب نارمل Behave رنے لگی تھی۔

''ولی بیٹا! نگینہ میں یہ مثبت روّیہ کتنا اچانک ہے نا۔'' احمد شاہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

''بالکل! ہے تو سہی! لیکن اِس کا پراپر علاج ہوا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ وہ علاج کیا ہوگا۔''

''وہ ہے دِل سے مارا ایک عدد تھپڑ!'' ولی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''ایک ڈاکٹر نے ایک عدد تھپڑ سے محترمہ کا علاج کیا ہے۔'' جواباً عبدالولی نے ساری بات کہہ سنائی۔

''اوہو؟'' احمد شاہ جانے کتنے عرصے بعد مسکرائے تھے۔

''ولی! میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہ رہا تھا۔ شہباز نے طارق کے لیے نگینہ کا رشتہ مانگا ہے میں اور روشن تو اِس رشتے سے مطمئن ہیں بس تمہاری اور نگینہ کی مرضی جاننا باقی رہ گئی۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟'' احمد شاہ نے ساری عمر اپنے بچوں کو اپنے فیصلوں میں شامل کر کے گزاری تھی، اب لیسے وہ اتنے بڑے فیصلے کو اکیلے کر ڈالتے۔

''بابا جان! یہ اتنا اچھا رشتہ ہے کہ اِس سے تو انکار ممکن ہی نہیں، آپ فوراً ہاں میں جواب دے دیں، اں نگینہ سے البتہ ضرور پوچھ لینا چاہیے۔'' ولی نے اپنی مرضی بتاتے ہوئے بہن کی مرضی کا بھی بھرپور لہال کیا۔

''کس بارے میں میری مرضی درکار ہے بھائی۔''

نگینہ ملازموں سے ساری چیزیں کمرے میں رکھوا کر واپس آئی تھی، وہ بے حد نارمل نظر آ رہی تھی اور ب کو حیران کر رہی تھی۔ طارق نے اُس کے گرد Unsecurity کا خول توڑ ڈالا تھا۔ وہ دوبارہ لڑوں پر اعتبار کرنا سیکھ رہی تھی، اس لیے اُس کا روّیہ بہت حد تک نارمل محسوس ہو رہا تھا۔

''میری بہن کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ ہونے جا رہا ہے اُس بارے میں اُس کی مرضی درکار ہے۔'' عبدالولی نے بالکل سہیلیوں کی طرح پوچھا۔ احمد شاہ عبدالولی کو روکنا چاہتے تھے کہ پوچھنے کا یہ کام اُیں زیادہ بہتر کر لیتی ہیں لیکن ولی کی Excitment دیکھ کر وہ چپ رہے۔

''مطلب بھائی؟'' نگینہ نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ طارق بھائی کا رشتہ میری بہن کے لیے آیا ہے۔'' ولی نے بغور بہن کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''طارق بھائی کا؟'' نگینہ نے سوال دہرایا۔

ولی کا دِل اپنا ماتھا پیٹنے کو چاہا۔ وہ طارق کے ساتھ ''بھائی'' کا لفظ استعمال کررہی تھی۔

''جی! اور آپ کی ہاں یا نا ہم سب کو درکار ہے۔''

''بھائی! میرا تو اغوا ہوگیا تھا نا! اور کتنی بدنامی ہوئی، میری اپنی دوستیں مجھ سے کالج میں بات نہیں کرتیں کہ میں گندی لڑکی ہوں تو پھر طارق بھائی کیوں؟'' نگینہ نے بے شک اپنا جملہ پورا نہ کیا تھا لیکن وہ اپنا مطلب سمجھا گئی تھی۔

''میری بہن پاکیزہ ہے، یہ ہم سب جانتے ہیں اور وہ خود بھی جانتا ہے تم آئندہ کبھی یہ بات کہنا، نہ سوچنا، اس بُری بات کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دو۔'' وہ بہن کو تسلی دے رہا تھا اور دِل احمد شاہ کا ... رہا تھا۔

''اب بولو نا کہ ہاں؟'' ولی نے ایک بار پھر سوال کیا۔

نگینہ نے سر جھکالیا۔

''جیسی سب کی مرضی!'' وہ کہہ کر رُکی نہیں، اُٹھ کر باہر بھاگ گئی۔

''مبارک ہو بابا جان!'' ولی نے مسکرا کر کہا۔ کتنے ہی دِنوں بعد وہ یوں مسکرایا تھا، ورنہ جس طرح اس کی آنکھیں بجھ کر رہ گئی تھیں، مسکراہٹ کی کوئی کرن اُس کے چہرے پر بالکل نہ آتی تھی۔

''آپ کو بھی مبارک ہو بیٹا!'' احمد شاہ نے مسکرا کر کہا۔

''یوں لگتا ہے کہ اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' احمد شاہ نے دعائیہ انداز میں کہا اور گہری سانس لی۔

''انشاء اللہ!'' عبدالولی نے بے اختیار کہا۔

واقعی اب خوشیاں اُن کے دروازے پر کھڑی دستک دینے کو تیار تھیں۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم بابا جی!'' ترنم کے ساتھ ایک مقامی لڑکی بھی تھی۔ ترنم نے بھی مقامی لباس پہنا ہوا تھا اور وہ پہچانی نہ جارہی تھی بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔ اُس کو بابا جی نے گاؤں کے ایک گھر جہاں اُن کی شاگرد اور شاگرد رہتے تھے میں پناہ دلوادی تھی، بابا جی نے کچھ مصلحتوں کی وجہ سے ترنم کو وہاں بھیجا تھا، آج ترنم کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔

''وعلیکم السلام! جیتی رہو، خوش رہو، آباد رہو، اللہ رحمان رحیم ہمیشہ تم لوگوں سے خوش رہیں۔'' بابا جی نے بے حد پیار سے ترنم کو دُعا دی۔

ترنم نے اُن کا سر پر رکھا ہاتھ بہت دیر تک اپنے سر پر رکھے رکھا، اُسے لگ رہا تھا، جیسے اُس کے دماغ سے اندر تک نور اور ٹھنڈک اُترتی جارہی ہے، مقامی لڑکی بابا جی سے اجازت لے کر جاچکی تھی۔

''بابا جی! ماں کا کچھ پتا نہیں چل رہا، اگر میں واپس جاتی ہوں اور ماں کو ڈھونڈتی ہوں تو میں پکڑی جاؤں گی۔'' ترنم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں اپنی موت سے نہیں ڈرتی، میں بے کار زندگی گزارنے کے بعد چاہتی ہوں کہ میری موت کم از کم کارآمد ہو، تا کہ اللہ کے ہاں کچھ آسانیاں پاسکوں۔'' ترنم نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

''اس لیے اپنی بے کار زندگی کی قیمتی موت کو سنبھالے، چھپائے پھرتی ہوں بابا جی!'' ترنم نے طویل سانس بھری۔

''میں چاہتی ہوں کہ اُس گروہ نے کتنی ہی لڑکیوں کی زندگی تباہ نہیں کی بلکہ بہت سارے گھروں کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ میں اُس گروہ کو ختم کرانا چاہتی ہوں تا کہ میرے جیسی لڑکیاں ترنم نہ بن سکیں۔'' ترنم کا لفظ لفظ سے دُکھوں کا لہو رِس رہا تھا۔ بابا جی نے ایک بار پھر ترنم کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا انشاء اللہ! اُس مولا نے سب ٹھیک کردینا ہے بس تو خود کو، اپنی زندگی کو، اپنی موت کو، سب کو اُس اللہ رحمان کے حوالے کردے۔ باقی وہ سب کچھ خود دیکھ لے گا۔'' بابا جی کی بات میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ترنم کی روح تک میں سکون اُتر آیا۔

''میں جس رستے پر نکل آئی ہوں وہاں تو اُس کی تھکن تک اپنی نہیں ہے!'' ترنم نے سوچا۔

''ٹھیک ہے بابا جی! میں خود کو اور سارے معاملات کو رب سوہنے کے حوالے کرتی ہوں، آپ بھی میرے لیے دعا کریں کہ اللہ میرے سارے معاملوں کو آسان کردے۔'' ترنم نے بے اختیار کہا۔

''آمین! اللہ تجھے قبول کرے۔'' بابا جی نے بہت اہم اور بڑی دُعا دی تھی اُسے۔

''میں چلتی ہوں بابا جی! مجھے بس اجازت دے دیں جب میرا جی زیادہ گھبرائے تو میں آپ کے پاس آجایا کروں؟'' ترنم نے جاتے جاتے بے حد معصومیت سے سوال کیا۔

''اے پیاری بیٹی! تیرے لیے اس بوڑھے باپ کے سارے دروازے ہمیشہ اور ہر وقت کھلے رہیں گے یہ تیرا گھر ہے جب مرضی آؤ اور رہو! تم کو گل بانو کے گھر اِس لیے پناہ دلوائی تھی کہ تم کو رہنے کی ساری سہولتیں ملیں، ورنہ یہاں اِس بوڑھے کے پاس تو مہمان نوازی کے لیے دُودھ اور دلیے کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے۔''

''ایسا نہ کہیں! یہاں تو میں نے دنیا کے سب سے لذیذ کھانے کھائے ہیں، جس کے آگے دنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے۔'' ترنم نے بے حد پیار سے کہا۔

''کتنے برسوں بعد رزقِ حلال کھایا ہے!'' ترنم نے بے حد دُکھی انداز میں کہا اور سر جھکا کر باہر نکل گئی۔

بابا جی نے اُس پر ایک گہری نگاہ ڈال کر بے اختیار آسمان کی طرف دیکھا۔

''بے شک تُو بہت مہربان ہے کسی کو وہ مقام ساری عمر عبادت کرنے پر دے دیتا ہے اور کسی کو اُس کی ایک اچھی نیت پر بھی مل جاتا ہے بے شک تو بہت مہربان ہے! کاش ہم سب اچھی نیت والے ہی ہو جاتے۔'' بابا جی نے بے اختیار کہا۔ لیکن زندگی کی کامیابی کا راز کہہ ڈالا تھا۔

❖❖○❖❖

''ہیلو! یہ آپ ہی ہیں نا ترنم؟'' طارق نے ترنم کی آواز سن کر پہچان لی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی طارق صاحب! میں ترنم بات کر رہی ہوں۔" اس نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ہم سے ساتھ کچھ وعدے کیے تھے ترنم۔" طارق نے اُس کو اُس کے Coopration کرنے پر یاد دلایا۔

"مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے طارق صاحب! لیکن میں نگینہ کو وہاں سے جب لے کر بھاگی تھی تو میڈم رانگی کے کارندے بھوکے کتوں کی طرح میرا پیچھا کر رہے تھے اب میں کچھ Safe جگہ پر ہوں میں آپ کو کچھ basic انفارمیشن دے رہی ہوں۔" ترنم نے طارق کو اُن افسروں کے نام دیے، جو پاکستان کے Futurictic پلانز رانگی کو بیچتے ہیں اور اُن فائلز کا بھی بتایا جو رانگی میڈم نے اپنی لڑکیوں کے ذریعے چوری کروائی تھیں یہ فائلز پاکستان کی Stretegic Asserts کے متعلق تھیں۔

جوں جوں ترنم بتاتی جا رہی تھی، طارق کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح پھوٹ رہے تھے۔

ترنم دوبارہ فون کرنے کا کہہ کر کب کا فون بند کر چکی تھی جب کہ طارق بے حد فکرمندی سے سر پکڑے بیٹھا تھا۔

"یا میرے اللہ! میں تو اِس گینگ جو Buttfies Kidnapers کہلاتے تھے اُن کو پکڑنا چاہ رہا تھا لیکن یہاں تو بات ہی اتنی خطرناک نکلی ہے، ہمارے ملک کے Stretegic Aseerts کا باہر دشمنوں تک پہنچانے کا مطلب! اُف! مجھے تو ہوم ورک مکمل کر کے فوراً ہائی کمان سے بات کرنی ہوگی۔" طارق نے فوراً فون کر کے اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا کہ وہ ایگلز اور ٹائیگرز کی ارجنٹ میٹنگ رکھے، یہ نام طارق کے دو گروپوں کے تھے، جو ٹائیگرز فارم کمانڈوز تھے اور ایگلز ہوم ورک کر کے لاتے تھے۔

طارق مسلسل بے چینی سے گھوم رہا تھا۔

اسے فوراً ہائی کمان سے بات کرنی تھی اُسے کوئی سینئر افسر بھی چاہیے تھا، جو ایسی پلاننگ کرواتا کہ طارق اپنی ٹیم کے ساتھ ہر رانگی کے گرد گھیرا تنگ کر کے اُسے پکڑ سکتا۔ لیکن جب تک وہ ہائی کمان سے بات کرتا، ان کو چیف آف پروجیکٹ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ طارق اِس وقت بہت پریشر میں تھا اور طارق ایسا انسان تھا جو پریشر میں ہمیشہ ہاتھی جتنی طاقت اور اس جتنا کام کرتا تھا اب دیکھنا تھا کہ اِس طاقت کا استعمال ٹھیک وقت پر کب ہونا تھا اور وہ ٹھیک وقت طارق کو بنا ہوم ورک کے نہیں مل سکتا تھا۔

"مجھے ترنم سے Detail میں ملاقات بھی کرنی ہوگی!" طارق نے پُرسوچ انداز میں خود سے کہا اور ایک بار پھر موبائل پر ترنم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

❖❖○❖❖

"مریم!! مریم کیا واقعی! کیا واقعی یہ سچ ہے؟" ڈاکٹر فیصل کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔

"جی بالکل سچ ہے!" مریم بی بی نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نفیسہ کو فوراً آسٹریلیا کے لیے تیار کرو، میں یہاں سے اُس کی اکاؤنٹ گارنٹی دے دوں گا"

ڈاکٹر فیصل نے بے تاب ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں فیصل! کیا اب بھی آپ کو پاکستان کی زمین میں وہ کشش محسوس نہیں ہوتی، جو آپ کو کھینچ کر

یہاں لا سکے؟ بس کریں اپنا یہ خود ساختہ بن باس!" مریم بی بی رو ہی تو پڑیں۔

"برسوں گزر گئے اپنے وطن، اپنی مٹی سے دُور رہ کر۔ اِس زمین سے بہت دور رہ لیے جس کے سینے میں ہمارے بہت سارے پیارے سو رہے ہیں۔ پلیز اب قسم توڑ دیں!" مریم بی بی سسک ہی تو پڑیں۔

بہت سارے پَل دوسری جانب خاموشی رہی، مریم بی بی کو یوں لگا جیسے شاید رابطہ کٹ گیا ہے۔

"ہیلو! ہیلو فیصل!!" مریم بی بی نے بے اختیار پکارا۔

"آں۔ ہاں۔ مریم!!"

"آئی ایم آن دی لائن!" ڈاکٹر فیصل کی روئی روئی آواز ماؤتھ پیس سے اُبھری۔

"میں پاکستان آ رہا ہوں۔" ڈاکٹر فیصل کے الفاظ جیسے مریم بی بی کے جلتے دِل پر پھوار کی طرح برسے۔

وہ بِنا کچھ کہے مسلسل ایسے سر ہلا رہی تھیں، جیسے وہ فون پر نہیں ڈاکٹر فیصل کے سامنے بیٹھی ہوں، دوسری جانب فون بند ہو چکا تھا اور مریم بی بی مسلسل فون تھامے روئے جا رہی تھیں۔ عبداللہ نے گھبرا کر ماں کا کندھا تھاما۔

"کیا ہوا امی! خیریت تو ہے؟ پاپا تو ٹھیک تھے نا؟" عبداللہ نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"آں۔ ہاں! وہ ٹھیک ہیں اور باقی جو ٹھیک نہیں تھا وہ بھی ٹھیک ہونے والا ہے۔" مریم بی بی نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب؟" عبداللہ کچھ سمجھ نہ پایا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے پاپا پاکستان آ رہے ہیں۔" مریم بی بی نے بھیگے بھیگے لہجے میں کہا۔

"ریئلی؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں! سچ!"

"تو پھر ہم ضرور نانا، نانی کے گاؤں بھی جائیں گے سدرہ خالہ کی قبر پر بھی جائیں گے۔" عبداللہ نے اگلا پلان بنایا۔ جواباً مریم بی بی کھو گئیں، اُن کی آنکھوں کے سامنے زندگی سے بھرپور ایک چہرہ مسکرایا۔

"وہ مجھ سے، ڈاکٹر باؤ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ دُنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے مجھے نہیں بھول سکتا۔ وہ میرے اندر روح کی طرح رہتا ہے! روحوں سے جڑے ناتے بھی بھلا کبھی ٹوٹتے ہیں؟" سدرہ آپی کی برسوں پہلے کہی بات اُن کے کانوں میں گونجی۔

"ہاں عبداللہ! سدرہ آپی کا قرض، بہت ساری دعائیں جو ہمیں اُن کی قبر پر کرنی تھیں وہ باقی ہے۔ ہم وہاں ضرور جائیں گے۔" مریم بی بی نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا۔

❖❖○❖❖

روشن ولا آج صحیح معنوں میں روشنی سے دمک رہا تھا۔

روشن ولا کے پھل دار لان کو ولی کے دوست یاسر جو سیٹ ڈیزائنر تھا، اُس نے بہت Facinate کر کے سجایا تھا اور یہ تحفہ اُس کی جانب سے تھا کیوں کہ Decoration کا سامان وہ خود لے کر آیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج ولی کی مہندی اور نگینہ کے نکاح کی رسم ساتھ ساتھ تھی لیکن اس قدر سج دھج کے باوجود دونوں دلہا بجھے بجھے تھے ایک اپنی اعصابی جنگ سے لڑتے لڑتے بے حال ہو چکا تھا اور دوسرا ذہنی طور پر اپنے پروجیکٹ کی جانب انگیجڈ تھا۔ ولی کے سارے دوستوں نے مل کر خوب ہنگڑا ڈالا، لڑکیوں نے خوب ڈھولکی بجائی، ٹپوں اور گانوں کا خوب تبادلہ ہوا۔

روشن آرا بیگم اور احمد شاہ نے کسی کو نہ روکا، لڑکے لڑکیاں ہلّہ گلّہ کر رہے تھے لیکن وہ تو مسلسل اپنے بیٹے کی جانب دیکھ رہے تھے جو بہت مشکل سے مسکرا رہا تھا۔

اُن کا خیال تھا کہ ولی شاید اپنے دوستوں کی شوخیوں شرارتوں سے ہی بہل جائے وہ جس طرح اس شادی کے لیے تیار ہوا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

نگینہ کے لیے نیلوفر بیگم بلیو کنٹراسٹ کے ساتھ بلیو کلر کا شرارہ سوٹ لائی تھیں۔ ییلو نیٹ کے دوپٹے پر چھ چھ انچ کی چوڑی پٹی جو بلیو کلر کی تھی اُس پر گولڈن ییلو، بلیو اور کہیں کہیں میچنڈ اکلر کے زرقون اور بیڈز کے ساتھ کام تھا۔

سائرہ نے یہ سوٹ خاص طور پر اپنی ایک فیشن ڈیزائنر دوست سے ڈیزائن کروایا تھا، پوری دو راتیں لگا کر دونوں نے مختلف Ideas کو مکس کر کے یہ سوٹ ڈیزائن کیا تھا اور بے حد خوب صورت تھا کڑھائی وغیرہ بھی کالج کے کاریگروں نے کی تھی، اِس لیے یہ سوٹ اتنا خوب صورت اور یونیک تھا، جس نے دیکھا تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا نگینہ کو تیار کرنے کے لیے بیوٹیشن گھر آئی تھی لیکن نگینہ نے اپنا رو رو کر حال بُرا کیا ہوا تھا اِس لیے بے چاری بیوٹیشن انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''آج تو تمہاری رخصتی نہیں ہے پھر بھلا کیوں رو رہی ہو؟'' بیوٹیشن پوچھے بنا رہ نہ سکی۔

''لیکن میرے جانے کا سلسلہ تو آج سے شروع ہو جائے گا، میں امّاں بابا کو چھوڑ کر کیسے جاؤں گی پھر بھیا! کیا یہ سب لوگ میرے ساتھ نہیں جاسکتے۔'' نگینہ نے معصومیت سے پوچھا۔

بیوٹیشن نگینہ کی بات سن کر مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

''کیا اِس دور میں بھی اتنی سادہ اور معصوم لڑکیاں ہو سکتی ہیں؟'' بیوٹیشن سوچ رہی تھی۔

اُسی پل روشن آرا بیگم کچھ گھبرائی سی اندر آئیں۔

''آپ پلیز دومنٹ کے لیے باہر تشریف رکھیں میں آپ کو بعد میں بلاتی ہوں۔'' جس طرح انہوں نے بیوٹیشن کو باہر بھیجا تھا اُس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنا چاہتی تھیں۔

''نگینہ بیٹا! مجھے تم سے ایک بہت اہم بات کرنی تھی۔''

''جی امّاں جان کہیے۔''

''بیٹا تم جانتی ہونا کہ طارق کی نوکری کس نوعیت کی ہے۔''

''جی ہاں!!'' نگینہ نے ماں کا چہرہ بغور دیکھا کہ آخر وہ کیا کہنے جا رہی تھیں۔

''بیٹا! آج طارق کو اچانک محکمے کی جانب سے کال آئی تھی اُسے فوراً نکلنا پڑا، اب وہ نہیں آسکتا اِس لیے مجبوراً تم دونوں کے نکاح کا دِن پرسوں مقرر ہوا ہے۔ بیٹا طارق کی زندگی میں یہ سب کچھ مسلسل چلتا رہے گا اگر تم کو اس کی کسی بات پر اعتراض ہے تو فوراً بتادو، ابھی تو وقت ہے نا!'' روشن آرا بیگم نے اُس

ھرائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''نہیں امّاں جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' نگینہ نے سر جھکا کر کہا۔

''پھر آپ ہی تو سمجھاتی ہیں کہ موت تو ہوا میں بھی آنی ہے، زمین پر بھی آتی ہے تو پھر اِس سے ڈرنا ا۔'' نگینہ نے بے حد سمجھ داری سے کہا۔

''مجھے آپ کے کسی فیصلے پر اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے آپ فکر مند نہ ہوں۔'' نگینہ نے ا ہاتھ تھام کر کہا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابھی یہ لڑکی بچوں کی طرح رو رہی تھی اور ابھی کتنی سمجھ اتیں کر رہی تھی۔

''میری پیاری بیٹی سدا خوش رہو!'' روشن آرا بیگم نے آگے بڑھ کر نگینہ کا ماتھا چوما اور ہلکی پھلکی ہو کر ل گئیں اُن کا دماغ بہن کی جانب بھی اٹکا ہوا تھا ابھی تک اُن کے گھر سے کوئی نہ پہنچا تھا۔ اُن کے و دماغ میں یہ کشمکش بھی تھی کہ اگر علیزے آجاتی ہے تو اُن کے بیٹے کی ذہنی حالت کیا ہوگی؟ کیا وہ ا بے ہیو کرے گا؟

ہت سارے سوال اُن کے گرد کھڑے شور مچا رہے تھے لیکن فی الحال اُن کے پاس کسی ایک کا بھی ب نہ تھا۔

❖❖○❖❖

''آپ میرا فون کیوں نہیں اٹھاتے؟'' سحرش نے طارق سے لڑتے ہوئے پوچھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے میں مصروف تھا۔'' طارق نے گاڑی پہلے آہستہ کی اور پھر بند کر کے فون لگا، گزشتہ کچھ عرصے سے سحرش کی گفتگو کسی امتحان سے کم نہ ہوتی تھی اور اِس اعصابی پریشانی میں از کم اُس سے گاڑی چلانا مشکل ہو جاتا تھا۔

''آپ کہاں مصروف تھے؟''

''میں نے بتایا نا کہ کام میں مصروف تھا۔''

''نہیں! آپ اُس لڑکی کے ساتھ تھے۔'' سحرش نے سنگی انداز میں کہا۔

''بے فکر رہو، بنا شادی کے میں اُس کے ساتھ وقت صرف نہیں کر سکتا اور تمہیں تو اِس بات پر خوش ہونا یے کہ میرے پاس تو سرے سے وقت ہوتا ہی نہیں، تو میں کتنا وقت اس کو دے پاؤں گا۔'' طارق نے ڈی آہ بھری۔

وہ عجیب سی کیفیت میں تھا اگر نگینہ کو سحرش کے متعلق پتا چلتا تو شاید وہ کبھی اُس کی زندگی میں نہ آتی۔ ن اُس سے چھپا کر اُسے بے ایمانی کا احساس ہو رہا تھا۔

''آپ اُس لڑکی کو چھوڑ نہیں سکتے؟'' سحرش نے غصّے سے پوچھا۔

''نہیں سحرش! میں اِس معاملے میں مجبور ہوں۔'' طارق نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

''پلیز طارق!'' سحرش نے اس بار کچھ نرمی سے کہا۔

''تم طارق سے اُس کی جان مانگ لو، لیکن نگینہ سے دوری کا امتحان نہ مانگنا۔'' طارق نے بے حد نرمی ے درخواست کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سحرش کو نگینہ سے بے حد حسد ہوتا تھا لیکن آج پہلی بار اُسے نگینہ پر رشک آ رہا تھا۔
"میں آپ سے صرف ایک ہی تو چیز مانگ رہی ہوں، وہ ہے آپ کا اپنا آپ پورا، کیوں کہ میں آپ کو کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔" سحرش نے ایک بار پھر جنونی ہو کر کہا
"سحرش! یہ بحث لاحاصل ہے بہرحال تمہاری اطلاع کے لیے میں اپنے گھر والوں کی رضامندی سے نگینہ سے بہت جلد نکاح کرنے والا ہوں، تم بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔" طارق نے بے حد صاف لہجے میں کہا اور ساتھ ہی فون بند کر دیا۔
"دیکھتی ہوں کیسے تمہارا نکاح ہوتا ہے!" سحرش نے پاؤں پٹخے۔

❖❖○❖❖

"السلام علیکم کون؟" نگینہ نے فون پر آ کر کہا۔ یہاں ذرا شور کم بھی تھا ورنہ سارے گھر میں مہمان تھے شادی کا گھر ہونے کی وجہ سے چہل پہل مختلف تھی۔
"میں طارق بات کر رہا ہوں۔" طارق نے نگینہ کو حیران کیا۔
"ارے! آپ تو کسی کام سے گئے تھے نا؟"
"ہاں بس! کچھ دیر میں یہیں سے چلا جاؤں گا گھر سے تو میں اپنے کام سے ہی نکلا تھا لیکن مجھے یاد آیا کہ ایک اور کام بہت اہم ہے، پہلے اُس کو نمٹایا جائے ورنہ شاید مجھ سے کوئی کام نہ ہوگا۔" طارق کے لفظوں میں نگینہ کے لیے الجھن موجود تھی۔
"آپ کہاں ہیں؟" نگینہ نے بے اختیار پوچھا۔
"میں اوپر بالکونی میں ہوں ولی کے اسٹوڈیو کی بالکونی میں، مجھے ولی نے ہی چابی دی ہے یہاں بیٹھ کر تم سے بات کرنے کے لیے۔"
ولی بے شک طارق سے بہت محبت کرتا تھا، بھروسہ کرتا تھا اسی لیے بنا پوچھے چابیاں اُس کے حوالے کر دی تھیں۔
"میں آتی ہوں!" نگینہ نے فون رکھا، اُس کے مہندی لگے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔
"ایسی کون سی بات ہے جو طارق مجھ سے کرنا چاہتے ہیں۔" نگینہ نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچا۔
نگینہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی یہ تیسری منزل پر موجود بڑا سا اسٹوڈیو تھا، جہاں ولی نے باہر سے کیمرے منگوائے تھے، جو رات اور دن کی لائٹ کے لیے خاص طرح کے Creative Effects دیتے تھے۔
عبدالولی پاکستان میں نہ تھا لیکن پھر بھی روشن آرا بیگم اُس کے اسٹوڈیو کا بہت خیال کرتی تھیں۔
"طارق بھا!" نگینہ نے باقی کا لفظ منہ میں ہی کھا لیا تھا وہ اتنا عرصہ اُسے بھائی کہتی آئی تھی کہ اب بھی اُس کے منہ سے لفظ "بھائی" اکثر بے اختیار نکل جاتا تھا۔
"نگینہ! ادھر ہی آ جاؤ۔"
بالکونی کی چھت پر ملٹی کلرز کے زیرو پاور کے بلب لگے ہوئے تھے، جب وہ اکٹھے جلتے تو بہت ہی پیاری اور خوب صورت روشنی پیدا ہو جاتی تھی۔

"جی کہیے!!" اُن کے بیچ جب بہت ساری خاموشی گزری تو نگینہ نے ہی گھبرا کر پوچھا۔
"نگینہ! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں! اپنی زندگی کا ایک ایسا سچ، جو میری خواہش نہ ہونے کے باوجود ے وجود کا حصہ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم کو کوئی اور کسی غلط طریقے سے بتائے۔" طارق نے اپنا گلا نکارتے ہوئے کہا۔
"ایسی کون سی اہم بات تھی جو وہ بتانے چلا آیا، اُس کے پاس اپنی نکاح کی اہم تقریب کے لیے ت نہ تھا یقیناً یہ بات سب سے بڑھ کر اور اہم تھی۔" اس نے سوچا۔
"تم میرے پاس آؤ!" طارق نے نگینہ کا ہاتھ تھام کر اُس کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔
نگینہ کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ اُس کے قریب کھڑی ہو گئی۔
"کہتے ہیں ہم جب سچ بولنا چاہتے ہیں تو ہمیں حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نگینہ میرا ہاتھ تھام لو کہ مجھ میں وہ حوصلہ پیدا ہو جائے جو تمہارے سامنے میں سچ بول سکوں۔" طارق کی بات پر نگینہ نے بے اختیار اُس کا ہاتھ تھاما۔ طارق نے بے حد مشکور نظروں سے اُسے دیکھا۔ یقیناً اُس کی چوائس بے حد ہی اور کروڑوں میں ایک تھی تب ہی تو نگینہ نے بنا کچھ پوچھے اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا اُسے وہ حوصلہ دیا جو وہ چاہتا تھا۔

❖❖○❖❖

"یہ زبیر فون کیوں نہیں اٹھا رہا؟" سید سرفراز علی نے غصے سے فون دیوار پر پٹخ دیا۔ نتیجتاً فون ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔
"غلام نبی!!" انہوں نے دروازے کی جانب منہ کر کے آواز لگائی۔
"جی سائیں۔" غلام نبی اُن کے لہجے کی گرج سن کر سہما سہما اندر آیا۔
"زبیر کو رقم تم دینے گئے تھے نا؟" انہوں نے سوال کیا تھا۔
"جی سائیں۔" اُس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔
"کیا کہا تھا اُس نے؟" سید سرفراز علی نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔
"جی!! جی بتایا تھا۔" غلام نبی نے سر جھکا کر کہا، جیسے اس سارے معاملے میں اُس کا اپنا قصور ہو۔
"وہ کہہ رہے تھے کہ!!" غلام نبی ہچکچا گیا۔
"بولو۔" سید سرفراز علی نے حکم دیا۔
"جی وہ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنا منحوس سایہ اپنی بہن کی خوشیوں پر نہیں ڈالنا چاہتے۔" غلام نبی نے من وعن سارے الفاظ دہرا دیے۔
"کیا بکواس ہے!!" سید سرفراز علی کو بہت غصہ آیا۔ وہی تو اُن کا اکلوتا وارث تھا وہ کیسے اِس جاگیر اِس سسٹم سے بددل ہو سکتا تھا۔ سید سرفراز کو کبھی بھی اپنا کوئی بچہ اتنا عزیز نہ تھا جتنا کہ اس حکمرانی کے سسٹم کی فکر رہتی تھی۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ گدی نشین اس سسٹم کی اہمیت اور اس کے نشے کو محسوس کرتا ہو، لیکن زبیر کا بیزار رویہ اُن کے لیے ایک نیا چیلنج پیدا کر رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُن کو اپنی زندگی اور موت دونوں سے زیادہ اس سسٹم کا نشہ اور اُس کی لذت عزیز تھی۔

"غلام نبی! سید زبیر علی کو فوراً حویلی لے کر آؤ اگر وہ اپنی مرضی سے نہ آئیں تو ہماری مرضی سے اُن کو یہاں لے آنا۔" سید سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"جی سائیں!" خادم خاص نے فوراً تابع داری سے کہا اور باہر نکل گیا۔

❖❖○❖❖

"یہ کیا بات ہوئی، میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گا۔" عبدالولی نے طارق سے ناراضی سے کہا۔

"یار سمجھا کرو نا!" طارق نے بے بسی سے کہا۔

"میں بہت مشکل کام میں پھنسا ہوا ہوں!"

"میرے تو اپنے نکاح کے لیے یہ لوگ بامشکل کل چھٹی دیں گے۔" طارق کو واقعی ولی کی شادی پر نہ پہنچنے کا بے حد دکھ تھا۔

"یار یہ تو بتاؤ اتنی دور بارات لے جانا مشکل تو ہوگا نا؟"

"تم نے لگتا ہے کارڈ غور سے نہیں پڑھا۔ بارات ہم لوگ یہاں ہی ایک ہال میں لے کر جائیں گے سید سرفراز علی نے ہماری ہر بات کو مانا ہے وہ لوگ خود یہاں دوپہر تک پہنچ جائیں گے اور رات کو ہم لوگ بھی وہاں ہال میں پہنچ جائیں۔"

"چھوڑو یار! اُس شخص نے سب سے بڑی بات منوالی، اب اگر وہ کچھ مانتا بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" طارق نے نروٹھے پن سے کہا۔

عبدالولی کا چہرہ ایک دم سے تاریک ہوگیا۔

"اچھا یار! پھر ملاقات ہوتی ہے۔"

"اِن شاء اللہ جلدی!" طارق نے جواباً کہا۔ فون بند ہو چکا تھا اور ولی گم سم ہوگیا تھا۔

جو خیال تھے نہ قیاس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
جو محبتوں کی اساس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
جنہیں مانتا ہی نہیں یہ دل
وہی لوگ میرے ہیں ہم سفر
مجھے ہر طرح سے جو راس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
مجھے لمحہ بھر کی رفاقتوں کے سراب اور ستائیں گے
میری عمر بھر کی جو پیاس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

یہ خیال سارے ہیں عارضی
یہ گلاب سارے ہیں کاغذی
گلِ آرزو کی جو باس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
جنہیں کرسکا نہ قبول میں
وہ شریکِ راہ سفر ہوئے
جو مری طلب، مری آس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
مری دھڑکنوں کے قریب تھے
مری چاہ تھے، مرا خواب تھے
وہ جو روز و شب میرے پاس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

"ولی!!" ولی کو کسی نے آواز دی تھی وہ اپنے خیالات کی دنیا سے ایک دم چونک کر نکلا، سامنے احمد شاہ کھڑے تھے۔

"بیٹا! دیکھو کون آیا ہے۔" احمد شاہ نے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ بابا جی نگینہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے چلے آرہے تھے۔

"بابا صاحب!!" ولی کی بجھی بجھی آنکھوں اور بجھے چہرے پر رونق آگئی۔ وہ ایک دم اُن کی جانب بڑھا احمد شاہ بھی مسکراتے ہوئے اُس کے پیچھے لپکے۔

"بابا صاحب! آپ یہاں؟" ولی نے حیرت اور خوشی سے اُن کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔

"میرے پیارے بیٹے کا بہت بڑا دن تھا مجھے تو آنا ہی تھا۔" انہوں نے بظاہر ہشاش بشاش انداز میں کہا لیکن اُن کی آواز کی نقاہت بھی واضح تھی۔ وہ جو اپنے مقام سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے لیکن آج وہ ولی کی وجہ سے اتنا لمبا سفر طے کر کے آئے تھے۔

"بڑا دن!!" وہ بے اختیار ہنسا۔ بابا صاحب کے ساتھ سب نے اُس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کیے۔

"کیوں بڑا دن نہیں ہے بیٹا؟" احمد شاہ نے پوچھا۔

"آپ! آپ اندر چلیں نا، آرام سے بیٹھیں گے تو بات بھی کریں گے۔" ولی نے بابا صاحب کو مخاطب کیا۔

وہ اپنے اندر کے جوڑ توڑ سے اِس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ سامنے والوں کے بہت سے سوالات کو اگنور کررہا تھا۔

"آپ آگئے ہیں تو مجھے سکون مل گیا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔" احمد شاہ بابا جی کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے تو روشن وِلا کی روشنیوں میں بابا صاحب کے بابرکت وجود کی وجہ سے مزید اضافہ ہوگیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ لوگ واقعی خوشی، خیر اور روشنی جیسے ہوتے ہیں جو انسانوں کی زندگیوں کے اندھیرے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے آتے ہیں بابا صاحب بھی ایسے ہی لوگوں میں شمار ہوتے تھے یہی وجہ تھی عبدالولی کے دِل میں خوشی اور سکون تو اُترا ہی تھا احمد شاہ کو بھی پہلی بار اتنے عرصے میں محسوس ہوا تھا وہ جو کچھ عرصے سے خلا میں محوِ سفر ہیں اُن کے پاؤں بھی زمین پر لگنے والے ہیں۔

❖❖○❖❖

روشن آرا بیگم نے بہت ساری دیگیں پکوا کر یتیم خانے بھجوادی تھیں اور ایک دارالامان کی بچیوں کو کپڑے بھجوائے تھے وہ اپنا ہر کام شروع کرنے سے پہلے صدقے پر بہت Belive کرتی تھیں یہی وجہ تھی کہ اللہ رحمٰن کی ذات اُن کے رزق اور خوشیوں میں ہمیشہ دوگنا اضافہ کردیتی تھی۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ! میرا بیٹا اس شیروانی سوٹ میں تو کسی ملک کا شہزادہ لگ رہا ہے۔'' روشن آرا بیگم عبدالولی کو مجبور کرتی رہیں کہ اپنے دوستوں کا کہا مان لو اور پارلر چلے جاؤ، لیکن ولی کو مصنوعی زندگی کے رنگ بالکل پسند نہ تھے اس لیے اُس نے گھر رہ کر ہی تیار ہونا پسند کیا اور جب وہ تیار ہوکر باہر نکلا ہر کسی کی نگاہ جیسے اُس پر جم کر رہ گئی۔

اُس کی خوب صورتی اور مردانہ وجاہت تو اُس کے عام سے عام کپڑے کو خاص بنادیتی تھی۔ لیکن آج کے اسپیشل ڈریس نے اُس کی Special Personality کو بھی چار چاند لگادیے تھے۔

''بھائی! امّاں جان سچ کہہ رہی ہیں کہ آپ تو سچ میں شہزادے لگ رہے ہیں۔'' نگینہ نے بھی بہت پیار سے بھائی کو دیکھا۔

''نظر تو پیار کی بھی لگ جاتی ہے، کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے میرے بیٹے کو!'' روشن آرا بیگم نے آگے بڑھ کر عبدالولی کے گرد آیت الکرسی پڑھ کر حصار کھینچا۔

عبدالولی نے اُن کو کندھوں سے تھام کر بے حد پیار سے دیکھا۔

''آپ بہت پیاری ماں ہیں!'' عبدالولی نے بے اختیار ہوکر ماں کو کہا۔

کس قدر پرفیکٹ منظر تھا ماں، ممتا اور اُس کے بچے! احمد شاہ، جو دروازے میں کھڑے تھے گہری سانس بھر کر رہ گئے۔

بابا صاحب نے اُن کو بھیجا تھا کہ وہ سب کو بلا لائیں اور جو قرض اُن پر ہے عبدالولی اور نگینہ کی پہچان کا وہ اُسے اُتار سکیں۔

''روشن! بچوں کو لے کر باباجی کے کمرے میں چلو!'' احمد شاہ خود کو کم زور نہ کرنا چاہتے تھے اب شاید وہ خود بھی اندر سے چاہتے تھے کہ یہ پُل صراط عبور ہو ہی جائے۔

جب وہ باباجی کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ جانماز پر بیٹھے تسبیح کررہے تھے ذکر الٰہی اُن کو اپنی روح کی غذا محسوس ہوتا تھا، اسی لیے وہ ہر وقت اپنی غذا کا انتظام کرتے رہتے تھے۔

''آؤ بچو!'' باباجی نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نگینہ تو لاڈ سے بالکل اُن کے قریب بیٹھ گئی۔

''قرآن پاک میں بار بار ذکر آیا ہے کہ جو امانت آپ کے پاس ہو، اُسے اُسی طرح لوٹادو!'' سب اُن کی جانب متوجہ تھے احمد شاہ بالکل خاموش تھے جب کہ روشن آرا بیگم اُن کی تمہید سے ہراساں سی ہوگئی تھیں۔

''عبدالولی اور نگینہ بیٹا! مجھے بتاؤ گے کہ تم لوگوں نے احمد شاہ اور روشن بٹی کو کیسے والدین پایا؟'' باباجی نے شاید روشن آرا بیگم کے چہرے پر موجود خوف کو آسانی پڑھ لیا تھا اسی لیے اُنھوں نے اپنی تمہید کا ٹریک چینج کرلیا۔

''بے شک ہمارے والدین دنیا کے سب سے بہترین والدین ہیں۔'' عبدالولی نے ایک لمحے کی دیر کے بغیر کہہ ڈالا۔

''بالکل! امّاں جان اور بابا دی بیسٹ ہیں!'' نگینہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''لو روشن بٹی! اتنی مضبوط گواہیاں ہیں، میرا خیال ہے کہ تم اپنا ڈر ختم کردو تاکہ ہم با آسانی بچوں کو بتاسکیں کہ!'' باباجی نے آدھی بات چھوڑ کر اُن کو دیکھا۔

''جی اچھا!'' روشن آرا بیگم نے بامشکل خود کو سنبھالا۔

''عبدالولی اور نگینہ بیٹا! آپ دونوں احمد شاہ اور روشن بٹی کے آنکھوں کے تارے ہو اور اِس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی سچائی یہ بھی ہے کہ آپ اِن کی سگی اولاد نہیں ہو!'' باباجی کی بات پر نگینہ ایک دم ڈر کر روشن آرا بیگم کے ساتھ آ لگی، جیسے اُس سے اُن کو کوئی چھین لے گا جب کہ عبدالولی کے چہرے پر کسی قسم کی کوئی حیرت نہ تھی جیسے وہ بہت پہلے سے یہ بات جانتا ہو، جیسے وہ دھند کے پار موجود منظر کو پہلے سے دیکھ چکا ہو۔

''آپ لوگ! آپ دونوں کی جنم بھومی وہی ہے، جہاں میں رہتا ہوں اُس کے قریبی گاؤں میں۔ وادی سون سکیسر سے نیچے اُترائی ہر دس گاؤں اور اونچائی میں موجود پانچ گاؤں جو آپ کی والدہ کی میراث تھی وہ سب آپ کی ملکیت ہے۔ احمد شاہ کے پاس آپ کے والدین کی زمینوں کے کاغذات اور اُن کے نکاح نامے، آپ کی پیدائش کے سرٹیفکیٹ سب موجود ہیں ان کاغذات کے ذریعے آپ اپنی زمینوں کی ملکیت پر دعویٰ کرسکتے ہیں۔''

باباجی یہ کیا بتا رہے تھے عبدالولی اور نگینہ دونوں کو رتی بھر بھی زمینوں اور دولت کی خواہش نہ تھی اُن کو تو بس اپنے والدین چاہئیں تھے۔

''آپ کے والد سید عبداللہ بہت نیک اور پیارے انسان تھے آپ کی والدہ کا نام عائشہ بی بی تھا۔ آپ کی دو پھوپھیاں تھیں۔ دادی تھیں، پھوپو کا نام مریم بی بی اور سدرہ بی بی تھا، جب کہ دادی حضور کا نام زلیخا بی بی تھا اور دادا کا نام سید نوازش علی تھا۔ آپ کا نصیب بہت اچھا تھا۔'' باباجی کچھ پل کو سانس لینے کو رُکے۔

''ایک حادثے میں آپ کے والدین اور اہل خانہ انتقال کرگئے تو احمد شاہ بیٹے نے آپ کو خاندانی دشمنی سے بچانے کے لیے اپنالیا تھا اور اپنی اولاد جان کر پالا، یہ دونوں آپ کے ہمیشہ والدین رہیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کو جنم دینے والے کوئی اور تھے اور بے حد اچھے نیک انسان تھے، آپ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھے اعمال اور دُعاؤں کے پورے پورے حصے دار بھی ہیں اُن کا حق ہے کہ اُن کی اولاد کا صدقۂ جاریہ اُن کو بھی جائے۔'' باباجی کہہ رہے تھے اور عبدالولی اور نگینہ گم سم اُن کی باتیں سن رہے تھے۔

''آپ کے ایک سوتیلے چچا ہیں آج کل ساری زمینیں وغیرہ اُن کی ہی تحویل میں ہیں۔'' باباجی کہتے کہتے تھک گئے تھے۔

''بابا، امّاں جان! میں ساری عمر آپ لوگوں کی پوجا کرتا آیا ہوں لیکن آج لگتا ہے وہ بھی کم تھی. آپ نے بے شک بہت بڑا احسان کیا ہم پر۔'' عبدالولی نے دونوں کے سینے سے لگ کر کہا۔ احمد شاہ کا چہرہ پرسکون ہوگیا اور روشن آرا بیگم اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کررہی تھیں کہ اللہ نے اتنی بڑی بات جس کو وہ سوچ سوچ کر گھبراتی رہتی تھیں کس قدر آسانی سے اُن کے بچوں تک پہنچادی تھی اور اِس کو پہنچانے کے لیے اس قدر بابرکت انسان کو بھیجا تھا، جس نے اِس ساری بات کی ہسٹری میں سے ہر طرح کی پریشانی، بے چینی اور بے اعتباری چُن لی تھی۔

نگینہ نے ماں کا مضبوطی سے ہاتھ تھام رکھا تھا وہ عبدالولی کی طرح بہت زیادہ Expressive نہ تھی لیکن اُس کا ایک ایک ایکشن بتارہا تھا کہ وہ کس قدر زیادہ احمد شاہ اور روشن آرا کو چاہتی ہے۔

''نہیں بیٹا! احسان کا لفظ استعمال کرکے ہمیں پرایا نہ کرو، تم کیا جانو جب تم دونوں ہمیں بابا امّاں کہہ کر پکارتے تھے تو کیسا بڑا احسان ہمارے دِلوں اور زندگیوں پر کرتے تھے۔ وہ اندھیرے جن میں کھوکر میں اپنے اللہ سے روٹھنے لگی تھی تم دونوں نے آکر وہ اندھیرے روشنی میں بدل دیے، میں نے تو تم دونوں کو پاکر اپنے خُدا کو اپنے یقین کو دوبارہ پایا ہے!'' روشن آرا بیگم نے بھیگی بھیگی پلکوں سے کہا۔

''بابا صاحب! ہمارے والدین کو کیا حادثہ پیش آیا تھا؟'' عبدالولی نے ایک دم ہی وہ سوال کردیا جس کے جواب سے باباجی خود بھی بچنا چاہ رہے تھے کیوں کہ یہ وہ سوال تھا، جو عبدالولی کو بدلے اور غصّے کی آگ میں دھکیل سکتا تھا۔ لیکن سچ کب تک چھپ سکتا تھا بالآخر ایک نہ ایک دِن تو سچ کو سامنے آنا ہی تھا اور اُس کا سب کو سامنا کرنا ہی تھا۔

''اُن کی حویلی کو آگ لگ گئی تھی اور سب افرادِ خانہ اُسی حادثے میں جل کر ختم ہوگئے تھے۔''

''اوہ! تو وہ خواب، خواب نہ تھے حقیقت تھے وہ چہرے اجنبی نہ تھے وہ تو اپنوں کے چہرے تھے۔'' عبدالولی کے دِل میں ہوک سی اٹھی۔

بچپن سے وہ جو خواب دیکھتا تھا اُن میں کچھ چہرے درد اور تکلیف میں دیکھتا تھا تب وہ اُن کی تکلیف کو محسوس نہ کرسکتا تھا لیکن آج وہ یہ تکلیف اپنے دل پر محسوس کررہا تھا۔

وہ تکلیف جن سے اُس کے اپنے گزرے تھے!

عبدالولی کے دل پر بہت عرصے سے ایک اَن جانا خوف اور دُکھ موجود تھا، آج اُس کو بھی شناخت مل گئی تھی۔

''اس حادثے میں کوئی نہ بچا تھا۔'' باباجی نے بے حد دُکھ سے کہا۔

''نہیں باباجی! اِس حادثے میں، میں اور نگینہ بچے تھے، میری پھوپو مریم بی بی زندہ ہیں!'' ساری کڑیاں کھلنے پر عبدالولی کے لیے اس حقیقت سے پردہ اٹھانا آسان ہوگیا تھا کہ وہ عورت، جو دیوانوں کی

طرح اُس کے پیچھے پاکستان تک چلی آئی تھی وہ اُس کی سگی پھوپھی اور عبداللہ!!

عبداللہ جس کے وجود سے اُسے کتنی اپنی اپنی خوشبو محسوس ہوتی تھی وہ اُس کا پھوپوزاد بھائی تھا۔

''پیارے بیٹے! اُمید ہے نئے رشتوں کے ساتھ آپ پرانے رشتوں کو بھی لے کر چلیں گے۔'' باباجی نے عبدالولی سے کہا۔

''رشتے جتنے پرانے ہوجاتے ہیں اتنے ہی مضبوط بھی ہوجاتے ہیں پھر میں اپنے جنم دینے والے کو تو بھول سکتا ہوں، لیکن میری زندگی کو زندگی کا مطلب دینے والوں کو کیسے بھول سکتا ہوں؟'' عبدالولی نے بے اختیار کہا۔

آج اُس کی زندگی کچھ نئے رشتے لینے جارہی تھی اور اب اُسے کچھ پرانے کھوئے رشتے بھی مل گئے تھے۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ ہر رشتہ چاہے وہ نیا ہو یا پھر پرانا! ذمے داری مانگتا ہے، قربانی مانگتا ہے ایک رشتے کو پانے کے لیے اُس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی دے ڈالی تھی اور اب جو بن مانگے رشتے ملے ہیں تو وہ بھی تو اُس سے خراج مانگیں گے۔

''بی بی جی! باہر چھوٹی بٹیا کے سسرال والے آئے ہیں!'' اُسی پل ملازمہ نے آکر اطلاع دی۔

''کون! شہباز بھائی اور نیلوفر؟'' روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' ملازمہ نے تابع داری سے کہا۔

''بیٹا! وقت تیزی سے نکلتا جارہا ہے سب مہمان آچکے ہیں میرا خیال ہے اب بس نکلنے کی کرنی چاہیے۔'' روشن آرا بیگم نے چادر کے پلو سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

ولی کے دل میں اب بھی ڈھیروں ڈھیر سوال تھے لیکن اب ہر کوئی افراتفری میں تھا بارات لے جانے کا وقت ہوگیا تھا مگر اُس کو تو اپنے سوالوں کے جواب تفصیلاً چاہئیں تھے۔ لیکن اب وقت باقی نہ تھا۔

ولی کو لگ رہا تھا کہ وہ ایک دم اپنی عمر سے بہت بڑا ہوگیا ہے زندگی جانے اُس کے لیے مزید اور کتنے انکشاف اپنے دامن میں لیے کھڑی تھی۔

❖❖○❖❖

''جانے میں ہر بار کیوں لیٹ ہوجاتی ہوں، آنی سے بہت جھاڑیں پڑیں گی۔'' سائرہ نے تیزی سے ہائی ہیل جوتے کا بکل بند کرتے ہوئے کہا۔

ابو اور آنی تو نکل چکے تھے اور وہ لیٹ ہوجانے کی وجہ سے ابھی یہیں پر تھی۔

گیلے بالوں کو بلو ڈرائی کرکے وہ انہیں کھلا چھوڑ کر اپنا جھلملاتا دوپٹہ لے کر جب باہر نکلی تو ملازمہ ٹی وی لاؤنج میں ایک مہمان لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔

''کون؟'' سائرہ نے بغور اُسے دیکھا لیکن اُسے یاد نہ آیا کہ وہ ہے کون؟

''سوری! میں جلدی میں ہوں۔'' سائرہ نے بے اختیار گھڑی دیکھی، ڈرائیور گاڑی نکال کر باہر کھڑا تھا۔

''اب یہ مہمان کون ہے؟'' سائرہ کا دماغ الجھا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟" سائرہ نے پوچھا۔

"نہ جاننے سے کیا رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔" لڑکی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"جی!" سائرہ نے جی کو کچھ زیادہ ہی کھینچ دیا تھا۔

"بعض اوقات دو لوگوں میں بے حد قریبی رشتہ ہوتا ہے لیکن بے خبری کی وجہ سے وہ رشتہ دور ہوتا ہے۔" لڑکی بولی۔

"پلیز اپنا تعارف آسان لفظوں میں کروا دیں اور یہ بھی کہ اِس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔" سائرہ نے زچ ہو کر کہا۔

"میرا نام سحرش ہے!" لڑکی نے چونکانے والے انداز میں کہا۔

سائرہ نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"اگر وہ سحرش ہے تو اِس میں کیا انوکھا ہے۔"

"میرا پورا نام سحرش طارق ہے اور طارق میرے شوہر کا نام ہے!" سحرش نے ایک دم بم دھماکا کیا۔

"ک۔ کیا؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"اِس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے، میں آپ کی بھابی ہوں اور میری اور طارق کی شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔" لڑکی نے ساتھ ہی کچھ تصاویر نکال کر سامنے رکھ دیں۔

"لالہ؟" سائرہ حیرت سے تصویر پکڑے کھڑی تھی اُس کا تو دماغ گھوم کر رہ گیا۔

"لالہ! جو نگینہ کو بچپن سے پیار کرتے آئے تھے، جن کا اُس سے کل نکاح تھا وہ۔ وہ کیسے شادی کر سکتے ہیں؟ یا میرے اللہ!" سائرہ نے بے اختیار سامنے بیٹھی اُس روڈ سی لڑکی کو دیکھا۔

"کیا واقعی ایسا ہے؟"

سائرہ کا دِل آنے والے بہت سارے لوگوں کی زندگی میں اِس بات کا جو منفی اثر ہونے والا تھا اُس کو سوچ کر ہی سہم گیا تھا۔

❖❖○❖❖

سید سرفراز علی ہال میں پہنچ کر ریسپشن کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے وہ کسی چیز کی کمی نہیں چاہتے تھے۔

مسکان کو تیار کر کے ابھی ابھی برائیڈل سویٹ میں لے جایا گیا تھا یہ کمرہ پورا سویٹ تھا جہاں بیڈ، صوفے، باتھ روم اور ٹی وی وغیرہ سب موجود تھا تا کہ دلہن ریلیکس کر سکے۔ بہت عمدہ Comfortable روم تھا۔

سید سرفراز علی، نفیسہ بیگم اور مسکان کو وہاں چھوڑ کر ریسپشن پر چلے آئے۔

بارات آنے میں کچھ وقت تھا لیکن بارات کے کچھ مہمان جو بارات کے ساتھ نہ آئے تھے وہ بھی گاہے بگاہے آ رہے تھے۔

سید سرفراز علی کی ملازمائیں ہر آنے والے مہمان کو پھولوں کے ہار پہنا رہی تھیں اور اُن کو چاندی کے

Coins گفٹ کر رہے تھے یہ چاندی کے Coins بہت پیاری ٹرانسپیرنٹ Packing میں تھے اور عام Coins کی نسبت سات آٹھ گنا بڑے اور چوڑے تھے۔

جب ہر مہمان یہ تحفہ لے کر مرعوب ہوتے ہوئے اردگرد کی سج دھج دیکھ کر اندر جا رہا تھا تو سید سرفراز علی کی گردن مزید تن جاتی تھی۔

اُسی پل اُس کی نگاہ سامنے پڑی۔

کیا یہ کوئی بھیانک خواب تھا؟

سامنے سے مریم بی بی اور ڈاکٹر فیصل چلے آ رہے تھے۔ سید سرفراز علی نے بے اختیار آنکھیں ملیں۔

"کیا مر جانے والے دوبارہ زندہ ہو کر آ رہے تھے۔" جوں جوں وہ لوگ قریب آ رہے تھے سید سرفراز علی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جوں جوں ڈاکٹر فیصل اور مریم بی بی سید سرفراز کے قریب آ رہے تھے، سید سرفراز علی کے کٹھور اور جس دِل پر بے انتہا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اُن کے دل میں باقاعدہ درد اُٹھا تھا۔

ہر منظر میں چاہے وہ حقیقت کا ہی کیوں نہ ہو اُس میں ہر وقت کچھ نہ کچھ **Illusion** ضرور ہو ہیں یہ **Illusions** ہمارا دِل اور دماغ ہر وقت پیدا کرتے ہیں یہ کبھی خوش فہمی اور کبھی کبھار غلط فہمی لبادہ اوڑھ لیتے ہیں لیکن سامنے جو منظر تھا، وہ نہ ہی کوئی الوژن تھا اور نہ ہی اُس نے کسی غلط قسم کا لبا اوڑھ رکھا تھا۔ وہ ایک ایسی حقیقت تھا جس کو اُن کا دِل بے شک نہیں مان رہا تھا لیکن اُن کا دماغ بتا تھا کہ سامنے والا منظر سچ ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو سید سرفراز علی؟'' کوئی اُن کے اندر سے بولا۔

''کیا شکست اور وہ بھی ایسی!'' ساتھ ہی اندر سے جواب بھی آیا۔

''نہیں! میں نہیں ہار سکتا، میں نہیں ہار سکتا۔'' سید سرفراز علی ایک دم چلاّئے۔

اُن کے پاس کھڑے سب لوگ متوجہ ہوئے، مریم بی بی اور ڈاکٹر فیصل دونوں عین اُن کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''تم؟'' سید سرفراز علی نے اپنے بائیں بازو میں درد روکتے ہوئے کہا، لیکن درد تھا کہ سینے تک چلا آ رہا تھا۔

''کیسا! حیرت ہوئی یہاں دیکھ کر یا پھر زندہ دیکھ کر!'' ڈاکٹر فیصل نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے یوں پوچھا، جیسے اُن کے بیچ اتنے سال اتنے پل آئے ہی نہ ہوں۔

سید سرفراز علی کا منہ کھلا کچھ کہنے کے لیے لیکن وہ ایک دم نیچے آ گرے، ایک دم حاضرین میں بھگدڑ مچ گئی۔

خادمِ خاص اپنے مالک کی جانب تیزی سے لپکے۔

''کیا ہوا سائیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''ہارٹ اٹیک!'' ڈاکٹر فیصل نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اُن کو فرسٹ ایڈ دینے کے لیے نیچے بیٹھ گئے۔

''سید سرفراز علی! خبردار تم یوں مرے تو! میں تم کو اتنی آسانی سے مرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔'' ڈاکٹر فیصل نے ابتدائی طبی امداد دیتے ہوئے سید سرفراز علی کے کان میں کہا۔

جب کہ مریم بی بی بالکل ساکت کھڑی تھیں، جیسے اِس چلتے منظر میں وہ ایک صرف بے جان مورت ہوں۔

''ابھی تو بہت سارے کھاتے کھلنے ہیں، تم ایسے کیسے مر سکتے ہو؟'' وہ دِل ہی دِل میں بولیں۔

❖❖○❖❖

''کیسے؟'' نفیسہ بیگم کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ ملازمہ نے آ کر ایک بالکل مختلف خبر سنائی دی تھی۔

''آپا امّاں کیا ہوا، یہ سب لوگ کیوں اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' مُسکان کو کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا وہ سب کے چہروں پر پھیلی پریشانی سے باخوبی سمجھ رہی تھی۔

اس کا سارا دھیان تو عبدالولی کی ہی طرف لگا تھا۔

''کچھ نہیں بیٹا! باہر روڈ پر کوئی حادثہ ہو گیا تھا اب ٹھیک ہے، ایمبولینس لے گئی ہے متاثرین کو۔'' آپا ں نے گہری سانس بھر کر اپنے اندر کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ ہال سارا مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور مسکان! اُس کے ارمان تو مچل مچل کر باہر آ رہے تھے۔

''بیٹا! میں ابھی آتی ہوں، تم بیٹھو کچھ آرام کر لو، سارا وقت بیٹھ بیٹھ کر تم نے تھک جانا ہے، بہتر ہے دیر ٹانگیں اُوپر کر کے ٹیک لگا لو۔'' آپا امّاں اُسے مشورہ دیتی ہوئیں باہر نکل گئیں جب کہ مُسکان نے ت سے اُن کو دیکھا۔

''آج اُس کی شادی کا دن تھا، وہ اُسے آرام کرنے کا مشورہ کیوں دے رہی تھیں۔'' وہ اپنی حیرت پر پاتی سامنے لگے قدِ آدم شیشے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

وہاں تو کسی شہزادی کا عکس تھا۔

مسکان خوشی اور بے یقینی سے اپنے آپ کو ہر ہر اینگل سے دیکھ رہی تھی اُس کا دل مختلف رفتار سے کا تھا وہ اپنا عکس ولی کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔

اُسے حیران اور مبہوت دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ جس کے سامنے اُس نے اپنا دِل اور زندگی ہار دی تھی آج وہ اُسے جیت کر خود کو دوبارا پانا چاہتی تھی نے اس پانے کے کھیل میں بڑے خسارے سہے تھے اور اب وہ صرف جیت کی منتظر تھی اور ایسے میں اماں کے مشورے کہ تم آرام کر لو اُسے بہت بُرے لگ رہے تھے۔

❖❖○❖❖

ایسا کیا ہوا کہ سید سرفراز علی کا پہاڑ جیسا دِل کم زور پڑ گیا؟

نفیسہ بیگم ایمبولینس تک تیزی سے پہنچیں کیوں کہ سید سرفراز علی اُن سے ملے بغیر ہسپتال نہ جانا چاہتے وہ اندر آ کر بیٹھیں تو سید سرفراز نے آکسیجن ماسک منہ سے ہٹا لیا۔

''نفیسہ! اگر میں مر جاؤں تو بھی مسکان کی رُخصتی ادھوری نہیں رہنی چاہیے، اُسے میرے متعلق کل رات ہا چلنا چاہیے۔ و۔ ولیمے کے بعد۔'' سید سرفراز علی نے اُکھڑتی سانسوں کے ساتھ حکم دیا۔

''لیکن وہ! اُسے کیا کہوں گی تمہارے متعلق؟''

''کچھ بھی!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم جاؤ!'' سید سرفراز علی نے بری طرح ہانپنا شروع کر دیا، سانسیں پھر اُکھڑنے لگیں تو ڈاکٹر نے فوراً آکسیجن ماسک لگا دیا۔

ایک ہی وقت میں سید سرفراز علی کی ایمبولینس روانہ ہوئی اور دوسری جانب مسکان کی بارات ڈھیروں گاڑیوں کی لائن میں پارکنگ سلوبز کراس کر رہی تھی۔

پارکنگ بھی بہت Creative لائنز میں ڈیزائن کی گئی تھی، یہ ویڈنگ وینو وزیروں کی پارٹیز کے لیے مخصوص تھی لیکن سید سرفراز جیسے شخص کے لیے یہاں شادی افورڈ کرنا بالکل مشکل نہ تھا وہ مسکان سے زیادتیوں کا ازالہ کرنے کے لیے ہر چیز اور ہر کام کو دی بیسٹ کے خانے میں سیٹ کرنا چاہتے تھے۔

سنوبری تو اُن کی نیچر میں تھی ہی لیکن یہ سب کچھ انہوں نے مسکان کے لیے کیا تھا۔

لیکن قسمت تھی کہ جس بارات کو انہوں نے تقدیر کا رُخ موڑ کر اپنے راستے پر آنے پر مجبور کیا تھا اُس فتح کو دیکھنے کے لیے وہ موجود نہ تھے، جوں جوں بارات گیٹ کے قریب آ رہی تھی ایمبولینس کی تیز آواز وہاں موجود بینڈ کی آواز میں دبتے دبتے ختم ہو گئی تھی۔

انسان خود کو بہت بڑا Planner سمجھتا ہے لیکن دنیا کے سب سے بڑے Planner کے سامنے وہ زیرو ہو جاتا ہے۔

❖❖○❖❖

''پیارے بیٹے! بسم اللہ کر کے اپنا دایاں پاؤں باہر رکھو!'' روشن آرا بیگم کی آواز خوشی اور جذبات سے کپکپا رہی تھی۔

اُن کا شہزادوں جیسا بیٹا آج واقعی شہزادہ لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ زندگی کی جانب اس کا یہ قدم اتنا بابرکت ثابت ہو کہ زندگی کے پودے سے لگے سارے کانٹے جھڑ جائیں اور اُس کی ڈال پھول اور پھل سے جھک جائے اور یہ ایسا کوئی ناممکن بھی نہ تھا کیوں کہ یہ ایک ماں کی دعا تھی اور ماں کی دعا تو ایک فائٹر کی طرح ہوتی ہے جو ہر مشکل اور ناممکن سے لڑ جاتی ہے۔ عبدالولی نے جیسے ہی اپنا قدم باہر رکھا۔ اس کے دوستوں نے بھنگڑا ڈالتے ہوئے اُسے گھیرے میں لے لیا۔

روشن آرا بیگم، جو بہت خوب صورت چادر میں مکمل طور پر لپٹی ہوئی تھیں مسکرا کر ذرا پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ احمد شاہ نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو بے اختیار انہوں نے بھی مُڑ کر دیکھا۔

''روشن! دیکھو، یہ وہ منظر ہے جو آج سے اکیس سال پہلے ناممکن تھا ہماری اولاد نہ تھی لیکن آج! آج اِس منظر نے بتا دیا ہے کہ اگر ہماری سگی اولاد بھی ہوتی تو یقیناً اُتنی وفادار اور تابعدار ہرگز نہ ہوتی، اللہ نے انعام کے طور پر ہم کو یہ بچے نوازے تھے، آج میرا دل بھی اِن بچوں کی طرح جھومنے کو کر رہا ہے اتنا خوش ہے کہ میرا دِل کرتا ہے میں بھی اپنے ربّ کا اِسی طرح جھوم جھوم کر شکریہ ادا کروں، جس نے ہماری ادھوری زندگی کو ایسے پورا کیا کہ یوں لگا، جیسے دِل کو اب کسی اور بات کی حسرت نہیں۔'' احمد شاہ کہہ رہے تھے اور روشن آرا بیگم سامنے کا منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں میں بہتے آنسو بے اختیار صاف کرنے لگیں۔

''واقعی آج کا منظر اکیس سال پہلے ناممکن بن چکا تھا لیکن اُس بڑی سرکار نے، رب العزت نے اُن کی زندگی اِس خوب صورت منظر سے رنگی ہی تھی کیوں کہ وہ خود سے درخواست کرنے والے کی کبھی نہیں ٹالتا اور مانگنے والے کو ہمیشہ عطا کرتا ہے۔

❖❖○❖❖

''بی بی جی! باہر آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' ملازمہ نے برائیڈل سویٹ میں داخل ہو کر کہا۔

''کون ہے، میں ابھی تو سب مہمانوں سے مل کر آئی ہوں۔'' نفیسہ بیگم نے نقاہت سے کہا۔ وہ اندر سے اتنی پریشان تھیں کہ اُن کی طبیعت خراب ہونے لگی۔

''آپا امّاں! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' مسکان نے بھی بے حد فکرمندی سے پوچھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے کھڑکی سے عبدالولی کو دولہا بنے دیکھا تھا، سہیلیوں کا کہنا تھا کہ دلہن اگر کھڑکی سے دولہے کو دیکھ لے تو وہ ہمیشہ بیوی کی مانتا ہے۔

عبدالولی جو کبھی اُس کے ماننے میں ہی نہ تھا، مسکان نے یہ سن کر اُسے بہت حرص سے دیکھا۔

اُس کی اندر تک یہ خواہش تھی کہ اب وہ اپنا پیا من بھائے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اُس کا بن کر رہے، اُس کی ہمیشہ مانتا رہے۔ اُس نے عبدالولی کو کتنی ہی دیر دیکھا لیکن جیسے ہی وہ کمرے میں آئی تو آپا امّاں کو پسینے پسینے دیکھ کر وہ بے حد فکرمند ہو گئی۔

''تم! دُور جا رہی ہو نا، اِس لیے دل کم زور پڑ رہا ہے بس اتنی سی بات ہے۔'' آپا امّاں نے گہری سانس بھر کر خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔

''بی بی! وہ لوگ، جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں اُن سے کیا کہوں؟'' ملازمہ منتظر تھی اُس نے اپنا سوال دہرایا۔

''اُن کو بابا سائیں سے ملوا دو، آپا امّاں تھکن کی وجہ سے اچھا محسوس نہیں کر رہیں۔'' جواب مسکان نے دیا۔

''نہیں! رُکو، میں آتی ہوں۔'' نفیسہ بیگم نے گھبرا کر اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا کہ کہیں مسکان کو باپ کی خبر نہ مل جائے کہ وہ ہسپتال ہیں۔ ساتھ ہی اُٹھ کر وہ باہر نکل گئیں۔

سامنے جو شخصیت کھڑی تھی اُسے دیکھ کر نفیسہ بیگم کو یوں لگا، جیسے اُن کا پورا وجود آنسو بن کر رہ گیا ہو، جب سے وہ سید سرفراز علی کی زندگی میں آئی تھیں ہر وقت کا رونا تو تب ہی سے قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔ لیکن یہ آنسو ہمیشہ کسی اپنے کے انتظار میں اُن کے دل پر گرتے رہے اور پہاڑوں کا سا بوجھ لیے موجود تھے، لیکن آج سامنے اپنے ماں جائے کو دیکھ کر اُن کے اندر آنسوؤں کے بنے گلیشیر کچھ ایسے پگھلے کہ اُن کا سارا وجود بس آنسو بن کر رہ گیا۔

جانے کتنی دیر وہ بھائی کے سینے سے لگیں دھاڑیں مار کر روتی رہیں، آج انہوں نے اپنی بھری جوانی کو بہا لیا تھا جو سید سرفراز کے ہاتھوں تباہ ہوئی تھی، ماں باپ بھائی سب کے آنسو ڈاکٹر فیصل کے کندھے سے لگ کر بہا لیے تھے خود ڈاکٹر فیصل کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی وہ پھانس، وہ بوجھ جو برسوں سے وہ اپنے دِل پر لیے گھوم رہے تھے، اپنی ماں جائی سے ملنے پر کچھ کم ہو گیا تھا۔

''بھائی! میرا بھائی زندہ ہے!'' نفیسہ بیگم نے ڈاکٹر فیصل کا چہرہ تھام کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''جس رات سید عبداللہ کو اور اُس کے سارے خاندان کو سید سرفراز نے آگ لگوائی تھی اس کی صبح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عبداللہ مجھ سے ایک خوشی کی خبر کا وعدہ کر گئے تھے... آج آپ کو دیکھ کر میں جان گئی ہوں کہ وہ خوش خبری آپ تھے۔‘‘

آج! سید عبداللہ نے اپنا وعدہ پورا کر ڈالا، وہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن میرا روم روم اُن کا شکر گزار اور دُعا گو ہے۔‘‘ نفیسہ بیگم نے دوپٹے کے پلو سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

’’وہ ہم سب پر قربان ہوگیا، وہ اپنے لوگوں کے لیے آسانی اور برابری کا سسٹم بنانا چاہتا تھا لیکن! اُسے اِس کی سزا موت کی صورت ملی۔‘‘ ڈاکٹر فیصل کے چہرے پر آج بھی اتنا ہی دُکھ تھا جتنا سید عبداللہ کی موت کا دُکھ برسوں پہلے ہوا تھا۔

’’خدا کی لاٹھی بے آواز ہے بھائی!‘‘ نفیسہ بیگم نے روئے روئے لہجے میں کہا۔

سید سرفراز علی کا مکافاتِ عمل کا دور شروع ہو چکا ہے لیکن میرا دل خوش نہیں ہوا، کیوں کہ سید سرفراز علی کی سزا کے حصے دار اُس کے بچے بنے ہیں۔ یہ بچے مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز تھے کیوں کہ یہ ہمیشہ سے معصوم تھے لیکن قسمت کے بہت بدبخت نکلے، کیوں کہ اِن کا باپ سید سرفراز علی ہے اور اُن کو ہر صورت یہ سزا بھگتنی ہے۔‘‘ نفیسہ بیگم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

اِس سارے دورانیے میں مریم بی بی کے ساتھ زہرہ اور عبداللہ خاموشی سے پھوپو اور باپ کو دیکھتے رہے، اُن سب نے موقع دیا کہ وہ دونوں برسوں سے لدا بوجھ دِل سے اتار دیں۔

’’نفیسہ! تم سید سرفراز علی اور اُس کی اولاد سے کوئی ہمدردی نہ رکھو کیوں کہ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے اُسے ڈسنا سکھانا نہیں پڑتا کیوں کہ یہ اُس کی فطرت میں ہوتا ہے۔‘‘ ڈاکٹر فیصل نے بے حد سفاکی سے کہا۔

سید سرفراز علی نے اُن کے دِل میں اتنے چھید لگائے تھے کہ ان کو اپنا دِل ایک چھلنی کی طرح لگنے لگا تھا تبھی تو اتنے سوراخوں کی وجہ سے کوئی اعتبار اُن کے دِل میں ٹھہر نہ پاتا تھا۔

’’بھائی! اگر دِل میں معاف کردینے کا احساس نہیں ہوگا تو اُس مولا سے ہم ہر وقت جو اپنی معافی اور بخشش کی دُعا کرتے رہتے ہیں کیسے اُس سے سوال کر پائیں گے؟‘‘

’’تم سید سرفراز علی کو معاف کرنا چاہتی ہو؟‘‘ ڈاکٹر فیصل نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ لوگ اِس وقت ہال کے ایک جانب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہر فیملی کے لیے الگ سے ٹیبل لگائے گئے تھے جتنے انوی ٹیشن تھے اتنے ہی ٹیبل بھی لگائے گئے تھے، ہر ٹیبل پر ہر مہمان کا نام موجود تھا لوگ اپنے اپنے نام دیکھ کر میزوں پر بیٹھے تھے۔

’’معافی! بھائی معافی تو اُسے ملتی ہے جو اُس کا طلب گار ہوتا ہے۔ بنا طلب کے یہ کبھی نہیں ملتی، جس کو اِس کی طلب ہوتی ہے وہ اپنے رویّوں سے، اپنی زبان سے، اپنے دل سے اِس کا طلب گار ہوتا ہے اور اُسے یہ مِل بھی جاتی ہے اور سید سرفراز! اُسے تو اپنی غلطی کا ہی احساس نہیں ہوتا تو وہ معافی کیوں مانگے گا؟‘‘ نفیسہ بیگم کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔

’’جو معافی چاہتا نہیں اُسے نہیں ملے گی، میں تو!‘‘ نفیسہ بیگم نے لب کچل کر آنسو پینے کی کوشش کی، آنسوؤں کی وجہ سے وہ بات مکمل نہ کر پا رہی تھیں۔

’’میں تو آپ ﷺ کی دی ہوئی بات سے اپنی اندھیروں میں ڈوبی زندگی میں کچھ روشنی کی امید بھرنا ہتی ہوں وہ دنیا کے بہترین انسان تھے، جنھوں نے فرمایا تھا کہ اگر کچھ بھی نہ کرسکو تو کم از کم ایک پودا رور لگا دینا تا کہ جب وہ درخت بنے تو اُس کا صدقہ جاریہ پھل اور سایہ جو وہ دوسروں کو دے گا تمہیں ملے۔‘‘

’’میرے پاس بھی اپنے اعمال اور اولاد نہیں ہے جو صدقہ جاریہ بنتے، میں مکان کو اُس کے ساتھ ترین اچھائی کر کے اُسے بچا کر اپنے لیے صدقہ جاریہ کا بندوبست کر رہی ہوں۔ میرے لیے اگر وہ رف دشمن کی بیٹی ہوتی تو میں کب کی بربادی کی انتہاؤں اور خسارے کے ڈھیر اپنے دامن میں بھر لیتی، لیکن میرے مولا نے مجھے ایسا کرنے سے روک کر میرے لیے آسانیاں پیدا کردیں، اب مجھے کوئی بھی لگے کہ میں سید سرفراز علی کو معاف کر رہی ہوں تو میں اُسے نہیں بتاؤں گی کہ میرا دل کیا سوچتا ہے کیوں کہ بہترین سوچ کو پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔‘‘ نفیسہ بیگم شدتِ جذبات سے سُرخ چہرہ لیے بولیں۔

ہرہ نے پانی کا گلاس بھر کر اُن کو تھمایا، جسے وہ بنا سانس لیے پی گئیں۔

ڈاکٹر فیصل کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو کر بھیگ گئی انہوں نے نظر بھر کر اپنی بہن کو دیکھا، جو اُن کو بے حد بلندی پر محسوس ہوئیں۔ وہ عورت ہو کر اتنی چھوٹی بات جان گئی تھی اور اُس نے اپنے راہ کے کانٹے پھولوں میں تبدیل کر لیے تھے۔ اور انہوں نے اتنی زہریلی باتوں کو سینے سے لگا رکھا تھا اور اُن کی ساری زندگی پھوڑے کی طرح دُکھتی رِستی رہی تھی۔

’’ہم جب کسی کو معاف کرتے ہیں نا بھائی! تو دراصل ہم خود کو معاف کرتے ہیں۔ غصہ اور کدورت (بغض) دراصل ہم کو اندر اندر ہی اندر جلاتا ہے، سزا دیتا ہے جتنی آگ کسی کو دیتے ہیں اتنی ہی آگ خود کے اندر بھی جلتی ہے۔‘‘ نفیسہ بیگم پانی پی کر، آنسو بہا کر شانت سی ہوگئیں۔ مریم بی بی نے ڈاکٹر فیصل کا برسوں کا تڑپنا اور سسکنا اُن کو بتا دیا تھا اِس لیے وہ چاہتی تھیں کہ اُن کا بھائی اس بھانبڑ سے نکل آئے اور دیکھے کہ یہاں سے نکل کر اللہ نے باہر کتنی ٹھنڈک رکھی ہے۔

’’نفیسہ! تم نے میرے جلتے دِل پر آج پانی ڈال کر میرا اندر تک شانت کر دیا، شکریہ میری بہن!‘‘ ڈاکٹر فیصل نے نفیسہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

’’وہ آگ جو سرفراز علی نے ہمارے گھر اور زندگیوں کو برسوں پہلے لگائی اُسے میرے آنسو اور آہیں ہمیشہ تازہ کرتی رہیں، میں نے کبھی یہ آگ بجھائی ہی نہیں۔‘‘ ڈاکٹر فیصل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

’’وطن سے دور اپنی مٹی سے دُور! اپنوں کی قبروں سے دُور، میں کہیں بہت دُور کھو گیا تھا لیکن آج میری بہن تم نے مجھ پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے، تم نے میرے وجود کو مجھ سے ملا دیا ہے، جو برسوں پہلے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔‘‘ ڈاکٹر فیصل دھیرے دھیرے بولے۔

مریم بی بی نے بے حد احسان مند نظروں سے نفیسہ بیگم کو دیکھا۔ بظاہر جس کی زندگی کی کشتی میں ڈھیروں سوراخ ہو گئے تھے وہ آج تک اِسی لیے نہ ڈوبی تھی کیوں کہ اُس نے اپنی کشتی سب سے بڑے نگہبان کے حوالے کر ڈالی تھی اور آج ایک بظاہر ٹوٹی پھوٹی عمارت نے کسی اور گرتی عمارت کو سہارا دے کر اُٹھا ڈالا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نفیسہ بیگم نے وہ کام کر ڈالا تھا جو مریم بی بی برسوں میں بھی نہ کر سکی تھیں۔

''میں! آج اپنا سارا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں وہ جو چاہے فیصلہ کرے، فیصلہ جزا کا ہو یا سزا کا میں اُس کی رضا میں راضی رہوں گا۔'' ڈاکٹر فیصل نے بے حد پُرسکون ہو کر کہا۔

''انسان واقعی کم عقل ہے وہ بار اُٹھالیتا ہے جو اُسے اٹھانا نہیں چاہیے جب وہ جزا اور سزا کا فیصلہ کرنے کا مختار نہیں ہے تو پھر کیوں ساری عمر دوسروں کی زیادتی کو خود پر سزا کی طرح لاگو رکھتا ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے دِل میں کہا۔

''ہم مُسکان بیٹی کو اپنی دعاؤں اور پیار کے سائے میں خود رخصت کریں گے۔'' مریم بی بی نے جلدی سے بارش کی پہلی بوند بنتے ہوئے کہا، ساتھ ہی انہوں نے دھڑکتے دِل سے شوہر کو دیکھتے ہوئے تائید چاہی۔

''انشاء اللہ!'' ڈاکٹر فیصل نے کہا تو مریم بی بی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے ایک دُھند کے بھرے موٹے سے غلاف میں بند زندگی گزار رہی تھیں، وہ غلاف اُن کے اردگرد سے پھٹ کر ختم ہوگیا ہو اور تازہ ہوا اور زندگی کی حرارت اُن تک پہنچ گئی ہو۔

''آپ مسکان بیٹی کو بتائیں کہ اُس کی پھوپو مریم بی بی اور تمہاری نسبت سے تمہاری بیٹی ہونے کی وجہ سے اُس کے ماموں اُس کو دعائیں اور پیار دینے کے لیے آئے ہیں۔'' یہ ڈاکٹر فیصل کہہ رہے تھے، جو آئے تو ہر چیز تہس نہس کرنے کے ارادے سے تھے لیکن اب وہ بالکل ایک بدلا ہوا بیان دے رہے تھے۔

اللہ نے اُن کے دِل پر بھی رحمت کردی تھی، اُن پر آمرزش کی بارش کر کے اُن کے دل میں بھڑکتی آگ کو بجھا ڈالا تھا۔ نفیسہ بیگم چہرہ صاف کر کے دھیمے سے تبسم کے ساتھ اندر بڑھیں تا کہ مسکان کو بتاسکیں کہ اُس کی شادی کا دِن اُن کے لیے بھی ڈھیروں خوشیاں لے کر آیا تھا۔

❖❖○❖❖

آنچل سے دھوپ جھٹکی
اوک میں تارے بھر لائے
کیکر بو کر بیر توڑے
ایسا جگ میں ہو نہ پائے
چنری پہ اتنے تارے چمکیں
جتنی جھمل مکیش لگائیں
چاش میں ڈوبی لکھی کافی
پھر نہ لکھے کوئی چاؤ مصرے
ڈونگا ہے جب دریا ڈونگا
دِل پتوار سہار لے تیرتا جائے
رانجھن ڈھیرا دِکھتے ہی

ن کوئل بن کے کوکتا جائے
ا کبوتر بن کے ڈالے
گھمن گھمن گھمیریا
ن کی چادر میں پھوٹیں پھوٹیں
آگ کی بڈی مائیاں
چھن چھن چھن چھن امبر سے
بن کے موتی برسیاں
ل نس کھلی سوڈے کی بوتل
روم روم بھیگا چھلکی اکھیاں
اکھیاں اور نہ ترسیاں

عبدالولی کے پہلو میں بیٹھے کیمروں کی لائیٹس میں چمکتی ہوئی مسکان تو کسی اور ہی جہان میں کھوئی ی تھی کہ بعض سچائیاں بھی خواب سی لگنے لگتی ہیں۔

جب زہرہ اور اُس کی دوسری سہیلیاں اُسے اسٹیج پر لے کر آئیں تو عبدالولی احتراماً کھڑا ہوگیا۔ اُس ے دلہن کو یہ ویلکم پروٹوکول دیا تھا، شکرانے سے مسکان کا دِل جھک جھک جارہا تھا یہ وہی عبدالولی تھا ں کے لیے اُس کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔

جس ربّ سے وہ نراش ہوگئی تھی، روٹھ گئی تھی اُس نے اُس کی سرکشی کے باوجود معجزانہ طور پر وہ کچھ ے دیا تھا، جس کی اُس کو خواہش تو تھی لیکن اُمید باقی نہ رہی تھی۔

وہ دلہن بنی چوری چوری عبدالولی کو ہی دیکھ رہی تھی اِس شخص کو اُس نے اتنا پوجا تھا اُسے وہ بہت بلند رُور محسوس ہوتا تھا لیکن آج کا دِن مختلف تھا!

پجارن کی قسمت بدل گئی تھی!
اُس کی پوجا سپھل ہوگئی تھی۔
اُس کی ''کہی'' سب سے بڑے دربار میں ''سُنی'' گئی تھی۔
اُس کی دعائیں مقبول ہوگئی تھیں۔

''تو مُسکان عبدالولی! یہ خواب نہیں، یہ سچ ہے!'' اُس نے اپنے اندر خوشی سے پھوٹتے اناروں کی ململ کو محسوس کرتے خود سے کہا۔

❖❖○❖❖

''بابا سائیں کہاں ہیں آیا امّاں؟'' مسکان نے وقت رخصت اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرتے پوچھا۔

''وہ؟'' نفیسہ بیگم کچھ پل کو چپ سی رہ گئیں، اُن کے کانوں میں سید سرفراز علی کی آواز گونجی۔

''مسکان کو میرے متعلق کچھ پتا نہ چلے، اُسے اچھی یا بُری خبر ویسے کی رات کو دی جائے۔'' نفیسہ بیگم نے بے اختیار گہری سانس لی، وہ خود سید سرفراز علی کے انجام سے بے خبر تھیں۔

''زبیر کا مسئلہ تھا ہوسٹل سے کچھ ڈرگ ملی تھیں، کوئی پولیس کیس تھا اُس سلسلے میں ارجنٹ نکلنا پڑا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نفیسہ بیگم نے وہ بہانہ بنایا جو زیادہ ٹھوس تھا کیوں کہ اِس سے پہلے بھی کئی بار زبیر ڈرگز کی وجہ سے ہا سائیں کے لیے مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ تھرل کے لیے ڈرگز استعمال کرتا تھا اور سید سرفراز علی نے اُسے کبھی تھرل کے لیے بھی نہ روکا تھا۔

''زیادہ مسئلے کی تو بات نہیں ہے نا؟'' مُسکان نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں!تم بے فکر رہو، ویسے بھی سید سرفراز کے لیے عموماً کوئی مسئلہ، مسئلہ نہیں ہوتا! کیوں کہ وہ تو خود مسئلوں کی جڑ ہوتا ہے۔'' آخری جملہ دِل میں کہتے آیا امّاں نے مُسکان کو تسلی دے کر رخصت کیا۔

''بچی نے بہت دُکھ جھیلے ہیں، آپ کے گھر کے سُکھ کچھ اِس کی جھولی میں پڑ جائیں گے تو اِس کے سارے ملال دُھل جائیں گے اور مہمان، بیٹیوں، بارش کو جو خوش آمدید کہتا ہے اللہ کا بہت پیارا ہوتا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے روشن آرا بیگم کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے بعد میں ہمیشہ اِس کا بہت خیال رکھوں گی، میں خود بیٹی کی ماں ہوں اور بیٹی کتنی نازک ہوتی ہے، اچھی طرح جانتی ہوں، میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے وہ اس کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔'' روشن آرا بیگم نے کہا تو نفیسہ بیگم جھلملاتی آنکھوں سے ایک دم مسکرا دیں۔

''ہاں! میں جانتی ہوں، وہ واقعی لاکھوں میں ایک ہے۔'' نفیسہ بیگم نے بے حد یقین سے کہہ کر مسکان کو رخصت کیا۔

بعض لوگوں میں جیسے شرافت خاندانی پہچان ہوتی ہے، ویسے ہی بعض لوگوں کا خون بولتا ہے کہ وہ بے حد قابلِ اعتبار انسان ہیں اور ولی اُن خوش نصیبوں میں ہمیشہ شامل رہا تھا۔

❖❖○❖❖

کافر نہ ریا کار، نہ صوفی، نہ ولی ہیں
اللہ نے جو ہم کو بنایا ہے وہی ہیں
مصری ہیں نہ شامی ہیں، نہ ہندی ہیں نہ عربی
ہم رشتۂ توحید سے اعلیٰ نسبی ہیں
وہ اصل حقائق کو چھپانے کے لیے ہیں
تحریر میں جو لفظ باندازِ جلی ہیں
اللہ نے سونپا تھا ہمیں کارِ نیابت
وہ چھوڑ کر ہم کشتۂ آساں طلبی ہیں
یہ حکمِ مشیت تھا کہ دُنیا کو سنوارو
اور ہم ہیں کہ برگشتۂ دنیائے دنی ہیں
تھا حکم کہ گلزار کرو دشتِ جنوں کو
اور ہم ہیں کہ ہاتھوں کو دھرے منتظری ہیں
اُٹھتا ہی نہیں اب تو قدم راہِ عمل میں
اس طور سے فالجِ زدہ خوفِ بدی ہیں

کہنے کو تو ہم راندۂ فردوس ہیں لیکن
یہ یاد رہے، ہم میں ہی نبیوں کے نبی ہیں

طارق نے ہائی کمان کو بھرپور Presentation دی تھی، جس کی وجہ سے اُسے کچھ زیادہ مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا، اُسے بھرپور آپریشن کی اجازت اور سہولیات دی گئی تھیں۔

طارق بہت پُر جوش تھا اور جلد باز بھی!

ہر چیز بہت اچھی ہوئی تھی اور رزلٹ بھی اُس کی اپنی پسند کا مل گیا تھا بس اُسے ایک بات کا اختلاف تھا کہ اُسے آپریشن کی اجازت پانچ روز بعد ملی، جو ڈپٹی ہائی کمان میں Directers تھے اُن کا خیال تھا کہ اتنے بڑے آپریشن کے لیے ضروری ہے کہ چوہوں کے سارے پوپ ہولز بند کر دیے جائیں تا کہ جب پکڑ دھکڑ شروع ہو تو کسی کو بھاگنے کا موقع نہ ملے۔

بات تو اُن کی بھی درست تھی لیکن طارق کی کوئی سِنس الارم ہر وقت کھڑی رہتی تھی، جو اُسے مسلسل وارن کر رہی تھی کہ اتنا لمبا گیپ کسی نقصان کا باعث بن سکتا ہے، لیکن اس ساری بات کو ماننے کے سوا اس کے پاس کوئی اور آپشن بھی تو نہ تھا۔

اِس لیے وہ ''یس سر'' کہہ تابعداری سے اپنی فائلز اور اسسٹنٹ کو لے کر باہر آ گیا۔

دماغ کتنا ہی فکر مند تھا لیکن اُس کا دِل اُس سے زیادہ پُرسکون تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اچھی نیتوں کے ساتھ اللہ کا ساتھ ہوتا ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہوتا ہے، جیت صرف اُس کی ہوتی ہے۔

❖❖○❖❖

''مجھے اجازت دو بیٹا!'' بابا جی تیار بیٹھے تھے واپس جانے کو جیسے ہی عبدالولی کی بارات گھر آئی، انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر مشترکہ دُعا کی اور پھر اجازت چاہی۔

''کیوں بابا صاحب! یہاں کوئی تکلیف ہے، ہم سے کوئی کوتاہی ہوگئی؟'' احمد شاہ نے اُن کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں پیارے بیٹے! میں یہاں اہم کام کے لیے آیا تھا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس مولا نے امانت لوٹانے میں بھرپور مدد کی۔ اب وہاں بھی کوئی منتظر ہے، کچھ کام ادھورے ہیں، میرا جانا ضروری ہے، کوئی دِل کے بھنور میں دھنسا ہے اور اُسے نکالنے کا کام اللہ نے مجھے سونپا ہے مجھے جانے دو۔'' بابا جی نے اتنے دھیمے لہجے میں کہا کہ اُن کے پاس بیٹھے احمد شاہ بامشکل اُن کی بات سُن پائے۔

اُن کی بات میں کچھ ایسا تھا کہ احمد شاہ اُن کو روک نہ پائے۔ انہوں نے اپنی سب سے اچھی گاڑی اور ڈرائیور اُن کے ساتھ کر دیے تا کہ اُن کا سفر کچھ بہتر گزر سکے۔

وہ بابا جی کے جانے پر خوش نہ تھے۔

لیکن اُن کو بابا جی کی خوشی بہت عزیز تھی۔

''میری دعائیں اور پیار ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ رہے گا اللہ تعالیٰ تم کو ہمیشہ آسانیاں دے اور تم اُس کے دیے سے ہمیشہ دوسروں کو دیتے رہنا!'' بابا جی اُن سب کو پیار بھری دُعا اور نصیحت کر کے سفر کے لیے نکل پڑے اُن کو جانے کی جلدی تھی کیوں کہ کوئی اُن کی مدد کا شدت سے منتظر تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

❖❖○❖❖

کمرے کی ڈیکوریشن دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

مسکان خود ایک ڈیزائنر تھی اور کریٹو لوگ ہمیشہ کریٹو کو پسند کرتے ہیں۔

کمرے میں ماحول کو لائٹیس کے ذریعے **Facimate** کیا گیا تھا۔

گولڈن کلر کے بڑے بڑے برتنوں میں خوش بودار پھول تھے، جن کی مہک نے اُسے اندر تک تازہ کر دیا تھا سفید گلابوں کے ساتھ پنک اور سرخ گلابوں کا امتزاج کر کے فلاور ڈیکوریشن اور ارینج منٹ کے ساتھ اس قدر خوب صورت تھی کہ اسے مبہوت کر رہی تھی۔

عبدالولی اُن خوش قسمت لوگوں میں شامل تھا جس کے چاؤ اور ارمان کرنے والے بہت سارے لوگ تھے اُس کی ایک ایک چیز کا خیال رکھنے کے لیے بہت سارے لوگ ہر وقت دِل سے موجود رہتے تھے۔

''مسکان بیٹا!'' روشن آرا بیگم نے کمرے میں داخل ہو کر اُسے پکارا۔ مسکان نے چونک کر اُن کو دیکھا، وہ کمرے کے ماحول میں اِس قدر گم تھی کہ وہ اُن کی موجودگی کمرے میں فوری طور پر محسوس کر پائی۔

''السلام علیکم!'' مسکان نے اُن کو باقاعدہ سلام کیا۔ حالاں کہ گھنٹہ پہلے تو وہ اُن کے ساتھ ہی یہاں آئی تھی لیکن اُسے فوری طور پر تکلف کی دیوار توڑنے کا یہی راستہ نظر آیا اِس لیے وہ سلام کر کے آگے بڑھی۔

''جیتی رہو بیٹا!'' روشن آرا بیگم نے دُعا دیتے ہوئے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نگینہ ہاتھ میں ایک ڈبہ اُٹھائے اندر آئی، اُس کے پیچھے پیچھے عبدالولی بھی تھا۔

''لمّاں جان! دیکھیں بھائی نے مجھے کیا دیا۔'' نگینہ نے جیولری کا باکس کھول کر دکھایا۔ یہ پنڈل تھا جس میں بہت بیش قیمت ہیرا جڑا ہوا تھا۔

عبدالولی کو اسکالر شپ میں ہر مہینے ٹھیک ٹھاک پیسے ملتے تھے احمد شاہ عبدالولی کے اکاؤنٹ میں ہر وقت ہینڈسم اماؤنٹ رہنے دیتے تھے اس وجہ سے روزمرہ ضروریات پوری کرنے کے بعد بھی عبدالولی کے پاس بہت زیادہ رقم پیچھے رہ جاتی تھی۔ علیزے کے تصور کو سامنے رکھتے ہوئے اُس نے نگینہ اور علیزے دونوں کے لیے ڈائمنڈ کے یہ لاکٹ خریدے تھے۔

''بہت خوب صورت ہے، اللہ آپ کے نصیب میں کرے۔'' روشن آرا بیگم بھائی کی بہن کے لیے محبت دیکھ کر کِھل اُٹھیں۔

''لمّاں جان! یہ آپ کے لیے چھوٹا سا تحفہ لیا تھا۔'' عبدالولی نے ایک چھوٹا سا باکس کھول کر بہت نازک سا بریسلٹ نکالا، جس کے سینٹر میں بہت ہی خوب صورت ہیرا موجود تھا۔

''بیٹا! آپ ہی تو میری اصل دولت ہو، میرے لیے کیوں اتنی قیمتی چیز خریدی؟'' روشن آرا بیگم کو واقعی بہت خوشی ہوئی تھی۔

بیٹے جب ماؤں کے لیے کچھ خریدتے ہیں تو ماؤں کو الگ ہی طرح کا فخر محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے بیٹے نے اُن کو سوچ کر خاص طور پر اُن کے لیے کوئی چیز خریدی۔

''دنیا میں جتنی دولت موجود ہے وہ ساری خرچ کر دی جائے پھر بھی میری ماں کے شایان شان کوئی چیز خریدی نہیں جاسکتی۔'' عبدالولی نے اُن کے ہاتھ پر بوسہ دے کر وہ بریسلٹ پہنا دیا۔ اِس سارے دورانیے میں وہ اپنی نئی دلہن کو بالکل بھولے بیٹھا تھا۔

''عبدالولی!''

''بیٹا! آپ اِدھر آؤ۔'' انہوں نے مسکان کے برابر اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

عبدالولی نے ایک نظر مُسکان کو دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ بے حد خوب صورت تھی لیکن آج تو روپ ٹوٹ کر اُس پر اُترا تھا۔ ولی کو حیرت ہوئی کہ ایک دم اُسے کیا ہوا، اُس نے اُسے کیوں نوٹس کیا؟

اُس کے اردگرد تو ہمیشہ ہی بہت خوب صورت لڑکیاں رہی تھیں پھر اُس نے اُسے کیوں نوٹس کیا؟

شاید یہ نکاح کے بولوں کا اثر تھا۔

نکاح کے بول ایسے جادو اثر ہوتے ہیں جو دو اجنبیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک کر دیتے ہیں۔

''یہ لو!'' روشن آرا بیگم نے ڈبے سے ایک نازک سا تاج نکالا۔

''یہ شاہ صاحب نے مجھے شادی کی رات تحفہ دیا تھا، یہ احمد کی پڑدادی کا ہے اِس میں کچھ نگینوں کو میں نے بڑھایا تھا ورنہ یہ ویسے کا ویسا ہے، جب سب خواتین اس کو اپنے بیٹوں کی دلہنوں کے لیے سنبھالتی آئی ہیں تو میرا دل بھی کیا کہ اِسے میرے ولی کی دلہن پہنے۔'' روشن آرا بیگم نے ولی کو تاج پکڑا دیا۔

''اِس کا میں کیا کروں، یہ تو مسکان کے لیے ہے نا؟'' ولی نے سادگی سے ماں سے پوچھا۔

''بدھو! پہنا دو میری بہو کو۔'' روشن آرا بیگم نے حوصلے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

دس پندرہ سال مسلسل آپ ایک ہی خواب دیکھیں لیکن جب حقیقت مختلف ہو جائے تو بہت مشکل ہوتا ہے اُس کا سامنا کرنا۔ انہوں نے بھی علیزے کا تصور کر کے یہ تاج سنبھال کر رکھا تھا انہوں نے مسکان کو دیکھا، ولی نے اُسے تاج پہنا دیا۔ مسکان کے چہرے سے اِس قدر خوب صورت روشنیاں پھوٹ رہی تھیں کہ روشن آرا بیگم کے سارے ملال دُھل گئے۔

''اللہ تعالیٰ کی ذات تم دونوں کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے، تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے دِلوں میں بستے رہو، اللہ تعالیٰ تم دونوں کو نیک اور صالح اولاد عطا فرمائے۔'' دُعا کے آخری حصّے جہاں پر ولی پہلو بدل کر رہ گیا تھا، وہاں مُسکان کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔

''خوش رہو!'' انہوں نے دونوں کو دُعا دی اور نگینہ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئیں۔

کمرے میں کتنی ہی دیر خاموشی کا راج رہا، یہاں تک کہ مسکان نے بے چین ہو کر ولی کو دیکھا، جو کسی بہت گہری سوچ میں بیٹھا تھا۔

مسکان نے تھک کر پہلو بدلا تو اُس کی چوڑیوں کی کھنک کسی بہت خوب صورت موسیقی کی طرح کمرے میں گونجی، عبدالولی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

وہ ایک دم مسکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''مُسکان!'' ولی نے اُسے بلایا۔

مُسکان کا دِل اچھل کر حلق میں آپڑا۔

''جی!'' مسکان بامشکل بول پائی۔

''جن حالات میں ہماری شادی ہوئی، تم کو خبر ہوگی۔'' ولی تو تمہید باندھنے لگا تھا، لیکن مسکان کے نفی میں سر ہلانے پر وہ چونکا۔

''مطلب تم نہیں جانتیں کہ تمہارے فادر نے میری بہن کو کڈنیپ کرنے کا ڈرامہ رچا کر تاوان میں ہمارا نکاح کروایا۔'' مُسکان حیرت اور دُکھ سے ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ سچی ہے۔

''بابا سائیں ایسا کریں گے، میں نہیں جانتی!'' مسکان نے صفائی دینے کی کوشش کی تو عبدالولی نے اُسے مزید صفائی دینے سے روک دیا۔ وہ عورتوں کی عزت کرتا تھا اور اُسے اچھا نہ لگتا تھا کہ اُس کے سامنے کوئی عورت گڑگڑائے یا پھر اپنی صفائیاں دے۔

''جو ہوگیا وہ اب بدلا نہیں جاسکتا، میں نے مان لیا ہے یہی حقیقت ہے لیکن میرے دل کو ماننے میں کچھ وقت درکار ہے۔'' ولی نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ مسکان کا دِل بے اختیار ڈوبا، آنسو اُس کی آنکھوں میں اُبھر آئے۔

''لیکن بے فکر رہو، یہ وقت زیادہ نہ ہوگا کہ تمہارے صبر کا دامن چھوٹ جائے۔'' ولی نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُس کے بے حد قریب ہو کر کہا۔ مسکان کے تو سارے مسام پھوٹ پڑے، نگاہیں جھک کر سجدے میں جو گئیں تو اُٹھنا محال ہوگئیں۔

وہ جسے اُس نے دِن رات مانگا تھا وہ اُس کے اِس قدر قریب تھا، اُس کی قربت اُسے موم کی طرح پگھلا رہی تھی۔

''میں! آپ کے ساتھ، آپ کے ہر احساس کے ساتھ ہمیشہ رہوں گی، میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ میں جس نے آپ کو اتنا چاہا کہ میں، میں نہ رہی آپ ہوگئی اب ہمیشہ کے لیے آپ کی ہوگئی ہوں، اب مجھے کوئی ڈر نہیں ہے، میں انتظار کروں گی!'' مسکان نے رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر کہا تو ولی کے اندر طمانیت بھری لہر دوڑ گئی۔

''یعنی راستہ اتنا کٹھن نہ تھا۔'' اُس نے بے اختیار مسکان کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا۔ اور مسکان کا دِل بھی اتنی ہی شدت سے ایک بار پھر دھڑکا۔

ابھی ایک کا دِل تال پر تھا اور دوسرے دِل کو اِس تال پر آنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا لیکن پہلے دل کو یقین تھا کہ محبت کا سُر ایک دن ضرور چھڑے گا۔

❖❖○❖❖

سائرہ ساری تقریب میں غائب دماغ رہی تھی حالاں کہ اُس کی عزیز ترین سہیلی کا وہ خاص دِن تھا لیکن وہ بھرپور طریقے شامل نہ ہوسکی تھی۔ وہ مسلسل ذہنی کشمکش میں تھی۔

''بیٹا! تم سوگئیں کیا؟'' آنی نے اندر داخل ہو کے پوچھا۔

''نہیں آنی! آجائیں۔'' سائرہ کپڑے بدل چکی تھی اب وہ سلیپنگ ڈریس میں گم سم آئینے کے سامنے بیٹھی میک اپ اُتار رہی تھی، لیکن اُس کا سارا دھیان اُن تصویروں میں تھا، جو آج وہ لڑکی سحرش

لگر آئی تھی۔

سائرہ کو سمجھ نہ آرہی تھی کہ یہ بات کس سے شیئر کرے اور کس سے کنفرم کرے۔

ابو اور آنی کو بتانا بہت رسکی تھا دونوں کی طبیعت دھوپ چھاؤں کی طرح ہونے لگی تھی، دونوں کو ہی لی پرابلم ہوجاتا تھا۔

''کل کی تقریب کے لیے میں نے اپنی بہو کو یہ سلامی ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' آنی نے ست لڑا ہار ل کر سائرہ کے سامنے لہرایا۔

''واہ! بھابی کے تو عیش ہوگئے۔'' سائرہ نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت زبردست چیز ہے آنی! کہاں چھپا رکھا تھا اسے؟'' سائرہ نے خود کو ہشاش بشاش کرنے کی شش کرتے ہوئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو، تیرے لیے بھی میں نے بہت یونیک چیزیں سنبھال کر رکھی ہیں۔'' آنی نے مسکراتے ئے ہار دوبارہ ڈبے میں بند کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ہار میرا ہے! ویسے تو آپا کا سارا زیور بھی پڑا ہے، جو میں نے کبھی نہیں تڑوایا، وہ زیور میں تم کو وں گی اور میرا زیور جو اَبا نے میرے لیے بنا کر رکھا تھا وہ میں اپنی بہو کو ڈالوں گی، بے شک نئے دور کی ڑیں بھی تم لوگ بنوانا، لیکن میں نے جو سوچ رکھا ہے وہ تم لوگوں کو ضرور دوں گی۔'' آنی کی آنکھیں ت کرتے ہوئے چمک رہی تھیں۔

''کیوں نہیں آنی! یہ زیور تو ہمارے لیے اُن دعاؤں کی طرح ہیں، جو آپ نے ہمارے لیے سنبھال ر رکھیں ہوئی تھیں۔'' سائرہ نے اُن کا دِل سچے دِل سے بڑھایا۔

''اچھا اب تم سوجاؤ، صبح بہت سارے انتظام کرنے ہیں آخر میرے بیٹے کا نکاح ہے۔'' آنی خوشی شی باہر نکلیں تو سائرہ ایک دم بستر پر ڈھے گئی۔

''اللہ! یہ خوشی راس آجائے ہمیں، آنی اور ابو کس قدر خوش ہیں، خدانخواستہ کوئی بھی بدمزگی اُن کو کتنا کھ دے گی، ایک تو لالہ ابھی تک نہیں آئے۔'' سائرہ طارق کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی جو ہر فون کال ر کہہ رہا تھا کہ وہ بس ابھی پہنچنے والا ہے۔

جب وہ غصّے سے بالکل پھٹنے والی ہوگئی، تب اسے باہر گیٹ پر ہارن سنائی دیا۔ یہ ہارن طارق کی یپ کا تھا۔

سائرہ کے پاس مزید انتظار کا صبر نہ تھا اِس لیے وہ تیزی سے باہر بھاگی۔

❖❖○❖❖

''نفیسہ! تم ہمارے ساتھ چلو۔'' ڈاکٹر فیصل اور مریم بی بی نے مشترکہ اصرار کیا۔

نفیسہ بیگم نے بے اختیار گہری سانس بھری۔

''بھائی! میرا اُس مینڈک جیسا حال ہوگیا، جو اپنے کنوئیں تک ہی رہنے کا عادی ہوچکا ہوتا ہے، میری زندگی تو گزر چکی اب اس ''عصرِ وقت''، میں، میں کیسے زندگی کے رُخ کو بدل دوں، مجھے ایسے ہی رہنے دیں۔'' نفیسہ بیگم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نفیسہ! میری بہن! تم زندہ ہو یہ جان کر میرا دِل جو برسوں سے مردہ پڑا تھا اُس میں زندگی دوڑ نے لگی ہے، تم میری خاطر اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لو۔" ڈاکٹر فیصل نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"پلیز پھوپو!" عبداللہ نے اُن کا ہاتھ تھاما۔

پلیز پھوپو۔" زہرہ اُن کے کندھے سے جا لگی۔ جانے کیوں!

نفیسہ بیگم کے دِل پر جمی برسوں کی برف پگھلنے لگی۔

"کیا کچھ رشتے واقعی زندگی جیسے ہوتے ہیں، جو ہاتھ رکھتے ہی دِل و جان میں زندگی دوڑانے لگ جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" نفیسہ بیگم نے حامی بھری۔

ڈاکٹر فیصل کا چہرہ خوشی سے جگمگانے لگا۔

"میں مُسکان کی شادی کی آخری تقریب کے بعد آپ کے ساتھ چلوں گی۔" نفیسہ بیگم کا اشارہ ولیمہ کی تقریب کے متعلق تھا۔

ڈاکٹر فیصل کچھ پَل سوچ میں پڑ گئے پھر طویل سانس بھر کر مان گئے۔

"ٹھیک ہے، جہاں اتنا عرصہ میں نے دِل پر پتھر رکھے رکھا، وہاں دو دِن اور سہی!" ڈاکٹر فیصل نے کہا۔

"پھوپو اب ہمارے ساتھ رہیں گی نا!" زہرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ جواباً نفیسہ بیگم نے جی بھر کر اپنے پیاروں کے چہرے دیکھے۔

"ہاں! اب میں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ رہوں گی۔" نفیسہ بیگم کے دل نے فیصلے کی سیڑھی بالآخر چڑھ ہی لی۔

❖❖○❖❖

وہ جو مربعوں زمین کا مالک تھا، جس نے اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی، جو برسوں سے دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتا آ رہا تھا کہ خود کو خدائی کا دعویٰ کرنے سے بھی اُسے گریز نہ تھا آج وہ آئی سی یو میں تن تنہا موجود تھا۔

اتنا تنہا جیسے کہ کوئی لاولد یا پھر لاوارث انسان ہو سکتا ہے۔

وہ جس نے دولت کو اپنے گھر کی باندی بنا رکھا تھا وہ اتنا کنگال تھا کہ اُس کے لیے دُعا کرنے کے لیے کوئی رشتہ اِس آئی سی یو کے دروازے پر نہ تھا۔ بیٹے کے ہوتے، بیوی کے ہوتے ہوئے بھی آج وہ بالکل تنہا تھا۔

باہر خادمین بیٹھے تھے لیکن اُن کو لاکھ Concern اپنے مالک سے سہی لیکن اُن کا خون کا رشتہ تو سید سرفراز علی سے نہ تھا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹرز اور نرسیں آئی سی یو سے باہر نکلیں تو سید سرفراز علی کا خادم ڈاکٹر کی جانب لپکا۔

"سائیں! بڑا سائیں اب کیسا ہے؟" ملازم نے سوال کیا۔

"اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔" ڈاکٹر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

پہاڑ کو ٹوٹنے میں وقت لگتا ہے، ابھی تو پہاڑ صرف اپنی جگہ سے ہلا ہی تھا اور پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو تباہ ہونا اُن کے مقدر میں ہوتا ہے۔

❖❖○❖❖

مرے لہو کی روانیوں میں
نہاں ہے تُو ہی
مری نظر میں
اِک عالمِ بے کراں ہے
تُو ہی
کلام میں سانس لے رہا ہے
بصورتِ اشک
رات، دن مجھ سے کہہ رہا ہے
دُعائیں تُو ہی سُنے گا، آخر کو تُو ہی
اس کربِ جاوداں کا سبب ہے
تو ہی علاج ہوگا

ترنم سر جھکائے بابا جی کے سامنے بیٹھی تھی، رات کے اِس پہر وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟" بابا جی نے قریب آ کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ! میری ماں! بابا جی بس ایک نظر میں اپنی ماں کو دیکھنا چاہتی ہوں، یوں لگتا ہے اگر میں اپنی ماں سے نہ ملی تو مر بھی نہ سکوں گی۔" ترنم نے سسکتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! وہ مالک جو اوپر بیٹھا ہے نا! وہ ستر ماؤں سے زیادہ بندے سے پیار کرتا ہے اگر ایک ماں اپنے بچے کی ذرا سی تڑپ کو محسوس کر لیتی ہے تو وہ مولا کیسے تیری تڑپ کو محسوس نہیں کرتا ہوگا۔ بے شک وہ سب سے زیادہ سننے والا ہے، اُسے "یا سمیع"، کہہ کر جب پکارتے ہیں تو وہ ضرور سُنتا ہے، وہ تیری ماں سے تجھے ضرور ملوائے گا۔" بابا جی نے اُسے تسلی دی۔

"بابا جی! آخر انسان آخری دم تک حریص کیوں رہتا ہے؟ اس دُنیا سے اتنے غم لینے کے باوجود اِس دنیا سے خوشیاں لینے کی آس اُسے کیوں رہتی ہے، یہ حرص آخر کیوں نہیں مرتی؟" ترنم نے مٹھیاں بھینچ کر بامشکل کہا۔

اپنی خواہش کے آگے سب بے بس ہوتے ہیں، بے بس انسان بے چارہ تو گول گول گھمن گھیریاں ہی کھاتا رہتا ہے۔ ترنم بھی اکثر حیرت زدہ ہوتی تھی کہ آخر اُس کی زندگی ختم ہو گئی تو اُس کے اندر خواہش کیوں ختم نہیں ہوتیں۔

خواہشیں!!

"بیٹا! تو پریشان نہ ہو، جس طرح سب کے حصے کا رزق اُترتا ہے نا، اُسی طرح صحت، خوشیاں، غم اور یہ خواہشیں بھی ہمارے حصے کی اُترتی ہیں۔" بابا جی کی بات پہ ترنم یک ٹک انہیں دیکھے گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا اللہ کبھی مجھ پر میری لرزشوں کو اِس طرح معاف کردے گا؟''
''بیٹا! بے بسی لاکھ ان چیزوں کے ساتھ انسان محسوس کرتا ہو لیکن اُس اللہ کی بندگی کے لیے تو اُس کا دِل اُس کے بس میں ہوتا ہے نا!''
''بابا جی! میری ساری زندگی سیاہ کاری میں گزری ہے، ایسے میں کسی شخص کی طلب کرنا حیرت کی بات ہے نا؟'' ترنم شاید ابھی تک نیند میں تھی، جو اپنے آپ میں نہ تھی اِسی لیے تو ایسے سوال کررہی تھی۔
''خواہش کرنا بُری بات نہیں ہے لیکن خواہش کا گھوڑا اتنا سرپٹ نہیں بھگانا چاہیے کہ اردگرد کی ساری چیزیں تباہ ہوجائیں۔'' بابا جی کا تحمل دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔
''پر میری خواہشوں کے گھوڑے تو ہمیشہ ہی سرپٹ دوڑے ہیں اور میں ہر بار بُری طرح گری ہوں۔'' ترنم نے غائب دماغی میں اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''عزت! جو واحد میری ماں باپ کے پاس تھی اور مجھے اُس کی قدر نہ رہی تھی پھر میں نے اُسے کھو کر اُس کی قدر جانی تھی، اب میرا روم روم اُس عزت کا طلب گار ہے آہ! کاش وقت لوٹ آتا اور میں اپنی غلطی سُدھار لیتی۔'' ترنم نے پچھتاوے سے کہا۔
''ایمان فاطمہ سے ترنم کا سفر نہ کرتی۔'' ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ کفارے کی راہ پر چلنے کے باوجود کبھی کبھی اِسی طرح ڈی ٹریک ہوجاتی تھی۔
بابا جی نے اُس کے چہرے پر پھونک ماری اور اُسے سونے کا اشارہ کیا۔ لیکن ترنم کی آنکھوں سے نیند کہیں دور نکل گئی تھی۔
''مرنے سے پہلے میں ماں سے اور اُس بشر سے ملنا چاہتی ہوں، جو مجھے اِن انسانوں کی دُنیا میں واحد انسان نظر آیا تھا۔'' ترنم کی آنکھوں کے سامنے ولی کا چہرہ لہرایا۔
ترنم منہ ہی منہ میں بدبدا رہی تھی۔
بابا جی نے پھر کچھ پڑھ کر اُس پر پھونکا۔ اُسے ایک دم سکون کا احساس ہوا اور اُس کی روٹھی نیند بھی واپس آگئی اور اُس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگ گئیں۔
''آہ! میری ماں!!''
''آہ! وہ میرا عزت دار زندگی گزارنے کا خواب!'' نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں سے جو آخری منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے ذہن کے پردے پر لہرایا وہ عبدالولی کا چہرہ تھا۔

❖❖○❖❖

''مارک! اُس کو ڈھونڈ کر لاؤ!''
''وہ! اُسے!!'' میڈم راگنی نے غصّے سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ اُس سے جملہ پورا کرنا دُشوار ہو رہا تھا۔
''جانے اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا، بے شک وہ اب ہمارے کام کی نہ رہی لیکن اُس کا مرنا ضروری ہے بہت ضروری ہے، وہ گھر کا بھیدی ہے لنکا ڈھا سکتا ہے۔'' راگنی میڈم نے غصّے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔
''کیا معلوم کہ وہ کوئی بھید جانتی بھی تھی کہ نہیں۔'' مارک نے اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے

کہا۔
''وہ ماہی کے ساتھ رہتی تھی اور ماہی جس نے میرا بہت اعتبار حاصل کرلیا تھا اور بہت کچھ جان گئی تھی بھی تو وہ اتنی جرأت کرپائی کہ یہاں سے لڑکیاں نکال سکے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ترنم اِن سب باتوں سے لاعلم ہو، مارک ہر شہر میں اپنے کارندوں کو اُس کی تصویر Send کرو، اُس کو چھان کر نکال کر لاؤ، اُسے میں اپنے ہاتھوں سے ایسی بھیانک سزا دینا چاہتی ہوں کہ سب لڑکیاں یاد رکھیں، اُسے میں ایسا عبرت کا نشان بنانا چاہتی ہوں کہ آئندہ کوئی بغاوت کا تصور تک نہ کرسکے۔'' میڈم راگنی نے شعلہ بار نگاہوں سے پھنکارتے ہوئے کہا۔
''اوکے میڈم! جیسا آپ کا حکم۔'' مارک کہہ کر باہر نکل گیا جب کہ میڈم راگنی جلے پیر کی بلّی بنی مسلسل کمرے کے چکر کاٹتی رہی۔
''ترنم ترنم! یو آر فنشڈ ناؤ!'' اُس نے اپنی ہتھیلی پہ مکّا مارتے ہوئے کہا۔
وہ اِس وقت بل کھاتی زخمی ناگن بنی بیٹھی تھی جو ہر صورت بدلہ لینا چاہتی تھی۔

❖❖○❖❖

''بی بی جی! مبارک ہو سائیں کو ہوش آگیا ہے۔'' نفیسہ بیگم گم سم بیڈ پر لیٹی تھیں جب ملازمہ نے آکر اطلاع دی، لیکن نفیسہ بیگم کے فلیٹ تاثرات دیکھ کر ایک دم اُس کے جوش وخروش میں کمی آگئی۔
''آپ بی بی جی! آپ سائیں کو دیکھنے ہسپتال نہیں جاؤ گے کیا؟'' ملازمہ خود کو کہنے سے پھر نہ روک سکی۔
نفیسہ بیگم نے غائب دماغی سے ملازمہ کو دیکھا، یوں لگتا تھا وہ وہاں موجود ہوکر بھی موجود نہ تھیں۔
''بی بی جی!'' ملازمہ نے اُسے سہہ بار پکارا۔ وہ بھی اپنی ہٹ کی پکی تھی۔
''ہوں!'' نفیسہ بیگم جیسے واپس آگئیں۔
بہت سارے چہرے اُن کے سامنے لہرا رہے تھے بہت ساری یادیں ناگن بنی اُن کو ڈس رہی تھیں۔
رانی، میر، ماسی، امّاں، بابا، بلال کیسے چاند چہرے دِل کے پیارے اُن سے چھوٹ گئے تھے اور یہ سب سید سرفراز کی وجہ سے تھا۔ انہوں نے ساری عمر سید سرفراز علی سے اِس قدر نفرت کی تھی کہ جب وہ زندگی موت سے لڑ رہا تھا تو بھی وہ وہاں نہیں گئیں اور نہ ہی کوئی فون کیا۔ اُن کا دل عجیب دوراہے پر تھا۔ اُس شخص کی اولاد جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھیں اُس کی اولاد کو انہوں نے ہمیشہ پیار کیا تھا۔
پہلے وہ اپنے اِس پیار پہ جو اُن بچوں کے لیے دل میں اُمڈتا تھا حیران ہوتی تھیں کہ اللہ نے یہ پیار اُن کے دل میں کیوں رکھا پھر وہ اللہ کی شکر گزار ہوئیں کہ اگر نفرت کی اِس جلتی آگ میں جس میں اُن کا خود کا وجود بھی جلتا تھا اگر یہ پیار نہ ہوتا تو وہ اِس آگ میں جل جل کر بالکل راکھ ہوچکی ہوتیں، ان بچوں کا کوئی قصور تھا نہیں لیکن اگر ہوتا بھی تو وہ معاف کردیتیں، لیکن سید سرفراز علی کا وہ کوئی بھی قصور معاف کرنے پر تیار نہ تھیں۔
وہ کل جا رہی تھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لیکن وہ جانے سے پہلے اُس شخص کو مل کر جانا چاہتی تھیں، جس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور اُن کی زندگی سے کھیلا تھا۔ وہ اُسے بتانا چاہتی تھیں کہ ہر فرعون کی قسمت میں بالآخر غرق ہونا ہی لکھا ہوتا ہے۔

❖❖○❖❖

کس نے دیکھا آنے والے دن کا روپ
کس نے چُھوا ہے شام کی بھیگی زلفوں کو
کس کے مقدر میں ہے پورے چاند کی رات
کون صبح کے جھونکوں میں ہوگا بے دار
جانے دو
کل کی باتیں اُجلے اُجلے خوابوں کی پہچان سہی
اِس لمحے سے روشن کون سا پل ہوگا
یہ لمحہ جو ہم دونوں کا حصہ ہے
اِس سے پہلے تاریکی تھی
اِس کے بعد کا علم نہیں
بیتے وقت کی اِس ساعت خاموش رہو
تم سے اگر ہو
مجھ پر یہ احسان کرو
اپنا چہرہ میرے سامنے رہنے دو

مدھم روشنیوں میں وہ عبدالولی کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی، وہ جاگتے میں کتنا مختلف ہوتا تھا Attitude کے ساتھ! لیکن سوتے میں تو وہ بالکل معصوم بچہ دکھائی دے رہا تھا۔ گہرے براؤن بال بکھر کر ماتھے پر آ گئے تھے سنہری آنکھیں بند تھیں لیکن گھنی پلکیں مڑی ہوئی تھیں جیسے مسکارا لگا رکھا ہو۔

مسکان کے اندر تک خوشی اور سکون اُتر رہا تھا۔

وہ اُس کی وہ دُعا تھا، جو اُسے ناممکن لگتی تھی لیکن آج وہ اُس کے ساتھ ایک کمرے، ایک ہی بستر پر اتنے قریب سو رہا تھا کہ وہ اُسے چھو سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی۔

بے شک ابھی فاصلے برقرار تھے لیکن مسکان کو کوئی پروا نہ تھی۔ جس ربّ نے یہ ناممکن، ممکن کر دیا تھا۔

تو فاصلے نزدیکیوں میں بدلتے کب دیر لگتی ہے۔

اس لیے وہ بے حد اطمینان سے اپنے دیوتا کو دیکھ رہی تھی، جس کو اُس نے اپنی سُدھ بُدھ کھو کر پوجا تھا وہ جو کل تک اُس کا نہ تھا لیکن آنے والے کل میں صرف اُس کا تھا۔

❖❖○❖❖

''کیسے ہو چھوٹے صاحب!'' رحیم بخش نے بہت پیار سے عبدالولی کو دیکھا۔

''آپ کے سامنے ہوں، بڑوں کی دُعاؤں کا اعجاز ہے۔'' عبدالولی نے اُن کو ہاتھ تھام کر کرسی پر بٹھایا۔

''بٹیا کیسی ہے، نظر نہیں آئی!'' رحیم بخش نے نگینہ کو اِدھر اُدھر اتنے لوگوں میں تلاش کرنے کی کوشش

'رحیم بابا! وہ اب ٹھیک ہے خواتین کی سائیڈ پر ہے۔''

عبدالولی نے آف وائٹ کلر کا سوٹ زیب تن کیا تھا جس میں اُس کا دراز قد اور دراز لگ رہا تھا اُس اجلی رنگت کے ساتھ میچ ہو رہا تھا آج وہ اِس قدر اچھا لگ رہا تھا کہ روشن آرا بیگم جب اُسے ایں آیت الکرسی پڑھ کر اُس پر پھونکتیں۔

''بیٹا! شادی بہت بہت مبارک ہو، علیزے بیٹی سے ملوا دو میں اُس کو پیار دینا چاہتا ہوں۔'' رحیم بخش ات ہسپتال سے چھٹی ملی تھی، گھر آنے پر اُسے پتا چلا کہ صبح عبدالولی کا ولیمہ ہے، جہاں سب ملازم ا میں آئے تھے رحیم بخش بھی آیا تھا۔

یہ دو بچے اُسی کی توسط سے اِس خاندان کا حصّہ بنے تھے وہ اِن بچوں کو اپنے بہت قریب محسوس کرتے اُن کی خوشیوں میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

علیزے کے نام پر عبدالولی کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔

''تو رحیم بابا کو کچھ نہیں معلوم!!'' عبدالولی پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

''میری دلہن سے ملیں گے؟'' وہ رحیم بابا سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں! میری دعائیں اور پیار اُس کا بھی حق بنتا ہے، مجھے لے چلو گے بیٹا؟'' رحیم بخش نے کہا۔

''چلیے!'' وہ رحیم بخش کو لیے اسٹیج کی جانب چلا آیا۔ اِس طرف بزرگ یا پھر بہت اہم لوگ تھے، جو شاہ کے قریبی تھے، وہ لوگ جو دلہن کو خود سے پیار اور منہ دکھائی دینا چاہتے تھے اِسی لیے وہ اس ب تھے ورنہ مرد حضرات کی سیٹنگ شیشے کی دیوار کے پار تھی، خواتین کی جانب سے دوسری جانب کا نظر آ رہا تھا جب کہ مرد حضرات کی طرف شیشہ Blind تھا۔

''ولی! بیٹا دیکھو تم سے کون ملنے آیا ہے۔'' روشن آرا بیگم نے مریم بی بی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

''پھوپو!'' ولی نے پہلی بار اُن سے اپنے رشتے کو قبول کیا، بہت خوب صورت زرقون لگن چادر میں مریم بی بی بہت حسین لگ رہی تھیں انہوں نے ہمیشہ کی طرح اُسے دیکھتے سینے سے لگا لیا۔

''تمہیں تو دیکھتے ہی میرے دِل نے گواہی دے دی تھی کہ تم ہی میرے عبدالولی ہو۔'' مریم بی بی نے آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تم ہو بہو میرے بھائی جیسے ہو۔'' مریم بی بی ہمیشہ کی طرح اُس کو دیکھ کر اپنا جی نہ بھر پا رہی تھیں۔

عبدالولی نے ایک نظر ماں کے چہرے کو دیکھا کہ کہیں اُن کے چہرے پر کوئی Insisecurtiy تو ں ہے کیوں کہ عموماً ایسے موقعوں پر پالنے والی ماں زیادہ کانشس ہو جاتی ہے کہیں اُس کا بیٹا نئے وں کی وجہ سے پُرانے رشتوں میں اُلجھ کر اُن کو بھول نہ جائے۔

لیکن وہ روشن آرا بیگم تھیں احمد شاہ کی بیوی! جنھوں نے ساری عمر ربّ العزت کے بھروسے پر گزاری ں اور اپنی بیوی کو بھی اپنے جیسا بنا ڈالا تھا۔ روشن آرا بیگم کا چہرہ شانت تھا، جس نے ولی کو بھی پُرسکون ر دیا۔

اب وہ مریم بی بی کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ میں دے رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ کل کہاں تھیں؟'' ولی نے بے اختیار پوچھا کیوں کہ ڈاکٹر فیصل اور عبداللہ سے اُس کی ملاقا رخصتی کے وقت ہوئی تھی لیکن مریم بی بی اور زہرہ نظر نہ آئی تھیں۔

''میں؟''

''بیٹا میں آئی تھی لیکن میری طبیعت کچھ بگڑ گئی تھی، میں ہائی بی پی کی مریضہ ہوں، فوراً خوشی اور میرے دِل سے سہارا نہیں جاتا، کل اللہ نے میرے خاندان کو مکمل کردیا تو اتنی بڑی خوشی مجھ سے سنبھل پائی، اِس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے زہرہ کے ساتھ واپس جانا پڑا۔'' وہ دھیرے دھیرے ولی سے بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں اور کچھ فاصلے پر کھڑا رحیم بخش حیران و پریشان کبھی مریم بی بی کو دیکھتا اور اسٹیج پر بیٹھی مسکان کو دیکھتا!

''تو کیا ولی نے سید سرفراز علی کو معاف کردیا، ماننا پڑے گا فرشتوں کا خاندان ہے یہ!'' رحیم بخش بے حد حیرت سے سوچا۔

''بہت بہت بڑا دِل چاہیے اتنا کچھ معاف کرنے کے لیے!

کمال ہے، معاف کردیا!

معافی اچھی بات ہے! لیکن ظالم کو اُس کے کیے کی سزا نہیں ملے گی تو اُن مظلوموں کی روحوں انصاف کیسے ملے گا، جو بے گناہ اِس ظالم کے ہاتھوں مارے گئے، یہ بڑے لوگ ہیں اِن کے تو دِل بڑے ہیں!'' رحیم بخش دِل ہی دِل میں الجھتے ہوئے آگے بڑھا۔

''السلام علیکم بی بی جی!'' اُس نے آگے بڑھ کر روشن آرا بیگم کو سلام کیا۔

''بیٹا! اپنی دلہن کے پاس نہیں لے جاؤ گے؟'' رحیم بخش نے عبدالولی سے پوچھا۔

روشن آرا بیگم نے مسکرا کر سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

''چلیے بابا!'' عبدالولی اُن کو لیے اسٹیج پر آ گیا جہاں مسکان نگینہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''السلام علیکم رحیم بابا!'' نگینہ نے کھڑے ہوکر اُن سے پیار لیا، اِس وقت وہ بھی تیار تھی اور پیاری لگ رہی تھی۔

''جیتی رہو، سدا خوش رہو!'' انہوں نے اُس کے سر پر پیار دیا اور جیب سے دو ڈبیا نکالیں۔

''اِس میں چاندی کے کڑے تھے، بہت پرانے ڈیزائن کے ہاتھ کے بنے ہوئے، پر کڑے اچھا لگ رہے تھے۔

''یہ ہماری ماں کے ہیں، تین تھے ایک ہم نے اپنی بیٹی کو اُس کے بیاہ پر دیا تھا۔ دو سنبھال لیے ایک ولی بیٹا کی دلہن واسطے اور ایک بٹیا کے لیے۔'' رحیم بخش نے کڑے اُجلوا لیے تھے اور بہت اچھے لگ رہے تھے اُن کا دِل بہت بڑا تھا بے شک وہ غریب تھے۔

''ارے! یہ تو بہت خوب صورت ہیں!'' ولی اور نگینہ دونوں نے یک زبان کہا۔

''ہیرے پہننے والے اگر یوں چاندی کی قدر کرتے ہیں تو اُن کو ہیرے ملتے ہیں نا!'' رحیم بخش کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

''مسکان! رحیم بابا ہمارے بزرگ ہیں۔'' ولی نے مسکان کو مخاطب کر کے کہا۔

جواباً مسکان نے ماتھے تک ہاتھ لے جاکر آداب کیا۔

''جیتی رہو، شاد رہو، آباد رہو سدا سہاگن رہو۔ حیرت بھی ہے لیکن اللہ کے کام سب سے زیادہ بہتر ہوتے ہیں، انسان کو ماننا پڑتا ہے!'' وہ دھیرے سے بولے اور آہستہ سے اسٹیج سے اُتر آئے۔ اُن کے بدلتے موڈ کو ولی نے شدت سے محسوس کیا، اِس لیے اُن کے پیچھے پیچھے ہی آلپکا۔

''کیا ہوا بابا؟ آپ کچھ پریشان ہیں میری شادی علیزے سے نہیں ہوئی اِس لیے؟'' ولی نے پوچھا۔

''بیٹا! جوڑے تو آسمانوں میں بنتے ہیں، لیکن میں حیران ہوں تم پر، بلکہ میں تو بس حیران ہوں کہ تم نے اتنا بڑا دِل کیا، تم نے اپنے ماں باپ کے قاتل کی بیٹی سے شادی کی، میں حیران تھا اِس لیے میں پریشان تھا۔''

''مطلب؟'' ولی نے چونک کر پوچھا۔

''تم جانتے ہو نا کہ سید عبداللہ اور عائشہ بی بی سمیت تمہارے سارے خاندان کو آگ لگا کر مار دیا گیا تھا۔'' رحیم بابا نے کہا۔

''آگ نہیں، حادثے میں انتقال ہوا تھا!'' ولی نے کہا۔

''نہیں! اُن کو سید سرفراز علی جو تمہارا سوتیلا چچا ہے اور مسکان تمہاری بیوی کا باپ، اُس نے تمہارے خاندان کو آگ لگا کر مارا تھا۔'' رحیم بخش نے دھماکا کیا۔

''عبدالولی کے ذہن کے پردے پر وہ چیختے چلّاتے چہرے ایک بار پھر اُبھرے۔

''ظالم نے بہت ظلم کیا تھا، وہ بہت ظالم شخص تھا لیکن تم بہت بڑے دِل کے مالک ہو جس نے تم کو اور تمہاری بہن کو بھی اپنی طرف سے موت دے ڈالی تھی، تم نے بیٹا اُس شخص کی بیٹی کو اپنی عزت بنا کر حیران کر ڈالا، کاش! میں بھی اپنا دِل اتنا بڑا کرسکوں، لیکن بیٹا میں اپنے دِل میں اُس شخص کے لیے نرم احساسات نہیں رکھ سکتا، میرا دل مجبور ہے، اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوجائے تو میرے دِل کی بے بسی کی وجہ سے معاف کردینا۔'' رحیم بخش سر جھکائے ہاتھ جوڑتا وہاں سے نکل گیا۔

اور عبدالولی کے پاس تو اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ رحیم بابا کو روک سکے۔

ماں اور باپ کے حصّے کی محبت روشن آرا بیگم اور احمد شاہ نے اتنی دی تھی کہ کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہوا تھا لیکن اِس پَل اُس کے دماغ کے پردے پر ایک بے حد خوب صورت چہرہ اُبھرا، لوری سُناتے اور اُسے کہانیاں سناتے سینے سے لگا کر کھیلتے!

یہ چہرہ اُس کی ماں عائشہ بی بی کا تھا۔

گھوڑے پر سواری کرواتے کندھے پر اُٹھا کر پھیرنے والا ایک شخص کا چہرہ تھا، یہ سید عبداللہ تھے اُس کے بابا۔!

پھر وہ دونوں آگ میں گِھر گئے اور کوئی عورت اُن دونوں کو اِس آگ سے بچا کر بھاگی تھی۔

''آیا امّاں! میرے بچوں کو بچائیے!'' ماں اور باپ دونوں آگ کے کمروں میں بند تھے باہر تالے لگے ہوئے تھے۔

لیکن وہ موت میں کھڑے ہوکر بھی مسلسل اُن کو بچانے کی بات کررہے تھے۔

''لمّاں، بابا!!'' ولی سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہیں ایک کرسی پر ڈھے گیا۔

وہ آگ جو برسوں پہلے جلی تھی اُس کی تپش ولی بھرپور اپنے دِل پر محسوس کر رہا تھا۔

اُس کا دِل چُرمرا کر راکھ ہو رہا تھا۔

وہ بے اختیار رو پڑا، بالکل اُسی طرح، جب وہ بچپن میں بابا کے کہیں باہر جانے پر رو پڑتا تھا، امّاں کے نظر نہ آنے پہ رو پڑتا تھا۔

آہ! یہ یاد کے خانے! جو تب تک نہ کھلے تھے، جب تک کوئی اُن کو کھٹکھٹانے والا نہ آیا تھا اور آج لو رحیم بابا ان دروازوں پر دستک ہی نہیں دے کر گئے تھے بلکہ وہ تو ان کو دھکا دے کر مکمل کھول گئے تھے۔

ہال میں کچھ مختلف شور اُٹھا۔

''ولی! چلو طارق آ گیا، انکل بُلا رہے ہیں۔'' ٹی ٹو نے اُس کا کندھا ہلایا۔ پھر ولی کی روئی روئی سرلے آنکھوں کو دیکھ کر چونکا۔

''کیا ہوا! تم تو بہادر انسان ہو، پھر علیزے بھی مجھے اِس ساری تقریب میں نظر نہیں آ ئیں۔'' ٹی لو نے اپنا اندازہ لگایا۔

''علیزے؟'' ولی نے غائب دماغی سے کہا۔

پھر جیسے بات کو سمجھتے ہوئے اُس نے بے اختیار گہری سانس بھری۔ اِس دوران وہ جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھ کر خود کو کمپوز کر چکا تھا۔

''اِٹس اوکے یار! چلو طارق کو ویلکم کرتے ہیں۔'' عبدالولی نے خود کو ہشاش بشاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور ٹی ٹو کا ہاتھ تھام کر باہر کی جانب لپکا جہاں طارق کو ویلکم کیا جا رہا تھا۔

طارق کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ اتنے خوب صورت تھے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کو پکا چونک کر رہے تھے، جب من کی مُراد ملتی ہے تو ہر آ سی کا چہرہ شاید ایسے ہی چمکنے لگتا ہے۔

عبدالولی عجیب سی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

لیکن آج اُس کے کام احمد شاہ کی دی ہوئی تربیت کام آ گئی تھی یہ وہ تربیت تھی جو عبدالولی کو کھڑا کیے ہوئے تھی اُس کے اندر طوفان برپا تھا لیکن اس تربیت ہی کی وجہ سے اِس طوفان سے سب بے خبر تھے ورنہ کم زور لوگوں پر تو غم کا ایک لمحہ بھی اُتر آئے تو وہ اپنے اردگرد شور مچا کر مجمع اکٹھا کر لیتے ہیں، لیکن وہ کمزور نہ تھا کیوں کہ اُس کا استاد احمد شاہ جیسا اللہ پر مضبوط یقین رکھنے والا مضبوط انسان تھا۔

نکاح کے ولیوں میں احمد شاہ اور عبدالولی تھے۔

نکاح خواں جب نگینہ سے منظوری لے کر طارق کی جانب جا رہے تھے اُسی پَل سحرش نا جانے کہاں سے پیچھے کرسیوں سے نکل آئی تھی۔

سب سے پہلے سائرہ نے اُسے دیکھا اور اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ اُسے لگ رہا تھا، خوشیوں کے یہ رنگ ابھی تباہ و برباد ہو جائیں گے اور ہوا بھی یہی، سحرش نے بنا لحاظ کیے سب سے پہلے وہ تصاویر اور نکاح نامہ احمد شاہ اور شہباز صاحب کو دکھایا جو اُس کے پاس موجود تھا۔

اِس دوران وہ مسلسل مسکراتے ہوئے سب کو دیکھ رہی تھی۔ شہباز صاحب کا تو ایک دم رنگ متغیر ہو گیا۔

''طارق! یہ لڑکی درست کہہ رہی ہے؟''

''ابو! کوئی بھی سوال کرنے سے پہلے یہ ضرور یاد رکھیے گا کہ برسوں کے لیے آنی کی بنائی تصویر سے آپ کا گھر تباہ ہو گیا تھا، اپنی سچائی کی Justification دینا آپ کے لیے کس قدر مشکل ہو گیا تھا میرا لپال ہے جتنا آپ اِس درد کو اچھے سے سمجھ سکتے ہیں کوئی اور نہ سمجھے گا۔'' طارق ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔

''میں آپ کی بیوی ہوں کیا یہ درست نہیں ہے؟'' سحرش نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''بہت ساری درست باتیں اور سچائیاں بالکل جھوٹ کی طرح ہوتی ہیں سحرش بی بی۔'' طارق کے ساتھ آئے مہمانوں کے ساتھ ڈاکٹر زبیر بھی تھے، پہلی بار سحرش کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔

''احمد صاحب! آپ ایک عقل مند انسان ہیں امید ہے آپ گھر کی بات ہجوم میں کرنا پسند نہیں کریں گے۔'' زبیر صاحب کے کہنے پر احمد شاہ طارق کو لیے برائیڈل روم میں لے آئے، وہیں پر سحرش بھی آ گئی۔

نیلوفر، سائرہ، نگینہ کو لیے آ ئیں، جب کہ روشن آرا بیگم سہمی سہمی سی احمد شاہ کے ساتھ آئی تھیں۔

''میرا نام ڈاکٹر زبیر ہے، میں ماہر نفسیات ہوں، سحرش بی بی میرے پاس گزشتہ دو سال سے زیرِ علاج ہیں یہ اُن کی فائل ہے۔'' یوں لگتا تھا کہ وہ بائے پلان ساری تیاری کر کے آئے تھے۔

''طارق صاحب نے اِن سے کن حالات میں شادی کی، میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں، باقی فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔'' ڈاکٹر زبیر نے الف سے یے تک ساری کتھا کہہ سنائی، اِس کے ساتھ ہی وہ سحرش کی ذہنی کیفیت بتانا نہ بھولے تھے۔ جب وہ ساری بات سنا رہے تھے سحرش کی جرأت نہ ہو رہی تھی کہ وہ کچھ بولے۔

کچھ وہ طارق کی آنکھوں میں عجیب سے رنگ دیکھ کر سہم گئی تھی۔

''زندگی تم سے پہلے ہی بہت کھیل چکی ہے سحرش! اب تم اِس سے نہ کھیلنا۔'' مرینہ آنٹی کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا وہ ایک خطرناک کھیل کھیل چکی تھی اور اِس کا رزلٹ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اُسے اب احساس ہوا تھا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ایک مرتی ہوئی عورت کے سامنے مجبور ہو کر اُس کی بیمار بیٹی سے شادی کرنا، یہ جانتے بوجھتے کہ جس حادثے سے وہ گزر چکی ہے اُس کی وجہ سے اُس لڑکی سے اولاد کی نعمت بھی اُس کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

''طارق کے قدم کے پیچھے تو بہت سارے مضبوط دلائل ہیں احمد صاحب!'' ڈاکٹر زبیر ماہر نفسیات تھے اِس بات کو جس اچھے طریقے سے Convey کر سکتے تھے کوئی اور شاید سب کی نفسیات کے مطابق بیان نہ کر سکتا۔

طارق نے بے حد ممنون نظروں سے ڈاکٹر زبیر کو دیکھا۔

''شہباز صاحب! آج نہیں تو کل طارق کی دوسری شادی آپ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے کیوں کہ آپ کو اپنی نسل کے لیے یہ قدم اٹھانا پڑتا، پھر اِس میں اگر طارق کی مرضی شامل ہو جاتی ہے تو کیا بُرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے؟'' ڈاکٹر زبیر نے سب کے چہروں پر نگاہ ڈال کر سوال کیا۔

''اگر یہ بات طارق ہم سب کو پہلے بتا دیتا تو زیادہ بہتر ہوتا، تا کہ یہ تماشہ نہ لگتا۔'' احمد شاہ کا موڈ اب بھی بہتر نہ ہوا تھا آخر وہ بیٹی کے باپ تھے۔

''سوری انکل! بے شک اِس میں میری کوتاہی اور کم زوری ہے میں اِس کے لیے بے حد معذرت خواہ ہوں، میں آپ کا قصور وار ہوں اگر سزا ملے گی تو میں قبول کروں گا، لیکن میں اِس سزا کو سہہ نہیں پاؤں گا انکل! بیٹا جان کر معاف کر دیں!'' طارق نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ تھامے اور احمد شاہ تو بنے ہی پیار سے تھے ایک دم موم کی طرح پگھل گئے۔

انہوں نے ایک نظر روشن آرا اور ولی کو دیکھا جن کی نظروں میں صاف لکھا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اُن کے فیصلے کے ساتھ ہیں۔

احمد شاہ بے اختیار مسکرا دیے، لیکن!!

نگینہ؟

احمد شاہ نے مڑ کر نگینہ کو دیکھا۔

''نگینہ کی دی ہوئی طاقت سے تو آج میں اپنا اتنا کم زور کیس مضبوطی سے لڑ سکا ہوں! نگینہ جانتی ہے انکل!'' طارق نے دھیرے سے یوں اقرار کیا، جیسے کوئی جرم کا اقرار کرتا ہے۔

بہر حال **Explaination** اِس بات پر بھی ہو سکتی تھی کہ نگینہ نے کیوں اُن کو نہیں بتایا، لیکن طارق اُن کو یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ غلطی کو درست کرتے ہوئے ضروری نہیں ہے کہ ہر اینگل بیک وقت درست ہو جائے، آسان طریقہ تو یہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوا سب سے معافی مانگ لیتا۔ بعض مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہوتا کوئی **Daring** حل ہو سکتا ہے تو وہ معافی مانگ لینا ہے۔

ربّ کے سامنے بھی تو یہ ہی معاملہ چلتا ہے نا!

گناہ کیوں کیا، تھوڑا کیا زیادہ کیا، مجبوری سے کیا اِس کی کیا معافی دینی، اُس سے تو بس معافی ہی چاہیے ہوتی ہے۔ اگر انصاف مانگا جائے تو ہمیشہ پکڑ ہی ہوگی، اِس لیے انصاف کی دلدل میں ٹانگ نہیں پھنسانی چاہیے، طارق نے بھی عقل مندی کی تھی اور یوں سب کی نظروں میں بھی سرخرو ہو گیا تھا۔

لیکن جہاں سب لوگوں کا فیور طارق کے ساتھ ہو گیا تھا وہیں سحرش کو ایک دم سے وہاں بے حد گھٹن کا احساس ہوا، اُسے اپنا آپ اِس قدر اکیلا اور اجنبی لگا کہ سانس لینا دُشوار ہو گیا اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اُس کی نظریں شرمندگی اور بے بسی سے اُٹھ نہ پا رہی تھیں۔

''تُو طارق کو ایسے کھو دے گی!'' مرینہ آنٹی کی گونج نے اُس کا پھر حصار کھینچ کر اُسے شکنجے میں جکڑا۔ سب کی نظروں میں اُس کی کوئی وقعت نہ تھی وہ طارق کو بادشاہ مان کر ملکہ بن سکتی تھی لیکن اُس نے اُسے گرا کر خود کو بھی گرا لیا تھا۔

''تاؤ؟'' اُس نے بے حد شرمندگی سے طارق کو دیکھا۔ طارق کی نظریں بھی اُس کے اوپر تھیں۔

''بے فکر رہو سحرش! اگر اللہ کسی کو سہارا دے کر نہیں چھینتا تو اُس کے ماننے والے بھی سہارا دے کر کسی سے نہیں چھینتے اور میں دنیا میں کسی چیز کو، کسی بات کو مانوں یا نہ مانوں، اللہ کو ہمیشہ مانتا رہوں گا۔'' طارق

کہہ کر باہر نکل گیا۔

باقی سب تو کب کے باہر جا چکے تھے اب سحرش کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔

اُس نے بے اختیار اپنے لب کچلے، وہ اِس گیم میں سدا کی طرح پھر جیت گیا تھا۔

واقعی اُس کی مرتی ماں نے اُس میں وہ خاص بات دیکھ لی تھی، جس کی وجہ سے اُس نے جاتے جاتے سحرش کا بھرم ایک بار پھر رکھ لیا تھا۔

سحرش تھکے تھکے قدموں سے ہال سے باہر نکل آئی۔

وہ آخر کس بات کو لے کر طارق پر آئندہ کوئی حق جما سکتی تھی یہ تو طارق کی ہی عظمت تھی کہ وہ اُس کو اپنی زندگی پر کوئی حق دے سکتا تھا، زندگی صرف اُن لوگوں کے لیے اپنی روڈ کے لیے راستہ دیتی ہے جو دوسروں کو اوورٹیک کرنے کے چکر میں کبھی بھی نو انٹری میں داخل نہیں ہوتے اور جو نو انٹری میں داخل ہو جاتے ہیں وہ واپس بھی نہیں آ سکتے اور آگے بھی نہیں جا سکتے، ایسے میں وہ کہاں ہوتے ہیں؟

''وہ تو ان فیکٹ کہیں بھی نہیں ہوتے نہ زندگی کی راہ میں نہ ہی دِلوں میں!''

❖❖○❖❖

ایک انداز سے دیکھوں تو ہمایوں تم ہو
اور اک طرز کی بابر میں ہوں
روز و شب درد کے پھیروں میں رہیں
بارِ غم خود پہ اٹھانے کی دعاؤں کے سوا
مستجابی کا کوئی ڈھنگ نہ ہو
تندرستی بھی کوئی طاق عدد ہو جیسے
دو پہ تقسیم نہیں ہو سکتی
میرے آزار میں جتنا بھی اضافہ ہوگا
اِس قدر تم کو شفا پہنچے گی

مُسکان آنکھیں پھاڑے عبدالولی کو دیکھ رہی تھی اُس کی قسمت میں صرف ایک رات اعتبار کی آئی تھی، جانے اُس کی قسمت میں کیسے چکر تھے، جو ختم ہونے کو ہی نہ آ رہے تھے۔

وہ آنکھیں پھاڑے ولی کا انکشاف سُن رہی تھی۔

''کیا واقعی! کیا واقعی بابا سائیں اتنا بڑا ظلم کر سکتے ہیں؟'' اُس کا دِل بُری طرح ڈوبا۔

کیوں کہ اُس کے دِل نے جواب ہاں میں دیا تھا کیوں کہ دِل بھی تو اُن کے ظلم کو سہہ چکا تھا۔ سید اظہر علی سے اُس کی شادی کر کے پھر اُس کے گھر میں جو ذلت سہی اُس نے، اُن کے ایک ظالمانہ فیصلے کی وجہ سے ہی تو تھا لیکن وہ ایک بار پھر بدلے تھے، انہوں نے ولی کی صورت میں اُسے زندگی دوبارہ لوٹائی تھی۔

تو وہ پھر بہل گئی تھی!

لیکن آج ایک بار پھر ایک سچائی منہ پھاڑے کھڑی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یا خدایا!''

مُکدی نہیں رات ہوندا نہیں سویرا!!

اے کیسا نیرا اِے!!!

میری قسمت نوں جانے سویرے راس نہیں آندے

یا نیریاں نوں میری قسمت راس آ گئی ہے

''مسکان! میں ایسی رسی پر چل رہا ہوں جس پر چلتے چلتے میرے پاؤں آبلہ پا ہو گئے ہیں!''

''تم۔!'' عبدالولی سے بولنا مشکل ہو گیا۔

''ولی! لیکن میرا قصور؟''

''تمہارا قصور اُسی طرح ہے جیسے قابیل کو تا قیامت ہر قاتل کے حصے سے گناہ کا حصہ دار بنایا جائے گا۔''

''تم سید سرفراز علی کی بیٹی ہو، تم بھی! تم کو بھی اپنے باپ کے کیے کا بدلہ سہنا پڑے گا۔'' ولی تیزی سے باہر نکل گیا جب کہ مسکان رو دینے والی تھی۔

آیا امّاں آج نہ آئی تھیں پھر بابا سائیں بھی نہ آئے تھے وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔

لیکن روشن آرا بیگم نے اُسے یہ سب محسوس نہ ہونے دیا تھا وہ اُسے بہت پیار سے گھر واپس لے آئی تھیں اُسے تسلی دے کر وہ جا چکیں تو ولی ایک دھماکے کے ساتھ آیا اور سب اُڑا کر چلتا بنا۔

مسکان مسلسل آیا امّاں اور سید سرفراز علی کے موبائل ٹرائی کر رہی تھی، بابا سائیں کا موبائل تو بند جا رہا تھا لیکن آیا امّاں کا موبائل رنگ لے رہا تھا پھر وہ کیوں نہیں اُٹھا رہی تھیں۔

''یا اللہ! نہ باپ، نہ ماں نہ ہی بھائی آیا!''

کیسے بے جڑ کے پودے کی طرح کا احساس ہے۔

اب یہ ولی کیا سُنا گیا تھا۔ وہ سر تھام کر گر گئی تھی۔

یہ کیسا موڑ ہے، جو زندگی نے اِس قدر بُری طرح کاٹا کہ اُس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔

❖❖○❖❖

''آخر کدھر چلا گیا ولی؟'' روشن آرا بیگم اور احمد شاہ ایک دوسرے سے فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔

گارڈ نے اندر انٹرکام پر اطلاع دی تھی کہ چھوٹے صاحب بہت بُرے انداز میں گاڑی باہر نکال کر گئے ہیں جو اطلاع اُس نے دی تھی وہ بہت چونکا دینے والی تھی، ولی کے ہاتھ میں اُس کا پسٹل بھی تھا جو اُس نے ڈیش بورڈ پر رکھا تھا۔

''خدا کے لیے پتا کریں، میرے اعصاب مسلسل شاک سے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔'' روشن آرا بیگم نے ڈھلتے ہوئے کہا۔

''کاؤنٹ ڈاؤن روشن! زندگی گزشتہ دنوں اُس کے لیے اِس قدر جھٹکے لے کر آئی ہے کہ اُس کا پاؤں کہیں بھی پھسل سکتا ہے، لیکن وہ تب ٹھیک رہا تو اب!'' وہ جیسے با آواز بلند خود ہی سوچ رہے تھے۔

''اب کیا ہوا؟ تم دلہن سے جا کر پوچھو!'' انہوں نے روشن آرا بیگم کو کہا۔

''ہاں وہ سید سرفراز علی کی کیا خبر ہے؟ احمد شاہ نے پوچھا۔

''اب وہ خطرے سے باہر ہیں، میرا خیال ہے بہو کو بتا دیتے ہیں وہ اپنے گھر والوں کی غیر موجودگی سے بہت پریشان ہے۔'' روشن آرا بیگم نے جاتے جاتے مُڑ کر پوچھا۔

''ٹھیک کہتی ہیں، آپ بہو کو بتا دیں۔'' احمد شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

روشن آرا بیگم سر ہلاتی باہر نکل گئیں۔

❖❖○❖❖

سید سرفراز علی شاید غنودگی میں تھا اِسی لیے اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ نفیسہ بیگم نے سارا دِن خود سے لڑتے گزارا تھا اب وہ یہاں موجود تھیں۔

سید سرفراز علی کے پاس جب آئی تھیں تو وہ تکلیف سے تڑپ رہے تھے اور نفیسہ بیگم وہیں رُک گئی تھیں اُس کو تڑپتے دیکھنے کی کتنی خواہش تھی، وہ یہ موقع کیسے جانے دیتیں، اِس تڑپ کے دیکھنے کے کھیل میں وہ مسکان کے پاس بھی نہ جا پائیں۔

ڈاکٹرز نے سید سرفراز علی کو نیند کا انجکشن دے دیا تھا اور وہ اُن کے پاس کھڑی رہی تھیں، خود سے لڑتے لڑتے اِس شخص سے نفرت کرتے کرتے تھک گئی تھیں۔

''سید سرفراز!'' سید سرفراز کے جسم ذرا سی حرکت ہوئی تو نفیسہ بیگم نے اُن کو پکارا۔

سید سرفراز علی نے آنکھیں کھول دیں، اب اُن کی طبیعت خاصی سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔

''نفیسہ! مسکان کیسی ہے؟ وہ خوش تو ہے نا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ہاں بہت خوش ہے، تمہارے منحوس سائے سے نکل کر اُسے ضرور خوش رہنا چاہیے۔'' نفیسہ بیگم پھنکاریں۔

''تم! تم پھر شروع ہو گئیں!'' وہ ہنسے۔

ایسے حالات میں سید سرفراز جیسا ہی شخص ہنس سکتا تھا۔

''میں تم کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں، میں جتنا عرصہ تمہارے ساتھ رہی اللہ سے تمہاری بربادی مانگتی رہی، تم پر کوئی عذاب مانگتی رہی! اب میں اپنا سارا حساب اللہ کے سپرد کر کے تم کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں اپنے بھائی کے پاس، جس کو تم اپنے طور پر مار چکے تھے، میں تم کو ہمیشہ کم زور لگی ہوں نا! ہاں میں کم زور ہوں، میں تم سے بدلہ نہیں لے پائی لیکن میرا اللہ بڑا طاقتور ہے، میں نے اپنے سارے معاملے، سارے حساب اُس کے سپرد کر دیے ہیں اب تم جانو یا پھر وہ! میں جا رہی ہوں، اب میں ایک پل کے لیے تمہارا نام اپنے نام سے جُدا نہیں دیکھ سکتی، جا رہی ہوں!'' وہ ایک لمحے کو رکیں پھر گویا ہوئیں۔

''طلاق کے کاغذوں پر سائن کر دینا ورنہ میرا بھائی آ کر کروا لے گا اور اگر وہ آیا تو اور بھی کھاتے کھولے گا بہتر ہو گا اُن کاغذات پر دستخط کر دینا!'' نفیسہ بیگم کے لفظ لفظ میں پھنکار تھی۔ سید سرفراز حیرت سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا واقعی یہ نفیسہ بیگم تھیں؟''

''سید سرفراز علی!'' وہ جاتے جاتے پلٹیں۔

''مت بھولنا میں نے اپنا مقدمہ اوپر دے دیا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا اور باہر نکل گئیں۔

سید سرفراز علی کو اپنے دِل پر ایک بار پھر کوئی پتھر کی طرح بوجھ محسوس ہوا، جو اُن کے دِل کو چُرمُرا رہا تھا۔

وہ دِل جس میں زخم یا محبت کبھی نہ رہ پائی تھی۔

❖❖○❖❖

''چلیں!'' نفیسہ بیگم نے باہر گاڑی میں آ کر بیٹھتے ہی ڈاکٹر فیصل سے کہا۔ انہوں نے نفیسہ بیگم کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''نفیسہ! ہم آج ہی گاؤں کے لیے نکلیں گے۔'' ڈاکٹر فیصل نے لب بھینچ کر کہا۔

نفیسہ بیگم نے ڈاکٹر فیصل کا چہرہ دیکھا، جہاں بہت سارا کرب تھا۔

''اماں، بابا اور قیصر بھائی سے ملنا ہے، تم ملتی رہتی تھی؟'' ڈاکٹر فیصل نے پوچھا، وہ بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہے تھے۔

''جی بھائی! میں جاتی تھی۔'' نفیسہ بیگم نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''برسوں تو سید سرفراز علی نے مجھے اُن کی قبروں پر جانے نہ دیا، نہ نشانی بتائی۔ ذرا ذرا بات کے لیے بہت تڑپاتا تھا، میں نے اپنے ماں باپ بھائی کی قبریں بہت مشکلوں سے پائی تھیں۔'' نفیسہ بیگم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ اُن کا لہجہ جس تکلیف کو ظاہر کر رہا تھا وہ اُن کے ماضی کے متعلق بتا رہا تھا۔

''بس نفیسہ! اب اور دُکھ نہیں!'' ڈاکٹر فیصل نے بہن کا کندھا تھپتھپایا۔

جواباً نفیسہ بیگم نے آنسو ضبط کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

❖❖○❖❖

عبدالولی مسلسل چھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے یہاں پہنچا تھا، فاصلہ اب بھی آدھ پونے گھنٹے کا موجود تھا دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے جو اندھیرا روشن سا لگتا ہے وہ اندھیرا ٹھنڈی ہوا کے ساتھ شدت سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔

وہ وہاں سے اِس لیے بھاگ آیا تھا کہ احمد شاہ اور روشن آرا بیگم کی تابع داری اور پیار اُسے ایک بار پھر پچھاڑ کر نہ رکھ دے۔ وہ اپنے اندر کے لاوے سے گھبرا کر دوڑ آیا تھا وہ اُس شخص کو ختم کر دینا چاہتا تھا، وہ اُس شخص کے وجود کے ایک ایک حصے پر زخم دینا چاہتا تھا۔

ولی نے پیٹرول پمپ سے گاڑی فل کروائی اور سفر پھر شروع کر دیا۔

جب اُس کی گاڑی رُکی تو وہ خود حیران تھا کہ اُس کی گاڑی حویلی رُکنے کے بجائے بابا جی کے حجرے کی پہاڑی پر آ کر کیوں رُکی۔

ولی تڑپ کر دوڑتا پہاڑی پر چڑھا تھا، جیسے بچہ ماں کی آغوش کے لیے بلکتا ہے، سکون کے لیے

رونے کے لیے! بنا دستک دیے وہ اندر آ گیا، عجیب دروازہ تھا ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ رہنے والے کو کسی باہر والے سے ڈر نہ لگتا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اندر اُس کے ساتھ اللہ کی ذات رہتی ہے۔

''بابا صاحب! آپ نے مجھے یہ کیوں نہ بتایا، یہ کیوں نہ بتایا کہ مکان کے باپ نے میرے خاندان کو جلا کر مارا تھا۔ وہ اُس خونی کی بیٹی ہے، میں نے اُسے اپنی بیوی کا درجہ دیا۔'' عبدالولی اُن کے سامنے بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا پستول اب فرش پر پڑا تھا۔

بابا جی نے سلام پھیر کر اُس کو کندھوں سے تھاما۔

''ایمان بیٹا! ولی کو پانی پلاؤ۔'' انہوں نے ولی کے پیچھے کھڑی ترنم سے کہا۔

ولی کو تو اپنی بے خودی میں وہاں کوئی اور دکھائی ہی نہ دیا تھا۔

''یہ لیں، پانی پی لیں!'' ترنم نے کچے پیالے میں پانی ولی کو دیا۔ ولی ایک ہی سانس میں پی گیا۔

''بابا صاحب! میں اُسے مار کر خود مر جانا چاہتا ہوں ورنہ میرے اندر کی آگ مجھے جلا کر مار دے گی۔'' ولی نے غصّے سے کہا۔

''پیارے بیٹے!'' بابا صاحب نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

ولی لمبے لمبے سانس لے کر وہیں زمین پر لیٹ گیا۔

''جل رہا ہوں میں!!

جل رہا ہوں میں!!

''پیارے بیٹے یہ آگ نہیں ہے، یہ بدلے کا زہر ہے جو تم کو جلا رہا ہے۔'' بابا جی نے اُس کے جلتے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔'' ولی بخار سے پھنک رہا تھا۔

''ولی! تم کو بخار ہے بیٹا!'' بابا جی نے فکر مندی سے کہا۔

''ایمان بیٹا اور پانی لاؤ، پٹیاں کرتے ہیں۔'' بابا جی نے پانی لے کر ململ کا اپنا رومال پھاڑ کر اُسے پٹیاں کی تھیں۔

ساری رات ولی بخار میں تپتا رہا اور ایمان فاطمہ اور بابا جی اُسے پٹیاں کرتے رہے۔ صبح اُس کا بخار ٹوٹا تو وہ گہری نیند سو گیا ایمان فاطمہ اُس کے سرہانے سے نہ ہٹی۔

چند سال پہلے وہ اُسے زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا موڑ دے پر خون سے لت پت ملا تھا اور آج ایک بار پھر وہ ایسی ہی کشمکش میں تھا۔

''اے اللہ! میں بہت گناہ گار ہوں، اتنی کہ دُعا مانگتے بھی شرم آتی ہے، لیکن اے اللہ کتنے ہی گناہ گار سیاہ کار کیوں نہ ہوں ہمارا اللہ تو تُو ہی ہے تیرے پاس ہی ہم نے آنا ہے، تجھ سے ہی مانگنا ہے، تجھ سے نہیں مانگیں گے تو کس سے مانگیں گے، پلیز اللہ جی! ولی کو آسانی عطا کر دیں۔'' ایمان فاطمہ نے بے حد دل سے دُعا کی۔

وہ مسلسل ولی کے سرہانے بیٹھی رہی، بس بیچ میں نماز کے لیے اٹھی تھی۔

صبح صبح بابا جی حسبِ عادت احاطے میں بکریوں کا دُودھ دوہنے نکلے تو بھی ایمان فاطمہ اُن کے ساتھ

نہ گئی ورنہ عموماً وہ اُن کے ساتھ بکریوں کا دُودھ دوہنے اور پرندوں کو دانہ ڈالنے نکلتی تھی، اپنی دادی کی ر
سے بڑے بزرگ سے اُسے بے حد پیار ہوگیا تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ اُسے صرف دو لوگوں سے دنیا میں غرض ہے ایک اپنی ماں اور دوسرا ولی! جو اُسے ہمی
عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اُس نے اب تک دو ہی طرح کے مرد دیکھے تھے یا تو اُن کی نگاہوں میں ہوس
ہوتی تھی یا پھر شک کے ساتھ نفرت دیکھی تھی۔ وہ عزت کی ترسی ہوئی لڑکی تھی اور ولی کو وہ ہمیشہ ویرانوں
میں تنہائی میں ہمیشہ اوکورڈ طریقے سے ملی تھی، لیکن پھر بھی اُس کی نگاہوں میں وہ عزت ختم نہ ہوئی تھی
اُس کی اِسی ادا پر اُس کا دِل اِس قدر اُس پر فدا ہوگیا تھا۔

''اماں۔ بابا!'' ولی غنودگی میں بڑبڑا رہا تھا۔

ایمان نے اُس کے قریب ہوکر سننے کی کوشش کی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، جیسے ہی اُس نے اس کے ماتھے
پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کرنے کی کوشش کی، ولی نے اُس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔ ایمان
کا سارا وجود ہولے ہولے کانپنے لگا۔

ولی کے چھوتے ہی، اُسے محسوس ہوا، جیسے اُس کا وجود پاکیزہ ہورہا ہو، عجیب طرح کی خوشی اور
پاکیزگی کا احساس تھا۔

اُسے اب تک اتنے مردوں نے چھوا تھا لیکن اُسے سب کے چھونے پر بس یہی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے
اُس کے وجود کو سانپ ڈس رہے ہوں لیکن ولی واحد مرد تھا، جس کے لمس نے اُس کی روح کو چھولیا تھا۔

''اماں، بابا!'' وہ غنودگی میں بھی اپنے والدین کو پکار رہا تھا۔ رات بابا جی نے عبدالولی کے والدین کی
جو کہانی سنائی تھی، ایمان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔

تبھی تو اُس نے ولی کے لیے شدت سے آسانیوں کی دُعا مانگی تھی۔

''پانی!'' ولی نے بند آنکھوں سے لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ایمان فاطمہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ
چھڑا کر اُسے سہارا دے کر پانی پلایا۔

''آپ؟'' پانی پینے کے بعد ولی نے حیرت سے اُس سے پوچھا۔

''جی! میں ہی ہوں ترنم!'' ایمان فاطمہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

ولی کو پہلے تو سمجھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے پھر دھیرے دھیرے اُسے ساری باتیں یاد آنے لگیں تو وہ ایک
بار پھر اذیت میں مبتلا ہوگیا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' عبدالولی نے سوال کیا۔

''بن رہے ہیں یا سچ مچ نہیں پتا!'' ایمان فاطمہ نے حسبِ معمول بدگمان ہوتے ہوئے کہا۔ ایسا کیسے
ہوسکتا تھا کہ نگینہ، طارق اور احمد شاہ میں سے کسی نے اُس کی اصلیت کا ذکر ولی سے نہ کیا ہو۔

''آپ کی مرضی ہے، مانیں یا نہ مانیں۔'' ولی نقاہت سے ایک بار پھر لیٹ گیا۔

''وہ میرا مطلب تھا کہ اب تو نگینہ بھی بتا چکی ہوگی کہ میں کیسی لڑکی ہوں، میں بُری لڑکی ہوں لیکن
اِس بُری لڑکی نے بہت ایمان داری سے ایک اچھی لڑکی کی عزت بچا کر اُسے خیر و عافیت سے اُس کے
پیاروں کے حوالے کردیا تھا۔'' ایمان فاطمہ نے دھیرے سے سر جھکا کر کہا۔

''اوہو!'' ولی جیسے ساری بات سمجھ گیا، اُسے دُکھ ہوا تھا۔

ترنم ایک کال گرل ہے، وہ اپنے چہرے کی معصومیت کی وجہ سے کبھی اپنی اصلیت کھول نہ پائی تھی تبھی
اوہ ترنم کی ہر بار اُلجھی اُلجھی گفتگو سمجھ نہ پاتا تھا۔

''کون کہتا ہے کہ آپ بُری لڑکی ہیں۔'' ولی نے دُکھتے سر کے ساتھ کہا۔

''آپ میری اصلیت تو جانتے ہیں نا؟'' ایمان نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو!''

''تم اچھی نہ ہوتی تو کیا جان پر کھیل کر نگینہ کو بچا کر پاتیں۔ تم کیا جانو تمہارا احسان تا عمر ہماری
لگیوں پر رہے گا۔'' ولی نے آخری جملے دِل میں کہے تھے کہ وہ انا پرست لڑکی کہیں احسان والی بات کو
ل پر نہ لے لے۔

''اچھا کتنی اچھی لڑکی؟'' ایمان نے چڑ کر کہا۔

وہ بُری تھی اور اچھی نہیں تھی اس کا اُسے بہت زیادہ کمپلیکس تھا یہ وہ بات ہے جو اُس کی کم زوری تھی
ل لیے اِس بات کو لے کر ہمیشہ وہ ولی سے بحث کیے جاتی تھی۔

''چلیے مان لیا کہ آپ پہلے میری اصلیت نہ جانتے تھے اِس لیے آپ مجھے اچھی لڑکی کہتے تھے اور
ب جب کہ میرا پول کھُل گیا ہے کہ میرا تعلق کہاں سے ہے تو بھی کیا آپ اپنے بیان پر قائم رہیں
گے؟'' ایمان نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''آپ کا تعلق انسانیت سے ہے یہی آپ کا تعارف ہے اور آپ ایک اچھی لڑکی ہیں۔'' ولی بے
لک بے حد نقاہت میں تھا لیکن اُس نے یہ بات اپنے پورے ہوش وحواس میں بے حد مضبوط اور ٹھوس
لہجے میں کہی تھی۔

جواباً ایمان فاطمہ کچھ پَل اُسے حیرت سے دیکھتی رہی اور پھر اِس شدت سے پھُوٹ پھُوٹ کر روئی
کہ ولی بوکھلا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کا سر اُس قدر بُری طرح چکرایا تھا کہ وہ سمجھ نہ پایا کہ آخر اُس نے ایسا کیا
کہہ دیا کہ یہ لڑکی رو رو کر پانی بنتی جارہی ہے۔

''پلیز ترنم! مجھے بتائیے میں نے ایسا کیا کہہ دیا! میں نے کچھ غلط کہا ہے تو پلیز مجھے معاف کردیجیے
ا۔'' ولی اپنی feelings کو بھول کر اُسے چپ کروانے لگا۔

''ایک بار پھر کہیں کہ میں اچھی لڑکی ہوں!'' اُس نے روتے روتے رُک کر بے حد پیار سے ولی سے
کہا۔

''ہاں! تم بہت اچھی لڑکی ہو، میرا دِل گواہی دیتا ہے۔'' ولی نے سچائی سے کہا۔

''کتنی اچھی؟'' وہ دیوانوں کی طرح سوال کررہی تھی۔

''بہت اچھی! بہت زیادہ!'' ولی نے کہا۔

''اچھا!'' وہ استہزائیہ ہنسی۔

''بالکل سچ ہے! بے شک اللہ جانتا ہے۔'' ولی نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''اتنی اچھی ہوں کہ آپ جیسا عزت دار، خاندانی شخص مجھ سے شادی کرلے؟'' ایمان نے طنزیہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوچھا۔

"ولی نے چونک کر بے حد سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

بات اب اُس کی انسانیت کی قدر اور Values کی آ گئی تھی، جواب دینا تو بہت ضروری ہو گیا تھا۔

"ہاں! کر سکتا ہے۔" ولی نے بے حد مضبوطی سے جواب دیا۔

"تو پھر آپ مجھ سے شادی کریں گے؟" ایمان فاطمہ نے اُس کو جن آس بھری نظروں سے دیکھا ا ولی کو لگا اگر وہ نہ کر گیا تو وہ خدا کی خدائی کو نہ کروا دے گا۔ اُس لڑکی کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔

"ہاں!" جانے ولی کو کس طاقت نے ہاں کروائی تھی۔

یہ وہی طاقت تھی جو غالباً اُسے ہزاروں میل سے اُٹھا کر یہاں لے کر آئی تھی اور یہاں لا کر اُ ہوش و حواس سے بیگانہ کر ڈالا تھا۔

ایمان کو یقین نہ آیا کہ واقعی وہ "ہاں" سن رہی ہے۔

"سوچ لیں! کہیں آپ مکر تو نہ جائیں گے!" ایمان نے یوں پوچھا، جیسے مرتے ہوئے انسان کو وسائی ہوتی ہے کہ کہیں اُس سے بچی کھچی سانسیں تو نہیں چھین لی جائیں گی۔

"نہیں! لیکن ترنم! میں تو اِس قدر اُلجھا ہوا ہوں کہ میری زندگی کس موڑ پر جا رُکے، میں خود نہیں جانتا۔ تم نہیں جانتیں کہ میں یہاں کس ارادے سے آیا ہوں؟" ولی نے بے شک ترنم کی آس نہ توڑی تھی لیکن اُسے تمام حقائق سے آگاہ کر دیا تھا۔

"میں یہاں اپنے باپ کے قاتل کو مارنے آیا ہوں ترنم! اگر میں نے اُسے نہ مارا تو بچپن سے ز چہروں کو میں آگ میں جلتے دیکھتا رہا ہوں، اُن کی آگ ساری زندگی مجھے جلا جلا کر راکھ کرتی رہے گی پہلے میں نہیں جانتا تھا ساری حقیقت لیکن اب میں جانتا ہوں اور اب جب تک میں بدلہ نہیں لوں گا اُن ا قرض بھی نہیں ادا ہوگا۔" ایسی باتیں کرتا وہ بالکل اپنے آپ میں نہ تھا۔ وہ عبدالولی نہ لگ رہا تھا۔

ترنم چپ چاپ اُسے سنتی رہی۔

"ایسے میں، ایسی ذہنی حالت میں، میں کیسے شادی کر لوں؟ لیکن یاد رکھنا میں صرف ذہنی حالت کی و سے انکار کر رہا ہوں۔"

"صاحب! یہ تو بہانہ ہو گیا! لاکھ آپ جواز دیں، انکار تو ہو گیا نا!" ترنم نے رُندھی آواز میں کہا۔

"یا اللہ! عجیب لڑکی ہے، مسئلہ سمجھتی ہی نہیں!" ولی کو بخار کی وجہ سے پہلے ہی سر میں درد ہو رہا تھا مزید اُس کی باتوں سے بڑھ گیا تھا۔

"پیاسا تو پانی ہی مانگے گا بیٹا! وہ کہاں صرف پانی کی تسلی سے صبر کر سکتا ہے۔" بابا جی کب آئے دونوں ہی جان نہ پائے تھے۔

"یہ لو بیٹا! اللہ کی دی ہوئی نعمت کو سنبھالو۔" بابا جی نے دودھ کا برتن ترنم کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! اب کیسی ہے طبیعت؟" انہوں نے ولی کا ماتھا چھو کر بخار کا اندازہ کرنے کی کوشش کر پوچھا۔

"ٹھیک ہوں!" ولی نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! وہ عزت کی اتنی بھوکی ہے کہ جب تک اُس کی بھوک نہ مٹے گی، وہ کیسے تمہاری بات کو سمجھ سکتی ہے۔ وہ تم سے تمہارے نام کی عزت چاہتی ہے!"

"بابا جی! آپ اس کی فیور کر رہے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ میں یہاں کس مقصد سے آیا ہوں، جس مقصد کے لیے آیا ہوں اُس کی وجہ سے میں کسی اور کو اپنی ذات سے اٹیچ کر کے کیسے؟

میرا مطلب ہے جب میں خود کے!!

پلیز بابا جی!

آپ سمجھیں نا!" عبدالولی نے ایک دم سر تھام لیا۔

"میں جس سیریس مسئلے میں!"

"آپ اِس بات کو Serious اور اہم کیوں نہیں لے رہے کہ میں قتل کرنے جا رہا ہوں۔" عبدالولی نے ایک دم زچ ہو کر کہا۔

"بیٹا! تم کو اللہ نے ایسا بنایا نہیں ہے تو پھر خود پر کیوں ظلم کرتے ہو، تم ایسے کاموں کے لیے نہیں بنے، تم جانتے ہو کل سے لے کر اب تک جو تم تڑپ رہے ہو، وہ صرف بدلے کے لیے نہیں تڑپ رہے بلکہ تمہارے اندر کی جنگ تم کو تڑپا رہی ہے، تمہارے اندر کا اچھا انسان تمہارے دِل کی برائی سے لڑ رہا ہے وہ تم کو روکتا ہے تم رکتے نہیں ہو، بس سارا مسئلہ یہ ہے۔" بابا جی ایک لمحے کو رکے۔

"مان جاؤ، خود کو سمجھا لو! اِس آگ کو تم ہی ختم کر سکتے ہو۔" بابا جی کی باتیں اُس کے اندر کے الجھاؤ کو اور الجھا رہی تھیں۔ وہ واقعی اپنے اندر کو سمجھ نہ پا رہا تھا۔

"بابا جی! مجھے جانے دیں۔" ولی نے بامشکل اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔" بابا جی نے حیرت انگیز طور پر اُسے اجازت دے دی۔ ولی کا خیال تھا کہ وہ اُسے روکیں گے لیکن انہوں نے اُسے نہ روکا۔

اور ایسا کر کے انہوں نے اُس کے اندر کے زور کو بہنے دیا تھا، اُس کے زور کو توڑ دیا تھا۔

"میں چلتا ہوں!" ولی نے اپنی پسٹل اِدھر اُدھر تلاش کی، بابا جی نے تکیے کے نیچے سے پسٹل نکال کر ولی کے ہاتھ میں تھما دی۔ ولی کو ایک اور جھٹکا لگا۔

"میں تم کو نہیں روکوں گا پیارے بیٹے!" بابا جی نے بے حد سکون سے کہا۔

"ولی بیٹا! جانے سے پہلے کچھ کھا لو، یہاں سے کوئی کھائے پیے بغیر جاتا ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" بابا جی کے اصرار پر ولی ایک بار پھر وہیں بیٹھ گیا۔

"ایمان بیٹی! دودھ کے اندر گندم کا دلیہ ڈال لو۔" بابا جی نے دودھ اُبالتی ترنم سے کہا۔

ترنم نے چپ چاپ ہدایات پر عمل کیا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی، وہ بالکل کھوکھلی ہوئی جا رہی تھی۔

بابا جی نے تاسف سے اُسے دیکھا۔

ولی نے چپ چاپ دلیہ کھایا اور اجازت لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ولی!" بابا جی نے اُسے جاتے جاتے پھر پکارا۔

"جب تم اپنا کام مکمل کر لو تو یاد رکھنا کوئی تمہاری دی ہوئی زبان کے پورے ہونے کا منتظر ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بابا جی نے ترنم کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

ولی کچھ کہنے کے لیے رُکا، لیکن اُسے کسی طاقت نے بالکل چپ کروادیا اور اُس نے ایک بار پھر اس طاقت کے زیرِ اثر اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

جب کہ ترنم کی آنکھوں میں جھڑی لگ گئی تھی۔

''بیٹا! بھروسہ رکھو، اُس پر نہیں۔

اللہ پر بھروسہ رکھو!!''

❖❖○❖❖

''جی ترنم بی بی! طارق بات کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے!

ٹھیک ہے۔ آپ یوں کریں دو دن لے لیں اور ہمیں پیپر ورک دے دیں، لیکن پلیز اپنی لوکیشن تو دیں، ہم آپ کو Protection دیں گے آپ کا یوں Protection کے بغیر کہیں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔'' طارق نے اصرار کیا۔

''طارق صاحب! کبھی کسی نے حفاظت کی ہے کیا؟ میں اللہ کی حفاظت میں ہوں، میں جانتی ہوں، جب تک میرا کام مکمل نہیں ہوگا مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو آپ کا Paper Work بھی مل جائے گا۔'' ترنم نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''بابا جی! میرے موبائل میں بیٹری لو ہوگئی ہے، گاؤں جا کر چارج کروانی ہوگی!'' ترنم نے بابا جی سے کہا۔

''لیکن اگر میں Paper Work کرنے بیٹھوں گی تو اِسے کیسے چارج کرواؤں گی۔''

تم بیٹا اپنا کام کرو، میں آپ کے موبائل کا مسئلہ دیکھتا ہوں۔'' بابا جی نے اُسے تسلی دی تو وہ بال پین لے کر کام کرنے بیٹھ گئی۔

اُس کا ہر ہر لفظ راگنی کی قبر مزید گہری کر رہا تھا۔

❖❖○❖❖

ولی بڑی حویلی کے اُس کھنڈر میں پہنچ کر وہیں بیٹھ گیا، آنکھیں بند کر کے۔ یہاں کبھی جب زندگی تھی اُس کو Visualize کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

پھر وہ سیدھا سید سرفراز علی کی حویلی پہنچ گیا۔

''سید سرفراز صاحب! باہر آئیے۔'' وہ غصّے سے بولا۔

''سائیں آپ یہاں؟'' وہاں موجود ملازم اُسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

''سائیں تو بیمار ہے، ہسپتال میں ہے آپ کو نہیں معلوم؟'' ملازم نے ولی کو بتایا۔

''مطلب؟'' ولی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

جواباً ملازم نے ساری حقیقت کہہ سنائی۔

ولی نے غصّے سے زور سے زمین پر ٹھوکر ماری، جیسے وہ زمین نہ ہو بلکہ سید سرفراز علی ہو!

''اب؟'' کوئی اُس کے اندر سے پوچھ رہا تھا۔

''میں سید سرفراز کو دُکھ دینا چاہتا ہوں! اتنا دُکھ کہ اُسے دُکھ کا احساس بہتے خون کی طرح ہو جائے۔''

ولی نے اپنے اندر کو جواب دیا۔

''ہر شخص کی جان کسی نہ کسی طوطے میں بند ہوتی ہے، میری بھی کم زوری میری بیٹی ہے، میں نے بحیثیت ایک باپ جو کیا، میں تمہارے ساتھ زیادتی نہ کرنا چاہتا تھا، میں نے اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔'' سید سرفراز علی کی آواز ولی کے کانوں میں گونجی۔ ولی کو جیسے ایک دم راستا مل گیا۔

وہ واپس جا رہا تھا۔ وہ بابا جی کے حجرے جا رہا تھا۔

وہ ترنم سے نکاح کرنے جا رہا تھا۔ وہ سید سرفراز علی کو دُکھ دینے جا رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کی آگ بجھانے کے لیے پہلی بوند پانی کی لینے جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''میڈم خبر ملی ہے۔'' مارک نے میڈم راگنی کو فون پر کہا۔

''کہاں ہے؟'' میڈم راگنی پھنکاری۔

''میڈم ابھی اُس کی کچھ Location ٹریس ہوئی ہے، میں آپ کو کچھ دیر بعد Exact خبر دوں گا۔ بہر حال گڈ نیوز ہے، چڑیا پھنسنے والی ہے۔'' مارک خباثت سے ہنسا۔ خون کا کھیل کھیلنا درندگی کا تماشہ لگانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

ترنم کی جانب موت کے سائے بڑھ رہے تھے وہ اِس لیے بہت خوش تھا۔ وہ اُسے پکڑ کر مزہ چکھانا چاہتا تھا۔

لیکن اُسے تو ابھی سے مزہ آ رہا تھا ایک اور چڑیا پھنسنے والی تھی۔

❖❖○❖❖

یہ سب تم نے کیا، کیا؟'' ٹی ٹو فون پر چیخ رہا تھا۔

ولی یُو ورسو کمپوزڈ Composed پرسن!

پلیز ولی!'' ٹی ٹو نے اُسے روکنا چاہا۔

''نو!'' ولی نے مصمم ارادے سے انکار کیا۔

''بس دعا کرو میرے لیے۔'' ولی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''تم ابھی تک راستے میں ہو!'' ولی نے طارق سے پوچھا۔

''تم بھی نا، نمونے ہو۔'' طارق نے زچ ہو کر کہا۔ لیکن بہر حال وہ ولی کی ایک کال پر نکل پڑا تھا۔

''آ جاؤ، پھر ہی تم کو اصل بات بتاؤں گا!'' ولی نے بہت سکون سے کہا اور فون بند کر دیا۔

❖❖○❖❖

''آنٹی السلام علیکم!'' ٹی ٹو نے مؤدب ہو کر روشن آرا بیگم کو کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''خیریت سے ہو بیٹا!''

''بیٹھو!'' روشن آرا بیگم بہت نڈھال ہوگئی تھیں لیکن بہر حال گھر آئے مہمان کو Attend کرنا بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے حد ضروری تھا۔

''میں مسکان بھابی سے ملنے آیا تھا، اُن سے ضروری کام تھا۔'' ٹی ٹو سے بولنا دُشوار ہو رہا تھا۔ ولی نے اُس پر بہت اہم ذمہ داری ڈال دی تھی۔

دو دن کی دلہن کو یہ بتانے کے لیے کہ اُس کا دولہا کہیں اور شادی کر رہا ہے!

''بیٹا! وہ تو شاہ صاحب کے ساتھ ہسپتال گئی ہے، اُس کے والد ہسپتال میں ایڈمٹ تھے وہ ڈسچارج ہو کر اپنے گھر جا رہے ہیں تو وہ مسکان کو بھی ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے۔ ویسے تو رسم ہوتی ہے دلہن شادی کے بعد اپنے گھر اپنے میکے جاتی ہے اور پھر دولہا جا کر اُسے واپس لاتا ہے، میں نے اُسے اُس کے والد کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہیں سے ہی جانے کی اجازت دے دی۔ اب تک تو شاید وہ لوگ نکل گئے ہوں۔'' روشن آرا کی بات پر وقتی طور پر ٹی ٹو نے سکون کا سانس لیا۔

چلو وقتی طور پر مسکان کو بُری خبر سنانے سے وہ بچ گیا تھا۔

''کوئی خاص بات؟'' روشن آرا بیگم براہ راست ولی کا نہ پوچھنا چاہتی تھیں لیکن اِس ساری بات میں وہ مسلسل ٹی ٹو کو دیکھ رہی تھیں کہ شاید ولی کی اطلاع دے۔

لیکن جب وہ خود سے نہ کچھ بولا تو بالآخر انہوں نے اُس سے پوچھنے کا فیصلہ کر لیا۔

''بیٹا! ولی کہاں ہے؟'' انہوں نے ایک دم ٹی ٹو سے پوچھا، جس طرح ٹی ٹو کے چہرے کا رنگ بدلا تھا وہ بتا گیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ ولی کہاں ہے۔

''تم ولی کا کوئی پیغام مسکان کو دینے آئے تھے نا؟'' روشن آرا بیگم نے بغور اُسے دیکھا۔

ٹی ٹو کو اپنا آپ بُری طرح ڈولتا محسوس ہوا۔

روشن آرا کے سامنے وہ جھوٹ نہ بولنا چاہتا تھا اُسے سچائی بتانا ہی پڑی۔

روشن آرا بیگم کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔

اُن کے اپنے گھر پر قیامت گزری اور اُن کو پتا ہی نہ چل سکا!

❖❖○❖❖

میں اِس بستی میں رہتا ہوں
جہاں سب لوگ
اندیشوں کے کمبل اوڑھ کر
خوابوں سے اتنی جنگ کرتے ہیں
کہ سانسیں پھول جاتی ہیں
جہاں سہمے ہوئے سب پالتو کتے
اِک ایسے خوف کو محسوس کرتے ہیں
کہ اکثر بین کرنا بھول جاتے ہیں
جہاں بچوں کے بستے تختیاں
سہمے کھلونے، چوڑیوں کی کرچیاں

سب گندگی کے ڈھیر میں ہی
عافیت محسوس کرتی ہیں
جہاں پینے کے پانی میں
لہو کا ذائقہ تحلیل ہوتا ہے
میں اِس بستی سے باہر کی
کسی دنیا کو جب بھی سوچتا ہوں
تو میرے اجداد کہتے ہیں
میں باغی ہوں!!
میں باغی ہوں!!

ڈاکٹر فیصل کے کانوں میں اپنی ہی کہی نظم گونجی۔ وہ مسلسل سفر کر کے گاؤں پہنچ گئے تھے۔ اب وہ کتنی دیر سے سر جھکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے، اُن میں ہمت نہ ہو رہی تھی کہ! کہ گاڑی سے باہر نکل کر اُس زمین پر پاؤں رکھیں جس کے اندر اُن کے پیارے دفن تھے۔

''فیصل باہر آئیں!'' مریم بی بی نے گاڑی آبائی قبرستان کے باہر رکوائی۔

یہ حویلی والوں کا بہت خوب صورت قبرستان تھا ظاہری آن بان رکھنے والے اپنے قبرستان کو بھی ویسا ہی سجا کر رکھتے تھے۔

''پاپا باہر آئیں۔'' عبداللہ نے باپ کو آواز دی۔

ڈاکٹر فیصل نے طویل سانس بھر کر خود کو مضبوط کرتے ہوئے زمین پر پاؤں رکھا۔

تیز ہوا کا جھونکا اُن کے چہرے کو چھو کر گزر گیا۔ ساتھ ہی فضا میں ایک بہت مانوس خوشبو اُن کو محسوس ہوئی۔

''موتیا!'' وہ بے اختیار بولے۔

''ہاں! یہ خوشبو اُن کی موتیا کی تھی۔'' دو آنسو بے اختیار اُن کی آنکھوں سے بہے۔

''میں جانتا ہوں تم میرے قریب یہیں کہیں ہو۔'' ڈاکٹر فیصل نے اُس خوشبو کو گہرا سانس لے کر اپنے اندر اُتارتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔

''اگر میں تم کو نہیں بھولا تو تم بھی تو ہمیشہ میرے دِل میں رہی ہو! ہر پل زندہ! دیکھو اِن بچوں کو، عبداللہ کو، زہرہ کو! یہ تمہارے ساتھ کیے ہوئے وعدے کی نشانیاں ہیں، میں نے تمہاری مریم کو بچا لیا تھا موتیا۔'' وہ آنسو صاف کرتے قبرستان میں داخل ہو گئے۔

نفیسہ بیگم نے جہاں اُن کو لے جا کر کھڑا کیا تھا، وہاں بہت ساری قبروں کے بیچ ایک قبر پر کتبہ سیدہ سدرہ بی بی کے نام سے جگمگا رہا تھا۔

ڈاکٹر فیصل کو یوں لگا اُن کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔ قبر کے ارد گرد کتنے ہی ''موتیے'' کے پھول پودے لگے ہوئے تھے۔

''یہ! یہ پودے کس نے لگوائے؟'' ڈاکٹر فیصل نے رُندھی آواز میں بہن سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سائیں! میں نے تو یہاں سایہ دار درخت کا پودا لگایا تھا لیکن اللہ کی قدرت ہے کوئی بھی پودا یہاں لگاؤ، سوائے موتیے کے پھولوں کے کچھ نہیں اُگتا۔'' مالکن کو یہاں دیکھ کر گورکن بھی دوڑا آیا، وہ یہاں سب قبروں کی حفاظت کرتا تھا۔

ڈاکٹر فیصل نے ایک بار پھر قبر کو دیکھا، جو جگہ جگہ سے موتیے کے پودے سے بھری پڑی تھی، جس پر بے انتہا پھول اُگے ہوئے تھے۔

''موتیا!'' ڈاکٹر فیصل اِس قدر پھوٹ کے روئے کہ اُن کو اپنے اردگرد کی خبر نہ رہی۔

مریم بی بی نے اُن کو کھل کر رونے دیا اور نفیسہ بیگم کو بھی روکا تھا کہ وہ اُن کو رونے سے نہ روکیں۔

''آپ نہیں جانتیں یہ آنسو باہر آنے کتنے ضروری تھے، کون کہتا ہے کہ مر جانے سے محبت مر جاتی ہے جو لوگ دلوں میں زندہ ہوں، وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

اُن کی محبت زندہ رہتی ہے۔

❖❖○❖❖

''آپ نے اتنی دیر کہاں لگادی، آپ کا موبائل بھی بند پڑا ہے۔'' روشن آرا بیگم احمد شاہ کو دیکھتے ہی لپکیں۔

''میں واپسی پر شہباز کی طرف گیا تھا کہ طارق کو شاید ولی کی کوئی خبر ہو، خیریت تم کو کوئی خبر ملی۔''

''ہاں جی!'' روشن آرا بیگم نے جو کچھ بتایا، احمد شاہ پریشانی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں، مجھے وہاں جانا ہوگا ورنہ ولی کوئی غلط کام نہ کر بیٹھے، اگر وہ بدلہ لے گا تو ہر صورت قاتل بن جائے گا اور میں! اپنی برسوں کی کمائی یوں ختم ہونے نہیں دوں گا۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' روشن آرا بیگم نے کہا۔

''لمّاں جان! پلیز میں بھی جاؤں گی، ورنہ یہاں ڈر ڈر کر مر جاؤں گی۔'' نگینہ جو ابھی ابھی آئی تھی ساری بات سن کر وہ بھی اصرار کرنے لگی۔

احمد شاہ چند پل سوچ میں مبتلا ہوگئے۔

''ٹھیک ہے چلو! میں گارڈ کو کہلوادوں اُن کی گاڑیاں جانا ضروری ہیں۔'' احمد شاہ موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرتے باہر نکلے جب کہ روشن آرا بیگم اور نگینہ فوراً سفر کی تیاری کے لیے اندر چلی گئیں۔

❖❖○❖❖

''سوچ لو یار!'' طارق ساری بات سُن کر بوکھلا گیا۔

''میں نے تمہاری مجبوری سمجھی تھی، تم میری سمجھ لو۔'' ولی بھیگی ہنسی ہنس کر بولا۔

''اِس لیے تو اِس کنویں میں چھلانگ مارنے سے روکا تھا، تم جانتے ہو وہ لڑکی کون ہے؟'' ولی نے طارق سے پوچھا۔

''کمال ہے یار! شادی تم کر رہے ہو اور پوچھ مجھ سے رہے ہو۔'' طارق بدمزگی سے بولا۔

''وہ ترنم ہے۔'' ولی نے طارق کے سر پر دھماکہ کیا۔

''کک۔ کیا؟'' طارق ایک دم حیرت سے بولا۔

''ولی! تم نہیں جانتے وہ لڑکی کس گروہ سے آئی ہے؟''

''خود تم سحرش کے نام پر نیکی کر گئے اور مجھے لڑکی کا بیک گراؤنڈ سنانے لگے۔'' ولی نے اُس کی بات کاٹ کر طنز کیا۔

''نہیں یار! تم غلط سمجھ رہے ہو، یہ تو اللہ جانتا ہے، کون گناہگار اور کون نیک ٹھہرایا جائے گا۔ میں ذرا تلف بات کر رہا ہوں، دراصل اُس لڑکی کے پیچھے ایک پورا گینگ ہاتھ دھو کر پڑا ہے، پھر وہ بہت ساری باتوں میں سرکاری گواہ بننے جارہی ہے تاکہ راگنی کو سزا ہوسکے۔'' طارق نے فکرمندی سے کہا۔

''تو کیا سرکاری گواہ بننے والی لڑکی سے شادی پر پابندی ہوتی ہے؟'' ولی نے پوچھا۔

''ولی۔ ولی! او اللہ کے بندے سمجھا کرو یار، اُس کے دشمن تمہارے بھی دشمن بن جائیں گے۔''

''یار موت تو جب آنی ہے وہ ہر جگہ آجانی ہے۔'' ولی کی بے نیازی دیکھ کر طارق چونکا۔

''ولی! تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''اِس لیے کہ ایک عزت کے لیے تڑپتی بلکتی لڑکی نے اللہ کا واسطہ دے کر مجھ سے عزت مانگی ہے، یار میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اُس کا سوال نہ پورا کیا تو کہیں وہ مجھ سے واپس نہ لے لے۔'' ولی کی بات پر طارق نے بے اختیار جھرجھری لی۔

''تم ٹھیک ہو ولی!'' طارق نے ایک سیکنڈ لگایا تھا اور فوراً چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔

❖❖○❖❖

یہ گھر بابا جی کی ایک شاگردہ اور شاگرد کا تھا، یہاں نکاح کی تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔

طارق گواہوں میں شامل تھا بابا جی نے خود اُن کا نکاح پڑھایا تھا۔ جب ترنم کو بابا جی نے ایمان فاطمہ بنت عبدالرحمان کہہ کر پکارا تو اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

''میرا باپ! میرا پاکیزہ باپ! عزت دار باپ آج دوبارہ اُس کا نام میرے نام کے ساتھ تمہاری وجہ سے پکارا گیا ہے عبدالولی!

تیرا شکریہ۔ تیرا شکریہ!

اے اللہ تو کتنا مہربان ہے!

تیرا شکریہ۔ تیرا شکریہ! وہ روتی جارہی تھی اُس اللہ نے اُس کی وہ خواہش پوری کردی تھی، جو اُس نے آخری خواہش کی طرح مانگی تھی۔

وہ ایمان فاطمہ بنت عبدالرحمان، آج عزت دار باپ کی بیٹی پکاری گئی تھی، ایک عزت دار شخص کی زوجیت میں دے دی گئی تھی۔

''اے اللہ تیرا شکریہ، تیرا شکریہ! میری آخری خواہش تھی یہ تو پوری ہوگئی، تو کیا یہ میری زندگی کا آخری دِن ہوگا!'' جانے کیوں یہ خیال اُس کے من میں دوڑا آیا، پھر خود ہی وہ اپنے خیال پر ہنس پڑی۔

''ارے اِس آخری خواہش کا آدھا حصہ باقی ہے، اللہ جی میری ماں سے بھی ملوادیں اب!

❖❖○❖❖

''جب سے تم آئی ہو میں پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہو بٹیا آخر کیوں اتنی چپ ہو!'' وہ پراڈو جیسی بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

luxries اور بڑی آرام دہ گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔
سید سرفراز کی طبیعت کی خرابی کے پیشِ نظر ڈرائیور بہت محتاط ہو کر گاڑی چلا رہا تھا۔
"میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہی ہو!" سید سرفراز نے بُت بنی مسکان سے کہا۔
"کیا عبدالولی نے تم سے بُرا سلوک کیا ہے؟" وہ اَن جانے اندیشوں سے پہلی بار ڈر رہے تھے، ساتھ ہی شدید غصّے نے اُن کو آ گھیرا۔
مسکان نے بے حد تاسف سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اُسے دُکھ تھا کہ وہ اُس کا باپ تھا کاش اُسے اپنا باپ چننے کی چوائس ہوتی تو وہ اُسے کبھی بھی نہ چنتی۔
ایک اجنبیت کی لہر اُس کے اندر اُٹھی، اگر نفرت کی اُٹھتی تو بھی خیر تھی، جہاں نفرت ہو تو بھی کوئی نہ کوئی Concern تو ضرور ہوتا ہے نا! لیکن یہ کیا تھا اُس کے اندر تو اجنبیت ہی لہریں لے رہی تھی۔
وہ ایک دم اُن سے بہت دور جا کھڑی ہوئی۔
"مسکان! میری بات کا جواب دو۔" وہ دبی دبی آواز میں چیخے۔
اُسی پل مسکان کا موبائل فون زور زور سے بجا۔
"ہاں بولو ٹی ٹو!"
"مسکان! تمہارا فون سگنل نہیں لے رہا تھا۔ تم سے بات نہ ہو پا رہی تھی، اِس لیے تم تک یہ پیغام دیر سے پہنچا رہا ہوں۔" پھر جو کچھ ٹی ٹو نے مسکان کو بتایا وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
"کیا ہوا، کون ہے فون پر؟" سید سرفراز علی نے فون پکڑ کر پوچھا۔
جواباً ٹی ٹو نے ساری بات اُن کو بھی کہہ سنائی۔
"میں ولی کو مار ڈالوں گا اگر اُس نے میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی۔" سید سرفراز علی زور سے دھاڑے۔
ڈرائیور نے ڈر کر گاڑی روکی، شاید صاحب کو کوئی کام ہے۔
"کس کس کو ماریں گے بابا؟" مسکان استہزائیہ ہنسی ہنسی۔
"کس کس کو ماریں گے!" مسکان روتے روتے ایک دم اُن کے بازوؤں میں جھول گئی۔
سید سرفراز نے پریشانی سے مُسکان کو دیکھا۔
اپنی ہار کو دیکھا۔

❖❖○❖❖

"بھابی! یہ میری طرف سے رکھیں، فی الحال یہی تھا میرے پاس۔" طارق نے لفافے میں کچھ کیش رقم دی تھی۔ بابا جی کی شاگردہ سے کہہ کر ویڈنگ ڈریس منگوا کر گفٹ کیا تھا۔
"بھابی!"
"یا اللہ! کیا واقعی مجھے عزت مل گئی ہے۔"
"رشتے میرے ساتھ جڑ گئے ہیں؟ میں ترنم کے بجائے کسی رشتے سے پکاری جاؤں گی؟"
"یہ رکھ لیں طارق بھائی!"

اگر اُس نے بھابی لفظ سے ترنم کو عزت دی تھی تو ترنم نے بھی طارق صاحب سے طارق بھائی کا فاصلہ بہت جلد طے کیا تھا۔
"یہ فائل ہے، میں نے اِس میں تمام انفارمیشن لکھ دی ہے، یہ سی ڈی ہے۔ یہ لیس پن ڈرائیو، باقی کا ڈیٹا آپ کو اِس میں سے مل جائے گا اور یہ Diary ہے۔" ترنم نے ایک بیگ ساری چیزوں سمیت طارق کے حوالے کردیا۔
"پیارے بیٹے! اللہ آپ کو کامیابی عطا کرے۔" بابا جی نے طارق کو دُعا دی۔
"بابا جی! یہاں ہمارے ملک میں تو ہر جگہ ہر طرف ارد گرد کرپشن ہی کرپشن ہے، ہم تو بس اپنی کوشش کر سکتے ہیں۔ ایک جگہ کو صاف کرتے ہیں تو دوسری جگہ بھری پڑی ہوتی ہے۔" طارق بے اختیار بولا۔
"پیارے بیٹے! اِس ملک کے فرد ہونے کی نسبت ہمارا فرض ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم سب اپنی اپنی ذمے داری کو محسوس کریں اور ایک دُوسرے پر تنقید کیے بغیر بس اپنے اپنے حصّے کا جھاڑو لگائیں، پہلے اپنے من میں جھاڑو پھیر کر وہاں اللہ کو بساؤ پھر اپنے ارد گرد لگاؤ اور انسانیت کے لیے جگہ بناؤ۔" کہتے کہتے بابا جی جیسے کھو گئے۔
"ہمت نہ ہارو، اپنا فرض پورا کرتے رہو۔" بابا جی کی بات پر ترنم اور طارق دونوں کے ہی دلوں کو بے حد سکون ملا۔
"شکریہ بابا جی!" طارق نے اُن کے ہاتھوں کو بے اختیار پکڑ کر بوسہ دیا۔
"جاؤ بیٹا! اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔" بابا جی نے اُسے دُعا دی۔
"اچھا بھابی! چلتے چلتے پوچھ لوں، ولی نے آپ کو تحفے میں کیا دیا؟"
"طارق بھائی! میرے لیے تو وہ پورے جہان کی دولت سے زیادہ ہے، انہوں نے مجھے عزت جیسی دولت دی ہے اور ظاہری چیزوں کو پوچھ رہے ہیں تو وہ یہ ہے۔" ترنم نے ایک بہت خوب صورت انگوٹھی دکھائی، یہ ولی کی پرسنل انگوٹھی تھی اور ترنم کو ڈھیلی تھی لیکن ترنم نے کسی خزانے کی طرح سنبھال کر رکھی تھی۔
"بیٹا! میں اپنی جگہ جانا چاہتا ہوں!" بابا جی نے ترنم سے کہا وہ لوگ ابھی تک بابا جی کی شاگردہ کے گھر تھے، وہ کھاتے پیتے بڑے گھر کے لوگ تھے انہوں نے دو تین کمرے فوراً اُن کو دے دیے۔
"ولی آتے ہیں تو پھر چلے جائیے گا۔" ترنم نے کہا۔ ولی باہر گاؤں میں گیا ہوا تھا۔
باہر ایک دم گاڑیاں رکنے کا شور سنائی دیا۔
"کون ہے باہر؟" ترنم گھبرا گئی۔
"باباجی! ولی بھائی کے امی ابو آئے ہیں۔" باہر سے اُس گھر کی ایک لڑکی نے اندر آ کر کہا۔
"کمال ہے! ولی نے انکل انٹی کو بھی بلا لیا۔" طارق حیران ہوا۔ وہ لوگ سب آگے پیچھے باہر نکلے۔
"بابا صاحب! آپ یہاں؟"
"السلام علیکم!" احمد شاہ، روشن آرا بیگم جہاں بابا جی کو دیکھ کر حیران ہوئے، وہیں اُن کو سکون ہوا کہ جہاں بابا جی موجود ہوں گے وہاں سوائے خیر کے بھلا کیا ہوگا۔
"وعلیکم السلام! جیتے رہو بیٹا! قسمت میں لکھا تھا کہ ہماری ملاقات بہت جلد ہوگی۔" بابا جی نے سب کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیار کرتے ہوئے کہا۔

''باباولی کہاں ہے؟''

''ولی خیریت سے، تم اپنی بہو کو پیار نہیں دو گے؟'' باباجی نے پیچھے کھڑی ترنم کی جانب اشارہ کیا۔

''باباجی! آپ نے ایسا کیوں ہونے دیا، آپ تو ولی کو روک سکتے تھے نا!'' روشن آرا بیگم نے ترنم کے جھکے سر کو دیکھ کر شکوہ کیا۔

''بیٹی! اگر میں اِس نکاح میں شامل ہوا ہوں اور میں نے خود پڑھایا ہے تو اِس کا صاف مطلب ہے کہ میں اس کو ٹھیک سمجھتا تھا اِس لیے ایسا کیا۔'' باباجی نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

''پھر بھی باباجی!'' روشن آرا بیگم ناراض تھیں۔

''دو دو بہوئیں! اور دونوں میری پسند کی نہیں!'' روشن آرا بیگم کو ملال ہوا۔

''ملال نہ کرو، یہ اللہ کی رضا ہے قبول کرو۔'' باباجی نے روشن آرا بیگم کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ایمان فاطمہ بیٹا! آگے بڑھ کر ساس کو سلام کرو۔'' باباجی نے ترنم کی ہمت بندھائی۔

''خوش رہو آباد رہو!'' روشن آرا بیگم نے ایک شکوہ کناں نظر طارق پر ڈال کر ترنم کو پیار دیا۔

احمد شاہ بیوی کے روٹھے روٹھے انداز دیکھ کر بے اختیار مسکرائے۔

''آپ نے لتاں جان کو ناراض کر دیا! آپ ہی خبر کر دیتے۔'' نگینہ نے پاس کھڑے طارق کو کہا۔

''مجھے تو خود یہاں آ کر خبر ہوئی لیکن کوئی نہیں مانے گا اس لیے میں صفائی نہیں دوں گا۔''

''یہ بیٹی ہماری اللہ کی بہت پیاری ہے، اللہ نے اِس کو بڑے درجے عطا کیے ہیں۔'' باباجی نے سب کے دِلوں سے ملال کم کرنے کی کوشش کی۔

اُسی پَل ایک دم گولیوں کے چلنے کی آواز کے ساتھ ایک دم سنسناتی گولیاں قریب سے گزری تھیں۔

''یا اللہ!'' ترنم ایک دم نیچے گری۔

''سب زمین پر لیٹ جائیں!'' طارق زور سے چلّایا اور جوابی فائر کرنے لگا لیکن اُس کے پاس ایک ہی گن تھی وہ تو شکر تھا احمد شاہ کے ساتھ آئے گارڈز نے جوابی حملہ کر دیا تھا۔

''طارق! سب کو اندر لے کر جاؤ۔'' ولی اپنی گن لیے سب کو کور کر رہا تھا وہ ابھی ابھی آیا تھا۔ وہ تو گزشتہ دو دن سے اپنا پسٹل اپنی جیب میں لیے گھوم رہا تھا۔

''ولی ہٹ جاؤ!'' طارق بُری طرح چلایا کیوں کہ ولی کوئی بھی آڑ لیے بغیر سب کو کور کر رہا تھا۔

''سب کو اندر لے کر جاؤ!'' ولی چیخا۔

طارق نے بمشکل سب کو اندر کیا، لیکن جب وہ باباجی کو کھینچ کر اندر لایا تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''باباجی! طارق کو اِس بزرگ سے ایک دم سے پیار ہو گیا تھا اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

باباجی کی ساری قمیض خون سے لت پت تھی۔

''باباجی!'' احمد شاہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے سب باہر گولیوں کا طوفان بھولے اُن کے گرد بیٹھے۔

''کیوں روتے ہو! سب کو موت آنی ہوتی ہے، میں تو خوش قسمت ہوں دو دہائیاں جی کر، بے شک اولاد نہیں تھی پھر بھی اتنے سارے لوگ میرے لیے موجود ہیں۔'' باباجی نے نقاہت سے کہا۔

''لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔'' باباجی مسلسل کلمہ پڑھ رہے تھے۔

''میں آپ کو ہسپتال لے کر جاؤں گا۔'' طارق نے کہا۔

''تم نہ بھولنا، ہمت نہ ہارنا! اپنے اپنے حصّے کا جھاڑو پھیرنا نہ بھولنا۔'' باباجی کے چہرے پر بہت خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

''طارق میرے قریب آؤ۔'' اُن کی آواز مدھم تھی اِس لیے طارق نے اپنے کان اُن کے منہ پر لگا دیے۔

پھر سب نے واضح طور پر اُن کے منہ سے کلمہ طیبہ سنا اور انہوں نے یوں مسکرا کر آنکھیں بند کیں، جیسے کوئی بہت بڑی خوشی مل گئی ہو۔

ساری عمر شہادت کی موت مانگنے والے کو اللہ نے شہادت جیسی موت دے دی تھی وہاں موجود ہر شخص سسک پڑا تھا طارق نے بہت احتیاط سے اُن کو زمین پر لٹا دیا تھا۔ باہر گولیوں کی آواز بند ہو گئی تھی۔

طارق نے کمرے میں نگاہ دوڑائی سب موجود تھے، سوائے ترنم اور ولی کے۔

''ترنم۔ ولی!'' طارق باہر بھاگا۔

''ولی!'' طارق کا دِل حلق میں آ گیا۔

ولی سامنے خون سے لت پت موجود تھا۔

❖❖○❖❖

''مُسکان کو ہوش آ جائے گا سائیں! بس ڈپریشن سے بچائیں، میں نے نیند کا انجکشن لگا دیا ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر جسے قریبی قصبے سے ڈرائیور لایا تھا، اُس نے کہا۔

''مُسکان!'' سید سرفراز علی کے دِل کو تڑپ لگی تھی۔ حیرت تھی پتھر کو دیمک لگی تھی، حیرت تھی!

❖❖○❖❖

''نہ جاؤ تم لوگ میں پہلے بھی منع کر چکا ہوں۔'' قاسم علوی نے گاڑی میں سے نکل کر کہا۔

''بس پاپا! یہاں تک لے آئیں ہیں تو اندر تک بھی جانے دیں آج سید سرفراز علی کا روزِ حساب نہ سہی! لیکن میں اپنے دل کا بوجھ اُس پر لاد کر آنا چاہتا ہوں۔'' سمعان علوی نے اُن کے کندھے سے لگ کر کہا اور زبیدہ بیگم کا ہاتھ تھام کر حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔

جب کہ قاسم علوی نے پریشانی سے اُن دونوں کو دیکھا۔

جیسے وہ لوگ شہر کی کچھار میں داخل ہو رہے ہوں۔

''میں تم سے یہ نہیں کہنے آیا کہ میرا کوئی ڈی این اے ٹیسٹ کروالو اور مجھے بیٹا مان لو، مجھے تو ساری عمر دُکھ رہے گا تم میرے باپ ہو! میں تو صرف تم سے اتنا کہنے آیا ہوں کہ میں تم پر تھوکتا ہوں! پھر واقعی سمعان نے سید سرفراز پر تھوک دیا۔

زبیدہ بیگم بھرپور طریقے سے مسکرائیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم! تم کو میں ابھی مزہ چکھاتا ہوں!" سید سرفراز علی نے غصّے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"چکھاؤ!" سمعان نے نڈر ہو کر کہا۔

اُس کی آنکھوں کی چمک سے سید سرفراز کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ جانے وہ کون سی طاقت تھی کہ سید سرفراز علی چاہ کر بھی اُن کو روک نہ سکا نہ رکوا سکا۔

"سید سرفراز علی! تم ہار گئے ہو، دیکھا میں خسارے میں نہیں، خسارے میں تم ہو بیٹے کے ہوتے ہوئے تمہیں بیٹا نہیں ملے گا۔" زبیدہ بیگم نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا اور سمعان علوی کا ہاتھ تھام کر مضبوط قدموں سے باہر نکل گئیں۔

اُن کے قدموں کی دھمک سید سرفراز علی کو اپنے دِل پر سُنائی دی تھی۔

تم ہار گئے ہو!

تم ہار گئے ہو!

حویلی کی دیواروں سے لٹکے حنوط شدہ جانوروں کے سر زور زور سے بول رہے تھے، سید سرفراز علی نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

❖❖○❖❖

جب اپنا قافلہ عزم و یقیں سے نکلے گا
پھر آسماں کا سورج زمیں سے نکلے گا
مری زمیں مجھے ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقین ہے کہ چشمہ یہیں سے نکلے گا

"ولی.... ولی!" طارق دیوانوں کی طرح اُس کی جانب بھاگا۔

ولی کا سارا جسم خون سے لت پت تھا! یہ خون ترنم کا تھا، جو اُسے بچانے کے لیے خود اُس کے سامنے آ گئی تھی۔

"ترنم!" طارق نے دُکھ سے اُسے پکارا۔

"طارق بھائی! اُن لوگوں کو پایۂ انجام۔ تک۔ ضرور، پہنچانا!

تا۔ تا کہ کوئی ایمان۔ فاطمہ دہلیز۔ کے پا۔ پار۔ تت۔ ترنم نہ بن سکے۔"

"ولی اسے اٹھاؤ، یہاں تو کوئی قریب ہسپتال بھی نہیں ہے۔" طارق نے پریشانی سے کہا۔

ولی نے اپنے آنسو صاف کر کے اُسے اٹھانے کی کوشش کی تو ترنم نے اُس کے بازوؤں پر اپنا سر رکھ کر اُسے ایسا کرنے سے منع کیا۔

"ولی! کیا میں اِن آنکھوں کو چوم سکتی ہوں، جنھوں نے مجھے کبھی بُری۔ نگاہ۔ یا حقارت سے نہیں دیکھا۔" ترنم کی فرمائش ولی نے فوراً پوری کی۔

ترنم کو واقعی اللہ نے نواز دیا، جو علیزے کو نہ مل سکا، مسکان کو نہ مل سکا وہ سب سے پہلے ترنم کو ملا تھا۔

ولی نے اُس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

"پلیز ہمت کرو، ہم تمہیں لے کر چلتے ہیں۔" ولی نے ترنم کو گود میں اُٹھایا اور طارق نے گاڑی سنبھال

لی۔

ولی ترنم کا سر گود میں رکھے پیچھے سیٹ پر تھا۔

"ولی! میں۔ نے۔ سنا تھا موت۔ درد۔ دیتی ہے!!

لیکن۔ مجھے۔ درد کیوں نہیں ہو رہا؟ مجھ کو اپنے سارے جسم پر۔ اتنی ٹھنڈک کیوں محسوس ہو رہی ہے؟ یہ اتنی خوشبو کہاں سے آ۔ رہی ہے؟ مجھے اتنی نیند کیوں۔ آ۔ رہی ہے؟" ولی نے اُس کے ماتھے کا بوسہ ایک بار پھر لیا اور اُسے سینے سے لگا لیا۔

یہ لڑکی ایک بار پھر اُس کی جان بچا گئی تھی!

اپنی جان گنوا کر وہ اُسے بچا گئی تھی۔

وہ اُسے ایک دم اپنے دِل کے بے حد قریب محسوس ہو رہی تھی۔

"ولی! میں نے۔ تم کو۔ اللہ سے مانگا تھا!" اُس نے سرگوشی کی۔

"بہت سال پہلے ہی مانگا تھا۔" اُس کے چہرے پر بہت خوب صورت مسکراہٹ تھی، اتنی خوب صورت کہ ولی مبہوت ہو گیا۔ اِس وقت ترنم کا چہرہ پریوں کے چہرے کو بھی مات دے رہا تھا۔

"یا اللہ! یہ اتنی حسین کیسے ہو گئی؟" ولی خود سے سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"اب۔ میں تم سے وہاں پر۔ ملوں گی!" وہ پھر مسکرائی۔

"اُف! کتنی۔ میٹھی۔ نیند۔ ہے!!

آ۔ آنکھیں نہیں۔ کھل رہیں!

سنو ولی! میری ماں۔ کا۔ خیا۔ خیال رکھنا!" ترنم سے بولا نہ جا رہا تھا لیکن نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی۔ ایسے جیسے وہ اپنے لفظ دُنیا میں پورے کر کے جانا چاہ رہی تھی۔

"ولی سنو! میری ایک خواہش اور پوری کر دو گے؟" ترنم نے بند ہوتی آنکھوں کو ایک بار پھر بھرپور کھول کر کہا۔

"کہو؟" ولی نے پیار سے اُس کے بکھرے بال پیچھے کرتے کہا۔

"مسکا۔ مسکان کو معاف کر دینا۔ اُس کا قصور صرف۔ یہ ہے۔ کہ وہ۔ قاتل کی بیٹی ہے! اُس کا قصور معاف۔ کر دینا۔! مسکان کو بہت پیار کرنا!

بہت زیادہ!

تم۔ تم۔ پیار کرتے کتنے اچھے لگو گے!

وہ ہنسی تھی۔!

ولی کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا کیسے بولے جا رہی ہے، اتنی گولیاں لگنے کے باوجود ذرا بھر بھی اُس کے چہرے پر تکلیف کیوں نہیں ہے۔

"بولو، کرو گے نہ اُس سے پیار؟" یہ سوال اُس سے کون سی طاقت کروا رہی تھی وہ نہ جانتی تھی وہ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ بہت میٹھی نیند محسوس کر رہی ہے۔ اتنی ٹھنڈی ہوا اور خوشبو ہے کہ اُس کا من سونے کو مچل رہا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بولو نا ولی! مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں! کروں گا۔"

اتنا زیادہ پیار کہ تمہارا اندر، باہر بس پیار بن جائے!

تمہارا لمس۔ تمہارا پیار قسمت والی کو ملے گا۔ ولی!

ولی! میں بھی بہت۔ قسمت۔ والی ہوں!

ولی نے بے اختیار اُس کی آنکھوں کو چوما۔ اس نے ایک بہت خوب صورت چیز محسوس کی تھی، جیسے اُس نے چاند کو چھو لیا ہو۔ روشن چمک دار۔!!

ترنم کا سارا وجود خوشبو کی لپیٹ میں تھا۔

اُس نے ایک بار آنکھیں کھول کر مسکرا کر ولی کو دیکھا اور ولی کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور ہلکے سے ہنس کر آنکھیں ایسے بند کیں، جیسے کوئی چھوٹے سے بچے کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔

کافی دیر ولی یک ٹک اُسے دیکھے گیا۔

"گڑیا چپ کیوں ہوگئی۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"ایمان۔ ایمان!" لیکن اس کی پری تو پرستان سونے چلی گئی تھی یا شاید معافی سے مہکی اس حوروں کی خوشبو جیسی لڑکی کو اُس کی نئی حور سہیلیاں کھیلنے لے گئی تھیں۔

"ایمان!" ولی نے سسکاری بھری اور اُسے کسی خزانے کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا۔

"طارق! گاڑی واپس لے چلو، ہسپتال جانے کا فائدہ نہیں۔" ولی نے کہا اور ایمان کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

طارق نے نم آنکھوں سے ایمان فاطمہ کو دیکھا، جسے اللہ نے بہت ساری نشانیاں دُنیا کو دے کر اپنی امان میں لے لیا تھا۔

ساری گاڑی ڈھیر ساری خوشبو سے بھری پڑی تھی۔ ولی کے ساتھ ساتھ طارق نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا۔

❖❖○❖❖

سید سرفراز علی کا سر جھکا ہوا تھا۔

لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے!

وہ جو کبھی زندگی میں نہ رویا تھا، آج رو رہا تھا۔ لوگ حیرت سے انگلیاں منہ میں دبائے دیکھ رہے تھے۔

زبیر کی میت حویلی کے آنگن میں پڑی تھی، وہ ایڈز سے مرا تھا۔ مرنے سے پہلے اُس نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا تھا۔

"ربّ کرے دنیا میں تم سا کوئی باپ پیدا نہ ہو۔

سید سرفراز علی!!

تیرے پیسے نے میرے لیے تھرل نہیں، موت خرید کر دی!

تم کیسے باپ تھے، جس نے کبھی مجھے نہ روکا!

کسی آگ میں کودنے سے نہ روکا!!

تم باپ تھے کہ دشمن!! میری وصیت ہے کہ کوئی دشمن میری قبر کو مٹی نہیں دے گا۔" زبیر

اور سید سرفراز علی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پہاڑ رو پڑا تھا پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا تھا، اُس کا وارث مر گیا تھا۔

اور مرا بھی ایسے جیسے کوئی لاوارث مرتا ہے، وہ اُس سے نفرت کرتا مرا تھا، جس سے اُس نے بہت پیار کیا تھا۔

"اُٹھ جاؤ زبیر!

زبیر! سید سرفراز علی ڈھے گیا۔

تم نہیں مر سکتے!" تم سید سرفراز علی کے بیٹے اتنے کم زور نہیں ہو سکتے، تم ایسی موت نہیں مر سکتے۔

"ہا۔ ہائے زبیر! سید سرفراز علی کی غصّے کی دھاڑیں تو زمانے نے سنی تھیں لیکن روتے ہوئے کی دھاڑیں پہلی بار سنی تھیں۔

مسکان ایک کونے میں لگی عورتوں میں بیٹھی تھی۔ زندگی میں ہر رشتے کا خانہ خالی ہوگیا تھا۔

"آہ! میرا بھائی!"

جنازہ اٹھنے لگا تو سید سرفراز علی کھڑے سے گر پڑا۔ لوگوں نے سہارا دے کر ساتھ چلایا۔

"بھائی!" مسکان چیخی۔

"میرے پاس کوئی رشتہ نہیں رہا، میں اکیلی رہ گئی، میں اکیلی رہ گئی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

تبھی دو مضبوط بازوؤں نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔

مُسکان نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا۔

"و۔ ولی!"

ولی کی آنکھیں روئی ہوئی تھیں۔ سفید لباس میں اُس کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔

"ولی! میرا بھائی مر گیا! میں، میرے پاس کوئی نہیں رہا، سب مر گئے یا چھوڑ گئے میں، میں کیوں زندہ ہوں!"

"سب تمہارے پاس ہیں، میں ہوں تمہارے پاس۔" ولی نے مسکان کو سینے سے لگا لیا۔

مسکان اتنا روئی کہ پانی ہوگئی۔

ولی نے اُسے رونے دیا۔

لوگ زبیر کا جنازہ اُٹھا کر لے کر جا رہے تھے۔

ولی بھی ساتھ ہولیا۔ زبیر کو دفنانے کے بعد جب سب چلے گئے سوائے سید سرفراز علی اور اُس کے چند خاص ملازمین کے تو ولی آگے بڑھا!

مرے کو گدھ کھاتا ہے!!

اور میں گدھ نہیں ہوں۔!!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیدسرفراز علی! آیا تو تھا تم سے بدلے لینے، لیکن مرے کو کون مارے۔!!
جاؤ تم پر اللہ کی مار!!
ولی نے نفرت سے کہا اور تیزی سے واپس چلا گیا۔
سیدسرفراز سودائیوں کی طرح اُسے جاتا دیکھتا رہا۔

❖❖○❖❖

سیدسرفراز علی! میں جا رہی ہوں!
جانے سے پہلے میں تم کو باپ ہونے سے عاق کرتی ہوں۔
تمہارے ''سرنیم'' Sir Name کی وجہ سے میں نے بہت دُکھ اٹھالیے۔
میں جا رہی ہوں، اور آئندہ سے میرا کوئی باپ نہیں ہے نہ میں تمہاری بیٹی ہوں۔'' مسکان، ولی کا ہاتھ تھام کر حویلی سے باہر نکل آئی، جہاں خوشیاں اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔

''مسکان!!
مسکان! مسکان مجھے نہ چھوڑ کر جاؤ۔''

''عبدالولی میرے پاس بہت دولت ہے میری ساری دولت لے لو اور مجھے معاف کر دو۔'' سیدسرفراز علی نے اُن کو روکا لیکن وہ بنا مُڑے چلے گئے۔

''نہ رُکو۔ نہ رکو!''

''مجھے کوئی نہیں چاہیے، کوئی نہیں! میں سیدسرفراز علی اکیلا ہی سب پر بھاری ہوں!'' سیدسرفراز علی ایک دم ہذیانی انداز میں ہنسا۔

''تم اکیلے کہاں ہو سیدسرفراز علی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔'' ایک دیوار سے سیدعبداللہ اور عائشہ بی بی نکل آئیں۔

دوسری جانب سے زلیخا بی بی، سدرہ بی بی، مریم پھوپو نکلیں، سیدسرفراز علی کی آنکھیں خوف سے اُبل رہی تھیں۔

''مجھے تو نہیں بھول گئے سُسر جی!'' ایک دیوار سے شہر بانو نکل کر ہنسی۔

''لیکن! تم سب تو مر گئے ہو! تم کیسے میرے ساتھ رہ سکتے ہو!'' سیدسرفراز علی ڈر کر دیوار سے جا لگا۔

لیکن حویلی کا یہ ہال کمرہ لوگوں سے بھرتا جا رہا تھا۔

جورا۔ جورے کی بیوی، وہ ساری لڑکیاں جو اُس کی ہوس کا نشانہ بن کر مر چکی تھیں۔

سیدعبداللہ اور عائشہ بی بی سکون سے صوفے پر جا بیٹھے اور سب اُس کے اردگرد کھڑے ہنس رہے تھے۔

''میں! میں تم سب کو مار دوں گا۔ جلا کے ماروں گا تا کہ تم دوبارہ مجھے تنگ نہ کر سکو۔'' سیدسرفراز علی غصے سے بڑبڑاتا ہوا تیزی سے گاڑیوں کے گیراج کی طرف لپکا۔

زبیر کی موت کے بعد زیادہ تر ملازم خود ہی سیدسرفراز علی نے نکال دیے تھے، جو چند تھے وہ اس وقت اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سیدسرفراز علی کو، اُس کے پاگل پن کو روکنے کے لیے کوئی نہ تھا

سیدسرفراز علی پیٹرول کی یہ گیلن گیراج سے نکال کر لایا تھا یا کسی گاڑی سے، وہ غصے میں ہذیان بکتا بڑبڑاتا بھاگتا واپس آیا، اب وہ دیوانوں کی طرح پیٹرول چھڑک رہا تھا۔

''میں تم سب کو جلا کر مار ڈالوں گا!''

وہ چیخا اور ساتھ ہی اُس نے ان سب ہنستے ہوئے لوگوں پر آگ کی تیلی پھینک دی۔ ایک زور کا دھماکا ہوا اور ہر طرف آگ کے شعلے اٹھنے لگے۔ اب سیدسرفراز علی خوشی سے ناچ رہا تھا۔

''اب تم سب کیسے بچو گے، میں نے سب کو جلا کر مار دیا۔ مار دیا!'' وہ تالیاں بجا رہا تھا آگ اُسے چاروں طرف سے لپیٹ میں لے رہی تھی اور پھر کچھ ہی پلوں بعد اُس کی ہنسی کی آواز دِل دوز چیخوں میں بدل گئی۔

خدائی کا دعویٰ کرنے والا جل گیا تھا۔

وہ آگ جو برسوں پہلے اُس نے لگائی تھی اُس کی لپیٹوں نے آج خود اُس کو بھی پکڑ لیا تھا۔

❖❖○❖❖

باباجی کا حجرہ پھر آباد ہو گیا تھا۔ باباجی اور ترنم دونوں کی قبریں وہاں بنادی گئی تھیں، حجرے کے ساتھ کی ساری جگہ لے کر ولی نے ایمان فاطمہ ٹرسٹ ہسپتال بنادیا تھا۔ وہ آخری پلوں کی بے بسی کیسے بھول سکتا تھا، جب وہ ایمان کو بچانا چاہتا تھا اور قریب کوئی ہسپتال نہ تھا۔ دوسروں کو ہسپتال کی سہولت دے کر ایمان کے لیے صدقہ جاریہ کا ایک راستہ بنادیا تھا، اسی طرح ولی نے ہسپتال کے ساتھ متصل زمین پر بچوں کا مدرسہ بنوایا، ساتھ ہی علاقے کی سب سے خوب صورت مسجد ڈیزائن، کی تھی وہ جگہ جو برسوں سے باباجی کی عبادت سے اللہ کے نام سے زندہ تھی۔

ولی نے اُس جگہ کو ویسے ہی اللہ کے نام سے آباد کروادیا تھا مسجد اور مدرسہ بنوا کر، باباجی ہی نہیں اپنے والدین سیدعبداللہ اور عائشہ بی بی کے لیے صدقہ جاریہ کا انتظام کر دیا تھا، جہاں ہر آنے والا نماز تو پڑھتا تھا، ساتھ فاتحہ بھی پڑھ کر جاتا۔ ساتھ ہی قبروں کا مجاور وہاں کے سادہ لوگوں کو سختی سے منتیں مانگنے اور سجدہ کرنے سے منع کرتا تھا اس ڈیوٹی کے پیسے مجاور کو الگ دیے جاتے تھے وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے بزرگوں کی طرح باباجی کی قبر کہیں سجدہ گاہ نہ بن جائے اور وہ اس کام میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

طارق نے میڈم راگنی اور اُس کے گروہ کو کامیاب طریقے سے پکڑا تھا۔ مارک تو آن دا اسپاٹ مر گیا تھا البتہ راگنی کو طارق نے جان بوجھ کر آن دا اسپاٹ مارا تھا۔ ایسا اُس نے ترنم کی وجہ سے کیا تھا کیوں کہ ترنم نے بتایا تھا کہ وہ ایسا سانپ ہے، جسے بھاگنے کا سوراخ ضرور مل جاتا ہے اور وہ باہر نکل کر انڈے بچے پیدا کر کے پھر اپنا سیٹ اپ بڑھالیتی ہے۔ طارق نہیں چاہتا تھا کہ اس بار سانپ کو کوئی اور سوراخ میسر ہو۔

طارق غیر سرکاری طور پر جتنی چیزیں اور سیٹ اپ تباہ کر سکتا تھا، اُس نے کیے تھے۔ باباجی نے مرنے سے پہلے اُسے وہ نام بتایا تھا، جو اِس گروہ کے ہائی کمان کا تھا۔

طارق کو حیرت تو تھی کہ وہ کیسے جانتے ہیں کیوں کہ ترنم کے سب ثبوتوں کے باوجود وہ ہائی کمان باس کا نام نہ جان پایا تھا لیکن باباجی نے مرتے ہوئے وہ نام بتا کر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ اپنے حصے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھاڑو پھیر گئے تھے اب اُس کی باری تھی اور اُس نے اپنی ذمے داری بھرپور طریقے سے ادا کی تھی۔

❖❖○❖❖

''یہ تمہاری امانت ہے!'' علیزے نے مسکان کو وہ پائل لوٹائی، جو کبھی ولی نے اُسے گفٹ کی تھی۔ وہ عبداللہ کے ساتھ آسٹریلیا چلی گئی کیوں کہ عبداللہ کی پڑھائی ابھی باقی تھی۔

''اِسے بنا کسی ملال کے پہننا اور اس کی جھنکار میری محبت کو محسوس کر کے سننا!'' ولی نے وہ پائل مسکان کی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی دیکھ کر کہا۔

مسکان نے اپنے دیوتا کو دیکھا، وہ واقعی بہت اونچا تھا۔ وہ واقعی ایک سچا مرد تھا۔

وہ بشر کی پہچان تھا۔

اُس نے معاف کر کے آمرزش کا وہ بیج بویا تھا، جس کے لیے بہت بڑے دِل کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور ولی واقعی بہت بڑے دِل والا انسان تھا۔ بڑے دِل والے ہی اللہ کے ہاں بڑا مقام پاتے ہیں۔

اِسی لیے تو وہ ایمان کی ماں کو طارق کے ذریعے تلاش کر کے گھر لے آیا تھا اور اُسے گھر میں گھر کے افراد کی طرح رکھا ہوا تھا۔

احمد شاہ کا بتایا یہ روشنی کا، نیکی قافلہ ولی نے رُکنے نہ دیا۔

پرت در پرت
قبا در قبا
یہ پھیلا منوں پہ خمار جنوں
جب پھنس رہا کسی گرداب میں
کسی دام میں، کسی زعم میں، کسی خواب میں
من کے اندھیرے اُسے لے اُڑے
کبھی بھول بھلیاں کبھی دشت میں بھٹکیں
کبھی سراب کے پیچھے گھڑی کے کانٹے
گھومتے رہے سرکتے رہے
زندگی اک کھیل ہے
یہ انتہا سا انتہا
کہیں دیپ جلے کہیں سلگے جاں
زندگی لمبی سڑک تارکول پہ لپٹی ہوئی
سیاہی سے اَٹی ہوئی
جو کاجل گھر میں بھڑک اٹھے اس کی لو تڑپ اٹھے
من کے اندھیرے میں چنگاری چمکے
کاسے میں پڑے سکے چھنکے
جب نقش سارے مٹ گئے

لفظ سبھی کھو گئے وہ مقام درد
جہاں اشک بولیں، اشک ہی تولیں
جو عیاں ہوئے، تو بیاں ہوئے
صفحہ عشق پہ لکھے راز
جس کی ''واپسی'' ہوئی
اسے ''آ گہی'' ملی
اُس نے پالی آ درش
باقی سب ڈھونڈتے رہے
کالے سیاہ پاتال میں
رنگ نور کی آمرزش
جو نظر عتاب وہ نظر سیلاب
جو ''وہ'' منظور من ہو ساتی
تو اس کی پور پور بھگو دے بارش
جب کڑک چمک مدھم پڑی
ایک ہی گونج رہ گئی باقی
آمرزش، آمرزش، آمرزش

ترجمہ:

(اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے مظالم کو بھی، ہمارے دِل لگی کے طور پر کیے ہوئے اور بغیر دل لگی کے کیے ہوئے گناہوں کو بھی اور بلا ارادہ کیے ہوئے گناہوں کو بھی اور سب ہی قسم کے گناہ ہم سے سرزد ہوئے ہیں۔ تُو سب کو بخش دے)

(تمت بالخیر)